آپ
اور اس کا مستقبل
پ کے بچے کا مستقبل آپ کی اہم ذمہ داری ہے۔
پنے بچے کے لئے ایک ایسے مستقبل کی فکر کیجئے جس میں
یم، مکان، علاج اور دیگر بنیادی ضروریات کی ضمانت ہو سکے۔
ماہ کچھ نہ کچھ پس انداز کیجئے اور حبیب بینک
میں جمع کرتے جایئے
لی سیونگ اکاؤنٹ کی خصوصیات :-
صرف پانچ روپے سے اکاؤنٹ کھولا جا سکتا ہے
پچاس ہزار روپے تک ۲½ فیصد منافع
ادائیگی بذریعہ چیک
بھی
یب بینک میں فیملی سیونگ اکاؤنٹ کھولئے
مشرقی و مغربی پاکستان میں
ے شاخیں ہیں۔
حبیب بینک لمیٹڈ
کو بہتر خدمت کا موقعہ دیجئے

منظور شدہ محکمۂ تعلیمات کراچی، لاہور، پشاور، کوئٹہ
جاری شدہ: ۱۹۴۵ء ۵ فون: ۳۹۹۳۲

مرتبہ
صہبا لکھنوی
کشش صدیقی

قیمت		زرِ سالانہ
بارہ روپے		بارہ روپے

مکتبۂ افکار
رابسن روڈ کراچی

لندن آفس

۱- ڈیورسے کورٹ - برانڈس بری پارک - لندن - این - ڈبلیو-۲

تلوک چند محروم

کلامِ فیض

مکرمی تسلیم — جناب فیض احمد فیض کی ادبی خدمات کے متعلق کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ اردو شاعری کے دورِ جدید میں فیض کا نام ایک امتیازی حیثیت حاصل کر چکا ہے۔ ان کے کلام کی جس قدر اور جس طریقے سے قدر افزائی کی جائے لائقِ تحسین و ستائش ہے۔ اذکار کا فیض نمبر ہندوستان، پاکستان اور روس میں یقیناً مقبول ہوگا۔ میری بیاض میں دو شعر کا ایک قطعہ ۲۷ اپریل ۱۹۵۶ء کی تاریخ کے ساتھ مرقوم ہے۔ دلی میں ان کا پرانا مداح ہوں۔ وہ قطعہ یوں ہے:-

کلامِ فیض مثالِ نگاہِ خوش چشماں
نوائے راز بھی ہے اور شرحِ راز بھی ہے
ملے نہ کیوں دلِ اہلِ نظر میں جا اس کو
کہ دل نواز بھی ہے اور دل گداز بھی ہے

نیاز مند تلوک چند محروم
14.1.65

سرورق : عزیز کارٹونسٹ ، مارننگ نیوز

جانِ مضموں

(۱۴)

(نادر و یادگار تازہ و غیر مطبوعہ)

غیر مطبوعہ عکسی خطوط

(۱۴)

(احباب کے نام)

غیر مطبوعہ خطوط

(۵)

(ایلس فیض کے نام)

گلشنِ دیدار

(۴۳)

(نایاب اور تاریخی تصاویر)

موضوعِ سخن (۴۴)

(پیغامات و تاثرات)

محبوبِ نظر (۱۶)

(زندگی و شخصیت)

ذکرِ یار (۳۸)

ہم عصر شعراء کے نذرانے

(۲۵) بارش سنگ
(فکر و فن)

(۱۳) تذکرہ و تبصرہ
(مختصر و اہم)

۴ نیض اور نئی نسل
(مطالعے و جائزے)

۴ لوح و قلم
(انتخابِ کلام)

۱۱ حرفِ سادہ
(مضامینِ فیض)

۱۰ روشنیوں کا شہر
(افسانے و فکاہیے)

○

فیض نمبر کے جملے مضامین نظم و نثر کا حقِ اشاعت محفوظ ہے۔ تمام تخلیقات براہِ راست حاصل کی گئی ہیں اور پہلی بار شائع ہو رہی ہیں

افکار (اپریل - مئی - جون ۱۹۸۵) شمارہ: ۱۶۴ - ۱۶۵ - ۱۶۶

مدیر: صہبا لکھنوی — مطبوعہ: مشہور آفسیٹ پریس کراچی — دفتر: رابسن روڈ کراچی — فون: ۷۳۹۹۳

اِشاریہ

—— اور اب "فیض نمبر" پیشِ خدمت ہے!

زندہ و باکمال شخصیتوں کے اعترافِ عظمت کی جس نئی روایت کا آغاز افکار نے "جوش نمبر" سے کیا تھا وہ "فیض نمبر" تک آن پہونچی۔

افکار کو اس بات پر فخر ہے کہ اُس نے نامساعد حالات اور محدود وسائل کے باوجود اس صدی کی تین عہد آفریں شخصیتوں —— جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری اور فیض احمد فیض کی زندگی، شخصیت اور فن پر جامع و مستند خصوصی اشاعتیں پیش کرکے اردو زبان و ادب کی نئی تاریخ مرتب کی۔ یہی نہیں، اُس نے اِن عظیم فن کاروں کو اُن کے جیتے جی خراجِ تحسین ادا کرکے مُردہ پرستی کی روایت پر کاری ضرب لگائی، اور اُنہیں ناقدری کا شکار ہونے اور خصوصی اشاعتوں کے لئے موت کے انتظار کی زحمت سے بھی بچا لیا۔ اس بے نام سی کوشش کا ایک روشن و تابناک پہلو یہ بھی ہے کہ زندہ مشاہیرِ علم و ادب کی قدر دانی اور اعترافِ کمال کی رسم اب کسی نہ کسی عنوان چل پڑی ہے —— علاوہ ازیں یہ حقیقت بھی اردو اور پاکستان کے لئے کچھ کم باعثِ فخر و امتنان نہیں کہ "جوش نمبر"، "حفیظ نمبر" اور "فیض نمبر" سے قبل دُنیا کی کسی بھی زبان میں —— کسی بھی زندہ و باکمال شاعر پر اتنی عظیم و پُرشکوہ دستاویزی اشاعتیں شاید ہی کبھی پیش کی گئی ہوں۔ خدائے بزرگ و برتر کا شکر و احسان ہے کہ یہ تاریخ ساز اشاعتیں افکار کا مقدر ٹھہریں!

"فیض نمبر" سے افکار کی ادبی زندگی کا ۲۱ واں سفر شروع ہو رہا ہے۔ ۲۰ سال کی طویل و صبر آزما جدّ و جہد کی داستان سُنانے کا نہ یہ وقت ہے نہ حوصلہ —— بس یوں سمجھئے کہ ادبی جرائد کی ناقدری، نامساعد حالات، ادب دوستی اور علم پروری کا فقدان، وسائل کی

کی، حکومت اور کاروباری اداروں کی اردو زبان و ادب سے عدم دلچسپی وہ سُرخیاں ہیں جن سے یہ داستان عبارت ہے ـــــ پھر بھی کچھ سَر پھرے ادبی جنوں میں مبتلا ہیں، اور خونِ جگر سے ادب کے لالہ زاروں کی آبیاری کر رہے ہیں۔ چنانچہ "فیض نمبر" بھی جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے ـــ اسی ذوق و شوق، لگن اور سعی و جہد کا حاصل ہے جس کے بارے میں شاعرِ مشرق کا ارشاد قولِ فیصل کی حیثیت رکھتا ہے ع

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر!

سو خُونِ جگر صَرف ہُوا ـــــ اب یہ فیصلہ آپ کو کرنا ہے کہ "فیض نمبر" فیض صاحب کے شایانِ شان ہے یا نہیں۔ ویسے ہمارے لئے وہ لمحہ بے حد جاں گداز تھا جب کتابت شدہ مسودوں کو سمیٹنے کے بعد یہ علم ہوا کہ "فیض نمبر" ۵۰۰ کے بجائے تقریباً ۱۱۰۰ صفحات پر پھیل گیا ہے ـــــ ہمارے جیب و داماں کی وسعتیں اور وسائل کی انتہا معلوم ـــــ چنانچہ تمام تر کوششوں کے باوجود سارے کتابت شدہ مضامین نظم و نثر شاملِ "فیض نمبر" نہ ہو سکے جس کا ہمیں دلی افسوس ہے ـــــ پھر بھی یہ نمبر ۵۰۰ کے بجائے تقریباً ۸۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

"فیض نمبر" میں جیسا کہ آپ دیکھیں گے ـــــ ہم نے کچھ نئے تجربے کئے ہیں اور کوشش کی ہے کہ "جوش نمبر" اور "حفیظ نمبر" کی روایت کچھ اور آگے بڑھ سکے۔ چنانچہ مخصوص عنوان ـــ "روشنیوں کا شہر" کے تحت جو افسانے پیش کئے جا رہے ہیں وہ اپنی نوعیت کا پہلا تجربہ ہے، ان افسانوں میں فیض کی شخصیت اور شاعری نے زندہ کرداروں کا رُوپ دھار لیا ہے۔ کسی شاعر پر افسانے لکھوانے کا تجربہ بڑا کٹھن اور صبر آزما تھا ـــــ بارے ہم اُن رفیقوں کے احسانمند ہیں جنہوں نے ہمارے اس خیال کو نہ صرف پسند کیا بلکہ افسانے لکھ کر ہمارے تجربے کی لاج بھی رکھ لی۔ توقع ہے کہ آپ اِن افسانوں کو دلچسپی سے پڑھیں گے۔

فیض اور نئی نسل ـــــ اس نمبر کا ایک اور اہم حصہ ہے جس میں کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلباء و طالبات کے منتخبہ مضامین پیش کئے جا رہے ہیں۔ افکار پہلی بار نئی نسل سے ہونہار ادیبوں کی نمائندہ تحریریں "فیض نمبر" میں فخر کے ساتھ پیش کر رہا ہے ـــــ سچ پوچھئے تو اسی نسل پر زبان و ادب کے درخشاں مستقبل کا انحصار ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ "فیض نمبر" کی منفرد ترتیب و تدوین بھی آپ سے داد و ستائش لئے بغیر

نہ رہے گی۔ مجموعی طور پر اس نمبر کو ہم نے ۹ ابواب میں منقسم کیا ہے اور یہ التزام رکھا ہے کہ ہر عنوان "فیض نمبر" کے مضامین نظم و نثر سے معنوی طور پر ہم آہنگ رہے۔

جادۂ مضمون، گلشنِ دیدار، موضوعِ سخن، محبوبِ نظر، ذکریات، بارشِ سنگ، لوح و قلم، حرفِ سادہ اور روشنیوں کا شہر۔ یہ ہیں وہ عنوانات جو تمام تر کلامِ فیض کا عطیہ ہیں۔ اور ہر لحاظ سے مکمل اور بھرپور۔ ان عنوانات کے تحت نادر و یادگار تصاویر، نایاب اور غیر مطبوعہ تحقیقات، قلمی خطوط، شعراء کے نذرانے، انتخابِ کلام، شخصیت و فن پر خصوصی مضامین تذکرے اور تبصرے وغیرہ شامل ہیں۔

ابتداء میں مستند حالات کے ساتھ "فیض نامہ" بھی شامل ہے تاکہ آئندہ نسل ان حوالوں کی مدد سے فیض کی زندگی، شخصیت اور فن پر مزید کام کر سکے۔ اس سلسلے میں ہم ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن، انجمن ترقیٔ اردو کراچی، نیشنل لیاقت لائبریری کراچی، کے علاوہ شمیم حنفی (ریسرچ اسکالر الٰہ آباد یونیورسٹی) احمد رئیس (کراچی) احمد وحید اختر (لکچرر پشاور یونیورسٹی) اور صابر حسین (کراچی)، کے ممنون ہیں جن کے اشتراک و تعاون سے یہ کتابیات مرتب ہو سکی۔

ان حضرات کے علاوہ فیض صاحب اور وہ تمام افکار دوست اور اہلِ قلم بھی شکریے کے مستحق ہیں جن کی رفاقت و اعانت سے یہ دستاویزی نمبر مکمل ہو سکا۔ اس تاریخ ساز اشاعت کی مسرت میں وہ حضرات بھی شریک ہیں جن کے مضامین نظم و نثر کتابت کے باوجود ناگزیر حالات کے سبب شاملِ فیض نمبر نہ ہو سکے۔

"فیض نمبر" کے آغاز سے تکمیل کے آخری اور سخت مرحلے تک جن رفیقانِ افکار نے راتوں کو جاگ کر جس خلوص، محبت اور ایثار کا ثبوت دیا اور جس ترتیب اور حسنِ معیار کے ساتھ "فیض نمبر" آپ تک پہونچایا۔ اُس کے لئے یہ دونوں حضرات بھی دلی شکریے کے مستحق ہیں۔

— اور آخر میں ہمیں بس اتنا ہی اور کہنا ہے ؎

جتنا لہو تھا صرفِ قبا کر چکے ہیں ہم

صہبا
۱۴ ستمبر ۶۵ء

فیض احمد فیض

خامہ انگشت بدنداں

مکرمی صہبا صاحب،

"ہم کہاں کے دانا تھے، کس ہنر میں یکتا تھے"

یہاں غالب کا تو خیر مضمون واحد ہے لیکن ہمیں آسمان کی
بے سبب دشمنی کے بجائے دوستوں اور کرمفرماؤں کی
نوازشہائے بیجا کا گلہ ہے جس کی تازہ مثال
آپکے یکجا کردہ دفتر کی صورت میرے سامنے ہے۔
بعد پھر اسی پہ اکتفا نہیں آپ اس ستم ظریفی کی

داد کسی ممدوح سے چاہتے ہیں، ایسی افتاد میں بڑے لوگ
(یا چھوٹے لوگ) کبھی انکسار سے کام لیتے ہیں کبھی تعلّی
سے، ہم جیسے عام آدمی تو صرف خامہ انگشت بدنداں
اور ناطقہ سربگریباں ہی یا عذر پیش کر سکتے ہیں
گردہ پُستی سے انحراف تو خیر اچھی بات
ہے لیکن سچ پوچھئے تو ہمیں جیتے جاگتے چلتے انسانوں کے
بارے میں، ایسی طویل و عریض حاشیہ آرائی سے بہت تشفی
نہیں، اس لئے اوّل تو یہ شبہ ہوتا ہے کہ آپکو راستے میں
ممدوح جس قابل تھے کر چکے اس لئے انکے اعمال و کردار
کے پوسٹ مارٹم میں مزید تاخیر کیوں کی جائے،
دوم یہ شبہ ہوتا ہے کہ آپ عجلت اس لئے کر رہے ہیں کہ
کسی کے جیتے جی تو دوست احباب عزت ہی میں

کسی ایک آدھ کلمۂ خیر کہہ گزرتے لیکن بعد میں التفاتِ دل دوستاں رہے نہ رہے،

یہ سوءِ ظن تو محض سخن گسترانہ بات ہے ورنہ آپ کے خلوص اور حسن نیت پر کسی کافر کو شبہ ہوگا، اور آپ کی جہد و کاوش کے لئے شکر و سپاس سے احتراز کیسے ممکن ہے، حقیقت میں گلہ ہے تو یہ ہے آپ سے کہ عزیز دوستاں ہونے کے لئے کسبِ کمال میں جتنی سعی و تلاش لازم تھی میسر نہ آسکی یا شاید اس کا بھی کچھ اس قابل نہیں، بقول اقبال

طپیدن و نرسیدن چہ لذتے دارد
خوشا کسے کہ بدنبال محمل است ہنوز

فیض
۱۲/۴/۶۵ء

صہبا لکھنوی

فیض احمد فیض

زندگی، شخصیت اور فن کا مستند جائزہ

ہمارے دم سے ہے کوئے جنوں میں اب بھی خجل عبائے شیخ و قبائے امیر و تاج شہی
ہمیں سے سنت منصور و قیس زندہ ہے ہمیں سے باقی ہے گل دامنی و کج کلہی (فیض)

خاندانی نام ——— فیض احمد خاں	ادبی نام و تخلص — فیض احمد فیض
صحیح تاریخ و سن پیدائش: ۱۳ فروری ۱۹۱۱ء	بمقام ——— سیالکوٹ

فیض کی صحیح تاریخ و سنہ پیدائش کا اب تک کسی کو علم نہیں تھا۔ چنانچہ تذکروں میں بھی ہمیشہ غلط اندراجات ہوتے رہے۔ فیض نمبر کی تیاری کے دوران کافی تحقیق و تجسس کے بعد پہلی بار صحیح اور مستند تاریخ و سنہ پیدائش کا انکشاف ہوا۔ چنانچہ آئندہ رہبری اور حوالے کے لئے فیض کا عکس تحریر پیش کیا جا رہا ہے:

تاریخ پیدائش اسکول کے کاغذات میں ۷ جنوری سن ۱۹۱۱ء اور میٹرک ۷ جنوری ۱۹۱۲ء درج ہے۔ میں نے حال ہی میں ایک دوست سے فرمائش کی تھی کہ وہ سیالکوٹ کے دفتر بلدیہ سے پیدائش کے اندراجات کا ریکارڈ دیکھ کر صحیح تاریخ معلوم کرنے کی کوشش کریں۔ ان کی تحقیق کے مطابق بلدیہ کے کاغذات میں ۱۳ فروری ۱۹۱۱ء تاریخ پیدائش درج ہے۔

فیض احمد فیض
۱۶/۴/۶۵ء

آب و جد

قصبہ کالا قادر ضلع سیالکوٹ — فیض کے آباؤ اجداد کا مولد و مسکن ہے۔ بیشتر افراد خاندان زراعت پیشہ تھے۔ فیض کے والد چودھری سلطان محمد خان نے خاندانی پیشہ کو اپنانے کے بجائے عربی، فارسی اور انگریزی میں دستگاہ حاصل کی اور افغانستان کے ایک سرکاری وفد کی پیش کش پر اس کے ہمراہ کابل چلے گئے۔ جہاں امیر عبدالرحمٰن والیٔ افغانستان نے آپ کی غیر معمولی ذہانت، قابلیت اور صلاحیت کار سے متاثر ہو کر پہلے آپ کو افغان شہزادوں کا اتالیق مقرر کیا۔ پھر چیف سکریٹری کے اعلیٰ عہدے پر ترقی دی۔ اور بعد میں افغانستان کا سفیر کبیر مقرر کر کے آپ کو انگلستان بھیجا۔ جہاں آپ نے تین سال تک نہایت محنت اور خوش اسلوبی سے سفارتی فرائض انجام دیئے۔ لندن کے دوران قیام میں آپ نے بیرسٹری کا امتحان پاس کر لیا۔ یہیں آپ کی علامہ اقبال سے پہلی بار ملاقات ہوئی۔ تین سال کے بعد آپ افغانستان واپس آئے اور ایک وزیر زادی سے شادی کی۔ کچھ عرصہ بعد حکومتی سازشوں کا سلسلہ شروع ہوا — چنانچہ آپ بھی اس کی زد میں آ گئے۔ بدقت تمام اپنی جان بچا کر راتوں رات سرحد عبور کی۔ دوران سفر آپ کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ جوں توں سیالکوٹ پہنچے۔ بیرسٹر کی حیثیت سے نئی زندگی کا آغاز کیا، اور جلد ہی خدا نے آپ کو عزت، دولت اور شہرت سے نواز دیا۔ یہاں آپ نے دو شادیاں کیں، جن سے چار لڑکے اور پانچ لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ فیض کی والدہ کا نام سلطان فاطمہ ہے جو بفضل خدا بقید حیات ہیں۔ فیض کے والد کا ۱۹۳۱ء میں سیالکوٹ میں ہی انتقال ہوا۔

وراثت شعر و ادب

فیض کے والد چودھری سلطان محمد خان سیالکوٹ کے نامی گرامی اور ذی حیثیت بیرسٹروں میں تھے۔ علم و ادب سے آپ کو بچپن سے لگاؤ تھا۔ علامہ اقبال، سر عبدالقادر، ڈاکٹر ضیاءالدین، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، حبیب الرحمٰن شیروانی، علامہ سید سلیمان ندوی اور دیگر ممتاز علمی و ادبی شخصیتوں سے آپ کے ذاتی مراسم اور خصوصی روابط تھے، اور آپ کا بیشتر وقت ان حضرات کی صحبتوں اور محفلوں میں گذرتا تھا۔ علی گڑھ یونیورسٹی کورٹ کے ممبر، انجمن اسلامیہ سیالکوٹ کے صدر اور انجمن حمایت الاسلام کی مجلس انتظامیہ کے ایک سرکردہ رکن کی حیثیت سے آپ نے گراں مایہ علمی و تعلیمی خدمات انجام دیں۔ آپ کی مشہور تصانیف میں امیر عبدالرحمٰن کی سوانح عمری (انگریزی میں) اور افغانستان کے دستوری قوانین بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ فیض نے جس وقت سیالکوٹ کی ادب خیز سرزمین پر آنکھ کھولی، اس وقت ان کے والد کا ستارہ عروج پر تھا۔ گھر میں علم و ادب کے چرچے تھے، اور ارد گرد صاحبان کمال کا اجتماع تھا۔ چنانچہ فیض کی ذہنی اور فکری تربیت میں اس ماحول نے بھی نمایاں حصہ لیا جس کے باعث حصول علم اور مطالعہ کا ذوق ان میں بچپن سے ہی پیدا ہو گیا

پہلا شعر

۱۹۲۰ء میں مرے کالج سیالکوٹ کی ادبی تنظیم "اخوان الصفا" کے پہلے طرحی مشاعرہ کے لئے فیض نے جو غزل کہی اس کا پہلا شعر یہ تھا ؎

لب بند ہیں ساقی، مری آنکھوں کو پلا دے
وہ جام جو منت کش صہبا نہیں ہوتا

یہ شعر بے حد مقبول ہوا، اور اسی مشاعرے سے فیض کی ادبی شہرت کا آغاز ہوا۔

فیض اور بھائی بہن

۱ - حاجی طفیل احمد
۲ - فیض احمد فیض
۳ - میجر عنایت احمد
۴ - بشیر احمد
۵ - بیگم شجاع الدین
۶ - بیگم حمید
۷ بیگم نجیب اللہ خاں
۸ بیگم اعظم علی
۹ رشیدہ سلطانہ

دو بھائی — حاجی طفیل احمد اور بشیر احمد — اور تین بہنیں — بیگم نجیب اللہ خاں، بیگم اعظم علی اور رشیدہ سلطانہ فوت ہو چکی ہیں۔

ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم

۱۹۱۵ء میں چار برس کی عمر میں حفظ قرآن سے تعلیم کا آغاز ہوا۔

۱۹۱۶ء میں مولوی ابراہیم میر سیالکوٹی کے مشہور مکتب میں داخل ہوئے، اور اردو، فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی۔

۱۹۲۱ء میں سیالکوٹ کے اسکاچ مشن ہائی اسکول کی چوتھی جماعت میں داخل ہوئے اور ابتدائی درجات امتیاز کے ساتھ پاس کئے۔

۱۹۲۷ء میں فرسٹ ڈویژن میں میٹرک پاس کیا۔

۱۹۲۹ء میں مرے کالج آف سیالکوٹ سے فرسٹ ڈویژن میں انٹرمیڈیٹ پاس کیا۔ اسی دوران میں علامہ اقبالؒ کے استاد شمس العلماء مولوی سید میر حسن سے فارسی اور عربی میں دستگاہ بھی حاصل کی۔

۱۹۳۱ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے اور عربی میں بی اے (آنرز) کے امتحانات پاس کئے۔

۱۹۳۳ء میں گورنمنٹ کالج سے انگریزی میں ایم اے کیا۔

۱۹۳۴ء میں اورینٹل کالج لاہور سے عربی میں ایم اے کیا اور فرسٹ ڈویژن حاصل کی۔

ملازمت

۱۹۳۵ء میں ایم، اے، او کالج امرتسر میں انگریزی کے لیکچرر کی حیثیت سے ملازمت کا آغاز کیا۔

۱۹۴۰ء میں ہیلی کالج آف کامرس میں انگریزی کے لیکچرر مقرر ہوئے۔

۱۹۴۲ء میں بحیثیت کیپٹن فوج میں ملازم ہوئے اور لاہور سے دہلی منتقل ہو کر شعبۂ تعلقات عامہ میں خدمات انجام دیں۔

پہلی نظم

جس کا عنوان "میرے معصوم قاتل" تھا۔ پہلی بار سنہ ۱۹۲۹ء میں گورنمنٹ کالج لاہور کے مشہور رسالے "راوی" میں شائع ہوئی تھی۔ یہ نظم نایاب ہے

۱۹۴۳ء میں میجر اور ۴۴ء میں لفٹننٹ کرنل کے عہدے پر ترقی مل گئی۔

۱۹۴۷ء پہلی جنوری کو فوجی ملازمت سے استعفیٰ دے کر لاہور واپس آگئے۔

۱۹۵۹ء میں پاکستان آرٹ کونسل لاہور کے سکریٹری مقرر ہوئے اور جولائی ۶۲ء تک خدمات انجام دیں۔

۱۹۶۴ء میں لندن سے پاکستان واپس آکر کراچی میں مستقلاً رہائش اختیار کرلی اور یکم اپریل سے عبداللہ ہارون کالج کراچی کے پرنسپل ڈگری کی حیثیت سے فرائض انجام دے رہے ہیں

ادارت

۱۹۳۸-۳۹ء ماہنامہ "ادب لطیف" لاہور کی ادارت کے فرائض انجام دیئے۔

۱۹۴۷-۵۸ء ۴ر فروری سے پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کے تحت شائع ہونے والے مشہور جرائد روزنامہ پاکستان ٹائمز، روزنامہ امروز اور ہفت روزہ لیل و نہار کے مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔

شادی اور بچے

۱۹۴۱ء میں لندن نژاد خاتون مس ایلس جارج سے (جو بیگم تاثیر کی حقیقی بہن ہیں) اسلامی شرع کے مطابق عقد نکاح ہوا۔ شیخ کشمیر شیخ عبداللہ نے نکاح پڑھایا۔ ایلس جارج اہل دنیا میں ایلس فیض کے نام سے مشہور ہیں۔ فیض کی والدہ نے اپنی چہیتی بہو کا اسلامی نام "کلثوم" رکھا ہے۔

۱۹۴۲ء میں پہلی بیٹی سلیمہ اور

۱۹۴۵ء میں دوسری بیٹی منیزہ پیدا ہوئی۔

قید و بند

۱۹۵۱ء ۹ر مارچ کو پہلی بار سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار ہوئے، اور راولپنڈی سازش کے الزام میں چار سال ایک ماہ گیارہ دن تک سرگودھا، منٹگمری، حیدرآباد، کراچی اور لاہور کی جیلوں میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد ۲۰ر اپریل ۱۹۵۵ء کو رہا ہوئے۔

۱۹۵۸ء دسمبر میں دوسری بار سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار ہوئے اور اپریل ۱۹۵۹ء میں رہائی ملی۔

خطابات و اعزازات

۱۹۴۶ء میں فوجی ملازمت کے دوران۔ ایم۔ بی۔ ای کا خطاب ملا۔

۱۹۶۲ء میں دنیا کا مشہور ترین لینن امن انعام حاصل کیا جس سے نہ صرف فیض کی بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی بلکہ پاکستان اور اردو زبان و ادب کا وقار بھی بڑھ گیا۔

تلمذ سخن

شعر و سخن کے سلسلے میں فیض نے کسی سے اصلاح نہیں لی اور نہ باقاعدہ کسی کی شاگردی اختیار کی۔ ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ میں نے اپنے ذوق و وجدان کو رہبر اور خود تنقیدی و خود احتسابی کو شعار بنا کر ہمیشہ اپنے کلام پر نظر ثانی کی۔ اس کے علاوہ چند مخلص اور قریبی احباب سے جن میں ایم۔ ڈی۔ تاثیر، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، مولانا چراغ حسن حسرت، پطرس بخاری، اور کرنل مجید ملک بطور خاص قابل ذکر ہیں، مشورے کرتا رہا۔

پہلا شعری مجموعہ

نقش فریادی

۱۹۴۱ء میں شائع ہوا

پہلا نثری مجموعہ

میزان

۱۹۶۲ء میں شائع ہوا

معنوی اساتذہ

○ طرفہ ○ امراء القیس ○ عمر بن ربیعہ ○ حماسہ کے شعراء ○ حافظ ○ سودا ○ میر ○ غالب ○ انیس ○ نظیر اکبرآبادی ○ اقبال ○ حسرت موہانی ○ شیکسپیر ○ شیلے ○ براؤننگ ، اور ○ کیٹس ۔

علم و مطالعہ

ذوقِ علم اور ذوقِ مطالعہ — فیض کو ورثے میں ملا ہے — زمانۂ طالب علمی سے ملازمت یا ایام اسیری تک اور سفر و سیاحت سے پرنسپل کے دور تک انہوں نے ادب ، فلسفہ ، نفسیات ، سیاسیات ، تاریخ ، مذہب ، سائنس ، غرض کہ ہر موضوع پر وسیع مطالعہ کیا ہے ۔ فکری طور پر جن عظیم شخصیتوں کی عظیم تحریکات و تخلیقات سے وہ متاثر ہوئے یا اُن سے استفادہ کیا ، ان میں سے چند یہ ہیں :— سرسید ۔ حالی ۔ گوئٹے ۔ دانتے ۔ ملٹن ۔ طالستائی ۔ برنارڈ شا ۔ سقراط ۔ افلاطون ۔ ارسطو ۔ کانٹ ۔ ہیگل ۔ مارکس ۔ برگساں ۔ نٹشے ۔ شوپنہار ۔ ہیوم ۔ آئن اسٹائن ۔ فرائڈ ۔ ڈارون ۔ جیمس جین ۔ کالی داس ۔ سورداس ۔ بھگت تلسی داس ۔ کبیر داس ۔ ملک محمد جائسی ۔ رحیم خانخاناں ۔ فرنز روز نبرگ ۔ ہیولاک ایلس وغیرہ ۔

سیاحت و سفر

برصغیر کے تمام قابل ذکر شہروں کے علاوہ فیض نے سنہ ۴۸ء اور سنہ ۴۹ء میں سان فرانسسکو اور جینوا ، سنہ ۵۸ء میں تاشقند اور جولائی ۶۲ء سے جنوری ۶۴ء تک انگلستان اور روس کے تمام علاقوں کے علاوہ سیلون ، کیوبا ، الجیریا ، مصر ، لبنان ، ہنگری اور کئی یورپی ملکوں کا وسیع پیمانے پر سفر کیا ۔ اور متعدد کانفرنسوں میں حصہ لیا ۔ ۶۲ء اور ۶۴ء کے دوران اُن کا بیشتر قیام لندن میں رہا ۔

ادبی و سماجی خدمات

سنہ ۱۹۳۶ء میں سجاد ظہیر اور صاحبزادہ محمود الظفر کی تحریک پر لاہور میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام میں نمایاں حصہ لیا ۔ فیض کی ذاتی دلچسپی اور عملی مساعی سے پنجاب میں انجمن ترقی پسند مصنفین بہت جلد ایک عوامی ادبی تحریک کی صورت میں پھیل گئی ۔ قیام پاکستان کے بعد فیض نے مزدور تحریک میں بھی سرگرمی سے حصہ لیا ۔ ٹریڈ یونین فیڈریشن کے نائب صدر اور مزدوروں کے نمائندے کی حیثیت سے انہوں نے آئی ۔ ایل ۔ او کے اجلاس منعقدہ سان فرانسسکو اور جینوا میں بھی شرکت کی ۔

فیض عموماً کم سخن اور خاموش طبع مشہور ہیں لیکن اس حقیقت کا بہت کم لوگوں کو علم ہوگا کہ آزادیٔ تحریر و تقریر اور بنیادی حقوق کے تحفظ میں انہوں نے ہمیشہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور کبھی کسی طاقت سے مرعوب نہیں ہوئے ۔ اس حق گوئی و بے باکی کی خاطر اگرچہ انہیں قید و بند کی صعوبتوں سے بھی دوچار ہونا پڑا ، لیکن وہ کبھی حرفِ حق سے منحرف نہیں ہوئے ۔ عمل و کردار کی یہ صداقت و یکسانیت بہت کم شخصیتوں کا مقدر بن سکی ہے ۔

فیض پر انگریزی میں پہلی کتاب

پوئمس بائی فیض

انتخاب و ترجمہ

وی ۔ جی ۔ کیرنن

(سنہ ۱۹۵۷ء)

دو یادگار انتسابات

"دستِ صبا" — "کلثوم" کے نام

"میزان" — پطرس ، تاثیر ، حسرت محمود اور رشید جہاں کی یاد میں ۔

فیض بحیثیت ڈرامہ نگار

۳۸ - ۱۹۳۹ء کے دوران فیض نے ریڈیو کے لئے کئی کامیاب ڈرامے لکھے جو لاہور سے نشر ہو کر کافی مقبول ہوئے ان ڈراموں میں ـــ توہینِ عدالت، پرائیوٹ سکریٹری، سانپ کی چھتری، تماشا مرے آگے، خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ صرف ایک ڈرامہ "پرائیوٹ سکریٹری" "ادبِ لطیف" لاہور میں شائع ہوا ہے ـــ باقی غیر مطبوعہ ہیں لیکن خود فیض کے پاس ان ڈراموں کے مسودے موجود نہیں

فیض فلمی دنیا میں

فیض نے اب تک صرف دو فلموں کے گانے اور مکالے لکھے ہیں۔ پہلی فلم "جاگو ہوا سویرا" تھی جو ۱۹۵۹ء میں نمائش کے لئے پیش کی گئی۔ اس فلم پر بین الاقوامی اعزاز بھی مل چکا ہے۔ دوسری فلم "دور ہے سکھ کا گاؤں" زیرِ تکمیل ہے۔

فیض کی بین الاقوامی حیثیت

فیض کا کلام پاکستان، بھارت اور دنیا کی تمام ترقی یافتہ زبانوں میں منتقل ہو چکا ہے۔ وہ اس عہد کے مقبول ترین شاعر ہیں۔ ان کا سرمایۂ شعری اگرچہ مختصر ہے لیکن ان کے کلام کی انفرادیت، ہمہ گیر مقبولیت اور ادبی عظمت اس حقیقت کی غماز ہے کہ شاعری صرف تعدادِ اشعار یا مجموعہ ہائے کلام کی کثرت پر مبنی نہیں۔ لب و لہجہ کی انفرادیت، موضوعات کے تنوع اور احساس کی عمومیت کی رہینِ منت ہے۔

فیض کی تصانیف

		سنہ اشاعت	
۱	نقشِ فریادی		۱۹۴۱ء
۲	دستِ صبا	"	۱۹۵۳ء
۳	زنداں نامہ	"	۱۹۵۶ء
۴	دستِ تہِ سنگ	"	۱۹۶۵ء
۵	میزان (مجموعۂ مضامین)	"	۱۹۶۲ء

دستِ تہِ سنگ کو چھوڑ کر فیض کے تینوں شعری مجموعوں کے اب تک کئی کئی ایڈیشن شائع ہو کر عوام و خواص میں مقبول ہو چکے ہیں

زیرِ ترتیب :- اردو شاعری کا انتخاب ○ پاکستانی کلچر (اردو اور انگریزی میں) ○ اقبال کی شاعری۔

فیض کی چند پسندیدہ تخلیقات

فیض کو اپنے شعری سرمائے میں سے جو تخلیقات بہت زیادہ پسند ہیں ـــ اُن کی تفصیل یہ ہے :-

(۱) نقشِ فریادی :

○ مجھ سے پہلی سی محبت ○ تنہائی ○ چند روز اور مری جان ○ موضوعِ سخن ○ ہم لوگ

(۲) دستِ صبا :

○ متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے ○ شفق کی راکھ میں جل بجھ گیا ستارۂ شام ○ دو آوازیں ○ دو عشق ○ ایرانی طلبہ کے نام ○ زنداں کی ایک شام ○ زنداں کی ایک صبح ..

(۳) زنداں نامہ :

ملاقات ○ ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے ○ دریچہ ○ آجاؤ افریقا۔

(۴) دستِ تہِ سنگ :- شام ○ ملاقات مری ○ ختم ہوئی بارشِ سنگ ○ کہاں جاؤ گے ○ پاس رہو۔

فیض پر تحقیق

روس کی لومبا یونیورسٹی اور چیکوسلواکیہ میں فیض کے فن پر طلبا تحقیقاتی کام کر رہے ہیں۔

فیض نامہ

فیض احمد فیض کی زندگی شخصیت اور فن پر شائع شدہ اہم تذکروں تبصروں اور مضامین کی تفصیلی کتابیات :

کتابیں

نمبر شمار	مصنف	تصنیف	ناشر یا ملنے کا پتہ	اشاعت
۱	پروفیسر آل احمد سرور	تنقیدی اشارے	اردو اکیڈمی سندھ، کراچی	۱۹۴۲ء
۲	پروفیسر اختر انصاری دہلوی	ایک ادبی ڈائری	ایم ثناء اللہ خاں - لاہور	۱۹۴۴ء
۳	پروفیسر فراق گورکھپوری	اردو کی عشقیہ شاعری	سنگم پبلشنگ ہاؤس، الہ آباد	۱۹۴۵ء
۴	پروفیسر آل احمد سرور	نئے پرانے چراغ	اردو اکیڈمی سندھ، کراچی	۱۹۴۶ء
۵	پروفیسر احتشام حسین	روایت اور بغاوت	ادارۂ اشاعت اردو، حیدرآباد دکن	۱۹۴۷ء
۶	کرشن پرشاد کول	نیا ادب	انجمن ترقی اردو پاکستان - کراچی	۱۹۴۹ء
۷	سردار جعفری	ترقی پسند ادب	انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ	۱۹۵۱ء
۸	پروفیسر احتشام حسین	تنقیدی جائزے	الہ آباد پبلشنگ ہاؤس، الہ آباد	۱۹۵۱ء
۹	〃 〃 〃	تنقید اور عملی تنقید	ادارۂ فروغ اردو - لکھنؤ	۱۹۵۲ء
۱۰	غلام حسین ایم۔اے	مختصر تاریخ زبان اردو	شاہ اینڈ کمپنی، کراچی	۱۹۵۲ء
۱۱	اصغر حسین خاں نظیر لدھیانوی	مختصر تاریخ ادب اردو	عشرت پبلشنگ ہاؤس - لاہور	۱۹۵۳ء
۱۲	سجاد ظہیر	روشنائی	آزاد کتاب گھر - دہلی	۱۹۵۴ء
۱۳	پروفیسر رشید احمد صدیقی	جدید غزل	سلسلۂ خطبات افتتاحیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۱۹۵۵ء
۱۴	ڈاکٹر عبادت بریلوی	روایت کی اہمیت	انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی	۱۹۵۶ء
۱۵	ڈاکٹر اعجاز حسین	مختصر تاریخ ادب اردو	اردو اکیڈمی سندھ کراچی	۱۹۵۶ء
۱۶	آغا شیدا کاشمیری	میزان شعر	عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور	۱۹۵۶ء
۱۷	ڈاکٹر عبدالوحید	جدید شعرائے اردو	فیروز سنز، لاہور	۱۹۵۸ء

۱۸	ڈاکٹر عبادت بریلوی	تنقیدی تجربے	اردو دنیا۔ کراچی	۱۹۵۹ء
۱۹	مجتبیٰ حسین	تہذیب و تحریر	مکتبۂ افکار۔ کراچی	۱۹۵۹ء
۲۰	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	اردو شاعری میں تجربے اور روایت	اردو اکیڈیمی سندھ۔ کراچی	۱۹۶۰ء
۲۱	ڈاکٹر اعجاز حسین	اردو ادب آزادی کے بعد	کارواں پبلشرز۔ الہ آباد	۱۹۶۰ء
۲۲	پروفیسر مجنوں گورکھپوری	شعر اور غزل	ادبی اکیڈیمی۔ کراچی	۱۹۶۱ء
۲۳	ڈاکٹر عبادت بریلوی	جدید شاعری	اردو دنیا۔ کراچی	۱۹۶۱ء
۲۴	پروفیسر عبدالقادر سروری	جدید اردو شاعری	شیخ غلام علی اینڈ سنز۔ لاہور	۱۹۶۲ء
۲۵	ممتاز حسین	ادب و شعور	اردو اکیڈیمی، سندھ۔ کراچی	۱۹۶۲ء
۲۶	نظیر صدیقی	تاثرات و تعصبات	پاک کتاب گھر۔ ڈھاکہ	۱۹۶۲ء
۲۷	فیض الرحمٰن اعظمی	افکار نو	اردو مرکز۔ دہلی	۱۹۶۲ء
۲۸	عبدالحمید راشد	غزل کا سروپ	دارالادب۔ بہاول پور	۱۹۶۲ء
۲۹	پروفیسر کلیم الدین احمد	عملی تنقید	کتاب منزل۔ پٹنہ	۱۹۶۳ء
۳۰	سید ابوالخیر کشفی	جدید ادب کے دو تنقیدی جائزے	اردو اکیڈیمی سندھ۔ کراچی	۱۹۶۳ء
۳۱	ڈاکٹر وزیر آغا	نظم جدید کی کروٹیں	ادبی دنیا، لاہور	۱۹۶۳ء
۳۲	ادارہ	شاہراہ امن پر	ادارۂ ادبیات مشرق، ماسکو	۱۹۶۳ء
۳۳	ڈاکٹر سلام سندیلوی	ادبی اشارے	عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور	۱۹۶۴ء

رسالے

نمبر شمار	مصنف	عنوان مضمون	رسالہ	اشاعت
۱	عباس حمید عبداللہ	فیض احمد فیض	آجکل، دہلی	۱۵ر جولائی ۱۹۴۵ء
۲	جلال الدین احمد	نقش فریادی پر ایک نظر	نقوش، لاہور	شمارہ : ۲۳-۲۴
۳	پروفیسر آل احمد سرور	دست صبا	اردو ادب، علی گڑھ	جولائی تا دسمبر ۱۹۵۲ء
۴	مجتبیٰ حسین	بہ ذوق نغمہ کمیابی	افکار، کراچی	افسانہ نمبر ۱۹۵۳ء
۵	ڈاکٹر عبادت بریلوی	دست صبا اور فیض	افکار، کراچی	سالنامہ ۱۹۵۴ء
۶	پروفیسر رکن الدین حسان (عثمانیہ)	فیض کا شاعرانہ مزاج	مشرب، کراچی	جنوری ۱۹۵۴ء
۷	دیویندر ستیارتھی	فیض کی شاعری	شاہراہ، دہلی	اپریل ۱۹۵۴ء

	صہبا لکھنوی	افکار فیض نمبر		فیض احمد فیض
۸	اے حمید ناز	فیض کے ذہنی ارتقا کے چند پہلو	امروز، لاہور	استقلال نمبر ۱۹۵۴ء
۹	سید ابو الخیر کشفی	اسد ادب کے دس سال	افکار، کراچی	دس سالہ نمبر ۱۹۵۵ء
۱۰	ایلس فیض	فیض احمد فیض	نقوش، لاہور	شخصیات نمبر ۱۹۵۵ء
۱۱	ابو الفضل سید محمود قادری	فیض کا شعور	نظام ادب، حیدرآباد دکن	۱۹۵۵ء
۱۲	فرمان فتحپوری	فیض کا ذہنی اور فنی ارتقاء	افکار، کراچی	جنوری ۱۹۵۶ء
۱۳	اقبال مہدی	فیض — ایک عظیم فن کار	سٹی کالج میگزین حیدرآباد دکن	فروری ۱۹۵۶ء
۱۴	عابد علی عابد	زنداں نامہ پر ایک نظر	صادق، لاہور	اپریل ۱۹۵۶ء
۱۵	محمودہ جمال	کچھ فیض کے بارے میں	شاعر، بمبئی	جنوری ۱۹۵۷ء
۱۶	شمس کنول	فیض سے ایک انٹرویو	فن کار، بمبئی	فروری ۱۹۵۷ء
۱۷	اثر لکھنوی	زنداں نامہ کا سرسری جائزہ	علی گڑھ اردو میگزین، علی گڑھ	۱۹۵۷ء
۱۸	شمیم کرہانی	سفینۂ غزل اور فیض	صبا، حیدرآباد دکن	شمارہ: ۸-۹-۵۷ء
۱۹	انجم اعظمی	فیض کی ایک نظم	افکار، کراچی	نومبر ۱۹۵۷ء
۲۰	نامی انصاری	زنداں نامہ، ایک مطالعہ	شاعر، بمبئی	جنوری ۱۹۵۸ء
۲۱	شہاب جعفری	فیض زباں دانوں کی نظر میں	قند، مردان	اشاعت خاص ۱۹۵۸ء
۲۲	رشید حسن خاں	فیض کی شاعری پر ایک نظر	ادیب، علی گڑھ	مئی ۱۹۵۸ء
۲۳	وحید الدین خاں متین	فیض اور دست صبا	ادیب، علی گڑھ	دسمبر ۱۹۵۸ء
۲۴	حمید اختر	فیض احمد فیض	جلترنگ، لاہور	۱۹۵۹ء
۲۵	صہبا لکھنوی	فیض احمد فیض	افکار، کراچی	افسانہ نمبر ۱۹۵۹ء
۲۶	اثر لکھنوی	بسیار سفر باید.....	قند، مردان	مئی، جون ۱۹۵۹ء
۲۷	سہیل بخاری	فیض کے کلام میں جمود	کامران، سرگودھا	اگست، ستمبر ۱۹۶۰ء
۲۸	رشید حسن خاں	فیض کی شاعری	آجکل، دہلی	ستمبر ۱۹۶۰ء
۲۹	ابو الاعجاز حفیظ صدیقی	فیض اور حافظ	ادب لطیف، لاہور	اپریل ۱۹۶۱ء
۳۰	الطاف حسن قریشی	انتخاب کلام فیض	اردو ڈائجسٹ، لاہور	جولائی ۱۹۶۱ء
۳۱	ممتاز حسین	فیض ـ شاعر امن	مارننگ نیوز کراچی	جولائی ۱۹۶۲ء
۳۲	"	"	فارن لٹریچر، ماسکو	۱۹۶۲ء
۳۳	ظ۔ انصاری	فیض کی شاعری	لیترا تورنایا گزیتا۔ ماسکو	ادبی اخبار ۱۹۶۲ء
۳۴	مظفر علی سید	فیض کی میزان	نصرت، لاہور	اگست ۱۹۶۲ء
۳۵	تاجور سامری	فیض کی شاعری پر ایک نظر	جوار بھاٹا، دہلی	ستمبر ۱۹۶۲ء

۳۶	سجاد باقر رضوی	'میزان' پر تنقید و تبصرہ	نگار پاکستان، کراچی	نومبر ۱۹۶۲ء
۳۷	قاری	دو آٹوگراف اور ایک خط	تلاش، دہلی	فروری ۱۹۶۳ء
۳۸	صدیق کلیم	فیض کی شاعری — ایک تجزیہ	لیل و نہار، لاہور	۱۴ اپریل ۱۹۶۳ء
۳۹	سجاد ظہیر	اردو شاعری کے چند مسئلے	عوامی دور، دہلی	اپریل ۱۹۶۳ء
۴۰	سید ہاشمی کیفو	فیض کی شاعری	ساقی، کراچی	مئی ۱۹۶۳ء
۴۱	ظہیر صدیقی	فیض کی نظریاتی شاعری	شاعر، بمبئی	جولائی ۱۹۶۳ء
۴۲	محتسب	بازپرس	تحریک، دہلی	ستمبر ۱۹۶۳ء
۴۳	ظ، انصاری	شامِ انتظار کا تنہا شاعر	صبا، حیدرآباد دکن	نومبر ۱۹۶۳ء
۴۴	اویس احمد دوراں	جدید نظم نگاری میں ہیئتی تجربے	شاعر، بمبئی	دسمبر ۱۹۶۳ء
۴۵	عرش صدیقی	فیض کی شاعری میں رومانی عناصر	ادبی دنیا، لاہور	شمارہ ۱۱، ۱۹۶۳ء
۴۶	فتح محمد ملک	نئی شاعری اور جدید شاعری	فنون، لاہور	شمارہ ۲، ۱۹۶۳ء *
۴۷	انور محمود خالد	فیض احمد فیض کی شاعری	کریسنٹ مجلہ اسلامیہ کالج لاہور	جنوری ۱۹۶۴ء
۴۸	ستر اعظمی ہاشمی	فیض اور راشد (تقابلی مطالعہ)	کتاب، لکھنؤ	فروری ۱۹۶۴ء
۴۹	الطاف حسن قریشی	فیض سے انٹرویو	اردو ڈائجسٹ، لاہور	اپریل ۱۹۶۴ء
۵۰	جمیل الرحمٰن زخمی	اردو شاعری کے جدید میلانات	شاعر، بمبئی	اپریل، مئی ۱۹۶۴ء
۵۱	منیر فاروقی	فیض کا تصورِ محبوب	فکر و خیال، کراچی	مئی، جون ۱۹۶۴ء
۵۲	عرش صدیقی	فیض اور جدید شاعری	خیابان مجلہ پشاور یونیورسٹی	خاص نمبر ۱۹۶۴ء

نقشِ فریادی

۴۱ء میں 'نقشِ فریادی' کی اشاعت سے فیض کی ادبی عظمت اور جدید شعری ادب کی نئی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ اس مجموعہ کی اشاعت کے فوراً بعد سلام مچھلی شہری نے ذیل کی نظم لکھ کر فیض کو خراجِ تحسین ادا کیا تھا۔ یہ غیر مطبوعہ نظم پہلی بار شائع ہو رہی ہے

'نقشِ فریادی' کا مجموعۂ دلکش اور میں
شجرِ ماہ کی شاخوں کے تلے محوِ خیال
زندگی گیت ہے ان گیتوں میں کچھ درد بھی ہے
درد کو گیت سمجھ لوں تو میں گاؤں کیسے
چاندنی رات میں رقصندہ ہیں نازک اجسام

سوچتا ہوں انہیں سینے سے لگاؤں کیسے
گیت ٹوٹے ہوئے بربط پہ سناؤں کیسے
دیکھوں تاریکیٔ غم میں کوئی لے ہو شاید
اے شبِ ماہ کے جلوو! میں ابھی آتا ہوں!

(۱۹۴۱ء) ۵ سلام مچھلی شہری ،

جانِ مضموں

جانِ مضموں ہے یہی شاہدِ معنی ہے یہی

فیض احمد فیض

آج کے نام
اور آج کے غم کے نام

کلرکوں کی افسردہ جانوں کے نام
کِرم خوردہ دلوں اور زبانوں کے نام
پوسٹ مینوں کے نام
تانگے والوں کے نام
ریل بانوں کے نام
کارخانوں کے بھوکے جیالوں کے نام
بادشاہ جہاں، والیٔ ماسوا، نائب اللہ فی الارض،
دہقاں کے نام
جس کے ڈھوروں کو ظالم ہنکا لے گئے ہیں،
جس کی بیٹی کو ڈاکو اٹھا لے گئے ہیں،
ہاتھ بھر کھیت سے ایک انگشت پٹوار نے کاٹ لی ہے

فیض احمد فیض

سرکار نے کاٹ لی ہے
دوسری مالیے کے بہانے سے سرکار نے کاٹ لی ہے
جن کی پگ زور والوں کے پاؤں تلے
دھجیاں ہو گئی ہے

ان دکھی ماؤں کے نام
رات میں جن کے بچے بلکتے ہیں اور
نیند کی مار کھائے ہوئے بازوؤں سے سنبھلتے نہیں
دکھ بتاتے نہیں
منتوں زاریوں سے بہلتے نہیں

ان حسیناؤں کے نام
جن کی آنکھوں کے گل
چلمنوں اور دریچوں کی بیلوں پہ بیکار کھل کھل کے
مرجھا گئے ہیں

اُن بیاہتاؤں کے نام
جنکے بدن بے محبت ریاکار سیجوں پہ سج سج کے
اُکتا گئے ہیں

بیواؤں کے نام

کٹڑیوں اور گلیوں محلوں کے نام،
جنکی ناپاک خاشاک سے چاند راتوں
کو آ آ کے کرتا ہے اکثر وضو
جنکی غاروں میں کرتی ہے آہ و بکا
آنچلوں کی حنا
چوڑیوں کی کھنک
کاکلوں کی مہک
آرزومند سینوں کی اپنے پسینے میں جلنے کی بُو،

طالبعلموں کے نام
وہ جو اصحاب طبل و علم
کے دروں پر کتاب اور قلم

کا تقاضا لیے، ہاتھ پھیلائے

پہنچے، مگر لوٹ کر گھر نہ آئے

وہ معصوم جو بھولپن میں

وہاں اپنے ننھے چراغوں میں لو کی لگن

لے کے پہنچے، جہاں

بٹ رہے تھے، گھٹا ٹوپ، بے انت راتوں کے سائے

اُن اسیروں کے نام

جن کے سینوں میں فردا کے شب تاب گوہر

جیل خانوں کی شوریدہ راتوں کی صرصر میں

جل جل کے انجم نما ہو گئے ہیں

آنے والے دنوں کے سفیروں کے نام

وہ جو خوشبوئے گل کی طرح

اپنے پیغام پر خود فدا ہو گئے ہیں

فیض

یتیم لہو

کہیں نہیں ہے کہیں بھی نہیں لہو کا سراغ
نہ دست و ناخنِ قاتل نہ آستیں پہ نشاں
نہ سرخیِ لبِ خنجر نہ رنگِ نوکِ سناں
نہ خاک پر کوئی دھبہ نہ بام پر کوئی داغ
کہیں نہیں ہے کہیں بھی نہیں لہو کا سراغ
نہ صرفِ خدمتِ شاہاں کہ خوں بہا دیتے
نہ دیں کی نذر کہ بیعانۂ جزا دیتے
نہ رزم گاہ میں برسا کہ معتبر ہوتا
کسی علم پہ رقم ہو کے مشتہر ہوتا
پکارتا رہا بے آسرا یتیم لہو
کسی کے پاس سماعت کا وقت تھا نہ دماغ
نہ مدعی نہ شہادت حساب پاک ہوا
یہ خونِ خاک نشیناں تھا رزقِ خاک ہوا
کہیں نہیں ہے کہیں بھی نہیں لہو کا سراغ

(اپریل ۱۹۶۰ء)

فیض

سہرا

فیض اور سہرا — جی ہاں! بات کچھ عجیب سی ہے۔ لیکن اس حقیقت سے کیسے انکار ممکن ہے کہ غالباً [illegible] فیض نے بھی سہرا لکھنے کی رسم [illegible] ہے اور اس میں بھی ان کا منفرد اسلوب نمایاں ہے۔ اس سہرے کے مخاطب طاہر [illegible] (جو فیض کے [illegible] رہے [illegible] فوراً بعد آرٹس کونسل لاہور کے سکریٹری مقرر ہوئے) اور یہ سہرا [illegible] ان کی تقریب شادی ۲۴ مارچ ۱۹۶۲ء کو لاہور میں منعقد ہوئی۔ مقطع میں جو سخن [illegible] ہے اس کی تمام تر ذمہ داری فیض کے سر ہے [illegible] یا طاہر [illegible] — یہ غیر مطبوعہ سہرا بلاشبہ [illegible] کی چیز ہے جسے افکار نے دریافت کر کے فیض نمبر کے لئے بدقت [illegible] کیا ہے۔

(ادارہ)

سجاؤ بزم، درِ مے کدہ کشادہ کرو
اٹھاؤ سازِ طرب، اہتمام بادہ کرو
جلاؤ چاند ستارے، چراغ کافی نہیں
یہ شب ہے جشن کی شب روشنی زیادہ کرو
سجاؤ بزم کہ رنج و الم کے زخم سلے
بساطِ لطف و محبت پہ آج یار ملے
دعا کو ہاتھ اٹھاؤ کہ وقت نیک آیا
رُخِ عزیز پہ سہرے کے آج پھول کھلے
اٹھاؤ ہاتھ کہ یہ وقت خوش مدام رہے
شبِ نشاط و بساطِ طرب دوام رہے
تمہارا صحن منور ہو مثلِ صحنِ چمن
اور اس چمن میں بہاروں کا انتظام رہے

(۲۴ مارچ ۱۹۶۲ء)

فیض

اے وطن اے وطن

تیرے پیغام پر اے وطن اے وطن
آ گئے ہم فدا ہوں ترے نام پر
تیرے پیغام پر اے وطن اے وطن
نذر کیا دیں کہ ہم مال والے نہیں
آن والے ہیں اقبال والے نہیں
ہاں یہ جاں ہے کہ سُکھ جس نے دیکھا نہیں
یا یہ تن جس پہ کپڑے کا ٹکڑا نہیں
اپنی دولت یہی اپنا دھن ہے یہی
اپنا جو کچھ بھی ہے اے وطن ہے یہی
وار دیں گے یہ سب کچھ ترے نام پر
تیری للکار پر، تیرے پیغام پر
تیرے پیغام پر اے وطن اے وطن
ہم لُٹا دیں گے جانیں ترے نام پر
تیرے غدار غیرت سے منہ موڑ کر
آج پھر ایروں غیروں سے سر جوڑ کر
تیری عزت کا بھاؤ لگانے چلے
تیری عصمت کا سودا چکانے چلے
دم میں دم ہے تو یہ کرنے دیں گے نہ ہم
چال ان کی کوئی چلنے دیں گے نہ ہم
تجھ کو بکنے نہ دیں گے کسی دام پر
ہم لٹا دیں گے جانیں ترے نام پر
سر کٹا دیں گے ہم تیرے پیغام پر
تیرے پیغام پر اے وطن اے وطن!

فیض

تین گیت

"جاگو ہوا سویرا" کے فلم ساز اجے کاردار کی نئی فلم "دور ہے سکھ کا گاؤں" کے مکالمے اور گیت فیض احمد فیض نے لکھے ہیں — ذیل کے تینوں گیت اسی زیر تکمیل فلم کے ہیں۔ (ادارہ)

(۱)

پنکھی راجہ رے پنکھی راجہ میٹھا بول
جوت جگی ہر من میں
بھنورا گونجے ڈالی جھومے
بستی باڑی بن میں —
جوت جگی ہر من میں

ندیا رانی رے
ندیا رانی میٹھا بول
میٹھا بول
گھاٹ لگی ناؤ
رات گئی سکھ جاگا
پائل باندھو، ناچو گاؤ
گھاٹ لگی ہر ناؤ

ندیا رانی میٹھا بول

سندر گوری رے
سندر گوری میٹھا بول
جیوے روپ جوانی
بات کرے تو پھول کھلیں
انکھیاں ایک کہانی
جیسے دور سے تارا چمکے
چمکے روپ جوانی
جیوے روپ جوانی
جوت جگی ہر من میں
پنکھی راجہ میٹھا بول
ندیا رانی ..... سندر گوری

(۲)

سُکھی رہے تیری رات چندا سُکھی رہے تیری رات
دور بسے چین کی نگری چندا دور ہے سُکھ کا گاؤں
جانے کیسے راہ کٹے گی ہارے تھک تھک پاؤں
اوٹ میں بیٹھے بیری چندا، تھام لے میرا ہاتھ
سُکھی رہے تیری رات ــــ

تیری دیا سے دیپ جلا ہے اس پاپن کے دوارے
جانے کیسے بھاگ جگے ہیں بھول گئے دکھ سارے
من کانپے، بتی دھڑکے، چندا چھوٹ نہ جائے ساتھ
سُکھی رہے تیری رات

(۳)

بجھ گیا چندا، لٹ گیا گھروا، باتی بجھ گئی رے
دیا راہ دکھاؤ
موری باتی بجھ گئی رے، کوئی دیپ جلاؤ
رونے سے کب رات کٹے گی ہٹ نہ کرو، من جاؤ
منوا کوئی دیپ جلاؤ
کالی رات سے جوتی لاؤ
اپنے دکھ کا دیپ بناؤ
ہٹ نہ کرو، من جاؤ
منوا کوئی دیپ جلاؤ

(۱۹۶۲ء)

فیض

شامِ غم

ہر گھڑی عکسِ رُخِ یار لئے پھرتی ہے
کتنے مہ تابِ شبِ تار لئے پھرتی ہے

سُن تو لو، دیکھ تو لو، مانو نہ مانو اے دل
شامِ غم سیکڑوں اقرار لئے پھرتی ہے

ہے وہی حلقۂ موہوم مگر مَوجِ نسیم
تارِ گیسُو میں خمِ دار لئے پھرتی ہے

باغباں ہوش کہ برہم ہے مزاجِ گلشن
ہر کلی ہات میں تلوار لئے پھرتی ہے

فیض

دو یادگار نظمیں

ذیل میں فیض احمد فیض کی دو ایسی نادر و یادگار نظمیں پیش کی جارہی ہیں جو ان کی ادبی زندگی کے آغاز اور طالب علمی کے دور سے تعلق رکھتی ہیں۔ ایک نظم "اقبال" پر ہے اور دوسری انگریزی میں جسے ہم ترجمہ کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔ یہ دونوں نظمیں ۱۸-۱۹ سال کے اس فیض کی ہیں جس نے ابھی نام خدا جوانی کی سرحدوں میں قدم رکھا تھا اور ۲۹-۳۰ء کے دوران لاہور میں انٹرمیڈیٹ اور بی اے کی تعلیم مکمل کر رہا تھا۔ یہ تخلیقات "راوی" میں چھپی تھیں، اور نایاب ہو چکی تھیں۔ ہم برادرم سبط حسن اور برادرم اصغر سلیم کے ممنون ہیں جنہوں نے یہ نایاب تخلیقات مہیا کیں۔ (ادارہ)

اقبال

زمانہ تھا کہ ہر فرد انتظار موت کرتا تھا
بساطِ دہر پر گویا سکوت مرگ طاری تھا

عمل کی آرزو باقی نہ تھی بازوئے انساں میں
صدائے نوحہ خواں تک بھی نہ تھی اس بزم ویراں میں

رگِ مشرق میں خون زندگی تھم تھم کے چلتا تھا
فضا کی گود میں چُھپ تھے ستیزا انگیز ہنگامے

خزاں کا رنگ تھا گلزار ملت کی بہاروں میں
شہیدوں کی صدائیں سو رہی تھیں کارزاروں میں

سُنی واماندۂ منزل نے آوازِ درا آخر
مے غفلت کے ماتے خوابِ دیرینہ سے جاگ اٹھے

ترے نغموں نے آخر توڑ ڈالا سحر خاموشی
خود آگاہی سے بدلی قلب وجاں کی خود فراموشی

عروق مردۂ مشرق میں خون زندگی دوڑا
زمیں سے نوریاں تا آسماں پرواز کرتے تھے

فسردہ مُشتِ خاکستر سے پھر لاکھوں شرر نکلے
یہ خاکی زندہ تر پائندہ تر تابندہ تر نکلے

نمود و بود کے سب راز تو نے پھر سے بتلائے
ہر اک قطرے کو وسعت دے کے دریا کر دیا تو نے

ہر اک فطرت کو تو نے اس کے امکانات جتلائے
ہر اک ذرّے کو ہم دوشِ ثریا کر دیا تو نے

فروغِ آرزو کی بستیاں آباد کر ڈالیں
طلسم کن سے تیرا نغمۂ جاں سوز کیا کم ہے

زجاجِ زندگی کو آتشِ دوشیں سے بھر ڈالا
کہ تو نے صد ہزاراں افیونیوں کو مرد کر ڈالا

(سنہ ۱۹۳۱ء)

فیض احمد فیض
ترجمہ
انجم اعظمی

Illusion

خوابِ پریشاں

(Verse Libre)

To a desolate heart, sick with
longing, there came a dream
— the most beautiful of dreams.
But it was a faithless as all dreams
be —
The dream of becoming a
Hostel — Prefect.
It went the way it came, but
the poor man's world was
changed.
The staircase creaked demoniac
laughter,
And the bathing cubicles were
sad.
The infernal tower — clock
chiming its eternal hours,
How wearisome; and Gurmukh
Singh's beard —
How absurd!

(1930)

Faiz

ہاں خواہش کے بیمار مرے تنہا دل نے
اک خواب بھی خوابوں کی طرح پیارا دیکھا
لیکن مرے سب خوابوں کی طرح
یہ خواب بھی بے معنی نکلا
یہ خواب کہ بن جاؤں گا کسی دن —
— بورڈنگ کا مانیٹر میں
حیرت کہ ہوا ایسا ہی مگر
تھی کس کو خبر
اِس موڑ پہ آ کر بخت رسا سو جائے گا
زینوں کی صدا آسیب زدہ
حمام میں غم کی گردانیں
اور ایک نحوست کا پیکر
مینار گھڑی
ہر گھنٹہ کراہی وقت کے لمبے رستے پر
آواز تھکن میں ڈوبی ہوئی
میں، گرمکھ سنگھ، سنتا ہی رہا
سن سن کے مگر یہ کہنا پڑا
یہ خواب بھی کتنا مہمل تھا

فیض

(قطعات)

کاسۂ سر لیے چلو

دیدۂ تر پہ وہاں کون نظر کرتا ہے
شیشۂ چشم میں خوناب جگر لے کے چلو
اب اگر جاؤ پئے عرض و طلب ان کے حضور
دست و کشکول نہیں کاسۂ سر لے کے چلو

فیض
۱۲/۴/۶۵ء

سرِ آغاز

شاید کبھی افشا ہو نگاہوں پہ تمہاری
ہر سادہ ورق جس سخن کشتہ سے خوں ہے

شاید کبھی اس شکست کا مرہم ہو سرافراز
جو آمدِ سحر کی تمنا میں سرنگوں ہے،
شاید کبھی اس دل کی کوئی رگ تمہیں چبھ جائے
جو سنگِ سرِراہ کی مانند زبوں ہے

فیض
۱۲/۴/۶۵ء

نوحہ

۲۹ دسمبر ۵۹ء کو کراچی کے ہر دلعزیز اور ممتاز جواں سال
صحافی محمد اختر کی اچانک موت سے متاثر ہو کر

نہ دید ہے نہ سخن اب نہ حرف ہے نہ پیام
کوئی بھی حیلۂ تسکیں نہیں اور آس بہت ہے
امیدِ یار، نظر کا مزاج، درد کا رنگ
تم آج کچھ بھی نہ پوچھو کہ دل اُداس بہت ہے

فیض

بچوں کے لئے

بہت کم حضرات کو علم ہوگا کہ فیض نے بچوں کے لئے بھی نظمیں لکھی ہیں۔ ذیل میں ہم اُن کی دو نہایت خوبصورت اور یادگار نظمیں برادرم مصطفیٰ زیدی ـــــــــ اور مسعود احمد برکاتی کے شکریہ کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔ یہ فیض کی شاعری کا ایک نیا رُخ ہے جو اب تک تاریکی میں تھا۔ (ادارہ)

منیزہ کی سالگرہ

ایک منیزہ ہماری بیٹی ہے، جو بہت ہی پیاری بیٹی ہے،

ہم ہی سب اُسکو پیار کرتے ہیں، سب کے سب اُسکو پیار کرتے ہیں

کیسے سب کو نہ آئے پیار اُس پر، ہے وہی تو ہماری ڈکٹیٹر

پیار سے جو کبھی جو چِڑا بیٹھیگا، وہ ضرور اُس سے مار کھائیگا،

خیر یہ بات تو ہنسی کی ہے، ویسے سچ مچ بہت وہ اچھی ہے،

پھول کی طرح اس کی رنگت ہے، چاند کی طرح اسکی صورت ہے
جب وہ خوش ہو کے مسکراتی ہے، چاندنی جگ میں پھیل جاتی ہے
پڑھنے لکھنے میں خوب قابل ہے، کھیلنے کودنے میں کامل ہے
عمر دیکھو تو آٹھ سال کی ہے، عقل دیکھو تو ساٹھ سال کی ہے
پھر وہ گانا بھی اچھا گاتی ہے، گرچہ ہم کو نہیں سناتی ہے
بات کرتی ہے اسقدر میٹھی، جیسے ڈالی پہ کوک بلبل کی
ہاں کوئی اسکو جب ستاتا ہے، تب ذرا غصہ آہی جاتا ہے
پر وہ جلدی سے من بھی جاتی ہے، کب کسی کو بھلا ستاتی ہے
ہے شگفتہ بہت مزاج اسکا، سارا عمدہ ہے کام کاج اسکا

ہے میزہ کی آج سالگرہ، ہر طرف شور ہے مبارک کا
چاند تارے دعائیں دیتے ہیں، پھول اسکی بلائیں لیتے ہیں
باغ میں گا رہی ہے یہ بلبل، تم سلامت رہو میزہ گل
امی ابا بھی اور باجی بھی، آنٹیاں، انکل، بہن بھائی بھی
آج سب اسکو پیار کرتے ہیں، مل کے سب بار بار کہتے ہیں

پھر یونہی شور ہو مبارک کا
آئے سو بار تیری سالگرہ
سو تو کیا سو ہزار بار آئے
یوں کہو بے شمار بار آئے
لائے ہر بار اپنے ساتھ خوشی
اور ہم سب کہا کریں یونہی
یہ منیزہ ہماری بیٹی ہے
یہ بہت ہی پیاری بچی ہے

(۱۹۵۰ء)

(۲)

پرسا، پرسو، پرشُو رام

ایک لڑکا جس کا "پرسا" نام تھا
پڑھنے لکھنے میں بڑا ناکام تھا

اُس نے جب بھی امتحاں کوئی دیا
اُس کو ہر پرچے میں انڈا ہی ملا

اُس نے سب انڈے اکٹھے کر لئے
بیچنے کو ٹوکری میں دھر لئے

چیز عمدہ تھی ملے گاہک ہزار
بن گیا بس اس طرح وہ مالدار

باقی انڈے جو بچے اے مہرباں
اس نے اس پر لا بٹھائیں مرغیاں

بیس دن کے بعد وہ چوزے بنے
جن کو کھانے کے لئے ملتے چنے

ہو گئے جس وقت وہ پل کر جواں
ڈھیر لگ جاتا تھا انڈوں کا وہاں

بیچتا تھا روز "پرسا" بے شمار
لوٹتا رہتا تجارت کی بہار

چار پیسے جیب میں رہنے لگے
لوگ اب "پرسو" اسے کہنے لگے

فیضؔ اب دولت ہے اس کے پاس عام
لوگ سب کہتے ہیں اس کو پرس رام

(۱۹۵۶ء)

فیض احمد فیض

دُو طنزیئے

فیض کی ابتدائی نثر کے دو یادگار نمونے جو تقریباً نایاب تھے، ذیل میں پیش کئے جا رہے ہیں۔ یہ دونوں طنزیئے جو مکالموں کی صورت میں ہیں فیض نے آج سے تقریباً ۳۵ سال قبل زمانۂ طالب علمی میں لکھے تھے ان کو پیش کرنے کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ فیض کے ادبی ارتقا کا جائزہ لیتے وقت اُن کی اولین تخلیقات کو بھی سامنے رکھا جائے۔ (ادارہ)

شکست

(ایک طنز)

افراد

سلمیٰ ——— (ایک لڑکی)

پہلا لڑکا ——— دُوسرا لڑکا۔

پہلا لڑکا: سلمیٰ تم جانتی ہو کہ میں خاموشی کا عادی ہوں، لیکن گھر والوں کی گفتگو میں تمہارا ذکر آجائے، تو مجھے زبان پر قابو نہیں رہتا۔ میرے الفاظ خود بخود گرمجوش ہوتے چلے جاتے ہیں۔ کئی بار والدہ بگڑ کر پوچھتی ہیں۔ آخر تمہیں سلمیٰ سے

اتنی کیا دلچسپی ہے؟

سلمیٰ: (دوسرے لڑکے سے) ۔ کس قدر تیز خوشبو لگا رکھی ہے ۔ آج مجھے سر درد نہ ہو جائے ۔

پہلا لڑکا: (تقریباً رو رکھتے ہوئے) ۔ تمہیں نہیں معلوم تم میرے لئے کیا کچھ ہو ۔ تمہیں دیکھ کر جاتا ہوں تو دنیا کی ہر شے مسرور نظر آتی ہے ۔ پڑھنے بیٹھتا ہوں تو کائنات کا خشک چہرہ متبسم دکھائی دیتا ہے ۔

سلمیٰ: (دوسرے لڑکے سے) ۔ جہاں تک مجھے یاد ہے تمہارے لباس میں کبھی کوئی بے جا شکن نظر نہیں آئی ۔ بھلا تمہیں اپنے سوا اور کس سے محبت ہوگی!

پہلا لڑکا: سلمیٰ! جب ہم بچے تھے تو تم مجھ سے طرح طرح کی فرمائشیں کیا کرتیں ۔ اور جب ان میں سے کوئی پوری نہ ہوتی تو روٹھ جایا کرتیں ۔ حسرت ہے مجھے اب بھی کوئی حکم دو جو پورا نہ ہو سکے اور تم روٹھ جاؤ ——— .... تمہیں منانے کے لئے کیا کچھ نہ کروں ۔

(سلمیٰ احسان مندانہ نگاہوں سے دیکھتی ہے)

دوسرا لڑکا: تم کس قدر حسین ہو میری ملکہ ۔ تمہیں یاد کرتا ہوں تو دل کا ہر تار وفورِ شوق سے کھنچنے لگتا ہے ۔ تمہارا تصور کرتا ہوں تو خیال کی نیم تاریک فضا میں روپہلی کرنیں دوڑ جاتی ہیں، اور تمہیں دیکھتا ہوں تو ——— دل چاہتا ہے کہ بہار اور اس کی تمام رنگینیاں تمہارے آتشیں ہونٹوں کے ایک ہلکے سے تبسم پر نچھاور کر دوں ۔

سلمیٰ: (پہلے لڑکے سے) تم نے آج بال بھی نہیں بنائے!

دوسرا لڑکا: راتوں کی کیف آور چاندنی میرے لئے ایک نغمہ بن جاتی ہے ۔ اس کے عنبریں گیسوؤں میں کس قدر نغمے خوابیدہ ہیں ۔ صبح کی نیم بیدار رنگینی کو صرف ایک ترانہ یاد ہے ـــ اس کی اُلفت نواز آنکھوں میں کتنے میکدے آباد ہیں!

سلمیٰ: (پہلے لڑکے سے) ۔ تمہارے کوٹ کا کالر کتنا گندہ ہے ۔

دوسرا لڑکا: سوچتا ہوں کہ اگر تم میری ہو جاؤ تو ہم دونوں شراب و شعر کی موہوم دنیا میں نکل جائیں ۔ جہاں آفتاب حدت سے محروم ہو اور مہتاب افسردگی سے ناآشنا ۔

وہاں درد کی شدت سے نغمے نہ اُلجھتے ہوں
ناکام نگاہوں سے آنسو نہ چھلکتے ہوں
وہاں زیست کا ہر لمحہ عشرت کی کہانی ہو
مہتاب ہو، ساغر ہو، بادہ ہو، جوانی ہو

اس دنیا کی ہر شام زہرہ کے مدہوش نغموں سے مرتعش ہو اور اس کی ہر صبح بہار کے نوخیز پھولوں سے معطر ۔

سلمیٰ: (پہلے لڑکے سے) تم تو گنوار ہو ۔

دوسرا لڑکا: ہم پرندوں کی طرح آزاد ہوں ـــ آزاد اور بے فکر ـــ تمام دن ہم قدرت کے وسیع و شاداب مرغزاروں میں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ٹہلا کریں اور ......

(سنہ ۱۹۳۱ء)

یادِ رفتگاں

دی احباب

(ایک اور طنز)

دسمبر ۱۹۳۰ء کی ایک شام

منظر: نیو ہوسٹل میں ایک پُر اسرار شخوانہ جس کا فرنیچر ایک معتبر اسٹول پر مشتمل ہے۔ فرش پر چائے کے برتن، سگریٹ کے خالی پیکٹ اور جلے ہوئے ٹکڑے بکھرے پڑے ہیں۔ فضا میں ایک سُرخ موم بتی کی روشنی لڑکھڑا رہی ہے۔

'احباب' سیاہ لبادے اوڑھے، متین چہرے بنائے آہستہ آہستہ داخل ہوتے ہیں۔

'چوہدری صاحب' اسٹول صدارت پر بیٹھ کر مالا جپنے لگتے ہیں۔ ن اور ح میں بحث چھڑ جاتی ہے۔ ف دیوار سے ٹیک لگا کر اونگھنے لگتے ہیں۔ ع ایک کونے میں سسکیاں بھرتا ہے۔ م شعر لکھتا ہے۔ ش گاتا ہے)

احباب

ن - ح - ش - ف - ع - م

چوہدری صاحب

ن: تو میں کہہ رہا تھا کہ ہندوستان کی موجودہ تہذیب کا سنگِ بنیاد روس میں رکھا گیا۔ کیونکہ موجودہ ہندوستان کا ہر ادیب اور ہر فلسفی روسی مصنفین کے تخیل کا ممنونِ احسان ہے۔ ستیہ گرہ کو سب سے پہلے روسیوں نے رواج دیا۔ ٹالسٹائی پہلا شخص تھا جس نے داڑھی کی حمایت میں علمِ جہاد بلند کیا، اور اگر ترگنیف پیدا نہ ہوتا —

(ش — 'اک کون میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو')

ح: — کیسی لایعنی باتیں کرتے ہو یار۔ ہر ذی حس انسان جسے قاسمِ ازل نے تھوڑی سی عقلِ رسا ودیعت کی ہے، اس بات کا ادراک رکھتا ہے کہ ہندوستانی قومیت کا موجودہ نہوض غالب اور اس کے بعد کی تعلیم کا نتیجہ ہے۔ اقبال کا ایک مصرع ہے

خوشا کسے کہ بدریا سفینہ ساخت مرا

ہزار ترگنیف کے تخیل —

(چوہدری صاحب: پریم، شکتی، شانتی —)

ش: ساڈوں بولیاں نہ مار وے چھنے —)

ن: اوہو ہو — آہا ہا — اہی ہی ہی — غالب کون بلا تھا، اور اقبال کیا چیز ہے۔ میں کہتا ہوں ترگنیف ترگنیف اور دوستووسکی۔

کیوں؟

ف : چھوڑو یار، سگرٹ نکالو۔

(م : اگر ایک شعر کا رقبہ ساڑھے تین مربع انچ ہو تو ایک مصرع کا طول ــــ)

چودھری صاحب : افسوس تو یہی ہے کہ تم ابھی کانٹ اور برگسن کی اخلاقی تصوریت سے چھوا تک نہیں۔ تم لوگ روحانی تجربات کو مادی لذات پر قربان کر دیتے ہو، اور اشیا کی حقیقی اقدار کو ان کی صوری اقدار سے تمیز کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے ــــ ہمل اور جہنم کی تعلیم ــــ

ف : دنیا میں صرف دو حقیقتیں ہیں عشق اور سگرٹ اور دونوں میں سے سگرٹ زیادہ ہمہ گیر اور زیادہ سہل الحصول ہے۔ اس لئے سگرٹ نکالو۔

ع : کوئی شیکو کا رہنیں، ایک بھی نہیں۔

ن : دنیا کی واحد حقیقت لغویت ہے کیونکہ حسن، عشق، شعر سب لغو ہیں۔

ف : اور تم؟

ن : ہا ہا ہا ہا۔

ف : بجا ہے۔ کیوں م شعر نہیں ہوا۔

م : ایک مصرع کا لیفٹ آؤٹ کم رہ ہے۔

چودھری صاحب : ن، ابھی تمہاری جبین نیاز اور کسی کے آستانِ ناز میں کتنا فاصلہ باقی ہے؟

ح : کچھ نہ پوچھئے، آج کل ان کی پتنگ چڑھی ہوئی ہے۔ آخر دو سال کی محنت کا اتنا بھی صلہ نہ ملتا۔ میرے کمرے کی دیوار پہ ابھی تک ان کی آہ و بکا کے تاثرات سے لرزہ براندام ہیں۔

ف : ؎

وفائے دلبراں ہے اتفاقی ورنہ اے ہمدم
اثر فریاد دل ہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے

ع : آہ، سیزن ختم ہو رہا ہے اور ابھی ابھی تک خبر نہیں۔

م : مصرع ہو گیا۔

سب : خاموش ــــ خاموش ــــ م صاحب نے مصرع لکھا ہے۔

م : 'بدلی تری نظر، مری دنیا بدل گئی'

سب : واہ واہ کیا کہنے ہیں ــــ م صاحب ــــ قلم توڑ دیا۔

(وقفہ)

ف : مجھے تو بیہودہ معلوم ہوتا ہے۔

چودھری صاحب : ذاتی نظریہ تھی یا ایجنیرر کا یور۔

ح : ہاں، اور تمام مصرعہ میں فارسی کی ایک بھی ترکیب نہیں۔

ن : اور خیال بھی کچھ نیا نہیں۔ دوستوسکی۔

ش : تمہارے دوستوسکی، کانٹ اور غالب ــــ

(نصف درجن سلیس سلواتیں)

چودھری صاحب : صاحبان نیشنل انیتھم۔

(سب کھڑے ہو کر گاتے ہیں :ــــ

وہ کافر صنم کیا خدا ہے کسی کا
وہ کا آ آ فر صنم کیا

(موم بتی بجھ جاتی ہے)

(بشکریہ انا حباب (فیض) شہ ۱۹۳۰ء)

فیض احمد فیض

غیر مطبوعہ خطوط

سلام مچھلی شہری کے نام

Alnageldie Estate
Simla
(1940.)

ڈیر سلام بھائی

آپ کا خط ملا، احسان کیا۔ اس میں معافی کی کون بات تھی۔ نظم بھیجتا ہوں۔ پسندیدگی کا شکریہ۔

نیازمند
فیض

پھر کوئی آیا دلِ زار! نہیں کوئی نہیں
راہرو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار۔

لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ ۔
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہگزار ۔
اجنبی خاک نے دھندلا دیئے قدموں کے سراغ ۔
گل کرو شمعیں بڑھا دو مے و مینا و ایاغ ۔
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو ۔
اب یہاں کوئی نہیں ۔ کوئی نہیں آئے گا ۔

عبدالرحمٰن چغتائی کے نام

سنٹرل جیل، حیدر آباد سندھ

۶ نومبر

مخدومی جناب قبلہ، آداب و سلام

جب سے آپ کا خط آیا ہے میں بقول غالب اسے یوں لیے پھرتا ہوں کہ

کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے،

آپ کی یاد آوری میرے لیے افتخار کا باعث ہے اور آپ کی محبت وسیلۂ تسکین۔ جیسا کہ آپ نے لکھا ہے زندگی کا سلسلہ تو کسی طور چلتا ہی رہتا ہے اہم بات یہ ہے کہ تخلیق کا سلسلہ رکنے اور فن کی شمع بجھنے نہ پائے، جب تک یہ سانس چلتا ہے اور یہ شمع جلتی ہے دیگر معاملات ان

نعمتوں کے مقابل ہیچ ہیں اور سطوت جم "سرمایۂ غم فرہاد" کے منہ نہیں آ سکتی،

میری نئی کتاب "دست صبا" کے نام سے چھپ رہی ہے، افسوس کہ میری غیر حاضری کے باعث اس میں کچھ موقلم کا حسن اضافہ نہ ہو سکا۔

امید ہے کہ آپ اور احباب و اقرباء میں بخیر و عافیت ہوں،

بخیریت ہوں۔ فقط

نیاز مند
فیض

احمد ندیم قاسمی کے نام

(۱)

5, Cornwall Avenue
Finchley, London N. 3

۲۹ جنوری (۶۳ء)

برادر عزیز

ابھی ابھی ایک اور دورے سے لندن واپس پہنچا ہوں۔

آپ کا خط رکھا تھا، بہت مسرت ہوئی۔ بھئی میرے بارے میں آپ کا شبہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں تھا بات صرف یہ ہے کہ میں اپنے عزیزوں کو سلام و پیام دل میں زیادہ لیکن کاغذ پر کم لکھتا ہوں

تو آپ لوگ کچھ صفائی باطن پر توجہ دیجیئے کہ یہ پیغامات آپ تک پہنچ جایا کریں۔ کچھ دن ہوئے میں نے اخبار میں دیکھا تھا کہ بعض روسی اور امریکی سائنسدان ٹیلی پیتھی (Telepathy) سے متعلق تحقیق کر رہے ہیں اس لئے کچھ تعجب کا محل نہیں اگر ظاہر و باطن کے علوم آخر یکجا ہو جائیں۔

جو کچھ کتاب گھر کی خریت چکا ہوں، نہ جانے آجکل خون دل بیچنے والوں کے خریدار کتنے ہیں لیکن یہ بازار بالکل سرد بھی کبھی نہیں ہوتا غالباً کافی دنوں تک صبر اور شکر کی آزمائش ہوگی لیکن آپ اسکے عادی ہیں۔ بہرصورت میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ نئے مجموعے کے بارے میں شرمسار ہوں، آنے سے پہلے پیسوں کی ضرورت تھی، اسلئے وہ تو میں کاروان کے ہاتھ بیچ آیا تھا لہٰذہ پہلے ایڈیشن کے دام بھی وصول کر چکا ہوں فی الحال اور تو کچھ گرہ میں نہیں البتہ جیل سے لکھے ہوئے خطوط ابھی ابھی ایلس نے یکجا کئے ہیں، انکا مسودہ چند دنوں تک سبط کو بھیج رہا ہوں، آپ بھی دیکھ لیجیے، اگر آپ کے مطلب کی چیز ہو تو چھاپ دیجیئے، یہ خطوط انگریزی میں ہیں اسلئے ترجمے کا بکھیڑا ہوگا۔ سبط کو اسی غرض

سے بھیج رہا ہوں۔ آپ دونوں مقالے کے بعد مجھے رائے لکھ دیجئے
رسالے کے لئے آپکی فرمائش کی تعمیل میرے سر ہے۔
ابھی تک تو اس مرناک فضا میں شعر کا دور دور سراغ نہیں
ملا۔ دیکھئے کیسے ہے شاید مزید خامہ جبر نوائے سروش سنائی دے جائے
بہرصورت کوشش ضرور کرونگا۔

آپ سے میں نے کہا تھا ذکر کیا تھا کہ بعض غیر ملکی ناشرین پاکستانی
ادب (شعر، افسانہ) کا ایک مجموعہ شائع کرنا چاہتے ہیں۔ آپ نے
نہیں کیا تو یہ کام اب میرے ذمے لے لیا ہے۔ یہاں بیٹھ کر سب کتابیں
کھنگالنا تو ناممکن ہے البتہ بہت سی چیزیں پہلے سے میرے
ذہن میں ہیں اور یہاں کے School of Oriental Studies
کا کتب خانہ کافی اچھا ہے، اگر آپ اپنی پسندیدہ چیزوں کی فہرست
بھیج سکیں تو کچھ سہولت ہو جائیگی، خدیجہ کا ناول اور اپنی نئی کتابیں تو
بہرصورت بھجوا دیجئے لیکن ہوائی ڈاک سے، ٹکٹ کے پیسے بھیج
دیئے جائینگے۔

میں غالباً سال رواں کے اواخر تک لوٹ آؤنگا،
گزشتہ وقت بیشتر جہاں گردی میں گزرا، اب کچھ پڑھنے

لکھنے کی کوشش کروں گا۔ 'جنگ' کی فرمائش پر صحافتی مراسلت
کا ایک سلسلہ بھی زیر غور ہے۔ دیس سے غیر حاضری مجھے خود بھی
بہت گوارا نہیں (ہوس سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہمکو) لیکن
حدیث شریف میں ہے "زر غباً تزدد حباً" (کم ملا کرو تاکہ
محبت میں اضافہ ہو) چنانچہ یہ فراق تو سنت کی پیروی میں ہے
فرصت ملے اور پھر کو بیمار پڑنے دیجئے۔ ذرا دراس بھی ہوں تو انہیں
بھی لکھوں گا۔

مخلص
فیض

(۲)

لندن
۶ مارچ (۶۳ء)

برادرم ندیم

آپکے دونوں خط ملے، جلد اس لئے نہیں لکھا کہ لکھنے میں
کچھ تھا ہی نہیں اور مجھے یقین تھا کہ محض وعدۂ فردا سے آپکی تشفی
نہیں ہوگی، اب مشکل سے معرکۂ تر کی صورت نہ سہی تک بندی
کی صورت ہو سکی ہے، کچھ خاص چیز نہیں لیکن خانہ پری تو شاید
ہو جائیگی۔

گزشتہ تین چار دن سے یہاں کچھ موسم کھلا ہے اور
ہوا میں کچھ لاہور کی سی کیفیت محسوس ہوتی ہے لیکن محض ہوا
سے کیا ہوتا ہے۔ گھر کا پتہ یاد نہیں ظہیر
خدیجہ کو مبارکباد بھیج رہا ہوں،
کے پتے سے لکھ رہا ہوں۔
شیطان کی آنت
جنگ کے لئے ریکویم کے بارے میں ایک
کل روانہ کر چکا ہوں۔ اچھا ہے دیر سہی، آپ کے انتخاب کے بعد کتاب کا
انتظار رہے گا۔ سب احباب کو پیار۔ فقط

مخلص
فیض

ہر سمت پریشاں تری آمد کے قرینے
دھوکے دیے کیا کیا ہمیں بادِ سحری نے
ہر منزلِ غربت پہ گماں ہوتا ہے گھر کا
بہلایا ہے ہر روز بہت در بدری نے
میخانے میں عاجز ہوئے آزردہ دلی سے

مسجد کا نہ رکھا ہمیں آشفتہ سری نے
تھے بزم میں سب دودِ سرِ بزم سے شاداں
بے کار جلایا ہمیں روشن نظری نے
ہر جامۂ صد چاک بدل لینے میں کیا تھا
مہلت ہی نہ دی فیضؔ کبھی بخیہ گری نے

(۴)

لندن
۲۸ اکتوبر (۶۲ء)

برادرم غلام اسلام لودھی جی

دو چار دن ہوئے لوٹا ہوں، آپ کا خط منتظر پایا۔
یعنی اب تو سیروں خون خشک کر کے بھی مصرعۂ تر کی صورت نظر نہیں آتی اِسلئے غزل تو کوئی ہوئی نہیں، جوں توں کر کے ایک نظم گھسیٹی تھی سو بھیج رہا ہوں، چھاپنے کی شرط یہ ہے کہ اول مجھے اپنی منتخب کردہ کہانیوں کی فہرست بھیجئے اور یہ بھی لکھئے کہ آپکی دستیابی کی صورت کیا ہے۔ دوم خدیجہ کی ناول اور سال

کھینچئے۔ سوم مجھے استاد دامن، احمد راہی اور دوسرے پنجابی شعرا
کا منتخب کلام چاہیے۔ زیادہ وقت صرف کرنے کی ضرورت نہیں۔ دس
پندرہ نظمیں کافی ہیں۔ اگر آپ فارغ بخاری، شیخ ایاز اور کسی بلوچی
دوست کے ذریعے پشتو، سندھی، اور بلوچی کے نئے ترقی پسند شعرا
کا کلام بھی حاصل کر سکیں تو بہت ہی عمدہ بات ہو، بہتوں کا بھلا
ہوگا۔ کم از کم پہلی دو چیزیں فوراً بھجوا دیجئے۔

فنون کا دوسرا شمارہ مل گیا ہے، صورت اچھی ہے،
سیرت کا ابھی مطالعہ نہیں کیا۔ خدیجہ، ظہیر اور سب احباب کو
پیار پہنچا دیجئے (خدیجہ کے گھر کا پتہ آپ نے نہیں لکھا) فقط

مخلص
فیض

رنگ ہے دل کا مرے

تم نہ آئے تھے تو ہر چیز وہی تھی کہ جو ہے
آسماں حدِ نظر، راہگزر راہگزر، شیشۂ مے شیشۂ مے
اور اب شیشۂ مے، راہگزر، رنگِ فلک
رنگ ہے دل کا مرے "خونِ جگر ہونے تک"

فیض

چمپئی رنگ کبھی، راحتِ دیدار کا رنگ

سرمئی رنگ کہ ہے ساعتِ بیزار کا رنگ،

زرد پتوں، خس و خار کا رنگ،

سرخ پھولوں کا، دہکتے ہوئے گلزار کا رنگ،

زہر کا رنگ، لہو رنگ، شبِ تار کا رنگ،

آسماں، رہگزر، شیشۂ مے

کوئی بھیگا ہوا دامن، کوئی دکھتی ہوئی رگ

کوئی ہر لحظہ بدلتا ہوا آئینہ ہے

اب جو آئے ہو تو ٹھہرو کہ کوئی رنگ، کوئی رُت، کوئی شے

ایک جگہ پر ٹھہرے،

پھر سے اک بار ہر اک چیز وہی ہو کہ جو ہے

آسماں حدِّ نظر، رہگزر رہگزر، شیشۂ مے شیشۂ مے

حمید اختر کے نام

(۱)

لندن

۱۰ اپریل ۶۳ء

عزیزی حمید اختر:

تمہارا خط ملا، مسرت ہوئی، کاروبار کے

گزشتہ خط سے آپ لوگوں کے اندیشہ ہائے دور دراز اور
فلمی منصوبوں کا پتہ چلا، ٹھیک ہے ہم خود "لا تقنطوا" کے قائل
ہیں آپ لوگوں کی گاڑی چل نکلے تو بہت اچھا ہو، بہر صورت
اس بہانے سے لندن کی سیر ہو جائے تو کیا برائی ہے، اپنی کشتی کے
بارے میں کچھ ایسی پریشانی کی بات نہیں جب تم آؤ گے تو دیکھا
جائے گا، اپنے یہاں، یا اس کے کہیں اور، کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔
لاہور میں آجکل موسم گل ہو گا، یوں تو لوگ یہاں اس
موجودہ موسم کو بھی بہار کہتے ہیں لیکن بقول شاعر

جسکی بہار یہ ہو پھر اسکی خزاں نہ پوچھ

اگلے ہفتے ہم چند دنوں کے لئے پیرس اور پھر لندن جا رہے ہیں
اگرچہ اب سب فرنگی ملک ہیں تو ایک ہی سے دکھائی دیتے ہیں
ایلس چھیمی اور میزو خوش ہیں صرف اپنا جی پردیس سے متنفر
ہے۔ خیر اب چند مہینوں کی بات ہے۔
سعدیہ اور بچوں کو ہم سب کی طرف سے پیار۔

باقی عند اللہ

مخلص
فیض

(۲)

5 Carwall Avenue
London N3.
4/6/63.

ڈیر حمید اختر،

تمہارے دونوں خط پہنچے، کوئی قابل ذکر بات نہ تھی اسلیئے پہلے خط نہیں لکھا، ماغنیٹ سے تمہارے دوست دو چار دن ہوئے مل گئے تھے باقی ایک دو حضرات جن کا تم نے ذکر کیا ہے ابھی نہیں پہنچے، کاردار بھی قریباً دو ہفتے سے یہاں ہے لیکن PIA کے کام میں مصروف، آج جرمنی گیا ہے غالباً دو تین دن میں لوٹے گا۔ اُسے توقع تھی کہ فلمی سامان کنگرلنگس کے بارے میں تمہارے ہاں سے کوئی اطلاع پہنچیگی جو اب تک نہیں پہنچی، اس بارے میں اطلاع دیجئے، تمہارے آنے میں کوئی شک تو اسکے بعد ہی پیدا ہوگا۔

'فنون' ابھی تک نہیں پہنچی۔ قاسمی صاحب کو یاد دلوایئے
ویسے نقادوں کی نئی پود کے ارشادات تو ادھر اُدھر پہنچے

ہی رہتے ہیں، اور اب تو اُنکی باتیں بھی پُرانی ہو گئی ہیں۔

سبط کا خط آیا تھا، ایک آدھ دن میں جواب لکھونگا

شکر کرکے آنے کی اطلاع تھی، کس حال میں ہیں۔ محمود صاحب سے

کہیئے کہ یہاں پہنچ کر مجھے اور کے پتے پر اطلاع کر دیں۔ ٹیلیفون

نمبر FIN 0714 ہے، آجکل یہاں موسم بالکل لندن ہو رہے گلدی جاڑوں

کا سا ہے۔ لیکن وہ بات کہاں،

نصیب صحبت یاراں نہیں تو کیا کیجے

یہ رقص سایۂ سرو و چنار کا موسم

ہم سب کی طرف سے سعدیہ لعد بچوں کو بہت بہت پیار

مشتاق

مخلص

فیض

ڈاکٹر عبادت بریلوی کے نام

3 Cornwall Avenue
Finchley N.3
Tel. FIN 0714

عبادت صاحب،

آپ سے بدھ کے دن ملنے کا وعدہ تھا

لیکن مجھے خیال نہیں ہے کہ اس سے ہم مجھے کچھ بات کے بارے میں کیسے
تو پڑتا ہے سمجھے کہ کچھ تیاری درکار ہوگی اس لیے جمعرات کو
دو بجے رکھیے، اگر یہ وقت موزوں ہو تو مجھے ٹیلیفون پر مطلع کر دیجیے
بیگم صاحبہ کو آداب
خدا حافظ
مخلص
فیض

اطہر قادری کے نام

پاکستان ٹائمز
لاہور
۱۲/ جنوری ۱۹۵۸ء

مکرمی اطہر صاحب، السلام علیکم

آپ کے خط کا شکریہ۔ Writers Guild
کے سلسلے میں یہاں گفتگو کی ابتدا ہو چکی ہے،
بعض ادیبوں سے ابھی مشورہ باقی ہے، کوئی
عملی تجویز مرتب ہو جانے کے بعد آپ حضرات

کو مطلع کر دوں گا، آپ لوگ اُردو اور پنجابی
ادیبوں کو یکجا کرنے کی سعی کرتے ہوئے کوشش
یہی ہونا چاہیئے کہ یہ حلقہ ذاتی اور سیاسی اختلافات
سے الگ رہے اور اسے خالص ادبی نقطہ نظر سے
دیکھا جائے، اگر غزل ادارۂ لیل و نہار کو
بھجوا دی ہے

فقط

مخلص
فیض

حزیں لدھیانوی کے نام

مکرمی حزیں تسلیم

آجکل سبط حسن صاحب رخصت پر ہیں
اس لئے انکی ڈاک میں دیکھ رہا ہوں،

"جنگ ہنستا ہے" کے بارے میں آپکے اعتراضات سے بالکل متفق ہوں، غالباً عجلت میں کسی نے غور نہیں کیا،

غزل کے متعلق غالباً سبط حسن واپسی پر آپکو مطلع کر سکینگے، فقط

مخلص
فیض

نسیم سیّد کے نام

پاکستان ٹائمز، لاہور
۲۹/۴/۵۸ء

عزیزی

آپکا خط ملا، آجکل ہر نوع کی مشکلات ہر جگہ آپکو پیش آئینگی، آپ محنت سے کام نباہنے کی کوشش کیجئے، اگر مجھے کہیں اور بہتری کی صورت نظر آئی تو ذہن میں رکھونگا۔

فقط
مخلص
فیض

صہبا لکھنوی کے نام

لاہور
۲۵ راپریل ۵۹ء

مکرمی صہبا صاحب، تسلیم،

نظم حاضر ہے، تاخیر کے لئے معذرت خواہ ہوں

مخلص
فیض

دلفگارو چلو

چشمِ نم جانِ شوریدہ کافی نہیں،
تہمتِ عشقِ پوشیدہ کافی نہیں،
آج بازار میں پابجولاں چلو
دست افشاں چلو، مست و رقصاں چلو۔
خاک برسر چلو، خوں بداماں چلو،
راہ تکتا ہے سب شہرِ جاناں چلو،
خلوتِ خاص بھی، مجمعِ عام بھی،

شیرِ الزام بھی، سنگِ دشنام بھی،
صبحِ ناشاد بھی، روزِ ناکام بھی،
ان کا دمساز اپنے سوا کون ہے،
شہرِ جاناں میں اب باصفا کون ہے
دستِ قاتل کے شایاں رہا کون ہے،
رختِ دل باندھ لو دلفگارو چلو،
پھر ہمیں قتل ہو آئیں یارو چلو!

ابراہیم جلیس کے نام

پاکستان آرٹس کونسل
لاہور
(١٩٦٠)

برادرم جلیس، دعا و سلام،

آپ کا خط پہنچا، بہت مسرت ہوئی، حیدرآباد سے ایک دو خط اسی سلسلے میں پہلے بھی آ چکے ہیں

نے مدد لیتی رہے۔ کو بہت دن ہوئے معذرت کا خط
لکھا تھا، معلوم ہوتا ہے راستے میں خورد برد ہو گیا،
کچھ قصہ یوں ہے کہ حیدرآباد دیکھنے کا مجھے خود بہت
اشتیاق تھا لیکن مجبوریاں تمہیں معلوم ہیں فی الحال کوئی
صورت جانے کی نہیں ہے ورنہ ضرور جاتا۔ میری جانب
سے معذرت مع اظہار تاسف لکھ بھیجو اور یہ بھی کہ
زندہ ہیں تو شاید صحبت باقی ہو،

امید ہے کہ آپ لوگ بعافیت ہونگے۔

مخلص
فیض

ایک خط، ایک دعوت نامہ

ہارون کالج
شاہ ولی اللہ روڈ، کھڈہ، کراچی
ٹیلیفون: ۳۴۱۶۲

۱۳ نومبر ۱۹۶۴ء

مکرمی، تسلیم،

اتوار ۲۲ نومبر ۱۹۶۴ء کو ہمارے کالج میں

انجمن اساتذۂ ہارون کالج کی طرف سے

"عوامی تعلیم کے مسائل"

پر ایک مذاکرہ منعقد ہوگا جس کی صدارت

جناب ڈاکٹر سلیم الزماں صاحب صدیقی، چیئرمین سائنس کونسل ادا

فرمائیں گے، اور اسی روز کالج کے ادارۂ ادبی و علمی تحقیقات کے اہتمام میں

شمس العلماء ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ کی برسی

منائی جائے گی جس کی صدارت

جناب ڈاکٹر شیخ محمد ابراہیم "خلیل"

فرمائیں گے۔

دونوں اجلاسوں کے پروگرام اس خط کے ساتھ منسلک ہیں۔

مجھے امید ہے کہ جناب ان تقریبوں میں شریک ہو کر مجھے اور

کالج کے اساتذہ کو ممنون فرمائیں گے۔

آپ کا مخلص

فیض احمد فیض

پرنسپل

فیض احمد فیض

جیل کی سلاخوں سے

(بیوی کے نام)

(۱)

۱۴ر جون ۱۹۵۱ء

جانم

مجھے امید ہے کہ تمہیں میرا پچھلا خط مل گیا ہوگا۔ ان خطوط کو اتنے سارے ہاتھوں سے گذرنا پڑتا ہے کہ ان کے پہنچنے میں تاخیر ناگزیر ہے۔ اس لئے اگر تمہیں کافی عرصے تک میرا کوئی خط نہ ملے تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ طویل عرصہ کی تنہائی اور بے کاری کے باعث انسان چند موضوعات پر کچھ عجیب انداز میں سوچنے لگتا ہے اور غالباً میرا پچھلا خط اسی کیفیت کا حامل تھا۔ لیکن تمہیں اُس پر کوئی خاص توجہ دینے کی ضرورت نہیں۔ اس سے تو صرف اس حقیقت کی نشاندہی ہوتی ہے کہ دل باتیں کرنے کو چاہتا ہے ایسی باتیں جو ہم نے کافی مدت سے نہیں کی ہیں۔ اس سے قطع نظر کہ یہ باتیں مجبوراً بر سرِ عام کی جا رہی ہیں۔

قید ہونے کے بعد سے میں نے اپنی چھوٹی نظم مکمل کر لی ہے جس کا یہ مطلب ہوا کہ میں نے پچھلے تین ماہ میں تقریباً اتنا ہی لکھا ہے جتنا پچھلے تین سالوں میں لکھا تھا لیکن یہ شاعرانہ جذبہ بھی اب اپنے اختتام پر پہنچا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ یہاں ہمارے ارد گرد اس قدر شور تھا کبھی اور ہنسی مذاق ہے کہ اس عالم میں سوچ بچار ممکن ہی نہیں۔ اس کے علاوہ ہم اپنے مقدمہ کی تیاری بھی کر رہے ہیں۔ اس لئے خود اپنی ذات کے متعلق کچھ کرنے دھرنے کی گنجائش نہیں۔ البتہ میں نے اپنی کھوئی ہوئی حس کا کچھ حصہ واپس حاصل کر لیا ہے اور مجھے امید ہے کہ جب یہ ہنگامہ ختم ہو جائے گا تو میں پھر لکھنے کی جانب متوجہ ہو جاؤں گا۔

یہاں موسم گرم ہونے لگا ہے لیکن ہوا چلتی رہتی ہے۔ اس لئے ناقابل برداشت نہیں ہوا ہے۔ لاہور تو تپ رہا ہوگا بچوں کا کیا حال ہے؟ تم کیسی ہو؟ کیا تم نے خرچ کا حساب متوازن کر لیا ہے؟ میں جانتا ہوں کہ تم پریشانیوں میں گھری ہوگی لیکن ہم اس سے بڑی پریشانیاں بھی جھیل چکے ہیں۔ اور مجھے امید ہے کہ یہ وقت بھی گزر جائے گا۔ جیسا کہ میں تمہیں بتا چکا ہوں تمہاری فکر کرنے کے علاوہ میں فارغ اور خوش و خرم ہوں۔ اب تو ہم شطرنج اور ٹینس بھی کھیلتے ہیں۔ اور کھانے پینے کی چیزیں بھی وافر ہیں

مجھے ابھی تک تمہارا خط نہیں ملا اس لئے جلد خط لکھو۔ منیزہ اور شمی کو میری جانب سے پیار کر لو۔

اور اگر فرصت ہو تو میری امی کی ڈھارس بندھانے کی کوشش کرو۔

تمہارا فیض

(۲)

۱۸ اگست ۱۹۵۱ء

جانِ من !

مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے خط کا جواب جو مجھے چار روز قبل موصول ہوا تھا تاخیر سے دے رہا ہوں۔ مجھے امید ہے
ہیں اس دوران میں میرا آخری خط مل گیا ہوگا۔ مجھے یہ جان کر اطمینان ہوا کہ تمہاری مکان کی پریشانی بالآخر دور ہوگئی۔ ان
یشانیوں اور مسائل سے الجھنے کے لئے تمہیں تنہا چھوڑ کر میں خود کو مجرم محسوس کرتا ہوں۔ لیکن شاید اس میں بھی بہتری کی
ورت ہو۔ جب تک لوگوں کو مصائب کا سامنا نہ ہو۔ ان سے برد آزما ہونے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی۔ پھر بھی میری
ں ہے کہ کاش میں تمہیں اُن سے نپٹنے کے لئے تنہا نہ چھوڑتا۔ بلکہ ہم دونوں مل کر تمام مشکلات کا سامنا کرتے۔ بہرحال ہمت
م پریشانیاں جلد ہی دور ہو جائیں گی۔ زندگی میں بے شمار ایسی باتیں ہیں جن کے لئے انسان زندہ رہنے کی تمنا کرتا رہتا ہے
ت ہے کہ انسان ہمیشہ جوان نہیں رہتا اور ضعیفی سے پہلے کے چند سال بیش بہا ہوتے ہیں۔ لیکن مجھے امید ہے کہ ہمیں ان
لوں کو اچھی طرح گزارنے کا موقع ضرور ملے گا۔ یہ دیکھ کر کہ یہاں کے نوجوان میرا بیحد ادب و احترام کرتے ہیں مجھے ہنسی بھی
ے اور رونا بھی۔ خاص طور پر اُس نوجوان کپتان کا جذبۂ احترام دیکھ کر جسے میں قرآن پڑھاتا ہوں۔ چونکہ یہاں کے مختصر سے
لوگ فوجی عہدوں کی بابت زیادہ توجہ نہیں دیتے۔ اس لئے ہر ایک سے یہی امید کی جاتی ہے کہ وہ اپنا کام خود کرے
ہاں بھی مجھے یہ سہولت حاصل ہے کہ مجھے سگریٹ یا ایک گلاس پانی کے لئے اٹھنا نہیں پڑتا۔ اس کا ایک افسوس ناک
ہے۔ وہ یہ کہ میری وہ تمام اچھی عادتیں جو میں نے لائلپور جیل میں بنائی تھیں تیزی سے چھوٹتی جارہی ہیں اور میں پہلے کی مانند
ہا ہوں۔ امّی نے تم سے غلط کہا ہے کہ میں دبلا ہوگیا ہوں۔ ہماری ملاقات رات گئے ہوئی تھی اور ممکن ہے انہیں یہ
اس بنا پر ہوا ہو کہ ہم انتہائی کشیدہ ماحول میں ملے تھے۔ انہیں یہ گمان تھا کہ مجھے اُن سے کوئی گلہ ہے اس لئے وہ اپنی
پیش کرنے لگے اور تم جانو صفائی پیش کرنے کا فعل مجھے بیحد بور کرتا ہے چونکہ مجھے کچھ زیادہ نہیں کہنا تھا اس لئے ہماری ملاقات جیسی
گوار ہونی چاہئے تھی نہ ہو سکی۔ جس کا مجھے رنج ہے۔ بہرحال یہ حقیقت ہے کہ میری صحت بالکل اچھی ہے اور سچ تو یہ ہے
اس بات کا افسوس ہے کہ میرا وزن بڑھ رہا ہے اور وہ دس پونڈ وزن جو لائلپور جیل میں کم ہوگیا تھا واپس مل رہا ہے

البتہ یہ بات یقیناً پریشانی کی ہے کہ ہم سب گنجے ہوتے جارہے ہیں چونکہ یہاں گرد زیادہ ہے اور میرے بالوں کی حالت
طور پر خراب رہتی ہے بدتر ہوتی جارہی ہے مجھے تو اندیشہ ہے کہ اس وقت تک جب میں جیل سے باہر نکلوں میں اپنی
لکشی بالکل کھو چکا ہوں گا جو یقیناً قابلِ رحم حالت ہوگی۔ اس لئے کہ پھر اسکینڈل پھیلانے والے کیونکر میرے متعلق کوئی
پھیلا سکیں گے۔ ایک بوڑھے اور گنجے سے کوئی اسکینڈل منسوب کرنا بلاشبہ دشوار ہوگا۔

امّی اور ابا کا بڑا پیارا خط ملا ہے۔ یہ خط میرا خط پہنچنے سے قبل لکھا گیا ہے۔ بہرحال اب انہیں میرا خط مل گیا ہوگا۔
فرصت ہو تو میرے خط کا انتظار کئے بغیر مجھے خط لکھتی رہا کرو۔ میرے پاس تو تمہیں بتلانے کے لئے ننھی ننھی باتیں یا خبریں
ہیں۔ لیکن میں تمہاری خیریت اور کبوتروں کی بابت معلوم کرنے کے لئے بیتاب رہتا ہوں۔ یہ جان کر کہ وہ کیا کر رہے ہیں
ڑی مسرت ہوتی ہے۔ کیونکہ میں ان کا تصور کر لیتا ہوں اور اس طرح ان کا قرب محسوس کرنے لگتا ہوں۔

اب یہ بات یقینی ہے کہ یہ مقدمہ چار پانچ ماہ چلتا رہے گا۔ لہذا تم اپنے آئندہ پروگرام میں اسی کے مطابق رد و بدل کر سکتی ہو۔ نوازش نے مجھ سے کہا ہے کہ طفیل ستمبر میں آنا چاہتے ہیں۔ اگر وہ آئے میں تو تم بھی ان کے ساتھ آ سکتی ہو۔ مجھے کتابیں مل گئی ہیں۔ بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ کتابیں یہاں پہنچ چکی ہیں اور مجھے جلد ہی مل جائینگی۔ میں نے حیدر کو لکھا ہے کہ میرے پاس امروز اور پاکستان ٹائمز بھیج دیا کرے کیونکہ مجھے انہیں منگوانے کی اجازت مل گئی ہے اور میں بے چینی سے ان کا انتظار کر رہا ہوں۔ اگر انھوں نے بھیجنا شروع نہیں کیا ہے تو تم کہکر جلد بھجوا دو۔

جب تک میرا پیار منیزہ اور دلچسپ معصوم چہروں کو میری جانب سے چوم لو۔ زیادہ پیار قبول کرو۔ منیزہ کو ابا کی جانب سے سالگرہ کی مبارک باد پہنچے۔

فیض۔

(۳)

اتوار ۱۹ ستمبر ۱۹۵۱ء

جانِ عزیز!

چھٹی کا ہفتہ ختم ہو رہا ہے اور کل ہم سب اپنی روزمرہ کی بیگار میں پھر مصروف ہو جائیں گے۔ اس ہفتہ ہم نے کئی سماجی تقریبیں منعقد کیں۔ پہلی تقریب "دوسرے گھر" پر کھانے کی دعوت تھی جس میں ہمارے گھر کے علاوہ ایک اور صاحب بھی مدعو تھے یہ دعوت اس "کوری کانی کولیٹر" کے اعزاز میں دی گئی جو بریگیڈیئر لطیف کو آم اور دیگر پھلوں کے ساتھ اپنی بیوی کی جانب سے موصول ہوئے۔ باہر جا کر کھانا کھانے کا تاثر قائم کرنے کی غرض سے ہم نے خاص لباس پہنا۔ دوسری شاندار تقریب وہ عید پارٹی تھی جس کے بارے میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ یہ غالباً پہلا موقع ہے کہ میں بچوں کی آوازوں کے نغموں سے محظوظ ہوا۔ حالانکہ ماضی میں انھیں کبھی گوارا نہ کرسکا۔ اکبر کے بچے اور تین چار دوسرے قیدیوں کی بیویاں اور بچے بھی آئے تھے جن کے ساتھ چند دوسرے رشتہ دار اور مقامی وکلا بھی تھے اور اس طرح ہمیں فرار کے چند گھنٹے نصیب ہو گئے مجھے یقیناً انتہائی مسرت ہوتی اگر تم بھی یہاں موجود ہوتیں لیکن شاید یہ بہتر ہی ہوا کہ تم شریک نہ ہو سکیں۔ ایسے موقعوں پر درد و کرب کا ناخوشگوار تاثر قائم ہو جاتا ہے اور اس لئے مجھے وقتی مسرت و سکون کے بجائے اُس خلش و کرب کا زیادہ احساس رہا جو بیویوں اور بچوں کے دلوں میں ایسے لمحات کے گزر جانے کے بعد پیدا ہو جاتا ہے یلیسٹڈ لزم کا یہ معمہ اب تک حل نہیں ہو سکا۔ کیا یہ مناسب نہیں کہ انسان وقتی مسرتوں سے محض اس لئے کنارہ کشی کرلے کہ اس کے بعد پیدا ہونے والے اضطراب سے بچ جائے۔ کیونکہ یہ ممکن نہیں ہے کہ موجودہ اور آنے والے لمحات کو متوازن کیا جا سکے۔

یہاں کی زندگی معمولی جزئیات میں اتنی الجھی ہوئی ہے کہ کسی کو اخلاق و فلسفہ پر غور کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ چند دنوں تک ہم اپنے نئے ریڈیو سیٹ میں اتنی گہری دلچسپی لیتے رہے جتنی دلچسپی شمیم فلمی نغموں میں لیتی ہے۔ اس کے بعد ایک کالی بلی نے ہمارے وارڈ میں ایک سیاہ و سپید بچے کو جنم دے کر ہمارے لئے بچوں کی پرورش کا مسئلہ کھڑا کر دیا۔ پھر عید کی دعوت کے لئے کھانے کی اقسام طے کرنے کا مسئلہ آیا۔ ان کے علاوہ بھی متعدد داخلی مسائل ہیں۔ مثلاً ہمارے زندان کے لئے پردوں کی فراہمی۔ چارپائی اور صبح کی چائے کا انتظام وغیرہ۔ ان تمام مراحل کے درمیان دنوں کی یکسانیت کے ادبدا دوں کے سائے پھیلتے جاتے ہیں اور وقت کی نبض مدھم ہوتی جاتی ہے۔

چونکہ دن چھوٹے ہونے لگے ہیں۔ اس لئے جب ہم صبح کی چائے کے لئے اٹھتے ہیں تو کافی اندھیرا چھایا رہتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مجھے طلوعِ سحر سے اور سونے جیسے پیلے چاند کو رفتہ رفتہ سفید پڑتے دیکھے ہوئے سالوں گذر چکے ہیں۔ وہ جیل کی دیواروں میں بھی حسین نظر آتا ہے اور دل چاہتا ہے کہ تمام پریشانیوں کے باوجود زندگی کا شکریہ ادا کیا جائے۔

تاثیر کی کتاب مجھے آج مل گئی ہے۔ میں مزید کارروائی جلدی کروں گا۔ کاش مجھے اتنا ذہنی سکون میسر ہو تاکہ میں اس کے ساتھ انصاف کرسکتا۔ بہرحال میں اپنی بہترین کوشش کروں گا۔ ان کی نظموں کا کیا بنا؟ اگر مسودہ مکمل ہو چکا ہے تو یہ ممکن نہیں کہ تم اسے چھپوا دو۔ اس کے لئے حمید احمد خاں سوانحی خاکہ تحریر کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد کسی تعارفی مضمون کی ضرورت نہ رہے گی۔ بالآخر مجھے جیل کے افسران سے ۱۷۵/- روپے کا چیک مل گیا ہے لیکن اس میں تمہارا الاؤنس بھی شامل ہے۔ اس طرح ان لوگوں نے تمہیں تقریباً چھ سو روپے کا گھاٹا دیا ہے۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ میرے جیل کے اخراجات کے لئے دو سو روپے ماہانہ کا الاؤنس منظور کیا گیا ہے اور یہ رقم تمہارے الاؤنس کے علاوہ ہوگی۔ لیکن اب ان لوگوں نے دونوں کو ملا کر تین سو کی رقم بنا دی ہے اس پر مستزاد یہ کہ ان لوگوں نے اس کی ادائیگی ۹ مارچ کے بجائے جس دن میں گرفتار کیا گیا تھا اس دن یعنی ۱۸ مارچ سے شروع کی ہے جو باعثِ حیرت ہے۔

میں مناسب نہیں سمجھتا کہ اس کے متعلق جھک جھک کروں لیکن شاید تم اس کی بابت کچھ کرسکو بلکہ ٹھیک تمہیں خود کو چھوٹا محسوس کرنے کی نوبت نہ آئے۔ میں تمہیں اس خط کی نقل بھیج دوں گا۔ جیل والے تمہیں رقم بھی بھیج دیں گے۔ کم از کم تمہارا کراچی تک کا کرایہ تو نکل ہی آئے گا۔ میرے خیال میں میرے لاہور منتقل کئے جانے کے امکانات کم ہیں۔ اس لئے تم اپنے پروگرام کے مطابق آسکتی ہو۔ میں بصد اشتیاق منتظر ہوں۔ تمہیں اور بچوں کو بہت بہت پیار

تمہارا فیض

(۴)

ہفتہ۔ ۲۲ مئی ۱۹۵۴ء

جانِ عزیز!

تمہارے تمام خط مل گئے۔ انھیں پاکر میں خود کو متمول اور گرم محسوس کرنے لگا ہوں (غالباً مجھے گرم کے بجائے سرد لکھنا چاہئے اس لئے کہ جہنم کی قسم کی یہاں سخت گرمی ہے) چونکہ ہمیں ابھی اگلے بیس سال تک اسی زبان کا استعمال کرنا ہے اس لئے میرے خیال میں یہی مناسب ہے کہ انگریزی محاوروں کو پھیلانے کی سعی کی جائے اور گرم کے بجائے سرد و سرد کے بجائے گرم اور دھوپ کے بجائے بارش وغیرہ کا استعمال شروع کر دیا جائے۔ حیدرآباد میں اکبر اور میں نے اس قومی کام میں ہاتھ بٹانے اور اردو کے محاوروں کو انگریزی میں منتقل کرنے کی کوشش کی تھی مثلاً۔ (Heart being garden garden) "دل باغ باغ ہوگیا"۔ دلچسپ نہ ہوتے ہوئے بھی کافی مشہور ہے لیکن چند دیگر مثالیں تو واقعی لاجواب ہیں مثلاً He is (Straightening his own owl) "وہ اپنا الو سیدھا کر رہا ہے" یا His parrot is (Shrieking in every place) "ہر طرف اس کا طوطی بول رہا ہے" ـــــ لیکن میں تو گرمی کی بات کر رہا تھا۔ یہاں جہنم کی گرمی پڑ رہی ہے اور لاہور بھی اس سے بہتر نہ ہوگا۔ ممکن ہے بدتر ہو۔ بہرحال میں زیادہ پریشان نہیں ہوں۔ ناشتہ کے بعد ہی میں خود کو اپنے کمرے میں بند کر لیتا ہوں۔ میرا کمرہ کافی ٹھنڈا ہے جس کے لئے میں غفار خاں کا شکر

گزارا ہوں۔ وہ بھی یہیں رہ چکے ہیں۔ اور پھر اس وقت تک باہر نہیں نکلتا جب تک دن ڈھل نہیں جاتا۔ میرا بیشتر وقت مطالعہ میں صرف ہوتا ہے۔ لیکن اب میری بینائی پہلے جیسی نہیں رہی اور مجھے بار بار رک کر اپنی آنکھوں کو آرام پہنچانا پڑتا ہے جس سے پڑھنے کا لطف جاتا رہتا ہے۔ انسان خلا میں نہ سوچ سکتا نہ محسوس کر سکتا ہے۔ پھر بھی میں نے ایک ہی نشست میں روزنبرگ کے تمام خطوط پڑھ ڈالے۔ مگر بار بار مجھے کتاب رکھ دینا پڑی ہے تاکہ اپنی سانس سمیٹ سکوں انھیں پڑھتے ہوئے میرا گلا بھر آتا رہا ہے۔ ان دنوں میں فریزر کی مشہور کتاب "سنہری شاخ" (GOLDEN BOUGH) پڑھ رہا ہوں۔ میں نے اس کتاب کو کالج کے ایام میں سرسری طور پر پڑھا تھا اور میرے دل میں اسے اطمینان سے پڑھنے کی خواہش موجود تھی۔ (جن دوسری کتابوں کو اطمینان سے پڑھنے کی خواہش باقی ہے اُن میں ہولاک ایلس اور برٹن کی تحقیقات، یونانی ڈرامے رادھا کرشنن کی کتاب ہندوستانی فلسفہ اور کنفیوشس کی تصنیفات شامل ہیں۔ تم فراخ دل دوستوں کے شیلف پر ان کتابوں کو تلاش کرتی رہنا) میں ختم کر لوں تو تم بھی فریزر کا مطالعہ کر لو۔ ہمارے ملک کے لوگوں کی بنیادی تعلیم کے لیے اس کا مطالعہ لازمی ہے۔ رہی بات میری شاعری کی تو حقیقت یہ ہے کہ ذہن میں تو بہت کچھ ہے لیکن کاغذ پر برائے نام۔ جیل سے متعلق جتنے موضوعات ہو سکتے تھے میں ان سب پر لکھ چکا ہوں اور اب جیل میں کسی نئے موضوع کی توقع نہیں ہے۔ جیل کے باہر جو کچھ ہو رہا ہے اس کے متعلق کچھ لکھنا ممکن نہیں ہے۔ بہر حال میں دو تازہ نظمیں منسلک کر رہا ہوں۔ ایک کا محرک روزنبرگ ہے اور دوسری کا لاہور جیل۔ یہ نظمیں ایسی تو نہیں کہ خاص طور سے تمہارے پاس بھیجی جائیں لیکن ممکن ہے وکٹر انھیں مجموعہ میں شامل کرنے کے لیے پسند کرے۔

مقامی اخبارات میں مجھے شیبی کا دلچسپ چہرہ نظر آیا ہے۔ میں بیحد خوش ہوا۔ مجھے یہ معلوم نہیں کہ شہرت حاصل کرنے کے لیے میری کون سا کارنامہ انجام دینے والی ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ کچھ نہ کچھ ضرور کرے گی اور قبل اس کے کہ ہم جان سکیں ہمارا گھر الف لیلوی جنوں سے بھر جائے گا!

جیسا کہ تم دیکھ سکتی ہو، میں خوش و خرم ہوں لیکن تمہاری اور بچوں کی یاد دل میں کچوکے مارتی رہتی ہے۔ اپنا خیال رکھو اور کسی بات کی فکر نہ کرو۔ کیونکہ اب یہ ہماری جدائی کا آخری موسم گرما ہے۔ چند ہفتوں بعد ہم آخری سال کے بیچ کے اوپر پہنچ چکے ہوں گے اور پھر اپنے ملاپ کے بقیہ مہینوں کی ڈھلوان پر اترنا شروع کر دیں گے۔ بچوں کو میری جانب سے پیار کرو۔

تمہارا

فیض

(۵)

ہفتہ ۱۳ر جون ۱۹۵۴ء

جانم!

دو روز ہوئے تمہارا خط ملا جو خوشگوار نہ تھا لیکن اور چیزوں کے علاوہ ان دنوں موسم بھی ایسا نہیں ہے کہ بہت بڑھا سکے۔ آؤ ہم دونوں ان حالات پر اس انداز میں غور کریں۔ اگلے دو دنوں کے بعد ہم جون کے وسط میں ہوں گے اور اگلے دو ہفتوں کے بعد ہم موسم گرما کے وسط میں ہوں گے اور ایک ماہ بعد ہم اس خراب موسم گرما کو پیچھے چھوڑ چکے ہوں گے۔ اس کے علاوہ ایک ہفتہ کے بعد دن چھوٹے ہونے لگیں گے۔ راتیں طویل اور سائے گھٹنے لگیں گے۔ تمہیں براؤننگ کی وہ نظم یاد تو

ہو گی۔

سال کے اس حصے میں دن کافی طویل ہوتے ہیں
لیکن راتیں — کم از کم راتیں تو چھوٹی ہوتی ہیں

تم کہو گی کہ یہ تمام باتیں احمقانہ ہیں کیونکہ ان سے نہ دن کی تمازت میں کمی آجائے گی نہ ہماری جیب میں کوئی رقم پہنچ جائے گی۔ ممکن ہے تمہارا خیال صحیح ہو لیکن موجودہ حالات میں ہمارے پاس الفاظ اور جذبات کے علاوہ اور کیا ہے؟ مثلاً امید۔ ہمت اور محبت یہ سب قابل فخر سرمایہ ہے جس سے روح کی بالیدگی اور دل کی مسرت قائم رہتی ہے لہذا لازم ہے کہ ہم مسرور و شادماں رہیں اور گرمی۔ خالی جیبوں اور ویران دلوں کو جہنم میں جھونک دیں۔ طاہرہ اور جان کے متعلق جان کر دکھ ہوا۔ معصوم بچے۔ میرے خیال میں یہی بہتر ہو گا کہ وہ تمہارے ساتھ ٹھہریں اور پنڈ ہواڑے پر سفر کر لیا کریں۔ کچھ زیادہ خرچ بھی نہ آئے گا۔ عنایت ملتان میں ہے اور ممکن ہے کہ وہ کچھ مدد کر سکے۔ مجھے اس کے خط کا جواب دینا ہے اور میں اگلے ہفتے اسے خط لکھنے کی سوچ رہا ہوں کیونکہ ممکن ہے کہ موسم کی وجہ سے تم نہ آسکو جس کا یہ مطلب ہو گا کہ ہفتہ کے بجائے میں تمہیں پیر کو خط لکھوں گا۔ مجھے تمہاری مالی پریشانیوں کا حال سن کر افسوس ہوا۔ میری رائے میں مناسب یہ ہو گا کہ تم اپنی مختصر بچت میں سے اتنی رقم نکال سکتی ہو، جو یوسف کی جانب واجب الادا ہے اس لئے کہ جلد یا دیر سے روف وہ رقم ضرور ادا کر دے گا اور اس وقت تم اپنی بچت سے نکالی ہوئی رقم واپس کر سکتی ہو۔ تم کراچی کے اخباروں کیلئے مضامین کیوں نہیں لکھتیں؟ ضروری نہیں کہ تم افسانے ہی لکھو۔ اس کے لئے تمہیں سکون اور محنت کی ضرورت ہو گی لیکن تم عورتوں اور بچوں کے بارے میں مضامین یا رپورتاژ لکھ سکتی ہو اور مجھے امید ہے کہ تمہیں ان کا معاوضہ مل جائے گا۔

ڈکر کو خط لکھو تو لکھ دینا کہ اگر اس کے خیال میں میرے وہ مضامین جو میں "نیو اسٹیٹسمین" کے لئے بھیج رہا ہوں۔ اچھے ہیں تو وہ انھیں بھیجتا رہے۔ چند سال قبل کنگسلے مارٹن نے مجھ سے کچھ ترجمے مانگے تھے لیکن میں نے کہا تھا کہ میرے پاس اچھے ترجمے نہیں ہیں۔ اب بھی میری یہی رائے ہے لیکن ممکن ہے میں غلطی پر ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ ڈکر یا نذیر انگلستان کی کسی اچھی نرسری سے پھولوں کے بیج کے چند پیکٹ خرید کر مجھے بھیج دیں۔ انھیں ضرور معلوم ہو گا کہ وہاں گرمیوں کے اور یہاں سردیوں کے کون سے پھول ہوتے ہیں۔ ——— چھوٹے پیکٹ کی قیمت چند پنس سے زیادہ نہ ہو گی اور ڈاک خرچ بھی چند شلنگ سے زیادہ نہ ہو گا۔ دوکاندار خود میرے پاس بذریعہ ڈاک بھیج سکتا ہے۔

میں نے فینسی ڈریس کی تصویر میں بھولے بھالے چہروں کو تلاش کرنے کی کوشش کی تھی لیکن میری بصارت نے میری مدد نہ کی۔

یہاں گرمی ضرور ہے لیکن ناقابلِ برداشت نہیں اور میں بالکل تندرست اور توانا ہوں۔ بالکل فلورن سکہ کے مانند ——— یہ جملہ چوسر کا ہے جو ان دنوں میرے مطالعہ میں ہے۔ مجھے موسم کی تبدیلی کا انتظار ہے۔ وقت سے پہلے کیونکہ اس کا مطلب محض موسم برسات کی آمد سے کچھ زیادہ ہو گا۔ تمہارا بھی انتظار ہے۔

تون مارچ

فیض۔
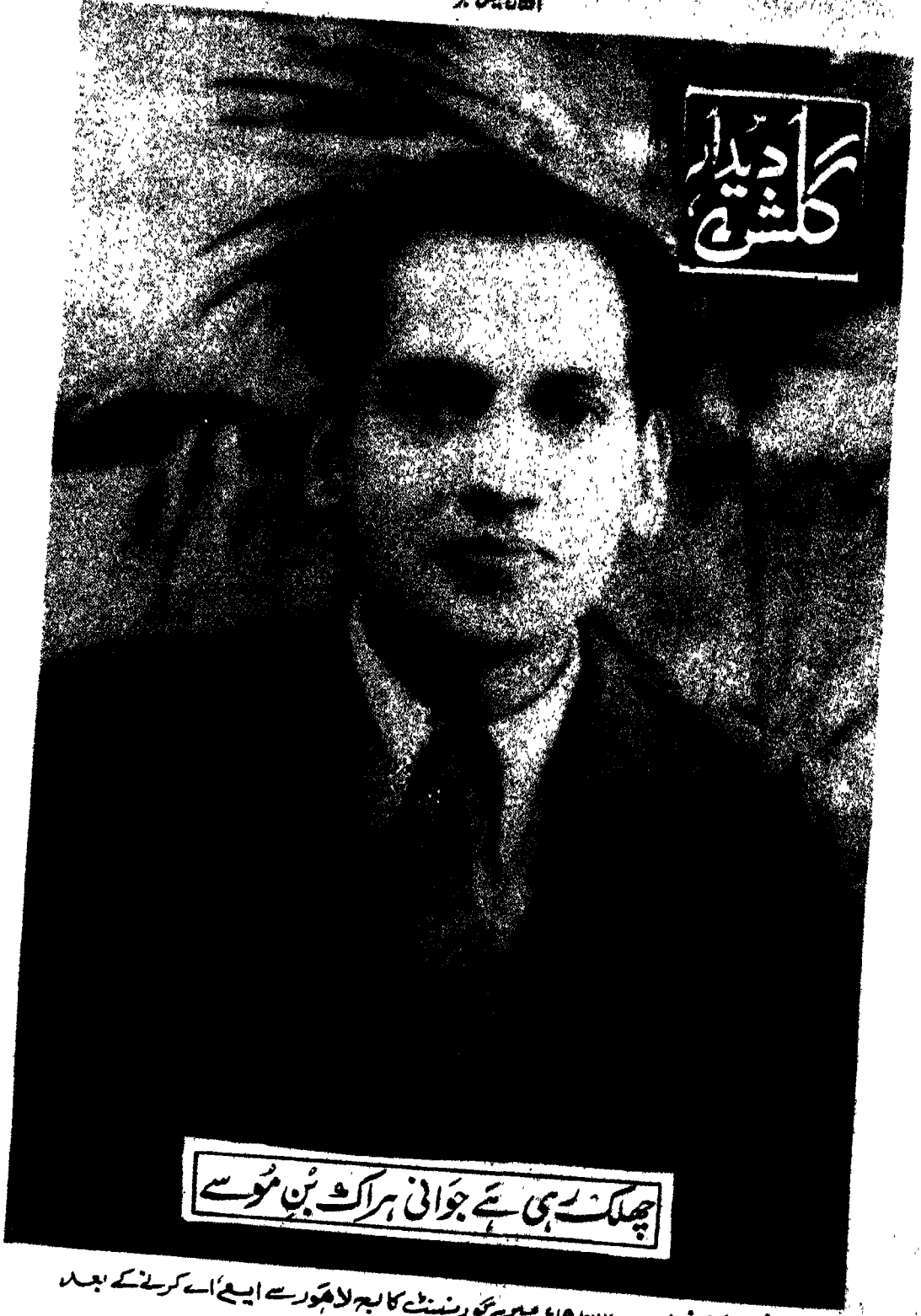
چھلک رہی ہے جوانی ہر اک بُنِ مُو سے

فیض کا شباب - ۱۹۳۳ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے کرنے کے بعد

کیسے اک چہرے کے ٹھہرے ہوئے مانوس نقوش
دیکھتے دیکھتے یک لخت بدل جاتے ہیں

فیض جنیوا کی بین الاقوامی کانفرنس میں
پاکستانی مندوب کی حیثیت سے (۱۹۴۹ء)

فیض، ایلس فیض کے ہمراہ،
راولپنڈی سازش کیس سے رہائی کے فوراً بعد (۱۹۵۵ء)

فیض، پاکستان ٹائمز کرکٹ کلب کے بیٹسمین
کی حیثیت سے فیلڈ میں (۱۹۵۶ء)

فیض فلم جاگو ہوا سویرا کی شوٹنگ کے دوران،
مشرقی پاکستان کے ایک گاؤں شیتول میں (۱۹۵۵ء)

کل پاکستان پوسٹمین یونین کے صدر کی حیثیت

لاہور میں کل پاکستان پوسٹمین یونین کے اجلاس میں فیض کی صدارتی تقریر ۱۹۵۵ء

ریلوے مزدور یونین کے نائب صدر کی حیثیت

ریلوے مزدور یونین کے جلسہ منعقدہ لاہور میں فیض تقریر کر رہے ہیں (۱۹۴۸ء)
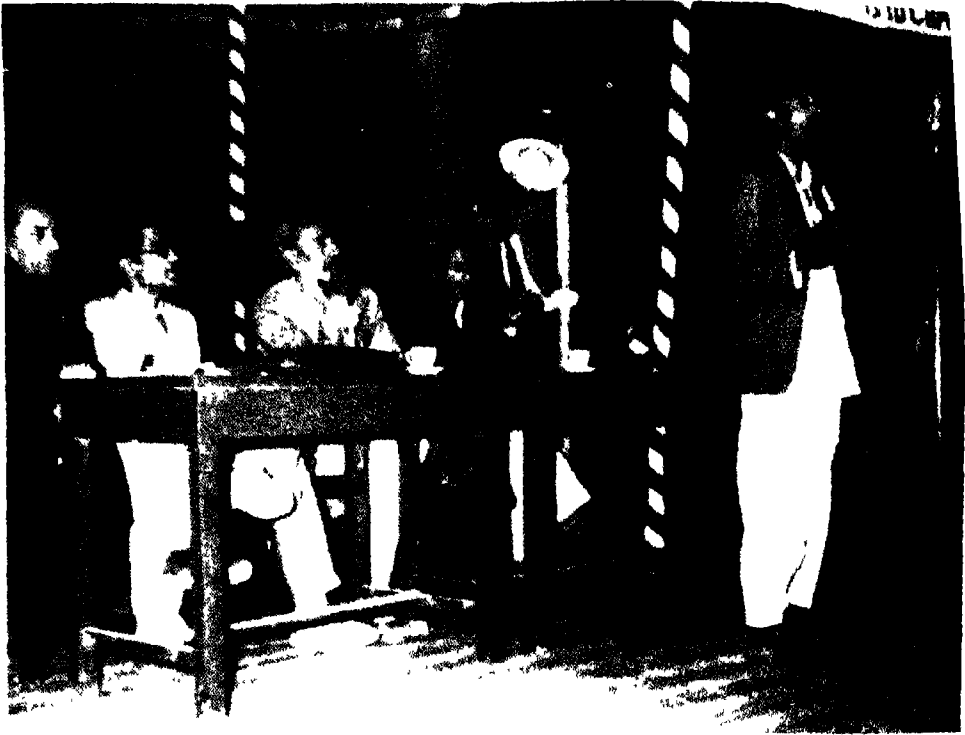
انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان کی سالانہ کانفرنس (۱۹۴۹ء)
جس کی مشترکہ صدارت (بائیں سے) فیض، احمد ندیم قاسمی،
سید مطلبی فرید آبادی اور ریحٰن روئی نے کی۔

لاہور کے ہوائی اڈے پر روسی ادیبوں کے وفد کے ہمراہ (۱۹۴۹ء)
دائیں جانب سے تیسرے نمبر سے احمد ندیم قاسمی، حمید اختر، ممتاز حسین اور فیض

فیض، پاکستان ٹائمز کی کرسیٔ ادارت پر کے، ایچ، خورشید
صدر آزاد کشمیر اور امین برین کے ہمراہ - (لاہور ۱۹۵۶ء)

فیض، پنڈی سازش کیس سے رہائی کے بعد 'پاکستان ٹائمز'
اور 'امروز' کے عملے کی استقبالیہ دعوت میں - (۱۹۵۵ء)
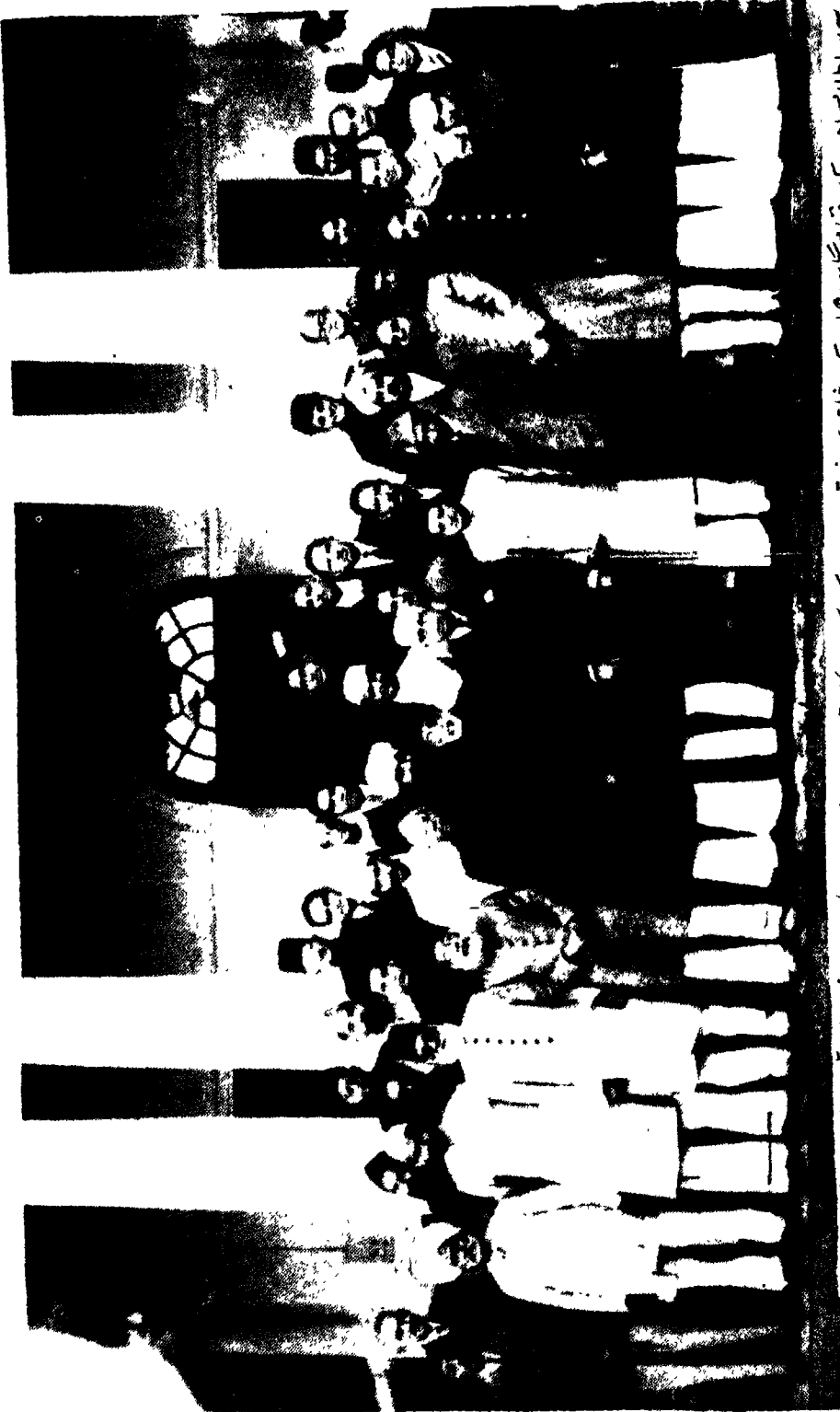
سر سلطان احمد کی قیام گاہ دہلی کے مشاعرہ منعقدہ ۱۹۴۱ء کی ایک یادگار تصویر۔ پہلی صف، (دائیں سے): روش صدیقی۔ حیات اللہ انصاری۔ حفیظ جالندھری۔ سیماب اکبرآبادی۔ ہز رضا علی۔ ثاقب لکھنوی۔ سر سلطان احمد۔ حسرت موہانی۔ مولوی عبدالحق۔ احسن کچھوچھوی۔ جوش ملسیانی۔ حیرت شملوی۔ دوسری صف: ممتاز حسن۔ مجید ملک۔ جمیل قدوائی۔ اسد ملتانی۔ عبدالعزیز فطرت۔ فیض احمد فیض۔ ڈاکٹر عابد حسین۔ عرش ملسیانی۔ تلوک چند محروم۔ بہزاد لکھنوی۔ حسن فیروز۔ تیسری صف: زاہد حسین۔ غلام محمد۔ خواجہ عبداللہ۔ ایشور دیال۔ شجاعت علی صدیقی۔ اے ڈی اظہر۔ پروفیسر محمد مجیب۔ چودھری محمد علی۔ عبدالرحمن صدیقی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین۔ آنند نرائن ملا۔

فیض کی زیرِ قیادت پاکستانی صحافیوں کا وفد پیکنگ میں چین کے وزیرِ اعظم چو این لائی کے ساتھ (۱۹۵۶ء) پہلی صف دائیں سے :۔ ...... میر خلیل الرحمٰن، چو این لائی، فیض، محسن علی ۔ اور آخر میں مختار زمن ۔ عقب میں ، احمد ندیم قاسمی، عمر قریشی، مولوی اختر علی، ظفر نیازی، قطب الدین عزیز اور دوسرے

ایشیائی کانفرنس دہلی کے دوران
دائیں سے: سردار جعفری - نیاز حیدر - فیض،
بیگم قدسیہ زیدی - جینندر کمار، آل احمد سرور،
بیگم زیدی کے گھر (۱۹۵۶ء)

روسی ادیبوں کے وفد کے استقبال کا ایک منظر (۱۹۴۹ء) پہلی صف میں دائیں سے پہلے نمبر پر قتیل شفائی، چوتھے نمبر پر فیض، اور آخر میں قمر ہاشمی نظر آ رہے ہیں

فلم "جاگو ہوا سویرا" کے یونٹ کے ہمراہ (۱۹۵۷ء) سامنے فیض اور سرور بارہ بنکوی نظر آ رہے ہیں
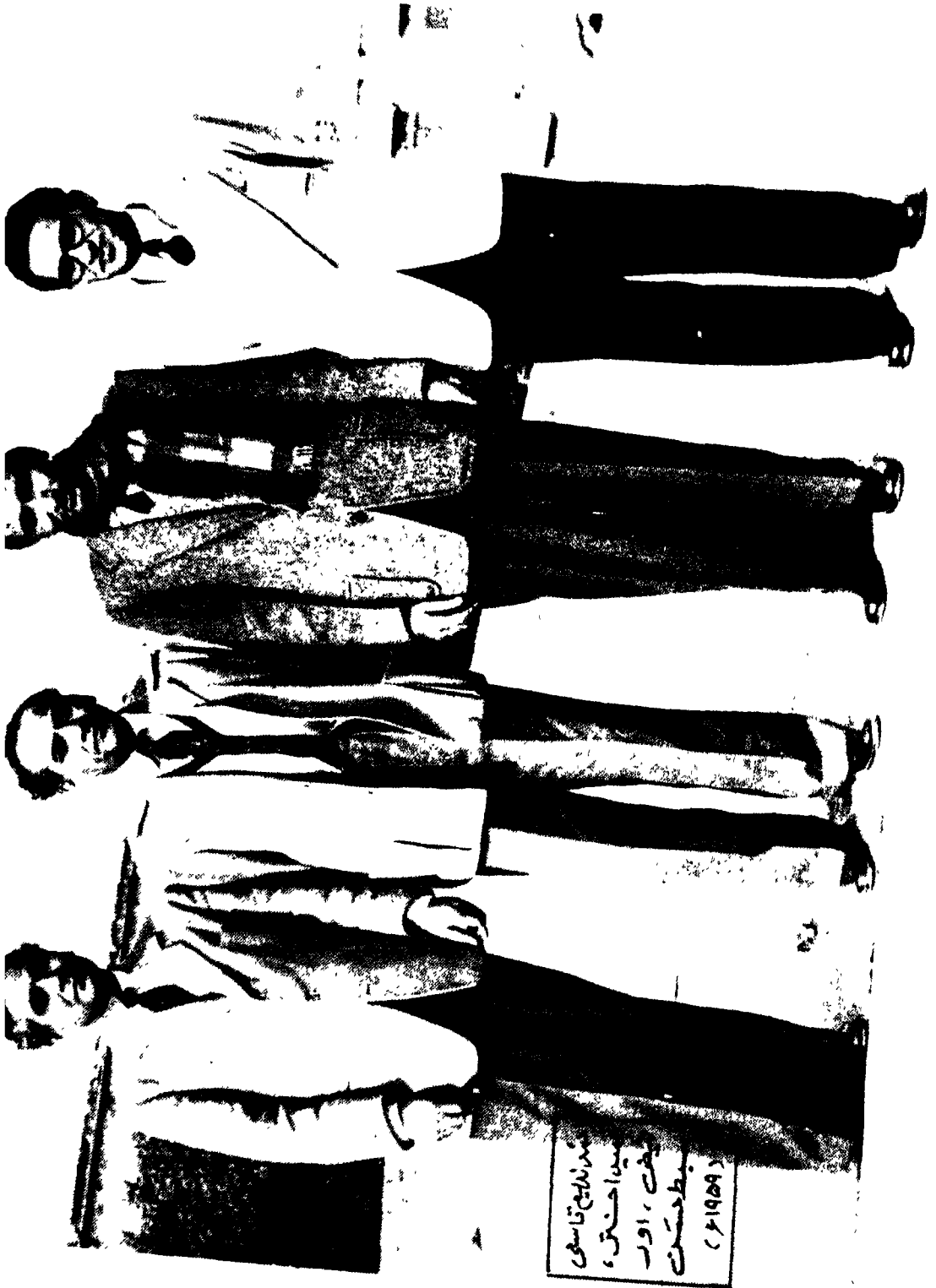
مد ندیم قاسمی،
یا احمد فیضی،
جعفر، اور
بطرس
(۱۹۵۹ء)

فیض، ادبیہ ایر تھیٹر لاہور میں فن کار زوبی اوران کی تخلیق مجسمہ فیض کے ساتھ ۱۹۷۹ء)

فیض، مصور صادقین اور نقاد وحید الدین (۱۹۶۴ء)

بائیں سے: فلمسٹار راج کپور، سلطانہ جعفری، فیض، سردار جعفری، عصمت چغتائی اور محمد زبیر (بمبئی)

پاکستان کے ھائی کمشنر راجہ غضنفر علی خاں کے زیر اھتمام یوم اقبال کے موقع پر دھلی کا ایک ھند و پاک مشاعرہ جس میں بھارت کے نائب صدر (موجودہ صدر) رادھا کرشنن اور وزیر خوراک اجیت پرشاد جین نے بھی شرکت کی۔ (۱۹۵۶ء)
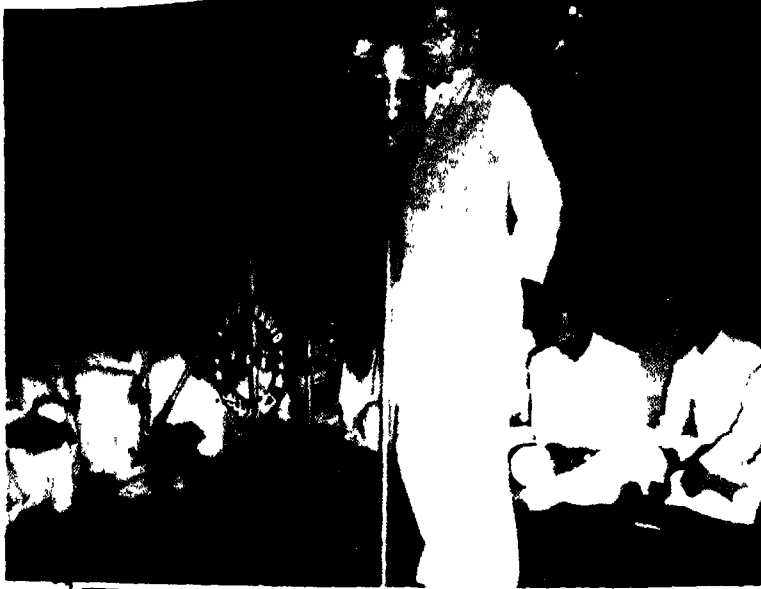
حیدر آباد کے ایک مشاعرے میں فیض [illegible]۔ پس منظر میں دائیں جانب شوکت تھانوی اور احسان دانش نظر آ رہے ہیں
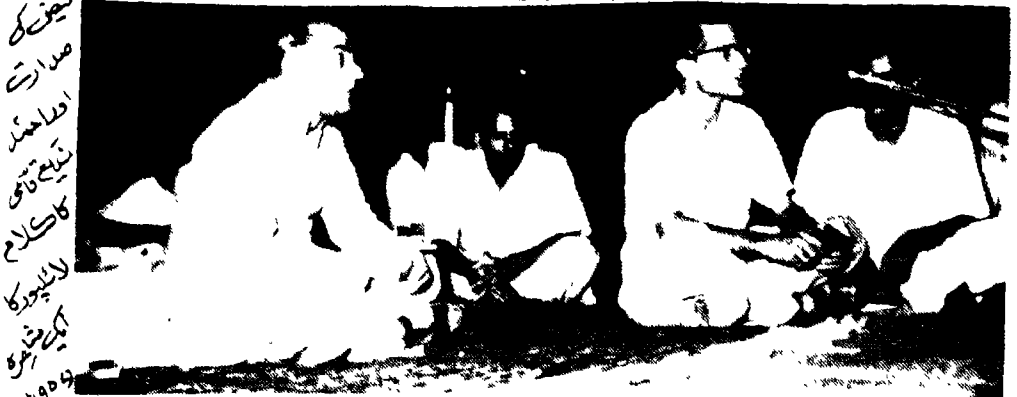
فیض کی صدارت اور احمد ندیم قاسمی کا کلام لائلپور کا ایک مشاعرہ (۱۹۵۶ء)

احمد ندیم قاسمی، فیض اور ایک بھارتی ادیب

قتیل شفائی، کشمیری لال ذاکر، فیض اور ساحر لدھیانوی
(ہند و پاک مشاعرہ دہلی - ۱۹۵۶ء)

فیض، فقیر وحید الدین اور ابراہیم جلیس،
فقیر وحید الدین کی تصنیف "[illegible]" کی تقریب اشاعت پر ایک ڈنر میں (اپریل ۱۹۶۵ء)

بائیں سے: ظہور نظر، احمد ندیم قاسمی، فیض، محسن بھوپالی اور جعفر منصور
(کل پاکستان مشاعرہ سکھر۔ ۱۹۶۵ء)

فیض اور ہندوستان کی مشہور اداکارہ نرگس - (بمبئی)

فیض پاکستانی فلمسٹار یاسمین کے ساتھ (لاہور)

کارٹونوں کی نمائش

۱۹۷۵ء

افتتاح کے بعد
فیض کارٹون
دیکھ رہے ہیں
ان کے دائیں جانب
[illegible]
[illegible]
[illegible]

جشنِ فرید ملتان
کی مجلسِ مذاکرہ
۱۹۷۲ء

فیض کرسیِ صدارت پر
اُن کے دائیں جانب
مسعود اشعر ہیں

مزارِ قائدِ اعظم پر
(۱۹۶۵ء)
اگلی صف میں
فاطمہ رسول حمزہ
رسول حمزہ
...... فیض
شوکت صدیقی
جمیل الدین عالی
اور
کمانڈر انور

فیض
سرسید گرلز کالج کراچی
کی
اراکین یونین اور پرنسپل
کے ساتھ

فیض کراچی یونیورسٹی
کی بزم ادب کی
انعام یافتہ افسانہ
نگاروں کے ساتھ)
(دائیں سے،
نوھیدہ سعید
ھاجرہ مسرور
(جج انعامی مقابلہ)
انیسہ ھلال
فیض
نسرین جعفری
اور شہلا تزئین
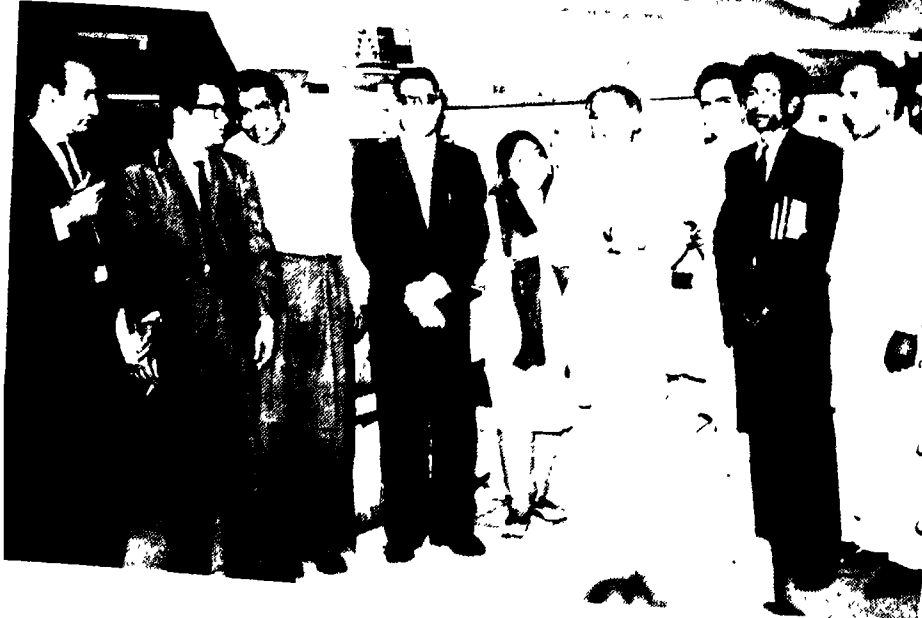
فیض
مکتبہ انجمن کتب بکھ
کراچی میں اپنی کتابیں
فروخت کرنے کے بعد
دائیں جانب
تیسرے نمبر سے؛
ناصر کاظمی؛
جمیل الدین عالی،
فیض
سحاب قزلباش
ابن انشا
ابراہیم جلیس
مشفق خواجہ
اور حمید اختر

(تاشقند ۱۹۵۰ء)
دائیں سے ۔ فیض ، شہرۂ آفاق ترکی شاعر ناظم حکمت ، چیف منیر حفیظ جالندھری اور اشفوپور منیر بیٹو ڈاکٹر ملک راج آنند

فیض سیشن تھیٹر کے اداکاروں کے ہمراہ
(سمرقند ۔ ۱۹۶۳ء)

فیض اور عالی، مشہور روسی شاعر رسول حمزہ اور ان کی بیوی کے ساتھ کراچی میں (۱۹۶۴ء)

تاشقند میں مشہور ادیب موسیٰ ایبک کے گھر ایک دعوت

دائیں سے ۔ موسیٰ ایبک ، ان کی صاحبزادی ، فیض اور حفیظ جالندھری ـــــــ (۱۹۵۸ء)

انگلستان کا ایک گھر ۔ فیض ، محمد نبی جان ، اُن کی بیوی بہن ، ماں اور بچوں کے ساتھ (۱۹۶۳ء) محمد نبی جان صاحب فیض کے مجموعۂ کلام ۔ "دستِ صبا" کا ترجمہ کر چکے ہیں ۔

فیض ، سائبیریا میں طلبہ و طالبات کے ایک کیمپ کے مہمانِ خصوصی (۶۳ء)

فیض — لینن امن انعام کمیٹی کے صدر پروفیسر سکوبلٹسن کے ساتھ

۱۹۶۲ء ... میں روسی خلانوردوں ، گگارین - تیتوف اور نکولائیف کے ساتھ ماسکو کی ایک تقریب میں -
... کے فرائض انجام دے رہی ہیں -

اوزار - عصر حجر
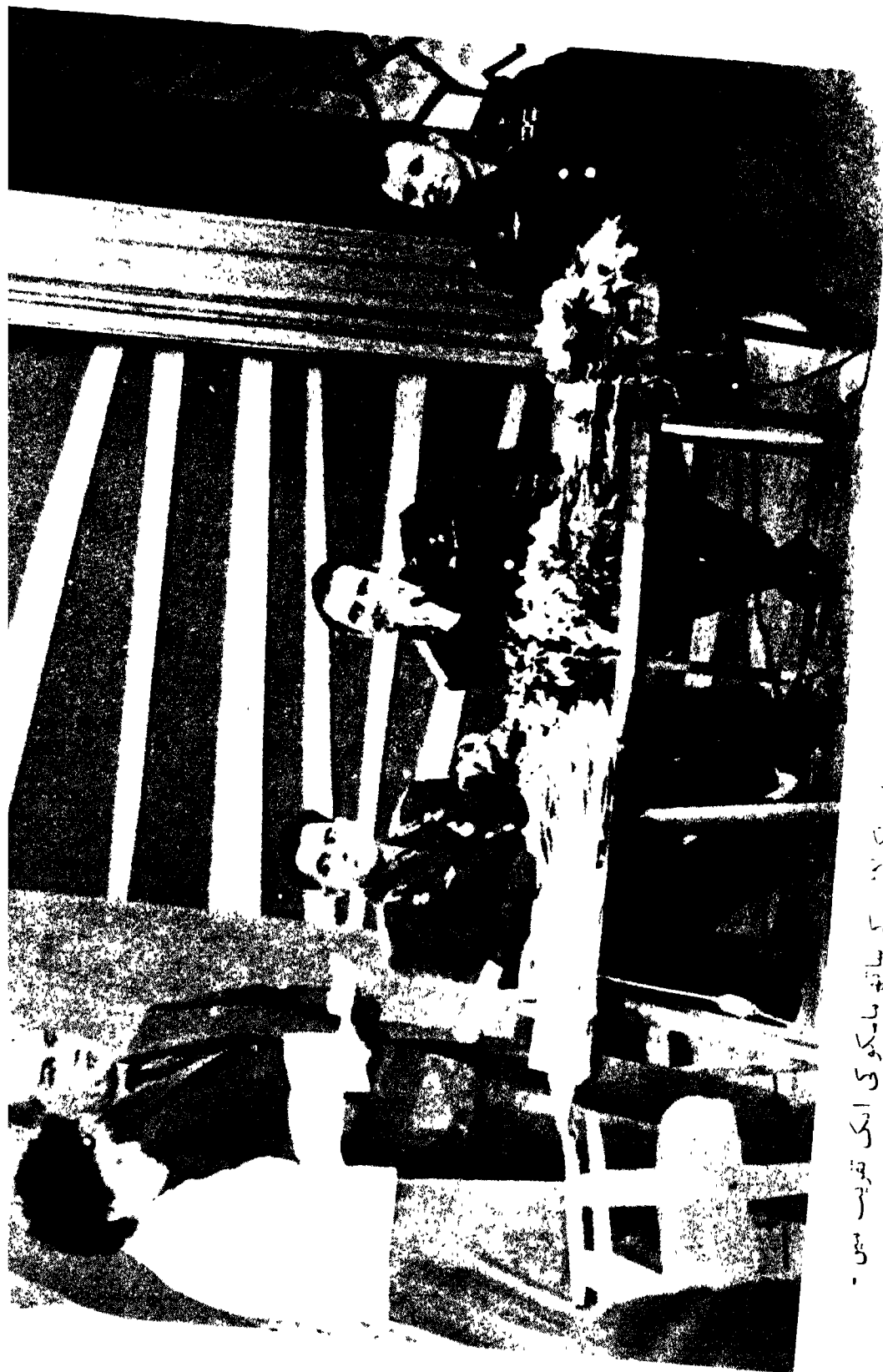
موضوعِ سخن

اپنا موضوعِ سخن ان کے سوا اور نہیں

چند پرچے

- پیارے فیض۔ ہم اس خبر سے بہت مسرور ہیں کہ تم ایک بار پھر آزاد ہو۔ سوویت عوام اور سوویت یونین کی بے شمار انجمنوں کی جانب سے مبارکباد قبول کرو۔ ہماری دعا ہے کہ تم صحت و عافیت کے ساتھ دنیا کے عوام کی جن میں پاکستانی عوام بھی شامل ہیں، ایک جیتی اور خوشحالی کے لئے اپنی بہترین صلاحیتوں سے عرصۂ دراز تک خدمت کرتے رہو۔

ماسکو۔ ۴ رمارچ ۵۹ء (مرزا ترسون زادہ۔ اناتولی سوفرونوف)

- جیل سے آپ کی رہائی پر ہم سب نے خوشی محسوس کی۔ دوبارہ آزاد فضا میں سانس لینے پر دلی مبارکباد۔ پاکستانی ادب کے ارتقاء، امن کی جدوجہد اور افرو ایشیائی مصنفین کے دوستانہ روابط کو مستحکم بنیادوں پر قائم کرنے کے لئے ہماری نیک تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

پیکنگ۔ ۲۵ راپریل ۵۹ء (ممبران انجمن مصنفین عوامی جمہوریہ چین)

- پیارے فیض۔ ہم آپ کی رہائی کی خبر سے بے حد مسرور ہوئے۔ آسٹریلوی ادیب اور عوام آپ کی ادبی کاوشوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ ماسکو کے دوران قیام آپ سے ملاقات کی یادیں آج بھی میرے لئے فرحت بخش ہیں۔

میلبورن (آسٹریلیا)، یکم جون ۵۹ء (جوڈا واٹن)

- پچاس سالہ جشن سالگرہ پر ہماری دلی مبارکباد۔ عالمی امن و آزادی کے مجاہد! ہماری دعا ہے کہ آپ عرصۂ دراز تک زندہ و سلامت رہیں، اور اپنی شاعری میں نئی وسعتیں پیدا کریں۔

آپ کے پچاس سالہ جشن سالگرہ کے شرکاء

ماسکو۔ ۱۹۶۱ء ممبران انجمن مصنفین سوویت یونین

- بین الاقوامی لینن امن انعام حاصل کرنے پر ویت نام کے عوام اور امن کی جدوجہد کرنے والوں کی جانب سے پرخلوص مبارکباد۔ عالمی امن کی بقا و استحکام کے سلسلے میں آپ کی کامیابی کے لئے ہم دعاگو ہیں۔

ہنوئی (شمالی ویت نام)، ۷ رمئی ۶۲ء (ویت نام امن کمیٹی)

جوش ملیح آبادی

جوش ملیح آبادی
رکن مشیر ادبی و مدیر لغت
ترقی اردو بورڈ

ترقی اردو بورڈ
URDU DEVELOPMENT BOARD

ٹیلی فون: دفتر: ۴۳۱۶۰۲
مکان: ۴۱۴۴۲

۹۲۳۔ اردو منزل، جمشید روڈ
کراچی ۵ ....

فیض کو میں ایک زمانۂ دراز سے جانتا ہوں، لیکن اس
وقت سے جب کہ وہ محض ایک طالب علم تھے —
یہ غالباً ۱۹۳۴ یا ۱۹۳۶ کی بات ہے کہ فیض نے مجھے لاہور
کے ایک [illegible] کے مشاعرے میں لکھنؤ سے بلایا تھا، وہ دن اور
آج کا دن، میرے تعلقات ان سے نہایت ہی خوشگوار رہے ہیں،
اور مجھ کو یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے کہ میرے ان کے بزرگانہ و
خوردانہ تعلقات، صرف مضبوط بنیاد پر قائم ہی نہیں، بلکہ رو بہ ترقی ہیں
یہ غالباً ۱۹۴۳ کے لگ بھگ کی بات ہے کہ میں نے ایک
سیاسی اختلاف کی بنا پر ان کی ایک نظم پر ایک طنزیہ نظم کہی تھی،
جسے فیض کو میں نے سنایا بھی تھا، معلوم نہیں وہ نظم کون صاحب

اُس زمانے میں لے اُڑے تھے، اور اب معلوم ہوا ہے کہ اُن صاحب نے اِس قدر مدت دراز کے بعد اُسے چھاپ دیا ہے، میرے نزدیک اُن بزرگ وار کا یہ فعل کسی اچھے یا اصلاحی جذبے کا حامل نہیں ہے۔

فیض کے مزاج میں، اُن کے کلام کی طرح، ایک نرمی اور ایک مٹھاس پائی جاتی ہے — اور اُن کے تبسّم میں، معصومیت کی جھلک آج بھی دل موہ لیتی ہے۔

اُردو شعراء کی سیرت کے متعلق میں اچھی رائے نہیں رکھتا، یہ ایک دوسرے کو بُرا بھلا کہنے، اور ایک دوسرے کو ذلیل کرنے کو سب سے بڑی عبادت سمجھتے ہیں —

میں نے اپنی تمام عمر میں صرف تین چار شاعروں کو پاک نفس دیکھا ہے، اور مجھ کو ایک راحت گوانسان کی طرح اس بات کے اظہار سے مسرت ہو رہی ہے کہ اُن چند اِنے گنے پاک نفس شعراء کے درمیان فیض کا چہرہ بھی دمک رہا ہے۔

میرا ساحل اب سامنے آ چکا ہے، میری کشتی کے بادبان لپیٹے جا رہے ہیں، لیکن ڈوب جانے سے پیشتر یہ کہہ دینا چاہتا

ہوں کہ میں اطمینان سے کروں گا، اور محض اس بنا پر کہ اُردو ادب
کے ایک ممدوح کو اپنے پیچھے چھوڑے جا رہا ہوں، اور اُس ممدوح کا
نام ہے فیض۔
اللہ اُن کی عمر کو دراز کرے، فن اور زبان کے
دروازے اُن پر کھول دے، اور رفتہ رفتہ اُن کو آسمانِ ادب
کا ایک ایسا آفتاب بنا دے جو کبھی ڈوبنے کا نام بھی نہیں لیتا۔

جوش مرحوم

۱۱/۲/۶۵

جسٹس ایس اے رحمن

<u>۷۸۶</u>

MR JUSTICE
S A. RAHMAN H Pk

PAKISTAN
SUPREME COURT

۶۵ گلبرگ لاہور
۷ نومبر ۱۹۶۸

مکرمی السلام علیکم۔

میں نادم ہوں کہ آپ کے تقاضوں کے باوجود افکار کے

جسٹس ایس اے رحمٰن

فیض نمبر کے لئے کچھ نہ لکھ سکا۔ تقاضے کی تائید ڈاکٹر عبادت بریلوی کے خط سے بھی ہوئی۔ میرا عذر محض کم فرصتی ہے۔ کئی جھنجھٹ گلے میں ڈال رکھے ہیں جن سے گلو خلاصی ممکن نہیں اور جو ادبی مشاغل کے آڑے آتے ہیں۔ یہ چند سطور محض بطور امتثال امر لکھ رہا ہوں۔

فیض صاحب ہند و پاکستان کے ادبی حلقوں سے اپنا لوہا منوا چکے ہیں اور شاعری کے نئے دبستان میں ان کی آواز شاید سب سے اہم ہے۔ میری نظر میں جو بات انہیں دوسرے جدید قسم کے کئی شعراء سے ممتاز کرتی ہے، ان کا اردو شاعری کی روایت سے ربط ہے۔ انہوں نے شاعری میں نئے تجربے بھی کئے ہیں اور ان کا فکر و تخیل جدید ذہن سے ہم آہنگ ہے لیکن انداز بیان کے لحاظ سے ان کی شاعری کی جڑیں ادبی روایت میں مضبوط ہیں۔ ایمائی اور الہامی کیفیتیں جو شاعری کی جان ہیں ان کے کلام میں بدرجۂ وافر موجود ہیں لیکن آجکل کی پہیلی قسم کی نظم طرازی کے وہ گنہگار نہیں ہوئے۔ نہ ہی ان کے

جہاں حرف وخیال کا وہ کھردرا پن ہے جو نئی شاعری کے بعض نمونوں میں ذوقِ سلیم پر گراں گزرتا ہے۔ اُن کی نظموں میں بھی لطیف تغزل کی دھیمی دھیمی آنچ محسوس ہوتی ہے۔ اُن کا تاریخی شعور اُن کا ذوقِ جمال، اور اُن کا فنی خلوص، اُن کی جبلی شرافت کے سائے میں پروان چڑھے ہیں۔ اسی لئے اُن کی شاعری لطیف احساسات کا مرقع ہے۔ اُن کے سیاسی نقطۂ نظر سے اختلاف ممکن ہے لیکن اُن کی ادبی دیانت، خلوص اور فنکاری سے انکار کفر کے مرادف ہوگا۔ کیونکہ اُن کی شاعری ذاتی واردات اور انفرادی تجربہ پر مبنی ہے۔ اور یہی اُن کی عظمت کی دلیل ہے۔

کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ مبدأ فیاض سے فیض کو انتظامی صلاحیتیں بھی عطا ہوئی ہیں۔ جب وہ پاکستان آرٹس کونسل (الحمراء) لاہور کے سیکریٹری ہوئے تو اس میدان میں اُن کے جوہر کھلے اور انہوں نے اپنی سرگرمیوں سے الحمراء کی کارکردگی میں وہ اضافے کئے جو کہ ومہ سے خراجِ تحسین حاصل کئے بغیر نہ رہے۔ اُن کی زندگی کا یہ پہلو اثبات

کی زندہ تردید ہے کہ شاعر عملی دنیا میں فضول مد سے زیادہ حیثیت نہیں
رکھتا۔ حق یہ ہے کہ وہ فطرت کے مشاہدہ کے ساتھ حیات کے مجاہدہ کے
بھی مرد ہیں۔ اور شاید ان کا یہ وصف بھی نوجوان ذہنوں کے
لئے کم جاذب توجہ نہیں ہوا۔

مخلص

ایس اے رحمٰن

بیگم شائستہ اکرام اللہ

کراچی

مورخہ ۸ ستمبر ۶۴ء

مکرمی　تسلیم۔

آپکی درخواست کی تعمیل میں چند سطریں
حاضر ہیں۔ فیض کی سی شخصیت، اور آپکے
قابل قدر کوشش پر اس سے بہت زیادہ لکھنا چاہیے
تھا لیکن پریشانی اور کام کے بوجھ سے بالکل دبی ہوں
اسلئے امید ہے کہ آپ اس بہت ہی ناکافی پیام
کا برا نہ مانیں گے۔ آئندہ خدا نے چاہا تو افکار کے

لیے کوئی چیز بہت محنت سے تیار کر کے پیش کروں
گی فقط
پیام بہت ہی ناکافی اور تشنہ ہے۔ دماغ
تفکرات کے ہجوم سے بالکل کام نہیں کر رہا اگر آپ
اسکو شائع ہونے کے قابل نہ سمجھیں تو مجھے ہرگز
شکایت نہیں ہوگی۔ دراصل یہ اشاعت کے قابل
نہیں ہے۔

افکار کا فیض نمبر یقیناً ایک قابل قدر چیز
ہوگی۔ کیونکہ جہاں تک مجھے معلوم ہے فیض کے کلام
اور مقام پر ابتک کوئی جامع چیز شائع نہیں ہوئی۔
فیض زمانۂ حال میں اردو کے صف اول کے شاعر
ہیں وہ نہ صرف ایک نئے طرز فکر اور طرز ادا
کے موجد ہیں بلکہ انکی اردو میں بھی اپنی کمال
حاصل ہے۔ انکے اشعار میں سیاست ہے۔ حقیقت
کی تلخی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ غزل کی شیرینی

اور لطافت بھی ہے کیونکہ بقول انکے

چاہا ہے اسی رنگ میں لیلیٰ وطن کو
تڑپا ہے اسی طور سے دل اُس کی لگن میں
ڈھونڈی ہے یونہی شوق نے آسائش منزل
رخسار کے خم میں کبھی کاکل کی شکن میں

انکی شاعری انکی زندگی کی آئینہ دار ہے خون دل سے لکھی ہوئی ہے اسلئے اس میں درد کی کسک ہے –

افکار نے انکے کلام کو نظر غور سے دیکھنے کی دعوت دیکر ایک ضروری ادبی خدمت انجام دی ہے۔

فقط
خاکسار
شائستہ سہروردی اکرام اللہ

ڈاکٹر یوسف حسین خاں

Pro-Vice-Chancellor

ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY,
ALIGARH.

۳ر جنوری ۱۹۶۵ء

محترمی – مجھے یہ معلوم کرکے مسرت ہوئی کہ افکار کا فیض نمبر

بعنقریب شائع ہونے والا ہے۔

فیض ہماری زبان کے چوٹی کے شاعروں میں ہیں جنھیں غزل اور نظم دونوں پر یکساں قدرت حاصل ہے۔ فیض کی غزل میں ایک نئے آہنگ کا احساس ہوتا ہے۔ انھوں نے زندگی کے جدید تقاضوں کو غزل کے پرانے رموز میں بڑی خوبی سے سمویا ہے اور اپنے حسنِ ادا سے شعر کا جادو جگایا ہے۔ مجھے پوری توقع ہے کہ فیض نمبر کی پوری طرح قدر ہوگی۔

فقط بولاکیلا

حسن علی اے۔ رحمان

Hasanally A. Rahman
VICE-CHANCELLOR
UNIVERSITY OF SIND.

Phone { Office: 2004

HYDERABAD
(WEST PAKISTAN)

Dated 196

مکرمی صہبا صاحب۔ السلام علیکم۔

مجھے یہ معلوم کرکے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ افکار کا فیض نمبر بھی شائع کرنا چاہتے ہیں ہمارے شعراء ادباء اور علماء کی قدردانی دراصل ہماری قوم اور ہمارے معاشرے کی قدردانی ہے۔

باہر کے لوگ ان کو دیکھ کر ہماری قوم سے متعارف ہوتے ہیں۔
یہ اور بات ہے کہ رطب و یابس اور حسن و قبح ہر جگہ اور ہر قوم
میں پایا جاتا ہے۔ تاہم فیض صاحب سے بالواسطہ اور بلا واسطہ
دونوں طرح ادب اور معاشرے کو فائدہ پہونچ سکتا ہے۔ خدا
کرے کہ آپ کی سعی مشکور ہو۔　　شکریہ

حسن علی اے احسان

پروفیسر آل احمد سرور

انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ

۱۹/۳/۶۵ء

محبی صہبا صاحب

آپ کے خطوط کا جواب نہ دے سکا۔ معذرت خواہ ہوں (ہندوستان ایڈیشن) پہ آپ میرا پیش لفظ شامل کر ہی چکے ہیں۔ اس کے بعد کسی تحریر کی ضرورت کیا ہے۔

فیض کو میں اس دور کے چوٹی کے شعرا میں شمار کرتا ہوں۔ ان کے تینوں مجموعے، 'نقش فریادی' 'دستِ صبا' 'زنداں نامہ' متعدد نظموں اور غزلوں کی وجہ سے ہمارے شعری مجموعوں میں ایک امتیازی شان رکھتے ہیں۔ فیض کی نظموں میں مجھے 'تنہائی' 'موضوعِ سخن' رقیب سے' 'دو عشق' 'اے روشنیوں کے شہر' 'یہ رات اس درد کا شجر ہے' 'ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے' 'یاد' 'دریچہ' مجھے بہت پسند ہیں اور انہیں میں نے بار بار پڑھا ہے۔ ایک دلچسپ بات یاد آئی۔ جب پہلے پہلے 'موضوعِ سخن' شائع ہوئی تھی، تو ایک ملاقات میں جگر صاحب نے "بھوک اُگتے" پر اعتراض کیا تھا۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ جب آنکھوں سے تارے ٹوٹ سکتے ہیں' تو کھیتوں سے بھوک اُگنے پر آپ کو کیوں اعتراض ہے۔ اُن کی منصف مزاجی کی دلیل یہ ہے کہ انہوں نے اس کے بعد اپنا اعتراض واپس لے لیا تھا۔ 'دستِ صبا' کی بعض غزلیں بھی مجھے پسند ہیں۔ فیض کی غنائیت اور صورت گری ان کی خصوصیات ہیں۔ ان کی تنقیدوں میں بھی ایک باشعور فن کار کی بصیرت کارفرما ہے۔ وہ چاہیں تو بڑے اچھے مضمون لکھ سکتے ہیں۔ بیڑس پر جتنے مضامین لکھے گئے ان

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

میں فیض کا مضمون مجھے سب سے زیادہ پسند ہے۔ اس میں پرستش کا جذبہ نہ تھا۔ ایک فن کار کا دوسرے فن کار سے محبت کا جذبہ تھا۔ افسوس ہے کہ فیض کی چیزیں ادھر بہت کم دیکھنے میں آئیں۔ خاموشی کے دورے ان پر پہلے بھی پڑ چکے ہیں۔ اس لئے امید ہوتی ہے کہ اب جو بند ٹوٹے گا تو بعض معرکے کی چیزیں دیکھنے میں آئیں گی۔ فیض کی زندگی کے حسن سے محبت اور اس کے پیچھے معنویت اور رمزیت کو پانے کی کوشش اُن کے کلام کو وقیع اور برگزیدہ بناتی ہے۔ اس کی اہمیت اور عظمت مسلّم ہے۔ انسانیت کے اس پرستار کی جتنی بھی قدر کی جائے کم ہے۔

مخلص :۔ آل احمد سرور

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

شعبہ اردو
کراچی یونیورسٹی
کراچی

۱۱ مارچ ۱۹۷۵ء

صہبا صاحب مکرم۔ السلام علیکم۔

آپ فیض نمبر نکال رہے ہیں۔ مبارک ہو۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہماری پوری قوم مردہ پرست بلکہ مقبرہ پرست ہے۔ مجھے تو اس میں بھی شبہ ہے کہ جو لوگ اسلاف کے مقبروں کو بیچ ڈالیں وہ کیسے مردہ پرست ہوں گے۔ زندگی میں ہمارے ادیبوں کو جس ناقدری، بے سروسامانی اور پریشانی حال کا سامنا ہوتا ہے خدا کا شکر ہے کہ فیض صاحب کو اس کی شکایت نہ ہوگی لیکن زندہ اور معاصر ادیبوں

اور شاعروں کی قدر دانی اور ان کے کلام و کمال کا اعتراف
ایک ایسی روایت ہے جو اگر روایت کا درجہ حاصل کر سکے
تو شاید ہمارے ذہن اور فنکاروں کے حق میں ایک مبارک
فال ہوگی۔ والسلام		آپکا
ابو اللیث صدیقی

ڈاکٹر مسعود حسین خاں

MASUD HUSAIN KHAN
M. A., Ph D. (Alig.), D. Litt. (Paris)
PROF. & HEAD, DEPARTMENT OF URDU
Osmania University, Hyderabad - A. P.

10-A. O. U. BUNGALOW
OSMANIA UNIVERSITY
HYDERABAD-A. P.
Phone 71130

۸ر جنوری ۶۵ء

جناب مکرم، تسلیمات

یاد آوری کا شکریہ! یہ سن کر مسرت ہوئی کہ آپ
افکار کا تازہ شمارہ اس بار فیض احمد فیض کی شخصیت اور شاعری
کے لئے وقف کر رہے ہیں۔ فیض اسکے واقعی مستحق تھے، اسلئے
اپنی تمام لسانی و فنی خامیوں کے باوجود انہوں نے جدید اردو شاعری کو
ایک نیا آہنگ اور لہجہ عطا کیا ہے۔ میں ان کا اتنا بڑا پرستار
نہیں کہ انہیں ابھی سے غالب و اقبال کی صف میں لا کھڑا کروں، لیکن
اس میں شک نہیں کہ انہوں نے اردو شاعری کی کئی جہات میں توسیع

کی ہیں: ان کا مخصوص علامتی انداز، نرم و پرسوز لہجہ، تہ دار تشبیہات و استعارات، اور سب سے بڑھ کر ایک نیا وجدان اور شعور جس میں فرد اور سماج دونوں تار حریر دو رنگ کی طرح بٹے ہوئے ہیں، یہ سب مل کر ایک عجیب انداز کی شاعری کو جنم دیتے ہیں، جس سے کم از کم ہمارا ادب آشنا نہیں تھا۔ تاریخی نقطۂ نظر سے اردو شعر کے سلسلے میں فیض نے سب سے بڑی خدمت یہ کی ہے کہ اسے خطیبانہ طمطراق اور انقلابی نعرہ زنی سے نجات دلائی۔ ایک انقلابی شعور کے باوجود انہوں نے فن اور محبوب کے ساتھ اپنا عہد استوار رکھا۔ کاش وہ فن کی خاطر اپنی شاعری میں محبوب کے عنصر کو اور کم کر سکیں، اور "سیاسی لیڈر کے نام" "صبح آزادی" "لوح و قلم" "زنداں کی ایک صبح" اور "ملاقات" (گو اس نظم کا عنوان بہت ہلکا ہو گیا ہے) جیسی نظمیں لکھتے رہیں۔ مجھے امید ہے افکار کا تازہ شمارہ فیض کے ادبی قدر و قامت کے متعین کرنے میں ایک کامیاب کوشش ہوگا، اور اس دو طرفہ بے اعتنائی سے عاری ہوگا جو کبھی غیر ادبی پرستش

اور کبھی ادبی انانیت و عناد کی شکل میں ہماری تنقید میں ظاہر ہوتی ہے ۔ مخلص آغا

مسعود حسن

ڈاکٹر سید عبداللہ

یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور

۱۲ر جنوری ۱۹۶۵ء

مکرمی السلام علیکم۔

عنایت نامہ محررہ ۲۶ر دسمبر ۱۹۶۴ء موصول ہوا۔ شکریہ۔

یہ معلوم ہو کر مسرت ہوئی کہ آپ نے فیض نمبر نکالنے کا ارادہ فرمایا ہے۔ یقیناً آپ کی یہ کوشش افکار اور اردو ادب کی تاریخ میں ایک سنہرے باب کا اضافہ کرے گی۔ دعا کرتا ہوں کہ حق تعالیٰ آپ کو اس نیک مقصد کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائے فقط والسلام۔

نیازمند: سید عبداللہ

ڈاکٹر گیان چند جین

Gian Chand Jain
M. A., D. Phil., D. Litt.

36, MALVIYA NAGAR
BHOPAL

محترم تسلیم

آپ کا پچھلے سال کا کرم نامہ کل ملا۔ شکریہ۔ فیض کا ادبی مرتبہ مجھ جیسے ہیچ مدانوں کے پیغام کا محتاج نہیں لیکن چونکہ آپ کی فرمائش ہے اس لئے تعمیل ارشاد میں "چھوٹا منھ بڑی بات" کے مصداق ذیل کا پیغام پیش کرتا ہوں۔ اگر آپ اس خصوصی شمارے کی ایک کاپی مجھے بھی مرحمت فرمائیں تو میری عقیدت کو

ممنون فرمائیں گے۔

مجھے خوشی ہے کہ آپ افکار کا فیض نمبر شائع کر رہے ہیں۔
زندہ ادیبوں کے خصوصی نمبر نکالنا بعض محترم حضرات کے نزدیک
بدعت ہے لیکن میری نظر میں انتخاب کا صحیح اصول یہ ہونا چاہیے کہ
صرف ان ادیبوں کے نمبر شائع کئے جائیں جو جیتے جی تاریخ ادب
میں بقائے دوام حاصل کر سکے ہوں یعنی ان کے مستقل ادبی مقام
کے باعث ان کو خراج عقیدت پیش کیا جا رہا ہو نہ کہ اس کے برعکس
خصوصی نمبر کا طرہ ادیب کی کلاہ میں اس غرض سے لگایا جائے کہ شاید
اسی سہارے سے اسے بقائے دوام مل جائے۔ عبدالحق۔ اقبال۔ جوش
اور فیض اسی پائے کے ادیب ہیں جن کے لئے کسی رسالے کا خصوصی
شمارہ نکالنا کوئی فخر کی بات نہیں، رسالے کے لئے ان کا نمبر
نکالنا باعث فخر ہے۔

ترقی پسند ادب پر اس کے دشمنوں کے مقدس بزرگ اس
لئے جز بز ہوتے ہیں کہ اس میں بسا اوقات ادبی اور جمالیاتی پہلو کو
نظر انداز کر دیا جاتا ہے لیکن فیض ایسے معدودے چند شعراء میں سے
ہیں جن کے یہاں زندگی کو آگے بڑھانے کا شعور بھی کسی سے کم نہیں
اور جو ادبی مذاق کو بھی بھرپور آسودگی بخشتے ہیں۔ ان کی آزاد نظم
پر پابند نظم کے رسیا بھی سر دھنتے دیکھے گئے ہیں۔

کسی سے پوچھا جائے کہ فیض نظم کے بڑے شاعر ہیں کہ غزل کے؟ تو قائل ایک عجیب دُبدھا میں پڑ کر سائل کی جان کو کوسے گا کیونکہ فیض اردو ادب کی تاریخ میں ان چار پانچ شعراء میں سے ہیں جن کی نظم، غزل سے بہتر ہے اور غزل نظم سے بہتر۔ زندگی آمیز غزل کے صالح ترین نمونے فیض ہی کے یہاں ملتے ہیں۔ سیاسی مضامین کو تغزل کے خوشنما جامے میں لپیٹ کر پیش کرنے کی روش فیض ہی کی چلائی ہوئی ہے۔

مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایک دو صدی بعد بھی فیض کا نام اردو ادب کی تاریخ میں یاد رکھا جائے گا۔ یہی بڑے ادیب کی نشانی ہے۔

نیاز کیش
گیان چند

شان الحق حقی

اردو نامہ (سہ ماہی)
ٹیلیفون: ۴۲۱۶۳

۶۴۲ - اُردو منزل
جمشید روڈ
کراچی ۵

۶ نومبر ۱۹۶۲ء

برادرِ گرامی، تسلیم!

فیض نمبر کا عقد مبارک ہو۔ میں آپ کے ساتھ نمبروں سے محظوظ و مستفید ہو چکا ہوں (اور کچھ تھوڑا سا ملکہ ربعیہ)

اب اس نمبر کا اشتیاق رہے گا (اور امید ہے کہ یہ تمامتر کدورت سے پاک ہوگا) - میں آپ کی مدیرانہ صلاحیتوں کا بھی معترف ہوں اور فیض کے شاعرانہ مرتبے کا بھی - یقین ہے کہ یہ نمبر دونوں کے شایانِ شان ہوگا -

پیغام تو وہ دیا کرتے ہیں جنھیں بیٹے کا بیاہ کرنا ہو - میں ابھی اس حیثیت میں نہیں ہوں، لہٰذا اسے حرفِ نامۂ تہنیت سمجھیے -

دعا گو
سلطان الحق

مجروح سلطان پوری

majrooh sultanpuri

[illegible] colony · juhu road · [illegible] · bombay · 54 · phone: 532916

۲۷ جنوری ۱۹۷۵ء

صہبا صاحب - میاں الٰہی بھی کیا بزرگی کہ حضرت نے مجھے آپ نے ذرا صاحبزادہ ہی بنا ڈالا - خیر -

آپ نے فیض نمبر کے لئے مجھ سے کوئی غزل یا نظم موضوع سے متعلق مانگی تھی۔ نظم یا غزل تو ہنگامۂ روزگار کی نذر سمجھئے البتہ ایک

مجروح سلطان پوری

خط ساتھ ہے مناسب سمجھئے تو حاضر ہے۔

فیض صاحب، مجاز، ن م راشد، اختر الایمان، مخدوم محی الدین اور علی سردار جعفری کی طرح میرے پیش رو ہیں۔ سنہ ۴۲ء میں جب میں نے شاعری شروع کی تو انمیں سے بیشتر حضرات صاحب دیوان ہو چکے تھے۔ لہٰذا کم و بیش ان سبھی کا عقیدتمند ہوں لیکن یہ بات کہنے میں مجھے باک نہیں کہ ن م راشد اور فیض صاحب کی شاعری اردو کیلئے ایک نیا طرز بیان لیکر آئی۔ جسکے بنیادی رشتے خواہ اقبال سے ہوتے ہوئے غالب تک جا ملتے ہوں لیکن پھر بھی یہ زبان انہیں حضرات کی دین کہی جائیگی گو ان کے ہمعصروں میں پنجاب کے بیشتر شعراء اسی نئی سی اور بدلتی ہوئی زبان میں شعر کہہ رہے تھے لیکن ان دو حضرات جیسے وہ لوگ کامیاب شاعری نہیں کر سکے۔ چنانچہ ان دونوں میں بھی ن م راشد کی شاعرانہ زبان تسکین و دماغ ہی تک رہی لیکن فیض نے اسکی رعنائی کو سوز و غم کی تابندگی بھی عطا کی اور یوں وہ اپنے ہم چشموں میں سربلند ہوئے۔ مجاز کی سرمستی نے تھوڑی دور تک انکا ساتھ دیا لیکن اسکے بعد تو وہ خود بھی سب کا ساتھ چھوڑ گئے۔ چنانچہ آج فیض کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ان سے شاعر و غیر شاعر سبھی نہ صرف عقیدت بلکہ محبت بھی کرتے ہیں یہ

انکی جادو بیانی کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

البتہ فیض کے بارے میں انکی شاعری کے اعتراف
کے ساتھ ہندوستان اور پاکستان میں یہ بات بھی عام ہے کہ فیض صاحب جتنے
سیاسی اور سماجی مسائل کو اتنا کھل کر نہیں بیان کرتے جتنے کے وہ مسائل مستحق ہیں
میرے ذہن میں یہ سوال کو اسطرح اٹھاتا ہے کہ فیض جیسا شاعر آج اپنے ملک کے
جدید شاعر کو ابہام و بیدلی کی تاریکی سے نکالنے میں کامیاب کیوں نہیں ہے!
کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ جب انکی آواز کو "حرف حق" کی طرح بلند ہونا چاہیے
تو انکی صدا "پیام زیر لب" بنکر رہ جاتی ہے۔ اور غوغائے فتنۂ محشر میں لوگ
فیض کے لب تو ہلتے دیکھتے ہیں لیکن چونکہ بات کچھ اتنے دھیمے لہجے میں ہوتی
ہے کہ آواز سنائی نہیں دیتی جبکہ انکی رہنما آج یہی آواز ہو سکتی تھی۔

بہرحال یہ تو ہر شخص کی اپنی اپنی رائے جزوی حیثیت سے
ہو گی لیکن مجموعی حیثیت سے فیض کی شاعری شاخ گل کی طرح پھولوں سے
لدی ہوئی ہے۔ اب یہ ہنرمندوں پر منحصر ہے کہ پھول کی پتی سے "ہیرے"
کا جگر کاٹ دیں۔

مخلص

مجروح،

ڈاکٹر محمود الٰہی

DR. MAHMOOD ILAHI
M. A., PH. D.
Head of the Urdu Deptt.

GORAKHPUR UNIVERSITY
GORAKHPUR ——— 196

۲۲/۲/۶۵ء

صہبا صاحب محترم　　　تسلیم

عنایت نامہ ملا، شکریہ۔ آپ نے دو عہد آفریں شخصیتوں پر افکار کے خصوصی شمارے اس طرح مرتب کیے کہ انہیں دستاویزی حیثیت حاصل ہو گئی۔ بڑی خوشی ہوئی کہ ایک اور عظیم کارنامہ پایۂ تکمیل کو پہنچ رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ پچھلے تجربوں سے فائدہ اٹھائیں گے اور فیض نمبر، جوش نمبر اور حفیظ نمبر سے زیادہ وقیع ہوگا۔

آپ کا "اندیشہ" غلط نہیں۔ اب اتنا وقت کہاں کہ میں فیض نمبر میں شامل ہونے کی سعادت حاصل کروں۔ ایک بات اور ہے، میرے راستے میں صرف وقت حائل نہیں۔ فیض پر لکھنے کے لیے جس جرأت اور ظرف کی ضرورت ہے، میں اس سے عاری ہوں۔ نہ جانے اس کا سبب کیا ہے کہ جن شخصیتوں نے مجھے متاثر کیا اور میں جن کا نام لیوا رہا ہوں، ان پر کچھ لکھنے کا جب میں نے ارادہ کیا تو سعدی کا یہ مصرعہ جس منزل کی نشاندہی کرتا ہے، وہاں سے

مجھے کہنا پڑا:

کہ وحشت گرفتہ ام ستیہم کہ تم

میں وہ وقت نہیں بھولا ہوں جب ایک طرف قال اللہ اور قال الرسول کے درس میں مصروف رہتا تھا اور دوسری طرف ابوالکلام آزاد، اقبال اور فیض کی تخلیقات میں گم رہتا تھا۔ میں ایک عربی مدرسے کے "دورۂ حدیث" کا طالب علم تھا لیکن بات بات پر فیض کے اشعار دہراتا تھا۔ اسی زمانے میں میں نے "عوامی ادبی کلب" کے نام سے ایک انجمن قائم کی تھی جس میں اکثر فیض کے اشعار پر بحث ہوتی تھی اور جب کوئی "عالم" ان کی نحوی اور صرفی خامی پر کچھ کہتا تھا تو میں اس سے قوی تر "سند" پیش کر کے اسے خاموش کر دیتا تھا۔

میں اکثر سوچتا رہتا ہوں کہ ان مسودوں پر جن سے غائبانہ طور پر میں نے استفادہ کیا ہے، کچھ لکھنا میرے فرائض میں شامل ہے اور انوری کے الفاظ میں میں اس کا اعتراف کرتا رہتا ہوں کہ

یکے جریدۂ اعمال خود نکردم کشف
ہزار کس را کہ کردم بجرح مستغرق

لیکن "عذرِ گناہ از خویش" پیش کرتے ہوئے وہی انوری والی بات آجاتی ہے کہ

ز دیدہ خون بچکد بر بدن بجائے عرق

اب اتنی توفیق ضرور ہوئی کہ ابوالکلام آزاد اور اقبال دو ذہین اور

اہل الرائے حضرات کے سپرد کر دیئے گئے ہیں جو پی ایچ ڈی کے لیے مقالہ لکھ رہے ہیں۔ شاید فیض پر بھی خود لکھنے کی یا کسی سے لکھوانے کی نوبت آجائے۔

میرا مزاج فارسی اور عربی ادبیات کے سائے میں پلا بڑھا ہے اور اسے فیض کی شاعری سے تسکین ملتی ہے۔ مجھے اس کا احساس کبھی نہیں ہوا کہ ان کے اسلوب میں وہ قدریں نہیں ہیں جو طرفہ امرء القیس، حافظ، سعدی، عرفی اور غالب کے اسالیب کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ فیض اردو شاعری میں ایک نئے دور کا آغاز کرتے ہیں لیکن ماضی کی حسین روایات سے انھوں نے اعراض نہیں کیا۔

امید ہے کہ آپ میرا عذر قبول کریں گے۔ پھر کبھی۔

والسلام
محمود الٰہی

عبدالرحمٰن چغتائی

دورِ جدید میں ترقی پسندانہ رجحانات نے دیکھتے دیکھتے ہندوستان بھر کو کچھ اس انداز سے اپنے گھیرے میں لے لیا تھا کہ آئے دن کسی نہ کسی تحریک سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔ شاعری اور سارٹ کی بدلتی ہوئی دنیا نے وہ مقبولیت حاصل کی کہ ہر جاننے والا ہر لکھنے والا جو کچھ کرنے کی سکت رکھتا تھا، اس تحریک کی لپیٹ میں ایسا الجھا کہ اس کے بغیر اندرونی میلانات کا پتہ چلنا دشوار ہو گیا۔ سیاسی سماجی اور ادب کی ترقی پسندانہ تحریک سے جس خلوص کا اظہار پنجاب کے فن کاروں نے کیا وہ قابل رشک تھا۔ میں خود بھی جدید ہندوستانی مصوری کے اسکول سے وابستہ رہا ہوں۔ اور جب بھی ہم اپنی روایات کو کسی نہ کسی شکل میں دیکھ پاتے تھے۔ تو اپنا ضمیر چیخ اٹھتا اور احساس ہوتا غلامی ہے کیا جو نکل نہیں لیتی۔ ہر جماعت نے کسی نہ کسی رنگ میں اس کی کا اعتراف کیا جو جدید تحریک نہ ہونے سے محسوس ہوتی تھی۔ شاعری کے جدید اور ترقی پسند انتخابات اور اس تحریک کو ہوا دینے والا اسکے دوش بدوش چلنے والا اکثر تاثیر تھا۔ حفیظ جالندھری نے اردو کے فروغ کے لیے ادبی دنیا میں کچھ کم جلوے نہ دیئے تھے۔ ڈاکٹر خالد، آزاد نظم کے امام راشد، سردار جعفری فیض اور دوسرے ترقی پسند ادیب داخلی اور خارجی مسائل سے دوچار رہے ان کی انتھک خدمات کا اعتراف ہر مکتبہ خیال کے افراد نے تا بمقدور کیا۔

حفیظ، راشد، تاثیر، پطرس، مجید ملک، فیض اور ڈاکٹر خالد کی تخلیقوں سے مستفید ہونے کا مجھے ہمیشہ موقع ملتا رہا۔ اکثر ان کا کلام سنتا رہا، پڑھتا رہا اور ان کے ارتقا کو بھی پیچھا نہیں چھوڑا۔ تاثیر کے ساتھ کیسے وقت گزرا، اور کیا سرچشمہ تھا اسکیا چاہتا تھا یہ ایک تفصیلی داستان ہے ویسے اس کو اپنی ترقی پسندی کا یہ عالم تھا کہ جو پڑھتا تھا جو سوچتا تھا وہی کچھ لکھتا تھا اور اس کا لکھا کبھی رائیگاں نہیں گیا۔ آئندہ بھی جو جو لوگ بھی آتی رہیں اس کے فن کے سانچے میں ڈھلنے کے لئے مچلتی تھیں، اور خیال ہوتا تھا کہ گر سوچنے سمجھنے کا یہی عالم رہا تو جانے یہ تخلیقی سرمستی کیا شکل اختیار کرے۔ فیض کی شاعری کے رجحانات چند دیگر شعراء سے ہیں۔ وہ تمام پہلو بہ پہلو چلتے رہے۔ عزم اور استقلال کے ساتھ ان میں موڑ بھی آتے رہے۔ رمز شناسی کا یہ عالم رہا کہ وہ رکے نہیں چلتے ہی رہے۔ بنیادیں مضبوط تھیں ان کے فن کی عمارت استوار ہوتی رہی اس تحریک میں بڑے بڑے فن کار اور دانشور نظر آنے لگے۔ فیض نے کچھ اس انداز سے شاعرانہ مرتبہ حاصل کیا کہ اس پر نگاہیں اٹھنے لگیں اور جو نگاہ پڑتی اسی کی ہو جاتی تھی۔ اگر ہم انسانی فطرت اور شاعرانہ انداز کا جائزہ لیں اور فیض اور دیگر شعراء کو قریب سے دیکھا جائے تو انہیں اپنی تہذیبی زندگی میں کئی جنوں کی جنبش دینی ہوگی۔ میں ایک آرٹسٹ ہونے کی حیثیت سے اس بات کا تجزیہ کرتا رہا اور کریدتا رہا۔ قناعت، خود پسندی اور خود بینی کو تولتا بھی رہا۔ محبت اور خلوص کے نقوش کے باوجود تا ثرات کا نفسیاتی جائزہ بھی ضروری تھا۔

علامہ اقبال کی محفلوں، دوستوں اور احباب کی بے تکلفیوں، خوش گپیوں اور ان کی بے مثل ہر دلعزیزی کے ہر دور کو میں نے قریب سے دیکھا ہے۔ جب بھی موقع آیا۔ یا بھول سے کلام سننے کی کسی نے درخواست کی، ان کے تیور بدل گئے۔ وہ کبھی ایسی درخواستوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے میں نے یہاں تک دیکھا ہے کہ اگر کبھی کوئی ایسا موقع پیش بھی آیا کہ وہ کلام سنانے پر مجبور ہو جاتے تو وہ فارسی شعراء کے اشعار پڑھنے لگتے اور موقع گزر جاتا۔ اس کے برعکس فیض بھی میرے ساتھ رہے اور ان کے ساتھ بھی محفلیں گرم رہیں۔ مشاعروں کی دعوتوں کے درمیان جب بھی کسی نے درخواست کی فیض نے اپنا فیض جاری کر دیا۔ شاعر کی ایک دھن ہوتی ہے۔ وہ دھن میں خلوص کے تا نظر نئی اور پرانی نظمیں سناتے اور جو بھی موجود ہوتا مسرور ہوتا۔ غالباً آزادی کے بعد جو نظم "صبح آزادی" فیض نے لکھی اور جس ضبط سے اس نے اسے فروغ دیا اور جس نقطۂ نگاہ سے اس نے روشناس کرایا وہ بڑا اچھوتا تھا۔ یہ اپنے رنگ کی منفرد کوشش تھی۔ جس نے تخلیق کی صورت میں بے انتہا مقبولیت حاصل کی کیونکہ آزادی کے مفہوم کے تحت ایک شاعر کی دور اندیشی اور سیاسی رمز شناسی صداقت سے قریب تر تھی یہ بلند مقام اس کو ہمیشہ حاصل رہے گا۔

مجھے فیض کا اندازِ تکلم ہمیشہ بھاتا رہا۔ وہ تحت اللفظ پڑھتے ہیں اور ان کے ہر انداز سے تاثرات نمایاں ہوتے ہیں۔ انفرادیت اور انا کی ایک گونا گوں شکل ہمیشہ ان کے چہرے پر رقصاں نظر آتی ہے۔ اپنی دل کشی کو ڈھالنے یا اپنے فیض کو تقسیم کرنے میں فیض نے کبھی ضد نہیں کی۔ کبھی کبھار میں متضاد طبقوں کے شعراء اور ان کے فن سے دوچار ہوتا ہوں تو متعجب ہوتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ فیض جیسی انفرادیت صرف ان لوگوں کا حصہ ہے جو قوموں کی امانت ہیں۔

راوی روڈ

سید الطاف علی بریلوی

All Pakistan Educational Conference

Registered No. (384 - 1951, 52) under act XXI of 1860.

۱۶ر نومبر ۱۹۶۴ء

فیض احمد فیض کا کلام میں نے بہت کم پڑھا اور سنا ہے بالمشافہ ملاقات کا بھی برائے نام اتفاق ہوا ہے۔ لیکن اُن کی مقبولیتِ عام بالخصوص نوجوان طبقہ میں خاصی مرعوب کن ہے۔ یہ مقبولیت بے وجہ نہیں ہوتی ہے۔ یقیناً فیض صاحب کے کلام میں کوئی ایسی ندرت اور تاثر ہے کہ لوگ دیوانہ وار اُنکے پیچھے دوڑتے ہیں۔ فیض صاحب ایک بلند پایہ پروفیسر اور روزنامہ 'پاکستان ٹائمس' جیسے بڑے اخبار کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں۔ لیکن بحیثیت ایک غزل گو شاعر اُنکا مرتبہ بلند سے بلند تر ہوتا جا رہا ہے۔ کلام میں سوز و گداز اور کہیں قنوطیت کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔ ادائے مطالب کے لئے حسنِ زبان و بیان لاجواب ہے۔ کاش اس قادر الکلامی کے ساتھ مقصدیت کچھ زیادہ واضح ہو جائے اور قوم میں جوشِ عمل پیدا

کرنے کے لیے رجائیت کا رنگ بکھر جائے تو فیض اُس خلا کو معتدبہ حد تک پُر کر سکتے ہیں جو علامہ اقبال کے وصال کے بعد پیدا ہو گیا ہے

سید العاص علیم زیدی

پشیاگمار پریمارتنے

کولمبو۔ سیلون
۴ر۔ مارچ ۱۹۶۵ء

آپ کے ماہنامے کے فیض نمبر کے لیے پیغام بھیجتے ہوئے میں بےحد فخر و مسرت محسوس کرتا ہوں۔ ایک سیلونی شاعر کی حیثیت سے مجھے ممتاز پاکستانی شاعر فیض احمد فیض سے ملنے اور مشاعرے میں ان کا کلام سننے کی سعادت اکثر حاصل ہوئی ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ مختلف ملکوں کی مختلف زبانوں میں ہم سب ایک ہی مشترکہ مقصد کے بارے میں سوچتے اور لکھتے ہیں اور اس دھرتی کا مقدس ترین مقصد انسانیت کو ہر طرح کی محکومی سے نجات دلانا ہے، جس کے لیے ہم سارے ہی ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں نے خود کو وقف کر رکھا ہے۔

عظیم ثقافت کی سرزمین، پاکستان نے ہمیشہ ایسے شاعروں اور ادیبوں کو جنم دیا ہے (اور یقیناً مستقبل میں بھی جنم دیتی رہے گی) جو داخلی حصار و سماجی قید و بند و محکومی سے آزادی حاصل کرنے کا جذبہ عوام میں بیدار کرتے رہتے ہیں وہ محکومیاں جو ان کے ارتقا کی راہ کا سنگ گراں ہیں۔ یہ شاعر اور ادیب عوام کے دوست اور ان کے دشمنوں کے دشمن ہیں، یہ دانش ور عوام کو متحد کر کے اور مفاد پرستوں اور سازشیوں کی عوام دشمن کوششوں کو ناکام بنا دیتے ہیں کوئی کسے نہیں اُبھار سکیں گے

پاکستانی شاعروں کے نغمے آج بھی تاریخ کے ایوانوں میں گونج رہے ہیں۔ ان کے جرأت مندانہ نغمے جو سرمایہ داروں کے خلاف عوام کو بیدار اور متحرک کرنے کے لیے انھوں نے تخلیق کیے اس مشترکہ نصب العین کی روشن مثال ہیں جسے افریقہ اور ایشیا کے ادیبوں اور شاعروں نے اپنا لیا ہے۔ چنانچہ اب نہ کوئی غدار ہمارے اتحاد میں رخنہ پیدا کر سکتا ہے اور نہ کوئی بزدل ہمیں ہمارے دشمنوں کے ہاتھ فروخت کر سکتا ہے۔

ان حقائق کی روشنی میں ایک سیلونی شاعر کی حیثیت سے میں دعا کرتا ہوں کہ میرے معزز دوست اور رفیق کار فیض احمد فیض صحت مند اور تادیر سلامت رہیں۔ اور یقین رکھتا ہوں کہ افریشیائی عوام کی سلامتی و اتحاد اور فلاح کے لیے وہ زیادہ سے زیادہ خدمات انجام دیتے رہیں گے۔

عرش ملسیانی

آج کل دہلی
۱۱/۱۲/۱۹۷۶

محترمی تسلیم۔

مجھے مسرت ہے کہ افکار کا فیض نمبر شائع ہو رہا ہے۔ اس سے قبل جوش نمبر اور حفیظ نمبر قبول عام کی سند حاصل کر چکے ہیں۔ فیض کا درجہ اردو شاعری میں بہت ممتاز ہے۔ وہ ان لوگوں کی صف میں پیش پیش ہیں جنہوں نے اردو نظم اور غزل کو نیا لہجہ اور نیا اندازِ فکر عطا کیا۔ ایسے باکمال شاعر کے لیے کسی رسالہ کا خاص نمبر مختص ہونا بڑی اچھی بات ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اس شمارے میں فیض کی شاعری کا صحیح جائزہ لیا جائے گا مطلب یہ کہ محض مدح سرائی پر ہی پورا شمارہ وقف نہیں ہوگا۔

مخلص
عرش

شورش کاشمیری

فیض دنیوی رشتے کے اعتبار سے تو تاثیر کے ہم زلف ہیں ہی۔ لیکن شاید ادبی اعتبار سے بھی ہم زلف ہی ہیں۔ قامت۔ نقشِ فریادی۔ لہجہ دستِ صبا۔ رنگ سرخ و سپید آنکھیں ساغر کو مرے ہاتھ سے لیتا کہ چلا میں۔ خود ہوئے گل کلام نالۂ دل اور گرد و پیش دود چراغِ محفل۔

میں انھیں اس وقت سے جانتا ہوں جب وہ مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ الاپتے تھے۔ بڑے ہی چپ چاپ

یعنی محفل آرا، نہ مجلس نواز، اندر ہی اندر سلگنے کے عادی۔ پہلے پروفیسر تھے، پھر ملٹری میں چلے گئے۔ اور وہاں تعلقات عامہ کے عسکری دفتر میں لیفٹننٹ کرنل ہو گئے، جنگ کے خاتمہ پر ملازمت سے سبکدوش ہونا پڑا۔ ادھر پاکستان بن گیا تو پاکستان ٹائمز میں مدیر بن گئے۔ چند سال ہوئے راولپنڈی کے مقدمہ سازش میں دھر لئے گئے تھے۔ اور قید و بند کے ایام گزارتے رہے۔

موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

چہرے پہ یاس، آنکھوں میں سوچ، ہونٹوں پر حسرت، باتوں میں ایطال۔ بظاہر نغمہ، بباطن نوحہ۔
ترقی پسند شعراء کے امام۔ شاعری میں نئے ہیئت، اور نئے تجربوں کے داعی۔ فیض احمد فیض

ایک فرصت گناہ ملی وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

پروفیسر سلامت اللہ خاں

DEPARTMENT OF ENGLISH
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH

۲۰ر فروری ۶۵ء

برادرم　السلام علیکم۔

آپ کا ۸ر فروری کا خط آیا۔ جواب میں تاخیر کی معافی چاہتا ہوں۔ میں علی گڑھ سے باہر تھا۔

مجھے یہ سن کر بیحد مسرت ہوئی کہ آپ افکار کا فیض نمبر نکال رہے ہیں۔ میں فیض کے بہت پرانے مداحوں میں سے ہوں یعنی اس زمانے سے جب لوگ "معتقد فتنۂ محشر نہ ہوتے تھے"۔ اور اب بھی جب کبھی ان کی کوئی چیز پڑھنے کو مل جاتی ہے تو فخر سے سر اونچا ہو جاتا ہے کہ یہ شاعر اردو زبان کا ہے۔

آپکا مخلص
سلامت اللہ خاں

سید محمد تقی

روزنامہ جنگ کراچی

۷ فروری ——— ہاں غالباً فروری ۱۹۴۷ء ہی کا ذکر ہے۔ امپیریل ہوٹل دہلی میں آل انڈیا مسلم نیوز پیپرس ایڈیٹرس کانفرنس کا اجلاس ہوا تھا جس میں ملک بھر کے مسلم اخباروں کے نمائندے شریک تھے۔ میں نے فیض صاحب کو پہلے پہل اس کانفرنس میں دیکھا۔ ململ کا کرتہ اور چپل پہنے ہوئے وہ سلسے مجمع میں ممتاز نظر آ رہے تھے۔ انگریز کے عہد میں کسی انگریزی اخبار سے وابستگی ایک ناقابلِ تصور اعزاز رکھتی تھی۔ خاص طور پر ایک مسلمان کے لئے جن میں انگریزی داں مسلم اخبار نویس خال خال ہی ہوتے تھے۔ اور ان میں سے بھی چند ہی ایڈیٹری کے آخری زینے پر پہنچنے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ پھر یہ بات بطور حقیقت

کے مان لی گئی تھی کہ انگریزی اخبار والوں پر انگریزی لباس ہی پھبتا ہے کالے ہندوستانیوں کا لباس نہیں جچتا۔ کانگریس والے البتہ اس کلیہ سے مستثنیٰ تھے جو دھوتیاں باندھتے تڑاق پڑاق انگریزی بولا کرتے تھے۔ اس لئے آل انڈیا مسلم نیوز پیپرس ایڈیٹرس کانفرنس کے احساس کمتری زدہ ماحول میں فیض صاحب کی یہ بدعت پُر تناؤ کر دینے کا سبب بنی۔

میرے ذہن میں اس ملاقات کی ایک اچٹتی سی یادداشت رہی جو کوئی سولہ سترہ سال بعد کراچی میں تازہ ہوئی۔ جب کراچی کے کسی ہوٹل میں ان سے ایک ضیافت میں ملاقات ہو گئی۔ پاکستان بننے کے بعد کراچی میں فیض صاحب ابھی ایک دو سال سے مستقل طور پر قیام پذیر ہوئے ہیں۔ اس عرصہ میں ان سے بار بار اور طویل ملاقاتیں ہوتی رہیں اور میں ہمیشہ ان سے مل کے یہ تاثر لیتا کہ وہ سیدھی سادی طبیعت، صاف مزاج اور کھلے دل و دماغ کے مالک ہیں۔ ادبی مقام، شاعرانہ بلند پردازی اور نظریاتی بلوغ سے قطع نظر اگر انھیں محض انسان کی حیثیت سے تولا جائے تو وہ انسانوں کی اس نسل میں نظر آئیں گے جو خانقاہی اخلاق کا ورثہ لیکر زندگی گزارنے کے نظریہ پر چلتی ہے۔ انھیں بآسانی دھوکہ دیا جا سکتا ہے۔ لیکن وہ مزاج کے ان تشکیلی عناصر سے محروم ہیں جو چلت پھرت، داؤ پیچ اور تہہ دار کردار کی تکمیل کا سبب بنتے ہیں۔

تاریخ کے تمام وہ لوگ جو سماج کی عام سطح سے ابھر کر تاریخ کے بہاؤ میں شامل ہو سکنے میں کامیاب رہے ہیں عام طور پر دُہری شخصیت گزارنے پر قدرت رکھتے تھے بلکہ نفسیات کے پس منظری عوامل کا جائزہ لیا جائے تو ہر انسان کسی نہ کسی درجہ میں بیک وقت دہرے کرداروں کا بوجھ اٹھائے رہتا ہے۔ اس کی بیرونی شخصیت فرد پر سماج کی قدروں کے دباؤ سے پیدا ہونے والے اخلاقی بار کی وجہ سے وجود میں آتی ہے۔ تاریخ میں خرد کی بڑائی بڑی حد تک اس بات پر منحصر رہی کہ وہ اپنے بیرونی کرداری غلاف کو کس ذہانت کے ساتھ استعمال کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔ "امیبا" ناسازگار ماحول میں غلاف اوڑھ کر اپنی زندگی بچا لینے کا آرٹ جانتا ہے۔ دوسرے ذی حیات بھی جہد للبقاء کی دوڑ میں اس خول پسندی کے اصول پر عمل کرتے ہیں۔ انسانوں کی سطح پر غلاف اوڑھنے کی یہ عادت سماجی تصادم کے پیدا کردہ شخصی غلاف اوڑھنے کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ انسان جسمانی لبادے ہی نہیں، اوڑھتا کرداری لبادے بھی استعمال کرتا ہے، اور وہ لوگ سماج سے زیادہ کامیاب معاملت کر لیتے ہیں جو اس سماجی خول یعنی سماج کے عطا کردہ خول کو پوری ذہنی توانائی کے ساتھ اور شعوری بیداری کی حالت میں استعمال کرتے ہیں۔ وہ عام طور پر سماجی قدروں کے بنے ہوئے پردے کے پیچھے رہتے ہیں اور کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ اس پردہ کو چاک کر کے باہر جھانک لیتے ہوں اور اپنی حقیقی شخصیت کا پرتو ڈال سکتے ہوں۔ سماجی پردوں کے پیچھے رہنے کی بنا پر یہ بڑا مشکل ہے کہ انسان کو اس کے صحیح رنگ میں دیکھا جا سکے اور اس کی حقیقت کو متعین قدروں کی ترازو میں تولا جا سکے۔ اپنی بیرونی شخصیت کے سہارے زندہ رہنے کا فن سب سے بہتر طور پر سیاست داں جانتے ہیں جبکہ اپنی اندرونی شخصیت پر قناعت عام طور پر ادبا، مفکرین اور دانشور کرتے ہیں۔ یقیناً اس میں متعدد استثنا بھی ہیں۔ لیکن یہ مستثنیٰ مثالیں متعلقہ دانشوروں کو دانشوری کے دائرے سے نکال کر سیاست دانوں کے زمرے میں لا کھڑا کرتی ہیں گویا یہ چند لوگ ان بکریوں میں بھیڑیئے بن کر آگئے ہیں جو سیدھی سادی زندگی گزارنے کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔ فیض صاحب پر بھی سماج نے دوہری شخصیت تھوپی ہے۔ لیکن میں جہاں انھیں سیدھا سادا، صاف طبیعت یعنی اکہری شخصیت کا حامل سمجھتا ہوں اس کا سبب یہ ہے کہ وہ اپنی سماجی شخصیت کو سیاست دانوں کی طرح استعمال کرنا نہیں جانتے۔ اور اسی سے ان کے کردار میں جاذبیت اور ان کی شخصیت میں رچاؤ پیدا ہو گیا ہے۔

لوگ افراد کے لئے جو پیمانے چاہیں بنا لیں مگر میں سمجھتا ہوں کہ افراد کی ناپ تول کا ٹھیک ٹھیک پیمانہ صرف یہ ہے کہ وہ اپنی کس شخصیت میں زندگی گزارتے ہیں اور انھیں سماج سے متصادم ہونے کی وجہ سے جو کردار ملا ہے اس کے استعمال کے فن سے کس قدر ناواقف ہیں۔ جو جتنا بھی ناواقف ہے وہ اسی قدر پیاری شخصیت رکھتا ہے اور اس فن میں جو جتنا سیانا ہوتا ہے اسی قدر کھوٹے کردار کا مالک۔

میر رسول بخش تالپور

حیدرآباد مغربی پاکستان

فیض نے بین الاقوامی اعزاز حاصل کر کے اردو زبان و ادب اور پاکستان کی عظمت میں غیر معمولی اضافہ کیا ہے۔ ان کی شاعری اچھوتے خیالات اور زندگی کے حقائق کی آئینہ دار ہے۔ اردو ادب میں فیض جیسی کم ہستیاں پیدا ہوئی ہیں۔ مجھے فخر و مسرت ہے کہ میں ان کے نیازمندوں اور عقیدتمندوں میں شامل ہوں۔

وہ بڑے منکسر المزاج انسان ہیں۔ ان کی پوری شخصیت نہ صرف کشش انگیز بلکہ سحر انگیز ہے۔ دوستوں میں بھی مقبول ہیں، عوام و خواص میں بھی مقبول۔ فیض کو اپنے وطن و ملک سے جنون کی حد تک محبت ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ وہ مسلمان قوم میں پیدا ہوئے جس کی ناقدری اپنے محسنوں کے ساتھ ایک روایت بن چکی ہے۔

فیض صرف شاعر ہی نہیں ایک حوصلہ مند دلیر انسان بھی ہیں۔ بڑی سے بڑی مصیبت اور پریشانی کے عالم میں میں نے انھیں ہمیشہ مسکراتے دیکھا ہے۔ وہ عزیزوں اور دوستوں کے غم میں بھی برابر کے شریک رہتے ہیں اور ان کی خوشیوں اور مسرتوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ واقعی ان کی شخصیت ہر لحاظ سے مکمل ہے۔ ان کی زندگی اور فن پر ہزاروں نمبر بھی شائع کئے جائیں تو کم ہے صہبا صاحب۔ قابلِ مبارکباد ہیں کہ انھوں نے زندگی میں قدردانی اور خراجِ تحسین کی روایت کا آغاز کیا۔ ان کے اس اقدام کی پوری قوم کو قدر کرنی چاہیئے۔

رسول بخش

ڈاکٹر عبدالوحید

فیروز سنز لمیٹڈ لاہور

۱۲ر جنوری ۶۵ء

محترمی صہبا صاحب! سلام مسنون

آپ نے افکار کے خاص نمبروں کے ذریعہ مردہ پرستی کا بت توڑ کر زندہ دوستی کی جو طرح ڈالی ہے اس کے لئے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ خداوند تعالیٰ آپ کو مزید ہمت و استقامت مرحمت فرمائے۔

فیض صاحب سے میں ذاتی طور پر متعارف ضرور ہوں۔ مگر انھیں قریب سے دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ کلام البتہ پڑھا ہے اور بحیثیت ایک قاری کے ان کی عظمت کو سراہا اور مانا ہے۔ ان کے نظریات و عقائد سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن جدید اردو شاعری میں ان کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ انھوں نے نئی نسل کی ایک خاصی تعداد کو اپنے افکار سے متاثر کیا ہے۔

فیض کی ایک بڑی خوبی جس کا میں خلوص کے ساتھ معترف ہوں، ان کا اعتدال اور متوازن اندازِ بیان ہے۔ وہ اپنے نظریات دوسروں پر زبردستی تھوپنے کی کوشش نہیں کرتے۔ بڑے نرم، رومانک لہجے میں اپیل کرتے ہیں اور یہی خصوصیت انھیں اپنے ہمعصر ترقی پسند شعراء میں ممتا

کرلیا ہے۔
اردو کے شعراء میں یہ فخر بھی صرف فیض ہی کو حاصل ہے کہ انھوں نے مختصر ترین شعری سرمایہ کے باوجود عالمگیر شہرت پائی اور لینن پرائز لے کر اردو کا سر فخر سے بلند کر دیا۔
امید ہے کہ افکار کا فیض نمبر بھی جوش نمبر کی طرح ایک عہد آفریں ادبی دستاویز ثابت ہوگا۔

عبدالوحید

نادم سیتاپوری

۱۶ جنوری ۱۹۶۵ء

نئی نسل کو "نئی غزل" کے فکر و فن کا نیا مزاج دینے والوں میں فیض ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے اس کے یہاں محض مشاہدہ نہیں ہے بلکہ مجاہدہ بھی ہے اس نے گفتار اور کردار کی غیر مربوط کڑیوں کو ہم آہنگ کر کے غزل جیسی فرسودہ صنفِ سخن کی آبرو رکھی۔
"فیض بلاشبہ ترقی پسند رجحانات اور بورژوائیت کے مابین ایک ایسا خوشگوار اور پائیدار سمجھوتہ ہے جسے اردو ادب کی تاریخ بہت دنوں تک فراموش نہ کر سکے گی۔

نادم سیتاپوری

محمد عتیق صدیقی

جامعہ نگر - نئی دہلی ۲۵
۱۲ دسمبر ۱۹۶۴ء

محترمی صہبا صاحب   تسلیم

نوازش نامہ مورخہ ۲۰ نومبر ملا۔ شکریہ۔ دہلی سے باہر تھا، اسی وجہ سے جواب میں غیر معمولی تاخیر ہوئی۔ یقین ہے کہ آپ معاف فرمائیں گے۔ یہ حقیقت ہے اور ہمیں اس کا کھلے دل سے اعتراف بھی ہے، کہ پاکستان کی آب و ہوا رسائل کے لیے بے حد سازگار ہے۔ وہاں کے اکثر رسائل کے عام نمبر بھی ہمارے بیشتر رسائل کے خاص نمبروں سے بہتر ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں "افکار" خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے، جس نے بڑی کامیابی سے "جوش نمبر" اور "حفیظ نمبر" نکال کر پاکستان کے ادبی رسائل کی اگلی صف میں اپنی جگہ ہی نہیں بنائی ہے، بلکہ مشرق کی روایتی مردہ پرستی سے ہٹ کر ایک نئی راہ نکالی ہے جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے۔ جوش اور حفیظ کے بعد افکار نے ہمارے عہد کے اردو کے سب سے بڑے متغزل شاعر کو اپنا موضوع بنایا ہے۔
یقین ہے کہ افکار کا فیض نمبر بھی اسی قدر عظیم ہوگا، جس قدر فیض کی شاعری عظیم ہے۔
آپ کے فیض نمبر کے ساتھ میری اور میری بہترین خواہشات اور توقعات وابستہ ہیں۔

محمد عتیق صدیقی

ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ

حیدر آباد
65/1/5

مکرمی تسلیم!

منفرد صاحب سے عقیدت ہے۔ آپکے حکم کی تعمیل کر رہا ہوں۔ کیا پیغام لکھوں سمجھ میں نہیں آتا بہر حال چند سطور بھیج رہا ہوں

مخلص

نبی بخش

مجھے یہ معلوم کرکے بہت خوشی ہوئی کہ امسال فیض احمد صاحب فیض کی ۵۴ ویں سالگرہ پر مکتبۂ افکار، فیض نمبر نکال رہا ہے

فیض اس صدی کے ہر دلعزیز، باوقار اور انقلابی شاعر ہیں۔ وہ اس دور میں ایسی شخصیت کے مالک ہیں جو آئندہ نسلوں کے لیے مشعل راہ بن سکتی ہے۔

افکار، کے فیض نمبر کی اشاعت پر میں آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ نمبر افکار، کی زندگی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

ڈاکٹر ایم آئی شیخ خلیل حیدر آبادی

صدر، حیدر آباد
۱۴ مارچ ۶۵ء

حضرت صہبا لکھنوی مدیر افکار، سلام مسنون

جب آپ کی تحریر سے مجھے یہ معلوم ہوا کہ آپ افکار کا فیض نمبر نکال رہے ہیں تو میں دیر تک ایک محویت کے عالم میں سوچتا رہا کہ اس پرتلموں کائنات کی نیرنگیاں کس قدر عجیب ہیں اور کتنی دلکش کہ ان کی طرف خیال کرتے ہی انسان کسی اور ہی عالم میں پہنچ جاتا ہے اور دیر تک اسے اپنی دنیا سے بے خبری رہتی ہے۔

اس سائنس اور مشین کے زمانے میں ادب و شعر کی طرف توجہ کرنا بظاہر ایک عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے۔ لوگ تو چاند پر جانے کی کوشش کر رہے ہیں اور کرۂ ارضی کے فاصلوں کو سمیٹ کر کم سے کم کر دینا چاہتے ہیں۔ اس مادیت کی ہیجان اور کشمکش میں ادب و شعر کی لطافتوں کی طرف خیال منتقل کرنا میرے خیال میں تو روحانیت یا روحانیت سے کوئی ملتا جلتا جذبہ ہو سکتا ہے اور اس جذبے میں ایک سکون ایک اطمینان ایک تھکے ہوئے مسافر کے سایہ طلب جذبے کی سی تلاش اور سلامتی کا پیغام محسوس ہوتا ہے۔

میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں کہ مردہ پرستی چھوڑ کر آپ نے زندہ اور چمکتے دمکتے جوہروں کی قدر دانی پر کمر باندھی ہے یہ بجائے خود بہت بڑی علامت حیات ہے۔ جوش نمبر اور حفیظ نمبر کے بعد افکار کا فیض نمبر یقیناً آپ کا اعلیٰ درجے کا سماجی، ادبی، اخلاقی اور شاعرانہ کارنامہ ہوگا۔ بلاشبہ فیض صاحب اپنی باطنی کیفیات قلبی واردات اور ظاہری احساسات کے اعتبار سے ہمارے ملک کے ایک ایسے ہی فرد ہیں جو اس حوصلہ افزائی کے مستحق ہیں جو آپ کی طرف سے کی جا رہی ہے۔ کیسا غضب ہے کہ سات سمندر پار کے لوگ فیض کو معاصرین کے ذریعہ سے دیکھ سکیں اور ہم پاس رہتے ہوئے بھی اس محترم شخصیت کا مشاہدہ نہ کر سکیں۔

صہبا صاحب میں سندھو نژاد سندھی ہوں۔ قدرتی طور پر میرا تعلق سندھی ادب سے ہونا چاہیئے اور ہے مگر ابتدائے عمر سے آج تک اردو ادب سے میرا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ قدما سے آج تک جتنے شعرا گزرے ہیں سب پر تقریباً قریب قریب نظر ہے مگر موجودہ دور میں اردو کے دو بڑے شاعر ایسے ہیں جن سے دوسری بین المملکتی زبانیں بھی متاثر ہیں اور جوش اور فیض کے کلام کو بہت ہی اہمیت دیتی ہیں۔ ملک کا وہ حصہ جس کو سابق سندھ کہتے ہیں اس کے اکثر ادیب و شاعر فیض سے آشنا ہیں اور اس کے افکار کے قدر داں۔

افکار کا فیض نمبر آپ کا ایک ایسا کارنامہ ہے جس کے لئے ادبی حلقوں اور شعری محفلوں کو آپ کا شکرگزار ہونا چاہیئے۔ کیا اچھا ہو کہ آپ مجھے بھی انہیں میں سے ایک سمجھ لیں۔

خلیل حیدرآبادی

ماہر القادری

ماہنامہ
فاران
مدیر: ماہر القادری
کیمبل سٹریٹ کراچی

جناب مکرم! السلام علیکم

جس دور سے ہم گزر رہے ہیں یہ وہ دور ہے کہ مرنے کے بعد اہل کمال کی خوبیوں کا اعتراف کیا جاتا ہے، زندگی میں ان کے جوہر لوگوں کو کم ہی نظر آتے ہیں۔ "افکار" نے زندہ مشاہیر پر خاص نمبر شائع کر کے صحیح قدر شناسی کا ثبوت دیا ہے۔ اور دنیائے ادب میں بڑی اچھی مثال قائم کی ہے،

جوش نمبر کے بعد حفیظ نمبر اور اب فیض نمبر کی تیاریاں ہو رہی ہیں توقع ہے کہ یہ سلسلۃ الذہب جاری رہے گا۔

ماہر القادری

محمد طفیل

نقوش لاہور
۲۶ مارچ ۱۹۶۵ء

برادرم آداب

میں اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں پایا کہ کچھ فیض صاحب کے بارے میں عرض کروں۔ اس لئے کہ اچھا مبصر تو وہی ہوتا ہے جو ایسی دور کی موتی لائے جو خود فن کار کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو تاکہ فن کار بھی مبصر کا منہ دیکھے اور قاری بھی۔

آپ تو میری ایک چھوٹی سی بات سن لیں۔ وہ یہ کہ میں فیض سے زیادہ فیض کی شاعری سے محبت کرتا ہوں۔

محمد طفیل

الطاف حسن قریشی

ماہنامہ اردو ڈائجسٹ
● ۲۱ ایکڑ سمن آباد۔ لاہور

جناب مکرم! السلام علیکم

میں بے حد شرمسار ہوں کہ آپ کے حکم کی تعمیل نہ کر سکا۔ کچھ تو یہ احساس رہا کہ میں اس کے قابل نہیں ہوں اور کچھ وقت کے جال میں پھنسا رہا۔

آپ کا فیض نمبر نکالنے کا عزم اور اس عزم کے پیچھے چھپا ہوا احساس اردو ادب کے لئے قوت کا سرچشمہ ہے۔ فیض صاحب کے خیالات اور ان کے عقائد سے ہزار اختلاف سہی، لیکن یہ تو ایک حقیقت ہے کہ انھوں نے سوچ کی نئی راہیں نکالی ہیں، اظہار و بیان کے نئے سانچے تراشے ہیں اور ان کے کلام کی شوخی اور نغمگی نے کتنے ہی دلوں اور ذہنوں کو مسحور کیا ہے۔ ایک اچھے فن کار کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں اور اس کے فن کے مختلف زاویوں کو یکجا کرنا کچھ آسان کام نہیں۔ طفیل صاحب! آپ فی الواقع مبارکباد کے مستحق ہیں کہ آپ ایک مشکل کام، جو فن کار کی زندگی میں اور بھی مشکل ہو جاتا ہے، اپنا خونِ جگر نچوڑ کر سرانجام دے رہے ہیں۔ خدا آپ کی صلاحیتوں کو اجاگر کرے۔

مجھے یقین ہے کہ فیض نمبر ان شاء اللہ آپ کے بھرپور عزم کی حقیقی مثال ہوگا۔ میری طرف سے پیشگی مبارکباد قبول فرمائیے۔

الطاف حسن قریشی

امریک آنند

Pagdandi
AN URDU MONTHLY
Phones : { Office : 2224 Res. : 4710

امرتسر

۱۰۔ دسمبر ۱۹۸۳ء

برادرم!

آپ کا محبت نامہ ملا۔ یاد فرمائی کے لئے شکریہ! آپ کے حسب خواہش فیض نمبر کے لئے اپنے تاثرات درج ذیل کر رہا ہوں ہماری نیک تمنائیں قبول کیجئے!!

"افکار" نے جوش نمبر کے ذریعہ شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کی خدمت میں ان کی ادبی خدمات کے لئے موزوں خراج عقیدت پیش کیا۔ یہ وقیع ضخیم نمبر جوش کے شایان شان تھا! حفیظ نمبر بھی قابل دید تھا۔ مقام مسرت ہے کہ اب "افکار" ایک خصوصی اشاعت "فیض نمبر" پیش کر رہا ہے!

فیض نے اردو شاعری کو نیا آہنگ دیا۔ اور نظم و غزل میں نیا رنگ اور نیا موڑ کلام فیض سے آیا۔ معاصر ارباب سخن اور ادیب ابتک ایک یاد دکھ بھائے اپنے دل کی بات زباں پہ لاتے ہوئے ڈرتے ہیں لیکن فیض نے کمال بے باکی اور بے خوفی سے انسان کے اپنے بہتر مستقبل کے لئے جد و جہد کے نغمے گائے ہیں۔ قید و بند بھی اس کی زباں بندی کرنے سے قاصر رہی اور زنداں نامہ میں اس نے اپنے جذبات و احساسات کا حسب سابق کھل کر اظہار کیا۔ آج بھی وہ اپنے کلام کے ذریعہ انسانیت کی سرخروئی کے لئے کوشاں ہے فی الحقیقت نظم میں فیض اور نثر (فکشن) میں کرشن چندر انسانیت کی ترجمانی کر رہے ہیں۔

ہم فیض نمبر کے لئے دلی نیک تمنائیں پیش کرتے ہیں۔ اور متوقع ہیں کہ ارباب ذوق اس خصوصی شمارہ کا خاطر خواہ خیر مقدم کریں گے۔ تاکہ "افکار" جلد ہی کرشن چندر نمبر بھی پیش کرے۔

امریک سنگھ آنند

شمس کنول

ماهنامه سنگم، کلیات، (مہاراشٹر)

۲۱ مارچ ۶۵ء

عزیز برادر محترم!

آپ کا اٹھائیس نومبر کا گرامی نامہ موصول ہوا۔ آپ کی فرمائش کے مطابق "افکار" کے فیض نمبر کے متعلق میں اپنی مختصر رائے کا اظہار کر رہا ہوں۔ آپ جیسے حضرات نے اردو پریس کو ایک شعور بخشا ہے! تھوڑی سی شراب اور بھنے ہوئے گوشت کی چند بوٹیوں کے لئے ترستے والے غالب آج اگر زندہ ہوتے تو خوشی سے پھولے نہ سماتے، ان کی زندگی میں کسی جریدے کا ان کی ادبی شان میں کوئی نمبر شائع کرنا تو دور کی بات تھی

مرزا کی زندگی میں تو ان کا دیوان بھی سلیقے سے نہ شائع ہو سکا، بانس کے ٹیلے کا غذ پہ بھدی طباعت کے ساتھ ان کا دیوان چھپا تھا جس کی قیمت چند کنے تھی، غالب کو تاج مرحوم لکھا جاتا ہے، دراصل وہ تو اپنی زندگی ہی میں قدر ناشناس زمانے کے ہاتھوں مرحوم بن چکے تھے ...

ادبی اور علمی ہستیوں سے زندہ دوستی اور اعتراف کمال کے سلسلے میں آپ نے پہل کی ہے۔ "افکار" کا جوش نمبر میری نظر سے گزرا تھا میرے خیال میں وہ ادب کی تاریخ کی ایک دستاویز تھی، شاید ہی کسی جریدے نے یا مدیر نے کسی ادبی شخصیت کے بارے میں تفصیلی مربوط مستند اور مکمل نمبر شائع کیا ہو، وہ نمبر صحیح معنی میں لائبریری کے لائق تھا اور تعلیمی نصاب میں شامل کئے جانے کے قابل تھا ... جوش نمبر اور حفیظ نمبر کے بعد فیض نمبر آپ کی تیسری کوشش ہے۔ آپ کے پچھلے اعلیٰ ریکارڈ کو دیکھتے ہوئے امید ہے کہ آپ کی یہ تیسری کوشش بھی کامیاب ہوگی اور افکار کا فیض نمبر پڑھنے والوں کو فیض پہنچائے گا ... یوں تو جوش، حفیظ اور فیض کسی تعارف کے محتاج نہیں، مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بڑے سے بڑا شاعر اور ادیب اپنی زندگی میں زمانے کی ناقدری کی بنا پر بڑی مردہ دلی سے اپنی زندگی بسر کرتا ہے۔ آپ اپنے ان نمبروں کے ذریعے لائق ادیبوں اور شعراء کی زندگی کو توانائی بخش رہے ہیں اور آپ کی یہی خدمت آپ کی بخشش کے لیے کافی ہے ... آپ کے ارد گرد موٹے موٹے، ضخیم اور جنگل جیسے نمبر شائع کرنے کی بدعت عام ہے مگر وہ نمبر عقل اور ادراک کی ترازو سے نہیں تولے جا سکتے، ان کی "افادیت" معلوم کرنے کے لیے ان کو سیروں اور منوں میں تولنا پڑتا ہے اور اصل وہ نمبر تو دوست نوازی، ادارہ پروری اور گروپ بندی کے مظہر ہوتے ہیں ... حال ہی میں ایک جریدے کے سالانہ نمبر کے دو حصے میری نظر سے گزرے، اس میں اردو زبان کے دو ایسے "قلم کاروں" کی آپ بیتیاں بھی شامل تھیں جو ابھی صحیح طور پر اردو بھی نہیں لکھ سکتے اور نہ افسانے کی تیکنک سے واقف ہیں! ان کی آپ بیتی بھی کوئی معنی نہیں رکھتی، ان پر تو ابھی بیت رہی ہے ... امید ہے کہ جوش نمبر اور حفیظ نمبر کی طرح فیض نمبر بھی مصلحت اندیشی سے پاک ہوگا، معترضانہ طور پر یہ بھی عرض کر دوں کہ میں ڈر، خوف، لالچ اور جانبداری اور منافقت کو مصلحت کہتا ہوں، میرے یہاں لغت میں مصلحت سے اور کوئی معنی نہیں ... بہرحال فیض نمبر کے سلسلے میں میری نیک خواہشات اور شبھ کامنائیں آپ کے ساتھ ہیں، قدرت کرے کہ آپ کو کامرانیوں کی کہکشاں، مسرتوں کی بہار اور صحت کے پھول نصیب ہوں!

شمس کنول

تاج سعید

MONTHLY
ARZHANG
AN ORGAN OF ... PUSHTO ... LITERATURE ...

ارژنگ

برادر مکرم۔ سلام و نیاز

آپ کا گرامی نامہ موصول ہوا۔ آپ نے فیض نمبر کے لیے بطور ایک صحافی مجھے بھی ایک پیغام تحریر کرنے کا حکم دیا ہے۔ آپ کی اس توجہ کا شکریہ۔

فیض اس عہد کے بہت بڑے شاعر ہیں۔ ان کو اپنی زندگی ہی میں جو عالم گیر شہرت ملی ہے، اپنے فن کی وجہ سے، وہ اس کے مستحق

لیکن آپ نے ان کی زندگی، شخصیت اور فن کے بارے میں جو ضخیم نمبر نکالنے کا پروگرام بنایا ہے، اس سے انکی عظمت کو چار چاند لگ جائیں گے۔ اور وہ لوگ جو انکی شاعری کے کلاسیکی مزاج کے قائل نہیں ہیں وہ بھی معترف ہو جائیں گے۔

یہ میں نے اس لئے لکھا ہے کہ ابھی کچھ حضرات ایسے بھی ہیں جن کو فیض کی برائی تسلیم کرنے میں تامل ہے۔ خیر یہ تو اپنی اپنی پسند کا معاملہ ہے۔ پھر بھی لینن پرائز کے انعام یافتہ کے طور پر فیض نے نہ صرف اردو ادب کا مان بڑھایا ہے، بلکہ ان کی فنکاری نے پاکستان کو دنیا بھر میں عزت و شہرت بھی بخشی ہے یہ کارنامہ کوئی معمولی نہیں۔

آپ قابل مبارکباد ہیں کہ آپ نے زندہ شخصیتوں کو ان کی زندگی میں خراج تحسین پیش کرنے کی جو روایت قائم کی ہے فیض نمبر کی اشاعت سے اس روایت کو مزید تقویت ملے گی۔"

مجاہد سلیم

چھپتے چھپتے

کرشن چندر

بمبئی
۲۵ / اپریل ۶۵ء

پیارے صہبا

معاف کرنا، بہت پریشان اور مصروف تھا —
"فیض نمبر" تمہیں بھی مبارک ہو اور فیض کو بھی۔ تم نے زندگی میں قدر دانی کی نئی روایت شروع کر کے تاریخی خدمت انجام دی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ 'جوش نمبر' اور 'حفیظ نمبر' سے زیادہ تمہارا 'فیض نمبر' مقبول و کامیاب رہے گا۔ مجھے تمہارے خلوص، تمہاری محنت اور تمہارے عزم و عمل سے اسی کی توقع ہے۔

'فیض نمبر' ملنے کے دو تین روز میں ضرور کوئی مختصر سا مضمون روانہ کروں گا۔
میرا انتظار کرو۔

تمہارا
کرشن چندر

ایگل
ایک عالمگیر قلم
دستیاب ہے
• نائجیریا • کویت
• ہانگ کانگ • شام • انگلینڈ
• ٹانگانیکا • لبنان • ایران
• کینیا • ترکی • برما
• ملائیشیا • اردن • عراق
آزاد فرینڈز اینڈ کمپنی لمیٹڈ

تھری اسٹارز

کی تین روشن صفات

3-STARS
1.5 VOLT
BATTERY
GUARANTEED EXTRA LONG LIFE

★ اعلیٰ کارکردگی

★ دیرپا

★ صحیح وولٹیج

تھری اسٹارز سیل میں اول سے آخر، خول سے مرکز تک ایک بڑھیا سیل کی سب خوبیاں شامل ہیں۔ مثلاً بہترین کیمیاوی اجزا، ساخت کے دوران کڑی جانچ اور سب سے بڑھکر سیل سازی کا طویل تجربہ۔
تھری اسٹارز سیل خریدیئے۔ یہ نام اس بات کی ضمانت ہے کہ یہ سیل بازار میں اپنی قسم کے ہر سیل سے عمدہ ہے۔
تھری اسٹارز سیل اپنی اعلیٰ کارکردگی۔ دیرپائی اور صحیح وولٹیج کی وجہ سے لاکھوں خریداروں میں مقبول ہے۔

نقش فریادی؟

محبوبِ نظر

اِک نظر تم مِرا محبوبِ نظر تو دیکھو

ایلس فیض
ترجمہ
سیّد ابوالخیر کشفی

یادوں کے سائے

یہ بات تقریباً ناممکن ہے کہ کسی ایسے شخص کے بارے میں معروضی انداز میں بات کی جائے۔ جو چوبیس سال تک رگِ جاں کی طرح ساتھ رہا ہے ——— ایک ایسا شخص جو میرا شوہر ہے۔

فیض پر لکھتے وقت ذاتی باتیں اور مشترک تجربات ریشم کی طرح دامنِ دل کو کھینچتے ہیں لیکن جب انتخاب کا یہ مرحلہ آ جائے کہ "کیا لکھوں" تو وہی باتیں چننی چاہئیں جو دوسروں کی زندگی پر اپنے اثرات مرتب کر سکیں۔ دوسروں کے دلوں کو یوں چھو لیں کہ ان کا لمس تبسم اور قہقہہ کی تحریک بن سکے ——— یہی نہیں بلکہ وہ باتیں آنسوؤں کی سرحد تک پہنچا دیں۔

میں ماضی کی طرف دیکھتی ہوں ——— اور میری نگاہیں ناگزیر طور پر زنداں کے دروازوں سے ہو کر ماضی تک پہنچتی ہیں جن کے یہ سال ہماری باہمی زندگی میں ایک خزینے کی طرح نظر آتے ہیں۔ مگر ان برسوں نے ہم دونوں کو وہ کچھ دیا ہے جو کسی طرح بھی ہم حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ چند سال جن میں گھٹنیوں چلتی ہوئی ایک بچی، چھوٹی سی لڑکی بن گئی جن میں ایک لڑکی آہستہ آہستہ نوجوان خاتون بن گئی۔ جن میں زندگی کی ایک اچانک موڑ کی طرح کسی کے سر کے بالوں پر سفیدی غالب آگئی۔ اور کسی کے چہرے پر جھریاں ——— آہستہ آہستہ اپنا جال بنتی رہیں ——— زنداں کے دروازے ہمارے درمیان حائل تھے ——— لیکن ان دروازوں میں داخل ہوتے ہوئے، ان سے نکلتے ہوئے، زنجیروں کی جھنکار اور تالوں میں کنجیوں کے گھومنے کی آواز کے ساتھ زنجیر و سلاسل کے یہ ایام اپنے جلو میں مسرت سے بھرپور لمحے لے کر آئے۔ ناقابلِ یقین طور پر خوشیوں سے گل بداماں لمحے ——— میں ان دنوں کے غم بلکہ غموں کی بات نہیں کروں گی۔ کیونکہ موت (اور غم) نے اپنی خراشیں ہم دونوں کو دی ہیں ——— میں تو خوشی کے لمحوں کی یاد تازہ کرنا چاہتی ہوں تاکہ سورج کی روشنی سے یہ بیتے ہوئے لمحات جگمگا اٹھیں ——— حالانکہ میں جانتی ہوں کہ سائے بھی اتنے ہی عزیز ہوتے ہیں۔

جب مارچ کی ایک صبح کو فیض نے مجھے اور سوتے ہوئے بچوں کو خدا حافظ کہا تو میرے سامنے سب سے پہلا اور سنگین مسئلہ یہ تھا کہ چار سو روپے ماہانہ کی آمدنی سے گھر کو کیسے چلایا جائے گا؟ بادلِ ناخواستہ ہم نے شفیع اللہ کے علاوہ دوسرے پرانے نوکروں کو الگ کر دیا۔ شفیع اللہ جو

اب بھی ہمارے ساتھ ہے۔ فیض کی سراپا اخلاص سوتیلی بہن بلی ہمارے ساتھ رہنے کے لئے آ گئی۔ تاکہ وہ بدلے ہوئے حالات میں زندگی بسر کرنے میں میری مدد کر سکے۔ پہلی ضرب ہمارے کچوں پر پڑی۔ کونونٹ میری کالج سے ان کا نام کٹوا کر کنیارڈ مشن اسکول میں داخل کرانا پڑا۔ مجھے تو اس بات کا اندازہ بعد میں ہوا کہ یہ فیصلہ ہماری بچیوں کے لئے کتنا سود مند ثابت ہوا۔ منیزہ اکثر مجھے برا بھلا کہتی۔ جب الویباں تھے تو میرے پاس ایک آیا تھی۔ اسکول میں جھولے تھے۔ مگر ٹمی بھی طرح طرح کے کھیل تھے ...... یہاں نئے ماحول میں اسے فرش پر بیٹھنا پڑتا۔ لیکن دعا کے نئے طریقوں نے اس میں ایک عجیب سا ذہنی اور نفسیاتی ہیجان پیدا کر دیا تھا ـــــ میری نند کے احتجاج کے باوجود وہ رات کو سونے سے پہلے اپنے گھٹنوں پر جھک کر نیم رکوع کے سے عالم میں آسمانی باپ کی حمد ـــــ بگڑی ہوئی، اور قدرے مضحک اردو میں سناتی۔ ایک رات جب وہ اپنے خالق سے مصروف کلام تھی اور ہم اسے سلانے کے لئے منتظر تھے، اس نے کہا۔ " او آسمانی باپ ...... تم جو حیدر آباد جیل میں ہو۔ جلدی سے واپس آ جاؤ۔" جب ہم نے اپنی گھٹی ہوئی ہنسی پر قابو پا لیا اور منیزہ کی باقی دعا سن لی تو اسے بستر میں لٹا دیا۔ پھر سے (نیم بیداری کے عالم میں) یہ کہتے ہوئے سنا۔ " باجی ـــــ بہت جلد سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

جیل میں ملاقات کی اجازت مدتوں کے انتظار کے بعد ملتی اور ہر ملاقات کی یاد اگلی ملاقات تک ہم سینے سے لگائے رہتے۔ اگلی ملاقات تک ہر پچھلی ملاقات کی ایک ایک نگاہ، ایک ایک لفظ، ایک ایک جنبش کو ذہن و دل ایک متاع عزیز کی طرح محفوظ رکھتے۔ یہ ملاقاتیں دو تین مہینے میں ایک بار ہوتیں ـــــ ہر ملاقات کے لئے ہمیں صحرائے سندھ کی وسعتوں کو طے کرنا پڑتا۔ یہ سفر تھکا دینے والے بھی تھے۔ اور پھر اس تھکن پر اخراجات کا اضافہ کیجئے۔ جیلر ہر ملاقات کی نگرانی کرتا۔ خاص طور پر میری ملاقات کی نگرانی کیونکہ مجھے "ممکنہ معلومات کا ذریعہ" سمجھا جاتا تھا۔ ہم ملاقات کے ان لمحوں کو ہلکے پھلکے واقعات اور دوستوں کے چٹکلات سے شیریں تر بناتے۔ تاکہ ان کا بوجھ لطافت تلے دب جائے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک ملاقات کے موقع پر جب میں ایک کہانی سنا رہی تھی۔ ہمارا جیلر اس کہانی کی دلچسپیوں میں یوں گم ہو گیا کہ جب سنتری اور جیلر کی ڈیوٹی کا وقت پورا ہو گیا تو اس نے دوسرے جیلر سے کہا: "بھئی تھوڑی دیر ٹھہر جاؤ۔ میں اس کہانی کا انجام تو سن لوں۔"

دوستوں نے مجھ سے اکثر پوچھا کہ بھلا کسی غیر کی موجودگی میں باتیں کیسے ہوتی ہوں گی؟ دو دوستوں کی ملاقات کے درمیان ایک تیسرا وجود ـــــ ہر بات سنتا ہوا آدمی۔ سچ پوچھئے تو ہمیں اکثر کسی اور کی موجودگی کا احساس ہی کب ہوتا تھا۔ ہاں کبھی کبھی حجاب درمیاں کی موجودگی، ملاقات کو آلودہ کر دیتی تھی۔ جیسے شروع شروع میں جیلر صاحب میرے اور فیض کے درمیان بیٹھنے پر اصرار فرماتے تھے۔

فیض کی گرفتاری اور ان کی غیر قانونی قید تنہائی (میں غیر قانونی اس لئے کہہ رہی ہوں کہ ایک مقررہ مدت سے زیادہ کسی شخص کو قید تنہائی کے عذاب میں مبتلا رکھنا غیر قانونی ہے) کے تین ماہ بعد میں اپنی دونوں بچیوں کے ساتھ ان سے ملنے لائل پور جیل گئی۔ ہمیں سپرنٹنڈنٹ کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ اس نے میرا نام پوچھا۔ میں نے بتا دیا۔ پھر اس نے ہم تینوں کو دیکھا۔ مجھے اب یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاید اس لمحہ ہم بہت تنہا، مایوس، دلملول اور دل گرفتہ نظر آ رہے تھے۔ جیسے ہمارے چہرے ہماری ذہنی کیفیت اور زندگی کے آئینے بن گئے ہوں۔ سپرنٹنڈنٹ نے مجھ سے پوچھا: "آپ کی یہی دو بچیاں ہیں؟" میں نے اسے بتایا کہ یہی بچیاں ہماری متاع ہیں۔ ہماری زندگی کا حاصل ضرب۔ اس نے جھجکتے ہوئے سوال کیا "کوئی لڑکا نہیں ہے؟" میں نے نفی میں گردن ہلائی ـــــ اس نے ایک آہ بھری ـــــ ایک طویل آہ۔ پھر میری طرف دیکھا اور کہا: "کیسے افسوس کی بات ہے۔ کیسی افسوسناک بات ـــــ" اس کے لہجے سے مجھے یہ احساس ہوا جیسے اب کسی بیٹے کی ماں بننا میرے مقدر میں نہیں جیسے ـــــ میرا سہاگ لٹ چکا ہو!

اور جب فیض کمرے میں داخل ہوئے تو دونوں بچیاں دوڑتی ہوئی ان کی آغوش میں سما گئیں۔ منیزہ نے جیسے بڑبڑاتے ہوئے کہا "ابو!

"وہ کہتے تھے کہ آپ کے ہاتھ اور پیر کاٹ ڈالے جائیں گے۔" وہ کون تھے یہ مجھے کبھی نہیں معلوم ہو سکا لیکن اس لمحے جب ہماری (میری اور فیض کی) نگاہیں ایک دوسرے سے ملیں تو ہمیں معلوم ہوا کہ بے یقینی ــــــ کے تجربے اور خوف سے ہم ہی نہیں گزر رہے تھے (بلکہ ہماری بچیاں بھی بے یقینی کے کرب میں مبتلا تھیں۔)

حیدرآباد تک ہمارے سفر کا مطلب تھا زیادہ ملاقاتیں۔ ان موقعوں پر ہم سہروردی مرحوم کے ساتھ قیام پذیر ہوتے۔ جو "ملزم" کی قانونی پیروی کر رہے تھے۔ سلیمہ اور منیزہ سہروردی صاحب سے جیسے بے ساختہ پیار کرنے لگیں۔ اور ان سے قریب ہوتی گئیں۔ سہروردی مرحوم بچیوں کے لئے رقص کی موسیقی کی دھن پر دائرہ ڈانس کرتے ــــــ دائرہ میں رقص ــــــ ایک دن سلیمہ نے اپنے سر کو جھٹکتے ہوئے کہا "آج میں نہیں ناچوں گی"۔ لیکن منیزہ فوراً اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ سہروردی صاحب نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ اور پرانی دنیا کے آداب کی سراپا تصویر بن کر جیسے رقص کی فرمائش کرتے ہوئے قدرے جھکے۔ منیزہ نے ایک نوجوان خاتون کی طرح جھک کر اس درخواست کو قبول کر لیا۔ سہروردی صاحب کا چہرہ بشاشت سے کھل اٹھا اور وہ دونوں کمرے میں ایک آہستہ اور مدہم سے فرانسیسی انداز کے شاہانہ رقص (minuet) میں مصروف ہو گئے۔ بعد میں سہروردی صاحب نے کاٹری میں دریائے سندھ تک جانے کی تجویز پیش کی۔ اور پھر دریا کی موجوں پر کشتی چلاتے ہوئے انھوں نے ہمیں ایک پنجابی لوک گیت سنایا جو لڑکیوں کو پہلے سے یاد تھا۔ یہ سب کچھ کس قدر پر لطف تھا لیکن جب ہم یہ سوچتے کہ یہی بوڑھا صاحب جو ہر آدمی کی صحیح حصول انصاف کے لئے جیل کی چار دیواری کے اندر اپنی جدوجہد پھر شروع کر دے گا۔ تو ہر بات مہمل اور بے محل معلوم ہونے لگتی۔

"دربارِ وطن میں جب اک دن ...."

یہ فیض کی محبوب ترین اور مقبول ترین قوالیوں میں سے ہے مجھے حیدرآباد جیل کی ایک عید یاد ہے۔ جب بیشتر قیدیوں کے خاندان یکجا ہو گئے تھے۔ شوخ رنگوں کے رنگا رنگ اور بھڑکیلے کپڑے پہنے ہوئے اتنے بچے وہاں جمع تھے جنھیں دیکھ کر دیکھنے والا یہ بھی بھول جاتا کہ بلا کسی استثنا کے ان سب کے باپ ایسے الزامات میں ماخوذ تھے جن کی بنا پر استغاثہ سزائے موت تک کا مطالبہ کر سکتا تھا۔

عید کی اس پارٹی میں یہ قوالی جس جوش، چاؤ اور تیز دھن میں گائی گئی۔ اس کا تصور بھی ایک مشکل کام ہے ــــ اور جب قوالی ختم ہوئی تو اس وقت تک تمام بچے، بیویاں اور مائیں، سب ہی اس قوالی میں شریک ہو چکی تھیں۔ سب کے ہونٹوں پر صرف یہی بول تھے کہ

دربارِ وطن میں جب اک دن ...

ہم سب نے نہایت پرتکلف دعوت کا اہتمام کیا۔ اور جب ہم گھر "یعنی ڈاک بنگلے" واپس پہنچے تو بچیوں نے کہا ــــ "ایسا کھانا تو ہم نے بہت دنوں سے نہیں کھایا تھا۔ ہے نا امی"

کھانے کی بات پر مجھے ایک دلچسپ واقعہ یاد آیا ــــ یہ ان دنوں کا واقعہ ہے جب فیض کو سزا دی جا چکی تھی۔ اور وہ اپنی میعاد قید منٹگمری جیل میں پوری کر رہے تھے۔ منیزہ اور سلیمہ نے اپنے ابو کو خط میں لکھا "ہم آ رہے ہیں۔ آپ دوپہر کے کھانے کے لئے کوئی اچھی سی چیز ضرور پکا لیجئے گا۔ "ہمیں ایک ساتھ دوپہر کا کھانا کھانے کی اجازت دیدی گئی تھی۔ جب ہم لوگ منٹگمری جیل پہنچے تو نائب سپرنٹنڈنٹ لودھی صاحب نے منیزہ سے کہا "تمہارے ابو نے یقیناً تمہارے لئے کوئی خاص چیز پکائی ہوگی۔"

"آپ کو کیسے معلوم ہوا؟" منیزہ نے پوچھا۔

"میں نے تمہارے خط میں پڑھا تھا۔" قدوسی صاحب نے جواب دیا جیل کے ارباب حل و عقد یقیناً خطوں کا احتساب کرتے تھے۔ ہنیزہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور بولی۔ "تو کیا تم میرے خط پڑھتے ہو؟"

"ہاں" قدوسی صاحب بولے۔

"اُف! بدتمیز کہیں کے۔"

میں نہیں کہہ سکتی کہ یہ بمبرسن کر قدوسی صاحب پر کیا بیتی۔ لیکن مجھے یہ اچھی طرح یاد ہے کہ ان کے چہرے پر اس وقت کیسے تاثرات تھے۔ چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا بیچارے قدوسی صاحب

جب ۱۹۵۹ء کے ابتدائی مہینوں میں مارشل لا کے تحت فیض پھر پابند زنداں بنے تو لاہور جیل سے وہ قلعہ لاہور میں منتقل کر دیئے گئے۔ میں نے ان سے ملاقات کی درخواست دی۔ سی۔ آئی۔ ڈی کے ذمہ داروں نے دانستہ جھوٹ سے کام لیا۔ انھوں نے اس بات سے لاعلمی کا اظہار کیا کہ فیض لاہور جیل سے قلعہ میں منتقل کر دیئے گئے ہیں۔ چنانچہ (اس دانستہ جھوٹ کی وجہ سے) میں لاہور جیل گئی۔ اندر وہاں پتہ چلا کہ فیض تو وہاں سے جا چکے ہیں۔ اور جب میں نے ملاقات کے لئے دوبارہ درخواست دی تو میں غصہ کے مارے سچ مچ ابل پڑی تھی۔ آخرکار میں اپنی بوڑھی ساس کے ساتھ قلعہ لاہور پہنچی۔ فیض کو ان کی کوٹھری سے بلایا گیا۔ انھیں دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہوا کہ یا تو انھیں شیو کرنے کی اجازت نہیں دی گئی یا انھوں نے خود ہی داڑھی بنانے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ ان کے چہرے سے پتہ چلتا تھا کہ ان کے پچھلے چوبیس گھنٹے خوشگوار ہرگز نہ تھے۔

میں نے پوچھا "تم نے ناشتہ کیا ہے؟"

فیض نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "ہاں"

"کیا؟" یہ تھا میرا دوسرا سوال

"او ـــــ ایک بن[1]۔ ایک پیالی چائے۔" فیض نے جواب دیا۔

"بن" کا لفظ سنتے ہی میں جیسے بارود بن گئی۔ جیسے کسی نے بندوق کی لبلبی پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ میرے مزاج کی یہ کیفیت کیونکر ہوئی؟ اس کا جواب خود مجھے بھی کبھی نہ مل سکا، لیکن شاید اس وقت "بن" ایک علامت بن گیا تھا۔ ایک اشارہ۔ ان تمام ناانصافیوں، دکھ درد، ذلت، فریب اور دروغ گوئی کا جن کا میں گزشتہ کئی ماہ سے شکار تھی۔

میں غصے سے بے قرار ہو کر جیلر کی طرف پلٹی اور چیخ اٹھی۔ "تم نے میرے شوہر کو بن دیا۔ صرف بن" جیلر کا منہ کھلا۔ مگر میں نے اسے ایک لفظ کہنے کا موقع نہ دیا۔ میں پھر برس پڑی۔ "تم کیا جانو۔ انھوں نے اپنی زندگی میں کبھی بن نہیں کھایا۔ تم نے بن ہی تو کہا تھا؟ بن۔ بن"

بیچارہ غریب آدمی کچھ نہ بولا لیکن اپنی پرجوش خطابت کے بعد میں نے ایک عجیب سا سکون محسوس کیا۔ اب اطمینان جیسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ اس وحشت آمیز اور خشمناک ساعت کے ایک گھنٹہ بعد جب میں گھر گئی تو میں نے انڈوں، مکھن، ڈبل روٹی سے ایک ٹوکری بھری اور جیلر کے نام ایک رقعہ لکھ کر بھیج دیا کہ "ناشتہ اس قسم کی چیز کو کہا جاتا ہے۔"

بعد میں "بن" کے واقعہ پر ہم دونوں بے تحاشہ ہنسا کرتے تھے۔ ایسی ہنسی جو ختم ہونے ہی کو نہ آتی تھی۔ کیونکہ قلعہ لاہور کی کسی کال کوٹھری

---

[1] عام اردو تلفظ اب تو "بند" ہو گیا ہے۔ مترجم

میں مقید آدمی کے لئے "بن" کی اہمیت ہی کیا تھی؟ ـــــــ لیکن شاید اس وقت اس بن کی اہمیت اس طویل اور تھکا دینے والی تنہائی اور کھوکھلے پن سے وابستہ ہو گئی تھی۔ جو مستقبل کے دامن میں چھپا ہوا تھا۔

میری ساس نے مجھے بعد میں بتایا کہ میری پر جوش تقریر کو سن کر وہ یہ سمجھی تھیں کہ فیض کو شاید قلعہ میں اذیت پہنچائی گئی تھی جس پر میں بگڑ رہی تھی۔

فیض سے (مختلف جیلوں میں) ملنے کے لئے ہمیں اکثر ریل گاڑی میں سفر کرنا پڑتا تھا۔ ہم لوگ تیسرے یا درمیانے درجے میں سفر کرتے تھے۔ اسی لئے بچیوں کو ہم سفروں سے گفتگو بھی ذرا زیادہ ہی کرنی پڑتی تھی۔ (اونچے کلاسوں کے مسافر۔ توبہ۔ کیسے رابا کیسے کا یہ بناشد) سلیمہ سے جب کوئی پوچھتا کہ اس کے والد کون ہیں۔ اور کیا کرتے ہیں، تو وہ جھجک جاتی تھی۔ ایک ایسے موقع پر میں نے اسے یہ کہتے سنا (اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ کیونکہ اسے سفید جھوٹ سے نفرت تھی) "ابو حیدرآباد میں کام کرتے ہیں"۔ منیزہ اس کی طرف مڑی اور غصے میں اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔ "چل جھوٹی کہیں کی، وہ جیل میں ہیں"۔

کچھ دن ہوئے مجھے ایک کاپی ملی۔ جس میں جیل سے فیض کی واپسی کے بعد تک کے واقعات ہیں۔ اتنے دنوں کی غیر حاضری کے بعد ہمیں ایک بار پھر فیض کو اپنی گھریلو زندگی کا حصہ بنانا تھا۔ ہماری گھریلو زندگی جو پدری نظام کی جگہ ایک خالص اور مضبوط مادری نظام بن گئی تھی ہم اس کاپی کو "وحدت کا منصوبہ" (One Unit Plan) کہتے تھے۔ اور ہم میں سے ہر ایک کا نام پاکستان کے کسی سابق صوبہ کے نام پر تھا۔ اس وحدت میں ایک بھانجی بھی شامل تھا۔ ہمارا کام اور فریضہ یہ تھا کہ پرانی اور نئی عادتوں میں اور گھر کے نئے ارکان کے ساتھ اختلاف رائے کا تصفیہ کریں۔ گھریلو زندگی کو بہتر اور خوشگوار بنانے کے لئے۔

ہم ہر ہفتے ایک جلسہ کرتے تھے۔ شکایات پیش ہوتی تھیں۔ اور ان کے حل تدوین کئے جاتے تھے۔

اب میں اس کاپی پر نظر ڈالتی ہوں تو ایسی تحریریں اور یادداشتیں نظر آتی ہیں۔

"میں کچھ سہیلیوں کو چائے پر بلانا چاہتی ہوں؟ کیا اس کی گنجائش نکل سکتی ہے۔"

"ہمیں گھر پر سالگرہ کی پارٹی کرنی چاہیئے۔"

"ابو کو باتھ روم ڈانسنگ سیکھنے کی مشق ضرور کرنی چاہیئے۔"

"نفیر کو اپنی الماری کے خانے خود صاف کرنے چاہیئں۔"

"ابو کو یکدن میں تیس سے زیادہ سگریٹ نہیں پھونکنے چاہیئں۔ اگر وہ نہیں مانیں گے تو میں یہ شکایت کاپی پر پانچ مرتبہ لکھوں گی۔"

مگر یہ جب کوئی دعوت ہو تو بڑوں کے ساتھ بچوں کو بھی بلایا جائے"۔ کبھی کبھی "سرحدی علاقہ" کسطرح منیزہ یہاں پر وہ بنجاتی اور شور مچاتی۔ اسکی زندگی میں یہی مطالبت خاموشی کیساتھ نہیں آئی فیض "سندھ" تھے کیونکہ سلیمہ کہتی تھی "ابو تو سندھ سے ہی تعلق رکھتے ہیں"۔ اور میں "بلوچستان" تھی شاید اس لئے کہ کبھی کبھی میں دوسروں کیلئے زحمت اور تکلیف کا سبب بنجاتی۔ ہمارے مالی وسائل محدود تھے اور مطالبے بڑھتے ہی جاتے تھے۔ اور ہمیں بہت ہی اچھی چیزوں کی تحدید کرنی پڑتی تھی۔ (آسان اردو میں راشن بندی) اور یہ تحدید اسوقت تک لازم تھی جبتک فیض جیل سے لوٹ کر دوبارہ کام شروع نہ کر دیتے۔ لیکن جلد ہی ہمارا جمہوری نظام کامیاب ہو گیا۔ اور کچھ ہی عرصہ بعد ہمارا گھر اس نہج پر چل رہا تھا جیسے گھر کا سرپرست ـــ اس گھر سے باہر کبھی گیا ہی نہ تھا۔

(انگریزی سے)

سجاد ظہیر

شخص و عکس

محمود امرتسر میں دو ڈیڑھ سال سے تھے لیکن ان کی یا رشیدہ کی پنجاب کے ادیبوں سے اس وقت تک ملاقات نہیں ہوئی تھی وہ پڑھانے میں بڑی محنت کرتے تھے اور اسی کام میں مشغول رہتے۔ رشیدہ ڈاکٹری کرتیں یا کبھی کبھی افسانے لکھ لیتی۔ ہم نے مشورہ کیا کہ لاہور چلیں اور وہاں اپنے مشترک دوست میاں افتخار الدین اور دوستوں سے مدد لے کر ادیبوں سے ملیں۔

لیکن قبل اس کے کہ ہم لاہور جائیں ہمیں غیر متوقع طور پر غیبی مدد ملی۔ امرتسر میں میرے ایک دو دن کے قیام کے بعد ایک دن رشیدہ نے یکبارگی کہا۔ "محمود! وہ جو تمہارے کالج میں ایک نیا لڑکا آیا ہے نا، انگلش ڈیپارٹمنٹ میں، کیا نام ہے اسکا؟ اور پھر میری طرف مڑ کر "میرے خیال میں تم اس سے مل لو۔"

محمود بہت سنجیدگی سے انگریزی میں "بولے تمہارا مطلب ہے، ہمارے انگریزی کے نئے لیکچرر فیض احمد!"

"اللہ، ہر گھڑی کوئی بھی نام مجھے یاد نہیں رہتا، وہ بولتا تو ہے نہیں۔ تمہارے کالج میں وہی ایک لڑکا سمجھدار معلوم ہوتا ہے۔ بنے کو اس سے ملنا چاہیئے۔"

محمود صاحب نے اس بات کو اپنے کالج اور اس کا وائس پرنسپل ہونے کی حیثیت سے اپنے اوپر حملہ تصور کیا اور ذرا تیزی سے بولے "اور تمہیں کیا معلوم۔ میرے کالج میں کون سمجھدار ہے اور کون نہیں؟ تم کتنوں سے ملی ہو؟ اور جن سے تم ملی بھی ہو ان کے نام تک تو تمہیں یاد نہیں۔"

اب کیا تھا رشیدہ بالکل اپنے اصلی رنگ میں آگئیں اور چمک کر بولیں "سب الو بھرے ہیں تمہارے کالج میں جنہیں ان کے نام بتک نہیں آتا۔ پتہ نہیں کس دنیا میں رہتے ہیں۔ میں اسٹاف کی بات کرتی ہوں۔ لڑکوں کی نہیں۔ نام جاننے کی کیا ضرورت ہے۔ صورت سے ہی پتہ چل جاتا ہے۔"

——— اس پر ہم سب کو بے ساختہ ہنسی آگئی اور میں نے موقع غنیمت جان کر کہا "اچھا بھئی! یہ طے کرو کہ ان سمجھدار فیض احمد صاحب سے کب ملاقات ہوگی۔"

——— محمود صاحب نے جواب دیا۔

"میں نے تمہارے آنے سے پہلے ہی فیض سے ترقی پسند مصنفین کے بارے میں باتیں کر لی ہیں اور تمہارا بھی ان سے ذکر کر دیا ہے۔" پھر اپنی ڈائری دیکھ کر کہا "آج ساڑھے چار بجے چار پرنسپل آ رہے ہیں۔"

"دیکھا تم نے ان حضرت کی باتیں" رشیدہ نے مجھ سے فخر کے لہجے میں کہا "میں نے بھی تو آخر یہی کہا تھا کہ فیض کو تم سے ملانا چاہیے۔ یہ تو خواہ مخواہ گھنٹے بھر سے مجھ سے الجھے ہوئے ہیں۔" محمود مسکراتے رہے کچھ نہیں بولے۔ ذرا دیر بعد انہوں نے اعلان کیا۔

"میں اب کالج چلا۔ مہربانی کر کے چار کے لیے سینڈوچ وغیرہ بنوا لینا۔" پھر ڈائری دیکھ کر انہوں نے کہا۔ "اور کل چائے پی کر ہم موٹر سے لاہور کے لیے روانہ ہوں گے۔ فیض بھی ہمارے ساتھ ہوں گے۔ میں نے افتخار کو اطلاع کر دی ہے۔ ہم ان کے یہاں ہی ٹھہریں گے۔ فیض اپنے گھر ٹھہریں گے۔"

"اور کچھ طے ہوا ہو تو وہ بھی ابھی بتا دو۔ ذرا ڈائری کا اگلا صفحہ تو دیکھو، بریک فاسٹ اور لنچ کس کے یہاں کھانا پڑے گا؟" رشیدہ نے پوچھ ہی لیا۔

"یو آر جسٹ امپوسبل" محمود نے کہا اور ہنستے ہوئے چلے گئے۔

بارے تیسرے پہر جب "فیض احمد صاحب" سے ملاقات ہوئی تو جس کا خطرہ تھا وہی ہوا۔ یعنی فیض نہیں بولے۔ کسی نئے آدمی سے گفتگو شروع کرنے اور اسے جاری رکھنے کا مشکل فن مجھے کبھی نہیں آتا۔ اس دن مجھے معلوم ہوا کہ اس میدان میں مجھ سے بڑھے اناڑی پائے جاتے ہیں۔

فیض کی راز داری کا کمال یہ تھا کہ اس وقت تک محمود اور رشیدہ کو اس کا بالکل علم نہیں تھا کہ فیض شاعری بھی کرتے ہیں۔ ان کی نظر میں تو بس وہ ادب خاص طور پر انگریزی ادب سے دلچسپی رکھنے والے ایک ذہین نوجوان تھے۔ جن میں کچھ کچھ ترقی پسند رجحانات پائے جاتے تھے۔ محمود نے مجھ سے ان کے ذوق سلیم کی تعریف کی تھی جس کا پتہ انہیں اس طرح چلا تھا کہ وہ محمود کے یہاں سے اچھی اچھی کتابیں مانگ کر پڑھنے کے لیے لے جایا کرتے۔ اور انہیں بڑے شوق سے پڑھتے

ہم نے شاید انگلستان کے نئے شاعر اسٹیفن اسپینڈر اور آڈن کا تذکرہ کیا۔ جن کے شعر کے نئے مجموعے ان دنوں شائع ہوئے تھے اور جن کی شاعری میں انگریزی شاعری کے مروجہ ٹی ایس۔ ایلیٹ کے پھیلائے ہوئے تلخی اور نامرادی کے رجحانات سے الگ ہٹ کر انسانیت کے نئے اشتراکی مستقبل اور یورپی عوام کی نافسسٹ دشمن جدوجہد کی امید جھلکتی تھی۔ مجھے اس پر کافی تعجب ہوا کہ فیض ان شاعروں کا کلام پڑھ چکے تھے۔ ترقی پسند ادب کی تحریک کے بارے میں ہم نے اس وقت تک جو کیا تھا مختصراً بتایا اور ان سے پوچھا کہ پنجاب میں اس کے کیا امکانات ہیں۔ فیض نے اپنے بشرے سے کسی خاص گرمجوشی یا انہماک کے جذبے کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ بس ایک پشیمان سی مسکراہٹ کے ساتھ بڑی مشکل سے اتنا کہا۔

"لاہور چل کے دیکھتے ہیں۔ میرے خیال میں وہاں پر کچھ لوگ تو شاید ہم سے متفق ہوں گے۔" معلوم ہوتا تھا کہ تہیہ کر کے آئے ہیں کہ سنیں گے، مسکرائیں گے مگر بولیں گے نہیں۔ آخر کو رشیدہ جھلا پڑیں۔

"یہ بھی خوب کہی، کچھ لوگ شاید متفق ہوں گے۔ جناب ہمیں اس مینی فیسٹو پر بہت سے لوگوں کے دستخط لینے ہیں اور پھر لاہور میں ترقی پسند مصنفین کی انجمن بنانی ہے۔"

محمود اور میں رشیدہ کی اس حرکت پر گھبرا سے گئے۔ ابھی ہماری فیض سے بے تکلفی نہیں تھی، اور میری تو بالکل پہلی ملاقات تھی اور رشیدہ تھیں کہ اس ہمارے شرمیلے مہمان کی تقلیں کرنے لگیں اور اس پر فقرے چست کر رہی تھیں لیکن انہیں روکنے یا منع کرنے کی کسے ہمت تھی۔ پھر بھی فیض ٹس سے مس نہ ہوئے البتہ اب کی ذرا اور کھل کر مسکرائے اور بولے۔

"تو لاہور چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔"

ہم اپنے پروگرام کے مطابق اس کے دوسرے دن لاہور چل پڑے۔ اور چراغ جلے وہاں پہنچ گئے۔ فیض اپنے گھر چلے گئے اور ہم تینوں سیدھے کینال بنک میاں افتخار الدین کی کوٹھی پر گئے۔ وہاں میاں صاحب کے نوکروں نے ہمارا استقبال کیا اور بتایا کہ میاں صاحب اور بیگم صاحبہ کسی پارلمان پر گئے ہیں ہم جاڑے میں شام کے وقت ۳۰-۴۰ میل موٹر پر چل کر آئے تھے اس لئے کافی ٹھٹھرے ہوئے تھے اندر آتشدان میں بڑی اچھی آگ جل رہی تھی۔ چپ چاپ اسکے گرد جاکر بیٹھ گئے۔ نوکر جلدی سے ہمارے لئے چائے بنا کر لے آئے آگ کی گرمی اور چائے نے ہمارے موڈ پر اچھا اثر ڈالا۔ رشیدہ ایک نرم کشن پر منہ چھپا کر قالین پر لیٹ گئیں محمود کا ہاتھ آہستہ سے اپنے جیب میں گیا اور انہوں نے پائپ نکال کر پینا شروع کر دیا۔ لیکن وہ وقت ضائع کرنے کے قائل نہیں تھے ساتھ ہی ساتھ انہوں نے اپنی نوٹ بک برآمد کی اور میرے ساتھ دوسرے دن کا پروگرام طے کرنے لگے ان کے نوٹ بک میں ۲۰-۲۵ ناموں کی ایک لمبی فہرست تھی لاہور کے ادیبوں، شاعروں، ادب میں دلچسپی لینے والوں ادب کے مددگاروں، آرٹسٹوں، پروفیسروں کی فہرست۔ انہوں نے کہا میرے لئے ضروری ہے کہ ان سب سے فوراً ملوں اس انکشاف پر مجھے کافی تعجب ہوا اور میں نے ان سے پوچھا۔ "تم تو کہتے تھے کہ تم یہاں کے ادیبوں کو جانتے ہی نہیں پھر یہ اتنی بڑی فہرست کیسے بنالی؟" انہوں نے جواب دیا۔

"تمہارے آنے سے پہلے فیض اور میں اس معاملے کے متعلق کئی بار باتیں کر چکے ہیں۔ میں تو ان میں سے ایک ہی دو سے واقف ہوں۔ لیکن فیض اکثر کو ذاتی طور پر جانتے ہیں۔ یہ فہرست انہیں نے لکھوائی ہے۔"

—— مجھے محمود کی اس مستعدی سے بڑی خوشی ہوئی۔

—— "یار تم سے جو بات بھی پوچھتے ہیں تم یہی کہتے ہو کہ فیض نے اور میں نے پہلے ہی سے طے کر لیا ہے۔ میرے لئے تو تم نے کچھ چھوڑا ہی نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ میرے اتنے دور آنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی" میں نے ہنس کر کہا۔

"بھئی اصل بات یہ ہے کہ فیض کے ساتھ پنجاب میں پروگریسو رائٹرز موومنٹ آرگنائز کرنے کے بارے میں میں نے کئی بار تفصیل سے باتیں کی تھیں اور ہم خود لاہور آتے۔ اتنی جلدی تمہارے یہاں آنے کی تو ہمیں امید بھی نہیں تھی۔"

—— اس کے بعد چند دن فیض احمد فیض کی رہنمائی میں لاہور کے مختلف ادیبوں سے ان کے گھر جاکر ملنے میں گذرے لیکن افسوس ہے کہ اب ان میں سے مجھے صرف دو سے ملنا صاف طور پر یاد ہے۔ ایک صوفی غلام مصطفیٰ تبسم اور دوسرے اختر شیرانی مرحوم۔ فیض شاید صوفی صاحب کے شاگرد رہ چکے تھے اس لئے وہ انہیں بہت اچھی طرح جانتے تھے اور غالباً رشیدہ اور محمود بھی فیض کے توسل سے ان سے پہلے سے واقف تھے۔

—— اختر شیرانی کے یہاں بھی مجھے فیض لے گئے۔!

—— اختر شیرانی کو دیکھ کر میرے دل کو بڑا دکھ ہوا میں نے پریشان ہو کر فیض کی طرف دیکھا ان کے چہرے پر ہمدردی اور سکون کی ملی جلی کیفیت تھی۔ زبان سے کچھ بولے بغیر جیسے انہوں نے مجھ سے کہہ دیا کہ "ایک اختر شیرانی ہی نہیں، ہمارے زیادہ تر ادیب

شاعر، اہلِ فن انہیں روح فرسا حالات میں زندگی بسر کر رہے ہیں جبھی تو ہم اس اپنی تحریک کو شروع کر رہے ہیں۔ فیض نے اختر شیرانی سے میرا تعارف کرایا اور ان سے ملنے کا مقصد بتایا۔ میں نے مختصراً ترقی پسند ادب کی مجوزہ تحریک کے بارے میں ان سے کچھ باتیں کیں۔

—— دو تین دن کی دوا دوش کے بعد جس میں اب میاں افتخار الدین بھی ہمارے ساتھ پورے جوش و خروش سے شریک ہو گئے تھے ہم نے ان پندرہ بیس آدمیوں کو جنہیں ہم سمجھتے تھے کہ ترقی پسند مصنفین کی تحریک میں دلچسپی لیں گے ایک ساتھ مل کر گفتگو اور مشورے کے لیے مدعو کیا۔ یہ اجتماع افتخار ہی کے گھر پر ہوا۔ ان کے مکان کے سامنے کے خوبصورت لان پر چار بجے کے قریب ایک ایک دو دو کر کے لوگ جمع ہونا شروع ہوئے۔ رشیدہ، محمود، فیض، افتخار اور میں وہاں پہلے سے موجود تھے۔ افتخار میزبان ہونے کے ناتے چائے وغیرہ کے انتظام کے لیے اپنے نوکروں کو ادھر سے ادھر بھگا رہے تھے۔ ہماری گھبراہٹ بھی کچھ کم نہیں تھی۔ جس کا اظہار اس وقت ہماری غیر معمولی خاموشی سے ہو رہا تھا۔ فیض حسبِ دستور نہایت اطمینان سے سگریٹ پی رہے تھے ——————

—— ان کے اس اطمینان پر رشیدہ تو رشیدہ مجھے بھی جو اپنے کو کافی ٹھنڈے دل و دماغ کا انسان تصور کرتا ہوں کسی قدر غصہ سا آ رہا تھا لیکن ہم سب نے اپنے جذبات کو اس وقت دبائے رکھا۔

—— اب تجویز پیش کی گئی کہ لاہور میں انجمن کی تشکیل کی جائے۔ فیض نے تجویز پیش کی کہ صوفی تبسم کو اسی وقت عارضی طور پر انجمن کا سکریٹری چن لیا جائے۔ جب انجمن کے ممبر بن جائیں گے تو اس کے باقاعدہ عہدے داروں کا انتخاب ہوگا۔ یہ بات اتفاقِ رائے سے منظور ہوئی۔ صوفی صاحب نے پہلے انکار کیا لیکن بعد کو اصرار کرنے پر راضی ہو گئے۔ اس چھوٹے سے جلسے کے ختم ہوتے ہوتے سورج ڈوب چکا تھا۔ سردی بہت بڑھ گئی۔ لوگ جلدی جلدی رخصت ہونے لگے۔

ہم خوش اور مطمئن تھے۔ رشیدہ فیض کو چھیڑ رہی تھیں اب وہ حضرت بھی کسی قدر کھلے اور بولنے چالنے پر رضامند سے معلوم ہو رہے تھے۔

—— (ترقی پسند مصنفین کی پہلی کل ہند کانفرنس منعقدہ لکھنؤ) کانفرنس کا پہلا سیشن خاتمہ کے قریب رہا ہوگا۔ ساغر نظامی اتنا اں دیر دارد ہوئے۔ ساغر صاحب نے ہمیں بتایا کہ ان کو کانفرنس میں آنے میں دیر اس وجہ سے ہوئی کہ وہ صبح سے نیاز صاحب (نیاز فتحپوری) کے یہاں بیٹھے تھے اور نیاز صاحب اسکے منتظر تھے کہ کانفرنس کے منتظمین میں سے کوئی انکے لیے سواری لے کر انکے مکان پر پہنچے تب وہ تشریف لے چلیں۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کے بعد ساغر تو تانگے پر بیٹھ کر خود ہی کانفرنس تک آ گئے لیکن مولانا نیاز اس لیے تشریف نہیں لائے کہ کوئی انہیں لانے کے لیے نہیں گیا۔ وہ ہم سے روٹھ گئے تھے۔ ہمیں اپنی کوتاہی پر شرمندگی ہوئی اور اپنی محرومی کا رنج۔ لیکن ہم یہ سوچنے پر مجبور تھے کہ ہماری کانفرنس میں شریک ہونے والے دوستانہ ہاں پریم چند اور حسرت موہانی بالکل دوسری طرح سے ہماری کانفرنس میں آ کر شریک ہوئے تھے اور ان کے علاوہ بہت سے نوجوان ادیب ملک کے دور دراز علاقوں سے روپے کا خرچ قرض لے کر تیسرے یا ڈیوڑھے درجے میں سفر کر کے لکھنؤ تک پہنچے تھے اور تکلیف دہ جگہوں پر ٹھہرے تھے۔ پنجاب کے نمائندے فیض احمد فیض نے رشیدہ کو چپکے سے بتایا کہ انکے پاس بس لکھنؤ آنے جانے بھر کا کرایہ تو تھا لیکن اب سگریٹ یا تانگے کرایے تک کے لیے جیب میں ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔ یقینی ان لوگوں اور مولانا نیاز میں نمایاں فرق تھا۔

—— (ترقی پسند مصنفین پنجاب کی پہلی صوبائی کانفرنس منعقدہ امرتسر) ہم نے بہت کوشش کی کہ مقامی کالجوں یا سکولوں

میں نے دلی دو دن کانفرنس کرنے کیلئے ایک چھوٹا سا ہال دیسے لیکن کوئی بھی راضی نہیں ہوا۔ آخر کو ہم نے کسان کانفرنس والوں سے کہا وہ بڑی خوشی سے خالی وقت میں اپنا پنڈال دینے کیلئے راضی ہو گئے۔ عجیب ہے۔ پنجاب کے کسان اپنے عوامی مصنفین کی صورتیں تو دیکھ لیں اور مصنفین کے لیے بھی کسانوں کے سائے میں اپنی کاروائی کرنا مفید ہوگا۔ مجھے تعجب اس پر تھا کہ ایم اے او کالج والوں نے بھی ہال نہیں دیا۔ شاید اس کے پرنسپل تھے۔ اور فیض وہاں پڑھاتے تھے۔ فیض نے کہا "بس سمجھیے یہاں کے بعض حلقے ہماری انجمن کے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔"

اس کانفرنس کی روداد مجھے یاد نہیں ممکن ہے فیض کو یاد ہو۔ یا ان کے پاس کانفرنس کی تجاویز اور بحثوں کی رپورٹ محفوظ ہو۔

—— (ترقی پسند ونیا کے مخالفین سے ایک مناظرہ منعقدہ دہلی) دہلی میونسپل کارپوریشن کے بڑے ہال میں جلسہ ہونا قرار پایا۔ سر رضا علی مرحوم اس کی صدارت کیلئے بلائے گئے۔ ترقی پسند مصنفین کی تحریک پر حملہ کرنے کے لیے دلی کے دو نامور صاحب تھے۔ خواجہ محمد شفیع ناول اور افسانہ نگار اور شاعر —— دوسرے مولوی سعید احمد تھے —— مولوی صاحب ندوۃ المصنفین (دہلی) کے ایک رکن تھے اور اس ادارے کے ماہانہ علمی اور دینی رسالے "برہان" کے اڈیٹر تھے ترقی پسندوں کی طرف سے اس حملے کا دفاع کرنے کے لیے فیض احمد فیض اور میں چنے گئے تھے —— جلسے کی کاروائی صدر سر رضا علی کی تقریر ہی سے شروع ہوئی —— اسکے بعد خواجہ محمد شفیع صاحب نے تقریر کی۔ خواجہ صاحب کی تقریر نہیں تھی ترقی پسندوں پر چوٹوں کا ایک سلسلہ تھا۔ انہوں نے آزاد شاعری کا مذاق اڑایا۔ زبان کی غلطیاں بتائیں۔ ان کے تصورات کو مخرب اخلاق اور پست اور غیر شاعرانہ ثابت کرنے کی کوشش کی۔ فحاشی کا الزام بھی ہم پر لگایا گیا۔ ہم ان اعتراضات کے سننے کے عادی ہو چکے تھے گو دلی کی ٹھیٹھ زبان اور اتنے پیارے لہجے میں ہم نے اسکے پہلے گالیاں نہیں سنی تھیں۔ مجمع پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ اور میراجی راشد اور مخدوم جالندھری کی چند نظموں کے ٹکڑے جب پڑھے گئے۔ تو اس پر کافی قہقہہ لگا۔

خواجہ صاحب کے بعد فیض بولے۔ وہ حضرت معلوم ہوتا تھا کہ فوجی دفتر سے لکر سیدھے جلسے میں آگئے ہیں انہیں کپڑے بدلنے کا بھی موقع نہیں ملا تھا۔ اور لفٹننٹ کرنل کی وردی زیب تن تھی۔ ان کا لباس ہی دلی والوں کو غیر ادبی معلوم ہوا ہوگا۔ مجھے کسی قدر گھبراہٹ ہونے لگی۔ فیض سے میں نے کہا۔

"کپڑے تو بدل لیے ہوتے۔" انہوں نے آہستہ سے جواب دیا۔

"سب ٹھیک ہے کوئی گھبراہٹ کی بات نہیں۔"

فیض تقریر شروع کرتے ہی مسئلے کی تہہ پر چلے گئے۔ اور خواجہ صاحب کے اعتراضات کا براہ راست جواب دینے کی انہوں نے زحمت نہیں کی۔ انہوں نے عالمانہ انداز میں اور بڑی متانت سے یہ ثابت کیا کہ ترقی پسندی ادب میں کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ سماج میں تبدیلی اور ارتقا کے ساتھ ساتھ ادب میں بھی تبدیلی اور ترقی ہوتی ہے۔ اسے روکنے کی کوشش کرنا فضول ہے ترقی پسند ادب کی تحریک ناگزیر ہے۔ البتہ اسکو بہتر بنانے کی کوشش کرتے رہنا چاہیے۔ فیض کی تقریر میں جوش اور زور طنز یا حملے کا انداز بالکل نہیں تھا اس میں روانی، متانت اور درس دینے کی سی کیفیت تھی۔ مجمع نے توجہ اور خاموشی سے ان کی تقریر سنی۔ نہ قہقہے لگے اور نہ تالیاں بجیں۔

—— اس میں کوئی شک نہیں کہ لاہور کے رسالہ "ادب لطیف" نے ترقی پسند ادب کی خاص طور پر اور اردو ادب کی عام طور پر بہت اہم خدمت انجام دی ہے ۱۹۳۹ء اور سنہ ۱۹۴۰ء میں غالباً فیض امرتسر سے لاہور آ گئے تھے اور ایک کالج میں انگریزی کے لکچرر ہونے کے ساتھ ساتھ اس رسالے کے بھی اڈیٹر ہو گئے۔ ان کے اداریوں اور تنقیدی مضامین نے ترقی پسند نقطۂ نظر کو واضح کیا۔ میرے لئے یہ ممکن نہیں کہ پنجاب میں ترقی پسند ادب کی تحریک کے اس دور کے واقعات کما حقہ بیان کروں یہ کام فیض یا کرشن چندر کے کرنے کا ہے

—— ۱۹۳۹ء میں جب عالمگیر جنگ کا آغاز ہوا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ ملک کی عوامی تحریکوں پر حملہ، تو سامراجی تباہ کاری اور جبر و تشدد کی اس فضا کو ہمارے دو شاعروں مخدوم اور فیض نے اپنی دو بڑی حسین اور پر اثر نظموں میں پیش کیا تھا مخدوم نے کہا تھا۔

رات کے ہاتھوں میں اک کاسۂ دریوزہ گری
یہ چمکتے ہوئے تارے یہ دمکتا ہوا چاند
بھیک کے نور میں مانگے کے اجالے میں مگن
یہی ملبوس عروسی ہے یہی ان کا کفن

لیکن اس نے آخر میں یہ بشارت دی تھی۔

رات کے ماتھے پہ آزردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشید درخشاں کے نکلنے تک ہے

اور فیض نے وطن کی آزادی کے مجاہدوں سے کہا تھا کہ جبر و تشدد کے اس دور کو صرف شجاعانہ مقاومت سے ہی ختم کیا جا سکتا ہے۔

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول زباں اب تک تیری ہے

فیض نے اپنی نظم "سیاسی لیڈر کے نام" میں ملک کے ان لیڈروں کی سیاست پر نکتہ چینی کی جو اس عظیم کارزار کی صحیح نوعیت کو نہیں سمجھتے تھے۔ فیض نے ان سے کہا۔

تجھ کو منظور نہیں غلبۂ ظلمت لیکن　　　　تجھ کو منظور ہے یہ ہاتھ قلم ہو جائیں
اور مشرق کی کمیں گہ میں دھڑکتا ہوا دن　　　　رات کی آہنی میت کے تلے دب جائے

—— اس دار و گیر کے زمانے میں بھی فرقہ وارانہ فسادات اور ان کے آثار کے موضوع پر جو ادبی تخلیق ہوئی اس میں سے بھی بہترین ترقی پسند مصنفین کی ہی نگارش ہے اور اگر پائندگی مائل ہے تو انہیں کی بعض نظموں اور انہیں کے لکھے ہوئے چند افسانوں اور مضامین کو۔ فیض کی وہ نظم جو اس مصرعے سے شروع ہوتی ہے۔

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر

کبھی بھلائی جا سکتی ہے؟ اس میں جذبات کی شدت کے ساتھ جن حقائق کی حسین و نازک مصوری کی گئی ہے وہ بہار اگست ۴۷ء کے بعد سے شروع ہونے والے پورے دور کی ماہیت کا فنکارانہ تعین کرتے ہیں۔　　　　(روشنائی سے)

شاہد احمد دہلوی

فیض صاحب

کوئی تیس سال پہلے کا ذکر ہے کہ دلّی میں سجاد ظہیر ایک دفعہ آئے تو ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی معرفت مجھ سے ملنے کے خواہشمند ہوئے۔ کتاب "انگارے" شائع ہو کر ضبط ہو چکی تھی۔ یہ ساجھے کی ایک ہانڈی تھی جو چار صاحبوں نے چوراہے پر پھوڑی تھی۔ اس کے ایک ساجھی سجاد ظہیر بھی تھے۔ اس لیے میں ان کے نام سے خوب واقف تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے اپنے گھر چائے پر بلایا اور سجاد ظہیر سے ملوایا۔ بہت ہوشمند آدمی نکلے۔ لندن میں کئی سال رہ کر واپس آئے تھے۔ نہایت سنجیدہ اور بردبار۔ ہنستے بھی تھے تو خندۂ دنداں نما سے آگے نہیں بڑھتے تھے۔ انھوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین دلّی میں قائم کرنے کی تجویز پیش کی۔ اور اس انجمن کے مقاصد بیان کیے۔ ڈاکٹر صاحب نے از راہِ مہربانی مجھے اس کام کے لیے سب سے زیادہ موزوں قرار دیا۔ شاید اس وجہ سے کہ اس وقت ساقی کا سورج چڑھتا جا رہا تھا۔ میں نے کہا "اگر ترقی پسندی اسی کا نام ہے کہ ادب کو زندگی کا آئینہ دار بنایا جائے تو ٹھیک ہے۔ انجمن قائم ہو جائے گی۔" اور انجمن انصار ناصری اور فضل حق قریشی کی مدد سے قائم ہو گئی۔ دلّی کے تقریباً سبھی بڑے ادیب، اردو اور ہندی کے، اس کے جلسوں میں شریک ہونے لگے۔ اور مضامین پڑھے گئے۔ جلسے باری باری مختلف گھروں میں ہوتے تھے۔ کبھی میرے ہاں، کبھی ناصری صاحب کے ہاں، کبھی خیری صاحب کے ہاں۔ اور کبھی جینندر کمار کے ہاں۔ ایک ایسا ہی جلسہ چاندنی چوک میں نیل کے کٹڑے کے بیچوں بیچ ڈاکٹر شوکت انصاری کے دواخانے میں ہوا۔ یہ ڈاکٹر صاحب مشہور کانگریسی لیڈر ڈاکٹر انصاری کے بہت قریبی عزیز تھے۔ اور انھی کی طرح گاڑھے کے کپڑے پہنا کرتے تھے۔ حالانکہ برسوں پیرس میں رہ کر آئے تھے۔ اس جلسے میں ایک طرف ایک ایسے صاحب بھی بیٹھے ہوئے تھے جن سے ہم میں سے کوئی واقف نہیں تھا۔ ہماری انجمن کے دو ایک جلسوں کے بعد ہر جلسے میں دو ایک نئے آدمی آنے لگے تھے۔ پہلے تو ہم انھیں ادیب یا شاعر سمجھتے رہے مگر بعد میں معلوم ہوا کہ یہ سی۔ آئی۔ ڈی والے ہوتے ہیں۔ اگلی دفعہ میں نے انھیں جلسے میں سے نکال دیا۔ انھوں نے محکمے کے افسر عبدالرحمٰن صاحب سے شکایت کی۔ وہ ایک ہی گرگ باراں دیدہ تھے۔ بولے: "آپ کو روس سے کتنی رقم ملتی ہے؟" میں نے کہا "کچھ بھی نہیں۔" بولے "تو پھر آپ ان کمیونسٹوں میں کیسے پھنس گئے؟" میں نے کہا "روس یا کمیونسٹوں سے اس انجمن کا کوئی تعلق نہیں ہے۔" بولے "آپ شریف آدمی ہیں اور آپ کا ریکارڈ بالکل صاف ہے۔ بہتر ہے کہ آپ اس سے الگ ہو جائیں یا کوئی اور انجمن بنا لیں۔ ورنہ آپ مصیبت میں پھنس جائیں گے۔" میں نے گھر آ کر سجاد ظہیر کو پوری روداد لکھی اور پوچھا کہ اگر کل کلاں کو میں قید ہو گیا تو آپ میری کیا مدد کر سکیں گے؟ جواب آیا "ہم کسی قسم کی مدد نہیں کر سکیں گے۔" ان کے اس خلوص سے میں اتنا خوش ہوا کہ میں نے دلّی کی انجمن فوراً بند کر دی اور اس کی بجائے "انجمن تہذیب ادب" قائم

کردی جس نے اپنی پیش رو انجمن سے کہیں بڑھ چڑھ کر کام کیا۔ اور اس کے جلسوں میں سی۔آئی۔ڈی کے لوگ بھی نہیں آتے تھے۔

ہاں تو ڈاکٹر شوکت انصاری کے ہاں جلسے میں جو ایک اجنبی شخص نظر آیا تو میں نے ڈاکٹر صاحب کے قریب جا کر پوچھا "یہ کون ہے؟"
ڈاکٹر صاحب کسی قدر حیران اور شرمندہ ہو کر بولے: "آپ انھیں نہیں جانتے؟ یہ فیض احمد فیض ہیں۔ اسلامیہ کالج امرتسر میں پروفیسر ہیں۔" میں پھر بھی نہیں سمجھا اور اپنی لاعلمی چھپانے کے لئے خاموش ہو رہا۔ جلسہ شروع ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے صدارت کی۔ مضامین پڑھے گئے۔ ان پر گفتگو ہوئی۔ نظمیں پڑھی گئیں۔ واہ واہ ہوئی۔ آخر میں جناب صدر نے فیض صاحب سے کلام سنانے کی درخواست کی۔ انھوں نے ازراہ انکساری نہیں نکر کی مگر جب انھوں نے اپنی ایک نظم سنائی تو ہم سب کے کان کھڑے ہوئے اور دیدے پھٹے کہ یہ بہترین شاعر اب تک کہاں چھپا رہا؟ پھر تو چاروں طرف سے ایک اور، ایک اور، ایک اور کی آوازیں آنے لگیں۔ ہم سب ان کا کلام سنکر بہت خوش ہوئے اور وقت رخصت میں نے فیض صاحب سے ہاتھ ملایا اور ان کی تعریف کی۔

یہ فیض صاحب سے میری پہلی ملاقات تھی۔

اس کے بعد، بلکہ تین چار سال بعد لاہور میں مشہور ادیب ایم۔ اسلم صاحب کے مکان پر ڈاکٹر تاثیر مرحوم کے ساتھ فیض صاحب سے دوسری ملاقات ہوئی۔ وہ کم گو آدمی ہیں۔ اور مجھے بھی زیادہ بولنے کی عادت نہیں ہے۔ لہٰذا اسلام دعا اور مزاج پرسی سے آگے بات نہ چلی۔ ان کے چلے جانے کے بعد اسلم صاحب نے بتایا کہ ڈاکٹر تاثیر کی میم صاحب کے ساتھ جوان کی ایک بہن آئی تھیں۔ ان سے فیض صاحب کی شادی ہو گئی ہے۔ لہٰذا تاثیر اور فیض اب ہم زلف ہو گئے ہیں۔

جب دوسری عالمگیر جنگ نے زور پکڑا تو عجب کایا پلٹ ہوئی کہ ہمارے بعض ادیب جو فرنگی حکومت کے سخت مخالف تھے فوجی دفتروں میں اعلیٰ عہدے حاصل کرنے کے لئے ایک دم سے چولا بدل کر حکومت کے وفادار ہو گئے۔ سب سے پہلے مجید ملک فوجی وردی پہنے نئی دلی میں دکھائی دیئے۔ مجھے تو جھٹکا سا لگا مگر وہاں آنکھ پر میل تک نہیں تھا۔ ان کے بعد ڈاکٹر تاثیر ایک فوجی دفتر کے ڈپٹی ڈائرکٹر بن کر آگئے انھیں دیکھ کر اور بھی زیادہ افسوس ہوا کیونکہ یہ تو کھدر کا کرتا اور کھدر کا پاجامہ پہنا کرتے تھے۔ ان کے بعد فیض صاحب دکھائی دیئے کپتان کی وردی پہنے ہوئے۔ حد یہ کہ کچھ دنوں بعد چراغ حسن حسرت بھی وردی پہنے ایک فوجی اخبار کی ایڈیٹری کرنے لگے۔ ایک صاحب تھے عارف۔ آل انڈیا ریڈیو میں انھوں نے بھی ریڈیو چھوڑ کر وردی پہن لی۔ ایک اور صاحب تھے بدر۔ وہ بھی وردی میں دکھائی دینے لگے حد یہ کہ ن۔م۔راشد بھی ریڈیو چھوڑ کر وردی پوش ہو گئے۔ وردی میں سب سے بے ڈھنگے حسرت مرحوم لگتے تھے۔ ڈول جسم اور فٹ بھر آگے چلنے والی توند کی وجہ سے لگتے تھے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے وردی کو نہیں بلکہ وردی نے انھیں پہن لیا ہے۔ اور سب سے زیادہ افسوس فیض صاحب کو دیکھ کر ہوتا تھا کہ یہ شریف آدمی کیوں اس چکر میں پھنس گیا؟۔ اس وقت روایت یہ مشہور تھی کہ تاثیر نے فیض کو پھانسا ہے۔ تاکہ وہ فخر سے یہ کہہ سکے کہ دیکھو میں نے خط غلامی نہیں لکھا مرحوم سے یہ کچھ بعید بھی نہیں تھا کہ:

ہم تو ڈوبے ہیں صنم، تم کو بھی لے ڈوبیں گے

کہہ کر دوسروں کو بھی اپنے ساتھ لے ڈوبیں۔

جنگ کے زمانے میں دلّی میں ادیبوں کی اچھی خاصی کھیپ آگئی تھی۔ احمد شاہ بخاری (پطرس) ریڈیو میں پہلے سے موجود تھے انھوں نے اپنے گرد ادیبوں کا خاصہ بڑا حلقہ قائم کر لیا تھا۔ ن۔م۔راشد، شوکت تھانوی، انصار ناصری، عشرت رحمانی، غلام عباس، محمود نظامی، بہزاد لکھنوی تو جنگ سے پہلے ہی ریڈیو میں آ چکے تھے۔ جنگ کے زمانے میں چراغ حسن حسرت، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، منٹو،

میراجی، اوپیندر ناتھ اشک، راجندر سنگھ بیدی، حامد علی خاں اور کرشن چندر بھی ریڈیو میں آ گئے۔ فوجی دفتروں میں مجید ملک، تاثیر، فیض اور بیدار آ گئے تھے۔ سونگ پبلی سٹی میں حفیظ جالندھری تھے اور پولی ٹکنک میں حمید احمد خاں، پطرس کے اشارے پر ایک اونچے درجے کا ادبی حلقہ نئی دلی میں بنایا گیا۔ اور اس کے جلسے کبھی پطرس کی کوٹھی پر اور کبھی تاثیر کے بنگلے پر ہونے لگے۔ مجھے بھی خبر نہیں کیوں یاد فرما لیا جاتا تھا۔ پطرس اگر واقعی دل سے کسی کی عزت کرتے تھے۔ تو وہ پروفیسر مرزا محمد سعید تھے جن سے انھوں نے ایک زمانے میں پڑھا تھا۔ ان کی بے اندازہ علمیت کے پطرس قائل تھے اور اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ حلقے کے پہلے جلسے میں مرزا صاحب بھی شریک ہوئے تھے۔ محمود نظامی نے "اردو شاعری میں عورت" کے عنوان سے مضمون پڑھا۔ اس پر گفتگو ہوئی اور کوئی بات ایسی نکلی کہ اس پر پطرس نے مرزا صاحب کو متوجہ کیا۔ مرزا صاحب دو چار لفظ بول کر خاموش ہو گئے۔ پطرس نے فیض صاحب کو اشارہ کیا اور خبر نہیں انھوں نے دانستہ یا نادانستہ آغاز کلام اس فقرے سے کیا کہ "یہ تو مرزا صاحب آپ جانتے ہی ہیں کہ یونان کی تہذیب روما کی تہذیب سے قدیم تر ہے۔" اتنا سننا تھا کہ مرزا صاحب کو جلال آ گیا۔ چمک کر بولے: "جی ہاں، میں جانتا ہوں، اور اس سے بھی زیادہ جانتا ہوں۔" اور پھر جو ان کے علم کے سمندر میں طوفان آیا ہے۔ تو انھوں نے آدھ گھنٹے میں قدیم تاریخ کو کھنگال کر رکھ دیا بچاری صاحب زیر لب مسکرا مسکرا کر فیض صاحب کی طرف دیکھتے رہے۔ جن کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔ پطرس نے چپکے سے میز پر چائے کا سامان لگوایا اور مرزا صاحب کا لکچر ختم ہوتے ہی اعلان کر دیا کہ "آئیے حضرات، چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔" فیض صاحب کی طرح ہم سب کو بھی مرزا صاحب کی تقریر میں مزہ آ گیا۔ اور ہمیں اندازہ ہو گیا کہ پطرس جو عزت مرزا صاحب کی کرتے ہیں واقعی مرزا صاحب اس کے مستحق ہیں۔ اس ایک جلسے کے بعد مرزا صاحب پھر کسی جلسے میں شریک نہیں ہوئے۔ ان جلسوں میں فیض صاحب کا کلام اکثر سننے میں آ جاتا تھا۔ ایک دفعہ دلی کے ٹاؤن ہال میں ایک بہت بڑا مشاعرہ ہوا تھا۔ جس کی صدارت پطرس نے کی تھی۔ اس میں فیض صاحب نے "برفاب سے جسم" والی نظم سنائی تھی۔ ایک صاحب جو میرے برابر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھ سے پوچھنے لگے کہ "برف سے جسم تو ہوتے تھے یہ برفاب سے جسم کیا ہوتے ہیں؟" میں نے کہا "جو برف جیسے نہیں بلکہ برف کے پانی جیسے ہوں۔" بولے "لاحول ولا قوۃ۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی؟" میں نے انھیں اور جلانے کے لئے کہا۔ "بات تو ہوئی۔ جو لطف برفاب میں ہے وہ برف میں کہاں، ستر سال پہلے غالب بھی تو کہہ گئے ہیں 'خس خانہ و برفاب کہاں سے لاؤں؟'" "کوئی تو بات ہے جو انھوں نے برف نہیں باندھا۔ برفاب باندھ گئے۔" ناراض ہو کر منہ پھیر لیا۔

جنگ کا یہی زمانہ تھا کہ کرشن چندر ایک شام کو کتب خانۂ علم و ادب اردو بازار میں آ گئے۔ یہاں مغرب اور عشاء کے درمیان ادیبوں اور شاعروں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ جامع مسجد میں جب عشاء کی اذانیں ہونے لگیں۔ تو ہم سب اپنے اپنے گھر جانے کیلئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ کرشن چندر مجھے باتوں میں لگا کر ایڈورڈ پارک لے گئے۔ اور بہت پس و پیش کے بعد بولے کہ "میں ایک ناول لکھنا چاہتا ہوں۔ آپ اسے شائع کریں گے؟" میں نے کہا "ضرور شائع کروں گا۔" بولے۔ "تو کیا یہ ممکن ہے کہ آپ مجھے اس کی قیمت ایک ہزار پیشگی دے دیں؟" میں نے کہا "روپیہ کب چاہیئے؟" بولے۔ "جب آپ دے سکیں۔ میں کشمیر جا کر ایک مہینے میں ناول لکھ لاؤں گا۔" اور واقعی میں جب ایک مہینے بعد وہ کشمیر سے واپس آئے تو انھوں نے میرے گھر آ کر "شکست" کا مسودہ میرے حوالے کر دیا۔ ڈھائی مہینے بعد یہ ناول شائع ہو گیا اور اس کی دھوم مچ گئی۔ ڈاکٹر تاثیر نے ایک فرضی نام سے اس پر تنقید لکھی، اس کا اثر ہوا کہ ناول کی شہرت اور بھی زیادہ ہو گئی۔ اب جسے دیکھیئے وہ کہہ رہا ہے۔ کہ میں بھی ناول لکھوں گا۔ اشک نے کہا "میں نے بھی ناول لکھنا شروع

کر دیا ہے۔ مگر میں پندرہ سو لوں گا۔" میں نے کہا: "اگر شکست سے بہتر لکھو گے تو پندرہ سو ہی دوں گا۔" مگر وہ ناول نہیں لکھا گیا۔ عصمت چغتائی نے "ٹیڑھی لکیر" لکھنا شروع کر دیا۔ منٹو نے ایک ناول دھر گھسیٹا اور خود ہی اسے ناپسند بھی کر دیا۔ سنا کہ ڈاکٹر تاثیر ناول لکھنے کو کہہ رہے ہیں۔ ان سے مل کر دریافت کیا تو کہنے لگے کہ "ارادہ تو ہے۔ مگر آپ فیض سے لکھوائیے۔" فیض صاحب سے ان کے فوجی دفتر میں ملا۔ بڑی خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ بولے۔ "چھ سو پیشگی دیجیے۔" میں نے چیک وہیں کے وہیں ان کے حوالے کیا۔ حسرت صاحب سے ملاقات ہوئی تو بولے "مولانا، یہ آپ نے کیا ناول شائع کیا ہے؟" میں نے کہا "آپ لکھیے نا" بولے "دو سو روپے پیشگی دے جائیے۔" ان کی خدمت میں بھی چیک پیش کر دیا۔ دو تین مہینے بعد فیض صاحب نے روپیہ واپس کر دیا کہ ناول نہیں لکھا گیا۔ حسرت صاحب نے نہ ناول دیا اور نہ روپے واپس کیے۔ بلکہ ان روپوں کا کبھی بھول کر بھی ذکر نہیں کیا۔ اور میں نے بھی انہیں اس خوف سے یاد دلانا مناسب نہیں سمجھا کہ کہیں وہ سچ مچ ناول لکھ ہی نہ دیں۔ فیض صاحب کی تنہا مثال ہے کہ انھوں نے روپیہ واپس کر دیا۔ ورنہ کم و بیش پندرہ ہزار روپیہ انہی پیشگیوں میں ڈوبا۔ اور پاکستان آنے کے بعد تو میں نے پبلشنگ کے کام سے توبہ ہی کر لی

رہا کھٹکا نہ چوری کا، دعا دیتا ہوں رہزن کو

فوجی خدمت سے سبکدوش ہونے کے بعد فیض صاحب "امروز" کے ایڈیٹر ہو گئے۔ چراغ حسن حسرت بھی اسی دفتر میں آ گئے تھے۔ ان حضرات نے اس اخبار کو چار چاند لگا دیے۔ عام اخباروں سے اس کی نمود مختلف تھی۔ خبروں کے علاوہ اس کا ادبی حصہ بھی بڑا جاندار ہوتا تھا۔ یہ اخبار بڑھتا ہی چلا گیا یہاں تک کہ سب اردو کے اخباروں سے بازی لے گیا۔ انگریزی اخبار "پاکستان ٹائمز" کے ایڈیٹر بھی فیض صاحب ہی تھے۔ اردو کے مضامین تو فیض صاحب کے لکھے ہوئے شاذ ہی دیکھنے میں آئے۔ البتہ انگریزی کے مضامین کئی دفعہ دیکھنے میں آئے۔ بہت سلجھے ہوئے اور پُرمغز ہوتے تھے۔ افسوس ہے کہ فیض صاحب نے نثر لکھنے کی طرف کبھی سنجیدگی سے غور نہیں کیا۔ اور اپنی تمام اعلیٰ قابلیت کے باوجود اب تک کوئی مستقل تصنیف پیش نہیں کر سکے۔ اور مجھے انجیل مقدس کا وہ قصہ یاد آتا ہے کہ ایک آقا جب سفر پر جانے لگا تو اپنے تین غلاموں کو ایک ایک سونے کا سکہ دے گیا۔ ایک غلام نے اسے خرچ کر ڈالا۔ دوسرے نے اسے زمین میں گاڑ دیا۔ اور تیسرے نے اسے کاروبار میں لگا دیا۔ آقا نے سفر سے واپس آ کر پوچھا کہ تم نے سکے کا کیا کیا؟ پہلے غلام نے کہا۔ "میں نے اسے خرچ کر دیا۔" آقا اس پر بہت بگڑا۔ اور اسے سزا دی۔ دوسرے نے کہا "میں نے اسے زمین میں گاڑ دیا تھا۔ یہ لیجیے یہ موجود ہے۔" آقا اس سے بھی ناخوش ہوا۔ اور بولا کہ "تم نے اسے ضائع نہیں کیا مگر تم نے اس سے فائدہ بھی نہیں اٹھایا۔ یہ تم نے بہت برا کیا۔" تیسرے نے سکہ بھی پیش کر دیا اور وہ منافع بھی جو کاروبار میں اسے لگانے سے حاصل ہوا تھا۔ آقا اس سے بہت خوش ہوا۔ اس کی ستائش کی اور اسے انعام بھی دیا۔ کاش فیض صاحب بھی اپنے ٹیلنٹ کو بروئے کار لاتے اور دوسروں کو اس سے مستفیض ہونے کا موقع دیتے۔ سنا ہے کہ ان کا ایک چھوٹا سا مجموعہ چند مضامین کا کبھی شائع ہوا تھا۔ اب تو وہ کہیں دیکھنے میں نہیں آتا۔ اور اکثر لوگوں کو اس کا نام بھی یاد نہیں رہا۔ انگریزی اخبار پاکستان ٹائمز کی ادارت بھی فیض صاحب ہی کو سونپی گئی تھی۔ اس کے بعد ایک بڑا شاندار ہفتہ وار پرچہ "لیل و نہار" بھی امروز اور پاکستان ٹائمز کے ادارے سے شائع ہونا شروع ہوا تھا۔ اس کے ایڈیٹر بھی فیض صاحب ہی مقرر کیے گئے تھے مگر ان کا نام شاید برائے نام ہی دے دیا گیا تھا۔ "لیل و نہار" میں نہ تو فیض صاحب بالالتزام کچھ لکھتے تھے۔ اور نہ انھیں اس پرچے کے دفتر میں کبھی کام کرتے دیکھا۔ ایک اور معروف ادیب و صحافی تھے۔ سبط حسن۔ یہی اس پرچے کا سارا کام کرتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد سبط حسن کو علیحدہ کر دیا گیا۔ شاید اس وجہ سے کہ وہ کمیونسٹ مشہور ہو گئے تھے۔ "لیل و نہار" جس تیزی سے بڑھا تھا۔ ان کی علیحدگی کے بعد اسی تیزی سے گرنا شروع ہو گیا۔ پروفیسر صوفی تبسم نے اسے بہت سنبھالنے کی کوشش کی۔ لیکن صوفی صاحب کا عہد "لیل و نہار" کا سنبھالا ہی ثابت ہوا۔ اور ایک لائق فخر ہفتہ وار جریدہ موت کی آغوش میں جا سویا۔

کمیونسٹ تو فیض صاحب بھی مشہور ہو گئے تھے۔ مگر ان کی تخریبی سرگرمیاں کبھی دیکھنے میں نہیں آئیں۔ وہ تو ایک خاموش اور مرنجاں مرنج

قسم کے آدمی تھے اور ہیں۔ مگر کمیونسٹ ہونے کا کلنک کا ٹیکا اگر ایک دفعہ کسی کے لگ جائے تو شاید پھر ساری عمر چھٹائے نہیں چھوٹتا۔ غالباً اسی داغ بدنامی کی وجہ سے فیض صاحب "پاکستان ٹائمز" سے، احمد ندیم قاسمی "امروز" سے اور سبط حسن "لیل و نہار" سے علیحدہ کر دیئے گئے۔

جب راولپنڈی کانسپیریسی کیس میں بعض بڑے فوجی افسروں کے ساتھ فیض صاحب بھی گرفتار کر لئے گئے تو بیری طرح بے شمار لوگوں کو تعجب ہوا کہ یہ شریف آدمی اس ترغے میں کیسے آ گیا؟ یہ کوئی بہت اونچے درجے کی سیاست ہے۔ جسے معمولی عقل کے لوگ نہیں سمجھ سکتے۔ لہٰذا ہم نے ع

رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند

کہہ کر صبر کر لیا۔ غالباً تین ساڑھے تین سال فیض صاحب قید و بند میں رہے۔ اس زمانہ میں ان کی بیگم نے مردانہ وار ابتر حالات کا مقابلہ کیا۔ ملازمت کی۔ اور اپنی بچیوں کے معیارِ زندگی میں فرق نہیں آنے دیا۔ ان کی تعلیم بھی جاری رہی۔ اور ان کے اجلے خرچ بھی چلتے رہے۔ میں نے بیگم فیض کو اخبار کے دفتر میں پسینے میں شرابور نہایت انہماک سے کام کرتے دیکھا ہے۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں ان کے قریب جا کر انہیں اس حوصلے کی داد دیتا۔ دور سے انہیں دیکھا اور بھاری دل اور بھاری قدموں کے ساتھ چلا آیا۔ بارے یہ ابتلا کا دور بھی ختم ہو گیا اور فیض صاحب بری ہو کر اپنے گھر آ گئے۔ ان کے جیل میں رہنے کا ایک فائدہ فیض صاحب کو ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔ ہمیں یہ ہوا کہ ان کی منظومات کے دو مجموعے "زنداں نامہ" اور "دستِ صبا" ہمیں مل گئے۔

بے روزگاری کے زمانے میں فیض صاحب نے ایک فلم کے مکالمے وغیرہ لکھے تھے۔ اور اس پر بین الاقوامی انعام ملا تھا۔ مگر فلم سازی اور فلم بازی سے کسی بھلے آدمی کو کیا سروکار؟ فیض صاحب دراصل تعلیمی سلسلے کے آدمی تھے۔ مگر کسی یونیورسٹی نے کوئی پیشکش نہیں کی۔ شاید اہلِ اختیار ان کے کلنک کے ٹیکے سے ڈرتے تھے۔ بارے جب لاہور میں آرٹس کاؤنسل کی شاخ قائم ہوئی تو فیض صاحب اس کے سکریٹری مقرر ہو گئے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد انہیں لینن پرائز دینے کا اعلان روس نے کیا۔ یہ تقریباً وہی زمانہ تھا جب پاسٹرناک کو اس کی کتاب "ڈاکٹر ژواگو" پر نوبل پرائز دیئے جانے کا اعلان ہوا تھا۔ اور حکومتِ روس نے اس بوڑھے مصنف کی ادھ کتے سے بدتر کر دی تھی۔ اب اسی کمیونزم کے منبع سے فیض صاحب کو انعام دینے کا اعلان کیا گیا تھا! سب نے دم سادھ لیا کہ اللہ خیر کرے۔ دیکھئے اب کیا گل کھلتا ہے؟ مگر حکومتِ پاکستان نے اس غیر ملکی اعزاز پر روس کی طرح تنگ دلی کا مظاہرہ نہیں کیا اور شکر ہے کہ ہمارے اندیشے غلط ثابت ہوئے جب فیض صاحب انعام لینے کے لئے روس جانے لگے تو کراچی ٹھہرتے ہوئے گئے۔ پاکستان رائٹرز گلڈ نے آرٹس کونسل میں ان کے اعزاز میں ایک بہت بڑا جلسہ کیا۔ اس جلسے کی صدارت کا فخر مجھے حاصل ہوا۔ منجملہ اور باتوں کے میں نے اپنی صدارتی تقریر میں اپنی حکومت سے شکوہ کیا کہ فیض صاحب کو اپنی حکومت سے اب تک کوئی انعام یا اعزاز نہیں ملا۔ اور سات سمندر پار کے ایک بہت بڑے ملک نے انہیں امن کے اتنے بڑے انعام کا مستحق سمجھا۔ شاید ہمارے ملک میں زندہ ادیبوں کی قدردانی کا دستور نہیں ہے جبھی تو پاکستان کا سب سے ہر دلعزیز شاعر محرومِ التفات ہے۔

جب فیض صاحب روس روانہ ہو گئے تو یہاں افواہ اڑنی شروع ہوئی کہ واپس آتے ہی وہ گرفتار ہو جائیں گے۔ مگر ایسا کوئی جابرانہ اقدام نہیں کیا گیا۔ اور فیض صاحب شاد و بامراد واپس آ گئے۔

روس سے واپسی کے کچھ عرصہ بعد سنا کہ فیض صاحب لندن چلے گئے ہیں اور پاکستانی کلچر پر مواد جمع کر کے کتاب لکھیں گے۔ خاصے

(باقی صفحہ ۱۷۸ پر)

ڈاکٹر ملک راج آنند
ترجمہ
سید رضا کاظمی

فیض — ایک پیاری عظیم شخصیت

جھکی ہوئی کشادہ پیشانی، ہلکی نرم آنکھیں۔ ہونٹوں پر گریزاں تبسم اور اس کا سراپا کمرے کی خواب آلود فضا میں ڈوبا ہوا جس پر نیم وا پردہ سے چھن کر صبح صادق کی دھندلی روشنی پڑ رہی تھی۔

یوں میں نے فیض کو پہلی بار دیکھا۔

رات کی گاڑی سے میں الہ آباد سے امرتسر پہنچا تھا۔ اور اسٹیشن سے سیدھا ڈاکٹر تاثیر کے مکان گیا۔ جہاں فیض بھی ٹھہرے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر تاثیر اور ان کی بیگم ابھی محو خواب تھے اس لئے ان کا نوکر مجھے اس کمرہ میں لے گیا تھا جس میں کنوارا شاعر بطور مہمان قیام پذیر تھا۔ چونکہ میں نے تمام رات ایک کمبل میں گزاری تھی اس لئے میں سردی میں ٹھٹھر سا گیا تھا۔ جب میں نے فیض سے اپنی پریشانی کا تذکرہ کیا تو وہ فوراً اپنے بستر سے اٹھ کھڑے ہوئے اور مجھ سے کہا کہ میں ان کے بستر میں سو رہوں۔ یہ کہہ کر وہ میرے لئے چائے کا انتظام کرنے چلے گئے۔ میں نے ان کے مشورہ پر عمل کیا اور بستر پر لیٹ گیا۔ لیکن ہندوستان کے ایک عظیم شاعر سے ملاقات کی مسرت میرے لئے کچھ اتنی ہیجان انگیز تھی، کہ میں کوشش کے باوجود سو نہ سکا۔

جب چائے آئی اور فیض نے صبح کا پہلا سگریٹ جلایا تو ہم دونوں ایک دلچسپ بحث میں پوری طرح الجھ چکے تھے۔ میرا استدلال تھا کہ جلد یا بدیر ہندوستانی زبانوں کی شاعری اپنے روایتی بندھن توڑ کر آزاد ہو جائے گی تاکہ صحیح جذبات کی ادائیگی اور ترجمانی ممکن ہو سکے۔ فیض کو میری رائے سے اختلاف تھا۔ ان کا خیال تھا کہ روایت سے انحراف نہ مناسب ہے نہ ممکن۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے اس سلسلہ میں ان کی توجہ فرانسیسی شاعر آرتھر ریمبا کی جانب مبذول کرائی تھی جو ایسے ملک کا شاعر تھا۔ جہاں روایت پسندی اور پرانی قدروں کا رجحان بے حد قوی ہے لیکن اس کی آزاد شاعری اس ملک کی شاعری میں انقلاب لے آئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے فیض کو ٹی ایس ایلیٹ کی مشہور نظم "الفریڈ پروفراک کا نغمۂ محبت" کا پہلا بند بھی پڑھ کر سنایا تھا۔

تو آؤ ہم دونوں چلیں

اُن نیم سنسان گلیوں میں
جو جانی پہچانی ہیں
جن میں بڑا دہ والے ریستوران ہیں اور موچنے اور تی کی دوکانیں ہیں
اس کمرہ میں جس میں عورتیں آتی جاتی ہیں
اور مائیکل انجیلو کا تذکرہ کرتی رہتی ہیں۔

جواباً فیض نے میرے بے تحاشہ بڑھتے ہوئے سرکے بالوں کو دیکھا اور صرف ایک لفظ کہا 'بوہیمین'
یہ حقیقت ہے کہ فیض کا طنز بالکل بجا اور درست تھا۔ میں تقریباً دس گیارہ سال سے امرتسر سے جلا وطن تھا۔ اس دوران میں لندن، پیرس، ایتھنز، ویانا اور برلن میں گھومتا رہا تھا۔ اس آوارہ گردی کے باوجود میں نے کچھ نہ کچھ ضرور حاصل کیا تھا۔ مضطرب متلاشی اور خوف زدہ ہونے کے باوجود میں نے ہمت نہ ہاری تھی۔ میرے دل میں دنیا کا درد تھا۔ لیکن زندگی اور اس کی نیرنگیوں میں میری دلچسپی برقرار تھی۔ اس ردعمل کے تحت جو میرے چچیرے بھائی کی جوان مرگی سے میرے دل میں اس وقت پیدا ہوا تھا، جب میں خود کمسن تھا یعنی اس وقت میری عمر صرف گیارہ سال تھی۔ میری ابتدائی انگریزی تصانیف کا کسی نے نوٹس نہ لیا تھا۔ میرے ننھے جسم میں آتشیں روح بسی ہوئی تھی۔ بلاشبہ میں بوہیمین تھا۔!

لیکن میں اپنے جذبات، بے حد حساس فیض تک کیونکر پہنچاتا؟ فیض جو خاموش طبع اور سنجیدہ تھا جس نے اس وقت تک پنجاب سے باہر کا سفر بھی نہ کیا تھا۔ میں اسے کیوں کر بتاتا کہ اس کے اردگرد ایک وسیع دنیا پھیلی ہوئی ہے۔ ایسی دنیا جسے ابھی پوری طرح دریافت نہیں کیا گیا ہے۔ اس حقیقت نے کہ دنیا کے وسیع حصہ میں غم و آلام بکھرے ہوئے ہیں۔ جو ستم رسیدہ ہے اور تباہی کے دہانے پر کھڑی ہے مجھے اظہار سے روک دیا اور میں فیض سے یورپ کی ترقی کی بات نہ کر سکا۔ اس کے باوجود مجھے اس بات کا احساس تھا کہ فیض جیسے شعرا کے لئے غزل یا نظم سے والہانہ عشق و وابستگی ایک قسم کی سہل انگاری ہے۔ چوں کہ میں مغربی شعرا کا ذکر چھیڑنا چاہتا تھا۔ اس لئے میں نے اقبال کا نام لیا جس کے کلام نے فیض کو کافی متاثر کیا تھا۔ اور جس نے مجھے بھی فلسفہ کی جانب راغب کیا تھا اور میں سچائی کی تلاش میں یورپ چلا گیا تھا۔ فیض نے کہا کہ عمر کے ساتھ ساتھ اقبال میں بھی روایت پسندی کا رجحان بڑھتا گیا۔ میں نے کہا کہ میں اقبال کی شاعری کے اس دور کی جانب اشارہ کر رہا ہوں جب وہ شاندار ماضی کو دوبارہ واپس لانے کی کوشش میں اسلام کی جانب متوجہ نہ ہوئے تھے۔ میں نے فیض کو بتایا کہ میں اس اقبال کو جو بانگِ درا کا متلاشی ہے ترجیح دیتا ہوں اس مسافر شاعر پر جو اپنی منزل پر پہنچ چکا ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ میں بہرحال گوئٹے کو اقبال پر ترجیح دیتا ہوں۔

(۲)

ہماری بحث جاری رہی۔ الفاظ کے اس پردہ کے باوجود جو میں نے خود اپنی ندامت چھپانے کے لئے کھڑا کر دیا تھا، میں نے محسوس کیا کہ فیض روایتی شاعری سے والہانہ لگاؤ رکھتا ہے۔ اور کچھ عرصہ بعد کشمیر میں جہاں ہم دونوں نے پورا موسم گرما ساتھ گذارا مجھے ان احساسات و جذبات کا اندازہ ہونے لگا۔ جن پر فیض کی شاعری کی اساس تھی۔

میں ان تمام مشاعروں میں موجود تھا جہاں فیض نے اپنی غزلیں پڑھیں۔ اور مجھے احساس ہوا تھا کہ اپنی محبت کے اظہار میں فیض کا شعور بہت پختہ تھا۔ اس کے الفاظ کہیں زیادہ پُرخلوص محسوس ہوئے ان گھسے پٹے الفاظ اور جملوں کے مقابلہ میں جو اردو کی روایتی شاعری میں آج تک سنائی دیتے رہے ہیں۔ جذبات کی ترجمانی میں سچائی اور خلوص کی ایک ایسی کھنک تھی، جو

سننے والوں کے دلوں کو چھو لیتی تھی جب کہ الفاظ کی ظاہری اور صوتی خوبیاں واہ واہ اور تعریفوں کے ڈونگرے سمیٹ لیتی تھیں۔

میں نے فیض کی شاعری کو محض اس لئے پڑھنا شروع کیا تاکہ میں مشاعروں کے جھوٹے اور مصنوعی ماحول سے اسے الگ کرکے اس کی صحیح پذیرائی کرسکوں۔ اور اس طرح میں فیض کے دل کے نقشہ پر سفر کرتا ہوا اس کی تنہائیوں کی حدود میں داخل ہو سکا وہ انتہائی نرم انداز میں اُن تمام عورتوں کو اشارے کر رہا تھا جو رخصت سے پہلے ہی ان تاریکیوں میں گم ہوئی جا رہی تھیں، جہاں ہندستان کی خواتین مرنے کے لئے گم ہو جاتی ہیں۔ اور نہ جانے کیوں مجھے گمان ہوا کہ انہوں نے فیض کو کھا لیا ہے ان لمحات میں جب وہ دبے پاؤں تاریکی کی جانب بڑھ رہی تھیں۔ اس کے بعد فیض کی تنہائیوں کا ساتھی کوئی خیال ہوتا۔ یا کوئی پرندہ یا پھول۔

غزل نے اپنے حسن سے فیض کو مسحور کر رکھا تھا۔ اس دور کی شاعری پر غالب اور اس کے پیش رووں کی شاعری کا اثر قائم تھا۔ اور فیض بھی اس ہمہ گیر اثر سے باہر نہ نکل سکا تھا۔ وہ بھی قیدی تھا، کام محبت کے جذبات کی ترجمانی کا!

(۳)

یورپ واپس جانے سے پہلے میں نے محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ فیض اپنے چمن زار شاعری میں نئے نئے نورانی بیج بونے لگا ہے۔ سیاسی حالات کے تحت پہنچنے والے صدموں نے گویا اس کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ اب اس کی شاعری مقامی حدود سے باہر نکل رہی تھی۔ گو کہ تشبیہیں اور استعارے وہی پرانے تھے لیکن اب فیض نے انہیں ایک وسیع سمندر میں اچھال دیا تھا۔ شاعر کے ہونٹوں کا تبسم راتوں پر چھا گیا تھا لیکن اس کا چہرہ تپ رہا تھا۔ سرخی بکھری ہوئی تھی انسانیت کے سامنے آئینہ نکھرا ابھر آئی تھی۔ اس مقام پر تنہا کھڑے ہو کر وہ کبھی ستاروں کو دیکھتا کبھی زمین کو۔ اور اس طرح حقیقت اور عمل کے درمیانی فاصلوں کو ناپنے کی کوشش کرتا۔ اب یہ حقیقت واضح ہو چکی تھی کہ فیض تمام بندشوں سے آزاد ہو کر اپنے دور کی جدوجہد میں شامل ہو گیا ہے۔

مجھے معلوم ہوا کہ اس نے مسز کرسٹوبل ٹیلر کی چھوٹی بہن الیس سے شادی کرلی ہے۔ میں فیض کی اس انتہائی حساس جوان خاتون سے لندن سے واقف تھا۔ اور مجھے یہ سوچ کر بڑی مسرت ہوئی کہ اب فیض ان مقامی جذبات سے آزاد ہو گیا ہے جو اسے غیروں سے قریب تر ہونے کے تجربوں میں مانع تھے۔

میری یہ توقعات بھی صحیح تھیں کہ اب حسین الیس، فیض کو مغرب کے حسن سے آشنا کردے گی اور دونوں خود کو بے تکلفی کی ایسی سطح پر پاکر جو عورت اور مرد کے حقیقی تعلق سے پیدا ہوتی ہے ہمیشہ مسکراتے رہیں گے۔

(۴)

جب میں سات سال بعد جو کہ دوسری جنگِ عظیم کا خونریز زمانہ تھا، یورپ سے واپس آیا تو میں نے دیکھا کہ فیض بالکل آزاد ہو گیا ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ کن واقعات یا حادثات نے اسے اس کی تنہائیوں کے گھیرے سے اس طرح باہر نکال پھینکا کہ اب اس کی جوانی عظمت کی راہ پر چل پڑی تھی۔ اس میں پہلے جیسی جھجک نہ تھی۔ اس کے برعکس میں نے ڈاکٹر تاثیر کو ہمیشہ مصلحت پسند اور غیر متوازن پایا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ ان لوگوں کا جو جھوٹے الفاظ اور نمود و نمائش کے ذریعہ اپنی عظمت برقرار رکھنا چاہتے ہیں نام و نشان تک باقی نہیں رہتا اس لئے کہ دیوتا انسانوں کے بہت قریب ہیں اور ان پر کڑی نظر رکھتے ہیں۔

مابعد جنگ فیض کا کلام اس حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے کہ ہر شے تصورات کے دائرے میں فتح کی جا سکتی ہے۔ یہاں تک

کہ ہم حیرت و استعجاب کے عالم میں پکار اُٹھتے ہیں : "درست ہے! میرا بھی یہی خیال ہے" یا "ہم نے بھی یہی محسوس کیا تھا"۔ اور اس قسم کی شاعری کی سچائی اور اس کے خلوص کا اندازہ اس بات سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ہماری زندگیوں اور اس کے بدلتے ہوئے رجحانات سے کس قدر مطابقت رکھتے ہیں۔

اس کے بعد ۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہو گیا اور ہندوستان پاکستان آزاد ہو گئے۔ آزادی کے فوراً بعد انسانیت سوز اور شرمناک فسادات کی آگ پھیل گئی جن سے فیض کی روح بھی لرز کر رہ گئی اور اس نے ایسے نوحے سنائے جن میں زخم خوردہ انسانیت کا ماتم تھا کیوں کہ انسانی اقدار اور عالمگیر اخوت پر فیض کے خیالات کسی سے ڈھکے چھپے نہیں تھے۔ انسانیت کی تحقیر و تذلیل پر وہ بھی غمگین و آبدیدہ تھا۔

اس کی شاعری اب اس شعلے کے مانند تھی جو غم و الم کی ٹھنڈی راکھ سے بھڑک اٹھتا ہے۔ درخود جلتا ہوا پڑھنے والے کے دل میں ان کے جذبات کا خیال کئے بغیر در آتا ہے۔ مشترک درد و الم کا احساس دو بھائیوں کو بھی متحد کر دیتا ہے۔ بالکل دیوار اگرچہ گھر کے دو حصوں کو تقسیم کر دیا تھا لیکن اگر کوئی اپنا مقدر خود پسند کرنے کی جرأت کر سکے اور غم و الم کو جوانمردی سے سہار بھی سکے تو لین دین کا یہ غیر منقسم تجربہ ضرور کامیاب رہے گا۔ اور اس طرح ایک دل دوسرے کا آئینہ بن جائے گا۔

(۵)

پچھلے دس سال میں فیض سے میری ملاقات زیادہ تر بین الاقوامی اجتماعات میں ہوئی، ماسکو، برلن، بمبئی، ماسکو اور ہوانا میں ہوئی ہے۔ ایسے اجتماعوں میں ذاتی دوستی کا توازن برقرار رکھنا ذرا دشوار ہوتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہر بار جب ہم ملے تو ہم نے ان بڑی بڑی کانفرنسوں کو بے تکلف دوستی کی اس فضا میں تبدیل کر دیا جو ہماری پہلی ملاقات میں اس چھوٹے سے کمرے میں قائم ہوئی تھی۔ اور اس طرح ہم نے ایک دوسرے کو صرف الفاظ سے چھوا ...... ان الفاظ سے جو ہماری بربادی کی لمحہ یادوں کے ساتھ ساتھ اب بھی کبھی کبھی ہمارے لب پر آجاتے ہیں اور جو اس آگاہی کے ساتھ آتے ہیں کہ یہ دنیا بڑی بے رحم ہے لیکن ہمارے جذبات و احساسات اتنے گریزاں اور تغیر پسند ہیں کہ انھیں صرف آخری قرار نہیں دیا جا سکتا۔

جام ہمیشہ ہمارے ہاتھوں میں ہوتے ہیں جو ہمیں اپنے دور کی کثیف و آلودہ گھٹی ہوئی فضا سے اوپر اٹھا کر مستقبل کے پراسرار دھندلکے میں لے جاتے ہیں اور ہم امید کرنے لگتے ہیں کہ ہم پھر ملیں گے اور ستاروں کو چھو لیں گے۔

فیض صاحب

(صفحہ ۱۴۷ سے آگے)

طویل عرصے تک وہ لندن میں رہے۔ اور یہاں واپس آ کر بھی انھیں خاصی مدت ہو گئی مگر وہ کتاب اب تک شائع نہیں ہوئی۔ شاید ان کی شاعرانہ سہل انگاری مانع ہے۔

سال ڈیڑھ سال پہلے سنا تھا کہ فیض صاحب کراچی یونیورسٹی میں انگریزی کے صدر شعبہ بنائے جا رہے ہیں۔ اس خبر سے خوشی ہوئی تھی۔ کہ یہ جگہ ان کے لئے موزوں بھی تھی۔ اور خود بھی یونیورسٹی کے لئے بھی لائق فخر۔ مگر پروفیسر احمد علی کی طرح فیض صاحب کو بھی ارباب بست و کشاد نے مناسب نہیں سمجھا۔ مگر جو جوہر قابل ہوتے ہیں انھیں قدرداں مل ہی جاتے ہیں۔ اب وہ ایک بہت بڑے شاید عبداللہ ہارون کالج کراچی کے پرنسپل ہیں۔ ہر چیز اپنی اصل کی طرف رجوع ہوتی ہے۔ فیض صاحب تعلیمی سلسلے کے آدمی تھے۔ پھر تعلیمی سلسلے ہی میں آ گئے۔ حق بہ حق دار رسید،

ڈاکٹر عبادت بریلوی

چند یادیں چند تاثرات

یادش بخیر لکھنؤ یونیورسٹی بھی کسی زمانے میں خوب جگہ تھی۔ ادب کے چرچے اور سیاست کے ہنگامے شاید ہی کسی یونیورسٹی نے اس طرح دیکھے ہوں جیسے کہ لکھنؤ یونیورسٹی نے دیکھے ہیں۔ میں جس زمانے میں وہاں پڑھتا تھا اس زمانے میں تو ادب کے یہ چرچے اور سیاست کے یہ ہنگامے اپنے شباب پر تھے۔ بڑی جاندار اور صحت مند فضا تھی۔ گوشے گوشے سے زندگی کے طوفان امڈتے تھے۔ دلوں میں نئی امنگیں انگڑائیاں لیتی تھیں اور نئے جنوں کے لئے نئے ویرانوں کی تلاش کا خیال ہر طرف برسات کے بادلوں بلکہ ساون کی گھٹاؤں کی طرح چھایا ہوا نظر آتا تھا۔

سن ۴۰ء کے آس پاس کا زمانہ ہے۔ کہ اس زمانے میں نئے ادب اور ترقی پسند ادب کی تحریکیں شروع ہو چکی تھیں اور اپنے عنفوانِ شباب کی منزلیں طے کر رہی تھیں۔ ہر طرف جدید ادب کا چرچا تھا۔ ادبی محفلوں اور مقامی اخباروں میں نئے ادب اور ترقی پسند ادب پر گرما گرم بحثیں ہوتی تھیں۔ یونیورسٹی میں جدید ادب کے کئی علمبردار موجود تھے ڈاکٹر علیم، احمد علی، سید احتشام حسین، علی سردار جعفری اور علی جواد زیدی وغیرہ کی موجودگی سے وہاں جدید ادب کا اچھا خاصا ماحول پیدا ہو گیا تھا۔ نئے رسالے آتے تھے اور ان میں نئے لکھنے والوں کی جو تخلیقات شائع ہوتی تھیں۔ ان کو نہ صرف شوق و اشتیاق سے پڑھا جاتا تھا بلکہ ان کی جانچ اور پرکھ بھی ہوتی تھی ــــ ایک ایک نظم پر اور ایک ایک کہانی پر ہفتوں اور مہینوں بحثوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

جدید شاعروں میں فیض، راشد اور میراجی اس زمانے میں سب سے زیادہ نمایاں تھے۔ ان کی نظمیں اس زمانے کے رسالوں میں بڑے اہتمام سے شائع ہوتی تھیں اور جدید شاعری کے پرستار انہیں بڑے شوق سے پڑھتے تھے اور بلاشبہ ان نظموں میں انہیں ایک نئے رنگ و آہنگ کا احساس ہوتا تھا۔

مجھے فیض کی شاعری سے اسی زمانے میں آشنا ہونے کا موقع ملا۔ اسی زمانے میں ان کی کچھ ہلکی پھلکی رومانی نظمیں لاہور کے بعض ادبی رسالوں میں شائع ہوئیں۔ بعض ترقی پسند دوستوں پر ان نظموں کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ بلکہ ان میں انقلاب کی گھن گرج کے فقدان سے وہ کچھ مایوس سے ہوئے، اور انھوں نے یہ فیصلہ صادر کر دیا کہ ان نظموں میں جدت ضرور ہے لیکن ان میں فرار کا احساس ہوتا ہے اس لئے ان کو اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ لیکن مجھ پر ان نظموں کا گہرا اثر ہوا۔ میں نے انہیں دلچسپی سے پڑھا، تنہائی

میں گنگنایا، احباب سے ان کی خوبیوں پر گفتگو کی۔ ترقی پسند مخالفین کی رائے کو ان کی جذباتیت پر محمول کیا۔ اور ادبی محفلوں میں اس موضوع پر خاصے تنقیدی ہنگامے کیے۔

فیض کی ان رومانی نظموں کو ابھی میں مزے لے لے کر پڑھ رہا تھا اور ان میں سے بیشتر مجھے ازبر ہو چکی تھیں کہ ان کی نظمیں "مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ" "چند روز اور میری جان فقط چند ہی روز" اور "رقیب سے" شائع ہوئیں۔ ان نظموں میں زندگی کا جو نیا شعور اور اس شعور کے ابلاغ میں جو نیا رنگ و آہنگ تھا اس نے بہت ہی لطف دیا۔ اور اب وہ جذباتی قسم کے ترقی پسند بھی فیض کے قائل ہو گئے۔ جو اس سے قبل ان کی رومانی نظموں کے خلاف تھے۔ اب انہیں فیض کی نظموں میں رومان و حقیقت کا سنگم نظر آیا اور وہ بھی ان کو اعلیٰ درجے کا شاعر ماننے اور ان کی شاعری کو سراہنے پر مجبور ہوئے۔

ابھی ان نظموں کو رسالوں میں شائع ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ ان کی کتاب "نقش فریادی" چھپ کر آ گئی۔ اور اس مختصر سی کتاب نے ادبی حلقوں میں ایک دھوم مچا دی۔ میں نے بھی اس کا ایک نسخہ خریدا اور اس میں جو نظمیں اور غزلیں شامل تھیں ان کو بار بار پڑھا۔ یہاں تک کہ تقریباً تمام نظمیں مجھے زبانی یاد ہو گئیں۔ ان نظموں میں رومانیت اور حقیقت کی جو دھوپ چھاؤں تھی اس نے کچھ اس طرح محسوس کرنے پر مجبور کیا۔ جیسے ان میں ہماری ہی باتیں پیش کی گئی ہیں۔ دراصل ان نظموں کی سب سے اہم خصوصیت ہی یہ تھی کہ اس زمانے کے نوجوان کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کی پوری طرح عکاسی کرتی تھیں۔ وہ نوجوان جو رومان و حقیقت کے سنگم پر کھڑا تھا۔ جس کو اپنی روایت سے رومانیت اور جذبات پسندی ملی تھی۔ لیکن جس کو نئی زندگی کے احساس و شعور نے حقیقت پسندی کی دولت سے بھی مالا مال کیا تھا۔ اسی لیے ہر نوجوان کو "نقش فریادی" کی نظموں میں ایک طرح کا آفاقی آہنگ نظر آتا تھا اور اس میں اپنے ہی جذبات و احساسات کی تھرتھراہٹ محسوس ہوتی تھی۔ آج چوبیس پچیس سال گزر جانے کے بعد جب مجھے "نقش فریادی" کی اشاعت کا وہ دور یاد آتا ہے تو یہ مصرعے میرے ذہن کی پہنائیوں میں ایک دفعہ پھر گونجنے لگتے ہیں اور میں انہیں گنگنانے کے لیے مجبور ہو جاتا ہوں۔ ؎

اے کہ تو رنگ و بو کا طوفاں ہے
اے کہ تو جلوہ گر بہار میں ہے
زندگی تیرے اختیار میں ہے
پھول لاکھوں برس نہیں رہتے
دو گھڑی اور ہے بہار شباب
آ کہ کچھ دل کی سن سنائیں ہم
آ محبت کے گیت گائیں ہم

سو رہی ہے گھنے درختوں پر ۔۔۔ چاندنی کی تھکی ہوئی آواز
کہکشاں نیم وا نگاہوں سے ۔۔۔ کہہ رہی ہے حدیث شوق نیاز
ساز دل کے خموش تاروں سے

چھین رہا ہے خمار کیفیت آگیں   آرزو، خواب، تیرا روئے حسین

نہ نجوم کہیں چاندنی کے دامن میں   ہجوم شوق سے اک دل ہے بیقرار ابھی

پھر کوئی آیا دل زار نہیں کوئی نہیں
راہرو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا

راہرو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہگزار

ان مصرعوں میں عنفوان شباب کے مخصوص جذبات کا جو ارتعاش ہے وہ آج بھی اسی طرح اثر کرتا ہے۔ جیسے آج سے برسوں پہلے کیا کرتا تھا آج بھی ان کو پڑھ اور گنگنا کر یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے آنکھوں کے سامنے حد نظر تک مسحور کر دینے والی چاندنی چھٹکی ہوئی ہے اور زندگی نے اس چاندنی میں اپنے آپ کو کچھ اس طرح غرق کر دیا ہے کہ دور دور تک اس کو کچھ اور نظر ہی نہیں آتا ——— زندگی کے یہ لمحے بھی کتنے حسین ہوتے ہیں، اس میں شبہ نہیں کہ یہ ہمیشہ باقی نہیں رہتے۔ وقت کا دھارا انہیں بہا کر دجانے کہاں لے جاتا ہے۔ لیکن یادوں کا روپ اختیار کر کے وہ پھر بھی زندگی کے ساتھ رہتے ہیں اور کسی حال میں بھی انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔

ابھی نقش فریادی کو شائع ہوئے کوئی سال بھر ہی ہوا تھا۔ کہ فیض ایک مشاعرے میں شرکت کے لئے لکھنؤ آئے اور اس طرح انہیں دیکھنے اور پھر ان سے ملنے کا مجھے موقع ملا۔

یہ تو مجھے یاد نہیں کہ یہ مشاعرہ کن لوگوں نے کیا تھا۔ لیکن اتنا یاد ہے کہ اس میں پرانے شعراء کے علاوہ نئے اور جدت پسند شاعروں کو بھی مدعو کیا گیا تھا اور یہ خبر سن کر کہ فیض بھی اس میں شریک ہو رہے ہیں میں بھی اس میں گیا تھا۔ لکھنؤ کے گنگا پرشاد ورما میموریل ہال میں مشاعرے کی یہ محفل ترتیب دی گئی تھی گلابی جاڑوں کے دن تھے۔ بڑی ہی خوشگوار خنکی تھی رات کو آٹھ بجے کے قریب مشاعرہ شروع ہوا۔ مولانا حسرت موہانی، حضرت جگر مرادآبادی، مجاز، جان نثار اختر، جذبی اور فیض اس محفل میں موجود تھے مشاعرہ شروع ہوا مختلف شعراء اپنا کلام سناتے رہے۔ جب صدر نے فیض سے کلام سنانے کی درخواست کی تو ایک صاحب سیاہ شیروانی اور سفید پاجامے میں ملبوس ایک طرف سے اٹھ کر اسٹیج پر آئے اور انہوں نے صدر کی اجازت سے اپنا کلام پڑھنا شروع کیا اس زمانے میں ترنم سے پڑھنے کا بڑا زور تھا۔ جگر صاحب اپنے دلآویز ترنم سے مشاعروں کی فضا میں ایک انقلابی کیفیت پیدا کر دی تھی ان کے علاوہ اس وقت کے نظم گو شعراء تک ترنم سے پڑھتے تھے۔ حفیظ، ساغر، روش، احسان دانش سب نے اپنے ترنم سے مشاعروں کی فضا کو رنگین اور پر کار بنا رکھا تھا۔ لیکن بعض نوجوان شعراء تحت اللفظ بھی پڑھتے تھے فیض نے بھی اس مشاعرے میں اپنا کلام تحت اللفظ پڑھا۔ لیکن سامعین ان کے معنی خیز کلام اور پڑھنے کے مخصوص، معصومانہ انداز سے

بے حد متاثر ہوئے۔ ایسی داد ملی کہ سماں بندھ گیا۔ فیض کا کلام تو اس زمانے میں خاصا مشہور تھا۔ آج ان کی زبان سے ان کے کلام کو سن کر سبھی بہت محظوظ ہوئے۔ سچی ایمان کی بات ہے کہ ان کے کلام اور پڑھنے کے انداز دونوں نے بہت لطف دیا۔

مشاعرے کے بعد وہ چند روز لکھنؤ میں اور ٹھہرے اور ان دنوں میں مجھے ان کو ذرا قریب سے دیکھنے کا موقع بھی ملا ملاقات تو اس کو نہیں کہا جا سکتا۔ اس لیے کہ میں بغیر کسی تعارف کے خود کسی سے ملنے میں بہت کمزور واقع ہوا ہوں۔ بڑی مشکل سے کھلتا ہوں۔ اس وقت بھی یہی صورت حال پیش آئی۔ اب یہ بھی یاد نہیں رہا کہ اس وقت فیض سے کہاں اور کس کے مکان پر ملاقاتیں ہوئیں بہر حال اتنا یاد ہے کہ ہم چند طالب علم اپنے چند شاعر قسم کے احباب کے ساتھ فیض سے ملنے کے لیے گئے تھے اور ان سے کئی ملاقاتیں بھی ہوئی تھیں۔ یہ بھی یاد ہے کہ فیض بولتے بہت کم تھے۔ میرے نوجوان ساتھیوں میں بعض بڑے تیز اور چرب زبان لوگ تھے۔ انھوں نے فیض سے ہر پہلو سے بات کرنے کی کوشش کی۔ خدا جانے کتنے سوال پوچھ ڈالے لیکن جواب ہوں، ہاں کے سوا کچھ بھی نہ ملا۔ خاصی دیر تک باتیں کرنے کے بعد صرف اتنا معلوم ہوا کہ فیض کا وطن سیالکوٹ ہے لاہور میں تعلیم حاصل کی ہے شاعری بچپن سے کر رہے ہیں لیکن گورنمنٹ کالج لاہور کی فضاؤں میں ان کی شاعری کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا ہے آج کل ام اے او کالج امرتسر میں انگریزی زبان اور ادب پڑھاتے ہیں۔ شعر کہنے کی کوشش اور کاوش نہیں کرتے جب کوئی جذباتی تجربہ شعر کے ڈھانچے میں ڈھلنا چاہتا ہے تو اس کو ڈھال دیتے ہیں۔ نئے ادب اور ترقی پسند ادب کی تحریک سے متاثر ہیں لیکن روایت سے کسی حال میں بھی رشتہ نہیں توڑنا چاہتے ـــــ لیکن یہ تمام باتیں فیض نے خود نہیں کہیں۔ ہم میں سے بعض لوگوں نے مختلف سوال کر کے یہ معلومات فراہم کیں ـــــ لیکن یہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ سوال طویل تھے لیکن فیض نے جو جواب دیے ان میں حد درجہ اختصار تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یا تو وہ باتیں کر نہیں سکتے یا کرنا نہیں چاہتے۔

میں نے اس وقت یہ محسوس کیا کہ فیض نہایت شرمیلے آدمی ہیں۔ خواہ مخواہ باتیں نہیں کرتے۔ شاید کر بھی نہیں سکتے۔ طولانی سوالوں کا جواب ہوں، ہاں سے دیتے ہیں اپنی شخصیت اور شاعری کے بارے میں گفتگو تو انھیں ذرا بھی پسند نہیں تعلّی سے تو وہ دور کا واسطہ بھی نہیں رکھتے۔ برخلاف اس کے ان کے مزاج میں مجھے عجز و انکسار کے عناصر نسبتاً زیادہ نمایاں نظر آئے اور میں نے یہ محسوس کیا کہ ان کی طبیعت میں وہ خصوصیات موجود ہیں جو ایک اعلیٰ درجے کے شاعر اور ادیب میں ہونی چاہئیں۔ مثلاً انھیں اپنی شاعری کے بارے میں غلط فہمیاں نہیں ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ انھوں نے اپنی شاعری سے زندگی اور ادب میں کوئی انقلاب برپا کر دیا ہے وہ تو بس اس لیے شعر کہتے اور شاعری کرتے ہیں کہ ان کو جی چاہتا ہے اور کوئی نامعلوم سی خلش نہیں ایسا کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

فیض سے اگرچہ میری یہ ملاقات مختصر تھی لیکن اس ملاقات نے مجھے بہت لطف دیا۔ کیونکہ آج مجھے ایک ایسے شاعر کو دیکھنے اور اس سے ملنے کا موقع ملا۔ جس کی شاعری کو میں نے مزے لے لے کر پڑھا تھا اور جس میں مجھے انسانی جذبات و احساسات کے نشیب و فراز اور سماجی زندگی کے مدوجزر کی ایک واضح تصویر نظر آئی تھی۔

دوسرے ہی دن فیض امرتسر واپس چلے گئے۔

اس وقت دوسری جنگ عظیم اپنے شباب پر تھی۔ ہندوستان میں ایک ہنگامہ تھا۔ برطانوی حکومت یہ کہتی تھی کہ یہ جنگ امن اور انسانیت کے لیے لڑی جا رہی ہے۔ ہندوستان کے لیڈروں کو اس سے اختلاف تھا۔ بڑے بڑے رہنما جیلوں میں تھے۔ اسی زمانے میں اشتراکیوں اور ترقی پسندوں نے یہ اعلان کیا کہ یہ جنگ واقعی امن اور انسانیت کی جنگ ہے۔ چنانچہ بہت سے اشتراکی اور

ترقی پسند ادیب تو رہا کر دیے گئے۔ لیکن دوسرے سیاسی لیڈر جیلوں میں رہے۔ حبیب الجمن اور کشمکش کا زمانہ تھا ———————— ہندوستان کو اس جنگ سے زیادہ اپنی جنگ آزادی سے دلچسپی تھی۔ لوگوں کو اس حقیقت کا احساس تھا کہ اس جنگ کو جیتنے کے لئے برطانوی حکومت نہ صرف ہندوستان کی دولت پانی کی طرح بہائی جا رہی ہے۔ بلکہ ان کے سپوت بھی صرف چند سکوں کے عوض جنگ کے مختلف میدانوں کو اپنے خون سے سیراب کر رہے ہیں۔ اس احساس نے نوجوانوں کے دلوں میں برطانیہ کے خلاف نفرت کی ایک آگ سی بھڑکا دی تھی

اسی زمانے میں یہ خبر آئی کہ فیض نے کالج کی ملازمت چھوڑ کر فوجی ملازمت کر لی ہے اب وہ لفٹیننٹ کرنل فیض احمد فیض ہو گئے ہیں اور دلی میں ان کا تقرر محکمۂ تعلقات عامہ کے اس محکمے میں ہوا ہے جس کو برطانوی حکومت نے جنگ کی پبلسٹی اور پروپیگنڈہ کے لئے قائم کیا ہے۔

یہ خبر سن کر افسوس بھی ہوا اور کسی حد تک غصہ بھی آیا اس خیال سے کہ فیض کے ایسے حساس اور لطیف مزاج رکھنے والے شاعر کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مہینوں اس پر لکھنؤ کے ادبی حلقوں میں بحثیں ہوتی رہیں۔ ترقی پسندوں نے اس کو سراہا اس لئے کہ اس جنگ میں روس بھی شامل تھا۔ اور ان کے لئے یہ جنگ امن اور انسانیت کی جنگ ہو گئی تھی۔ لیکن میں اس خیال سے مطابقت پیدا نہ کر سکا اور فیض کی یہ فوجی ملازمت مجھے کچھ اچھی نہیں معلوم ہوئی۔ لیکن پھر ان خیالات سے اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ انسان مجبور رہتا ہے۔ جنگ نے حالات خراب کر دیے ہیں معاشی اور اقتصادی نظام درہم برہم ہو گیا ہے۔ گرانی بڑھ گئی ہے، جینا دو بھر ہو گیا ہے۔ زیست دشوار ہے۔ یونیورسٹی اور کالج کی ملازمت میں کیا ملتا ہے۔ حالات نے فیض کو مجبور کر دیا ہوگا۔

اسی زمانے میں مجاز نے ریڈیو کے ایک مشاعرے میں اپنی وہ نظم پڑھی جس کا مصرعہ تھا۔

کرنل نہیں ہوں خان بہادر نہیں ہوں میں

اور جس کی وجہ سے عرصہ تک ریڈیو میں ان کا داخلہ بند رہا۔ —— دراصل اس میں فیض کی اس ملازمت ہی کی طرف اشارہ تھا اور مجاز کو بھی یہ بات پسند نہیں تھی۔ چنانچہ انھوں نے نہ صرف کسی عام مشاعرے میں بلکہ ریڈیو کے مشاعرے میں یہ نظم پڑھی۔ اور اس پر خاصے عرصہ تک ہنگامہ ہوتا رہا۔

فیض کئی سال دلی میں رہے۔ اسی زمانے میرا تقرر بھی اردو کے لیکچرار کی حیثیت سے اینگلو عربک کالج دلی میں ہو گیا۔ دلی کے ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ اس زمانے میں لاہور کے بھی بہت سے ادیب اور شاعر دلی میں قیام پذیر تھے۔ بخاری صاحب ڈائرکٹر تھا تاثیر، حامد علی خاں، حمید احمد خاں، حفیظ، فیض، راشد، میراجی، مختار صدیقی، اعجاز بٹالوی، ضیاء الدین عری، اتفاق سے یہ سب لوگ اس وقت بہ سلسلۂ ملازمت دلی میں جمع تھے۔ اور ان کی وجہ سے جدید ادب کا خاصا چرچا تھا۔ اس زمانے میں نوجوان ادیب حلقۂ ارباب ذوق کے جلسوں میں ہر اتوار کو مل بیٹھتے تھے۔ شروع شروع میں یہ جلسے میں نے میراجی مرحوم کی فرمائش پر اینگلو عربک کالج ہال کے ایک کمرے میں ترتیب دیئے۔ لیکن کچھ عرصہ بعد کالج کے ارباب اختیار کو اس پر کچھ اعتراض ہوا تو یہ جلسے کالج ہی میں میری جائے قیام پر ہونے لگے حفیظ اور تاثیر تو ان جلسوں میں آتے تھے لیکن فیض ان جلسوں میں کبھی شریک نہ ہوئے۔ غالباً اس کی وجہ ان کی سرکاری مصروفیت تھی لیکن اس زمانے میں بخاری صاحب اور تاثیر صاحب نے بھی ایک حلقۂ احباب قائم کر رکھا تھا اس کے جلسے کبھی کبھی بخاری صاحب یا تاثیر صاحب کے مکان پر یا پائی ٹیکنک وغیرہ میں ہوتے تھے۔ تاثیر صاحب مجھے اکثر ان جلسوں میں شریک کرتے تھے۔ یہاں کبھی کبھی فیض بھی آتے تھے اور ان

میں انہیں جلسوں میں ان سے ملاقاتیں ہوئیں۔ لیکن ان جلسوں میں بھی میں نے یہی دیکھا کہ فیض بولتے بہت کم ہیں۔ بخاری صاحب اور تاثیر صاحب تو باغ و بہار قسم کے بزرگ تھے۔ اور اپنی باتوں سے گل و گلزار کھلاتے تھے۔ لیکن فیض نے ان جلسوں میں بھی کبھی دو ایک جملوں سے زیادہ کچھ نہیں کیا۔ ان کی اس کم سخنی ہی نے مجھے ان سے دور رکھا اور میں کبھی اس زمانے میں ان سے کھل کر باتیں نہ کر سکا۔ تاثیر صاحب سے مجھ سے خاصی بے تکلفی تھی اور وہ گھنٹوں مجھ سے مختلف موضوعات پر باتیں کرتے تھے۔ کبھی کبھی میں ان کے دفتر میں اولڈ سکریٹریٹ بھی چلا جاتا تھا اور وہ سرکاری کام کو چھوڑ کر ادبی باتیں شروع کر دیتے تھے۔ لیکن فیض کے ساتھ کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا۔ ان کی کم سخنی ہمیشہ ہمارے درمیان حائل رہی۔ میرے مزاج کی بھی یہ کیفیت ہے کہ ذرا مشکل سے کھلتا ہوں۔ چنانچہ اسی مزاج نے مجھے اس زمانے میں فیض کے ساتھ بے تکلف نہیں ہونے دیا۔ ان سے ملنے اور بے تکلفی کے ساتھ باتیں کرنے کی آرزو ہمیشہ دل میں رہی لیکن اس آرزو کی تکمیل سے ہمکنار ہونے کا موقع ذرا کم ہی ملا۔

چند سال اسی طرح گزرے۔ اس زمانے میں پاکستان کی تحریک اپنے شباب پر تھی اور قیام پاکستان سے بہت پہلے لوگوں کو اس بات کا احساس ہو چکا تھا کہ دنیا کی کوئی طاقت پاکستان کے قیام میں راہ کا روڑا نہیں بن سکتی۔ چنانچہ بصیرت رکھنے والے لوگوں نے اسی زمانے میں پاکستان کے لئے مختلف قسم کی تیاریاں شروع کر دی تھیں ان میں پاکستان کے لئے نئے اخباروں کو جاری کرنے کا خیال بھی تھا میاں افتخار الدین مرحوم نے اس سلسلہ میں سب سے پہلے اقدام کیا اور لاہور سے پاکستان ٹائمز اور امروز نکالنے کا منصوبہ بنایا۔ چند سال میں اس منصوبے نے عملی شکل اختیار کی اور لاہور سے یہ دونوں اخبار نہایت آب و تاب سے نکلے۔ فیض پہلے پاکستان ٹائمز کے اڈیٹر اور پھر اس ادارے سے شائع ہونے والے تمام اخباروں کے چیف اڈیٹر مقرر ہوئے۔ انہوں نے فوجی ملازمت چھوڑ دی۔ صحافت کی دنیا میں قدم رکھا اور اس میدان میں خاصی کامیابی حاصل کی۔ ان کی ادارت کے زمانے میں ان اخباروں کا معیار اتنا بلند ہوا۔ کہ یہ اخبار اس وقت کے چوٹی کے اخباروں میں شمار ہونے لگے۔ ظاہر ہے کہ اس میں فیض کی صلاحیتوں کا بڑا ہاتھ تھا۔

فیض پاکستان ٹائمز کے اڈیٹر تھے جب میں قیام پاکستان کے بعد لاہور پہنچا۔ صحافت کی زندگی بڑی مصروف زندگی ہوتی ہے۔ میں بھی شروع شروع لاہور میں بری طرح مصروف رہا۔ اس لئے فیض سے صرف چند مختصر ملاقاتیں ہوئیں کبھی کسی جلسے میں مل گئے کبھی کہیں کھانے یا چائے پر سرسری سی ملاقات ہو گئی۔ کبھی اطمینان سے بیٹھ کر تفصیل سے باتیں کرنے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن اس زمانے میں جب میں پنجاب یونیورسٹی کی انجمن اردو کا صدر مقرر ہوا تو فیض سے مفصل ملاقاتوں کے کئی مواقع ملے۔ اور ان ملاقاتوں سے زندگی کے متعلق ان کے خیالات اور ادب کے بارے میں ان کے نظریات کا اندازہ ہوا۔

انجمن کے زیر اہتمام میں نے کچھ ایسے جلسے ترتیب دیئے جن میں مشہور شعرا اپنی زندگی اور شاعری کے بارے میں اظہار خیال کرتے تھے اس سلسلے میں میں نے فیض کو بھی دعوت دی اور انہوں نے اس دعوت کو اپنی مصروفیت کے باوجود خوشی سے قبول کیا۔ جلسے میں آئے۔ اپنی شخصیت اور شاعری کے بارے میں تقریر کی اور تاریخی ترتیب سے اپنی نظمیں سنائیں۔ جلسے کے آخر میں... استادوں، طالب علموں اور ادیبوں نے بعض سوالات بھی کئے اور فیض نے ان کے جواب بھی دیئے۔

فیض نے اس جلسے میں بتایا کہ وہ سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ان کی تاریخ ولادت ۱۳ جنوری ۱۹۱۱ء ہے ان کا بچپن سیالکوٹ ہی میں گزرا۔ ابتدائی تعلیم اسکاچ مشن اسکول سیالکوٹ میں ہوئی۔ شمس العلماء مولوی میر حسن اور مولوی میر ابراہیم سیالکوٹی ان کے استاد تھے۔ ان بزرگوں کا شمار اپنے زمانے کے بڑے فاضلوں میں ہوتا تھا ان کی شخصیتوں نے فیض پر گہرے اثرات چھوڑے ان کی

شاعری کا آغاز اسکول ہی کے زمانے سے ہوا۔ مشاعروں میں غزلیں پڑھیں۔ انعامات ملے اس زمانے میں اسکول سے باہر بھی سیالکوٹ میں شعر و شاعری کے چرچے تھے۔ چنانچہ ان مشاعروں میں بھی شرکت کی، اور اپنے اشعار پڑھ کر داد حاصل کرتے۔ بے۔ اے پاس کر کے وہ تعلیم کی غرض سے لاہور آئے۔ گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا۔ یہاں وہ بخاری صاحب، تاثیر صاحب اور صوفی تبسم صاحب کے زیر اثر آئے اور اس زمانے میں انہوں نے باقاعدہ شاعری شروع کی۔ اسی زمانے میں انہیں نئے ادب اور ترقی پسند ادب کی تحریکوں سے دلچسپی پیدا ہوئی اور ان تحریکوں کے زیر اثر ان کی شاعری کو زندگی کے نئے شعور سے آشنا ہونے کا موقع ملا آج بھی یہ اثرات ان کی شاعری میں کسی نہ کسی زاویے سے اپنی جھلک دکھاتے ہیں۔ —— وغیرہ وغیرہ

اس مختصر سی تقریر کے بعد فیض نے اپنی مختلف نظمیں تاریخی ترتیب سے سنائیں اور اختصار کے ساتھ ان کا پس منظر بھی بیان کیا۔ اس جلسے میں بعض لوگوں نے فیض سے ان کی مختلف نظموں کے بارے میں سوالات بھی کیے۔ اور فیض نے ان کے جوابات بھی دیئے کئی گھنٹے کی اس دلچسپ صحبت نے فیض کی شخصیت اور شاعری کے بعض نئے گوشوں کو ہم لوگوں کے سامنے بے نقاب کیا۔ آج مجھے ایک بار پھر اس بات کا احساس ہوا کہ فیض کو دوسرے شاعروں کی طرح اپنے کلام کے بارے میں غلط فہمی نہیں ہے اور وہ اس معاملے میں ذرا تعلّی سے کام نہیں لیتے۔ برخلاف اس کے وہ اپنی شاعری کے نشیب و فراز کو پوری طرح سمجھتے ہیں اور اس کے ایک باشعور نقاد بھی ہیں —— فیض نے انجمن اردو میں خاصی دلچسپی لی اور اسکے جلسوں میں اپنی مصروفیتوں کے باوجود پابندی سے شریک ہوتے رہے اس زمانے میں مجھے فیض کو زیادہ قریب سے دیکھنے کا اور ان کے خیالات و نظریات سے آشنا ہونے کا موقع ملا۔

اسی زمانے میں ایک دن مجھے وہ خبر ملی جس کو سنکر میں سناٹے میں آگیا۔ اور وہ خبر یہ تھی کہ فیض کو کچھ اور لوگوں کے ساتھ بغاوت کے الزام میں گرفتار کر دیا گیا ہے۔

سہ پہر کا وقت تھا میں مال روڈ پر باغ جناح کی طرف کی سیر کی غرض سے جا رہا تھا کہ راستے میں اخبار والے کی آواز سنائی دی جو کسی اخبار کا ضمیمہ بیچ رہا تھا۔ اور اس کی یہ آوازیں فضاؤں میں گونج رہی تھیں —— "باغیوں کو گرفتار کر لیا گیا —— سازش ناکام ہو گئی ——"

میں نے اس سے اخبار کا ضمیمہ لیا اور باغ جناح میں جا کر اس کو پڑھا۔ اس میں فیض کی گرفتاری کی خبر بھی تھی، اس خبر کو پڑھ کر طبیعت بہت بدمزہ ہوئی۔ رات بھر پریشان رہا۔ نیند نہیں آئی۔ بے شمار خیالات آتے رہے۔

صبح کو یہ خبر ملی کہ جو لوگ گرفتار ہوئے ہیں ان پر مقدمہ چلایا جائیگا لیکن اس کی کارروائی پوشیدہ رہے گی چنانچہ مقدمہ چلایا گیا لیکن اس کی تفصیلات کا علم نہ ہو سکا سب کو سزائیں ہو گئیں۔

فیض اسطرح کئی سال جیل میں رہے۔

جیل میں ان پر کیا بیتی اسکا تو مجھے علم نہیں کیونکہ میں نے اس تلخ موضوع پر کبھی ان سے بات نہیں کی۔ البتہ اس زمانے میں انھوں نے جو نظمیں لکھیں چھپ کر سامنے آتی رہیں۔ حکومت کی طرف سے ان کی نظموں اور غزلوں کی اشاعت پر کوئی پابندی نہیں لگائی گئی ملکیان کا دوسرا مجموعہ دست صبا اسی زمانے میں چھپ کر سامنے آیا۔ جب وہ جیل میں تھے۔

یہ مجموعہ مکتبہ کارواں لاہور کی طرف سے بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا گیا۔ اس کے ناشر چودھری عبدالحمید نے لاہور کے ایک اعلیٰ درجے کے ریستوراں (اس وقت اسکا نام یاد نہیں رہا) میں لاہور کے تمام ادیبوں شاعروں فنکاروں اور استادوں

کو جمع کیا تھا۔ اور دوست احباب کے نسخے تقسیم کئے تھے۔ ان تمام نسخوں پر فیض نے "جیل سے محبت سے" کے الفاظ لکھ کر بھیجے تھے۔ اور نیچے اپنے دستخط بھی کئے تھے۔

اس مجموعے کو میں نے بڑے ذوق و شوق سے پڑھا۔ اور اس پر ایک مفصل مضمون بھی لکھا۔ جو غالباً امروز کے کسی خاص نمبر میں شائع ہوا تھا۔ اس مجموعے میں نقش فریادی کی کی باتیں تو نہیں تھیں لیکن اس سے یہ ضرور اندازہ ہوا کہ فیض کی شاعری کے جس دھارے کو صحافت نے وقتی طور پر روک رکھا تھا وہ اب نئے حالات کے زیر اثر ایک دفعہ پھر بہہ نکلا ہے۔ اس میں جو نظمیں اور غزلیں شامل تھیں ان میں جذبات کی گرمی اور شعور کی روشنی کچھ اور بھی نمایاں تھی اور کہیں کہیں تھوڑی سی تلخی کا احساس بھی ہوتا تھا۔ لیکن ان میں آس پاس اور گرد و پیش کی زندگی کے مخصوص حالات کے مدوجزر کی ایک تصویر بہر صورت موجود تھی۔ اور باشعور نوجوانوں کے دلوں کی دھڑکنوں کا مخصوص نغمہ بہرحال سنائی دیتا تھا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ یہ مجموعہ ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اور اس کو نقش فریادی سے بھی زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی

فیض کے ساتھ دلچسپی اس زمانے میں اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ ان سے نظریاتی اختلاف رکھنے والے بھی ان کے شیدائی ہو گئے تھے انکی شاعری نے انہیں لوگوں کی نظروں میں مقبول اور محبوب بنا دیا تھا۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور طلبا تو ان کے دل و جان سے شیدائی تھے۔ وہ ایک سنگین الزام میں گرفتار تھے لیکن اس زمانے میں کالجوں میں جو مشاعرے ہوتے تھے وہاں فیض کی غزلوں پر غزلیں کہی جاتی تھیں۔ مشاعروں میں شریک ہونے والے شاعر اشاروں اور کنایوں میں ان کی شخصیت اور شاعری کے ساتھ دلچسپی کا اظہار کرتے تھے۔

اس صورت حال نے بعض ادیبوں اور شاعروں کے دلوں میں اس خیال کی لہر بیدار کی کہ فیض کی رہائی کے لئے حکومت سے مطالبہ کیا جائے۔ چنانچہ ایک درخواست لکھی گئی۔ ادیبوں، شاعروں، یونیورسٹی اور کالج کے استادوں نے اس پر دستخط کئے اور وہ حکومت کو بھیجی گئی خدا جانے اسکا کوئی اثر ہوا یا نہیں کیونکہ مقدمہ عدالت میں تھا۔ لیکن مقدمے کی کاروائی مکمل ہونے کے بعد فیض رہا کر دیئے گئے۔ ان کے رہا ہونے سے جو خوشی ادیبوں اور شاعروں کو ہوئی اس کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

لاہور میں انکے مکان پر آنے والوں کا تانتا بندھ گیا اور کئی ہفتہ تک میلہ سا لگا رہا۔

میں بھی بعض احباب کے ساتھ ان کی خیریت معلوم کرنے مزاج پوچھنے اور مبارک باد دینے کے لئے ایک شام ان کی جائے قیام پر پہنچا عرصے کے بعد فیض سے ملاقات ہوئی دیکھ کر دل بھر آیا۔ معانقہ کیا۔ حال احوال پوچھا۔ چائے آگئی باتیں ہوتی رہیں۔

جیل کی زندگی کے بارے میں میں نے جان کر کوئی بات نہیں کی۔ صرف اتنا دریافت کیا "جیل میں آپ کو پڑھنے لکھنے کی آسانیاں تو ہونگی "؟

کہنے لگے جی ہاں! پڑھنے لکھنے کی کوئی دشواری نہیں تھی "

میں نے پوچھا۔ "آپ نے جیل میں پچھلے دنوں کون کون سی کتابیں پڑھیں۔؟"

کہنے لگے "سودا کے کلام کا مطالعہ کیا۔ اور اس کو پڑھ کر بہت لطف آیا۔ چنانچہ سودا کی زمینوں میں کچھ غزلیں کہیں۔"

میں نے کہا وہی غزلیں جو نذر سودا کے عنوان سے آپ کے نئے مجموعے میں شائع ہوئی ہیں "

بولے جی ہاں؟"

اس کے بعد وہ یہ پوچھنے لگے "کہئے اورینٹل کالج کا کیا حال ہے وہاں کے ارباب — اختیار کیسے ہیں؟"

میں نے کہا "سب ٹھیک ہے۔ کام چل رہا ہے"
اور اس کے بعد دیر تک ہم لوگ سودا کی شاعری اور اورینٹل کالج کے معاملات پر باتیں کرتے رہے کوئی ایک گھنٹے کی گفتگو کے بعد میں نے رخصت ہوتے ہوئے پوچھا "آپ کیا ارادہ ہے؟"
کہنے لگے "کوئی ارادہ نہیں۔ آرام کروں گا تھک گیا ہوں"
اور واقعی فیض کی آواز میں تھکن کے آثار تھے۔ بظاہر تو صحت اچھی معلوم ہو رہی تھی لیکن کچھ بجھے بجھے سے نظر آ رہے تھے جیسے گذشتہ چند سال کے قید و بند نے انہیں ہلکان کر دیا ہو۔
کئی سال گزر گئے۔
اور پھر مجھے ۵۶ء میں فیض کے ساتھ ایک سفر کرنے کا اتفاق ہوا۔
دلی میں ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس تھی اس میں شرکت کے لئے پاکستانی ادیبوں کا ایک وفد بھی گیا تھا۔ وفد میں مولانا عبدالمجید سالک مرحوم، شوکت تھانوی مرحوم، اعجاز بٹالوی اور قتیل شفائی بھی شامل تھے۔
ہم سب لوگ صبح کو فیض کی جائے قیام پر جمع ہوئے اور واہگہ کے راستے سے امرتسر پہنچے۔ دن امرتسر میں گذارا۔ میں نے اس سے قبل امرتسر نہیں دیکھا تھا۔ فیض مجھے امرتسر کے تنگ اور تاریک بازاروں میں لے گئے۔ جلیانوالہ باغ دکھایا۔ دربار صاحب اور ہال بازار کی سیر کرائی۔ مرحوم۔ ایم اے او کالج کی عمارت میں لے گئے اور یہ بتایا کہ وہ اس کمرے میں بیٹھتے تھے۔ یہاں تاثیر صاحب لیکچر دیتے تھے۔ پھر سول لائنز کے مختلف مکانوں کی طرف اشارہ کر کے یہ بتاتے رہے کہ میں یہاں رہتا تھا۔ اس مکان میں ہماری شادی ہوئی تھی۔ اس جگہ ہم نے اپنی زندگی کے بہترین دن گذارے تھے۔
اس طرح دن بھر فیض مجھے امرتسر کی سیر کراتے رہے۔ شام کو سول لائنز میں ایک ہندو دوست کے یہاں کھانا کھایا۔ اور رات کو ہم لوگ فرنٹیر میل سے دلی روانہ ہوئے۔
صبح کو دلی پہنچے۔ اسٹیشن پر ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس کے والنٹیر اور کچھ ادیب موجود تھے۔ ان لوگوں نے ہمارا استقبال کیا۔ ہار پہنائے اور نئی دلی میں ہماری جائے قیام پر پہنچایا۔
پانچ چھ روز ہم لوگ دلی میں رہے۔ ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس کے کئی اجلاس ہوئے۔ ان سب میں ہم لوگوں نے شرکت کی۔ فیض نے ان جلسوں میں دو تقریریں کیں۔ ایک تو پاکستان میں ادیب کی حیثیت کے بارے میں۔ اور دوسری پاکستان کے جدید ادب کے متعلق۔ ان تقریروں سے یہ اندازہ ہوا کہ انہوں نے پاکستانی ادیبوں کے مسائل اور پاکستانی ادب کے جدید رجحانات کا تجزیاتی زاویہ نظر سے مطالعہ کیا ہے اور وہ ان کے تمام پہلوؤں سے پوری طرح واقفیت رکھتے ہیں۔
کانفرنس کے بعد ایک مشاعرہ بھی ہوا۔ اس میں فیض نے بھی اپنی نظمیں سنائیں اور انہیں ایسی داد ملی کہ بیشتر شاعروں کو ان پر رشک آیا۔ ہر طرف بس فیض ہی فیض نظر آتے تھے۔
پاکستان سے باہر فیض کو جو مقبولیت حاصل ہے اس کا اندازہ مجھے اس سفر میں ہوا۔ میں تو سمجھتا تھا کہ پاکستان ہی میں لوگ فیض کے شیدائی ہیں لیکن اب یہ حقیقت واضح ہوئی کہ پاکستان سے باہر بھی انہوں نے لوگوں کے دلوں میں جگہ بنا لی ہے۔ اور یہ مرتبہ کسی شاعر کو ذرا مشکل ہی سے نصیب ہوتا ہے۔

اس مقبولیت کا سبب انسانیت اور انسان دوستی کا وہ پیام ہے جس کے گرد ان کی شاعری گھومتی ہے۔ اور اسی پیام نے انہیں کئی سال بعد لینن پرائز دلایا جو بلا شبہ ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔

فیض لینن پرائز لینے کے لئے روس گئے۔ اور وہاں سے واپس آکر کوئی ڈیڑھ سال لندن میں رہے۔ میں بھی کم و بیش اسی زمانے میں اردو کے استاد کی حیثیت سے لندن آیا۔ اور یہاں ان سے برابر ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

بی بی سی میں صلائے عام کے کئی پروگرام ایسے ہوئے جن میں ہم نے پاکستان کے مختلف مسائل پر تبادلہ خیال کیا کئی مشاعرے بھی ترتیب دیئے گئے۔ جن میں فیض نے اپنا کلام سنایا اور بعض ادبی جلسے بھی ایسے ہوئے جن میں کبھی کبھی فیض نے تقریریں کیں۔ اور اس طرح مجھے لندن میں فیض کو نسبتاً زیادہ قریب سے دیکھنے اور ان کے خیالات و نظریات سے آشنا ہونے کے مواقع ملے۔

فیض کبھی کبھی اسکول آجاتے اور میرے ساتھ سینیر کامن روم میں بیٹھ کر باتیں کرتے تھے۔ میرے دوست اور رفیق کار رالف رسل بھی ان باتوں میں ہمیشہ دلچسپی لیتے تھے۔ دیر تک مختلف موضوعات پر تبادلہ خیالات ہوتا۔ مختلف ممالک میں ان کے سفر کی روداد سنی جاتی اور اردو زبان اور ادب کو پھیلانے کے منصوبے بنائے جاتے۔

لندن کے دوران قیام میں فیض نے پاکستان کی ثقافت پر کام بھی شروع کر دیا تھا۔ میرے ساتھ وہ برٹش میوزیم بھی گئے لیکن ان کے پاؤں میں چکر رہا اس لئے وہ دلجمعی اور یکسوئی کے ساتھ کام نہ کر سکے۔

اور پھر ایک دن فیض اسکول آئے میرے ساتھ ہی ریفکٹری میں رات کا کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد ہم لوگ سینیر کامن روم میں کافی پینے گئے۔ وہاں انہوں نے یہ خبر سنائی کہ وہ جلد پاکستان جا رہے ہیں

میں نے پوچھا "اچانک آپ نے یہ فیصلہ کیسے کر لیا۔؟"

کہنے لگے "بس یہاں جی نہیں لگتا۔ طبیعت اکتا گئی ہے"

میں نے کہا "عجیب بات ہے کہ لندن میں آپ کا جی نہیں لگتا!"

کہنے لگے "اپنا وطن یاد آتا ہے۔ ایک ایک چیز کی یاد ستاتی ہے۔ یہاں کس سے ملوں؟ کس سے باتیں کروں؟ کس کے لئے شعر کہوں؟ کس کو شعر سناؤں؟"

میں خاموش سنتا رہا۔

رسل کہنے لگے "لیکن یہاں آپ کو آزادی زیادہ ہے اور کام کرنے کے مواقع بہت ہیں"

فیض نے کہا "پابندی تو مجھ پر اپنے وطن میں بھی کوئی نہیں ہے۔ میں وہاں بھی آزاد ہوں۔ کام البتہ یہاں مختلف قسم کے ہو سکتے ہیں لیکن یہاں اجنبیت اتنی زیادہ ہے کہ کچھ کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ پھر سب سے خراب بات یہ ہے کہ یہاں کی زندگی تمام تر مصنوعی ہے اس میں تصنع بہت ہے۔ یہاں کسی سے ملنے جاؤ تو پہلے (APPOINTMENT) کرنا پڑتا ہے۔ دوست سے ملنے کے لئے بھی یہاں پر فون پر وقت مقرر کرنا ضروری ہے یہ بھلا زندگی ہے! اپنے یہاں تو جس وقت جی چاہا اٹھے اور دوستوں کے یہاں چلے گئے۔ مل گئے تو گپ شپ ہوئی تھوڑا سا وقت اچھا گذر گیا۔ نہیں ملے تو واپس چلے آئے۔ یہاں اس کا کوئی تصور نہیں۔ اسی لئے اس فضا میں میرا تو دم گھٹتا ہے۔"

میں خاموش سنتا رہا۔

فیض نے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا۔

رالف کو مخاطب کرکے کہنے لگے ـــــ "صاحب، آپ لوگوں نے بہت ترقی کی ہے۔ لیکن آپ لوگ ابھی تک بابا آدم کے زمانے میں ہیں۔ یہاں ہر شخص کو اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرنا پڑتا ہے۔ مہذب تو ہم لوگ ہیں کہ ہم نے تقسیم کار کے اصول پر عمل کیا ہے۔ ہر شخص کے لئے وہاں کام مقرر ہے۔ اس طرح ہر شخص کو آسانی ہوتی ہے اور یہی زندگی کی زیادہ ترقی یافتہ صورت ہے"

اب مجھ سے ضبط نہ ہو سکا، اور مجھے ہنسی آگئی۔ فیض بھی ہنسنے لگے۔ رالف نے بھی حسب معمول قہقہہ لگایا

اس دن دیر تک ہم لوگ اس قسم کی دلچسپ باتیں کرتے رہے۔!

دوسرے دن فیض نے فون پر یہ اطلاع دی کہ وہ ۲۴ جنوری کو جا رہے ہیں۔ جہاز نیپلز سے چلے گا۔ لندن سے نیپلز تک وہ ریل میں سفر کریں گے اور راستے میں دو دن پیرس میں ان کا قیام رہے گا۔

اس زمانے میں میں نے اسکول کے شعبۂ اردو کے لئے ادیبوں اور شاعروں کی آوازوں کو ریکارڈ کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ اور خاصی تعداد میں چیزیں ریکارڈ کی تھیں۔

جب فیض نے جانے کی تاریخ طے کرلی تو خیال ہوا کہ ان کا بھی ایک انٹرویو ریکارڈ کرلیا جائے۔ چنانچہ جانے سے ایک روز قبل خاص طور پر انہیں اس کام کے لئے اسکول میں دعوت دی۔ انھوں نے اس دعوت کو بخوشی قبول کیا۔ وہ آئے میں نے ان سے ان کی زندگی، شخصیت اور شاعری کے بارے میں مختلف سوالات کئے جس کے انھوں نے نہایت جواب دیئے۔ اور اسطرح ایک دلچسپ اور مفید چیز تیار ہوگئی جو اسکول آف اورنٹیل اسٹڈیز لندن یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں محفوظ رہے گی۔

۲۴ جنوری کو ان سے لندن میں میری آخری ملاقات ہوئی تھی ۲۴ کو وہ لندن سے نیپلز روانہ ہوئے اور پھر [illegible] فروری کی ۱۳ تاریخ کو وہ پاکستان پہنچے۔ ادیبوں نے ان کا شاندار استقبال کیا ان کے اعزاز میں بے شمار محفلیں منعقد ہوئیں اور وطن عزیز میں کراچی سے پشاور تک ایک دھوم مچ گئی۔

لندن میں انہوں نے رخصت ہونے سے قبل مجھے اپنی آخری غزل سنائی تھی اسکے یہ دو شعر مجھے بہت پسند آئے تھے۔ اور میں نے انہیں اصرار کرکے بار بار اشعار پڑھ کر سنانے کی زحمت دی تھی۔ پھر بھی میرا دل نہیں بھرا تھا۔ کیسے عجیب شعر تھے۔

شرحِ فراق، مدحِ لبِ مشک بو کریں
غربت کدے میں کس سے تری گفتگو کریں

یارِ آشنا نہیں کوئی ٹکرائیں کس سے جام
کس دلربا کے نام پہ خالی سبو کریں

مجھے یقین ہے کہ وہ اب اس قسم کے شعر نہیں کہتے ہونگے، اور ان کے نزدیک ان اشعار کی اب کوئی خاص اہمیت بھی نہیں ہوگی۔ لیکن میں ان اشعار کو آج بھی اکثر گنگناتا رہتا ہوں۔!

(لندن سے)

سردار جعفری

لکھنؤ کی ایک رات

فیض کے ساتھ

دیکھ آکر کوچۂ چاک گریباں کی بہار

وہ رات بڑی طوفانی تھی۔ دسمبر سنہ ۱۹۴۱ء کا مہینہ تھا، اور سرد ہوا کا جھکڑ چل رہا تھا۔ قیصر باغ لین میں ہمارے گھر کے سامنے کھڑا ہوا املی کا پرانا تناور درخت کسی عظیم الجثہ دیو کی طرح جھوم رہا تھا۔ اس کی شاخیں ایک دوسرے سے ٹکراتی تھیں۔ اور سائیں سائیں کی مسلسل آوازوں کے ساتھ بے شمار چھوٹی چھوٹی پتیاں برسنے لگی تھیں۔ ہوا ہزاروں پروں سے پرواز کر رہی تھی سڑکوں کی بجلی کی بعض روشنیاں جو کھمبوں کے بجائے تاروں سے لٹکی ہوئی تھیں، لمبی لمبی پینگیں لے رہی تھیں اور سائے دیوانہ وار ناچ رہے تھے، خود ہمارے سائے بھی کبھی پیچھے اور کبھی آگے آکر ناچنے لگتے۔ رات اپنے شباب پر تھی، اور ہمارے دلوں میں ایک احساس فتح مندی تھا۔ ہم آل انڈیا ریڈیو سے نووارد شعراء کا مشاعرہ پڑھ کر واپس آ رہے تھے۔

نووارد شعرا کا مشاعرہ منتظم تھے آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ کے اسٹیشن ڈائرکٹر سومناتھ چب معشوقِ عاشق پیشہ، صدارت کے فرائض شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی نے انجام دیئے۔ آج خود ان کے نظم سنانے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ وہ نوعمر ترقی پسند شاعروں کا کلام سننے آئے تھے۔ وجیہہ اور سرخ و سپید رنگ، دل نواز اور معصوم تبسم، آنکھوں میں شفقت، محبت اور غرور باقی سارے انداز میں ایک باوقار رندی سی۔

جوش کی بحث صدارت میں پس و پیش نہ کر
جوش تو قبلۂ رندانِ جہاں ہے ساقی

مشاعرہ سننے والے لکھنؤ کے صاحبانِ ذوق، وہ بھی جو نئی شاعری کے پرستار تھے، اور وہ بھی جن کے ماتھے پر بل پڑ جاتے تھے، آج وہ بھی دیکھنے آئے تھے کہ نووارد شعراء پر کیا بیتی ہے۔ انہیں کے ہجوم میں سجاد ظہیر، ترقی پسند تحریک کے بانی اور میر کارواں، ابھی نوعمر ہیں، انگلستان سے تعلیم ختم کر کے واپس آئے ہیں۔ جیل میں رہ چکے ہیں، بیماری کی وجہ سے رہا کر دیئے گئے ہیں، لیکن چہرے پر طالب علمی کی معصومیت باقی ہے۔ بھاری بھرکم جسم ہے، بہت نازک ہاتھ ہیں، شخصیت میں

سا ہے، رضیہ ان کی بیوی ہیں، گندمی رنگ، اچھریرا جسم، الہ آباد یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا ہے۔ مایا سرکار جھیلا ودیالے میں انگریزی پڑھاتی ہیں، بنگالی ہیں، لیکن لکھنؤ کی نفیس اردو بولتی ہیں۔

پروفیسر ڈی پی مکرجی بنگالی زبان کے مستند ادیب اور نقاد، موسیقی کے پرستار، سخن و شاعری کے دلدادہ، انتہائی ترقی پسند لکھنؤ یونیورسٹی میں معاشیات اور سماجیات کی تعلیم دیتے ہیں۔ بولتے ہیں تو منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ نفیس بنگالی دھوتی اور کرتا پہن رکھا ہے، کندھوں پر ایک کشمیری شال ہے، ہونہار طالب علموں کی تلاش میں رہتے ہیں اور انہیں اپنے گھر پر بلا کر چائے پلاتے ہیں، اپنی باتوں سے محظوظ کرتے ہیں اور کتابیں پڑھنے کے لئے دیتے ہیں۔ اردو کم سمجھتے ہیں لیکن بلا کی ذہانت ہے، اچھے اور بڑے شعر پر تیز کر لیتے ہیں، انہیں خوشی ہے کہ نو وارد شعرا میں اُن کی یونیورسٹی کا ایک طالب علم بھی ہے۔ احمد علی، جو ابھی ابھی انگلستان سے واپس آئے ہیں، اردو میں چند افسانے لکھے ہیں اور انگریزی میں ایک ناول جس پر فاسٹر کا دیباچہ ہے، بڑے ادیب سمجھے جاتے ہیں۔

گوہر سلطان جن کے گلے کی دھوم ہے۔ حیات اللہ انصاری، اردو کے مشہور افسانہ نگار اور 'ہندوستان' ہفتہ وار کے ایڈیٹر، نئے شاعروں کی طرف دار لیکن ناقدانہ انداز لئے ہوئے۔ انور جمال قدوائی اپنے مخصوص بہکے ہوئے انداز کے ساتھ سیاست میں عملی دلچسپی نہیں لیتے، ادب کی تخلیق نہیں کرتے لیکن نظریاتی اور جذباتی طور سے دونوں کے معاملے میں انتہائی انقلابی، اور سبط حسن، سر سے پاؤں تک عشق کا مجسمہ کسی افسانوی سرزمین کے شہزادے کی طرح جو جادو کے محلوں اور بارہ دریوں سے سوئی ہوئی شہزادیوں کو جگا لاتے ہیں۔ حسین چہرہ، جامہ زیب جسم، نفیس ترشے ہوئے ہونٹ، بڑی بڑی بے قرار آنکھیں، اور نہایت مہذب اور سلجھی ہوئی زبان، شاعر ان کے دوست نہیں درباری ہیں۔

ان سب کے علاوہ یونیورسٹی کے اور بھی اساتذہ اور طالب علم، اور لکھنؤ کے قدیم اساتذہ جامہ وار کی شیروانیاں پہن کر آئے ہیں اور دو زانو بیٹھے ہیں۔ اس سے پہلے اردو ادب کی تاریخ میں کبھی بزرگ اور معمر شعرا، نو عمر شاعروں کا کلام سننے نہیں آئے تھے۔

سب ہمہ تن انتظار ہیں کہ نو وارد شعرا، سو مناتھ چیب کے ساتھ اندر داخل ہوتے ہیں، یہ اس عہد کے باغی ہیں، سر پھرے عیش و نشاط کے دلدادہ مگر مفلس، بردوش، یہ ابھی عظیم نہیں ہیں، لیکن ان کے نام افسانے بن چکے ہیں، اردو شعر و ادب کے نئے دھارے اب ان کے نام پر بہیں گے۔ یہ نیا جذبہ، نیا احساس، نئی زبان لے کر آئے ہیں۔ ماضی کا سارا ورثہ ان کے پاس ہے جدید تعلیم کی اعلیٰ ترین ڈگریاں ان کے پاس ہیں۔ اس لئے قدیم اور جدید کا امتزاج ان کے یہاں خود بخود پیدا ہو گیا ہے۔ یہ پرانے ہیروں کو نئی طرح تراش رہے ہیں، ہجر و وصال کی داستانیں ان کو آتی ہیں، محبوب کے وعدۂ فردا کی لذت سے واقف ہیں لیکن ہندوستان کی آزادی اُن کی سب سے بڑی محبوبہ ہے، اور اس محبوبہ کے سامنے نئی شاعری پر اعتراض کرنے والوں کی گردن بھی جھک جاتی ہے۔

نو وارد شعرا کی طرف بے شمار نگاہیں اٹھتی ہیں۔ نگاہیں جن میں محبت کی گرمی ہے۔ نگاہیں جن میں سرد مہری ہے۔ عاشقانہ نگاہیں، رقیبانہ نگاہیں، لیکن ہر نگاہ میں ایک سوال ہے،

کون کون ہے؟

یہ مجاز ہے، خوش پوش مگر چاک گریباں، آنکھوں کی گہری اُداسی میں شوخی کی بجلیاں چمک رہی ہیں۔ اس کے باریک ہونٹوں کی نرم مگر شریر مُسکراہٹ کو لکھنؤ میں کون نہیں جانتا۔ اُس کے گلے اور شعر میں بقول فیض کے مغنّی کے نغمے کا درد ہے۔ جوش نے اس کی شخصیت کو ایک فقرے میں سمیٹ لیا ہے: "وہ ایک نگاہ میں دنیا کے سارے حُسن کو اور ایک گھونٹ میں دنیا کی ساری شراب کو پی جانا چاہتا ہے" ؎

اس محفلِ کیف و مستی میں اس انجمنِ عرفانی میں
سب جام بکف بیٹھے ہی رہے ہم پی بھی گئے چھلکا بھی گئے

اور یہ فیض احمد فیض ہے۔ لاہور کے گلی کوچوں کی تخلیق، چہرے کی مسکراہٹ اُداس ہے، لیکن آنکھیں نرم اور محبت بھری، آواز میں ہلکا سا گداز اور شعروں میں دل کی دھیمی دھیمی آنچ جو لفظوں کے سنگیت کو پگھلا کر رنگ بنا دیتی ہے اور ہر مصرع ایک پینٹنگ بن جاتا ہے۔ ایک حسین و جمیل تصویر جو دل میں آویزاں ہو جاتی ہے۔ تشبیہیں اور استعارے نرم رو شعروں کے اندر بجلیوں کی طرح کوندتے ہیں اور آنکھیں چکا چوند ہو جاتی ہیں، مگر یہ وہ بجلیاں ہیں جو صرف فیض ننھے ننھے شراروں سے بنا سکتا ہے ؎

دل کے ایواں میں لئے گل شدہ شمعوں کی قطار
نورِ خورشید سے سہمے ہوئے، اکتائے ہوئے
حُسنِ محبوب کے سیّال تصور کی طرح
اپنی تاریکی کو بھینچے ہوئے لپٹائے ہوئے

اور یہ جذبی ہے۔ سب سے بے نیاز اور سب سے الجھا ہوا، حسّاس چہرے پر عمر بھر کے مصائب اور مفلسی کی تلخی، آنکھوں میں محبت کی بے پناہ بھوک اور حسین ترنم میں ایک دل دوز کیفیت جس کو اُس کی آواز کی رچی ہوئی سرشاری بھی نہیں چھپا سکتی۔ کسی کا احسان اُٹھانے کو تیار نہیں ہے۔ زندگی کو بھی دھتکارتا ہے اور موت کو بھی ؎

نہ آئے موت خدایا تباہ حالی میں
یہ نام ہوگا غمِ روزگار سہہ نہ سکا

اور یہ مخدوم محی الدین ہے، حیدرآباد کا انقلابی۔ سنگِ اسود سے تراشا ہوا آبنوسی چہرہ، بلند پیشانی، شگفتہ آنکھیں، مسکراہٹ میں گرم جوشی اور باتوں میں بے انتہا یقین اور اعتماد۔ ترنم بے پناہ ہے، جس میں صرف نشاط ہی نشاط ہے۔ انقلاب اور بغاوت کے دوراہے پر کھڑا ہوا انتظار کر رہا ہے۔ کہنا مشکل ہے کہ یہ دکن کی کسی سانولی سلونی محبوبہ کا انتظار کر رہا ہے یا ہندوستان کی آزادی کا ؎

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے
پتیاں کھڑکیں تو یہ سمجھا کہ آپ آ ہی گئے
سجدے مسرور کہ مسجود کو وہ پا ہی گئے
آ گئی تھی دلِ مضطر میں شکیبائی سی
بج رہی تھی مرے غم خانہ میں شہنائی سی

اور یہ جاں نثار اختر ہے، نو وارد شعراء کے ہجوم میں تنہا جسے شاعری اپنے والد مضطر خیرآبادی سے ورثہ میں ملی ہے لیکن آپ سے اُلجھا ہوا، خود ہی سنجیدہ ہو جاتا ہے اور خود ہی مسکراتا ہے ؎

آسماں جیسے جلے لاٹے کی دُھول
چاند جیسے ایک بے امت رسول
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

اور یہ سردار جعفری ہے۔ کرشن چندر کا یہ کہنا ہے کہ "اس کے چہرے پر ہنسنے ہتھوڑے کا نشان ہے" پروفیسر محمد مجیب کی رائے ہے کہ وہ رنگین تصویریں نہیں بناتا، بلکہ پتھروں سے مجسمے تراشتا ہے ؎

سرمایہ کے سمٹے ہوئے ہونٹوں کا تبسم
مزدور کے چہرے کی تھکن ہے کہ نہیں ہے
وہ زیرِ اُفق صبح کی ہلکی سی سپیدی
ڈھلتے ہوئے تاروں کا کفن ہے کہ نہیں ہے
پیشانیٔ افلاس سے جو پھوٹ رہی ہے
اُٹھتے ہوئے سورج کی کرن ہے کہ نہیں ہے

نو وارد شعراء کے اس مشاعرے میں ن.م. راشد کے بھی آنے کی خبر تھی جس کے سر اردو شاعری میں آزاد نظم کا سہرا ہے، پطرس کے نزدیک وہ ایشیا کا سب سے بڑا شاعر ہے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ اردو زبان راشد کو کبھی فراموش نہیں کرے گی۔

مشاعرہ ختم ہونے کے بعد جب ہم آدھی رات کو گھر واپس پہونچے تو آندھی اور طوفان کا زور کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ سردی بھی بلا کی تھی۔

گھر میں فرنیچر کے نام پر ایک میز، بید کی چند کرسیاں اور مونج کے تین پلنگ تھے۔ انہیں کمرے سے سرکا کر زمین پر چٹائیوں کا فرش بچھا دیا گیا تھا، آتش دان میں آگ جل رہی تھی۔ اس کے اوپر کارنس تھی، اور کارنس کے اوپر دیوار پر اسپین کی ایک مجاہد خاتون کی بڑی سی تصویر لگی تھی۔ اس کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں، سینہ ابھرا ہوا تھا جس کی دوشیزگی کو فوجی لباس بھی نہیں چھپا سکتا تھا، چہرہ آسمان کی طرف اٹھا ہوا تھا اور ہونٹ شدّتِ جذبات سے اینٹھے ہوئے تھے اور تصویر کے نیچے لکھا ہوا تھا، "TO DEATH"

دو اودھی لالٹینوں پر جلتی ہوئی مدھم بتیوں کی روشنی میں وہ تصویر اور بھی زیادہ پُر حوصلہ اور دل آویز معلوم ہو رہی تھی۔ کارنس کا سایہ تصویر کے اُبھرے ہوئے سینے تک پہونچتا تھا، اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ پُرجوش شکل موت کے اندھیرے سے زندگی کا پیغام لے کر اُبھر رہی ہے۔ ایک طرح وہ تصویر ہمارے رومانی اور انقلابی جذبات کی ترجمان تھی۔ ہم بھی موت سے نبرد آزما ہونا چاہتے تھے۔ اسپین ہمیں اپنا مُلک معلوم ہوتا تھا۔ کیوں کہ وہ فاشزم کے خلاف آزادی اور انسانیت کے حسین خوابوں کے لئے لڑ رہا تھا اسپین کی آزادی اپنی آزادی تھی، اور وہ مجاہد خاتون آج کی رات ہماری محفل میں شریک تھی، اور ہندوستانی کی آزادی کے متوالوں کا حوصلہ بڑھا رہی تھی۔ ع

"گے کہ گشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست"

کمرے میں سکون تھا، آگ اور دلوں کی حرارت تھی۔ کبھی کبھی باہر چلنے والی طوفانی ہوائیں اپنے ہزاروں ہاتھوں سے ہمارے دروازے کو جھنجھوڑ دیتی تھیں، اور کھڑکھڑاہٹ کی آواز کے ساتھ بالٹیوں پر جلتی ہوئی شمعوں کی لویں تھرتھرا جاتی تھیں۔ ہم بالٹیوں کے گرد حلقہ باندھے بیٹھے تھے، اور جلتی ہوئی موم بتیوں کی نرم روشنی میں ایک دوسرے کے جذبات اور محبت سے بھرے چہروں کو دیکھ رہے تھے جوش ملیح آبادی زیادہ دیر تک قبلۂ رندانِ جہاں کے فرائض انجام نہ دے سکے۔ رات کے جاگنے کے معاملے میں وہ ہمیشہ کچے ہیں۔ اس لئے جب جماہیوں نے انہیں زیادہ ستایا تو وہ یہ کہتے ہوئے رخصت ہوگئے کہ رات کو جاگنا اُلو کی خاصیت ہے۔

محفل کی گرمی بڑھتی گئی۔ دلوں کا سرور بڑھتا گیا، چہرے زیادہ روشن ہوتے گئے۔ اب یہ فرق کرنا مشکل تھا کہ یہ شاعری کا دَم ہے یا جاموں کی گردش۔ سب ہم عصر تھے، سب نووارد تھے، سب ایک حلقے میں بیٹھے تھے، سب کا الگ الگ انداز تھا اور پہچانی جاتی تھی۔ کسی قسم کے رشک، حسد یا معاصرانہ چشمک کا پتہ نہیں تھا۔ ایک دوسرے کی تعریفیں اس طرح ہو رہی تھیں جیسے عاشق معشوق سرگوشیاں کر رہے ہوں۔

فیضؔ نے کہا، "بھئی لاہور میں ایک بہت اچھا شعر سنا تھا، معلوم نہیں کس کا ہے" ؎

جب کشتی ثابت و سالم تھی ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے

جذبیؔ کا اداس چہرہ پھول کی طرح کھل گیا۔ یہ جذبی کا شعر تھا جو اس سے پہلے لاہور پہونچ کر مشہور ہو چکا تھا۔ فیض اور جذبی گلے ملے۔

ابھی فیض کو بیٹھنے کی بھی مہلت نہیں ملی کہ جذبی نے بغیر کسی تمہید کے فیض کی نظم "موضوعِ سخن" کو اپنے بے پناہ اور انتہائی دلگداز ترنم کے ساتھ پڑھنا شروع کر دیا، جو ہم نے چند ماہ قبل "نیا ادب" میں شائع کی تھی ؎

گُل ہوئی جاتی ہے افسردہ سُلگتی ہوئی شام
دھل کے نکلے گی ابھی چشمۂ مہتاب سے رات
اور مشتاق نگاہوں کی سُنی جائے گی،
اور اُن ہاتھوں سے مس ہوں گے یہ ترسے ہوئے ہات

باہر ہوائیں چنگھاڑ رہی تھیں، اور اندر جذبی کا ترنم طوفان برپا کر رہا تھا۔ فیض کے چہرے پر ایک معصوم اور تشکر آمیز مسکراہٹ تھی، ایک شاعر کے لئے اس سے بہتر داد اور کیا ہو سکتی تھی۔

جذبی نے پہلا بند پڑھا تھا کہ مجاز نے دوسرا بند اُٹھا لیا اور اپنا راگ چھیڑ دیا ؎

اُن کا آنچل ہے کہ رخسار کہ پیراہن ہے
کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے چلمن رنگیں
جانے اس زلف کی موہوم گھنی چھاؤں میں
ٹمٹماتا ہے وہ آویزہ ابھی تک کہ نہیں

اب دونوں نے باری باری ایک ایک بند گا کر نظم مکمل کی۔

جذبی کے ترنم کا تار ٹوٹنے نہیں پایا تھا کہ مخدوم کا راگ بلند ہوا۔ اُس کے ہاتھ میں دیوان حافظ تھا جس کی ایک غزل وہ گنگنا رہا تھا ؎

شاہ شمشاد قداں خسرو شیریں دہناں
کہ بہ مژگاں شکند قلب ہمہ صف شکناں
بر جبیں تکیہ مکن گر قدحے می داری
شادیٔ زہرہ جبیناں خورد و نازک بدناں

اس غزل نے محفل کو اور ہی رنگ دے دیا۔ زہرہ جبینوں اور نازک بدنوں کے نام کا جام کون نہیں پینا چاہے گا، اور اب مخدوم کی آواز تنہا نہیں تھی۔ سُریلی اور بے سُری سب آوازیں مل گئیں۔ حافظ کی غزل کا کورس دیر تک جاری رہا — دیوار پر اسپین کی مجاہد خاتون موت کی دعوت دیتی رہی — باہر ہوائیں دیوانہ وار دروازے کو کھٹکھٹاتی رہیں، مگر ہم لوگ سب سے بے نیاز حافظ شیرازی کے لفظوں میں حسینوں کے جام صحت پیتے رہے۔ نہ جانے کس کے دل میں کون سا حسین جھانک رہا تھا۔
یہ طوفان تھما ہی تھا کہ جذبی پھر اُٹھ کر کھڑا ہو گیا، اور اب ناچ ناچ کر "موضوعِ سخن" کو گانے لگا ؎

آج پھر حُسنِ دل آرا کی وہی دھج ہو گی
وہی خوابیدہ سی آنکھیں وہی کاجل کی لکیر
رنگِ رخسار پہ ہلکا سا وہ غازے کا غبار
صندلیں ہاتھوں پہ ہلکی سی حنا کی تحریر

اس کی آواز میں خستگی پیدا ہو گئی تھی، اس لئے اور بھی دل دوز ہو گئی تھی۔ اب وہ ایک ایک لفظ کو اتنا کھینچ کر گاتا تھا کہ سانس کا تار ٹوٹ ٹوٹ جاتا تھا۔
ہم نے بہ مشکل پکڑ کر اُسے بٹھلایا، لیکن وہ تڑپ کر پھر کھڑا ہو گیا۔ فیض کی "موضوعِ سخن" پھر محفل پر چھا گئی۔ لیکن تھوڑی دیر بعد جذبی کی آواز نے ساتھ چھوڑ دیا۔ پھر بھی وہ نظم سُنانے پر اصرار کر رہا تھا۔
اب تک فیض کی ایک ہی نظم اور وہ بھی جذبی کی زبان سے اتنی بار سُنی جا چکی تھی کہ سب لوگ تھک گئے تھے، اس لئے کسی نے خیال کو دوسری طرف موڑنے کے لئے جذبی سے اس کی نئی نظم "موت" کی فرمائش کر دی۔ اور جذبی کی ٹوٹی ہوئی آواز اور تھکے ہوئے ترنم نے اس میں ایک عجیب کیفیت پیدا کر دی ؎

اپنی سوئی ہوئی دنیا کو جگا لوں تو چلوں
اپنے غم خانے میں اک دھوم مچا لوں تو چلوں
اور اک جامِ مئے تند چڑھا لوں تو چلوں
ابھی چلتا ہوں ذرا ہوش میں آ لوں تو چلوں

ایسا لگ رہا تھا جیسے گذرتی ہوئی رات کے ساتھ جو آندھیوں کی رفتار سے صبح کی طرف جا رہی تھی، جذبی سفر کر رہا ہے۔ نجانے کتنی بار اُس نے یہ نغمہ سُنایا۔ بس اتنا یاد ہے کہ جب صبح ہوتے ہوتے آندھیاں ختم گئیں اور بالٹیوں پر جلتی ہوئی موم بتیاں

چھوٹے چھوٹے سکوں میں تبدیل ہوگئیں۔ اور ان کی تھرتھراتی ہوئی لویں دم توڑنے لگیں، اور کھانے کے لئے دسترخوان بچھا، تو جذبی بیچ دسترخوان پر کھڑا ہو اگا رہا تھا ؎

اپنے بھیگے ہوئے دامن کو سکھالوں تو چلوں

آدھی سے زیادہ محفل سو رہی تھی، اور جذبی کی ڈوبتی ہوئی آواز کے ساتھ مخدوم کا اداس ترنم سنائی دے رہا تھا، جو صرف اپنے لئے گنگنا رہا تھا ؎

خلوتِ رنگیں میں بھی ڈستا ہے یوں دنیا کا حال
جیسے پیتے وقت بھوکے بال بچوں کا خیال

ایک اور رات ختم ہوگئی، جو پھر کبھی نہیں آئے گی۔ ایک اور دن شروع ہوگیا، اور دیوار پر لگی ہوئی اسپین کی مجاہد خاتون کی تصویر ہمیں زندگی کی جد و جہد کی طرف چلنے کی دعوت دے رہی تھی۔

"— فیض، بڑے خوش فکر شاعر ہیں۔ میجر اور لفٹننٹ کے خطابات اُن کی ادبی اور شاعرانہ صلاحیتوں کے ساتھ بے ادبی کا درجہ رکھتے ہیں۔ شاعری کا مسلک اشتراکی ہے اور کلام نے کسی شوخ حسینہ کی چشم غزالاں سے بہت سے اشارے چُرا کر رکھے ہیں۔ دل سے رومانی اور آنکھوں سے نفسیاتی معلوم ہوتے ہیں۔ احساس کی شدت جگہ جگہ لطیف انگڑائیاں لیتی جاتی ہے۔ زندگی کی تلخیوں کا ذکر اس طرح مسکرا مسکرا کر کرتے ہیں جیسے کوئی نئی بیاہی دلہن شوہر کی زیادتیوں کا شکوہ بڑی بہن سے کرتی ہے۔ بحر اور وزن دونوں کے قائل ہیں۔ بعض بعض نظموں میں قافیہ پابند نظموں سے ناخوش ہو کر ہڑتال کئے نظر آتے ہیں۔ مگر نظموں کے چہروں پر وہی شادابی اور شگفتگی پائی جاتی ہے جو کلرکوں کے چہروں پر تنخواہ والے دن نظر آتی ہے۔ پورا کلام "نو عمر الفاظ" اور "دوشیزہ بندشوں" کے پھولوں میں گندھا ہوا ہار معلوم ہوتا ہے عقائد میں پختگی اور "بوڑھا پن" پایا جاتا ہے۔ امید کا دامن کٹکٹا کر دانت سے پکڑے رہتے ہیں۔ جب آزاد نظم لکھتے ہیں تو اُس کے بول بعض اوقات کبوتر کی غٹرغوں کا سا ترنم پیدا کر دیتے ہیں۔ پابند شعر بڑے سلیقے سے کہتے ہیں۔

——— غلام احمد فرقت

حمید اختر

فیض شخصیت کی چند جھلکیاں

فیض کے متعلق گفتگو کے دوران، ایک دفعہ ایک ماہر و مغنیہ نے مجھ سے کہا تھا کہ "میں فیض پر مرتی ہوں۔ لیکن یہ فیصلہ نہیں کر سکی کہ وہ میرے کیا لگتے ہیں، میں انھیں اپنا معشوق سمجھوں یا عاشق، باپ تصور کروں یا بیٹا یا شوہر۔ یہ فیصلہ کرنا میرے لئے مشکل ہے۔ بہرحال میں فیض کو اتنا چاہتی ہوں، اتنا چاہتی ہوں کہ تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

فیض کی شخصیت (بلکہ محبوبیت) پر اس سے بہتر تبصرہ شاید ممکن نہیں ہے۔ ان کی شاعری پر تبصرہ کرنا میرا کام نہیں ہے مگر میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ فیض کی زندگی اور شخصیت پیار اور محبت کی ہر معصوم شکل کا مجموعہ ہے۔ ہمارے ایک مرحوم دوست نے جن کا تقاضا ہمیشہ یہ ہوتا تھا کہ میں ہر شام فیض کو گھیر کر ان کے گھر لے جاؤں، ایک دفعہ بھری مجلس میں یہ اعلان کر کے، پوری محفل کو حیرت میں ڈال دیا کہ فیض کا کلام ان کی سمجھ میں نہیں آتا مگر وہ فیض کے عاشق ہیں۔ یہ دوست زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے مگر یاروں کے یار تھے۔ فیض کو مرحوم کی یہی ادا پسند تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایک دفعہ بیگم فیض نے ان کے گھر جانے سے محض اس لئے انکار کیا کہ ان کی نظر میں یہ دوست بڑے بور تھے تو فیض تلملا اٹھے۔ یہاں بوروں کے بارے میں موصوف کے اس مفروضے کا ذکر بھی بے جا نہ ہوگا کہ "کوئی بور ہرگز قابل برداشت نہیں ہے، ماسوا اس بور کے جو آپ کا دوست ہے۔"

دوستی محبت اور خلوص کا یہی سرچشمہ اگر ناموروں، فنکاروں، دانشوروں اور ان جیسے لوگوں تک کی محبت کا مرکز ہے تو اس کی وجہ بڑی آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے۔ فیض کے دوستوں میں اہل علم، کم علم بلکہ بے علم لوگ بھی بڑی کثیر تعداد میں شامل ہیں۔ وہ محکمے بھی جن کا کام ایسے لوگوں کی نگرانی کرنا ہے دوستوں اور ہمدردوں سے بھرے پڑے ہیں، ان کے دوستوں میں فلم آرٹسٹ، گانے والے، ادیب، شاعر، طلباء، سرکاری محکموں کے ملازم، فوج اور پولیس بلکہ خفیہ پولیس کے افسروں غرض کہ ہر طبقے اور ہر قسم کے لوگ شامل ہیں۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے جیسے لوگوں نے فیض کو پڑھا کم ہے ان سے محبت زیادہ کی ہے۔ وہ بڑے شاعر ہیں۔ انھوں نے شعراء کی ایک پوری نسل کو متاثر کیا ہے اور جدید شاعری کو ایک نیا اسلوب دیا ہے لیکن بحیثیت انسان کے وہ اس شاعر سے بھی بڑے ہیں جس کو ایسے لوگ صرف اس کے کلام کے واسطے سے جانتے ہیں۔ وہ اگر شعر نہ کہتے تب بھی اتنے ہی بڑے آدمی ہوتے۔

دوستوں کی کمزوریوں کو نظر انداز کرنے میں ان کا ثانی مشکل ہی سے ملے گا۔ دوست کہلا جانے کے اہل لوگوں کو دھوکہ دینے والے پیشہ وروں کے لئے صلائے عام ہے کہ وہ فیض کے پاس پہنچیں کیونکہ وہ ان کو پہچان کر بھی دھوکہ کھا جائیں گے اور بعد میں معاف کر دیں گے بشرطیکہ آپ ان کے پاس جتنا تم چاہو لے جاؤ اور ... جاتے تھے اور کسی بدطینت اور ذلیل دشمن کے

مگر وہ کارناموں کا ذکر کرنے کے بعد ہمدردی کے طالب ہوں گے تو آپ کو مایوسی ہوگی کیوں کہ آپ کی الم ناک داستان ختم ہونے سے پہلے ہی وہ سگریٹ کا ایک مبا کش لیں گے پھر ایک مہین سی ہوں کی آواز آئے گی اور اگر آپ اس کے بعد بھی اس بارے میں ان کی رائے معلوم کرنے پر مصر ہوں گے تو آپ کو "چلو چھوڑو" کے سوا کچھ سننے کو نہیں ملے گا۔

یہ بات نہیں ہے کہ فیض کو غصہ نہیں آتا۔ غصہ ان کو بھی دوسرے خاکی انسانوں کی طرح آتا ہے مگر غصہ ضبط کرنے میں انھیں جو کمال حاصل ہے وہ بہت کم لوگوں کی قسمت ہے، ہم نے بڑے بڑے بدباطنوں کی خباثتوں کا مظاہرہ بھی دیکھا ہے جنھوں نے فیض پر کیچڑ اچھالنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر آخر میں منہ کی کھا گئے۔ تین برس پہلے جب ان پر دل کی بیماری کا حملہ ہوا تو اکثر دوستوں کا خیال تھا کہ یہ عارضہ اس غیر معمولی ضبط و تحمل کا نتیجہ ہے۔ ہو سکتا ہے یہ اندازہ صحیح ہو لیکن حساس آدمی کے لئے اپنے بارے میں غلط الزامات سن کر خاموش رہنا بھی بڑا مشکل کام ہے۔ اور فیض یہ کام بڑی مدت سے کر رہے ہیں۔ یہ کتنا بڑا ستم ہے کہ ہمارے معاشرے میں بڑے سے بڑے محب وطن، دانشور اور محبوب ترین افراد بھی مفاد پرستوں، خود غرض منددل اور کرائے کے ٹٹوؤں کے حملوں کا شکار ہو جاتے ہیں اور ان سے پوچھنے والا کوئی نہیں ہوتا، ان کے مخالفوں میں طرح طرح کے لوگ شامل ہیں۔ مثلاً حال ہی میں ایک مشہور صحافی نے جو ابتداً ایک روزنامے کے مالک تھے، بعد ازاں ایک اخبار کے مدیر اعلیٰ بنے اور ان دنوں مختلف اخبارات میں ہفتہ وار کالم لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ اس بات پر سخت غم و غصہ کا اظہار کیا تھا کہ فیض کو لندن اور ماسکو سے واپس آئے ہوئے کئی مہینے ہو گئے ہیں لیکن ان کے اعزاز میں ہونے والی دعوتوں کا سلسلہ رکنے ہی میں نہیں آتا۔ انھوں نے اس بات پر سخت تشویش ظاہر کی تھی کہ فیض کے اعزاز میں ایسی دعوتیں بھی ہوتی ہیں جن میں کوئی نہ کوئی مغنیہ گا کر ان کا کلام سناتی ہے۔"

ایسے بیمار لوگ ہر معاشرے میں موجود ہوتے ہیں مگر مہذب معاشرہ ایسے لوگوں کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ شرفا کی پگڑیاں اچھالتے رہیں۔ ہمارے ہاں بدقسمتی سے سرکار دربار میں رسوخ حاصل کرنے کے لئے بھی لوگ فیض جیسوں کو تختہ مشق بنانا شروع کر دیتے ہیں حالانکہ اگر یہ لوگ اس ضمن میں فیض سے مشورہ حاصل کریں اور ان سے صاف کہہ دیں کہ آپ کی ذات پر حملہ کرنے سے ہمیں ذاتی طور پر فائدہ پہنچ سکتا ہے تو فیض انھیں خود اپنے خلاف نظمیں اور مضامین لکھ دیا کریں لیکن جب یہ لوگ بے خبری میں حملہ کرتے ہیں تو اس کا دکھ فیض کو بھی ہوتا ہے۔ اس کا اظہار وہ بھلے ہی نہ کریں۔

دوستوں اور چاہنے والوں کی حد تک فیض بڑے خوش قسمت واقع ہوئے ہیں۔ ان کے دشمنوں کی صفیں بھی چاہنے والوں سے بھری پڑی ہیں اس کی ایک وجہ دوستی کے مقررات کے سلسلے میں ان کی روایت پرستی ہے۔ وہ اپنے دوستوں کے لئے ہر ممکن قربانی دینے کو تیار رہتے ہیں۔ چند برس پہلے ان کے ایک پرانے دوست بے روزگار ہوئے تو فیض ان کے لئے کام مہیا کرنے کی فکر میں مدتوں غلطاں و پیچاں رہے۔ آخر میں جو کام ان کی کوششوں سے ملا وہ مشکل تھا چنانچہ ان کے بعض قریبی دوستوں نے اندیشہ ظاہر کیا کہ یہ کام آپ کے دوست کے بس کا نہیں ہے۔ اور اگر وہ اپنے فرائض بخوبی انجام نہ دے سکے تو آپ کی پوزیشن خراب ہوگی۔

فیض نے حسب معمول سگریٹ کا ایک لمبا کش لگایا اور صرف یہ کہنے پر اکتفا کیا۔ "کوئی بات نہیں ہے بے چارے کو روٹی تو ملنے لگے گی، بعد میں دیکھ لیں گے کیا ہوتا ہے۔"

کسی وجہ سے یہ موقع ہاتھ سے نکل گیا۔ تو فیض نے دو تین مہینے کی باقاعدہ جدوجہد کے بعد ان کے لئے ایک نیا ادارہ قائم کرایا اور یہ دوست کئی برس تک اس باتنخواہ ادارے کے ساتھ منسلک رہے۔ اس ڈرامے کا ڈراپ سین بڑا دلچسپ ہے اور وہ یہ کہ یہ بزرگ پہلی آزمائش ہی میں لڑھک گئے اور فیض کے دشمنوں کی طرف سے شروع کی جانے والی ایک مہم میں باقاعدہ شامل ہو گئے۔ اس وجہ سے فیض کے اکثر دوست ان سے ناراض ہیں۔ مگر

حضرت فیض کے آج بھی ان سے ویسے ہی مراسم ہیں اس لئے کہ انھوں نے "چلو چھوڑو کوئی بات نہیں ۔" کہہ کر انھیں معاف کر دیا۔ مجھے یقین ہے کہ آئندہ بھی جب یہ دوست فیض کی مدد طلب کریں گے انھیں مایوسی نہ ہوگی ۔

انسان اتنی کمزور مخلوق ہے اور حالات نے اسے اس حد تک بے بس کر رکھا ہے کہ اسے معاف کئے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے لیکن معاف کرنے والا بھی انسان ہی ہو اور اسے اپنے آپ پر اتنا قابو ہو تو اس کے حوصلے کی داد دینا ہی پڑتی ہے ۔ فیض تو ایک اتھاہ سمندر ہے جس کی گہرائی کا کوئی اندازہ نہیں ہے ۔ ان کے پاس بیٹھ کر مجھے ہمیشہ سمندر کے قرب کا احساس ہوتا ہے بے پایاں وسعت اور کشادگی کا احساس ہوتا ہے ۔ یہ سمندر متلاطم اور مواج سمندر نہیں ہے ۔ اس کی سطح پر سکون ، ٹھہراؤ اور روشنی اور زندگی کے نمونے نشان ملتے ہیں ۔ اس ناپیداکنار سمندر کی گہرائی میں کون سے اسرار پوشیدہ ہیں ۔ اس کا اندازہ کرنا بہت مشکل ہے ۔

یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ ایک شخص جسے درد سینے اور اس کا بوجھ اٹھانے کا اس حد تک ملکہ حاصل ہے کہ اس کی پوری شاعری اس کے آہنگ میں ڈوبی ہوئی ہے لیکن یا اس قدر پرسکون اور مطمئن نظر آتا ہے ۔ فیض کو کسی سے جھگڑتے ، کسی پر ناراض ہوتے یا کسی کی مخالفت کرتے بہت کم لوگوں نے دیکھا ہوگا ، اصل میں وہ چاہتے ہیں کہ دنیا کا ہر آدمی مطمئن و مسرور نظر آئے ۔ اس کوشش میں وہ اکثر اپنا سکون بھی برباد کر لیتے ہیں لندن سے واپس آئے ہوئے انھیں بمشکل چار چھ ماہ ہوئے ہیں مگر ان کے شناسا اور شناساؤں کے جاننے اور ان سے واقفیت رکھنے والے اکثر اصحاب جن میں ہر قسم اور ہر طبقے کے لوگ شامل ہیں ان کے پاس روزگار اور کام حاصل کرنے کے لئے پہنچ رہے ہیں اور فیض کے دوستوں کو اس بات کا بخوبی علم ہے کہ کیسے کیسے لوگ اس عرصے میں ان کی سفارشی چٹھیاں لے کر پہنچے ہیں بے روزگاری ہمارے ہاں اس حد تک عام ہے کہ اس کے متعلق لوگوں نے غور و فکر کرنا ہی چھوڑ دیا ہے ۔ ہر شہر ، ہر گاؤں اور ہر گھر میں بے روزگار موجود ہیں ۔ ہمارے آپ کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ تمام تر نیک خواہشات کے باوجود ان کے لئے کام مہیا کریں مگر فیض ساری دنیا کو خوش دیکھنا چاہتے ہیں ۔ اور جب ایسا نہیں ہوتا تو اداس ہو جاتے ہیں ۔ ایلیس ، بیگم فیض اگر دو اور دو چار کی طرح سوچنے کی عادی نہ ہوتیں یا اپنی سطح کی طبیعت کی وجہ سے وہ بیگم کی ہر بات مان لینے کی عادت نہ ڈال لیتے تو ان کے گھر میں دنیا بھر کے بیکار ، بے روزگار اور رنگا رنگ قسم کے بے فکر لوگ جمع ہوتے ۔ بزرگ کہتے ہیں کہ جب دو روحوں کا ملاپ ہوتا ہے تو قدرت ایک دوسرے کی کمی پوری کرکے جوڑوں میں توازن پیدا کرنے کا خود اہتمام کر دیتی ہے ، میاں اگر بے فکر یا فضول خرچ ہے تو بیوی جز رس ہوگی ۔ ایک کی ناعاقبت اندیشی دوسرے کی دوررس نگاہوں کی وجہ سے اپنا اثر کھو کر بیٹھے گی ، فیض اور بیگم فیض کی حد تک یہ مقدمہ معجزانہ طور پر صحیح معلوم ہوتا ہے ۔ فیض کی بیگم اگر ایلیس کی بجائے کوئی اور خاتون ہوتیں تو معلوم نہیں موصوف کا کیا حشر ہوتا ۔

جو لوگ عام زندگی میں فیض سے ملتے ہیں یا انھیں اٹھتا بیٹھتا دیکھتے ہیں ، انہیں اس بات کا اندازہ نہیں ہوتا کہ فیض اعلیٰ درجے کے منتظم بھی ہیں ۔ یہ بات دوسری ہے کہ انتظامی امور کے متعلق ان کا انداز دوسروں سے یکسر مختلف ہوتا ہے اور وہ اپنے ماتحتوں یا ساتھ کام کرنے والوں پر حکم چلانے کے بجائے پیار ، محبت اور شفقت سے دگنا کام لیتے ہیں ۔ یوں تو ہمارے ہاں عام طور پر شاعروں کو لوگ نا کارہ اور کسی ذمہ داری کے قابل نہیں سمجھا جاتا ۔ فیض تو عام زندگی میں ظاہراً سست اور کاہل نظر آتے ہیں اور بات کرنے میں بھی حتی الوسع بخل سے کام لیتے ہیں ۔ جس آدمی نے کبھی اپنے ہاتھ سے اپنے ناخن تک نہ کاٹے ہوں اس کے بارے میں تنظیمی صلاحیت کے فقدان کا فیصلہ کر لینا غلط نہ ہوگا ۔ جس زمانے میں وہ جیل میں تھے یا جب وہ بیرون ملک گئے ہوئے تھے ۔ ان کی چھوٹی لڑکی منیزہ کو یہ پریشانی رہی کہ وہاں ان کے ناخن کون کاٹتا ہوگا ۔ جیل میں تو خیر مشقتی مل جاتے ہیں مگر جب وہ ماسکو روس میں تھے تو بچی کی پریشانی انتہا پر تھی ۔ معلوم نہیں ان کے ساتھ وہاں پر کیا گزری ، بہرحال جب وہ واپس آئے تو ان کے ناخن کٹے ہوئے تھے

اس کے باوجود ان کی تنظیمی صلاحیت کا اندازہ آرٹس کونسل لاہور کی حالت سے کیا جا سکتا ہے جن لوگوں نے اس ادارے کی زبوں حالی کا مشاہدہ فیض کے چارج لینے سے پہلے کیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ اس عمارت پر اصطبل کا گمان ہوتا تھا۔ نیشنل آرٹس گیلری کی تصویروں پر مٹی کی موٹی تہہ جمی ہوئی تھی۔ عمارت کے احاطے میں کتے لوٹتے تھے۔ تہذیبی سرگرمیوں کا نام ونشان تک نہ تھا۔ لیکن فیض کے آتے ہی یہ عمارت لاہور میں تہذیبی سرگرمیوں کا سب سے بڑا مرکز بن گئی۔ دو سال کی مدت میں فیض نے اس کی بنیادوں کو اتنا مضبوط بنا دیا کہ اب اس کے زوال کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔

زندگی کے متعلق فیض کا نقطۂ نظر انتہائی صحت مندانہ ہے مگر دیکھنے والوں کو وہ ہمیشہ بڑے "مغموم" نظر آتے ہیں، جب تک دنیا سے دکھوں اور غموں اور نفرتوں اور کدورتوں کا خاتمہ نہیں ہو جاتا وہ بڑے مغموم رہیں گے۔ مشکل یہ ہے کہ دکھ اور غم اور منافقت کے خاتمے کی کچھ زیادہ امید نہیں ہے۔ اسی وجہ سے ہم نے آپ نے اور ہمارے جیسے لاکھوں کروڑوں دوسرے انسانوں نے ان حقیقتوں کو قبول کر لیا ہے مگر فیض اندر ہی اندر سلگتے ہیں۔ دیکھنے میں وہ انتہائی "ذلیل" قسم کی محنت کرنے والوں کو تو "بور" نظر آتے ہیں۔ مجلس میں بیٹھے ہوئے وہ اکثر مجلس سے باہر نظر آئیں گے مگر شام کو محفل برپا کرنے کی انھیں ہمیشہ خواہش رہتی ہے۔ دوستوں سے مل بیٹھنے اور ہاؤ ہو کرنے کے لئے وہ شام کو ہر کام چھوڑنے پر تیار ہوں گے۔ جس زمانے میں وہ پاکستان ٹائمز لاہور کے مدیر تھے، اداریے بالعموم شام کی محفلوں کے اختتام پر، پریس میں کمپوزیٹروں کے برابر بیٹھ کر لکھتے تھے۔ موضوع کا انتخاب تو ہمیشہ صبح کو ہو جاتا تھا لیکن پریس والوں کو اداریہ رات کے دس گیارہ بجے سے قبل کبھی نہیں ملتا تھا۔ پاکستان ٹائمز کے عملے کا خیال تھا کہ وہ کام کو آخر وقت تک ٹالتے ہیں۔ اور جب فرار کے تمام راستے مسدود ہو جاتے ہیں۔ اس وقت اس بوجھ کو اتارتے ہیں مگر خیال میں یہ رائے درست نہیں ہے۔ اصل میں وہ دن بھر اپنے موضوع کے متعلق سوچتے رہتے تھے اور اس دوران میں غائب دماغی کے مظاہرے بھی کرتے رہتے، دن بھر یا شام کو ملنے والے اور محفل میں ان کے ساتھ بیٹھنے والے انھیں غیر حاضر پاتے تو شاعر سمجھ کر معاف کر دیتے حقیقتاً وہ آخر وقت تک اپنے اداریئے کے متعلق سوچتے رہتے تھے اور اس کے بعد لکھتے تھے۔

مجلسی زندگی کی محبت اور لگن فیض کو لاہور اور امرتسر کے دوستوں کی صحبتوں سے ملی ہے۔ زندگی کا بیشتر حصہ انھوں نے انھیں دو شہروں میں گزارا ہے۔ چنانچہ ان کی روایات ان کے خون میں رچی بسی ہیں میں نے کچھ برس پہلے یہ پیشن گوئی کی تھی کہ فیض وطن سے باہر نہیں رہ سکتے۔ ان کے قریبی دوست جانتے ہیں کہ گزشتہ دو تین برس میں لوگوں نے کس طرح انھیں ملک سے باہر رکھنے کی کوشش کی ملک سے باہر انھیں کتنی بڑی بڑی پیش کشیں ہوئی۔ نام اور دولت اور اطمینان دہ آسودگی غرضیکہ پاکستان سے باہر رہ کر انھیں زندگی کی ہر آسائش میسر ہو سکتی تھی۔ ان کے دوستوں نے ہمدردی میں اور دشمنوں نے اپنی مخصوص اغراض کے تحت ان کو وطن واپس آنے سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن جس شخص کی روح میں، وطن کی مٹی کی باس رچی ہو اور جسے اس کے پھولوں، بہاروں، نگاروں اور اس کے پتے پتے سے والہانہ عشق ہو، وہ وطن کی محفلوں، ہواؤں، دریاؤں، چشموں اور سب سے بڑھ کر لوگوں سے کیسے دور رہ سکتا ہے۔ فیض کے خمیر میں حب الوطنی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے اس لئے وہ ملک سے باہر کبھی بھی نہیں رہ سکتے۔ وہ لندن اور ماسکو اور کیوبا اور الجزائر میں گھومتے ہوئے بھی، اپنے وطن، اپنے شہر اور اپنے دوستوں، کو فراموش نہیں کر سکے ملک سے ڈیڑھ دو برس کی غیر حاضری کے دوران انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ پچھلے یہ دن رات انھوں نے کیسے کاٹے ہیں اور غریب الوطنی کے احساس نے انھیں کیا کیا چرکے لگائے ہیں۔

عوام دوستی، شاعرانہ صلاحیت اور تنظیمی استعداد کے باوجود فیض نے بڑا شاہانہ مزاج پایا ہے یہ چیز انھیں ورثے میں ملی ہے۔ ان کے

والدین کے پاس بہت آ جاتی تھی لیکن وہ کبھی کنبے کو، دوستوں کو اور ملنے والوں کا گھر بھر پالتے رہے، کسی کو ولایت بھیج رہے ہیں کسی کو تعلیم دلا رہے ہیں کسی کی شادی کرانے چلے ہیں۔ لہٰذا والد کی وفات کے بعد خاندانی ملکیت کا خاصا بڑا حصہ بیچ کر قرضہ اتارا گیا، فیض کو اپنی وراثتی جاگیر سے عملاً شاہانہ مزاج کے سوا کچھ نہیں ملا۔ اس کے باوجود ضرورت مندوں کی مدد کرنے میں ان کو بڑی مسرت ملتی ہے۔ حتیٰ کہ اگر آپ ان کے دوست ہیں اور جس لڑکی سے عشق کر رہے ہیں اس کے والدین شادی کے لئے رضامند نہیں ہوتے تو فیض رشتہ طے کرانے کی خاطر خود ساتھ چلنے کی پیشکش کر دیں گے، ایسے دوستوں کو ملامت بھی کریں گے جو ناکام عاشقوں کے زمرے میں شامل ہو جاتے ہیں۔ غالباً وہ ان کے دکھ درد کو ذاتی طور پر محسوس کرتے ہیں اور اس کرب میں خود کو مبتلا پاتے ہیں۔ جو قبیلۂ عاشقاں کے لئے مخصوص ہے ان سے اور کچھ نہیں بن پڑتا تو نامراد عاشقوں کو "بک اپ" کرنے اور دوبارہ قسمت آزمائی کرنے کا مشورہ ضرور دیتے ہیں۔

ان کے شاہانہ مزاج کا ایک دلچسپ قصہ اور سن لیجئے۔

بی اے کرنے کے بعد جب انھیں ایم اے میں داخلے کے لئے گھر سے پیسے ملے تو لاہور پہنچ کر انھوں نے کل رقم جشن مے نوشی اور "ہاؤ ہو" کی نذر کر دی جو کچھ بچا وہ کالج پہنچ کر پتہ چلا کہ بہت کم ہے اور داخلے کے لئے مزید دو سو روپے درکار ہیں۔ ان کے پاس صرف نو روپے بچے تھے۔ معلوم ہوا کہ عربی ایم اے کلاس میں داخلے کی فیس نو روپے ہے چنانچہ انھوں نے سو روپے جمع کرکے انگریزی کے بجائے عربی ایم اے میں داخلہ لیا اور دو سال پورے کئے اسکے بعد پھر انگریزی میں ماسٹر کی ڈگری حاصل کی۔

فیض کو کوئی کام نہ ہو اور انھیں گھر ہی پہ رہنا ہو تو وہ بڑے ٹھاٹھ سے دن گزاریں گے، مثلاً دیر تک بستر میں بیٹھ کر چائے پیتے رہیں گے، اخبار پڑھتے رہیں گے، اور مطالعہ کرتے رہیں گے، فرصت میں یہی ان کے محبوب مشغلے ہیں۔ نہانے سے موصوف حتی الامکان گریز کرتے ہیں۔ بیگم کے اصرار پہ بادل ناخواستہ غسلخانہ کا رخ کرتے ہوئے بھی یہ ضرور پوچھیں گے کہ کیا نہانا ضروری ہے۔ البتہ شام کو وہ اکیلے نہیں بیٹھ سکتے جب روز و شب ملتے ہیں اور شفق کی سرخی آسمان پر چھا جاتی ہے اور رات تاریکی کا بیکراں دبیز پردہ لے کر پہنچتی ہے تو وہ اس کی تاریکی اور سناٹے اور خاموشی اور ویرانی سے بچ نکلنے کے لئے زندگی کے دکھوں کو بھولنے کی خاطر اور پرانے زخموں کو ڈھانپنے کے لئے رندوں کی محفل کے متلاشی ہوتے ہیں، ایسی محفل جہاں ان کے جیسے لوگ ہوں جہاں حسن کی، عشق کی محبت اور مسرت کی باتیں ہوں اور جہاں بیٹھے بیٹھے رات کی گرانباری کے ختم ہونے اور صبح کے سجیلے قدموں کے پہنچنے کا احساس تیز تر ہو سکے۔

— "کیا تم اپنے شوہر کی شاعری سمجھ لیتی ہو؟" یہ سوال مجھ سے اکثر کیا گیا ہے، اور میں نے کافی غور و خوض کے بعد اس کا ایک ایسا جواب ڈھونڈھ لیا ہے جو میرے خیال میں صداقت پر مبنی ہے اور حرفِ آخر کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ میرا جواب ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ میں اُن کی شاعری کو سمجھنے کا دعویٰ تو نہیں کرتی، لیکن یہ دعویٰ ضرور ہے کہ میں شاعر کو سمجھتی ہوں۔ اور کسی شاعر کی شخصیت ہی اُس کی شاعری کا سرچشمہ اور اس کے وجدان کی قوتِ متحرکہ ہوتی ہے۔

— ایلس فیض

شیر محمد حمید

فیض - آئینہ خانے میں

"دستِ تہِ سنگ" کا شاعر اب کسی رسمی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ اس کی شاعری اس مقام سے بہت آگے بڑھ چکی ہے جہاں شاعر تقریظ و تبصرہ کا ضرورت مند ہوتا ہے۔ فیض مقبولیت کی بہت بلند سطح پر پہنچ چکا ہے۔ اس کی شہرت پاک و ہند کے نیم براعظم سے نکل کر دور دور اجنبی دیسوں کی سرحدوں کو چھو رہی ہے۔ اس کا آفاقی تخیل، اس کا منفرد اسلوب، نرم و دل آویز لہجہ، سبک و شیریں استعارے قبولِ عام کی سند حاصل کر چکے ہیں۔ لیکن ان سطور کی تحریر کا مقصد فیض کی شاعری کے محاسن و معائب کا بیان، اس کی شاعرانہ عظمت یا معاصرین میں اس کے مقام کا تعین کرنا نہیں ہے۔ یہ کام تو اربابِ نقد و نظر کا ہے۔ اس قسم کا محاکمہ یا موازنہ میرا موقف نہیں ہے اور میں اس کا اہل بھی نہیں ہوں۔ میری غرض و غایت صرف یہ ہے کہ فیض کی زندگی کے چند چیدہ چیدہ گوشے ایسے اہم واقعات سرسری طور پر بیان کر دوں جو میرے خیال میں اس کی زیست اور اس کی حیاتِ شاعری پر اثر انداز ہوئے ہیں جن کے باعث فیض کے خیالات، اس کے طرزِ زندگی اور اس کے مطمحِ نظر میں انقلابی تبدیلیاں آئی ہیں۔ ان واقعات کی اہمیت سمجھ لینے سے اس کی شخصیت، اس کے مقاصد، اس کے نقطۂ نگاہ کے تغیرات اور شاعری کے موڑ سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

فیض کی پبلک زندگی کا آغاز اس وقت ہوا جب وہ انگریزی روزنامہ پاکستان ٹائمز کے اجرا پر اس کے پہلے ایڈیٹر مقرر ہوئے صحافت اور سیاست کی دنیا میں ان کا نام خاص و عام کے سامنے آیا۔ اس وقت سے لے کر اب تک ان کی زندگی ایک کھلی کتاب کی صورت میں اہلِ نظر کے سامنے ہے۔ اس کے شب و روز، اس کا رہن سہن اس کے طور طریق کسی نگاہ سے پوشیدہ نہیں۔ وہ جو کچھ سوچتا ہے اخبار کے ایڈیٹوریل کالموں میں عوامی مجالس یا نجی محافل میں پیش کرتا رہا ہے! اس کے محسوسات شعروں کے قالب میں ڈھل کر خاص و عام کے حق نیوش کانوں تک پہنچتے رہے۔ وہ جو کچھ کرتا ہے حقیقت بیں نگاہوں کے سامنے ہے۔ لیکن فیض کی ابتدائی زندگی کے بعض اوراق ایسے ہیں جن تک عام نگاہوں کی رسائی نہیں۔ اس کے آغازِ بلوغت کے اکثر حادثات نظروں سے اوجھل رہے ہیں ان کی اہمیت عام دلچسپی کی نہ بھی ہو لیکن فیض کی شخصیت، اس کے مزاج کی ساخت، اس کی طبیعت کی افتاد، اس کے سوچنے کا انداز، اور سب سے بڑھ کر اس کی شاعری کا رنگ روپ سمجھنے کے لئے ان کا علم بہت ضروری ہے۔ شاعر اپنے ماحول کی پیداوار ہوتا ہے اس کی شاعری اس کی داخلی زندگی کا عکس اور اس کے گرد و پیش کا آئینہ ہوتی ہے۔ راقم الحروف کو فیض کے اس دورِ حیات کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے

اس کی مسرتوں میں شریک ہونے اور اس کے غموں میں غمگساری کی سعادت نصیب ہوتی ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ پردوں کو ہٹا کر ان اوجھل گوشوں کو روشنی میں لانا میرا حق بھی ہے اور فرض بھی اور میری اس ہرزہ سرائی کا صرف یہی جواز ہے۔

۱۹۲۹ء میں میں گورنمنٹ کالج لاہور میں تھرڈ ایئر کا طالب علم تھا۔ چونکہ فرسٹ ایئر میں ہی اس کالج میں داخلہ لے لیا تھا اس لئے دو تین برس کی مدت میں دوستوں کا حلقہ کافی وسیع ہو چکا تھا۔ ان میں چند مخلص اور ہم خیال دوست ایسے بھی میسر آ گئے تھے جن کی دوستی اور رفاقت پر اب تک فخر ہے۔ ہماری رہائش ان دنوں نیو ہوسٹل میں تھی ——— اور آخر اکتوبر کی ایک شام کا ذکر ہے کہ ہم سیر کے ارادے سے نکلے، چوک کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ ایک لڑکا جنگلے کا سہارا لئے دنیا و مافیہا سے بے خبر، محویت کے عالم میں ٹکٹکی لگائے کھڑا کہیں دُور دھندلکوں میں دیکھ رہا ہے۔ ہم اس کے بہت قریب آ گئے مگر اس کی محویت میں کوئی فرق نہ آیا۔ میں نے دوستو کو بتایا کہ کئی روز سے میں اس نوجوان کو ہر شام اسی جگہ یونہی کھویا کھویا سا گم سم کھڑا دیکھ رہا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کالج میں نووارد ہے اور ابھی کسی سے شناسائی نہیں۔ نبی احمد نے معاً کہا "آؤ آج ہم اسے دوست بنائیں۔" ہم نے پاس جا کر اسلام علیکم کہا لیکن نوجوان بدستور خود فراموشی کے عالم میں کالج ٹاور سے بھی پرے نظر جمائے کھڑا رہا۔ نبی احمد نے بلند آواز سے دُہرایا جناب اسلام علیکم! وہ ایک جھٹکے سے اس گم شدگی کی کیفیت سے بیدار ہوا۔ نیم باز آنکھوں سے ہمیں دیکھا اور خفیف سی مسکراہٹ سے ـــ وعلیکم اسلام کہا۔ میں نے کہا "گستاخی معاف ہم نے آپ کی محویت میں مخل ہونے کا تصور کیا ہے، اسے ہماری مجبوری سمجھئے، ہم آپ کی تعریف جاننے کے مشتاق ہیں۔"

"میرا نام فیض ہے میں نے مرے کالج سیالکوٹ سے ایف اے پاس کیا ہے اب یہاں گورنمنٹ کالج میں تھرڈ ایئر میں داخلہ لیا ہے۔ اور نیو ہوسٹل میں جگہ ملی ہے۔"

"میں بھی تھرڈ ایئر میں ہوں۔ میرا نام شیر محمد ہے۔ یہ نبی احمد ہیں اور فورتھ ایئر میں ہیں، یہ آغا حمید ہیں ہم سب اسی ہوسٹل میں رہتے ہیں، مگر آپ یوں تن تنہا کیوں کھڑے رہتے ہیں۔؟ ———"

"میں نووارد ہوں۔ یہاں میرا کوئی دوست نہیں۔ شناسا بھی نہیں، میں سیالکوٹ سے اکیلا ہی یہاں آیا ہوں۔" نبی احمد نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "تو آئیے آج سے ہم باہم دوست بن جاتے ہیں۔"

وہ دن اور آج کا دن، تیس سے اوپر برس ہو چکے وہ دوستی اب تک برقرار ہے۔

تھوڑے دنوں میں ہم آپس میں گھل مل گئے، اجنبیت اور غیریت کا احساس بہت جلد مٹ گیا، کم گو، کم آمیز فیض کی محبوب شخصیت ہماری محفل کا ایک قیمتی سرمایہ بن گئی۔ وہ اب بھی تنہائی پسند تھا۔ اس کے کھوئے کھوئے رہنے کی کیفیت اب بھی موجود تھی، مگر دوستوں کے درمیان ہوتا تو تھوڑی سی چھیڑ چھاڑ سے بے تکلف چہکنے لگتا۔ اس کی بڑی بڑی مخمور آنکھیں جو عموماً گھنی دراز پلکوں میں چھپی نیم وا حالت میں رہنے کی عادی تھیں، یوں چمک اٹھتیں گویا قندیلیں روشن ہو گئیں لبوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگتی، رگ رگ سے سرور و بہجت کی کرنیں پھوٹ پھوٹ پڑتیں، مسرت کے نور سے چہرہ نکھر جاتا، رخسار گلنار ہو جاتے۔ یہ فیض اُس فیض سے قطعی مختلف تھا جو عام طور پر اُداس اُداس نظریں لئے پہلو میں دیرانیاں بسائے چپ چاپ پھرتا نظر آتا تھا۔

فیض کے مزاج کا خمیر جن عناصر سے ترکیب پایا ہے ان میں اجزائے غالب لطافت، ملائمت، اخلاص اور بے نیازی کے ہیں

ان میں پیار، حسن پرستی اور رومان کے رنگا رنگ پھولوں کا رس اس خوبصورت تناسب سے ملا دیا گیا ہے کہ اس کا حاصل وہ لطیف و شیریں آمیزہ ہے جس سے فیض کا دل عبارت ہے۔ لطافت و رنگینی کی ان دبیز تہوں کے نیچے کہیں دور ایک چنگاری ایسی بھی دبی ہوئی ہے جس کی دھیمی دھیمی آنچ سے اس کا سینہ گرم رہتا ہے۔ بیشتر یہ چنگاری اپنی ہی راکھ میں دبی سلگتی رہتی ہے۔ دیکھنے والوں کو اس کا علم بھی نہیں ہوتا۔ لیکن کبھی یہ بھڑک اٹھتی ہے تو اس سرد راکھ سے وہ تند و تیز شعلے پیدا ہوتے ہیں کہ ان کی حدت اور تمازت سے فیض کا سینہ مدت تک آتشکدہ بنا رہتا ہے۔ اس آتش سوزاں کے سرد ہونے کے لئے طویل عرصہ درکار ہوتا ہے۔ یہ چنگاری عشق کا وہ جذبہ ہے جس سے فیض کی فطرت میں حرارت اور لہو میں صلابت ہے۔

فیض شدت سے چاہنے والے ہیں۔ اور اسی شدت سے چاہے جانے کے متمنی بھی ہیں۔ وہ اپنے دوستوں سے بے پناہ پیار کرتے تھے۔ ان کے دوست بھی اسی والہانہ انداز میں انہیں چاہتے تھے۔ محبت کا جذبہ فیض کی زندگی میں مرکزی محرک کا درجہ رکھتا ہے اپنی عمر میں اس نے کئی بھرپور عشق کئے ہیں، مختلف حالات و ادوار میں ان معاشقوں کی نوعیت بدلتی رہی ہے لیکن اس کی وسعت اس کی گہرائی اور گیرائی کی شدت میں کبھی کمی نہیں آئی۔ اس کے شواہد فیض کی شاعری میں اس کی نجی زندگی میں اور اس کے پبلک کردار میں جابجا تابندہ ہیں۔

حسنِ اتفاق سے ہم میں سے اکثر دوستوں کو شعر و سخن اور علم و ادب سے کچھ نہ کچھ لگاؤ تھا۔ چنانچہ کالج کی علمی ادبی مجالس میں بھی شریک ہوتے اور نجی صحبتوں میں بھی شعر و سخن کا چرچا رہتا۔ ہمارے ذوق و شوق نے ایک نئی راہ یہ نکالی کہ ہر اتوار کی شام کسی ایک دوست کے کمرہ میں ادبی محفل جمتی، پہلے سے دیئے ہوئے مصرع طرح پر ہر شخص التزاماً شعر کہہ کر لاتا۔ جن دوستوں کو شعر گوئی سے چنداں مس نہ تھا وہ بھی تک بندی اور قافیہ پیمائی پر مجبور تھے۔ طریقہ یہ تھا کہ جب سب لوگ باری باری اپنے شعر پڑھ چکتے تو ان میں سے انتخاب کیا جاتا۔ کسی کا ایک کسی کے دو شعر چن لئے جاتے اور پندرہ سولہ اشعار کی ایک قابل برداشت غزل مرکب تیار ہو جاتی، جو احباب کے نام سے کالج میگزین راوی میں چھپنے کو بھیج دی جاتی ظاہر ہے کہ اس غزل مرکب میں دو تین شعر جو جانِ غزل کہلانے کے مستحق ہوتے فیض کے تخیل کی پیداوار ہوتے تھے۔

دن اس نہج پر گزر رہے تھے۔ فیض کا نام احباب کی محفل سے نکل کر باہر کالج کی مجالس میں بھی چمکنے لگا۔ ہم فورتھ ائیر میں تھے۔ کالج میں اردو کی ادبی مجلس بزم سخن کے نام سے قائم تھی قاضی فضل الحق مرحوم اس کے صدر، میں سکرٹری اور آغا حمید معاون سکرٹری تھے، مہینہ میں ایک دو اجلاس ہو جاتے۔ فیض ہمارے دست راست تھے، کئی ہنگامہ خیز جلسے اور معرکے کے مشاعرے ہوئے۔ لیکن ظاہر ہے ان کی نوعیت عوامی اور ہنگامی سی تھی۔ مقالہ نویس نے مقالہ پڑھا واہ وا ہوئی اور اجلاس شور و غوغا میں ختم ہو گیا۔ خواص کو اس طرح کی ہنگامہ آرائی پسند نہ تھی۔ باذوق طلبا بھی مطمئن نہ تھے پروفیسر بخاری مرحوم (زبان یار خدایا یہ کس کا نام آیا) بالخصوص اس قسم کی ہلڑ بازی سے کبیدہ خاطر تھے۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ اس قسم کی غوغا آرائی سے کوئی مفید نتیجہ مرتب نہیں ہو سکتا۔ ان کے محسوس کرنے، سوچنے اور عمل کرنے میں زیادہ بُعد نہ تھا۔ کالج کے ہونہار باذوق طلبا سے رابطہ پیدا کیا، ہفتہ کی شام اپنے مکان پر آنے کی دعوت دی اور مجلس کا قیام عمل میں آگیا۔ مجلس کے ابتدائی ارکان میں فیض۔ راشد۔ آغا حمید، سید رشید احمد، نبی احمد، عمر فاروق اور راقم الحروف کے علاوہ چند طالب علم اور تھے۔ مجلس کی نشست بالعموم بخاری صاحب کے دولتکدہ پر ہوتی۔ ہفتہ کی شام اس کے لئے مخصوص کر دی گئی۔ بخاری صاحب کے ایما پر ان کے چند نامور ہم عصر مجلس کے ہر اجلاس

میں ضرور مدعو ہوتے۔ ان میں جناب عبدالمجید سالک مرحوم، جناب امتیاز علی تاج، ڈاکٹر تاثیر مرحوم، صوفی تبسم، مولانا چراغ حسن حسرت اور حضرت حفیظ جالندھری کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔ مجالس خالص غیر رسمی فضا میں منعقد ہوتے۔ جو پہلے آیا صوفے پر بیٹھ گیا جو بعد میں پہنچا فرش پر جم گیا۔ اس میں استاد و شاگرد اور چھوٹے بڑے کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ ایک طالب علم کو صدارت سونپی گئی۔ دوسرے نے اپنے پسندیدہ موضوع پر مقالہ پڑھا، سامعین نے بعض امور کی وضاحت طلب کی۔ سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ نفسِ موضوع پر ہر کوئی اپنے اپنے خیال اور نقطۂ نظر سے روشنی ڈال رہا ہے۔ نکتے اٹھائے جاتے ہیں، گرہیں کھل رہی ہیں، مشرق و مغرب قدیم و جدید کا ہر نظریہ پرکھا جا رہا ہے۔ ہر تبصرہ نگار ہر مفکر زیرِ بحث لایا جا رہا ہے۔ شاگرد پوچھ رہے ہیں، استاد گتھیاں سلجھا رہے ہیں، صدرِ مجلس، فاضل بزرگوں میں سے ہر ایک دادِ سخن دے رہا ہے۔ لیکن بخاری کی روح ہے کہ ہر سمت جاری و ساری ہے، جب چاہا اور جدھر چاہا بحث کا رخ موڑ دیا، کوئی پہلو اوجھل اور کوئی گوشہ نہیں چھوڑتے۔ ڈیڑھ دو گھنٹے کی اس گفتگو میں موضوع کا ہر رخ سے احاطہ کر لیا جاتا۔ اس کے بعد شعر گو طالب علموں سے تازہ کلام سنانے کا مطالبہ ہوتا۔ نظم ہو یا غزل ایک ایک بند ایک ایک شعر پر داد بھی دی جاتی اور اصلاح بھی کی جاتی۔ آخر میں معزز مہمان تھوڑا نظم یا غزل سناتے اور دو ڈھائی گھنٹے کی نشست کے بعد مجلس ختم ہو جاتی۔ بخاری صاحب کے دولت کدہ سے نکلتے تو ہم لوگ انشراحِ قلب کی کیفیت محسوس کرتے، وہ دولت جو برسوں کی مشقت سے بھی حاصل نہ ہو سکتی ہم ان دو گھنٹوں میں جھولیوں میں بھر لاتے۔

یہ کہنا ذرا بھی مبالغہ آمیز نہیں کہ بعض دوسرے دوستوں کی طرح، فیض کے دل و دماغ کی صلاحیتیں یہیں اجاگر ہوئیں۔ فکر کے گوشے یہیں منور ہوئے۔ تخیل کا زرِ خام اسی بھٹی میں کندن بنا۔ جذبات اور احساسات خداداد تھے۔ ان میں لوچ، لچک، وسعت و گہرائی اس پیرِ مغاں کے فیضانِ نظر سے پیدا ہوئی۔ فکر و تخیل کے مرغِ نو آموز نے پرواز کے رنگ ڈھنگ، فلک پیمائی کے انداز اسی چابکدست استاد سے سیکھے۔ بخاری کی نظر میں یہ خاص ملکہ تھا کہ جوہرِ قابل جہاں کہیں بھی چھپا ہو ڈھونڈ لیتی تھی، پھر اس جوہر کو جلا دینے اور آب و تاب بخشنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے، منتخب شاگردوں میں سے بخاری کی محبت و شفقت نے فیض کو ایک خاص مقام بخش رکھا تھا۔ فیض جو سدا کے لاڈلے ہیں بخاری کے بھی لاڈلے رہے۔ استاد و شاگرد میں جو تعلقِ خاطر مجلس کے زمانہ میں پیدا ہوا عمر بھر قائم رہا اور نیاز مندی اور دوستی کے مراحل سے گزر کر بے تکلفی کی حد تک بڑھا۔ بخاری کی موت نے اسے ایک مقدس رشتہ کا درجہ دے دیا ہے۔ صوفی تبسم اور فیض کی دوستی بھی اسی قبیل کی ہے بلکہ اسی سنہری زنجیر کی ایک پائیدار کڑی ہے

فیض نے ایک کھاتے پیتے معزز اور خوشحال گھرانے میں آنکھ کھولی۔ بچپن ناز و نعمت میں گزرا۔ آرام و آسائش کا کوئی لازمہ ایسا نہ تھا جو مہیا نہ ہو۔ نوکر چاکر خدمت کو موجود، شفیق ماں باپ کا دستِ محبت سر پہ، بھائی بہنوں کا پیار میسر، یہ وہ ماحول تھا جس میں فیض بڑھا، پلا اور جوان ہوا۔ اپنے ہاتھ سے کام کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔ کسی خواہش کے رد ہونے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ ان حالات کا نتیجہ یہ ہوا کہ طبیعت میں ایک طرح کا ناز، ایک جذبۂ پندار، ایک احساسِ فخر و تمکنت پیدا ہو گیا۔ تن آسانی اور سہل انگاری کی خو مزاج کا جزو بن گئی

گورنمنٹ کالج میں آئے تو کاہلی، تن آسانی کی عادت اور بے نیازی کی ادا پہلے سے موجود تھی۔ اپنی ضروریات سے بے نیازی اپنی چیزیں اور اپنے کپڑے تک سنبھال کر رکھنے سے لاپروائی۔ ان کا کمرہ کباڑ خانہ کا نقشہ پیش کرتا۔ لباس کبھی ڈھنگ سے نہ پہنتے، قیمتی سوٹ سلوٹوں سے بھرپور، جوتے پالش سے بے بہرہ، مہینوں حجامت نہیں بنی، اور کئی کئی دن بغیر شیو کے گزار دیئے۔ ماں باپ

بھائی بہن موجود نہیں تھے کہ ان کے کام دھا کر دا دیتے۔ پرانے خدمت گار بھی ساتھ نہ تھے کہ ان کے بکھرے ہوئے سامان کو سلیقے سے رکھ دیا کر اس پریشان حالی پر کوئی سرزنش کرنے والا بھی نہ تھا۔ چنانچہ فیض کے روزمرہ میں کوئی سلیقہ، کوئی قرینہ اور سنوار کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکی۔ اس پر مزید یہ کہ دل میں کسی انجانے درد کی کسک لئے، کوئی پوشیدہ درد چھپائے کسی گہری سوچ کی تھکان سے مضمحل، گم اور چپ چاپ پڑے رہتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ظاہری رکھ رکھاؤ سے بے نیاز ہو کر اپنے آپ میں سمٹ گئے۔ تنہا تنہا، کھوئے کھوئے سوچ کی گہرائیوں میں غرق رہتے۔ ان کی اس کیفیت سے ہم لوگ اکثر گھبرا جاتے۔ اُن کو چھیڑتے، بہلاتے، کہیں دیر میں جا کر وہ خفیف سی مخصوص مسکراہٹ لبوں پر نمودار ہوتی، آنکھوں میں دیئے سے جھلملاتے اور فیض اپنے خول سے باہر نکلتے۔

کاہلی اور تن آسانی فیض کی طبیعت میں یوں بس گئی تھی کہ اس کے ہاتھوں اس نے عمر بھر گوناگوں نقصان اور پریشانیاں اٹھائی ہیں۔ شادی کے بعد ان کی بیگم ان کی عادات کے باعث کافی پریشان رہی ہیں۔ یہ صرف بیگم کی انتھک مساعی اور بے مثال صبر و حوصلہ کا ثمر ہے کہ آج فیض کی زندگی میں کچھ باقاعدگی اور قدرے ترتیب نظر آتی ہے۔ ورنہ ان کے دوست تو ان لاابالیوں سے سمجھوتہ کر چکے تھے۔ بلکہ ان کے احباب اور استاد ان کمزوریوں کو فیض کی طبیعت کا ایک نرم و شیریں پہلو سمجھ کر ان سے پیار کرنا سیکھ گئے تھے۔

فیض اس حد تک کم گو ہیں کہ دوستوں سے بھی دل کی بات کھل کر نہیں کہہ پاتے، سینہ میں لاکھ حشر برپا ہوں، لب بند رہتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ دکھ میں آنکھیں بھیگ جائیں گی، خوشی میں ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ جائیگی۔ دوستی کے ابتدائی مہینوں میں یہ صورت حال مجھے سخت کھلتی رہی۔ میں محسوس کرتا کہ اتنے قریب ہو کر بھی فیض مجھ سے بہت دور ہیں۔ بات چیت میں جب بھی اس چیز کا ذکر کیا، فیض مسکرا کر چپ ہو رہے۔ میں سمجھتا ہوں یہ میرے صبر و خلوص کی فتح تھی کہ فیض نے آخر کار اپنے رازوں میں مجھے شریک کر لیا۔ اور میں ان کی خاموشی کا بھید اور ان کے دکھ درد کے سربستہ اسرار سے واقف ہوا۔

یہ راز ایک نوعمر خاتون سے فیض کے جذباتی لگاؤ سے وابستہ تھا۔ وہ دنوں کے آغاز بلوغت کی سحر تھی۔ اُدھر حسن کی دیوی ہزار صد ہزار رعنائیاں جلو میں لئے گل دیا سمن بکھیرتی پھر رہی تھی، ادھر عشق کا دیوتا لڑکپن کے معصوم کھیلوں سے گزر کر شعور کی اولین انگڑائیاں لے رہا تھا۔ بیداری کے پہلے ہی مرحلہ میں ایسا بھرپور تیر کھایا کہ دل و جگر کو برماتا رگ جاں میں ترازو ہو گیا۔ زخم اتنا کاری تھا کہ رگ رگ سے لہو ٹپکا، درد کی کسک اتنی شیریں اور لذیذ تھی کہ شہید لذت نے اس کو سرمایہ حیات بنا لیا۔ لیکن افسونِ جمال نے اس درجہ مسحور کر دیا کہ نظر بھر کر محبوب کا چہرہ تکنے کی ہمت نہ ہو سکی۔ لب و رخسار اور چشم و ابرو کی بناوٹ تک سے بے خبر رہا۔ گردن و سینہ کے نشیب و فراز اور جسم کے دلآویز خطوط پر نگاہ ٹک نہ سکی۔ محبوب کا سراپا بیان کرنے بیٹھتا ہے تو رنگ و بو کے طوفان اور نور و نکہت کے سیلاب میں راستہ بھول بھول جاتا ہے۔ گلاب کے پھولوں کی رنگینی، یاسمین کی نکہت، ریشم و مخمل کی نرمی، مرمر و صندل کی سپیدی، بجلی کی بے قرار چمک اور سیماب کا اضطراب کچھ ایسے ہی تاثرات کا دلآویز جادو ہے جو فیض کے حواس پر چھایا ہوا ہے۔ اس کے تصور میں حسن کی کائنات اسی بہشتِ رنگ و بو کا نام ہے۔ محبوب کا پیکر اسی فردوس سے عبارت ہے یہی وہ مرغوب و دلپسند فضا ہے جس میں فیض کھویا رہنا چاہتا ہے اسی کا ذکر محبوب کا ذکر ہے۔

اپنے افکار کی، اشعار کی دنیا ہے یہی
جانِ مضمون ہے یہی شاہدِ معنیٰ ہے یہی

عشق کے ابتدائی دور کی شاعری میں فیض جب بھی محبوب کا ذکر کرتا ہے تو اس قسم کی ترکیبیں استعمال کرتا ہے۔ اے کہ تو رنگ و بو کا طوفان ہے۔ اے کہ تو جلوہ گر بہار میں ہے' پھول لاکھوں برس نہیں رہتے' وہ گھڑی اور ہے بہار شباب' یا پھر معصوم تبسم کی فراوانی کا وسعت دید پر گلبار ہونا، ریاض زیست کا آزردہ بہار ہونا۔ بعد میں جب طوفان کی شدت کم ہوگئی اور حسن کے تجزیہ کا ہوش آیا' تب بھی رسیلے ہونٹ' معصوم پیشانی' حسین آنکھیں' خمار خواب سے بریز احمریں آنکھیں' سپید رُخ پہ پریشان عنبریں زلفیں ضیائے ماہ میں رنگ پیراہن کی دمک' دراز قد کی لچک' گداز جسم قبا جس پہ سج کے ناز کرے۔ دراز قد جسے سرو سہی نماز کرے' کے طلسم سے باہر نہیں نکلنا چاہتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ نگاہ دیدہ سرشار میں مضطر شوخیاں' رنگ غازہ رخسار میں خوابیدہ حشر تیں' سُرخ ہونٹوں پہ تبسم کی ضیا گویا سے گلزار میں یاسمن کے پھول ڈوبے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ فیض کی مرغوب فضا نیم شب' چاند' ٹھنڈی ہوائیں' سیاہ گھٹائیں اور بہار شباب کی نکہت بیزیوں سے ترکیب پاتی ہے جس میں وہ خود فراموشی کے عالم میں کھویا رہنا چاہتا ہے۔

کیسے رنگین و پرکیف شب و روز تھے' سرخوشی کی مستی کا نشہ چھایا ہوا ہے' رگوں میں دوران خون کی تیزی اور خون میں شراب کی مستی بسی ہوئی ہے۔

وہ سرخوشی دے کہ زندگی کو شباب سے بہرہ یاب کردے
میرے خیالوں میں رنگ بھر دے میرے لہو کو شراب کردے

آنکھوں میں روئے یار کی رنگینیاں جذب ہیں' مشام جاں عنبریں زلفوں کی مہک سے سرشار ہے' لہو کو شراب اور زندگی کو زرنگار کرنے کی آرزو ہے' رگ رگ میں تڑپ کا سیماب اور اضطراب کی برق آسودہ ہے' جذبات کے سمندر میں متلاطم لہروں کا مدوجزر ہے۔ مگر وضعداری کا تقاضا ہے کہ حرف آرزو لب پہ نہ آئے۔ پاس ضبط کی مجبوری ہے کہ آہ طلب دبی رہے۔ رعب جمال کی یہ کیفیت ہے کہ عرض مدعا کی ہمت نہیں' افسون حسن نے گویائی کی تاب چھین لی ہے۔ نگر نثار فیض تلملا کر رہ گیا۔ جس کی کوئی خواہش کبھی تشنہ تکمیل نہ رہی تھی۔ آج اسقدر بے بس تھا کہ حرف تمنا زباں تک نہ آسکتا تھا۔ اس نو وارد اقلیم غم کی یہ پہلی ہار تھی۔ پندار کا خوگر شکست پہلی سے دوچار تھا۔

نقش فریادی کی ابتدائی نظمیں اسی حشر سامان دور کی پیداوار ہیں' جی چاہتا ہے کہ ایک ایک نظم کا پس منظر اور ایک ایک شعر کی شان نزول بیان کرتا مگر پاس ادب ملحوظ ہے' پھر یہ ایک عظیم ظلم ہوگا کہ ان اشعار کی آفاقیت کو کسی ایک واقعہ کی قید میں محبوس کردیا جائے ان کے عالمگیر تاثر کو حد بندی کے پتھروں سے مجروح کردیا جائے۔ ہر چند بلند ترین شعر کا محرک بھی کوئی بہت معمولی واقعہ ہوسکتا ہے جس نے شاعر کی حیات میں لرزش پیدا کردی ہو جس نے اس کی رگ حیات کو چھیڑ دیا ہو' لیکن ہر شعر کو شاعر کی زندگی کے واقعات و حادثات پر منطبق کرکے دکھانا اس کے لازوال حسن اور آفاق گیر اثر کو محدود چوکھٹے میں بند کرنے کے جرم کا ارتکاب کرنا ہے۔

فیض کے اس معاشقہ کی عمر نو دس برس ہے۔ اس دوران میں راہ محبت کے سب مراحل اس نے طے کئے۔ مسرتوں کے فردوس آباد ہوئے تو نسیم بہار اٹھلائی اور سموم خزاں کی لپٹوں کا بھی گزر ہوا۔

آرزوؤں کے شیش محل تعمیر کئے تو امیدوں کے چراغ بھی جلائے' اور حسرتوں کا دھواں بھی اٹھا۔ محبوب کے عنبریں گیسوؤں سے کھیلنے میں تو ذوق کی جانکاہیاں بھی جھیلی ہیں۔ کمال وضعداری یہ ہے کہ سرور و نشاط کے نشہ میں آپے سے باہر کبھی نہیں ہوئے اور کرب و غم کی حالت میں فریاد و فغاں کبھی نہیں کی۔ انتہائی دکھ درد کے دنوں میں زیادہ سے زیادہ یہ کیفیت رہی۔

رنگینیٔ دُنیا سے — مایوس سا ہو جانا
دُکھتا ہوا دل لے کر — تنہائی میں کھو جانا
ترسی ہوئی نظروں کو — حسرت سے جھکا لینا
فریاد کے ٹکڑوں کو — آہوں میں چھپا لینا
راتوں کی خموشی میں — چھپ چھپ کر کبھی رو لینا
مجبورِ جدائی کے — ملبوس کو دھو لینا

ہم ابھی فورتھ ایئر میں تھے کہ فیض کے چمنستانِ حیات میں ایک ایسا مہیب زلزلہ آیا جس نے اس کی کائنات زیر و زبر کر دی یہ اس کے والد کی اچانک اور غیر متوقع موت کا اندوہناک حادثہ تھا۔ کرسمس کی تعطیلات میں فیض سیالکوٹ گئے۔ ہمشیرہ کی شادی کی تقریب تھی جس صبح برات کی آمد تھی بڑی رات گئے تک والد تیاریوں میں مصروف رہے۔ آدھی رات کے لگ بھگ تھک کر بستر پہ لیٹے تو اچانک اختلاجِ قلب کا دورہ پڑا، دیکھتے دیکھتے روح سافر ہو گئی۔ بھرے گھر میں کہرام مچ گیا قیامت ٹوٹ پڑی۔ صبح برات آ گئی عجب دردناک منظر تھا، ادھر باپ کا جنازہ اٹھا ادھر بہن کی رخصتی ہوئی۔ اس محشرِ کرب و بلا کے تصور سے بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

فیض کے والد خان بہادر چودھری سلطان محمد خان بار ایٹ لاء ایک عظیم اور بھرپور شخصیت کے بزرگ تھے۔ اُن کے اوصاف اور محاسن کا شمار آسان نہیں، ان کی حیاتی زندگی ایک افسانہ ہے۔ باپ کی داستانِ حیات کا اجمالی تذکرہ اس لئے ضروری ہے کہ بیٹے کی کہانی اس کے بغیر ادھوری رہتی ہے۔

وہ سیالکوٹ کے ایک دور افتادہ گاؤں میں پیدا ہوئے۔ میٹرک تک کی تعلیم قریب کے قصبہ میں حاصل کی، پھر اعلیٰ تعلیم کے لئے لاہور چلے آئے۔ کالج میں پڑھتے تھے مگر انگریزی کے علاوہ فارسی اور عربی میں فاضلانہ دسترس حاصل کر لی تھی۔ اتفاق سے انہی دنوں حکومت افغانستان کا ایک وفد سرکارِ انگریزی سے کسی اہم گفت و شنید کے لئے لاہور وارد ہوا۔ ارکانِ وفد کی زبان فارسی تھی اور فریقِ دیگر کی انگریزی، طرفین ایک دوسرے کی بات کیوں کر سمجھتا ترجمان کی ضرورت لاحق ہوئی تو کسی وسیلہ سے نوجوان سلطان محمد بلائے گئے۔ ترجمانی کے فرائض آپ نے اس خوبی سے سرانجام دیئے کہ افغانستانی وفد نے گراں بہا انعام و اکرام سے نوازا اور نہایت معقول مشاہرہ پر کابل میں ایک عہدہ کی پیشکش کی۔ سلطان محمد صاحب نے قدرے تامل کے بعد پیشکش قبول کر لی تعلیم ادھوری چھوڑ، وفد کے ہمراہ کابل روانہ ہو گئے، امیر عبدالرحمٰن خان کا دورِ حکومت تھا۔ دربار میں حاضری ہوئی۔ امیر ان کی حوصلہ مندی، خود اعتمادی اور قابلیت سے بے حد متاثر ہوا، اور ایک اچھے عہدہ پر تقرری ہو گئی۔ قربِ سلطانی ایک نہایت نازک مقام ہے مگر حوصلہ مند سلطان محمد کے قلب و ذہن کی صلاحیتیں ہر مقام پر سرخرو رہیں۔ اعتمادِ سلطانی حاصل کر کے دیکھتے ہی ترقی کے منازل بڑی سرعت سے طے کرتے گئے، شہزادگانِ عظام کے اتالیق خاص مقرر ہوئے پھر حکومت کے چیف سیکرٹری (میر منشی) کے عہدہ جلیلہ پہ فائز ہوئے۔

افغانستان کی سیاست اُن دنوں نہایت پیچیدہ مراحل سے گزر رہی تھی، ایک طرف زارِ روس کی حریصانہ نظریں افغانستان

سے گزر کر ہندوستان پر پڑ رہی تھیں۔ تو دوسری سمت شاطر انگلیسی گہری چالیں کابل کی بساط سیاست میں رکھنے ڈال رہی تھیں، ان دو بندوں کی پے در پے مشہ سے بچنا شاہ کابل کے لئے آسان کھیل نہ تھا۔ چیف سکریٹری کی بروقت مدد اور برمحل مشورے ہر نازک مرحلے پر امیر کے آڑے آتے رہے۔

ایک وقت ایسا آیا کہ لندن میں سفارت کے عہدہ کے لئے ایسے معتمد اور قابل شخص کی ضرورت پڑی جو لندن اور کابل کی سیاسی گتھیاں بطریق احسن سلجھا سکنے کا اہل ہو، چنانچہ نظر انتخاب پھر سلطان محمد خان پر پڑی۔ ہز ایکسی لینسی سلطان محمد خان حکومت کابل کے سفیر کبیر بن کر ملکہ وکٹوریہ کے دربار میں پہنچے، تین سال تک عہدۂ جلیلہ کے فرائض کمال خوش اسلوبی سے سرانجام دیئے۔ اپنے قیام لندن کے دوران، سفارتی فرائض کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ بیرسٹری کا امتحان پاس کر لیا۔ انگریزی زبان میں امیر عبدالرحمٰن خان کی سوانحعمری لکھ کر کتابی شکل میں شائع کی۔ لندن کی سفارت سے سبکدوش ہو کر واپس لوٹے تو کابل دربار کی سیاست میں کئی نئے عنصر ابھر آئے تھے۔ آپ کی ماہر انگلیاں ان الجھے ہوئے ناگوں کو سلجھانے میں لگ گئیں، انہی دنوں افغانستان کے ایک دور افتادہ سرحدی علاقہ میں بغاوت ہو گئی۔ سپہ سالار کی عسکری قوت ناکام ثابت ہوئی تو اس بغاوت کو سلطان محمد خان کی حکمت عملی نے فرو کیا۔ بلکہ سردار علاقہ کی لڑکی بھی ان کے نکاح میں آ گئی۔ سپہ سالار کو اس دوگونہ شکست کا شدید احساس ہوا۔ حسد کی آگ سے جل بھن گیا۔ ابھی یہ واقعہ تازہ تھا کہ بیرونی دراندازوں اور اندرونی سازشوں نے زیادہ شدت اختیار کر لی۔ اس افراتفری اور اندھیر گردی کے عالم میں سلطان محمد خان کی جان سخت خطرے میں پڑ گئی۔ بھرا بھرایا گھر چھوڑ رات کے اندھیرے میں پیدل نکلے اور بڑی جان جوکھوں کے بعد سرحد عبور کی۔

سیالکوٹ پہنچ کر اس مرد جری نے جسم و دل کے زخموں پر پٹی باندھی، کابل کے مسمار شدہ محلات کی یاد کو بھلا دیا اور نئے اینٹ گارے سے نئی زندگی کی تعمیر کا آغاز کیا۔ بیرسٹری پاس تھے، مکان کرایہ پر لیا اور وکالت کا بورڈ لگا کر بیٹھ گئے۔ ہمت و محنت کے سہارے دیکھتے دیکھتے اپنے ہمعصروں میں ممتاز جگہ حاصل کر لی۔ دولت کی دیوی پھر اسیر ہو گئی۔ عزت و اعتبار کی دولت سے پھر مالا مال ہو گئے۔ یکے بعد دیگرے دو شادیاں کیں اور اولاد کی نعمت فراوانی سے ملی۔ سیالکوٹ میں ان کا کام اور نام خوب چمکا، روپے پیسے کی ریل پیل تھی۔ گھر کا ٹھاٹھ امیرانہ رکھا۔ جتنا کماتے اس سے بڑھ کر خرچ کرتے، عزیزوں رشتہ داروں، غریبوں اور محتاجوں، سب کی دستگیری کی، سب کے آڑے وقت پر کام آئے، بچوں کی تعلیم و تربیت کا انداز شہزادوں سے کسی طور کم نہ تھا۔ ان کی دیکھ بھال، ان کا آرام و آسائش، اُن کے چاؤ چونچلے سب رئیسانہ تھے، دنیاوی وجاہت کے اصول میں بھی کوئی کسر نہ رہی۔ خان بہادر ہوئے، ڈسٹرکٹ بورڈ کے پہلے غیر سرکاری چیرمین بنے، سرگودھا میں پانچ مربع آراضی حاصل کی اور ایک عالیشان بنگلہ تعمیر کرایا۔ نوع بہ نوع کاروبار کو اسقدر وسعت دی کہ اس پھیلاؤ پر نگرانی مشکل ہو گئی۔ سرمایوں دھڑا دھڑ لگایا کہ قرض کے بھاری بوجھ تلے آ گئے۔ مگر تسلی یہ تھی کہ وکالت کی چند ماہ کی آمدنی سے سارا قرض چکا دیا جائے گا۔ غیب کا علم کسے ہے؟ ناگہانی موت نے سارے منصوبے ختم کر دیئے۔ باغبان کے اٹھ جانے سے ہرا بھرا باغ ویران ہو گیا۔ جگمگاتے محل زمین پر آ رہے۔ چوٹ اتنی ناگہانی اور اتنی کاری تھی کہ سنبھلنے کی کوئی آس نہ رہی۔

کچھ وقت گزرنے پر اہل خاندان کے حواس مجتمع ہوئے تو عزیز و اقارب اور بہی خواہ سر جوڑ کر بیٹھے، مرحوم کے ترکے کا جائزہ لیا گیا۔ مختلف دھندوں میں لگائے گئے بھاری سرمایہ کا کوئی دستاویزی اور کوئی تحریری ثبوت دستیاب نہ ہو سکا، ہر طرف سے صاف

جواب مل گیا، سرمایہ ڈوب چکا تھا۔ مگر قرض کا بارِ گراں موجود تھا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ زرعی اور سکنی جائیداد فروخت کر کے قرض سے سبکدوشی حاصل کی جائے، سرگودہا کی زمین اور کوٹھی، اونے پونے داموں بیچ دی گئی۔ سیالکوٹ کا رہائشی مکان تک بک گیا اور قرض کی پائی پائی ادا کی گئی۔ لفظی اور معنوی ہر دو لحاظ سے سبکدوش ہو کر خاندان لاہور پہنچا تاکہ لڑکوں کی تعلیم جاری رکھی جا سکے۔ ایک معمولی سا مکان کرایہ پر لیا اور پھر سے نئی زندگی کا آغاز ہوا۔

باپ کی موت کا سانحہ اس قدر اندوہناک اور صدمہ اتنا شدید تھا کہ فیض بے سکت ہو کر رہ گیا۔ یہ ایک شفیق باپ کی موت نہ تھی، آرام و راحت، بے فکری بے احتیاجی آسائش اور فارغ البالی کی موت تھی۔ فیض تیم ہی تو تھا بے بس اور بے نوا بھی تھا۔ آٹھ دس روز کمرے سے باہر نہ نکلا۔ رویا نہ آنسو بہائے۔ تڑپا نہ فریاد کی سکتے کی سی حالت میں گم سم پڑا چھت پر آنکھیں گاڑے، خلاؤں سے پار کسی بعید از نگاہ دنیا میں کھویا رہا، کھانا پینا، بولنا چلنا موقوف نہ جانے کرب و اندوہ کے کس کس جہنم سے گزرا! دل خون گشتہ سے کیا کیا سرگوشیاں ہوئیں!! یاس و نا امیدی کے کن کن صحراؤں کی ریت چھانی! دماغ سے کیا کہا اور ذہن کو کیا سمجھایا!! آٹھ دس دن کے بعد بستر چھوڑا منہ ہاتھ دھو کر کمرے سے نکلا۔ لب بند تھے مگر آنکھوں میں کسی انجانے عزم کی چمک تھی، زرد چہرے پہ اثبات یقین کی جھلک تھی۔ اس دن کے بعد فیض ایک مختلف انسان تھے۔ کاہلی اور تن آسانی چھوڑ محنت و مجاہدہ کی طرف مائل ہو گئے رفتار میں اگرچہ وہی دھیما پن تھا، مگر پاؤں میں عزم و استقامت کی مضبوطی نمایاں ہو رہی تھی، فیض جو آج تک صرف غمِ جاناں سے واقف تھے اب غمِ روزگار سے بھی دوچار تھے۔ اس نے غمِ جاناں کو جس دلفریب انداز سے غمِ روزگار میں سمویا ہے ہر کسی کے بس کی بات نہیں، پھر یہ دونوں غم کس طرح ایک عظیم اور عالمگیر غمِ دوراں کا روپ دھار کر دنیا کے سامنے آئے ہیں کسی نظر سے پوشیدہ نہیں، یہی فیض کا فلسفۂ حیات اور یہی اس کی شاعری کا نقطۂ عروج ہے۔

فیض کی یاس و غم کی کیفیت سمجھنے کے لئے اس کی نظم یاس دیکھئے جس کا پہلا بند یوں ہے ؎

بربطِ دل کے تار ٹوٹ گئے		ہیں زمیں بوس راحتوں کے محل
مٹ گئے قصہ ہائے فکر و عمل		بزمِ ہستی کے جام پھوٹ گئے
چھن گیا کیفِ کوثر و تسنیم

غم و اندوہ کی تاریک گھٹاؤں سے نکلے تو عزم و استقلال کی توانائی یوں ظاہر ہوئی ؎

سرود

موت اپنی نہ عمل اپنا، نہ جینا اپنا		کھو گیا شورشِ گیتی میں قرینہ اپنا
ناخدا دور ہوا تیز قریں کامِ نہنگ		وقت ہے پھینک دے لہروں میں سفینہ اپنا
عرصۂ دہر کے ہنگامے تہِ خواب سہی		گرم رکھ آتشِ پیکار سے سینہ اپنا
ساقیا، رنج نہ کر جاگ اٹھے گی محفل		اور کچھ دیر اٹھا رکھتے ہیں پینا اپنا
بیش قیمت ہیں یہ غم ہائے محبت مت بھول		ظلمتِ یاس کو مت سونپ خزینہ اپنا

بی اے پاس کر لینے کے بعد ہم لوگوں نے ایم اے کلاسز میں داخلہ لے لیا۔ فیض انگریزی اور میں تاریخ پڑھ رہا تھا۔ لیکن کالج کے اوقات کے بعد ہمارا زیادہ وقت اکٹھا گزرتا صرف شب خوابی کے لئے فیض اپنے مکان پر چلے جاتے۔ یہ علم مجھے بہت بعد میں ہوا کہ ان دنوں رات کے چند گھنٹے وہ کسی پرائیویٹ تجارتی ادارے میں لکھنے پڑھنے کا کام بھی کرتے رہے ہیں جس سے جیب خرچ اور روزمرہ ضروریات کے لئے کچھ رقم کما لیتے تھے۔ حسرت موہانی کے رنگ میں گویا ؎

ہے مشقِ سخن جاری، چکی کی مشقت بھی

فیض کی حیاتِ معاشقہ کے یہ دو سال بظاہر سپاٹ اور بے رنگ تھے۔ ہیجان و تلاطم کے ظاہری نشان ناپید تھے۔ مگر دل کی گہرائیوں میں یاد باقی تھی بے کسی کی دلیل، ہماری یہ کوشش کہ فیض عشق و محبت کے اس خارزار سے نکل آئیں کیونکہ اس کا انجام خوش آئند نظر نہیں آ رہا تھا، بظاہر کامیاب معلوم ہو رہی تھی مگر حقیقت میں انہوں نے اپنے جذبات کو بقول میجر محمد اسحٰق کیموفلاج (CAMOUFLAGE) کر لیا تھا اور کسی موافق وقت کے انتظار میں تھے، دل کو یہ سمجھا کر خاموش کر لیا تھا ؎

ساقیا رنج نہ کر، جاگ اٹھے گی محفل
اور کچھ روز اٹھا رکھتے ہیں پینا اپنا

ایم اے کر لینے کے بعد میں تو گاؤں چلا آیا سرکاری ملازمت کی ہوس اور شہری زندگی کی دلچسپیوں سے منہ موڑ کر اپنے چھوٹے سے قطعۂ اراضی سے روٹی کمانے کی فکر میں لگ گیا نصف صدی بیت ہو چکی ہے اور میں اس کانِ نمک سے باہر نہیں نکل پایا۔ فیض نے انگریزی میں ایم اے کر لینے کے بعد عربی کی ایم اے کلاس میں داخلہ لے لیا اور ایک سال میں عربی ایم اے کی ڈگری بھی حاصل کر لی۔ میرے گاؤں آ جانے کے بعد فیض کے دن رات کا زیادہ حصہ صوفی تبسم کے ذیلدار روڈ والے مکان پہ گزرا۔ ہر شام وہاں یاروں کی محفل جمتی جس میں ڈاکٹر تاثیر، حفیظ جالندھری، چراغ حسن حسرت، حفیظ ہوشیارپوری بالعموم اور پروفیسر بخاری مرحوم اکثر شریک رہتے۔ ان محفلوں کی نوعیت جہاں تفریحی اور خوش گپیوں کی تھی وہاں علمی و ادبی، ثقافتی و تہذیبی بھی تھی۔ طنز و مزاح کی پھلجھڑیاں بھی چھوٹتی رہتیں۔ اور شعر و سخن کے ہنگامے بھی سرد نہ ہوتے۔ یہی وہ دور ہے جس میں "نیاز مندانِ لاہور" کے نام سے ان یاروں نے دہلی اور لکھنؤ والوں سے یادگار معرکے لڑے ہیں۔

تعلیم سے فراغت پا چکنے کے بعد فیض کو روزگار کی تلاش ہوئی۔ انہی دنوں امرتسر میں وہاں کی انجمن اسلامیہ کا ایم اے او ہائی اسکول ایم اے او کالج بن گیا۔ نئے اسٹاف کی ضرورت تھی۔ گورنمنٹ کالج کے فارغ التعلیم نوجوانوں کی ایک کھیپ بھرتی ہو کر وہاں گئی، اُن میں فیض بھی شامل تھے۔

یہاں سے فیض کی کتابِ زندگی کا ایک نیا ورق الٹتا ہے۔ اب وہ خود کما کر کھانے کے قابل تھے۔ ان کے بڑے بھائی، طفیل احمد صاحب علی گڑھ یونیورسٹی میں ایم ایس سی کے طالب علم تھے کہ باپ کی ناگہانی موت نے بساطِ حیات الٹ دی۔ افراد خاندان کے ہمراہ لاہور پہنچ کر انہوں نے لا کالج میں داخلہ لے لیا، وکالت کا امتحان پاس کرتے ہی سب ججی کے امتحانِ مقابلہ میں بیٹھے۔ اُدھر فیض پروفیسر ہوئے اِدھر طفیل احمد سب جج بن گئے۔ گھر کے لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا کہ ادبار و نکبت کے بادل چھٹنے لگے اور فراغت کی سحر نمودار ہوئی۔ قدرے آسودگی کے لمحات میسر ہوئے تو فیض کے دل کی گہرائیوں میں دبی ہوئی کسک پھر کروٹیں لینے لگی۔ دوبارہ دیارِ یار کا رخ کیا آنکھوں میں محرومی کے اشک چھلکائے واپس امرتسر آ گئے۔ کئی مہینے سوگوار رہے اُن

دنوں ہر پانچویں چھٹے روز فیض کا خط مجھے ملتا۔ اس ذریعہ سے کبھی شعروں کے نازک آبگینوں میں اور کبھی نثر کے جام سفالیں میں فیض اپنا افسردہ دل بھیجتا رہا۔ اس دلگداز دور کا خاتمہ اس وقت ہوا جب فیض نے "مرگِ سوزِ محبت" لکھ کر داستانِ عشق کے ختم ہو جانے کی خبر مجھے لکھ بھیجی۔

بہت بعد میں جب راولپنڈی سازش کیس میں ماخوذ ہو کر فیض گرفتار ہوئے تو میں اُن کے بیوی بچوں کی خیر کو لاہور گیا ان کے مکان پر پہنچا اور حالات دریافت کئے۔ بیگم اس ناگہانی افتاد سے کافی پریشان تھیں میں نے تسلی کے کلمات کہے اور واپس آگیا ان دنوں فیض کے مکان پر سی آئی ڈی کی سخت نگرانی تھی۔ میرے یوں بے محابا وہاں چلے جانے پر انہیں نہ جانے کیا شکوک گذرے چند دن بعد اچانک میرے گھر کی تلاشی ہوئی پولیس والوں کو غالباً میرے اور فیض کے اصل تعلقات کی نوعیت معلوم نہ تھی یہاں انہیں کیا دستیاب ہوتا۔ فیض کی سیاسی زندگی سے مجھے کبھی سروکار نہیں رہا۔ البتہ فیض کے اُن نادر خطوط کا مجموعہ وہ اٹھا لے گئے جن کے ضیاع کا دُکھ مجھے عمر بھر رہے گا۔ یہی نہیں راشد اور آغا حمید کے خطوط بھی پولیس کی دراز دستی کی نذر ہو گئے۔ اگر کبھی سی آئی ڈی کے ارباب اختیار کا جی پسیجا تو شاید یہ عزیز خطوط کا یہ گنج گرانمایہ مجھے واپس مل جائے۔ ان کی ادبی قدر و اہمیت متقاضی ہے کہ انہیں ضائع ہونے سے بچایا جائے۔

عاشقی کا افسانہ تو ختم ہو گیا۔ مگر سوزِ عشق فیض کے خونِ دل میں سرایت کر چکا تھا۔ لذتِ دردِ قلب و جان میں بس چکی تھی، روئے یار کی رنگینیاں آنکھوں میں جذب تھیں اور عنبریں زلفوں کی نکہت لہو میں سمائی ہوئی تھی۔ اس پیکرِ جمال سے رشتہ ٹوٹا تو رخسارِ محبوب کی جگہ حسنِ ... جوڑ لیا۔ قامتِ یار اور عارضِ حبیب کے بجائے سرو و گل دمن میں کھو گیا اور فیض نے حسن کے اس مرکزِ محدود سے نکل کر کائنات کی وسعتوں میں بکھرے ہوئے لازوال حسن کو محبوبِ نظر اور معبودِ نگاہ بنا لیا۔ اپنے دردِ دل کو دنیا میں پھیلے ہوئے بیکراں درد کا جزو بنا دیا۔ اپنی محرومی کی کسک کو مخلوق کی وسیع تر محرومیوں کی تڑپ میں سمو گیا۔ ہر مظلوم کی آہ فیض کے دل کی آہ بن گئی۔ ہر ستم رسیدہ کا دکھ فیض کا اپنا دکھ ہو گیا۔ رقیب سے مخاطب ہو کر جو عہد آفریں نظم کہی ہے فیض کے اس انقلابِ ذہنی کا شاہکار مظہر ہے۔ یہاں سے فیض کی زندگی اور شاعری ایک نئے موڑ سے گزرتی ہے۔

پروفیسر تاثیر دو سال انگلستان میں گذار کر انگریزی ادبیات میں پی ایچ ڈی کی امتیازی ڈگری حاصل کر کے انہی دنوں وطن لوٹے اور ایم اے او کالج کے پرنسپل بن کر امرتسر پہنچ گئے، تھوڑے دنوں بعد صاحبزادہ محمود الظفر اپنی نامور اہلیہ رشیدہ جہاں کی معیت میں وائس پرنسپل مقرر ہو کر اس کالج میں گئے، بقول فیض ولایت سے تاثیر بالکل نستعلیق ہو کر آئے ان کا دماغ جو پہلے ہی علم و ادب کا ایک سمندر تھا اب گوہرِ زرخار بن چکا تھا جس کی تہہ میں بیش بہا اور رنگا رنگ گہر ہائے خیال بار کے ذخیرے دمک رہے تھے فیض نے حریصانہ شوق سے اس گنجینۂ تاباں سے کسبِ نور کیا۔ صاحبزادہ محمود کی والہانہ وطن دوستی اور حب الوطنی کی زندگی ایک رہنما ... مینار بن کر سمتِ راہ کا پتہ دے رہی تھی۔ پھر محترمہ رشیدہ جہاں کی تابناک داستانِ حیات کا ایک ایک ورق فیض کی پرتجسس نگاہوں کے لئے مقدس صحیفہ سے کم نہ تھا۔ اس قران السعدین میں فیض کے لئے نئی منزلوں کی بشارت اور نئی شاہراہوں پر گامزن ہونے کی نوید تھی، فیض کے دل و دماغ کے مخملک تانے بانے سلجھ سنور کر صاف ہموار مضبوط لڑی بن گئے، جذبات و احساسات کے بیش قیمت مگر ژولیدہ موتی ہو

کڑی میں نہایت خوبصورتی سے مل گئے، فیض کے جذبۂ درد کو ایک راہ، احساسِ حسن کو ایک سمت میسر آگئی، اس کی زندگی اور اس کی شاعری کی راہ و منزل متعین ہوگئی۔ اسی زمانہ میں ملک کے درد خواہ ادیبوں اور فنکاروں نے "ترقی پسند مصنفین کی انجمن" کی بنیاد رکھی فیض اس کے اساسی اور اولین معماروں میں تھے، فیض نے ایک خط میں انجمن کی تاسیس کی نوید دیتے ہوئے مجھے بھی شمولیت کی دعوت دی تھی۔ مگر میں تو ترقی پسندی کی راہ سے بہت دور، ہاتھ پاؤں توڑے پڑا تھا۔ اس جدوجہد میں شریک ہونے کا سوال ہی پیدا نہ ہوا۔

ڈاکٹر تاثیر ولایت سے علم و دانش کے خزانے ہی لوٹ کر نہ لائے تھے۔ ایک نہایت سلجھے ہوئے اطوار کی رفیقِ حیات بھی ڈھونڈ لائے تھے۔ تاثیر تو اللہ کو پیارے ہو چکے مگر بیگم تاثیر آج بھی اپنے نامور شوہر کی یاد کا قیمتی سرمایہ دل میں لئے اپنے بچوں کی نگہداشت اور تعلیم و تربیت کے ساتھ اپنے وطن کی تعمیری تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیوں میں دن رات شریکِ جدوجہد ہیں۔

امرتسر میں ڈاکٹر اور بیگم تاثیر کے ہاں پہلے بچے کی ولادت ہوئی تو بیگم تاثیر کی نوجوان چھوٹی بہن نومولود بھتیجے کو دیکھنے اور بہن سے ملنے ولایت سے امرتسر آئی۔ اس لندن نژاد حسینہ کو یہاں فیض سے ملنے، اس کی مقناطیسی صورت سے متاثر ہونے، اس کی دلآویز سیرت کا مطالعہ کرنے اور اس کے خوابوں کو سمجھنے کے ان گنت مواقع ملے۔ بات رسمی ملاقاتوں اور رکھ رکھاؤ کی منزل سے بہت آگے نکل گئی۔ مس ایلیس جارج۔ جس کا بچپن اور لڑکپن لندن کے شفاف پارکوں اور گنجان منزلہ گلیوں میں پروان چڑھا تھا، جس کی نوجوانی کے دن رات مغرب کے عروس البلاد کی تہذیبی و ثقافتی گہماگہمی میں بسر ہوئے تھے، جس نے آغاز بلوغت کے شام و سحر اس انداز میں گزارے تھے کہ میخانۂ فرنگ سے علم و فن کا ایک ایک جام سیر ہو کر نوش جان کیا۔ مشرق کے اس نوجوان شاعر کے خوابوں پر مٹ گئی۔ فیض جس کے دل کے طوفان سمٹ گئے تھے، جس کے دماغ کی شورشیں مدھم پڑ چکی تھیں اس مسیحا نفس دمساز کی رفاقت میں پھر سے جاگ اٹھا، امیدوں کے محل ابھرنے اور تمناؤں کے چمن آباد ہونے لگے۔ دو دل قریب قریب دھڑک رہے تھے۔ مہینوں تنہائی میں بیٹھے ایک دوسرے کو سمجھنے، ایک دوسرے کی آرزوؤں میں شریک ہونے، ایک دوسرے کے دکھ درد بانٹنے اور باہمی مسرتوں کو پنپنے کے امکانات پر سوچ بچار کرتے رہے۔ آخرکار پیمانِ وفا باندھ لیا اور عہدِ رفاقت استوار بھی کر لیا۔ ان کے اس فیصلے کی تہ میں صرف پیار و محبت کا جذبہ ہی کارفرما نہ تھا۔ باہمی افہام و تفہیم کا احساس مشترک خوابوں کی کشش اور دائمی رفاقت کی آرزو بھی شامل تھی۔ اس میں خون کی گرمی اور جذباتی ہیجان سے زیادہ گہرے ذہنی لگاؤ اور وسیع قلبی مماثلت کے پائیدار تعلق کا اثر تھا۔

اس سمجھوتے کے اعلان سے پیشتر اس کا چرچا فیض کی والدہ محترمہ اور بڑے بھائی کے کانوں تک پہنچ گیا تھا۔ وہ سب لوگ حد درجہ پریشان ہو گئے۔ غم آشنا بوڑھی ماں نے سمجھا کہ ولایت کی کوئی شوخ و شنگ میم اس کے بھولے بھالے بچے کو دام فریب میں الجھا کر ہمیشہ کے لئے ماں کے پہلو سے چھین کر لے جا رہی ہے۔ بھائی کے سوچنے کا انداز مختلف تھا، ان کا خیال تھا کہ مغرب نژاد آزاد خیال لڑکی کتنی بھی اچھی کیوں نہ ہو، ہمارے معاشرے میں کسی صورت جچ نہیں سکتی۔ جس تمدن کی وہ پیداوار ہے اس کی نوعیت ہمارے تمدن اور طرزِ معاشرت سے قطعی مختلف ہے۔ ان کی تہذیب، ان کی روایات، ان کا کلچر یکسر علیحدہ اور جداگانہ ہے۔ ان کے کھانے پینے کے آداب، اٹھنے بیٹھنے کے اسلوب اور لباس و ستر پوشی کے تصورات ہماری بود و باش کے رنگ ڈھنگ سے کوئی مماثلت نہیں رکھتے۔ یہ ناممکن ہے کہ لندن کی فضا میں پلی ہوئی یہ لڑکی پنجاب کے ایک متوسط درجے کے گھرانے کے ماحول میں پنپ سکے۔ پھر فیض کی قلیل تنخواہ جو اس کی اپنی ضروریات کی کفیل نہیں ہو سکتی، ایک انگریز بیوی کے روزمرہ کے لوازمات

کس طور پورے کر سکے گی؟۔ اُسے تو صاف ماں، بیرے اور اردلی بھی درکار ہونگے، ہم میں تو اتنی بھی سکت نہیں کہ اس کے غازہ اور پوڈر کا خرچ بھی اٹھا سکیں۔

یہ تھے وہ اندیشے جو فیض کے اہلِ خاندان کو لاحق تھے۔ طفیل احمد ان دنوں لائل پور میں سب جج تھے۔ گرمی کی تعطیلات میں فیض وہاں آئے تو طفیل احمد نے مجھے بھی بلا بھیجا کہ فیض کے راہِ راست پہ لانے کا کوئی ڈھنگ سوچا جائے۔ انہوں نے اپنے خدشات مجھے بتائے اور تاکید کی کہ میں فیض کو اس مہلک اقدام سے باز رکھنے کی کوشش کروں۔ میں نے علیحدگی میں بیٹھ کر انتہائی سنجیدگی سے فیض کو ایک طویل وعظ دیا۔ طفیل احمد صاحب کے بتائے ہوئے نکات، تصریح اور وضاحت سے ان کے ذہن نشین کرانے کی کوشش کی۔ وہ حسبِ معمول مسکراتے رہے اور سنتے رہے، میرا زورِ خطابت ختم ہوگیا تو سنبھل کر بیٹھ گئے اور زندگی میں پہلی بار پوری شرح و بسط سے اپنی زندگی کے اس اہم ترین مسئلہ کے ہر پہلو پہ روشنی ڈالی، میں نے سمجھ لیا کہ یہ خالی عشق کا معاملہ نہیں کہ انجام و عواقب سے بے خبر ہو کر قدم اٹھایا جا رہا ہے۔ یہ تو ایسا فیصلہ ہے جو مسائلِ تلخ و شیریں لطیف و سنگین جزئیات پر پورا غور و خوض کر لینے کے بعد کیا گیا ہے۔ میں نے پوری ذمہ داری کے احساس سے فیض کے فیصلہ پہ صاد کیا۔ طفیل صاحب اور ان کی وساطت سے والدہ محترمہ کو بھی راضی کیا کہ فیض کے انتخاب کو خوشی منظور کریں، کیونکہ فیض کی زندگی، اس کے خیالات اور اس کے ارادوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس سے بہتر رفیقۂ حیات کا ملنا ممکن نہیں۔ خوش قسمتی سے بات سب کی سمجھ میں آگئی جن کے دل میں کوئی خدشہ باقی تھا وہ بھی رضامند ہوگئے۔ کیونکہ فیض جو ہر ایک کا محبوب تھا اس کی خوشی میں سدِ راہ ہونا کسی کو بھی گوارا نہ تھا۔

منگنی کا رسمی طور پہ اعلان کر دیا گیا۔ دونوں اپنے اپنے طور پر تیاریوں میں لگ گئے شادی کی رسوم اگلے سال لاہور میں منائی گئیں۔ صحیح اسلامی طرز میں نکاح ہوا۔ دلہن ڈاکٹر تاثیر کے گھر سے رخصت ہو کر سسرال آگئی۔ خوشدامن نے خوش آمدید کہا اور بیٹی کلثوم کہہ کر گلے لگایا مسس ایلیس جارج بیگم ایلیس فیض بن کر نئے گھر میں آگئیں۔

ایلیس کی حیرت انگیز تبدیلی کا اندازہ ان لوگوں کو ہو ہی نہیں سکتا۔ جنہوں نے شادی سے پہلے انہیں نہیں دیکھا یہ صرف زمیں اور لعبیں کی تبدیلی نہ تھی، قلب و دماغ کا انقلاب تھا۔ صرف نام نہیں بدلا گیا روح تک بدل گئی۔ طفیل احمد صاحب کے اندیشے ایک ایک کر کے غلط ثابت ہوئے۔ ایلیس نے جس عزمِ آہنی کے ساتھ مغرب سے رشتہ توڑا اور مشرق کو اپنایا ہے جس بے مثال جرأت اور گرمجوشی سے نئے وطن کی ذمہ داریوں کو قبول کیا ہے اس کی نظیر ملنا محال ہے۔ اس نے صرف فیض کے نام اور وطن کو ہی نہیں اپنایا۔ اس نے تو فیض کے اہلِ خاندان، اس کے دوستوں اور ساتھیوں تک کو اپنایا۔ وہ تو فیض کے ارادوں اس کی آرزوؤں بلکہ اس کے خوابوں میں بھی شریک ہوگئی۔ اس کا تن من فیض کی زندگی اور اس کے محبوب سپنوں کی نذر ہوگیا۔ جس رفاقت کا عہد دونوں نے امرتسر میں باندھا تھا۔ آج تک ان کی زندگی کا مقدس عقیدہ اور راہِ عمل کا منزل نما ہے۔ ایلیس کے حوصلے اور تحمل کا کمال ہے کہ اس نے فیض کی کاہلی، سستی اور تن آسانی سے بھی پیار کیا ہے۔ انتہائی کشادہ دلی اور محبت سے اس کی کمزوریوں اور بوالعجبیوں کو سینہ سے لگایا ہے۔ جس جاں نثاری اور بُردباری سے بیوی نے فنکار خاوند کے لئے جسم اور روح کی آسودگیاں اور ذہن و قلب کی آسائشیں مہیا کی ہیں فیض نے بھی پیاری بیوی کی پرخلوص رفاقت کا اسی طرح پورا پورا حق ادا کیا ہے، اس کی دلجوئی اور دلداری میں ذرہ بھر کمی نہیں

آنے دی۔ عورے سے بھی اس کے نازک آبگینۂ دل کو ٹھیس نہیں لگنے دی۔ اس کی خواہشوں کا احترام اور اس کے جذبات کی پاسداری اس طور سے کی ہے کہ ازدواجی زندگی کے چند ہی برسوں میں فیض کی کاہلی اور سہل انگاری کی ساری علامتیں چھوٹ گئیں۔ اس کی زندگی میں باقاعدگی، روزمرہ میں ترتیب اور قرینہ پیدا ہو گیا۔

شادی کے چند ماہ بعد فیض امرتسر سے لاہور آ گئے اور ہیلی کالج آف کامرس میں انگریزی کے پروفیسر مقرر ہو گئے۔ دوسری عالمگیر جنگ کو شروع ہوئے دوسرا سال تھا، برلن ٹوکیو محور قائم ہو چکا تھا۔ جنگ کے ہولناک شعلوں نے ساری دنیا کو لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ہمارے ملک کے جوان وحشی درندوں سے لڑنے مشرق و مغرب کے محاذوں پر پہنچ گئے تھے۔ اندرون ملک کی سیاست، کانگریس کے منفی کردار اور مسلم لیگ کے عرفیانہ ردِ عمل کے باعث بڑے نازک دور سے گزر رہی تھی۔ دہلی کے فوجی ہیڈکوارٹرز کے شعبۂ تعلیمات عامہ میں ایسے وسیع الخیال بیدار مغز اہل قلم کی ضرورت تھی جو اس قومی انتشار کے دنوں میں فوج کے جوانوں کے حوصلے بلند اور مورال MORALE درست رکھنے میں مددگار ہو سکیں۔ فیض کو ایک عہدے کی پیشکش کی گئی۔ فاشی رجعت پسندی اور جمہوریت کے اس تصادم میں ہر صحیح الدماغ انسان کی طرح فیض کی ذہنی اور عملی ہمدردیاں جمہوریت کے ساتھ تھیں۔ بلا تامل یہ پیشکش منظور کر لی گئی اور کپتان کی وردی پہن کر دہلی ہیڈکوارٹرز پہنچ گئے۔ مجید ملک صاحب پہلے سے موجود تھے، چراغ حسن حسرت بعد میں آ گئے۔ ان لوگوں نے اپنا کام اس سوجھ بوجھ اور خوش اسلوبی سے سرانجام دیا کہ بالائی کمان حیران رہ گئی۔ کپتان فیض پہلے میجر اور پھر جلد ہی کرنل بنا دیئے گئے۔ جنگ کامیابی سے ختم ہوئی تو کمانڈر انچیف جنرل آکنلک نے فیض کو بلا بھیجا، ان کی کارکردگی کو سراہا اور خواہش ظاہر کی کہ فوجی ملازمت سے تعلقات کا سلسلہ منقطع نہ کریں اور کسی موزوں آسامی پر تعیناتی کی پیشکش کی۔ فیض کا مشن پورا ہو چکا تھا۔ انکار کر دیا اور لاہور لوٹ آئے۔

اس زمانے میں دہلی میں پروفیسر بخاری، ڈاکٹر تاثیر، چراغ حسن حسرت، حفیظ جالندھری، آغا حمید اور راشد مختلف حیثیتوں میں جمع ہو گئے تھے، پرانے یار اکٹھا ہوئے تو لاہور کی محفلوں کی یاد تازہ ہو گئی۔ دن بھر اپنے اپنے دفتروں میں کام کرتے اور ہر شام کسی نہ کسی جگہ اجتماع ہو جاتا۔ نشست جم جاتی تو رات گئے تک شعر و شاعری اور خوش گپیوں کا سلسلہ چلتا رہتا۔ حسبِ معمول بخاری اور تاثیر ان محفلوں کی روحِ رواں تھے۔ قیام دہلی کے دوران فیض کے ادبی اور دوستانہ مراسم کا دائرہ اور وسیع ہو گیا تھا۔ ملک کے ہر گوشے کے علمی و ادبی مشاہیر دہلی آتے رہتے اور پنجاب کے ان "نامور" "سپاہ زمیندان" سے تعلقات استوار کر لینے کی سعادت سے بہرہ یاب ہوتے رہتے۔

دہلی میں فیض اور بیگم فیض کے ہاں پہلی بچی سلیمہ کی ولادت ہوئی تو میں بھی مبارکباد کے لئے وہاں گیا۔ فیض سے اس کے دفتر میں ملا اور دونوں اکٹھے گھر آئے۔ سچ جانیئے میں ایلس فیض کو بالکل نہ پہچان سکا۔ کھدر کی پھولدار پرنٹ کی قمیص، سفید لٹھے کا پاجامہ، ململ کا دوپٹہ اور رپشاوری چپل پہنے ایک عورت ڈرائنگ روم میں صوفے اور کرسیاں جھاڑ رہی تھی۔ فیض نے اس کے کان میں کچھ کہا اور برآمدے میں میرے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ دس پندرہ منٹ کے بعد وہی عورت کافی کی ٹرے اٹھائے آ گئی۔ اور السلام علیکم کہہ کر ٹرے ہمارے سامنے میز پر لگا دی۔ میں نے نظراً

کر دیکھا تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ یہ الیس تھیں۔ اس قلب ماہیت اور ہیئت کذائی کو دیکھ کر بے اختیار میرے منہ سے نکلا "محبت کا بول بالا"۔ فیض احمد صاحب کے اندیشوں کا بطلان اس کمال خوبصورتی سے ہوتا دیکھ کر میں عش عش پکار اٹھا۔

فوج کی ملازمت سے فراغت پائی تو تلاش روزگار کا مسئلہ پھر سامنے آیا۔ فیض ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ "پروگریسو پیپرز لمیٹڈ" کے نام سے ایک فرم قائم ہوئی۔ میاں افتخار الدین اس کے کرتا دھرتا تھے۔ انہوں نے ایک انگریزی روزنامہ پاکستان ٹائمز کے نام سے لاہور سے نکالنے کا اعلان کیا۔ ایک اچھے انگریزی اخبار کے لئے معقول سرمایہ، کافی سازو سامان، دفتر، چھاپہ خانہ اور ایڈیٹوریل اسٹاف درکار ہوتا ہے۔ ان لوازمات کے علاوہ ایک ایسا ایڈیٹر جو صحافت کا وسیع تجربہ، انگریزی زبان پر کامل دسترس رکھتا ہو، ملکی اور بین الاقوامی سیاست پر پورا عبور رکھتا ہو اور ساتھ ہی انتظامی صلاحیتوں کا مالک ہو۔ فرم نے بڑی کوشش کی کہ ملکی یا غیر ملکی، ہندوستانی یا انگریز کوئی ماہر اور اونچے پایہ کا ایڈیٹر دستیاب نہ ہو سکا۔ آخر کار فیض صاحب کی طرف رجوع کیا گیا۔ یہ ان کی قابلیت اور اہمیت کا کھلا اعتراف تھا۔ فیض نے اتنی بھاری ذمہ داری اٹھانے پر کچھ تامل کیا۔ انہیں اس قسم کے کام کا کوئی تجربہ نہ تھا مگر خود اعتمادی کی دولت حاصل تھی۔ حوصلہ مندی سے یہ ذمہ داری قبول کر لی۔

اخبار کے اعلان سے لے کر اشاعت تک جو ہفت خواں طے کرنے پڑتے ہیں ان کا علم تو اخبار کے مالکوں اور ایڈیٹروں کو ہی ہو سکتا ہے۔ فیض نے ان مراحل کو کس طرح سر کیا، ابتدائی مشکلات پر کس طرح قابو پایا یہ تو فیض ہی جانتے ہیں۔ لیکن ان کی شبانہ روز مساعی کا نتیجہ تھا کہ اخبار مقررہ تاریخ کی صبح کو پوری آب و تاب سے شائع ہو گیا۔ اخبار کی آن بان دیکھ کر کہنہ مشق صحافی اور تجربہ کار اخبار نویس بھی حیران رہ گئے۔ فیض نے اس نوکاشتہ پودے کی خونِ جگر سے آبیاری کی اور یہ پودا دنوں میں جوان ہو کر ایک تناور درخت بن گیا۔ اس کی شاخیں ملک کی سرحدوں کو پار کر کے دور دور تک پہنچ گئیں۔ اہلِ نظر فیض اور پاکستان ٹائمز کو لازم و ملزوم سمجھتے رہے ہیں۔ اخبار کے اداریوں اور کالموں میں فیض کے قلم نے حق و باطل کے سینکڑوں معرکے لڑے ہیں۔ ریاکار سیاست دانوں، بے رحم سرمایہ داروں اور سیہ کار جاگیرداروں کی ستم رانیوں کے پردے مجاہدانہ جرأت سے بے نقاب کئے ہیں۔ برطانوی سامراج کی ریشہ دوانیوں اور ہندو امپیریلزم کی سازشوں کی گہری چالوں کو پوری ہمت اور دیانتداری سے عریاں کرتے رہے ہیں۔ جنگ آزادی میں اس دو طرفہ یلغار اور جوڑ توڑ کا مردانہ وار مقابلہ کیا ہے۔ بہت کم لوگ تھے جن کو معاملہ کی نزاکت اور اغیار کی مہلک سازشوں کا صحیح علم تھا۔ فیض کی فراست ان چالوں کی سمت دیکھ رہی تھی، اس لئے وہ ان کے خوفناک نتائج کے تصور سے پریشان تھے۔

آزادی ملک کا اعلان ہوا، وطن کی تقسیم معرض وجود میں آئی۔ آٹھ کروڑ مسلمانوں کے خواب کی تعبیر پاکستان کی شکل میں جلوہ گر ہوئی۔ لیکن ساتھ ہی قتل و غارت گری کا ایسا ہولناک طوفان اٹھا کہ پنجاب کی سرزمین یکسر لالہ زار بن گئی۔ آگ اور خون کے اس کھیل میں ملک کے سُورِ ماؤں اور قوم کے بہادروں نے انسانیت کی دھجیاں اڑا دیں۔ ایسے ایسے کارنامے کئے کہ شرم و حیا کو منہ چھپانے کی جگہ نہ رہی۔ بوڑھوں اور بچوں کی سربریدہ نعشوں کے انبار، معصوم و بے بس لڑکیوں کی عصمت اور آبرو کے جنازے دیکھ دیکھ کر چاند اور سورج کی آنکھیں بھی پتھرا گئیں۔ گھر گھر سے دھواں اٹھا اور دل دل سے فریاد نکلی۔ آزادی کا آفتاب طلوع ہوا تو ایک طرف مسرت و انبساط کے شادیانے بجے، دوسری طرف آہ و فغاں کے دودِ سیاہ نے وطن کی فضا کو تاریک کر دیا۔ فیض کے دردمند دل سے بے اختیار صدا بلند ہوئی کہ ۔

یہ داغ داغ اُجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں!

فیض کو اپنے وطن سے دیوانگی کی حد تک پیار ہے۔ دیس کے رخِ زیبا پہ کہیں ذرا سی خراش آنے کا امکان ہو تو فیض بے قرار ہو جاتا ہے۔ پیکرِ وطن کے کسی عضو میں کانٹے کی چبھن ہو تو اس کا دل درد سے تڑپ اٹھتا ہے۔ وہ رات دن اس عروسِ محبوب کو بنانے سنوارنے کے خواب دیکھتا رہتا ہے۔ وطن کا عشق فیض کی زندگی کا قطب ستارہ ہے۔ اپنی محبوبہ کی آرائش و زیبائش اور تزئین و تجمیل کی خاطر سمندر کی تہ سے آبدار موتی اور آسمان سے تارے توڑ لانے پر آمادہ ہے۔ وہ اس کے بال بال میں موتی پرونے اور رنگ مانگ پہ ستارے جھلملاتے دیکھنے کا آرزومند ہے۔ فیض عشق کرتا ہے تو اس کے جسم و روح کی ساری قوتیں معشوق کی ذات پہ مرکوز ہو جاتی ہیں۔

مارچ ۱۹۵۱ء میں فیض "راولپنڈی سازش کیس" میں ماخوذ ہو کر گرفتار ہوئے۔ فوجی افسروں اور جرنیلوں کی دھڑا دھڑ گرفتاریوں اور کئی غیر فوجی شہریوں کی پکڑ دھکڑ کا سلسلہ کچھ اس قدر عجلت اور تیزی سے عمل میں آیا کہ سارے ملک میں خوف و دہشت کی فضا چھا گئی۔ اخبارات نے اس واقعہ کو کچھ اس انداز میں پیش کیا کہ ہر جانب گھبراہٹ اور سراسیمگی پھیل گئی۔ ہر شخص مشوش اور ہراساں تھا۔ کہ نہ جانے کیا ہونے والا تھا اور خدا معلوم کیا ہونے والا ہے!!

مجھے فیض کی گرفتاری کی خبر اور اخبارات میں دیئے ہوئے سازش کے بھیانک نقشہ نے سراسیمہ کر دیا۔ کچھ عجب بے بسی اور گومگو کی حالت تھی، کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ ادھر صوبائی اسمبلی کے انتخاب شروع ہو رہے تھے اور اگلے دن میرے گاؤں کا پولنگ تھا۔ میں مسلم لیگ پارٹی میں شامل تھا اور ایک مسلم لیگی امیدوار کی حمایت کر رہا تھا۔ سوچا کہ پولنگ کا جھمیلا نمٹا کر لاہور جاؤں گا اور فیض کے گھر جا کر دریافتِ احوال کروں گا۔ چار پانچ دن میں ادھر سے فراغت ملی تو لاہور پہنچا۔ اور بیگم فیض سے حالات پوچھے۔ وہ بے چاری بالکل بے خبر اور اس اچانک افتاد سے سخت گھبرائی ہوئی تھی۔ اس معاملہ کا اسے کچھ بھی علم نہ تھا۔ بلکہ اس ضمن میں ایک عجیب لطیفہ ہو گیا، اس نے بتایا کہ رات کے دو بجے کا وقت ہو گا کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے دیکھا کہ ہمارے کمرہ کی کھڑکی کے شیشوں پر ٹارچ کی روشنی پڑ رہی ہے جو کبھی بجھ جاتی ہے اور کبھی دائیں بائیں حرکت کرتی معلوم ہوتی ہے۔ میں بستر سے اٹھی اور کھڑکی کھول کر نیچے دیکھا۔ نیم تاریکی میں مجھے متعدد آدمی کھڑے اور سرگوشیوں میں باتیں کرتے معلوم ہوئے۔ ان میں سے اکثر رائفلوں، بندوقوں اور پستولوں سے مسلح تھے۔ ٹارچ کی روشنی چمکی تو پولیس کی وردیاں نمایاں طور پر نظر آ گئیں۔ میں نے کھڑکی بند کی اور فیض کو جگایا اور صورت حال واضح کی۔ ان سے پولیس کی اس بے وقت آمد کا باعث پوچھا، مسکرا کر کہنے لگے ہم اخبار نویسوں کے گھروں کی آئے دن تلاشیاں ہوتی رہتی ہیں۔ کچھ ایسا ہی قضیہ ہو گا۔ تلاشی کے ذکر سے مجھے یاد آ گیا کہ ہماری الماری میں ایک دو بیئر کی بوتلیں رکھی ہیں، ایسا نہ ہو کہ تلاشی کے دوران پکڑی جائیں اور خواہ مخواہ آبکاری احکام کی توضیع کے لئے کسی ضابطہ کے تحت دھر لئے جائیں، اور جگ ہنسائی کا موجب بنیں۔ میں نے دونوں بوتلیں نکالیں اور مکان کے پشت کی جانب نیچے دیوار پر دے ماریں۔ بوتلوں کے ٹوٹنے سے جو دھماکہ ہوا تو پولیس کے جوانمرد گھبراہٹ میں پیچھے بھاگے۔ نہ جانے انہیں اس دھماکہ سے کیا شبہ ہوا۔

تھوڑی دیر بعد ہوا کی بجائے کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ فیض نے جا کر دروازہ کھولا اور آنے کی وجہ دریافت کی۔ پولیس کے چند اعلیٰ افسر موجود تھے۔ انہوں نے فیض کی گرفتاری اور مکان کی تلاشی کے وارنٹ دکھائے۔ تلاشی شروع ہو گئی۔ گھر کا کونہ کونہ دیکھا گیا۔ کپڑوں کے بکس، کتابوں کی الماریاں، اخبارات اور رسائل کے فائل، غرض ہر چیز زیر و زبر کر کے رکھ دی۔ بڑی دیر کے بعد اس کام سے فارغ ہوئے تو فیض سے تیار ہونے کو کہا۔ انہوں نے ہاتھ منہ دھو کر کپڑے بدلے اور مسکراتے ہوئے چلنے کو تیار ہو گئے۔ میری پریشانی دیکھ کر کہنے لگے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ کسی سلسلہ میں پوچھ گچھ کے لئے گرفتار کیا ہے ڈیڑھ دو گھنٹہ میں لوٹ آؤں گا۔" سوئی ہوئی بچیوں پر ایک نظر ڈالی، مجھ سے یہ کہہ کر سیڑھیاں اتر گئے کہ "ناشتہ پر واپس آجاؤں گا"۔ اور نیچے پولیس کی گاڑی میں جا بیٹھے۔ اُدھر مشرق میں صبح کی سپیدی نمودار ہو رہی تھی اِدھر پولیس کی گاڑی چل پڑی۔

فیض کی گرفتاری سے کر رہائی تک کچھ اوپر چار برس کی داستان میجر محمد اسحاق نے روداد قفس کے نام سے زنداں نامہ کے ابتدائیہ میں لکھ دی ہے۔ میجر صاحب فیض کے ساتھ اسیر زنداں رہے ہیں۔ اس لئے ان سے بڑھ کر کوئی بھی اس روداد سے واقف نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے ایام اسیری کا خاکہ جس جامعیت اور خوبصورتی سے بیان کیا ہے کہ اس سے بہتر تذکرہ تصور میں نہیں آسکتا۔ میں نے بھی کئی بار سرگودھا اور منٹگمری جیل میں فیض سے ملاقات کی تھی۔ فیض کی حالت وہی تھی جو میجر صاحب نے بیان کی ہے البتہ ایک دو باتیں ایسی ہیں جن کا ذکر اس لئے ضروری سمجھتا ہوں کہ میرے خیال میں ان کے بغیر داستانِ اسیری ادھوری رہ جائے گی۔ وہ ہے دوران اسیری بیگم فیض کا کردار۔

فیض گرفتار ہوئے اور نہایت سنگین الزامات میں ماخوذ کئے گئے۔ ایسے الزامات کے درست ثابت ہو جانے کی صورت میں موت کی سزا یقینی تھی۔ حالات اتنے بھیانک اور مایوس کن تھے کہ جن کے تصور سے بھی جی کانپتا تھا۔ فیض کے بعد صرف دو شخص تھے جن پر گھر بار سنبھالنے اور مقدمہ کی پیروی کا سارا بوجھ آپڑا تھا۔ ایک بڑے بھائی طفیل احمد تھے اور دوسری بیگم فیض۔ بھائی سرکاری ملازمت میں تھے۔ تنخواہ محدود اور کنبہ کے اخراجات کا سارا بار۔ کچھ بھی پس انداز نہ کر پاتے تھے۔ ادھر فیض کی گرفتاری کے ساتھ ہی ان کی تنخواہ بند ہو گئی تو آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ رہا اور اخراجات بدستور موجود۔ ان حوصلہ شکن حالات میں مقدمہ کی پیروی کے لئے روپیہ کہاں سے آئے۔ ملزم کے لواحقین بھاری رقوم کے عوض ملک کے چوٹی کے وکلاء کی خدمات حاصل کر رہے تھے۔ طفیل احمد اور بیگم فیض کی پریشانی کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔ لیکن ان کی پُرخلوص مساعی اور انتھک جدوجہد کا نتیجہ تھا کہ مقدمہ کے بھاری اخراجات کا انتظام بھی ہوتا رہا۔ اور گھر کے روز مرہ میں بھی فرق نہ آنے دیا۔ طفیل احمد نے عزیز بھائی کی رہائی کے لئے انتہائی ناموافق حالات میں جس جانفشانی اور تندہی سے کوشش کی ہے اس کا بیان آسان نہیں۔ فیض ان کو بے حد عزیز تھے فیض کی اسیری کا دکھ، مقدمہ کی سنگین نوعیت کا احساس، شبانہ روز بھاگ دوڑ کا اضمحلال ان کے ذہن و قلب پہ وہ فشار پڑا کہ فیض کی ملاقات کو حیدرآباد گئے اور زندہ واپس نہ لوٹے۔

لیکن بیگم فیض کی ذات صبر و تحمل اور ہمت و حوصلہ مندی کی سنگین چٹان ثابت ہوئی کہ غم و اندوہ کے طوفان، یاس و نا امیدی کی آندھیاں، تنگی و عسرت کے جھکڑ، اور دکھ درد کے بے رحم تھپیڑے اس کے پائے ثبات میں ذرا سی لرزش بھی پیدا نہ کر سکے۔ اس کے آہنی عزم و استقلال کی مثال پیدا کرنا محال ہے۔ پیارا خاوند جس کے لئے ماں باپ بھائی بہن چھوڑ سات سمندر پار

رشید حمید

اجنبی دیس کو وطن بنایا، اسیرِ قید و بند، الزام ایسا سنگین جس کی سزائے موت یا کم از کم عمر قید، فضا اتنی مسموم کہ کسی طرف سے ہمدردی کا بول تک نہ آئے۔ تنہائی اور بے بسی کا یہ عالم کہ خون کے رشتہ دار کالے کوسوں دور اور نزدیک کے دوست احباب قریب تک آتے سے ہراساں، ضرورت کی یہ صورت کہ ہزاروں کی احتیاج اور تنگدستی کی یہ کیفیت کہ بچیوں کی تعلیم اور خوراک و لباس تک کا انتظام محال۔ ایسے جان لیوا حالات میں بھی ہار نہ ماننا تعجب کی بات نہیں۔ مگر ثبات و عزیمت کی اس دیوی پہ ہزاروں سلام ہوں کہ ایک لمحہ کے لئے مایوس نہیں ہوئی تھوڑی دیر کو بھی حوصلہ نہیں ہارا۔

پاکستان ٹائمز اخبار میں نوکری کر لی۔ نوکر چاکر رخصت کر دیئے صرف ایک معمر آدمی معمولی تنخواہ پہ رکھ لیا کہ غیر موجودگی میں مکان پہ موجود رہے۔ منہ اندھیرے اٹھ کر مکان کی صفائی کرتی، ناشتہ تیار کر کے بچیوں کو اٹھاتی۔ نہلا دھلا ناشتہ کھلا ان کو اسکول روانہ کرتی اور آپ بائیسکل پہ سوار ہو کر اخبار کے دفتر پہنچ جاتی۔ دن بھر وہاں جان مارتی اور بچیوں کی اسکول سے واپسی سے پہلے گھر پہ موجود ہوتی۔ بچیوں کے معمول میں فرق آنے دیا نہ دفتر کے اوقات اور اپنے دیگر فرائض کی انجام دہی میں کمی آنے دی۔ وکیلوں کے دفاتر کے چکر، قانونی مشیروں کے پاس بھاگ دوڑ اس پہ مستزاد۔ رات کے چند گھنٹے آرام کے ملتے مگر وہی وقت تھا جب گھر کے دھندوں کا جائزہ لیتی۔ خطوں کے جواب لکھتی اور فیض کو حوصلہ افزا پیغام بھیجتی۔ ہر ہفتہ کچھ نہ کچھ پس انداز کرتی اور دوسرے تیسرے ہفتے کبھی تنہا کبھی بچیوں کے ہمراہ جیل میں فیض کی ملاقات کو پہنچتی۔

کسی پاکستانی خاتون کو ان حالات کا سامنا کرنا پڑتا تو شاید رونے دھونے یا شکوہ و فریاد سے ہی ان کو فرصت نہ ملتی چہ جائیکہ ان روح فرسا آزمائشوں میں ثابت قدم رہ سکتی۔ میرا مقصد اپنی بہنوں کی تحقیر و توہین نہیں ہے۔ خال خال مثال ہمارے معاشرہ کی خواتین میں بھی ایسی دستیاب ہو جائے گی۔ اس کے لئے چراغ لے کر ڈھونڈنا پڑے گا۔ اس سلسلہ میں بیگم حسرت موہانی کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ان کی ہمت و حوصلہ، جاں نثاری اور مستقل مزاجی کے محاسن لائق تحسین تھے مگر ان کو بھی ایسے جانگداز اور صبر آزما مصائب کا سامنا کرنا نہیں پڑا جن سے بیگم فیض کو واسطہ پڑا۔ پھر [illegible] کی بنتِ عم، بھائی بہنیں اور کنبہ کے افراد اور ہمدرد و غمگسار اعزا کی بھی کمی نہ تھی۔

فیض ابھی حیدرآباد جیل میں تھے اور مقدمہ کی سماعت ختم نہ ہوئی تھی کہ مجھے لاہور جانے کا اتفاق ہوا۔ ملاقات کے دوران میں نے جھجکتے جھجکتے بیگم فیض سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا "فیض کے لئے تو میں کچھ نہیں کر سکتا ایک دوست کی حیثیت سے میرا فرض ہے کہ ان کی غیر حاضری میں ان کے بال بچوں سے ہمدردی اور غمگساری کروں اور پریشانیوں میں آپ کا تھوڑا بہت بوجھ اٹھاؤں۔ میں چاہتا ہوں کہ کچھ اناج، گھی، گڑ، شکر اور دال وغیرہ گاؤں سے بھجوا دیا کروں۔ آپ کو ان چیزوں کی ضرورت بھی ہے۔ اور میرا اس پہ کچھ خرچ نہیں آئے گا۔ میرے لئے یہ خوشی کا باعث ہوگا آپ اس کی اجازت دے دیجئے۔"

بیگم فیض بالکل چپ چاپ بیٹھ گئیں۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد آنکھیں بھیگ گئیں۔ پھر سنبھل کر نہایت متانت سے کہنے لگیں "حمید! اس میں شک نہیں کہ گھر میں ان چیزوں کی ضرورت ہے اور اخراجات سے عہدہ برآ ہونا بھی محال ہو رہا ہے۔ مجھے آپ کے اور فیض کے تعلقات کا بھی پورا علم ہے۔ اگر مشکل میں کسی دوست کو پکارنا پڑے تو غالباً آپ کا نام پہلے ہی آئے گا۔ لیکن برا نہ مانیے میں چاہتی ہوں کہ فیض کی غیر حاضری میں سارا بار میں خود ہی اٹھاؤں۔ میرے لئے یہ صرف فرائض کا نہیں محبت کا بوجھ ہے۔ اس میں دوسرے کی شرکت مجھے گوارا نہیں۔ اس سے میری خودداری مجروح ہو جائے گی۔ مجھے یقین ہے آپ کو غلط فہمی نہیں ہوگی۔"

زندگی میں دکھوں اور غموں کا بوجھ تو ڈھونا ہی پڑتا ہے، اسے خندہ پیشانی سے ہنستے کھیلتے اٹھانا ہر کسی کا کام نہیں۔ لیکن اس کو محبت کا مقدس اور پیارا بوجھ سمجھنا بیگم فیض جیسی اولوالعزم اور جانباز چند ہی ہستیوں کا عقیدہ ہو سکتا ہے۔ قید میں فیض نے ہزاروں دکھ اٹھائے ہوں گے۔ کرب و اذیت کے ان گنت لمحے گزارے ہوں گے۔ بیوی اور بچوں کی جدائی شاق گزری ہوگی۔ مگر چار برس میں ایلس نے گھر کی طرف سے پریشانی کا ایک بھی گرم جھونکا فیض تک نہیں پہنچنے دیا۔ فیض کا حوصلہ بلند رکھنے اور پائے ثبات میں لغزش نہ آنے دینے میں جہاں اس کی اپنی بلا نوش طبیعت کے صبر و ہمت کا اعجاز ہے وہاں اس میں ایلس کی جاں سپاری و جاں نثاری کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔

نقش فریادی فیض کے ابتدائی دور کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے۔ دستِ صبا اور زنداں نامہ ایامِ اسیری کی یادگار ہیں۔ دستِ تہِ سنگ میں رہائی سے لے کر اب تک کی شعری تخلیقات شامل ہیں۔ آخری دور خاصا طویل ہے مگر زمانہ اسیری کے مقابلہ میں اشعار کی پیداوار بہت کم ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ قید کا زمانہ بہت پرآشوب تھا۔ جذبات میں تموّج اور ذہن میں ہر وقت ہیجان کی کیفیت تھی۔ ایسا وقت تخلیق شعر کے لئے مناسب ہوتا ہے۔ شاعر اپنی ہر واردات قلب کو شعر کے قالب میں ڈھالتا چلا جاتا ہے۔

رہائی کے بعد طبیعت میں ایک طرح کا ٹھہراؤ پیدا ہو گیا۔ جذبات میں وہ شدت اور ذہن میں خلجان کی وہ طوفانی کیفیت نہیں رہی۔ کبھی کبھار کوئی غیر معمولی حادثہ گزر جائے جو خیالات میں لرزش اور ذہن میں جھنجھلاہٹ پیدا کر دے تو کسی نظم یا غزل کا موضوع سوجھ جاتا ہے۔ مواد اندر ہی اندر پکتا رہتا ہے اور کسی موزوں ساعت میں نظم مکمل ہو جاتی ہے۔ تخلیق کی رفتار گو بہت مدھم ہے مگر خیالات کی گھلاوٹ میں پختگی اور الفاظ کے انتخاب میں سنجیدگی بہت بڑھ گئی ہے۔ معنی و بیان میں تناسب اور خیال و بندش میں موزونیت کا حسن کمال پہ پہنچ گیا ہے۔

فیض کا شعری افق اب مشرق سے مغرب تک پھیلا ہوا ہے۔ ساری دنیا اس کے تخیل کی آماجگاہ ہے اور کل کائنات اس کی ذہنی پرواز کا میدان۔ جہان کے کسی بھی کونے میں دکھ درد کی آواز اٹھے، فیض کا دل تڑپ اٹھتا ہے اور شعر کا موضوع ہاتھ آجاتا ہے۔

'دستِ تہِ سنگ' محض ایک علامتی استعارہ ہی نہیں ہے۔ شاعر کی ذہنی کیفیت کا ایک واضح نشان اور اس کی قلبی واردات کے بیان کا محاورہ ہے۔ ناداری، بھوک اور غم کے سنگِ گراں بار تلے پسی ہوئی بے کس مخلوق کی کراہ، ستم کش مزدوروں کے زخمی دلوں کی آہ، سامراجی قزاقوں کی لوٹ کھسوٹ سے تباہ حال قوموں کی فریاد، اجنبی ہاتھوں کے گرانبار ظلم سہتی ہوئی دنیا کی پکار، عزت و ناموس کے ڈاکو، عفت و آبرو کے لٹیرے، سیہ کار سرمایہ داروں کے خونی پنجہ میں تڑپتی بے بس حسینوں کی سسکیاں، درد و کرب کی جاں سوز چیخ بن کر فیض کے دل میں اتر گئی ہے۔ جہان بھر کے ستم رسیدوں کی تڑپ شاعر کے دل کی دھڑکن بن گئی ہے۔ وہ شدت و کرب سے تلملاتا ہے چیخنا چاہے تو چیخ نہیں سکتا، نالہ و فغاں کی اجازت نہیں کہ گوشِ سماعت پہ گراں گزرتی ہے۔ بیچارے کی کیفیت اس اچکے کے مشابہ ہے جس کا ہاتھ کسی بھاری پتھر کے نیچے آگیا ہو۔ اور ڈر کے مارے اونچی آواز سے رو بھی نہیں سکتا ہو۔ دبی دبی آہیں رکے رکے آنسو، سہمی سہمی فریادیں۔ شاعر کا روز مرہ کا مشاہدہ ہی نہیں، تجربہ بھی ہے۔ تلخابۂ غم کے یہی وہ گھونٹ ہیں جو دستِ تہِ سنگ کے شعری آبگینوں میں پیش کر رہا ہے۔

فقیر سید وحید الدین

فیض ایک دوست ایک دانشور

فیض فطرتاً بہت اچھے دوست، بہت اچھے انسان اور بہت اچھے دانشور کی حیثیت سے مجھے بھی جانے پہچانے ہیں۔ ان کی پرخلوص دوستی کے متعلق میرے احساسات اور تجربات آج بھی وہی ہیں جو کم و بیش بیس سال پہلے تھے۔ جب ہم لوگ دہلی میں فوجی ملازمت کے سلسلہ میں اکٹھے رہے۔ اس زمانے کی دلچسپ ملاقاتوں کی یاد ذہن پر ابھی تک نقش ہے۔

فیض اس وقت بھی شعر کہتے تھے لیکن اب تو انھیں بحیثیت ادیب، شاعر، نقاد اور صحافی آفاقی شہرت حاصل ہے۔ ان کی شہرت اور کمال فن میں ان کے جوہر طبع کو زیادہ دخل ہے یا مشق و جستجو کو؟ یہ سوال اگرچہ کئی بار ذہن میں ابھرا لیکن اس کا صحیح جواب پروفیسر محمد سلیم چشتی صاحب کی ایک ملاقات میں خود بخود مل گیا۔ سلیم چشتی صاحب علامہ اقبال کے ہم عصر اور محفل اقبال کے خوشہ چین ہونے کے علاوہ ۱۹۲۸ء میں مرے کالج سیالکوٹ میں لیکچرار بھی رہ چکے ہیں۔ ان دنوں وہ ایف اے کلاس کو انگریزی اور بی اے کے طلباء کو اردو پڑھاتے تھے۔ فیض نامی ایک متین ذہین لڑکا بھی فرسٹ ایر میں ان کا شاگرد تھا۔ چشتی صاحب کا بیان ہے کہ

"یہ لڑکا اپنی شرافت سنجیدگی، بردباری، کم آمیزی اور رکھ رکھاؤ کی وجہ سے میری ساری کلاس میں ممتاز تھا؟

اکتوبر میں جب کالج میں Tutorial Groups بنے تو حسن اتفاق سے یہ لڑکا چشتی صاحب کے گروپ میں شامل ہو گیا۔ چشتی صاحب نے اپنے فلسفیانہ ذوق کی مناسبت سے اس گروپ کا نام "اخوان الصفا" رکھا۔ طے پایا کہ گروپ کے زیر اہتمام ہر ماہ کالج میں ایک محفل مشاعرہ بھی منعقد کی جائے۔ انہوں نے پہلے مشاعرہ کے لئے یہ مصرع طرح تجویز کیا ؎

غمزہ نہیں ہوتا کہ اشارا نہیں ہوتا

نومبر ۱۹۲۸ء کے پہلے ہفتے میں مرے کالج میں پہلی مرتبہ یہ محفل مشاعرہ منعقد ہوئی۔ اس مشاعرہ میں مذکورہ بالا نوجوان نے بھی جس کی عمر ۱۶ سال سے کچھ ہی زائد تھی ایک غزل پڑھی اور جب یہ شعر سنایا ؎

لب بند ہیں ساقی میری آنکھوں کو پلا دے
وہ جام جو منت کش صہبا نہیں ہوتا!

تو چشتی صاحب فیض کی کم عمری کے پیش نظر شعر موزوں کرنے کی اس استعداد سے نہایت متاثر ہوئے اور ان کے ایک ہم جماعت رحمت اللہ

بیدل سے کہا۔

" اگر یہ لڑکا زندہ رہا اور اسی طرح مشق سخن کرتا رہا تو آگے چل کر اس کا شمار ہندوستان کے پہلی صف کے شعراء میں ہوگا۔"

چشتی صاحب کی اس پیش گوئی کو اب ۳۶ سال گزر چکے ہیں اور آج واقعی فیض کا شمار نہ صرف ہند و پاک کے مشہور دانشوروں میں ہے بلکہ اپریل ۱۹۶۲ء میں انھیں روس کا سب سے بڑا اعزاز "لینن پرائز" بھی حاصل ہو چکا ہے۔ یہ پرائز اس سے قبل ہندوستان میں ڈاکٹر سیف الدین کچلو کو ملا تھا۔ اور امن عالم کے قیام کی کوششوں کے سلسلے میں انڈونیشیا کے صدر سوئیکارنو اور گھانا کے صدر نکرومہ کو بھی مل چکا ہے۔ پہلے اس اعزاز کو اسٹالن پرائز کہا جاتا تھا۔ لیکن خروشیف کے زمانے میں اسے لینن پرائز کا نام دیا گیا۔ یورپ میں طویل عرصے قیام کے بعد فیض گذشتہ سال اپنے وطن واپس آئے ہیں۔ اور ان کا نام ملکی صحافت، قومی ثقافت، آرٹ، ادب اور شاعری کی زینت بنا ہوا ہے وہ ثقافتی سرگرمیوں علمی مجلسوں اور شعری محفلوں کی روح رواں ہیں۔

ان کی نجی زندگی کے متعلق بہت سی باتیں ایسی ہیں جو خاصی دلچسپ تو ہیں لیکن عام نہیں ہیں

فیض ۱۹۱۱ء میں سیالکوٹ جیسی مردم خیز سرزمین میں پیدا ہوئے جسے شاعر مشرق علامہ اقبال جیسی باعظمت ہستی کی پیدائش کا فخر حاصل ہے۔ ان کے اکثر بزرگ زراعت پیشہ تھے۔ لیکن فیض کے والد سلطان محمد خاں ذی حیثیت ہونے کے علاوہ اہل علم اور صاحب تصنیف بھی تھے کئی سال امیر عبدالرحمٰن کے ہمراہ افغانستان میں رہے۔ اردو انگریزی میں کئی کتابیں تصنیف کیں، افغانستان کے دستوری قوانین اور "تزک امیر" انگریزی میں ایک ناول ——— (THE WAZIRS DAUGHTER) جس کا اردو ترجمہ "دختر وزیر" کے نام سے شائع ہوا۔ فیض کو بچپن میں مسجد شیخ حسام الدین میں بھیجا گیا جہاں انھوں نے مولوی محمد ابراہیم سیالکوٹی سے قرآن شریف پڑھا۔ اور مکتب میں مولوی میر حسن کے شاگرد رہے۔ ۱۹۲۱ء میں اسکاچ مشن اسکول سے میٹرک ۱۹۲۹ء میں مرے کالج سیالکوٹ سے ایف، اے پاس کیا فیض کو ان دنوں پھر مولوی میر حسن سے عربی پڑھنے کا موقع ملا، چونکہ عربی ان کے منتخب مضامین میں شامل تھی۔ جب وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہونے لگے۔ تو اس موقع پر انھیں علامہ اقبال کی تائید و سعادت حاصل تھی۔ علامہ کا خط لکھ کر وہ کالج گئے، داخل ہوئے۔ اور ۱۹۳۱ء میں اعزاز کے ساتھ بی اے پاس کیا اور عربی میں آنرز کیا۔ ۱۹۳۳ء میں انگریزی میں اور ۱۹۳۴ء میں عربی میں ایم اے پاس کر کے ایم اے او کالج امرتسر میں لیکچرار بن کر چلے گئے۔ وہاں ۱۹۳۹ء تک انگریزی، اردو اور عربی پڑھاتے رہے ۱۹۴۰ء میں ہیلی کالج لاہور میں آگئے۔ اور ۱۹۴۲ء تک انگریزی کے لیکچرار رہے پھر اپنے محسن اور استاد مجید ملک صاحب کی تحریک پر ۱۹۴۲ء میں فوج کے شعبۂ تعلقات عامہ سے وابستہ ہو گئے۔ جہاں بطور کیپٹن ان کا تقرر عمل میں آیا۔ ۱۹۴۳ء میں میجر اور ۱۹۴۴ء میں لیفٹیننٹ کرنل کے عہدہ پر ترقی یاب ہوئے۔ قیام پاکستان سے ذرا قبل قائد اعظم محمد علی جناح کی زیر سرپرستی لاہور سے انگریزی روزنامہ پاکستان ٹائمز جاری کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ نواب افتخار حسین ممدوٹ اور سردار شوکت حیات کی تجویز اور تحریک پر فیض احمد فیض کو اس نئے انگریزی روزنامے کا چیف ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ فیض دسمبر ۱۹۴۶ء میں فوج سے مستعفی ہو کر لاہور آ چکے تھے چنانچہ ۴ فروری ۱۹۴۷ء سے پاکستان ٹائمز کی باقاعدہ اشاعت شروع ہوگئی۔ پاکستان ٹائمز جیسا انگریزی روزنامہ نکالنا اس زمانے میں مسلمانان پنجاب کے لئے بالکل نیا تجربہ تھا۔ لیکن فیض کی خداداد ذہانت اور شب و روز جد و جہد نے اسے کامیابی کی ایسی راہ پر ڈال دیا کہ پھر وہ اکثریتی فرقے کے دباؤ، حکمرانوں کی سخت گیری اور ناموافق حالات کے روکے نہ رک سکا۔

شروع میں پاکستان ٹائمز سول ملٹری گزٹ پریس میں چھپتا تھا لیکن قیام پاکستان کے فوراً بعد اخبار "ٹریبون" بند ہو گیا۔ اور بلڈنگ مع پریس پاکستان ٹائمز کے لئے خرید لی گئی! جہاں سے وہ اب تک شائع ہوتا ہے۔ اردو روزنامہ "امروز" بھی انھیں کی ادارت میں جاری ہوا۔ مولانا چراغ حسن حسرت اور ایوب کرمانی ان کے معاون اور رفیق ادارت تھے۔ اس اخبار نے اردو صحافت کے لئے جو جدید راہیں اور

نئی منزلیں تلاش کیں۔ آج ملک کی پوری اردو صحافت ان پر چل رہی ہے۔ اور نئی اعتبار سے حیرت انگیز ترقی کر چکی ہے۔ خبر نویسی، اداریہ، مقالات و قائع نگاری، تدوین کے نئے زاویۂ نگاہ اور کتابت و طباعت سے لیکر تصاویر تک کتنی ہی باتیں ایسی ہیں، جن کا تجربہ پہلی بار "امروز" میں کیا گیا تھا لیکن فیض کی ادارت میں ان اخبارات نے کاروباری منفعت سے زیادہ عوام کی ذہنی نشوونما اور احساسات کی راہنمائی و بیداری کا کام کیا۔

جہاں تک میرے علم میں ہے فیض نے کسی سے اصلاح نہیں لی۔ نہ کبھی محض نمود و نمائش اور داد و ستائش کے لئے شعر کہا۔ انھوں نے شاعرانہ تخلص کی رسم بھی نہیں اپنائی۔ جبکہ ان کا موجودہ نام فیض احمد فیض فوجی ملازمت کے آغاز پر محض اتفاقی طور پر کسی نے کاغذات میں درج کر دیا۔ جسے بعد میں انھوں نے تبدیل کرنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ اور یوں آہستہ آہستہ وہ ملک بھر بلکہ ساری دنیا میں فیض احمد فیض مشہور ہو گئے۔ ان کا پہلا مجموعہ کلام ۱۹۴۱ء میں "نقش فریادی" کے نام سے شائع ہوا۔ دوسرا مجموعہ "دست صبا" ۱۹۵۲ء کے دور اسیری کی یادگار ہے اور اس کے اب تک پانچ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ تیسرا مجموعہ کلام جس کا نام "زنداں نامہ" ہے دوسرا نامہ سودا کا یہ شعر ہے ؎

اے ساکنان کنج قفس ! صبح کو صبا
سنتی ہی جائے گی سوئے گلزار، کچھ کہو !

کہاں اور کن حالات میں مرتب ہوا۔ یہ بیان بالکل ہے۔ بہرحال یہ ۱۹۵۶ء میں شائع ہو کر مقبول عام ہوا۔ ایک بار تینوں مجموعوں کے نئے ایڈیشن شائع کرنے کا تذکرہ ہوا۔ تو فیض نے بتایا کہ وہ ان تینوں مجموعوں کو یکجا کر کے عنقریب شائع کرنا چاہتے ہیں۔ جس کا نام ہوگا "دست تہ سنگ" نثر میں فیض کی ایک تصنیف "میزان" کے نام سے ۱۹۶۱ء میں شائع ہو چکی ہے جو دراصل تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔

فیض سے جو لوگ پہلی بار ملتے ہیں۔ ان کی کم آمیزی سے غلط فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ فیض اور کبر و نخوت دو متضاد باتیں ہیں۔ ان کی کسر نفسی اور بے نیازی کا رنگ کچھ قریبی دوستوں ہی سے پوچھئے۔ وہ خاموش لیکن جہاں دیدہ اور جہاں بیں انسان ہیں۔ جب دیکھتا ہوں کچھ سوچتے ہوئے پاتا ہوں، واقعات زمانہ کی اتھل پتھل اور حوادث گرد و پیش کی ناسازگاری کا نہ ان کے ذہن پر کوئی منفی اثر ہوتا ہے نہ موڈ پر۔ بہت سے بڑے بڑے مسائل کا تجزیہ وہ یوں کرتے ہیں۔ جیسے وہ بالکل روایت اور معمول کے مطابق تھے۔ ان کی اہمیت عارضی اور ان کا حل یقینی ہے زندگی میں آزمائشوں اور مصائب و آلام کو انھوں نے اس سے زیادہ شاید ہی سمجھا ہو، کہ ہوا کا ایک جھونکا زد سے آیا اور گذر گیا۔ لیکن دوسروں کا دکھ درد دیکھنا اور برداشت کرنا ان کے بس کی بات نہیں۔ گفتگو کے دوران ایک دفعہ میں نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔

"فیض جیل کتنی بار گئے ہو ؟"

بڑی ہی بے نیازی سے جواب دیا۔ "بس کوئی تین دفعہ !"

مزید تحقیق کی، تو اسی بے پروائی اور مختصر انداز میں کہا۔ "پہلی دفعہ ایک دن کے لئے، دوسری دفعہ چار سال، اور تیسری دفعہ چار ماہ۔"

آج کل فیض سر عبداللہ ہارون کالج کراچی کے پرنسپل ہیں۔ لیکن انھوں نے جتنے دن اپنا تعلق صحافت سے رکھا، اخلاقی جرأت، بیباکی، بے خوفی اور حق گوئی کی چٹان بن کر رہے مصلحت کوشی، چاپلوسی، اور قصیدہ نویسی کو انھوں نے انسانی فطرت اور افراد کے اخلاق و کردار کے لئے ہمیشہ گھن سمجھا، جو پہلے فرد کو لگتا ہے پھر اجتماعی زندگی کی عمیت کو کھا جاتا ہے۔ فیض نے واقعی نظریاتی اور عملی اعتبار سے ہوا کے رخ پر بادبان کھولنے کی رسم نہ کبھی قبول کی نہ اسے رواج دیا۔ اس موقع پر ایک واقعہ کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

۱۹۴۹ء میں "امروز" کی ایک خبر پر لاہور کے ایک پولیس افسر کو بہت غصہ آیا۔ بات وارنٹ اور مقدمہ تک پہونچی، فیض گرفتار ہو کر ڈپٹی کمشنر ظفر الاحسن کی عدالت میں پہونچے، انھوں نے کہا "شخصی ضمانت داخل کر کے آپ رہا ہو سکتے ہیں"۔ فیض نے کہا "اس کی ضرورت

نہیں ہے ملک کے ممتاز ماہر قانون محمود علی قصوری کو علم ہوا تو فوراً فیض کی پیروی کے لئے عدالت پہونچے لیکن فیض نے انھیں بھی روک دیا کہ صفائی دینا مطلوب ہی نہیں تب وکالت اور پیروی کیسی؟ عجب کشمکش تھی، بالآخر عدالت نے سرکاری وکیل مقرر کرنے کی ہدایت کی جس نے ان کی صفائی میں دلائل دیئے۔ عدالت نے یہ دلائل قبول کرتے ہوئے انھیں باعزت بری کر دیا۔

فیض واپس آئے اور امروز میں کہا ایسا مقالہ افتتاحیہ سپرد قلم کیا جس کے نیچے ان کے دستخط بھی شائع ہوئے۔ پاکستان ٹائمز اور امروز کی تاریخ میں یہ پہلی مثال تھی کہ ایڈیٹر کے دستخط کے ساتھ ایڈیٹوریل شائع ہوا ہو۔

فیض کے پاس بیٹھ کر ان کی گفتگو سننا، اور مطالعہ کرنا ایک دلچسپی بات ہے، موڈ میں ہوں تو آہستہ آہستہ کتنے ہی مشکل مسائل وافکار کی گرہیں کھولتے چلے جاتے ہیں۔ سیاست، خرام سبک کلام، لیکن جو کچھ کہتے ہیں بہت خود اعتمادی اور پختہ یقین کے ساتھ جچے تلے انداز میں۔ گویا ذہنی الجھاؤ سے وہ ناآشنا ہیں۔ ان کی یہ سب مفید و قیمتی باتیں قومی سرمایہ ادب کا حصہ ہیں۔ جسے بدقسمتی سے محفوظ نہیں کیا جا رہا ہے۔ اشعار کی صورت میں اب تک ان کے جو ادب پارے شائع ہوئے ہیں، وہ بہت کم ہیں۔ ان کا زیادہ حصہ فیض کی بے نیازی اور قلندرانہ طبیعت کی بدولت ضائع ہو گیا ہے۔ مشرق اور مغرب کے ادب، نوع انسانی کی تاریخ، سماجی و ثقافتی قدروں، قدیم و جدید علوم کے گہرے اثرات پر ان کی نظر بہت وسیع ہے، اور بحیثیت انسان، بحیثیت دوست اور بحیثیت دانشور وہ ہر نسل کے لئے ایک نعمت سے کم نہیں ہیں۔ دیرینہ تعلق خاطر کی بنا پر مجھے ان کی صحبت میں وقت گذارنے کا موقع اکثر ملتا ہے کبھی وہ کرم فرماتے ہیں۔ کبھی میں جاتا ہوں، بعض ملاقاتوں کی یادداشتیں ذہن میں اس طرح محفوظ رہ جاتی ہیں جنھیں فراموش کرنا بھی چاہوں تو نہیں کر سکتا۔

ایک ملاقات کے دوران کوئی صاحب ان سے اردو زبان کی ترقی اور جمود پر گفتگو کر رہے تھے فیض نے کہا "میں اردو ادب کی ترقی کی رفتار سے مطمئن نہیں ہوں ۔۔۔۔ دراصل ادیبوں کا ایمان کمزور ہو گیا ہے" ۔۔۔۔۔ پھر کہا "شاعری میں جمود نہیں ہے، جب پیٹرول کم ہوتا ہے۔ گاڑی رک جاتی ہے لیکن عارضی طور پر ۔۔۔۔۔۔ پھر چل دیتی ہے"۔

ایک دفعہ سوال کیا گیا کہ نظم آزاد کو کچھ لوگ شاعری ہی نہیں سمجھتے۔ ان کا خیال ہے عروض ہی باہر شاعری کا تصور خود فریبی ہے۔

فیض نے کہا "کسی بات کو صرف اس لئے شعر نہیں کہا جا سکتا کہ وہ عروض میں ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ شاعر کے پاس کچھ کہنے کے لئے ہے بھی یا نہیں جسے کہنا آتا ہے یا کہنے کے لئے اس کے پاس موزوں الفاظ اور سلیقہ ہے۔ اگر اس کے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں ہے اور اس کے باوجود وہ کہہ رہا ہے تو وہ شعر یقیناً نہیں ہے"۔

بحث کچھ آگے بڑھی تو فیض نے مزید کہا: "راستے اور منزل کے تعین کے بغیر شاعری کا کوئی مستقبل نہیں ہے، شاعر، ادیب، اور دانشور کو بنیادی طور پر آگاہ ہونا چاہئے۔ کہ سچ کیا ہے، جھوٹ کیا ہے، عارضی کیا ہے، مستقل کیا ہے تصنع کیا ہے حقیقت کیا ہے"۔

فیض کو گفتگو کے موڈ میں دیکھ کر میں نے دریافت کیا۔ کہ فارسی اور اردو شاعری نے ان کے ذہن اور خیالات کو کس حد تک متاثر کیا ہے۔ جواب میں کہا۔ "فارسی میں ایک شاعر حافظ کو ٹھیک سے پڑھا ہے اور اردو میں میر اور غالب کو خوب غور اور دلچسپی سے پڑھا ہے۔ اقبال ایسا ہے کہ اسے پڑھتے وقت کوئی اور نظر میں نہیں جچتا۔ محسوس ہوتا ہے جیسے بس شاعری وہ ہیں۔ ملوکیت اور شعریت دونوں میں ہمہ گیر اور آفاقی"۔

فیض نے اردو شاعری پر اثر انداز ہونے والے تاریخی حوادث کا تجزیہ بھی کیا۔ اور ان محرکات کا ذکر بھی جو کبھی ترقی ادب کا نشان بنے اور کبھی جمود کا پیغام۔ انھوں نے کہا "اردو شاعری کا بڑا حصہ اس عہد زوال کی یادگار ہے جو وکٹورین دور کے برطانوی اخلاق نے پیدا کی۔ دراصل یہ ایک مصلحت آمیز منافقت تھی۔ جو سنجیدگی کے روپ میں ادب کی قدروں پر مسلط ہوئی۔ اور اس کی ساری شوخی اور ندرت چھین کر لے گئی۔

جذبۂ حب الوطنی کا ذکر چھڑا تو فیض نے کہا: "یہ ایک آفاقی جذبہ ہے جو ہر کہیں اور ہر دور میں فطرت انسانی کے عین مطابق غیر فانی رہے گا۔"

نظام تعلیم کا جب کبھی ذکر ہوتا ہے حصول علم کے جدید نظریات اور مقاصد کے بارے میں سوچ کر وہ کبیدہ خاطر ہو جاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:۔

"علم کا مطلب، کتاب پڑھنا اور امتحان پاس کرلینا نہیں ہے۔

علم کا مطلب تو ادراک ہے اور ادراک ہی سے احساس پیدا ہوتا ہے۔ لیکن یہ بات صرف ان ذرائع سے حاصل ہو سکتی ہے۔

(۱) علم کے حصول کی سچی لگن ہو۔

(۲) حقیقتوں کو دریافت کرنے کی آزادی ہو۔

(۳) حقیقت تلاش کرنے کی جستجو کو حوصلہ افزائی حاصل ہو۔"

غالب کی مرصع غزل گوئی زیر بحث تھی، فیض کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی پھر کہا: "غالب اپنی مثال آپ ہے۔" میرے اصرار پر اپنی پسند کے دو شعر سنائے۔ ؎

درد دل لکھوں کب تک؟ جاؤں اُن کو دکھلاؤں
انگلیاں فگار اپنی، خامہ خونچکاں اپنا
دفائے دلبراں ہے اتفاقی ورنہ اے ہمدم
اثر فریاد دلہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے

غالب کے بعد میر کا ذکر چھڑا۔ فیض میر سے بھی بہت متاثر ہیں۔ میر کے دو شعر انھوں نے بڑی پسندیدگی کے ساتھ سنائے۔ ؎

وصل و ہجراں یہی جو دو منزل ہیں راہ عشق کی
دل غریب ان میں خدا جانے کہاں مارا گیا
اداسیاں تھیں مری خانقہ میں قابل سیر
صنم کدے میں تو، ٹک آکے دل لگا بھی ہے!

فیض علامہ اقبال کے بڑے مداح ہیں۔ انھیں علامہ کے شفیق و محترم استاد مولوی میر حسن سے درس لینے پر بھی فخر ہے۔ علامہ کی شاعری اور افکار پر ان کے جو خیالات مجھے سننے کا اتفاق ہوا ہے ان کی تفصیل کا یہ موقع نہیں بس ایک ہی وقیع نکتہ پر غور کیجیے کہ علامہ کی وہ نظمیں فیض کو سب سے زیادہ پسند ہیں جہاں وہ واحد متکلم انداز میں بات کرتے ہیں۔ اور اپنی ذات سے خود مخاطب ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ؎

ہویدا آج اپنے زخم پنہاں کر کے چھوڑوں گا
لہو رو رو کے محفل کو گلستاں کر کے چھوڑوں گا
پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو
جو مشکل ہے تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑوں گا

حال ہی میں ایک صاحب نے ان سے ان کے اس شعر کا پس منظر دریافت کرنا چاہا ؎

مقامِ فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

فیض زیرِ لب مسکرائے اور جواب دیا

"بس آپ بیتی ہے"

فیض کی گھریلو زندگی بڑی سادہ اور پرسکون ہے۔ بیگم فیض نہ صرف ان کے گھریلو معاملات اور تمام خانگی امور کی نگران ہیں، بلکہ انہیں فیض کی ذہانت اور شاعرانہ مزاج کی مناسبت سے اپنے گھر میں ایسا ماحول برقرار رکھنے کی بڑی فکر رہتی ہے جس سے فیض کی علمی و فنی صلاحیتوں کو فروغ ملے، نقصان نہ پہنچے۔ وہ ان کے زیرِ ترتیب مسودات میں گہری دلچسپی لیتی ہیں۔ بعض معاملات میں ان سے اچھی خاصی بحث کرتی ہیں۔ محض اس لئے کہ فیض جو کچھ صحیح سمجھتے ہیں جو کچھ کہہ رہے ہیں۔ اس میں فنی یا علمی اعتبار سے کوئی سقم، کوئی لچک اور کوئی جھول تو نہیں ہے۔ وہ فیض کے انگریزی مسودات کو بڑی احتیاط سے خود ٹائپ کرتی ہیں، ان کی صحت و تصحیح میں ہاتھ بٹاتی ہیں۔ انگریزی فقروں کی ساخت اور الفاظ کی بندش پر ان کے مشورے اتنے مفید ہوتے ہیں کہ فیض نجی محفلوں میں بیگم فیض کی ان خوبیوں کا برملا اعتراف کرنے میں ذرا بخل روا نہیں رکھتے۔ بیگم فیض جو میرے مرحوم دوست ڈاکٹر تاثیر کی بیگم کی حقیقی بہن اور انگریز خاتون ہیں۔ خدا نے ان کو دو ذہین اور اچھی لڑکیوں کی نعمت سے نوازا ہے لیکن وہ بچوں کی نگہداشت اور امورِ خانہ داری کو اتنا وقت دیتی ہیں جو ان کاموں کے لئے ضروری ہے۔ انھوں نے اپنے نامور شوہر کے لئے گھر میں آرام و سکون اور لکھنے پڑھنے کے جو معمول بنائے ہیں، اس میں ذرہ بھر کمی یا فرق نہیں آنے دیتیں۔ فیض کا یہ مختصر سا ذہین خاندان کئی بار بڑی محنت، آزمائش اور مصیبت میں گھر چکا ہے۔ لیکن فیض اور بیگم فیض نے ہمیشہ ناساعد حالات کو ایک ہی طرح خوشی سے برداشت کیا ہے اور کبھی حرفِ شکایت لب پر نہیں لائے ہیں۔

فیض شعر کم کہتے، اچھے کہتے ہیں۔ اردو انگریزی مضامین اور مسودات پر ان کا قلم بہت تیز چلتا ہے۔ ان کی حاضر دماغی اور ذخیرہ الفاظ کا اندازہ ان مسودات سے ہوتا ہے جن میں کسی صفحہ پر خال خال ہی کوئی لفظ کاٹ کر دوبارہ لکھا نظر آتا ہے۔ ۱۹۵۱ء میں جب "روزگارِ فقیر" کا نقشِ اول مسودہ کی صورت میں ان کے سامنے آیا۔ اور نام تجویز کرنے کا ذکر چھڑا تو انھوں نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر، علامہ اقبال کے مشہور مصرع "سرآمد روزگارے این فقیرے" کی مناسبت سے اس کتاب کا نام "روزگارِ فقیر" تجویز کیا۔ یہ نام سن کر سب حیران ہوئے کہ اگرچہ علامہ کا یہ قطعہ بارہا پڑھا، لیکن ذہن اس طرف کبھی نہیں گیا۔ اسی طرح انھوں نے تعارف نامہ کے کم و بیش ۵ صفحات پاکستان ٹائمز کے دفتر میں بیٹھ کر صرف آدھ گھنٹے میں سپردِ قلم کر دئیے۔ ناقدین اور مبصرین نے بعد میں اس تعارفی مقالے کو اردو ادب کا شاہکار قرار دیا۔ اس پورے مقالے کے مسودہ میں فیض نے ایک لفظ بھی قلم زد نہیں کیا ہے۔ یہ مثالیں اور مشاہدات ظاہر کرتے ہیں کہ فیض کی ذہانت خداداد ہے۔ شاعری، مصوری، ادب، آرٹ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یا تو یہ سب خوبیاں فیض میں جذب ہو گئی ہیں، یا فیض ان سب میں ڈوب کر کچھ کہتے اور کچھ لکھتے ہیں۔

شاعرِ مشرق علامہ اقبال سے اپنی دیرینہ نیاز مندی اور عقیدت کی کیفیت بیان کرتے ہوئے "روزگارِ فقیر" میں اس ندامت اور پشیمانی کا اظہار کر چکا ہوں کہ شاعرِ مشرق کی صحبتوں سے جو مواقع میسر تھے ان کا استفادہ صحیح طور پر کر کے جو فیض اور حاصل کر سکتا تھا وہ نہیں کر سکا۔ اپنے اس تجربہ کی بنا پر کہتا ہوں کہ جس دور میں فیض جیسی شخصیتیں ہمارے درمیان موجود ہوں یہ اس دور کی بدقسمتی ہوگی کہ نوجوان طلباء اور فکر و نظر رکھنے والے اصحاب اس سرچشمۂ علم و فیض سے محروم رہیں۔ اور ان میں خدا نے جو ذہنی اور علمی خوبیاں جمع کی ہیں ان سے فائدہ نہ اٹھائیں۔ دعا ہے کہ فیض ہمارے درمیان زیادہ سے زیادہ عرصے رہیں، ملک ان کے علم و دانش، اور فکر و بصیرت سے خوشہ چینی کرتا رہے اور ان کا فیض پھولوں کی طرح ہماری مجلسی زندگی اور ادبی محفلوں میں مہکتا رہے۔

حمید نسیم

کچھ فیض صاحب کے بارے میں

صہبا صاحب آپ مصر ہیں کہ میں فیض صاحب کے بارے میں کچھ لکھوں۔ آپ کو "فیض نمبر" کی جامعیت کی فکر دامن گیر ہے۔ اس لئے آپ کا اصرار بے محل بھی نہیں۔ یہاں میں اسی الجھن میں ہوں کہ کیا لکھوں۔ فیض صاحب اس دور کے سب سے اہم شاعر ہیں۔ ایسے شاعر کے کلام کا جائزہ کوئی صاحب الرائے نقاد ہی لے سکتا ہے۔ اور میں نقاد تو کیا اس فن کا مبتدی بھی نہیں۔ ویسے یہ عجیب بات ہے کہ آج کل ہر مبتدی فیض صاحب کے کلام کو تختۂ مشق بنا رہا ہے۔ ادبی محفلیں ہوں کہ اخبار و رسالے نو بالغ اور نو مشق شاعر و ادیب فیض صاحب کی شاعری پر اس اعتماد اور جوش سے کج بحثی کرتے ہیں کہ آدمی حیران رہ جاتا ہے۔ جب سے فیض صاحب کو لینن پرائز ملا ہے۔ فیض صاحب کا "جادو توڑنے" کی مہم اور تیز ہو گئی ہے۔ اور اس مہم میں پیش پیش وہ نوجوان ہیں جو نہ دنیا کے ادب سے واقف ہیں نہ اپنی زبان اور شعری روایت سے آگاہ۔ خیر یہ انتقاد تو ہر صحیح شاعر پر پڑی ہے۔ غالب کے اکثر ہم عصر انہیں گمراہ مانتے تھے۔ "بال جبریل" چھپی تھی تو کئی نحوی قسم کے بزرگوں نے زبان اور محاورے کی اغلاط کی طویل فہرستیں تیار کی تھیں۔ ایک بزرگ نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ کتاب کا نام ہی غلط ہے کیونکہ "بال جبریل" کی ترکیب درست نہیں۔ ایک غالب کے چچا اقبال کو اک بال کہہ کر خوش ہوتے تھے۔ ایسی بے تکی باتیں جو آج کل کچھ لوگ فیض صاحب کے بارے میں کرتے ہیں، ہمیشہ ہوتی آئی ہیں۔ لیکن ان باتوں کا ادبی دھارے پر اثر نہیں پڑتا اور شاعر شاعر ہی رہتا ہے۔ کیونکہ وقت خود اس کا محافظ ہوتا ہے۔

معافی چاہتا ہوں بات کہاں سے چلی تھی کہاں آپہنچی۔ عرض میں یہ کرنا چاہتا تھا کہ اس دور میں جن لوگوں کو فیض پر لکھنے کا حق ہے اور جنھیں لکھنا چاہیئے۔ ان میں فراق گورکھپوری اور محمد حسن عسکری صاحب کے نام میرے ذہن میں بار بار آتے ہیں۔ فراق صاحب نے تو ایک زمانے میں فیض صاحب پر کچھ لکھا بھی تھا۔ امید ہے آپ انھیں دوبارہ لکھنے پر آمادہ کر سکیں گے۔ عسکری صاحب اہل کمال نقاد ہیں لیکن وہ "ستارہ و بادبان" میں فراق صاحب ہی کے ہو کر رہ گئے ہیں۔ ان سے کہیئے کہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں فیض صاحب بھی ان کے التفات کے حقدار ہیں۔

میں فیض صاحب کی شاعری کے متعلق کچھ عرض نہیں کروں گا۔ بجز اس کے کہ میں انہیں اس دور کا سب سے اہم شاعر سمجھتا ہوں یہاں ان کی شخصیت کے بارے میں کچھ باتیں عرض کئے دیتا ہوں۔ چند واقعات جن سے شاید انھیں جاننے اور پہچاننے میں مدد مل سکے۔

فیض صاحب سے میری ملاقات سنہ ۱۹۳۳ء میں لائلپور میں ہوئی تھی یہ غزل میں میری نافہمیائی کے آغاز کا زمانہ تھا ستمبر یا اکتوبر کا مہینہ تھا اور

اتوار کی صبح میں گھر سے باہر نکلا تو دیکھا کہ میرے بڑے بھائی کے سامنے ایک نہایت خوش شکل نوجوان بیٹھا ہے۔ بھائی نے مجھے دیکھا تو اشارے سے اپنے پاس بلایا اور کہا "ان سے ملو یہ ہیں فیض احمد فیض۔ بہت بڑے شاعر ہیں" فیض صاحب آخری فقرے پر کچھ شرما سے گئے۔ ان کی محبوب مسکراہٹ مجھے اب تک یاد ہے۔ میں چارپائی پر فیض صاحب کے پاس بیٹھ گیا۔ رشید بھائی نے فیض صاحب سے شعر سنانے کی درخواست کی۔ انھوں نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ اور اپنی نظم "سرود شبانہ" سنانی شروع کی ان کا لہجہ ایسا نرم اور ایسا شیریں تھا کہ نظم کے مصرعے میرے دل میں اترتے چلے گئے۔ جب انھوں نے نظم ختم کی تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ ساری نظم مجھے زبانی یاد ہو گئی ہو۔ فیض صاحب رخصت ہوئے تو میں نے رشید بھائی سے ان کے بارے میں دریافت کیا معلوم ہوا گورنمنٹ کالج میں ایم۔ اے میں پڑھتے ہیں لاہور میں مقیم ایک لڑکی سے عشق کرتے ہیں۔ فیض صاحب کی اس دور کی تمام نظموں کی محرک اور محبوب یہی خاتون تھی۔ جو لیمپ نیم شب شبستاں میں فیض صاحب کا انتظار کرتی تھی۔ مخملی باہوں والی محبوب۔

۱۹۳۴ء میں ہم لائلپور سے امرتسر آ گئے ۱۹۳۵ء میں میں میٹرک پاس کر کے ایم۔ اے او کالج میں داخل ہوا جہاں فیض صاحب پہلے سے لکچرر مقرر ہوئے تھے۔ چند مہینے گزرے تو میرے استاد ڈاکٹر تاثیر مرحوم پرنسپل ہو کر آ گئے۔ ان کے آنے سے ایم۔ اے او کالج ادبی اور سیاسی شعور کا مرکز بن گیا۔ اس زمانے میں وہاں بڑے بڑے اہل علم اور اہل نظر جمع تھے۔ صاحبزادہ محمود الظفر اور ان کی بیگم ڈاکٹر رشید جہاں، پروفیسر محب الحسن اور خود فیض صاحب۔ کبھی کبھار حضرت حفیظ جالندھری۔ صوفی تبسم اور پنڈت ہری چند اختر مرحوم تاثیر صاحب سے ملنے لاہور سے تشریف لاتے تھے۔ تاثیر صاحب کے ہاں اور ہمارے گھر میں محفلیں جمتی تھیں۔ شعر خوانی ہوتی تھی۔ نئے شعری رجحانات پر اظہار خیال ہوتا تھا۔ لطیفہ بازی بھی ہوتی تھی۔ تاثیر صاحب کی برجستہ گوئی اور فقرے بازی ان محفلوں کی جان تھی۔ امرتسر میں قیام کا زمانہ فیض صاحب کی شخصیت کی تربیت اور جلا کا اہم ترین دور تھا۔ صاحبزادہ محمود الظفر اور رشید جہاں نے فیض صاحب کے سیاسی شعور کو چمکایا اور تاثیر کی صحبت نے ان کی شاعری کو نکھارا۔ گرمیوں کی تعطیلات تاثیر صاحب ہمیشہ کشمیر میں گزارتے تھے۔ لیکن ان کے مشفقانہ مشورے جاری رہتے تھے۔ اپنے خطوں میں وہ میری غزلوں پر اصلاح اور فیض صاحب کی نظموں پر اپنی رائے باقاعدگی سے دیتے تھے۔ ایک مرتبہ کشمیر سے ان کی واپسی پر فیض صاحب اور میں ان سے ملنے گئے۔ تاثیر صاحب نے اپنی تازہ غزل سنائی جس کا ایک شعر مجھے اب تک یاد ہے۔

یہ بے گور و کفن لاشوں کا انبار ——————— نشانِ راہ ہے منزل نہیں ہے

اس نشست میں فیض صاحب نے اپنی نظم "تنہائی" سنائی۔ تاثیر صاحب بڑے انہماک سے سنتے رہے۔ اور کئی مصرعوں پر بیساختہ داد دی نظم ختم ہوئی تو تاثیر صاحب نے فرمایا "فیض تم نے رنڈی کے گھر کی بے مثال تصویر کھینچی ہے"۔ میں نے فیض صاحب کو برہم ہوتے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ لیکن یہ فقرہ سن کر فیض صاحب کے کان سرخ ہو گئے۔ بولے کچھ نہیں۔ لیکن صاف ظاہر تھا کہ تاثیر صاحب کے فقرے سے انھیں دکھ پہونچا ہے۔

ایلس لندن سے امرتسر آئیں تو ان سے تعارف کے لئے تاثیر صاحب نے کچھ لوگوں کو چائے پر بلایا۔ اس دعوت میں فیض صاحب میرے بھائی رشید اور میں بھی شریک تھا۔ مجھے ایلس بہت خوبصورت لگی اور دراز قد سرخ و سفید رنگ جاذب چہرہ

بید نسیم

شام کو جب ہم تاثیر صاحب کے ہاں سے واپس ہوئے تو راستے میں میں نے فیض صاحب سے ایلس کے بارے میں پوچھا کہنے
لگے "اچھی لڑکی ہے۔" میں نے کہا آپ کی بیوی بن جائے تو کیسا ہو۔ فیض صاحب ہنس دیئے اور صرف یہ کہا "تم تو پاگل ہو" پھر ہم سب لوگ ایلس
سے گھل مل گئے۔ میں ہمیشہ اس کے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے پیتا تھا۔ ایک شام ہم سب تاثیر صاحب کے ہاں بیٹھے تھے کہ ایلس نیلے اطلس کی شلوار قمیص
پہنے کمرے میں داخل ہوئی۔ آنکھوں میں ہلکا سا کاجل لگا رکھا تھا۔ اور کانوں میں بڑے بڑے نگوں والے بندے سجا رکھے تھے۔ تاثیر صاحب ترقی پسند تحریک
کے بانیوں میں سے تھے۔ اور اس وقت ترقی پسند مصنفوں کا ادرش بیان کر رہے تھے۔ فیض صاحب یکا یک نہ جانے کس خیال میں کھو گئے۔ مجھے یقین
ہے تاثیر صاحب کی کوئی بات ان تک نہیں پہنچی۔ ایلس کی آمد کا یہ تاثر کچھ دنوں بعد "موضوعِ سخن" میں کار فرما نظر آیا۔

۱۹۳۷ء میں تاثیر صاحب نے "بزمِ سخنورانِ پنجاب" کے نام سے ایک مخصوص ادبی محفل کی داغ بیل رکھی اور ہر مہینے ایک شاعر کے گھر طرحی مشاعرہ
ہونے لگا۔ پہلا مشاعرہ ماڈل ٹاؤن لاہور میں حفیظ جالندھری صاحب کے ہاں ہوا۔ اس مشاعرے کے لئے فیض صاحب نے بھی غزل
کہی تھی۔ "دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے"۔ باقی شاعروں کی غزلیں تو فوراً مرجھا گئیں۔ لیکن فیض صاحب کی غزل بجلی کی طرح سارے
ملک میں پھیل گئی۔ دوسرا مشاعرہ امرتسر میں فیض صاحب کے مکان پر ہوا۔ طرح کی زمین تھی "نظر میں ہے۔ خبر میں ہے۔ اثر میں ہے"۔ فیض صاحب
کا مطلع حاصلِ مشاعرہ رہا تھا

کچھ دن سے انتظارِ سوالِ دگر میں ہے
وہ مضمحل حیا جو کسی کی نظر میں ہے

دونوں مشاعروں میں فیض صاحب کی غزلیں دوسرے شاعروں کی غزلوں سے میلوں آگے تھیں چنانچہ "بزمِ سخنورانِ پنجاب" جلد ہی
ختم ہو گئی۔
پھر جنگ چھڑ گئی۔ تاثیر صاحب سرینگر کالج کے پرنسپل ہو کر چلے گئے۔ فیض لاہور میں ہیلی کالج آف کامرس میں انگریزی پڑھانے لگے۔ ہمارا خاندان عسرت
میں گرفتار ہو کر گورداس پور منتقل ہو گیا۔ اور وہ محفلِ یاراں برہم ہو گئی۔ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۱ء تک میں فیض صاحب سے قریب قریب روزانہ
ملتا رہا۔ فیض صاحب کے لاہور جانے سے یہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔ ۱۹۴۱ء کے بعد صرف مشاعروں یا ادبی محفلوں میں کبھی کبھار فیض صاحب سے ملاقات
نصیب ہوئی۔ ظاہر ہے ایسی ملاقاتوں میں دلی قربت کے مواقع بہت کم ہوتے ہیں۔
۱۹۶۳ء میں امریکہ سے واپس آتے ہوئے لندن ٹھیرا تو فیض صاحب سے ایک بار پھر طویل ملاقات کا موقع ملا۔ میں فیض صاحب کے دولت کدے پر
حاضر ہوا اور نصف شب تک ان کی خدمت میں رہا۔ انھوں نے اپنی تازہ نظمیں سنائیں۔ باتوں باتوں میں میں نے فیض صاحب سے کہا کہ پاکستان ان کا منتظر ہے۔
ان کی زبان صرف پاکستان ہی سمجھتا ہے۔ اور صرف وہیں ان کو یار آشنا مل سکتے ہیں۔ فیض صاحب کی آنکھوں میں یادِ یارانِ وطن سے نمی کی لکیر ابھر آئی تھی۔
کہنے لگے "میں بہت جلد پاکستان آ رہا ہوں دنیا دیکھنی تھی سو دیکھ لی۔ اب اپنے وطن میں ہی رہوں گا۔"
میں نے کالج میں فیض صاحب سے انگریزی پڑھی۔ اس اعتبار سے میں ان کا شاگرد بھی ہوں۔ لیکن وہ استاد سے زیادہ میرے دوست تھے۔ اور میں
ایک خلوص اور کم گو مونس دوست۔ ان کی شخصیت بھی ان کی شاعری کی طرح شیریں نرم اور دل آویز ہے۔ وہ فطرتاً کم گو ہیں۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ان
سے ملئے تو ان کی کم گوئی کے باوجود دل شگفتہ ہو جاتا ہے۔ اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے بہت سی باتیں کی ہوں۔ ویسے میں نے عام دوستوں کی محفل میں
فیض صاحب کو چہکتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ اب سے پچیس برس پہلے کا ایک واقعہ مجھے یاد ہے۔ امرتسر میں صوفی تبسم صاحب کے ہاں بہت سے دوست

جمع تھے۔ اور حسبِ دستور شعر و ادب کی باتیں ہو رہی تھیں۔ ایک مقام پر صوفی صاحب نے اپنے نہایت ہی معصومانہ انداز سے شکایت کی کہ ادب گروہ بندی کا شکار ہو رہا ہے۔ مولینا تاجور نجیب آبادی شاہکار کی وساطت سے ایک خاص گروہ کو ادب پر مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ باقی لوگ بھی اس روش پر چل رہے ہیں۔ صوفی صاحب کی آواز میں ایسی رقت تھی کہ محفل پر اداسی چھانے لگی۔ فیض صاحب جو اب تک خاموش تھے۔ یکایک بول اٹھے "صوفی جی! زمانہ بڑا نازک ہے۔ آپ بھی ایک آدھ آرگن ہاتھوں میں لے لیجئے"۔ ان کے اس فقرے سے محفل زعفران زار بن گئی۔ صوفی صاحب بھی بے ساختہ ہنس پڑے۔

میں نے کچھ دیر پہلے کہا تھا کہ فیض صاحب بڑے بامروت انسان ہیں۔ اس کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ جو کام وہ کر سکتے ہوں اس سے کبھی انکار نہیں کرتے۔ چنانچہ بہت سے نوجوان شاعر اپنے شعری مجموعوں کے دیباچے اور پیش لفظ فیض صاحب سے لکھواتے ہیں۔ فیض صاحب اپنی طبعی مروت سے مجبور ان شاعروں کی ایسی تعریف کرتے ہیں اور ان کے کلام میں ایسے ایسے محاسن پیدا کرتے ہیں جن کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ میں نے ایک مرتبہ فیض صاحب سے اس بات کا ذکر کیا۔ پہلے تو ہنس کر بات ٹال گئے۔ میں نے بات دہرائی اور کہا فیض صاحب یہ بات آپ کے لئے مناسب نہیں۔ اس سے عام لوگ گمراہ ہوتے ہیں اور صاحبِ فہم لوگوں کے دلوں میں بدگمانی پیدا ہوتی ہے۔ اس پر فیض صاحب نے فرمایا "بھئی! نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کوئی بری بات نہیں۔ اگر میں غالب، میر، اقبال جیسے شاعروں کی پرکھ میں کوتاہی کروں تو آپ کو شکایت کا حق ہوگا۔"

جو چند واقعات فوری طور پر یاد آ گئے ... نے لکھ دیئے ہیں۔ ذرا چاہوں یادوں کی ورق گردانی کروں تو اور بہت سی دلچسپ باتیں فراہم ہو سکتی ہیں۔ لیکن اس کی نہ مہلت ہے نہ توفیق بہرحال حکم کی تعمیل ہو گئی غنیمت ہے۔

ایک شعر کی پیروڈی

فیض صاحب کا شعر ہے ؎

وہ تو وہ ہے تمہیں ہو جائے گی الفت مجھ سے
اک نظر تم مرا محبوبِ نظر تو دیکھو

(زنداں نامہ)

'زنداں نامہ' کی اشاعت سے پہلے کا ذکر ہے۔ ایک صاحب لاہور سے آئے کہنے لگے "بھئی آج کل تو لاہور والے اس شعر کو یوں پڑھتے ہیں۔

وہ تو وہ ہے تمہیں ہو جائے گی نفرت مجھ سے
اک نظر تم مرا "قیوم نظر" تو دیکھو

ایک دن ابوالخیر کشفی نے فیض صاحب کو ان کے شعر کی یہ پیروڈی سنائی۔ فیض صاحب ہنس پڑے۔ کہنے لگے۔ مگر صاحب! یہ خوب ہے۔ کراچی والے اپنی پیروڈی بھی لاہور والوں سے منسوب کر دیتے ہیں۔"

آغا آفتاب قزلباش

پیغامِ آشناگویم

چودھویں کا چاند آسمان کی پہنائیوں میں روشن تر ہوتا جا رہا تھا۔ جمنا کی موجیں چاندنی کے سرور سے مستی کے عالم میں رقصاں ہو چکی تھیں۔ ہماری کشتی نورانی فضا میں آہستہ آہستہ رواں تھی۔ ہم سب پر خمار آلود مستی برس رہی تھی۔ انور کے گلے میں غضب کا سوز تھا، وہ ستار بجا رہا تھا، ایک آہ سرد کے بعد وہ مترنم ہو گیا ـ

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آجائے

گلوکار نے کیف سرمدی سے سب کو چونکا دیا۔ یہ چار مصرعے نشتر بن کر میرے دل میں اتر گئے۔ کشتی سے اتر کر گاڑی میں بیٹھے اور پرانی دلی کی سوئی لالٹینوں سے مہکتی ہوئی سڑکوں سے گزر کر ہم لال قلعہ اور شاہجہانی مسجد کے راستے سے گزر رہے تھے۔ شاہجہان آباد کا شکوہ سلطانی چاندنی رات میں کیسا دمک رہا تھا۔ رستے خوابیدہ اور سنسان تھے مگر چاندنی میں محبتوں کی پرواز آسمانی حوروں کی طرح ہوا کی موجوں کو بہا رہی تھی۔ انور نے فیض کے چار مصرعے سنا کر مبہوت و ساکت بنا دیا تھا۔ میں نے سوچا۔ ایسا باکمال آرٹسٹ جو خیال کو اتنا حسین و لطیف بنا کر دل میں کیفیت پیدا کر دے خود کتنا حسن اور دلکشی رکھتا ہوگا۔

دوسری صبح دگمبر پرشاد گوہر دہلوی کے ہاں کنور مہندر سنگھ بیدی سحر بھی آپہنچے۔ کنور صاحب اردو کے بڑے شیدائی اور عمدہ انسان ہیں۔ کنور صاحب بہت اچھا شعر کہتے ہیں اور مزے سے پڑھتے بھی ہیں، جناں کل رات کو ایک تازہ غزل انھوں نے سنائی۔ سماں بندھ گیا۔

میں نے فیض کے دو شعر جو رات کو انور نے سنائے تھے پڑھے۔ سب پھڑک اٹھے، اس وقت فیض غالباً ادب لطیف یا کسی اور رسالے کی ادارت کرتے تھے۔

کچھ عرصے کے بعد ن۔ م راشد کے ہاں ایک صاحب سے تعارف ہوا معلوم ہوا آپ ہی فیض صاحب ہیں! فیض کے شاداب و شگفتہ چہرے پر لطیف تبسم کی موجیں مرتسم تھیں مجھے ایسا محسوس ہوا کہ فیض سے برسہا برس کی رفاقت اور قربت ہے۔ میں تو لوٹ کر دارفتگی کے عالم میں فیض کے قدموں میں جا گرا۔ انھوں نے بے حد پیار سے گلے لگایا مشکل سے دو منٹ چلے ہوں گے اور میرے ساتھ ہم سب غریب خانے پر چلنے کے لیے لنگر

تیار ہو گئے ۔ میری والدہ سے ، بھائیوں اور بہن سے ملے اور آغا ساغر خوش جو اسوقت دلی سے ماہنامہ چمنستان نکالتے تھے ان کی فرمائش پر اپنے تازہ اشعار لکھوا کر دستخط کر کے دیئے ۔

دوسری جنگ عظیم چھڑ جانے سے جہاں جاپانیوں کے ہندوستان پر حملہ آور ہونے کا خطرہ دلی والوں کو اکثر رہا کرتا تھا وہاں دلی کی آبادی میں بھی بے حد اضافہ ہو گیا تھا ۔ امریکی اور برطانوی فوجی ہوٹلوں، چائے خانوں اور بازاروں میں جھنڈ کے جھنڈ نظر آتے تھے جنگی محکمے دھڑا دھڑ کھل رہے تھے اور دلی میں باہر سے بہت سے لوگ آ چکے تھے ۔

کرنل مجید ملک پبلک ریلیشنز ڈائرکٹریٹ میں براجمان تھے اور غالباً انھیں کے ایما پر چراغ حسن حسرت بدر الدین بدر اور فیض احمد فیض فوجی ملازمتوں میں داخل ہو چکے تھے ۔

یادش بخیر پروفیسر احمد شاہ بخاری (پطرس) اسوقت آل انڈیا ریڈیو کے حاکم اعلیٰ تھے ۔ ڈاکٹر محمد دین تاثیر بھی موجود تھے اور فردوسی اسلام حضرت حفیظ جالندھری سانگ پبلسٹی کے انچارج تھے ۔ باہر سے شعراء اور ادیب دور دور سے دلی آتے جاتے رہتے تھے ریڈیو اور وار فرنٹ کے مشاعروں میں بلوائے جاتے تھے ۔ اس چہل پہل سے ادبی صحبتوں میں چار چاند لگ گئے تھے ۔

ترقی پسند مصنفین کے نمائندے ، جدید شعراء مثلاً مجاز ، جذبی ، جاں نثار ، وامق فراق گورکھپوری اور ان سب کے پیر مغاں جوش ملیح آبادی سب کے سب اکثر و بیشتر دلی آتے رہتے تھے ۔ اور کئی کئی دن مسلسل قیام رہتا تھا ۔ کنور مہندر سنگھ بیدی خواجہ محمد شفیع دہلوی صدر اردو مجلس دلی کے ساتھ مشاعرے ترتیب دینے میں دن رات مصروف رہتے تھے ۔ پرائیوٹ صحبتیں بھی جمی رہتی تھیں مثلاً پطرس بخاری مرحوم کے گھر پر حفیظ جالندھری فیض مجاز ، پنڈت ہری چند اختر ، مولانا عبد المجید سالک ، ذو الفقار علی بخاری ، رفیع پیر اور ڈاکٹر تاثیر جمع ہیں رات گئے تک لطیفے ، قہقہے ، شاعری اور ذہانت آمیز فقرے بازی جاری ہے ۔ خواجہ محمد شفیع کے ہاں اردو مجلس کی جانب سے بھی اچھے اجتماع ہو جاتے تھے ۔ دلی کے جدید شاعروں میں تابش دہلوی ، جمیل الدین عالی ، ڈاکٹر یاور عباس اور شان الحق حقی مشاعروں میں شریک ہوتے تھے ۔ جوش اور جگر جب دلی آ جاتے ادبی ہنگامے زوروں پر ہو جاتے ۔ دعوتیں پارٹیاں مشاعرے برابر ہوتے رہتے محکمہ اطلاعات اردو کا ایک ماہنامہ "آج کل" شائع کرتا تھا ۔ اس کے مدیر آغا یعقوب دواشی بڑے علم دوست ہونے کے علاوہ عمدہ کھانے کھلانے کے لئے بھی مشہور تھے ۔ دلی میں روز ہنگامے گرم رہتے اور آغا دواشی اس کے متلاشی اور متمنی رہتے کہ ان کے ہاں گھر پر رنگا رنگ لذیذ کھانوں کے دستر خوان کو نوواردِ مہمان مزید اعزاز بخشیں ۔

آغا دواشی میرے ساتھ فیض صاحب کو مدعو کرنے گئے ۔ فیض اس قسم کی دعوتوں میں گرفتار تو ہو جاتے ہیں مگر انھیں یہ مرغوب نہیں ہے پھر بھی فیض نے عزت رکھ لی اور دعوت میں شریک ہو گئے ۔ بے چارے آغا دواشی تو کھانا کھلا کر خوش ہو گئے مگر حریفان بادہ پیمانے جام سخن کا دور چلا ہی دیا ۔ فیض بچ نکلنے کے لئے مجھے دیکھتے تھے مگر بالآخر اپنی باری پر فیض صاحب نے اپنی غزل سنائی اور خوب داد حاصل کی ۔

پھر لوٹا ہے خورشید جہاں تاب سفر سے
پھر نورِ سحر دست و گریباں ہے سحر سے
وہ رنگ ہے امسال گلستاں کی فضا کا
اوجھل ہوئی دیوارِ قفس حد نظر سے

میں فیض صاحب کو پہنچانے کے لئے انہیں محفل سے اٹھا لایا ہم اور وہ سوار ہو کر دواشی صاحب سے رخصت ہو گئے ۔

سانولی سلونی شام محیط ہو چکی تھی اور ہم لوگ لمبی نشست سے بالکل خستہ ہو گئے تھے۔ پرانی دلی کی سبز پوش درختوں کی قطاریں مہک اٹھی تھیں۔ ڈاکٹر شوکت اللہ انصاری کی کوٹھی سے رات کی رانی کی تیز خوشبو اڑ رہی تھی۔ ہم دونوں خاموش چلے جا رہے تھے میں اپنے نوجوانی کی یادوں پر نازاں تھا کہ میرے پہلو میں ایک عظیم انسان فروکش ہے جس کے شاداب چہرے کو کسی خوشگوار خیال نے رنگ میں ڈوب کر تابندہ و درخشاں کر دیا تھا۔

میں نے معافی مانگی "بھائی جان! میری وجہ سے آج آپ کو بہت زحمت ہوئی" فیض کے چہرے پر فرشتوں ایسی مسکراہٹ دمک اٹھی۔ بولے "زحمت رحمت کیسی ہے۔ وقت اچھا گزر گیا" میں ان کے احسان سے جھوم گیا اور ایک شعر بے ساختہ پڑھ دیا ؎

درخت غنچہ بر آورد و بلبلاں مستند
جہاں جواں شد و یاراں بعیش بنشستند

روزنامہ تیج دلی کے ایڈیٹر لالہ دھرم پال گپتا وفا کے ایک دوست نے اپنے ہاں مخصوص نشست کا انتظام کیا۔ ابن الحسن فکر نے جوش صاحب کو وہاں جانے کے لئے راضی کر لیا۔ فیض صاحب کے لئے مجھے متعین کیا گیا۔

کنور مہندر سنگھ اپنے ساتھ بخشب جارچوی، صابر دہلوی ایسے خوشگو شعرا کو ساتھ لائے تھے۔ حضرت امن لکھنوی پہلے سے موجود تھے۔ خوب خوب رنگ جما، اچھے اچھے شعر ہوئے اور خوب لطف رہا۔

جوش صاحب تقدیم و تاخیر کے قائل نہیں ہیں اور دوسرے خوب ترنگ میں تھے۔ انھوں نے خود ہی پڑھنا شروع کیا۔ جوش صاحب جب پڑھتے ہیں وہ توقع کرتے ہیں کہ ان کے دوست مصرع ضرور اٹھائیں۔ مجاز چیخ چیخ کر مصرع اٹھا رہے تھے، ایکا ایکی وہ اٹھ کر کہیں باہر چلے گئے۔ جوش صاحب نے فیض صاحب سے کہا "مصرع اٹھاؤ میری جان!" فیض صاحب سخت امتحان میں پڑ گئے مگر فوراً جاں نثار نے لوک کر مصرع اٹھایا۔ فیض سگریٹ کے دھوئیں سے شغل کرتے رہے۔ جاں نثار اختر اور مجاز جب پڑھ چکے تو جوش صاحب نے کہا "صاحبو! میرے پاس ایک آخری کارتوس اور ہے" پھر فیض صاحب سے فرمائش کی۔ فیض صاحب نے "مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ" والی نظم ٹھہر ٹھہر کر اور رچ کر پڑھی۔ بے حد داد و ستائش کا شور ہوا۔ مجاز چلاتے "صاحب! آپ کا آخری کارتوس خوب چلا سب کو گھائل کر گیا۔"

جوش صاحب جب دلی آتے تو ریلوے اسٹیشن کے ریٹائرنگ روم میں ٹھہرتے۔ مخصوص دوستوں کو جب سورج غروب ہو جاتا وہیں بلاتے۔

ایک بے حد سرد رات کو ریلوے ریٹائرنگ روم میں محفل گرم تھی۔ مولانا چراغ حسن حسرت، نازش دہلوی، مجاز، حکیم اصغر دہلوی اور دو تین اور صاحبان موجود تھے۔ فیض صاحب جوش صاحب کے لئے انگریزی شراب کا تحفہ ساتھ لائے۔ جوش صاحب فیض کی اس ادا سے بہت خوش ہوئے، خوب خوب شاعری ہوئی پھر لطیفے چل پڑے اور جب محفل ختم ہوئی تو بقول فیض

ڈھل چکی رات، بکھرنے لگا تاروں کا غبار ÷ لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گذار

گرم کمرے سے نکلے تو زمستاں کی رات آدھی ہو چکی تھی۔ فیض صاحب رخصت ہو چکے تھے۔ جوش صاحب کو یاد آیا کہ ان کا بٹوہ کمرے میں رہ گیا ہے۔ واپس اوپر جانے کے لئے دو زینے تھے۔ ایک زینے سے ہم چڑھ کر اوپر پہنچے تو چونکہ گھپ اندھیرا تھا ماچس جلا کے روشنی کی گئی۔ جوش صاحب نے دیکھا کہ ان کے کمرے کا دروازہ کوئی صاحب کھول رہے ہیں۔ جب جوش صاحب کمرے کے پاس پہنچے تو ان صاحب

سے جو پہلے سے ان کے کمرے کے قریب کھڑے تھے پوچھا "کون صاحب ہیں؟" ان صاحب نے کہا "اچھا جوش صاحب ہیں"۔ جوش صاحب بولے تم ایسے آپ فیض صاحب ہیں" دونوں نے گرمجوشی سے ہاتھ ملائے۔ تالا کھولا گیا۔ فیض صاحب نے اپنا اوورکوٹ لیا جسے وہ بھول گئے تھے۔ ادھر جوش صاحب نے اپنا منہ۔ یوں یہ سرد رات کی ملاقات ختم ہوئی۔

فیض آفیسرز میس میں رہا کرتے تھے۔ ایک دن جی چاہا کہ اتنی صبح میس میں پہنچوں کہ فیض صاحب کو محوِ خواب پاؤں۔ صبح کاذب اسوقت صبح صادق میں گھل کر تجلی بار ہو رہی تھی کہ ع

اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

پروانۂ اجازت ملتے ہی میں فیض کے کمرے میں موجود تھا۔ دو پلنگ پاس پاس بچھے تھے۔ مچھر جالیوں کے اندر ململ کے کرتوں میں ملبوس فیض اور ان کے دوست کرنل جان (غالباً یہی نام تھا) خوابِ راحت میں آسودہ تھے۔ میں نے جی بھر کے رخِ تاباں کی زیارت کی اور عالمِ کیف میں سعدی کا شعر گنگنانے لگا ؎

مگر نسیم سحر بوئے یار من دارد
کہ راحتِ دلِ امیدوارِ من دارد

فیض بیدار ہوئے تو مجھے اپنے کمرے میں اخبار پڑھتے دیکھ کر حیرانی سے بولے "ارے تم کب آئے؟" میں نے کہا آپ کو محوِ خواب دیکھنے کو چلا آیا تھا۔ مخصوص ہنسی سے نوازتے ہوئے اٹھے اور جلد جلد تیاری میں مصروف ہو گئے۔ کرنل جان فیض سے بے حد ارادت رکھتے تھے۔ انھیں ململ کے کرتے اور لٹھے کے پاجامہ میں دیکھ کر مجھے عجیب سا لگا۔ میں نے کرنل صاحب کو آداب کیا، انھوں نے مسکرا کر آداب کہا۔ جب وہ لوٹ تو بھی خاموش اور دلول رہے تو میں نے کہا کرنل صاحب آپ تو ایسے ہمدرد اور دلول بیٹھے ہیں کہنے لگے۔ ع

کمالِ ہم نشیں در من اثر کرد

آغا زواشی نے ایک دن کہا کہ ہم جوش پر مضمون چھاپنا چاہتے ہیں کیوں نہ یہ مضمون فیض سے لکھوایا جائے۔ اشرف علی مرحوم بھی میرے ساتھ تھے کہنے لگے چلو میں بھی فیض صاحب سے کہوں گا تم بھی کہنا مضمون ہم لکھوا لیں گے۔ "گڈ آئیڈیا"۔ اشرف علی اور ہم فیض صاحب کے ہاں پہنچ گئے۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اشرف نے عرض مدعا کیا، ایک زمانہ تھا کہ مجاز فیض کو "بحر الکاہل" کہا کرتے تھے۔ چنانچہ فیض نے عذر کیا "ہاں بات تو ٹھیک ہے مضمون تو ہونا چاہیے مگر جیسی فرصت درکار ہے آج کل نہیں ملتی دوسرے پڑھنا بھی پڑے گا۔ میرے پاس یہاں جوش صاحب کا کلام بھی موجود نہیں ہے!" ہم لوگ اڑے رہے اور جب فیض بے بس ہو گئے تو آخر اس پر راضی ہوئے کہ مجھے جوش کا سیٹ لا دیا جائے اور گاہے گاہے یاد دہانی بھی ہوتی رہے۔

اسوقت ترقی پسند مصنفین کی تحریک زوروں پر تھی، اشرف علی بھی ترقی پسند ادب کے اچھے نقاد اور تحریک سے دلی ہمدردی رکھتے تھے۔ اشرف نے ایسے گروپ کا ذکر کیا جنھوں نے جدید شاعری کی بے دردی سے بڑی نکتہ چینی کی تھی۔ کہنے لگے یہ لوگ کوئی نئی بات تو کہہ نہیں سکتے۔ ان میں اچھے سے نیا پن مظہر جدید ادب اور شاعری پر برسے ہیں"۔ اشرف کہنے لگے بعض مقامات پر تو اقبال نے بھی اساتذہ سلف ہی کو دہرا دیا ہے۔ میں نے کہا اگر دہرایا بھی ہے تو ایسے اچھوتے ڈھنگ سے کہا ہے کہ اصل سے کہیں بڑھ کر اور بالکل نیا کہا ہے۔ فرمانے لگے مثال تو دیجئے۔ "میرے ذہن میں اسوقت عرفی کا شعر ابھر آیا ؎

گماں مبر کہ چوں تو بگذری جہاں بگذشت
ہزار شمع بکشتند و انجمن باقیست

میں نے کہا اب اقبال کو دیکھئے ؎

گمان مبر کہ بپایاں رسید کار مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگ تاک است

اشرف بولے کہ اس میں تو الفاظ اور پیرایہ یکسر بدل دیا گیا ہے۔ فیض صاحب نے فیصلہ صادر کر دیا "صاحب یہ تو آپ جاسوسی کرتے ہیں۔"

اشرف نے چلتے ہوئے کہا محکمہ جنگ میں کوئی اسامی خالی ہوئی ہے۔ فلاں صاحب سے کہہ دیں۔ فیض نے اسی وقت ان صاحب سے اشرف کی سفارش کر دی اور اشرف دوسری صبح سے برسر روزگار ہوگئے۔

ماہنامہ آجکل پریس میں چھپنے کے لئے چلا گیا صرف فیض کا مضمون ابھی تک باقی تھا میں نے منگل کی شام انھیں فون کیا بھائی جان!
بے چارے آغا دو اشتی مصیبت میں پھنس جائیں گے اگر آپ نے مضمون نہ لکھا اب مزید تاخیر کی گنجائش قطعی نہیں رہی اس لئے براہ کرم آپ کل
انوار کے سارے پروگرام ملتوی کر دیجئے میں کل علی الصباح آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا آپ بولتے جائیے گا میں لکھ دوں گا۔" فیض صاحب
کا کرم ہے کہ ہمیشہ میری بات مان لیتے ہیں۔ کہنے لگے "اچھا کل آجائیے مضمون ہو جائے گا۔" دوسری صبح میں علی الصباح مسلط ہوگیا۔ [illegible] صاحب
کی طویل نظموں پر نشان لگا کر میں نے انھیں دکھائیں کچھ طربیہ نظموں پر نشان لگا دیئے۔ انھوں نے پہلا ایک مجموعہ الٹ پلٹ کر دیکھا پھر دوسری
کتاب دیکھی وہ بھی رکھ دی، پھر کوئی اور مجموعہ اٹھایا۔ کاغذ الٹتے رہے آخر کہنے لگے کاغذ پنسل لے لیجئے اور بولنے لگے۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ
ان کے ذہن میں مضمون ترتیب پا چکا ہے
اب صرف نزول ہو رہا ہے جن اشعار پر نشان تھے، میں نے وہ بعد میں چسپاں کر دیئے، کوئی تین گھنٹے کے بعد مضمون تیار تھا
ان کے ملاحظے اور نظر ثانی کے لئے میں مسودہ ان کے پاس رکھ کر چلا آیا۔ دوسرے دن مضمون تیار ہو گیا۔ جو آجکل دلّی میں
شائع ہوا، اور اب ان کے مجموعہ مضامین میں موجود ہے۔

ایک دن میں جوش صاحب کے ہمراہ فیض کے ہاں گیا۔ فیض گھر میں نہیں تھے۔ بیگم ایلس فیض ملیں۔ جوش صاحب نے کہا "یہ بتائیے
کبھی آپ کی اور فیض کی لڑائی بھی ہوتی ہے؟" وہ بولیں "آخر آپ ہماری لڑائی کیوں چاہتے ہیں؟"
جوش صاحب نے ہنس کر جواب دیا "اصل میں لڑائی بربنائے محبت ہوتی ہے اگر آپ لوگوں کی لڑائی نہیں ہوتی تو آپ لوگوں
کی محبت خالص نہیں ہے۔" بیگم فیض یہ الزام بھلا اپنے سر کیوں لیتیں کہنے لگیں "جوش صاحب! ہم دونوں میں اختلاف رائے تو اکثر
ہو جاتا ہے لیکن لڑائی کبھی نہیں ہوتی۔" جوش صاحب چلتے ہوئے کہنے لگے "اچھا اب کے جب ہم آئیں تو کسی خاص لڑائی کا قصہ سنائیے گا تاکہ ہمیں
آپ لوگوں کی محبت کا یقین آجائے۔"

ایلس فیض کو بے انتہا چاہتی ہیں اور جیسی باحیا اور شوہر پرست بیبیاں ہماری قدیم معاشرے میں دیکھی اور سنی
جاتی تھیں، ایلس ان سے بھی بڑھ کر ہیں بلکہ انھوں نے فیض کی جیل کی طویل مدت میں جس پامردی سے تن تنہا مصائب کا مقابلہ کیا
ہے اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ ایلس پر تو ایسا شدید امتحان کا وقت آیا تھا کہ عزیز ترین قریبی دوستوں نے ان سے ملنا جلنا تو درکنار
ڈر کے مارے خط وکتابت اور ٹیلی فون پر خیریت طلبی تک ترک کر دی تھی کہ کہیں یہ لوگ بھی عتاب میں نہ آجائیں۔ ایسے کس مپرسی کے
عالم میں بیگم فیض پاکستان ٹائمز سے بھی متعلق تھیں اور دیال سنگھ کالج میں پڑھاتی بھی تھیں اور اپنی معصوم بچیوں کی پرورش و پرداخت

اسی انداز میں گزرتی رہیں کہ انھیں باپ کی عدم موجودگی اور شفقت سے محرومی کا احساس تک نہ ہوا۔ انھوں نے اس کی ذرہ برابر بھی پروا نہ کی کہ فیض کے کیسے کیسے قریبی اور محبت کے دعویدار دوست ان سے وقت کے ساتھی کی طرح کنارہ کش ہو گئے تھے۔ حکومت اور ناسازگار حالات کا انھوں نے جم کر مقابلہ کیا۔ غالباً انھیں حافظ کے اس شعر کی حکمت معلوم تھی ؎

رسید مژدہ کہ ایام غم نخواہد ماند
چناں نماند و چنیں نیز ہم نخواہد ماند

جنگ ختم ہوگئی، فیض فوج سے سبکدوش ہو کر لاہور آگئے اور پاکستان ٹائمز ان کی ادارت میں شائع ہونے لگا۔ میاں افتخار الدین خدا انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے کیسے قدردان علم و ادب تھے۔ انھوں نے پاکستان پروگریسو پیپرز کے نام سے ایک بڑا ادارہ اپنے ذاتی روپیہ سے قائم کیا اور امروز اور پاکستان ٹائمز دو روزنامے شروع کئے۔ فیض اور حسرت ادارے کے بڑے سربراہ مقرر ہوئے۔

قدیم لکھنوی تہذیب اور شرافت کے مجسمے سید اخلاق حسین بیرسٹر اُسی زمانے میں لکھنؤ سے لاہور چلے آئے اور یہاں نئے سرے سے پریکٹس شروع کردی۔ جب وہ دلی سے لاہور آرہے تھے میں بھی ان کے ہمراہ چلا آیا۔ مجھے لاہور سے بھی عقیدت ہے۔ کیونکہ وہاں میرا بچپن گذرا۔ گول باغ میں مرزا ادیب اور اسلم کمبوہ کے ہمراہ قدرت کے نظارے کیا کرتا تھا۔ علامہ سر محمد اقبال، شالا مار باغ، قزلباش خاندان، سید واجد علی شاہ غرض بہت سی دلچسپیاں مجھے لاہور بلاتی رہتی تھیں۔ برسوں کے بعد لاہور آنا ہوا تو اب وہاں کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔

ہوٹل میں سامان رکھ کر میں فیض صاحب کے پاس جانے لگا تو اخلاق صاحب نے پوچھا کہاں چلے؟ میں نے انھیں بتایا بلکہ اصرار کیا کہ آپ بھی چلیں چنانچہ ہم دونوں پاکستان ٹائمز کے دفتر میں فیض کے کمرے میں جا پہنچے۔ فیض صاحب کے چہرے پر وہی حکیمانہ تبسم موجیں مارنے لگا جس میں سے اپنائیت کی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ فیض صاحب نے اخلاق صاحب کو مجبور کردیا کہ وہ فوراً ہوٹل چھوڑ دیں اور ان کی قیام گاہ پر ٹھہرنا منظور کرلیں۔ میں تو خود یہ چاہتا تھا۔ انھوں نے اخلاق صاحب کو منا لیا اور اپنے نوکر کو بھیج کر ہمارا سامان بیگم شاہ نواز کے مکان پر جہاں وہ خود مقیم تھے بھجوا دیا۔

اس وقت فیض کے کمرے میں چراغ حسن حسرت، میاں محمد شفیع (جو اس وقت پاکستان ٹائمز کے چیف رپورٹر تھے)، اور صفدر انبالوی بیٹھے ہوئے تھے۔ مولانا وقتاً بلند آہنگی سے رطب اللسان تھے۔ اتنے میں میاں افتخار الدین کھدر کی شیروانی میں ملبوس برق چکاچوند کی طرح کمرے میں داخل ہوئے۔ انھوں نے معافی مانگی کہ وہ مداخلت بے جا کر رہے ہیں حالانکہ کرسی کمرے میں نہ تھی۔ میں میاں صاحب کو دیکھ کر تعظیماً کھڑا ہو گیا۔ اور اپنی کرسی انھیں پیش کرنی چاہی۔ میاں صاحب نے پوری قوت سے مجھے کرسی میں بیٹھا دیا اور خود فیض کی میز پر ٹک گئے۔ صرف دو تین منٹ تک اخباری انتظامی امور پر بات کی اور چشم زدن میں کمرے سے نکل گئے۔ تھوڑی دیر میں میاں صاحب پھر آدھمکے اور اخلاق صاحب سے بہ اصرار دوسرے دن دوپہر کے کھانے کے لئے فرمائش کی اور فیض کی سفارش پر اخلاق حسین صاحب کی منظوری لے کر چلے۔

رات کو ہم لوگ فیض صاحب کے مہمان رہے اور رات گئے تک چاندنی رات میں کھلے آسمان کے نیچے پلنگ پر لیٹے لیٹے باتیں کرتے رہے۔ فیض صاحب تو ظاہر ہے بقول ڈاکٹر رشید جہاں "بولتے ہی نہیں"۔ اخلاق صاحب عجیب

گفتگو کرتے رہے" لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم "

آخر ۴۷ء کا قیامت خیز ہنگامہ گرم ہو گیا۔ قتل و خون، لوٹ مار اور غارت گری کی کڑی دھوپ میں سسکتی اور کراہتی آبادیاں بھیڑ بکریوں کی طرح ادھر سے اُدھر منتقل ہونے لگیں۔ دلی جو ادبا اور فضلا کا مسکن اور امن بھی ہم لوگوں سے اپنا دامن عافیت سمیٹ چکی تھی اور تاریخی پرانے قلعہ کا عریض و بسیط احاطہ بھی پناہ گزینوں پر تنگ ہو چکا تھا۔ قسمت نے مجھے بھی وہاں دھکیل دیا تھا۔ عجب عالم بے بسی اور کس مپرسی میں دن کٹ رہے تھے۔ مجازؔ نے ایک دوست سے بتایا کہ دلی کی تباہی میں آفتاب بھی ختم ہو گیا وہ صاحب جب لاہور پہنچے تو اخلاق صاحب کو بھی مجازؔ کی خبر سنائی اور وہ تسلیم و رضا کے پابند صبر کر بیٹھے۔ فیض سے بھی تذکرہ آ گیا اور بات پرانی ہو گئی۔

میں جب مر کھپ کر صحیح سلامت لاہور پہنچا تو فیض نے بے حد محبت سے گلے لگا لیا اس وقت انہوں نے بتایا کہ مجازؔ نے کسی سے کہلا بھیجا تھا۔ اخلاق صاحب بے چارے بھی بے حد رنجیدہ تھے ہم نے تو امرتسر اور جالندھر کے رفیوجی کیمپوں میں تمہیں ڈھونڈوایا تھا چلو تم بخیریت آ گئے ٹھیک ہے!

فیض کی انسان دوستی، عالمی برادری کا خوش آیند تصور اور ان کی آفاقی بلند نظری ان کی شاعری کے ذریعے ملک کے ذہین اور حساس دماغوں میں قدر و منزلت پیدا کر چکی تھی برِ عظیم ہند و پاک تو خیر ان کا وطن ٹھہرا۔ ان کی شہرت کا پرچم ملکوں کی سرحدوں سے گزر کر کرۂ ارض کے دور دراز گوشوں تک جا لہرایا۔ دنیا کے مجبور، محکوم، دکھی اور ناچار لاکھوں انسانوں کی شدید تکلیف سے ان کے دل میں لاوا پکنے لگا اور دل میں چھپا ہوا عوام کا درد ان کی نظموں میں حسین و جمیل ترکیبوں اور خوب صورت الفاظ کی شکل بن کر ڈھلنے لگا۔ انھوں نے اپنی محرومیوں کو آفاقیت میں سمو دیا جس کا ذکر جابجا ان کی عظیم شاعری میں پایا جاتا ہے ؎

نصیبِ صحبتِ یاراں نہیں تو کیا کیجیے　　　　یہ رقص سایۂ سرو و چنار کا موسم

بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے　　　　فروغِ گلشن و صوتِ ہزار کا موسم

میں جب لاہور پہنچا تو رہنے کے لئے ماڈل ٹاؤن میں مکان الاٹ ہو گیا تھا۔ جس دن میں اس مکان میں پہنچا اسی رات کو فیض صاحب اور ایلس بھابی میرے ہاں تشریف لائے۔ میں اپنی بے سر و سامانی کو دیکھتا تھا اور کبھی فیض اور بھابی کے کرم کو۔ امی جان (بیگم آغا شاعر) نے اپنے ہاتھ سے کھانا پکایا جسے بھابی نے بے حد تعریفیں کر کے قبول کیا۔ امی جان کو تسلی تشفی دے کر دونوں رات کو کافی دیر کے بعد سدھارے۔ مجھے لاہور سے کراچی آنا پڑ گیا۔ ایک صاحب جو تاک میں تھے فوراً "جبڑہ" دوڑے، مری بوڑھی ماں جو اپنی عزت لئے اس مکان میں بیٹھی تھیں انھیں وہاں سے نکال پھینکنے کے سامان کر ڈالے۔ امی جان نے مجھے تار دے کر بلوایا ادھر فیض صاحب کو اطلاع کرائی۔ جو لوگ فیض کو قریب سے جانتے ہیں صرف وہی اندازہ کر سکتے ہیں کہ بھلا ایسے جھمیلے ان کے بس کے کہاں ہیں۔ فیض صاحب نہ صرف خود امی جان کے پاس پہنچے بلکہ اپنے پاس سے ایک معقول رقم بحالیات کے دفتر میں میرے نام سے بطور کرائے کے جمع کرا دی۔ انھوں نے کمشنر بحالیات کو ایک خط بھی لکھا کہ مرحوم آغا شاعر دہلوی کا اردو ادب میں کیا مقام تھا، ان کی بیوہ اس مکان میں جائز طور پر بیٹھی ہیں۔ وغیرہ، وغیرہ، وغیرہ۔ لاہور پہنچا تو امی جان سے فیض کی عنایت اور شرافت کا ذکر سن کر ان کی انسان دوستی اور عظمت کا نقش کچھ اور گہرا ہو گیا۔

قیام پاکستان کے بعد سید اخلاق حسین صاحب بیرسٹر جو بعد میں مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے جج بھی ہو گئے تھے افراد خاندان کے ساتھ لاہور میں ہی مقیم ہو چکے تھے۔ محرم شروع ہوا تو بیگم اخلاق جو لکھنوی مجالس اور محافل دیکھے ہوئے تھیں خواہشمند ہوئیں کہ لاہور کی بھی کوئی مجلس سنی جائے۔ میں لاہور کا پرانا نیاز مند رہا ہوں مجھ سے رہنمائی کے لئے کہا گیا۔ مجھے صرف یہ علم تھا کہ موچی دروازے میں نواب مظفر علی خان قزلباش کی حویلی میں مجلس ہوتی ہے۔ چنانچہ یہی طے ہوا کہ وہاں چلا جائے۔

شب عاشورہ میں بیگم اخلاق اور دوسری مستورات کو لے کر موچی دروازے پہنچا۔ تنگ گلیوں میں بے حد بھیڑ تھی۔ بازار میں سبیلیں بنی جگمگاہٹ سے روشن تھیں۔ ہم لوگ ریلے میں چلے جا رہے تھے۔ ایک پان والے کی دوکان پر کالی شیروانی اور سفید شلوار میں ملبوس فیض صاحب سگریٹ خرید رہے تھے۔ میں نے لپک کر ہاتھ تھام لیا! بھائی جان! آپ کہاں؟ کہنے لگے تم کہاں جا رہے ہو۔ میں نے کہا مستورات کو مجلس میں لے جا رہا ہوں کہنے لگے چلئے ہم بھی آ رہے ہیں۔ آج کی رات ہم بھی مجلس سنیں گے۔ میں نے کہا وہاں ایسی بھیڑ بھاڑ میں بھلا آپ سے کہاں ملاقات ہوگی کہنے لگے نہیں کہیں نہ کہیں مل ہی جائیں گے۔

میری چھوٹی سی نادانیوں سے پریشان ہو کر فیض مجھ سے روٹھ نہیں جاتے بلکہ جس وقت نزول شعر کا ہنگام ہو اس وقت کی میری نا واجب اور نا مناسب زیادتیاں بھی وہ بغیر چہرے پر شکن ڈالے برداشت کر لیتے ہیں۔ ایک مرتبہ وہ کراچی آئے میں اسٹیشن سے ان کی قیام گاہ تک ان کے ساتھ رہا۔ انھیں خوب ہی بور کیا دوسرے دن ان کا پروگرام تھا کہ صبح کی گاڑی سے وہ لاہور واپس ہو جائیں گے مجھے اسی رات بہاولپور جانا پڑ گیا میں ٹھیک حساب لگا کر شام کو وقت سے پہلے رحیم یار خان پہنچ گیا۔ جب کراچی کی گاڑی رحیم یار خان اسٹیشن پر آ کر رکی میری نظروں نے دور سے انھیں دیکھ لیا۔

شعر۔ ۱۔ میرا کعبہ نظر آتا ہے مجھ کو لاکھ منزل سے

فیض کھڑکی میں ہاتھ لٹکائے کسی گہری فکر میں بیٹھے خلاؤں میں گھور رہے تھے۔ میں ان کے پاس پہنچ کر ان کے بازو سے لپٹ گیا وہ چونک پڑے اور حیران ہو کر بولے۔ تم یہاں کہاں؟ تم تو کراچی میں ملے تھے۔ میں نے کہا جی چاہا کہ آپ کو رستے میں گھیر لوں۔ ... قدرت نے موسم بہار کو بڑی فیاضی سے زندگی بخش تاثیر عطا کی ہے۔ مارچ کا مہینہ آتے ہی آسمان و زمین سے گویا رنگ و نور کی بارش ہونے لگتی ہے۔ نسیم سحر نکہتوں کے قافلے اڑا کر فضاؤں پر مستی ہی مستی محیط کر دیتی ہے۔

۹ مارچ سنہ ۵۱ء کی صبح طلوع ہوئی مگر فضاؤں سے ویرانی ٹپک رہی تھی۔ نیلگوں آسمان کی پہنائیوں میں ہوا کی موجیں دھیمے سروں میں المیہ ساز بجا رہی تھیں۔ موسم کی دلبرانہ گرمی بے کیفی اور بے لطفی میں تبدیل ہونے لگی۔ ذرا فرق پر میں نے محسوس کیا ؎

اک موج ہوا پیچاں اے میر نظر آئی
شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

زنجیر نظر آئی میں نے دہرایا۔ دل بجھ گیا اور غمناک موڈ طاری ہو گیا۔ سہ پہر کو مقامی روزناموں کے ضمیمے شائع ہو گئے جن میں اسیران سازش کے نام جلی حروف میں چھپے تھے۔ ان میں کرنل فیض احمد فیض اور سید سجاد ظہیر بھی تھے۔ ان کی اسیری سے ان کے احباب کو بے حد رنج ہوا۔ ارباب سلوک نے ان کی گرفتاری کو سراہا۔ خود فیض نے

آغا آفتاب قزلباش

اسیری کو محض زنداں کی چار دیواری نہ جانا بلکہ انھوں نے وہاں خلوت اور جلوت میں سوچا سمجھا اور نئی آنے والی نسل کے لئے ٹھری خوبصورت اور نادر تشبیہات کی حریر و پرنیاں میں لازوال آہنگ کی دیوی کو آراستہ کیا جس کے حسن کی تابناکی افق تا افق ابھر رہی ہے۔ فیض اللہ سجاد ظہیر کی اسیری پر سب سے اچھی نظم جذبی نے لکھی ہے۔

اے زنداں یہ خالقِ فن ہیں ان کا فن خود اک سیلاب
اور ایسے سیلاب کے آگے ، تیری ہستی جیسے حباب !
ان کی خموشی اک افسانہ ، ان کا تبسم ایک چمن
ان کے پھول سے عطر آگیں ہیں قریئے ، بستی ، دشت و دمن
اے زنداں کیا تجھ سے رکے گی ان کی تجلی ان کی دمک
یہ مانا دیواریں تیری اتنی اونچی جیسے فلک
جتنے گھنے ہوں گے اندھیارے چاند ستارے نکھریں گے
چاند ستارے جب نکھریں گے یہ اندھیارے بکھریں گے
(معین احسن جذبی)

فیض اسیری کے دوران تنہا بھی رہے اور ساتھیوں کے ہمراہ بھی ان کے ساتھی انھیں سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ انھیں زنداں میں لکھنے پڑھنے اور غور و خوض کرنے کا خوب موقع ملا ہے لیکن زنداں پھر زنداں ہے خود کہتے ہیں :-

"تیرے فراق میں یوں صبح و شام کرتے ہیں"

بھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی
چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رخ پر بکھر گئی ہوگی !

دل اندوہگیں ہو جاتا تھا لیکن ایسے عالم میں بھی اپنے نیاز مندوں کو فراموش نہیں کرتے میرے ہاں بیٹی بھی پیدا ہوئی تو آغا سرخوش نے انھیں جیل ہی میں اطلاع بھیجی۔ فیض نے لکھا بچی کا نام غزل یا نو بہار رکھ دیجئے چنانچہ بچی اسی دن سے نو بہار پکاری جانے لگی۔ رسالہ نو رنگ کراچی میں عزیزہ سحاب قزلباش کا مضمون میرا ابا پر شائع ہوا۔ اور ان کی نظر سے گزرا تو انھوں نے جیل سے یہ لکھ کر دل بڑھایا۔ "مضمون پسند آیا۔ ایسا مضمون لکھوانے کے لئے مرنے کو جی چاہتا ہے"۔ اسیران سازش کی پیروی مرحوم شہید سہروردی نے کی تھی۔ فیض نے اسے بہ نظر استحسان دیکھا۔ اسی زمانے میں سہروردی صاحب سے فیض کے خاص مراسم ہو گئے تھے۔ جب فیض رہا ہو گئے تو کراچی کے ہوائی مستقر پر ایک دن سرکاری اور غیر سرکاری عمائدین نے دیکھا کہ اس وقت کے وزیر اعظم شہید سہروردی کے ساتھ فیض بھی ہوائی جہاز سے برآمد ہوئے۔ کل تک جو اسیر محن تھا پاکستان کا وزیر اعظم اسے قدر و منزلت سے نواز رہا تھا۔ جہاز سے برآمد ہو کر اور سہروردی صاحب کے ہمراہ اتر کر نیچے آئے، ان کے چہرے پر وہی حکیمانہ تبسم گلستان کی طرح کھل اٹھا تھا۔ مجھے فیض کی خلوت اور جلوت، ان کے ساتھ کھانے میں شریک ہونے، ان کی خوابگاہ میں بیٹھ کر انھیں بور کرنے اور ایلس بھابی اور بچیوں کے ساتھ فیض کی صحبت میں اپنی زندگی کے بہترین لمحات گزارنے کی عزت اور سعادت حاصل ہوتی رہی ہے میں نے کبھی انھیں بدمزاجی یا خفگی کے موڈ میں نہیں دیکھا۔ جب کبھی بولے تو

سخن اندر دہانِ دوست گوہر
ولیکن گفتۂ حافظؔ ازاں بہ

ورنہ خوش رہے اور ان کی خوشیوں میں بھی کتنی بزم آفرینیاں، اور کتنی فکری جلوہ سامانیاں ان کے ذہن و دماغ میں حسین وجمیل تصورات ڈھالتی رہتی ہیں۔ ایلس بھابی اپنے ذکی اور ذہین شوہر پر جتنا بھی ناز و افتخار کریں کم ہے، وہ فخر و مباہات سے پھولی نہیں سماتیں اور سرگرم و مسرور ہیں اور زندگی کے نشیب و فراز میں برابر فیض کی مددگار اور شریک ہیں۔

ایک دن علی الصباح چائے کی میز پر فیض، بیگم فیض اور بچیوں کے ساتھ میں بھی شریک تھا۔ فیضؔ بہت پیار سے سلیمہ کو دیکھ رہے تھے۔ میں نے بھابی سے کہا "خدا کرے آپ کے اں لڑکا پیدا ہو اور وہ فیضؔ صاحب کی طرح شاعر بن جائے تو کیا اچھا ہو؟" ایلس بھابی فوراً سنجیدہ ہوگئیں "نہیں نہیں آفتاب! خدا کے لئے ایسا نہ کہیئے۔ میری بچی اور دوسری بچی کی طرف اشارہ کرکے بولیں یہی میری بڑی دولت ہیں۔ شاعری کے لئے فیض ہی کافی ہیں"۔

فیض اپنی والدہ صاحبہ کی بھی بڑی عزت کرتے ہیں۔ یقیناً وہ اپنے سپوت پر کیسا فخر محسوس کرتی ہوں گی۔ فیض کی انسان دوستی اور عالمگیر انسانی برادری کے نقیب ہونے کی حیثیت سے انھیں کچھ عرصہ ہوا لینن پرائز ملا تھا۔ وطن واپس آنے پر کئی جگہ فیض کی استقبالیہ دعوتیں ہوئیں۔ پریس کلب کراچی نے بھی ان کے اعزاز میں استقبالیہ کا اہتمام کیا تھا۔ فیضؔ صاحب نے وہاں اپنے بیرونی ممالک کے دورے اور اپنے مشاہدات و تاثرات بیان کئے جب ہنگامہ ختم ہوگیا تو میں فیضؔ صاحب کو الگ لے گیا اور ان سے کہا، "آپ کو معلوم ہے کہ مجھے شعر سے کوئی مناسبت نہیں ہے لیکن اسی وقت نذرِ عقیدت کے طور پر چند مصرعے موزوں ہوگئے ہیں اور وہ یہ ہیں: ؎

"لینن پرائز لے کر وطن واپس آنے پر"

نویدِ آمدِ فصلِ بہار لائے ہیں
وطن کے نام پہ عزّ و وقار لائے ہیں

تری نوا سے جوانی کو بانکپن ہے نصیب
وطن میں آنا مبارک ہو عصرِ نو کے نقیب

تجھی سے مسلکِ دار و رسن کی زینت ہے
ترے ہی فیض سے دنیا میں اپنی عزت ہے

صہبا صاحب نے جب مجھ سے فرمائش کی کہ فیض پر تو بہت سے صاحبان لکھیں گے تم شخصی قسم کا مضمون لکھ دو تو میں نہال نہال ہوگیا اور نازش و افتخار سے گنگنانے لگا۔ ؎

گدائے میکدہ ام لیک وقتِ مستی بیں
کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم

انور عظیم

ماسکو کی ایک رات

برف گر رہی تھی اور ماسکو کی رات کو پراسرار بنا رہی تھی ہماری کار یوکرائنا ہوٹل سے نتاشا کے گھر کی طرف بھاگ رہی تھی۔ سڑک پر تازہ تازہ سفید برف بچھی ہوئی تھی۔

نتاشا اور فیض پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ نتاشا کے کٹے ہوئے بال گھنگھریالے تھے اور گردن پر جھول رہے تھے۔ وہ فیض کی شخصیت اور شاعری دونوں کے سحر میں کھو گئی تھی فیض چند دن میں اپنے وطن واپس جانے والے تھے اور اب نتاشا انھیں اور ان کے دوستوں کو کھانا کھلانے اپنے گھر لے جا رہی تھی جہاں اس کا شوہر ادماں جہانوں کا انتظار کر رہے تھے۔

نتاشا کے شوہر نے بڑی فراخ دلی سے مہمانوں کا استقبال کیا۔ کھلانے پلانے میں اس نے روسی روایت کی پوری لاج رکھی۔ محفل رات گئے تک گرم رہی۔ نتاشا کا شوہر فلیش سے مہمانوں کی تصویریں لیتا رہا اور کہتا رہا "یہ تصویریں اچھے ہندوستانی اور پاکستانی مہمانوں کی یاد تازہ کریں گی"

ہم نتاشا کے شوہر کی خوش اخلاقی اور شگفتگی پر حیران تھے۔ اس کی آنکھوں سے بلا کی ذہانت اور شرارت ٹپک رہی تھی۔ نتاشا کا حسین چہرہ دمک رہا تھا اور مسرت حسین چہرے کو اور بھی حسین بنا دیتی ہے۔

جب ہم کافی پی کر ہوٹل کی طرف آنے تو ہم سب نتاشا کو چھیڑ رہے تھے

"برف گر رہی ہے۔ رات ڈھل رہی ہے اور تم ہمیں پہنچانے جا رہی ہو۔ تمہارا شوہر بڑا شریف ہے۔"

"میں تم لوگوں کو ہوٹل میں اتار کر سیدھی گھر واپس چلی جاؤں گی۔ اتنا انتظار تو وہ کر ہی لیگا۔" نتاشا نے شرارت سے اپنے شوہر کے بارے میں کہا۔

فیض نے بات کاٹ دی اور اپنے نرم لہجے میں کہا۔

"نتاشا دیکھنا۔ تمہارا شوہر تمہیں قتل کر دے گا اس کی آنکھوں میں خون ہے۔"

فیض کی یہ بات بھی مذاق میں اڑ گئی اور ہم سب کار سے اتر گئے۔

چند دن بعد فیض پاکستان واپس چلے گئے۔ میں ماسکو ہی میں تھا اس لئے نتاشا مجھے حیران کرتی رہتی: "بھئی فیض کی کچھ خبر ہے۔ روسی میں فیض کی نئی نظم کا ترجمہ ہوا ہے۔ بڑی خوبصورت ہے"

ٹیلی فون کے علاوہ بھی جب کبھی ملاقات ہوتی تو فیض کا ذکر ضرور کرتی اور کہتی ——— "میں نے اتنا اچھا آدمی نہیں دیکھا ——— اسی لئے تو وہ

(باقی صفحہ ۲۴۳ پر)

نصیر احمد زبیری

چیکوسلواکیہ میں فیض کی مقبولیت

میں ایک دن براتی سلاوا میں یونیورسٹی کے قریب ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھا چائے پی رہا تھا کہ ایک سلواک شاعر میرے پاس آئے۔ اور انہوں نے مجھ سے یہ درخواست کی کہ میں ان کو چند اردو کی نظموں وغیرہ کا سلواک زبان میں ترجمہ کرکے دیدوں تاکہ وہ اپنی سلواک زبان میں ان کو ڈھال سکیں۔ ان کی یہ فرمائش پوری کرنا میرے لئے جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ ایک تو میرے پاس فیض صاحب کی "دست صبا" اور "نقش فریادی" کی کتابوں کے علاوہ اور کسی شاعر کی کوئی کتاب نہ تھی۔ البتہ کچھ میرے پاس رسالے وغیرہ تھے۔ اور دوسرے یہ خیال ہوا کہ وہاں کی شاعری ہماری شاعری سے اس قدر مختلف ہے کہ یہاں والوں کی سمجھ میں کچھ نہیں آئے گی۔ اس کے علاوہ وہاں کی شاعری ردیف اور قافیہ سے بھی آزاد ہے۔ پھر بھی ان کے بہت اصرار کرنے پر فیض صاحب کی "تنہائی" "چند روز اور میری جان..... صرف چند ہی روز" اور "رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی" کا ترجمہ کرکے انھیں دیدیا۔ اور تمام ردیف اور قافیے انھیں سمجھا دیئے۔ اس کے بعد بات آئی گئی ہوگئی۔ چند دنوں میں ان چاروں نظموں کو انہوں نے نظم کی شکل میں ڈھال دیا اور وہ مجھے دکھانے کے لئے لائے۔ انہوں نے کافی محنت سے کام کیا تھا اور انھیں ان نظموں کو سلواک زبان میں ڈھالنے میں کافی کامیابی بھی ہوئی۔ سلواک شکل میں مجھے بھی یہ نظمیں کافی پسند آئیں اور میں نے انھیں اس بات کی اجازت دیدی کہ وہ ان نظموں کو کسی ادبی رسالے میں اگر ممکن ہو تو چھپوا سکتے ہیں۔ چند سطریں میں نے فیض صاحب کی تعریف میں بھی لکھ دیں اور اس طرح سے چند ماہ بعد یہ نظمیں وہاں کے ایک ادبی رسالے 'SLOOAK POHLADY' میں شائع ہوگئیں۔

اس طرح شروعات ہوئی۔ ان نظموں کے چھپنے کے چند ہی دنوں کے بعد سلواک مصنفین کے پریس کے سکریٹری کا ایک پرچہ مجھے ملا کہ اگر میرے پاس وقت ہو تو میں ان سے ایک بہت ضروری کام کے سلسلہ میں آکر ملوں۔ ملاقات ہونے پر انہوں نے بتایا کہ فیض صاحب کی جو نظمیں چھپی تھیں وہ لوگوں کو بہت پسند آئیں۔ اگر میں ان کے پریس کے لئے اردو غزلوں اور نظموں کا مجموعہ اور مختلف شاعروں کا ایک ہزار شعروں کا ترجمہ کردوں تو انھیں بہت خوشی ہوگی۔ کتاب حاصل کرنے کے سلسلہ میں تمام ہندوستانیوں کو جو وہاں موجود تھے خط لکھے اورینٹل انسٹیٹیوٹ ہندوستانی سفارت خانہ کی خدمات حاصل کی گئیں اور جتنی کتابیں اور رسالے کم سے کم وقت میں دستیاب ہوسکتے تھے حاصل کرلئے۔ اور دو سال کے اندر اردو کی مختلف ہندوستانی اور پاکستانی نظموں کا ایک مجموعہ مجاز کی ایک نظم "خواب سحر" کے نام سے شائع ہوگیا۔ چونکہ فیض صاحب کی دو کتابیں میرے پاس موجود تھیں۔ اس وجہ سے فیض صاحب ہی ایک ایسے شاعر تھے جن کی نظمیں اور غزلیں اس کتاب میں شامل ہوئیں جبکہ دوسرے شاعروں کی تین چار نظموں سے زیادہ نہیں تھیں (سوچ، رات یوں دل میں..... چند روز اور میری جان..... بول، تنہائی، مجھ سے پہلی سی محبت، آخری خط، رقیب سے، کتے، بھائی کے نام خط، ہم لوگ، تمہارے حسن کے نام، موضوع سخن، زنداں کی ایک شام، زنداں کی ایک صبح) صرف براتی سلاوا میں ۱۹۵۹ء سے لیکر ۱۹۶۴ء تک چار سلواک ادبی رسالوں میں ان کی ۲۰ نظمیں اور غزلیں

چھپ چکی ہیں۔

اسی دوران سجاد ظہیر صاحب پراگ تشریف لائے اور انہوں نے فیض صاحب کے اوپر ایک بہت ہی طویل مقالہ لکھا جو وہاں کے ایک رسالے "دنیائے ادب" پراگ میں ان کی چند نظموں وغیرہ کے ساتھ شائع ہوا۔ ان نظموں کا ترجمہ ژان ماریک صاحب نے کیا جو پاکستان کا دورہ بھی کر چکے ہیں۔ اس طرح فیض صاحب اردو کے پہلے شاعر تھے جن کا تعارف وہاں والوں سے پوری طرح ہوا اور وہ وہاں پر کافی مقبول ہوئے۔ ان کی بہت سی نظمیں وغیرہ پراگ اور براتی سلاوا کے ریڈیو اسٹیشن سے بھی نشر ہوئیں۔ اور براتی سلاوا کے ٹیلی ویژن سے ایک مرتبہ ان کے بارے میں ایک خاص پروگرام بھی نشر کیا گیا۔ اس کے علاوہ ان کی نظمیں وہاں کے تقریباً تمام ہی ادبی رسالوں میں چھپیں اور پہنچتے دنوں میں چیکوسلواکیہ میں وہ اردو کے سب سے مشہور شاعر ہو گئے۔ یہ بات بھی خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ ان کی "وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا" بھی بہت مقبول ہوئی اور بہت سے اخباروں میں چھپی اور ریڈیو اسٹیشن سے بھی نشر کی گئی۔ اس کے بعد سے جیسے ہی ان کی کوئی نظم یا غزل چیکوسلواکیہ پہنچتی کسی اخبار یا رسالے میں ترجمہ ہو کر چھپ جاتی تھی۔ "خواب سحر" کے اوپر جتنے بھی تبصرے لکھے گئے ان میں فیض صاحب کو خاص طور پر پسند کیا گیا۔ دونوں کے اندر اپریل ۱۹۶۱ء میں ان کی تینوں کتابوں "دست صبا" "نقش فریادی" اور "زنداں نامہ" کا ترجمہ کتابی شکل میں چیک زبان میں پراگ سے "نقش فریادی" کے نام سے چھپا (۵۰۰۰ کاپیاں) یہ ترجمہ ژان ماریک صاحب نے ایک چیک شاعر (K. BEDNAR) کے ساتھ مل کر کیا۔

فیض کی چیکوسلواکیہ میں مقبولیت کا پتہ ان دو باتوں سے چل سکتا ہے کہ چیک زبان میں "نقش فریادی" دو ہفتے میں بک گئی (چیکوسلواکیہ میں دو قومیں اور دو زبانیں ہیں۔ اس کی کل آبادی ۱۱ ملین کے قریب ہے ان میں سے ۳ ملین سلواک ہیں۔ اور سلواکیہ کا صوبائی دار الحکومت شہر براتی سلاوا ہے) اور اب اس سال ان کی تینوں کتابوں کا ترجمہ "دست صبا" کے نام سے براتی سلاوا میں شائع ہو رہا ہے۔

فیض صاحب چیکوسلواکیہ کے تمام ادبی حلقوں میں مقبول اور مشہور ہیں۔ ان کی مقبولیت ان کو "لینن انعام" ملنے کے بعد سے اور بھی زیادہ بڑھ گئی ہے شاید ہی کوئی ادب سے دلچسپی رکھنے والا ہو جو چیکوسلواکیہ میں ان کے نام اور کلام سے واقف نہ ہو۔ اگر یہ کہا جائے تو بالکل مبالغہ نہ ہوگا کہ فیض صاحب ہندوستان اور پاکستان کے شاعروں میں پہلے شاعر ہیں جو ٹیگور کے بعد وہاں مشہور اور مقبول ہوئے۔ اس بات میں بھی کوئی مبالغہ نہیں کہ ان کی ذات کا اردو زبان کو مشہور اور پاپولر کرنے میں سب سے بڑا ہاتھ ہے۔ چیکوسلواکیہ میں اردو ادب میں ان کی حیثیت اس سنگ میل کی سی ہے جسے بغیر دیکھے اور مانے آگے نہیں بڑھا جا سکتا۔

(براتی سلاوا، سفر)

ماسکو کی ایک رات

(صفحہ ۲۴۱ سے آگے)

اتنا اچھا شاعر ہے۔

لیکن کچھ دنوں بعد ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو نتاشا کی ایک دوست نے عجیب خبر سنائی۔

"نہیں نہیں میں یقین نہیں کر سکتا۔" میرے منہ سے نکلا

رات، برف، آواز! یکایک فیض کی بات یاد آئی۔

"نتاشا! دیکھنا تمہارا شوہر تمہیں قتل کر دے گا۔"

اور واقعی نتاشا کے شوہر نے اپنی حسین بیوی کو قتل کر دیا تھا۔

شمیم حنفی

فیض احمد فیض۔ چند زاویے

مئی ۱۹۶۲ء کی اس رات گوالیار میں کیسے کیسے شعراء مختلف اطراف و اکناف سے سورج کی شعاعوں کی طرح ایک مرکز پر جمع ہو گئے تھے۔ اردو سبھا کی جانب سے فراق صاحب کے زیرِ اہتمام ایک بڑا مشاعرہ ہو رہا تھا۔ اس مشاعرے میں ساحر آئے تھے۔ جن کی طویل نظم "پرچھائیاں" اس سے کچھ ہی عرصہ قبل شائع ہوئی تھی اور اس کے آبشار جیسے مترنم مصرعوں نے جانے کتنے ذہنوں میں سوئی ہوئی تصورات کی پرچھائیاں جگا دی تھیں۔ حیدرآباد کا باغی شاعر مخدوم محی الدین تھا جس کا ماہِ فلکی کی طرح بجھا ہوا چہرہ اور سرخ ریشے کی طرح تپی ہوئی آواز جس کے سوز و ساز میں آندھرا کے محنت کشوں کے آنسو ضم ہو کر شعلۂ شبنم کا سنگم بنا دیتے ہیں اور جس کے ہونٹوں سے نکلنے والے گیت ایوانِ اقتدار کے در و دیوار پر بادلوں کی گھن گرج سے زیادہ مہیب آواز میں منتقل ہو کر دستک دیتے ہیں۔ جاں نثار اختر تھے، جن کی اجڑی اجڑی سی بے ربط اور بے خبر نظر آنے والی شخصیت میں رچا ہوا تغزل کانوں میں رس گھول رہا تھا۔ اور ــــ اور ان سب سے بڑے شاعر تھے لیکن جس شاعر کو دیکھنے کے لئے سنکھیں تجسس اور بے قرار تھا۔ وہ فیض تھے جو اس سرحد کو عبور کر کے ہندوستان آئے تھے۔ جس کے سامنے نے پانچ دریاؤں کے علاوہ ہر کے ایک چھٹے دریا کا ابال بھی دیکھا تھا۔ جنھوں نے حصولِ آزادی کی منزل کو اپنی آخری منزل نہیں سمجھا تھا۔ اور اپنی ٹھہری ہوئی آواز اور دھیمے لیکن پر اعتماد لہجے میں "داغ داغ اجالے، اور شب گزیدہ سحر" کی طرف دیکھ کر اپنی ناآسودگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا۔ ؎

ابھی گرانیِ شب میں کمی نہیں آئی
نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

ساحر نے اپنی نظم پرچھائیاں سنائی پھر لوگوں کے اصرار سے مجبور ہو کر تاج محل اور اس کے بعد مخدوم کی سیدھی سادی لیکن توانا اور پُر اثر آواز نے ساری فضا پر ترنم کی چادر پھیلا دی ؎

کوئی جلتا ہی نہیں کوئی پگھلتا ہی نہیں
موم بن جاؤ پگھل جاؤ کہ کچھ رات کٹے

یہ معلوم ہوتا تھا جیسے انگارے پگھل کر رات کی رگ رگ میں سرایت کر گئے ہوں۔ بڑی شدید گرمی تھی۔ مشاعرہ پنڈال میں ہر طرف لوگوں نے اپنے رومال لئے تھے۔ اور بھری بھری سانسیں لیتے ہوئے اپنے دامن یا رومال یا جلتے ہوئے کسی اخبار یا رسالے کو پنکھے کی طرح ہلا رہے تھے لیکن

افکار فیض نمبر

شمیم حنفی

سفید بش شرٹ اور پتلون میں ملبوس، سیدھے سادے، ادھیڑ
ہوئے شاعر پر ٹک کر صدرِ مشاعرہ کی ترتیب
نگاہیں بار بار ڈائس پر مائک کے سامنے کھڑے ہوئے شاعر سے اور شاعر آپ اپنے وجود سے بے نیاز ہو کر
عمر کے اس شاعر پر پڑ رہی تھیں جو لاتعلق آباد کی رہی تھی۔ مشاعرے کے شور و غل سے۔ داد تحسین کے ہنگاموں سے
میں سگریٹ دبائے غور سے اشعار پڑھتے ہوئے شاعر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پیشانی پر منکسر نفسی اور سادہ مزاجی کی چمک تھی، بے نام سی افسردگی میں لپٹی ہوئی
آنکھیں پر خیال انداز میں کبھی کبھی سگریٹ کے دھوئیں سے بچنے کے لئے ایک ذرا سا کھل جاتی تھیں اور آنسو ستاروں کی سج میں سلگتے ہوئے ہونٹ غیر ارادی طور
پر کچھ ایسا انداز اختیار کر لیتے تھے گویا مسکرا رہے ہوں۔

یہ فیض تھے۔
تھوڑی دیر بعد فراق صاحب نے اپنی گیسوئے شب کھولتی ہوئی آواز میں بڑی محبت کے ساتھ فیض کا تعارف کرایا اور محمود احمد ہنر نے جو ناظر
کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ فیض کا نام پکارا۔ ان کی آواز شدتِ جذبات سے کانپ رہی تھی اور چہرے پر ایک ایسی سرخی عود کر آئی تھی جو داخلی مسرت
کا رد عمل ہوتی ہے۔
فیض نے سگریٹ کا بجھا ہوا ٹکڑا ڈائس کے پیچھے پھینک دیا۔ خاموشی سے اٹھے اور مسکراتے ہوئے مائک کے سامنے کھڑے ہو گئے۔
کچھ لوگ اپنی اپنی جگہوں پر اچک کر کھڑے ہو گئے، کچھ لوگ چیخنے لگے۔ کچھ تالیاں بجانے لگے، کچھ پہلے سے بھی زیادہ خاموش ہو گئے اور مشاعرے کے
پنڈال کی حدوں سے نکل کر لی جی آوازوں کے پرشور سیلاب نے سارے منظر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔
مہذب دنیا میں بے پایاں مسرت کا اظہار اکثر دیوانگی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔
میں ایک ٹک فیض کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ان کی آنکھوں میں اس وقت کچھ عجیب سی کیفیت جھلک رہی تھی جس میں نہ تو ناخوشگواری یا مزدور
یا پتھر جیسی کٹھورتا سی تھی اور نہ خواہ مخواہ کا عجز و انکسار۔ خدا خدا کر کے شور ختم ہوا۔ پھر لوگ اس طرح مہر بہ لب اور ساکت و جامد ہو کر بیٹھ گئے گویا چند لمحوں پہلے
گونجنے والے شور کا ان سے کوئی تعلق ہی نہ رہا ہو۔
فیض نے کوئی تقریر نہیں کی۔ بس ابتدائیہ کے طور پر چند جملوں میں لوگوں کے اظہارِ خلوص کا شکریہ ادا کیا اور اپنے شعر سنانے لگے۔
اب لوگ سنبھل سنبھل کر داد دے رہے تھے۔ فیض کے اشعار میں نہ تو زبان و بیان کی کرتب بازیاں تھیں جن کے مظاہرے پر کبھی کسی زمانے میں لوگ
اس قدر چیختے تھے کہ چھتیں اڑ جاتی تھیں اور نہ ہی ان میں جذبات کا طوفان تھا جو سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں کے احساس کے سوتوں میں ابال پیدا کر دیتا۔ ایک
سیدھی، سادی، گہری، دھیمی اور سوچ میں ڈوبی ہوئی آواز تھی۔ جو دوسروں کو ہنگامہ آرائی پر آمادہ کرنے کے بجائے سوچ میں ڈال دیتی تھی۔ اور لوگ کھوئے
کھوئے سے اس آواز کے پیچ و خم میں الجھے ہوئے اور اس آواز میں چھپی ہوئی سرخ کی ماہوں میں بانہیں ڈالے اس کے ساتھ ساتھ ایک فکری سفر پر چل کھڑے
ہوئے تھے جو مفلس کی قبا جیسی زندگی میں لگے ہوئے "درد کی پیوندوں" کی طرف خاموش اشارے کرتی ہوئی، لب پر حرفِ غزل لئے اور دل میں غموں
کی قندیل جلائے آگے بڑھتی جا رہی تھی۔
اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ فیض کی آواز اور ان کے خیال میں کتنا گہرا اور اٹوٹ رشتہ ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے کس قدر ہم آہنگ ہیں۔ وہ شاعر
جو سامنتی نظام کے سر بسجود ہوتے ہوئے ڈھانچے کو دیکھ کر مسرت یا فتحیابی کے جذبات سے مغلوب ہو کر فلک شگاف قہقہے لگانے کے بجائے بڑی دھیمی اور فکر
انگیز آواز میں اس نظام کے فاتحوں سے بس اتنا کہتا ہے:

شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
کیا آس لگائے بیٹھے ہو

جو ترقی پسند تحریک سے شدید ذہنی وابستگی کے باوجود اپنے اشعار کو محض ایک سیاسی منشور کی شکل نہیں دیتا جس کی آواز میں بڑا درد اور کرب ہے لیکن تمکنت اور بایدی کا نام و نشان نہیں۔ جو فکر و فن کا توازن ہمیشہ قائم رکھتا ہے اور اپنے نظریات اور معتقدات کو کسی قسم کی سستی نعرے بازی یا سطحی چیخ پکار کا شکار بننے کے بجائے اعلیٰ ایسا آب و رنگ عطا کرتا ہے جن کی چمک دمک آنے والے ہر زمانے میں یکساں طور پر برقرار رہے گی۔ اس کی آواز میں واقعی ایسا ہی ٹھہراؤ اور لہجے میں ایسا ہی توازن ہونا چاہیئے تھا۔

فیض جب تک مائک کے سامنے رہے ہم لوگ خاموشی سے ان کے اشعار سنتے رہے لیکن مشاعرے کے بعد جب رات کے تقریباً دو بج چکے تھے اور فضا ساکت تھی اور تھکی تھکی سی چاندنی ساری دھرتی پر پھیل گئی تھی اور میں اپنے چند دوستوں کے ساتھ ہوسٹل کی طرف چلا جا رہا تھا ہم سب باتیں کرنے لگے۔ وہی باتیں باتیں اور باتیں۔ اور یہ سوچنے لگا کہ فیض کے اشعار سنتے وقت ہم جس سحر کار انہ طلسم کے شکار ہو کر ساکت و جامد بیٹھے ہوئے تھے اس کی ہمہ گیری منزل یہی تھی کہ کچھ دیر بعد احساسات کی لہریں پوری شدت کے ساتھ تڑپ اٹھیں۔ اس طرح حال اور مستقبل کے سرے مل جاتے ہیں اور فیض کی آواز زمان و مکان کے حدود پار کرتی ہوئی زندگی اور وقت کے کاندھے سے کاندھا ملائے ایک ابدی نغمہ بن جاتی ہے۔

دوسری رات بھی ویسی ہی گرم تھی

منصور پارک میں مشاعرہ ہو رہا تھا۔ یہ مشاعرہ حرفی ادب کے امدادی فنڈ کے لئے تھا۔ اور سجاد ظہیر نے اس کا اہتمام کیا تھا۔ ڈاکٹر اعجاز حسین صدارت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔

سجاد ظہیر نے اپنے محبوب ترین دوست اور شاعر کا تعارف کرایا۔ فیض پھر اسی مخصوص تبسم کے ساتھ مائک کے سامنے آئے اور ان کی آواز کے ساتھ ساتھ ؎

صبح پھوٹی تو آسماں پہ ترے
رنگ رخسار کی پھوار گری
رات چھائی تو روئے عالم پر
تیری زلفوں کی آبشار گری

اور آخر میں یہ کہتے ہوئے کہ ؎

نہ سوالِ وصل نہ عرضِ غم نہ شکایتیں نہ حکایتیں
ترے عہد میں دلِ زار کے سبھی اختیار چلے گئے

فیض نے چپ سادھ لی۔ سجاد ظہیر انھیں ساتھ لئے ہوئے ڈائس سے نیچے اترے۔ فیض کے قدم کسی قدر لڑکھڑا رہے تھے قریب ہی ایک نیم روشن سی پتھریلی سی گلی کے نکڑ پر ہاتھوں میں آٹو گراف ڈائریاں سنبھالے طلبا کی ایک فوج کھڑی ہوئی تھی۔ فیض کو دیکھتے ہی وہ ان کی طرف لپکے۔

"اوہ! تم لوگ اب تنگ کرو گے! چلو فیض!" سجاد ظہیر نے شفقت آمیز جھلاہٹ کے ساتھ کہا اور فیض کو اس آفتِ ناگہانی سے نجات دلانی چاہی ——

ایک لمحے کے لئے فیض کچھ جھجکے پھر الیکٹرک پول کے نیچے کھڑے ہوگئے۔ بالکل سیدھے صحیح و توانا اور جمے ہوئے قدموں کے ساتھ۔ جیب سے فاؤنٹین پین نکالا اور یکے بعد دیگرے ساری ڈائریوں کے ایک ایک سادہ صفحے پر فیض احمد فیض کی آڑی ترچھی لکیریں ابھر آئیں۔

نو عمر طلبا کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں جیسے فیض کے دستخطوں میں انھیں اپنی آرزوؤں کا سراغ مل گیا ہو یا جذبات کی منزل ہاتھ آگئی ہو

شمیم حنفی

یہ مستقبل کی کلید پا گئے ہوں۔

آج سے لگ بھگ پانچ برس پہلے کی بات ہے۔ شاید ۱۹۵۸ء کے جاڑوں کی دوپہر تھی جب زیکوسلواکیہ کے ایک پروفیسر بار مارک الہ آباد آئے۔ پروفیسر مارک جوان اور خوبصورت آدمی تھے۔ تیس اور پینتیس کے درمیان عمر رہی ہوگی۔ ہندوستان کی متعدد زبانیں وہ بڑی روانی کے ساتھ بولتے تھے۔ اور زیکوسلواکیہ میں ادبیات اردو کے معلم تھے۔ شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی کی جانب سے انہیں ایک عصرانہ دیا گیا۔ صدر شعبہ ڈاکٹر اعجاز حسین نے شعبے کے طلباء سے پروفیسر مارک کا تعارف کرایا۔ پھر پروفیسر مارک نے ایک مختصر سی تقریر کی اور فیض کی متعدد نظمیں اور ان کے زیک ترجمے سنائے۔

چائے کی میز پر ڈاکٹر صاحب نے پروفیسر مارک کو طلباء کے درمیان بٹھا دیا تاکہ ہم لوگ ان سے باتیں کر سکیں۔

پروفیسر مارک نے دیواروں پر آویزاں تصاویر پر ایک نظر ڈالی۔

"یہ فیض ہیں، اور یہ اقبال اور یہ جوش اور یہ پریم چند۔" پروفیسر مارک بجلی کی سی تیزی سے ساری تصویروں سے اپنی شناسائی کا ثبوت دیتے جا رہے تھے۔

"آپ کو ہمارا کون سا شاعر سب سے زیادہ پسند ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"اقبال اور فیض!" پروفیسر مارک مطمئن انداز میں بولے۔

"کیوں؟"

"اقبال تو اس لئے کہ ان کے لہجے میں بڑی توانائی اور بلند آہنگی کا احساس ہوتا ہے۔ اس کی آواز ہمیں مایوس اور افسردہ ہونے سے بچاتی ہے۔ اور ایک برقی قوت کی طرح ہماری رگوں میں دوڑ جاتی ہے۔ وہ انسانی عظمت کے گیت گاتا ہے۔" پروفیسر مارک بڑی روانی کے ساتھ کہتے جا رہے تھے۔

"اور فیض؟" میں نے سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

"جی ہاں! فیض میرا دوسرا محبوب شاعر ہے۔ میں نے فیض کی اکثر نظموں کے زیک ترجمے کئے ہیں اور ہمارے یہاں ادب سے دلچسپی لینے والے تمام لوگ فیض کو خوب جانتے ہیں!"

"اس پسندیدگی کی وجہ تو آپ نے بتائی نہیں!"

"اوہ! بات یہ ہے کہ فیض کا شعور کسی حد... میرا مطلب ہے کہ جغرافیائی حدود کا پابند نہیں۔ ان کی آواز ہم سب کو اپنی آواز معلوم ہوتی ہے۔ بالکل اپنی۔ اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ بالکل نہیں!"

"اور؟"

"اور یہ بھی ہے کہ فیض جن اقدار کا ترجمان ہے ہم بھی ان قدروں کو پسند کرتے ہیں وہ قدریں ہماری بھی آئیڈیل ہیں۔ اس کے علاوہ فیض کے کلام میں جو موسیقیت اور ترنم اور سوز ہے وہ مجھے بہت پسند ہے۔"

اتنا کہہ کر پروفیسر مارک نے پھر فیض کے اشعار سنانا شروع کر دیا۔

۱۳ اکتوبر ۱۹۶۲ء کی صبح۔

میں قریب ساڑھے سات بجے احتشام صاحب (استاذی پروفیسر احتشام حسین) کے یہاں پہونچا۔ میں فیض سے متعلق ان کے چند تاثرات

جاننا چاہتا تھا ۔

احتشام صاحب چند منٹ بعد کمرے سے باہر آئے ۔ سفید کرتے اور پائجامے میں حسب معمول نکھرے نکھرے سے ، ہمیشہ کی طرح سادہ ، متین سنجیدہ ، اور باوقار !

چائے کے ہلکے ہلکے گھونٹ کے ساتھ ساتھ ادھر اُدھر کی چند باتوں کے بعد میں اپنے مطلب پر آگیا ۔

" آپ کے نزدیک فیض کی مقبولیت کا بنیادی سبب کیا ہے ؟ " یہ میرا پہلا سوال تھا ۔

ایک لمحے کے لئے احتشام صاحب کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں ابھریں ۔ پھر وہ اپنے مخصوص انداز میں بولے ـــ فیض کی مقبولیت کے بنیادی سبب کی تلاش میں چند اور اسباب پر بھی غور کرنا ضروری ہے جو کسی نہ کسی حد تک اس بنیادی سبب کو تقویت پہونچاتے ہیں ۔ مثلاً ترقی پسند تحریک اور مسائل سے ان کی گہری وابستگی ، ایسی علامتوں کا استعمال جو نئی ہونے کے باوجود کلاسیکی روایات سے بھی اپنا گہرا رشتہ رکھتی ہیں ، تیسرے ، گہرے فلسفیانہ یا مبہم خیالات کے بجائے عامۃ الورود جذبات اور خیالات کا اظہار ، چوتھے انداز بیان میں وہ امتیازی وصف جو زبان کے تخلیقی استعمال سے پیدا ہوتا ہے ۔ لیکن مجھے سب سے اہم چیز ان کی شاعری کی وہ متغزلانہ کیفیت نظر آتی ہے جو ان کے اظہار ہی نہیں خیالات اور جذبات میں بھی جاری و ساری ہے ۔ یوں تو یہ ایک حقیقت ہے کہ تغزل کی سحرکاری ہر نظم اور شعر کو پڑھنے یا سننے والے سے قریب تر کر دیتی ہے ۔ لیکن فیض نے تغزل کو زیست کے ایک بنیادی عنصر کی طرح استعمال کیا ہے ۔ اگر اس کی تشریح کی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ فیض کے یہاں وہ خارجی اثرات جن سے ذہن اور جذبے میں تحریک ہوتی ہے اس وقت تک شعر کا پیکر اختیار نہیں کرتے جب تک کہ ان کی داخلی دنیا میں بھی ان سے ہیجان نہیں پیدا ہوتا اور پھر ایک باشعور فن کار کی حیثیت سے ان کا کمال اس میں ظاہر ہوتا ہے کہ خارجی اثرات کے نمایاں ہونے پر وہ داخلی کیفیات کے ہیجان کو وہ نرم اور لطیف بنا کر اس طرح پیش کرتے ہیں کہ سطح پر سکون لیکن اندرونی لہریں بڑی تند و تیز ہوتی ہیں ان کا ایک مصرعہ یاد آتا ہے ۔

اک گداز درد کہ جو گیت میں ڈھلتا ہی نہیں

میں اسی کو ان کے فن کی بنیادی صفت قرار دیتا ہوں ۔ یعنی جب تک " گداز درد " گیت میں نہ ڈھلے ان کی شاعری میں جگہ نہیں پاتا ۔ اس طرح ان کے فن کی بنیادی خوبی یہی قرار پائے گی کہ موضوع اور موضوع کا سارا جوش و خروش نغمہ و رنگ بن جاتا ہے اور بقدر احساس ہر دل کو چھوتا ہے ۔ اس کو علامات کا فنی استعمال بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ علامتیں جب تک شخصی اور اجتماعی دونوں حدود کو نہیں ملا لیتیں ایک مبہم تاثر سے آگے نہیں بڑھ سکتیں ۔ ان باتوں کو پیش نظر رکھ کر میں فیض کی مقبولیت کا بنیادی سبب خیالات اور جذبات کے مخصوص اور شخصی یا انفرادی پیکروں کو ان علامتوں میں ڈھال دینے کی کامیاب کوشش کہوں گا جو ہر سطح کے ذہن کو کبھی خیال اور جذبے کے اندرونی وصف کی بنا پر کبھی علامت کی حیثیت سے کبھی اظہار کی ندرت کے سبب اور کبھی محض اس کے ابہام کی وجہ سے جو ذہن کو فضاؤں میں تیرنے کے لئے اکسا دیتا ہے ، متاثر کرتی ہے اس طرح شاعر کے نقطۂ نظر سے فکر و فن کے تقاضے پورے ہوتے ہیں اور اس کے قاری یا سامع کے نقطۂ نظر سے اثر پذیری کے ۔

اتنا کہنے کے بعد احتشام صاحب خاموش ہو گئے تو میں نے پھر عرض کیا " آپ فرماتے ہیں کہ ترقی پسند تحریک کی مقبولیت اور اس تحریک سے فیض کی گہری وابستگی بھی ان کی مقبولیت کا ایک بنیادی سبب بنی ۔ فیض سے قطع نظر ہمارے متعدد شعراء نے اپنے آپ کو اس تحریک سے اور زیادہ شدت کے ساتھ وابستہ کر رکھا تھا ۔ پھر بھی انھیں فیض کی ایسی مقبولیت نہیں مل سکی اس کا سبب کیا ہو سکتا ہے ۔ ؟ "

احتشام صاحب نے فرمایا ـــ " بھئی ! ترقی پسند تحریک سے وابستگی اور اس کے سہارے مقبول ہو جانا ، یہ تو محض ایک ضمنی سبب تھا ۔ اس لئے میں نے اس کو بنیادی جگہ بھی نہیں دی ۔ اس سے بڑا سبب وہ تھا جو ان کے اس طرز اظہار سے تعلق رکھتا ہے جس میں کلاسیکیت اور نغمانیت یا قدیم

ادب عالیہ کی عظمت اور عہد آفرینی کی بے چینی اور بے قراری یہ مل گئی ہیں۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ بات اس دور کے بعض دوسرے شعراء کے یہاں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ میں اس کا منکر نہیں ہوں۔ لیکن سیاسی خیالی جبر کی دوسرے شاعر نے اتنے گہرے شعور کے ساتھ رومانیت اور کلاسکیت کو ایک کرنے کی کوشش نہیں کی جتنی فیض نے۔ اور یہ سب کچھ کسی مصنوعی انداز میں نہیں بلکہ اپنی ادبی روایات اور تہذیبی اقدار کے صحیح احساس اور اپنے عہد کے تقاضوں کے صحیح ادراک کے نتیجے کے طور پر۔ یہ تھوڑا سا فرق فن اور اظہار فن میں بڑا فرق بن جاتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ لفظ اپنی معنوی، نفسیاتی، صوتی، اور جذباتی تہیں رکھنے کی وجہ سے اپنے استعمال کرنے والے کے شعور کا پابند ہو جاتا ہے۔ یہیں وہ فرق نمایاں ہوتا ہے جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے۔"

"نظم اور غزل کے دونوں سرمایہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے آپ کس صنف میں فیض کے کارناموں کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ فیض غزل گو کی حیثیت سے زیادہ کامیاب ہیں۔ یا نظم گو کی حیثیت سے؟" یہ میرا تیسرا سوال تھا۔

احتشام صاحب دھیرے سے بولے "آپ کے پہلے سوال کے جواب میں میں نے فیض کی شاعری کی بنیادی خصوصیت وہ متغزلانہ کیفیت بتائی تھی جو ان کی شخصیت اور ذہن میں جاری و ساری ہے۔ اس لئے مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی غزلوں اور نظموں دونوں میں اسی کیفیت کے وجود نے ایک طرح کی یک رنگی پیدا کر دی ہے۔ بس چونکہ نظم و غزل کے تقاضے جدا جدا ہیں اس لئے فنی حیثیت سے دونوں کی ہیئت الگ ہو جاتی ہے مگر ایک ہی طرح کی علامتوں کے استعمال اور ایک ہی طرح کے جذبات اور خیالات کا اظہار انھیں ایک دوسرے سے قریب لے آتا ہے اس کا مقصد یہ نہیں کہ وہ نظم اور غزل میں فرق نہیں کرتے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی مزاج کی کیفیت، ایک ہی دل کا کرب، ایک ہی شخصیت کی خواہش اظہار۔ کہیں مربوط اور کہیں غیر مربوط شکل میں ظاہر ہو گئی ہے۔ نظموں میں بھی وہی ایجاز، اختصار اور اکتفا کے ایک جگہ بند کیا ہوا جوش پایا جاتا ہے۔ جو غزل کے انفرادی اشعار میں ملتا ہے۔ اس لحاظ سے فیض دونوں میں کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ میں ذاتی طور پر ان کی بیشتر غزلیں اور چند نظمیں پسند کرتا ہوں اور یہ محسوس کرتا ہوں کہ شاید یہ خود میرے مزاج کی بات ہے ورنہ فکری اور فنی حیثیت سے ان کی نظمیں بھی اتنی ہی خوبصورت اور پر اثر ہیں جتنی ان کی غزلیں۔"

احتشام صاحب کے خاموش ہوتے ہی اچانک مجھے چند روز قبل کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ کسی رسالے کی ورق گردانی کرتے وقت میری نظر فیض کے چند جملوں پر پڑی تھی جن میں انھوں نے اپنے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ سودا کے کلام کی عام سطح انھیں میر سے زیادہ بلند معلوم ہوتی ہے اور جہاں تک مجھے یاد آتا ہے۔ فیض نے شاید یہ بھی لکھا تھا کہ انھیں سودا کا کلام بھی زیادہ خیال انگیز اور پُر اثر بھی محسوس ہوا۔

میں نے اس واقعے کی طرف اشارہ کیا تو احتشام صاحب فرمانے لگے —— "یہ تو انفرادی پسند کا معاملہ ہے اور اس کی ذمہ داری تمام تر فیض پر ہے۔ میں نے فیض کے یہ جملے نہیں دیکھے اس لئے اس سلسلے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہاں اگر نفسیات کی روشنی میں فیض کے اس خیال کا جائزہ لیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے یہاں جو غم انگیزی اور میر کی سی دھیمی دھیمی کیفیت ملتی ہے تشنہ کامی کا جو احساس ملتا ہے، ہو سکتا ہے سودا کے کلام کے مطالعے سے انھیں اس کی آسودگی کا سامان مل جاتا ہو اور سودا کے یہاں نشاط کی جو کیفیت نظر آتی ہے اس میں فیض شاید اپنی ناتمام خواہشوں کی منزل پا لیتے ہوں۔ انھوں نے اپنی قید کے زمانے میں سودا کا مطالعہ کیا تھا اور دو تین غزلیں سودا کی غزلوں پر کہی تھیں۔ لیکن سودا سے ان کی شاعری نے کوئی نمایاں اثر قبول نہیں کیا۔ البتہ میر کا اثر ان کے یہاں واضح طور پر نظر آتا ہے۔"

"آپ کے خیال میں فیض کا مستقبل کیا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"مستقبل کا فیصلہ تو مستقبل ہی کرے گا" احتشام صاحب نے جواب دیا۔ "کیونکہ بہت سے قدیم شعراء جن کا ان کے عہد میں کوئی مستقبل نہ تھا

آج پسند کئے جاتے ہیں ورنہ بہت سے ادیب جو اپنے عہد کی ادبی زندگی کے ستون تھے آج زمین پیوند ہو چکے ہیں اس لئے مستقبل کے متعلق کسی طرح کی پیشین گوئی ایک خطرناک کھیل سے زیادہ کچھ نہیں ہے تاہم ہمیں یہ حق تو حاصل ہی رہتا ہے کہ ہم کچھ کہیں چاہے وہ بعد میں غلط ہی کیوں نہ نکلے۔ اس خیال پر میں یہ سمجھتا ہوں کہ فیض اپنے اس بنیادی وصف کی وجہ سے جسے میں نے متغزلانہ کیف کہا ہے مستقبل میں ایک اونچے مقام پر رکھے جائیں گے کیونکہ انسانی شعور کتنا ہی بدل جائے غالباً انسان کی ان دھڑکنوں کو نہیں بدل سکے گا جو حسن اور محبت کی کشمکش سے، جذبات کی ناآسودگی سے، خوب سے خوب تر بننے کی خواہش سے، تصور جاناں کئے ہوئے بے فکر بیٹھے رہنے سے اور حسن کا ساحرانہ پیکر دیکھنے کی بے پناہ خواہش سے تعلق رکھتی ہیں۔ پھر اگر ایسا ہو کہ انسان کی یہ ساری خواہشیں مر جائیں تو نہ میر زندہ رہیں گے نہ غالب، نہ شیکسپیئر نہ کالیداس۔"

اب میں نے فیض کی شاعری سے ہٹ کر فیض کے ان ہلکے پھلکے خاکوں، ڈراموں، دیباچوں اور تنقیدی مضامین کا ذکر چھیڑ دیا جو وقتاً فوقتاً میری نظر سے گذرے تھے۔ میرا سوال یہ تھا کہ "فیض کی تنقیدی یا دوسری نثری تحریروں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

احتشام صاحب نے فرمایا ــــ میں نے سرسری طور پر فیض کے مضامین کا مجموعہ "میزان" دیکھا تھا۔ اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک پڑھے لکھے، باشعور اور ادب کے مسائل سے دلچسپی رکھنے والے شخص کے خیالات ہیں جو اختصار کے ساتھ ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ان کے مطالعے سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ وہ شعر و ادب یعنی فن کی قدروں کو ایک اونچا مقام دینا چاہتے ہیں اور محض اس ادب کو ادب ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں جو محض کوئی اطلاع بہم پہونچاتا ہے یا عشق یا اظہار خیال پر اکتفا کرتا ہے۔ ان کے ابتدائی مضامین میں بھی یہ بات پائی جاتی ہے۔ اور جس زمانے میں بعض ترقی پسند شاعری کے فنی پہلوؤں کو کسی حد تک نظر انداز کر رہے تھے اس وقت بھی فیض نے انھیں اہمیت دی۔ چنانچہ ادب لطیف کی ادارت کے زمانے میں وہ رسالہ کسی تحریک کے انتہا پسندانہ نقطۂ نظر کا ترجمان بننے کے بجائے اچھے جدید ادب کا نمائندہ بنا رہا۔ ان کی نثر نگاری کے متعلق اس وقت تک کچھ کہنا مناسب نہ ہوگا جب تک کہ ان کی ساری تحریریں نگاہ کے سامنے نہ ہوں۔"

اب کافی وقت گذر چکا تھا۔ دھوپ اچھی طرح پھیل گئی تھی۔ احتشام صاحب اسی دن سہ پہر کو لکھنؤ جانے والے تھے اس لیے میں نے گفتگو کا سلسلہ دراز کرنے کے بجائے یہیں ختم کر دیا اور ان سے اجازت لے کر رخصت ہو گیا۔

ــــ "فیض کا لاابالی پن اُن کی طبعی فراخ دلی اور بے نیازی کی غمازی کرتا ہے۔ اور انہیں کسی چیز کی افادی قدر و قیمت کی کوئی پروا نہیں ہے۔ اس سے صرف ان کی کتابیں ضرور مستثنیٰ ہیں جنہیں وہ بڑی حریصانہ نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اور انہیں اس طرح اپنے سینے سے لگا کر رکھتے ہیں، جیسے کوئی بندۂ زر اور بخیل اپنے مال و دولت پر اپنی جان نچھاور کر رہا ہو، لیکن کوئی شخص اُن سے کتاب مانگتا ہے تو ان سے انکار بھی نہیں بن پڑتا۔ جب میں اُن سے پوچھتی ہوں کہ "تم نے بلا سوچے سمجھے کتاب کیوں دے دی؟ معلوم نہیں اب وہ واپس بھی ملے گی یا نہیں؟" تو وہ بڑی متانت اور برجستگی سے جواب دیتے ہیں "جب تک کوئی اس کتاب کو پڑھتا ہے اسے دینے کا خطرہ مول لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔"

ــــ ایلس فیض

میں محفوظ ہے اور ہم ان سے رشتۂ قلب استوار کرتے رہے۔

مارچ ۱۹۴۸ء میں یونیورسٹی چھوڑ دی۔ اپریل ۱۹۴۸ء میں میدانِ صحافت میں قدم رکھا۔ صحافت میں جذباتی وابستگی کے سوا کچھ نہ تھا۔ ایڈیٹر ہونے کا شوق پورا ہوا۔ مگر یہ شوق بھی بہت جلد پورا ہو گیا کہ مجھ پر سادہ لوحی سے کام لینے کی مثال زیادہ صادق آتی ہے۔ ایک سال بعد عارف جو اب پاکستان ٹائمز میں ہیں، دہلی ڈان میں ساتھ ہو گئے۔ عارف نے وابستگی سی پیدا ہوئی کہ انہیں فیض کا قرب حاصل تھا۔ فیض اس زمانہ میں دہلی میں مقیم تھے۔ عارف، فیض کا تذکرہ کثرت سے کرتے اور ہم بیٹھے بیٹھے شام جان تازہ کرتا رہتا۔

کبھی تو بہرِ خدا آج ذکرِ یار چلے

اکتوبر ۱۹۴۹ء میں پاکستان آ گیا۔ ١٩   ء میں کئی بار لاہور جانا ہوا۔ فیض پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر تھے۔ مجھے بخوبی علم تھا کہ فیض کتنے کم اعتماد ایڈیٹر واقع ہوئے ہیں۔ جو چیز سب سے زیادہ ان کی شخصیت کا معیار ہے، وہ ان کے حسنِ اخلاق کا معترف ہے۔ درخت جس قدر ثمر بار ہوتا ہے اتنی قدر جھک جاتا ہے۔ فیض سے زیادہ ثمر بار شجر دنیا میں کون ہوگا۔ میدانِ صحافت، میدانِ ادب میں ہم سب نے دیکھا کہ بیشتر کا مضمون ہے۔ ہر انتہا صحافی، شاعر، ادیب ایسا ہوتا ہے کہ خود کو خدائے وقت سمجھتا ہے۔ اس کے برعکس فیض حقیقتاً ایک عظیم شاعر، ایک مستند ادیب، ایک بلند پایہ صحافی ہیں اور ان سب سے بڑھ کر ایک عظیم انسان ہیں۔ ان کا حسنِ اخلاق، مزاج کی سادگی اور منکسر المزاجی اس حقیقت کی آئینہ دار ہے۔

لاہور کے دورانِ قیام میں اپنے شفیق استاد اور بزرگ صحافی عبدالمجید ملک سے، حمید نظامی سے اور ایک نہایت ہی دلکش ہستی ڈاکٹر تاثیر سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ اکثر پاکستان ٹائمز کے دفتر گیا اور فیض سے نیاز حاصل کرنے کی شدید خواہش پیدا ہوئی، لیکن ان سے نہ مل سکا۔ طبیعت کی جھجک حائل رہی۔ وہ جھجک جو طالب کی خلش پیدا کر دیتی ہے۔ میں نے اس جھجک پر قابو پانے کی ہر ممکن سعی کی۔ اپنے آپ میں فیض سے ملاقات کا حوصلہ پیدا کیا۔ کچھ دنوں بعد فیض کراچی آئے اور میرے خصوصی شفیق کرنل مجید ملک کے بنگلے واقع گارڈن روڈ میں حسبِ دستور ٹھہرے۔ علم ہونے پر میں نے فون سے ملاقات کا وقت طے کیا اور اگلے روز حاضر ہو گیا۔ کرنل مجید ملک بنگلے پر موجود نہ تھے۔ صرف فیض تھے۔ میں وہ کیفیت کس طرح بیان کروں جب میں دھڑکتے دل لرزتے قدموں سے کمرے میں داخل ہوا۔ فیض بڑے تپاک سے ملے۔ ان کے لہجے کے خلوص اور دھیمے پن نے ان کی ہلکی ہلکی مسکراہٹ نے مجھے بیحد متاثر کیا۔ فیض کو میں نے دھان پان تو پایا لیکن ان کا خیالی پیکر جو زمانۂ طالب علمی سے میرے ذہن نے تعمیر کیا تھا وہ اب ایک مکمل، پُرخلوص اور بھرپور شخصیت کے روپ میں میرے سامنے تھا۔ میری آنکھوں نے دیکھا کہ فیض تمام تر شگفتگی ہیں وہ شگفتگی جو بادِ نسیم کی نرم نرم آہٹ سے پیدا ہوتی ہے۔

میں نے بات کم کی اور چہرہ زیادہ دیکھا۔ ۱۹۵۱ء اور ۱۹۶۰ء میں گیارہ سال کا فرق تھا۔ مگر سال کے اس بُعد نے فیض سے میری عقیدت میں کچھ اضافہ ہی کیا تھا۔ کمی نہ کی تھی۔

فیض نے چائے کی پیالی سے ایک اجنبی کی تواضع کی جس میں شکر قدرے زیادہ تھی۔ دل چاہتا تھا کہ زیادہ وقت گزاروں۔ مگر خود کو بارِ خاطر بنانا اور فیض کا زیادہ وقت لینا میں نے مناسب نہ سمجھا۔ آخر میں کون تھا کہ زیادہ وقت کا حقدار ہوتا! اجازت لی، واپس ہوا اور افغان سفارت خانہ تک دارالسرور کو بار بار مڑ کر دیکھتا رہا۔

کچھ دنوں بعد دفعتاً راولپنڈی سازش کیس میں فیض کا نام آیا۔ فیض اور وطن سے بغاوت! اور بغاوت بھی ان ایام مصیبت میں! کتنا ارمانوں سے ایک بت تراشا تھا، برسوں اس پر رنگا رنگ نقش کاری کی تھی۔ عقیدت کے پھول چڑھائے تھے۔ وابستگی کی صورت نکالی تھی، آج ایک ضرب سے کس بری طرح ٹوٹ گیا! اب اس ٹوٹے ہوئے بت کے ٹکڑے جمع کرنے کا حوصلہ بھی نہ تھا۔ دل کو عجیب جھنجھلاہٹ تھی اور مجھ کو دل پر غصہ

یہ ساغر، شیشے، لعل و گہر ٭ سالم ہوں تو قیمت پاتے ہیں
یوں ٹکڑے ٹکڑے ہوں تو فقط ٭ چبھتے ہیں لہو رلواتے ہیں
تم ناحق شیشے چن چن کر ٭ دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں ٭ کیا آس لگائے بیٹھے ہو

بات یہ تھی کہ وقتی صحافتی جذباتیت نے مجھے بُری طرح متاثر کر رکھا تھا۔ سماجی شعور، لاشعور کے تہ بہ تہ دبیز پردوں میں کہیں جا کر چھپ گیا تھا۔ فسادات کی ہولناکی، برسرِ اقتدار طبقہ کی شقاوت اور کشمیر کی بے بسی اور بے چارگی نے دل کو بُری طرح مجروح کر رکھا تھا۔ اُس وقت اگر کوئی مسلم فاشزم کا ایک موثر اور واضح تصور پیش کرتا تو میں بخوشی اُسے قبول کر لیتا۔

دراصل کبھی کبھی مجھ پر ذہنی ناپختگی کا دورہ پڑتا ہے اپنی زندگی اسی کشمکش اسی تضاد میں گذری ہے کبھی دل اپنا کبھی دل پرایا۔

فیض مرہم سے زیادہ نشتر کے قائل ہیں۔ میرے لئے وقت سے زیادہ خود فیض نے مرہم کے پھائے کا کام دیا۔ میں نے دیکھا پرانا بت کہیں سے ٹوٹا نہ تھا، تمام خواب میں اسے ٹوٹا ہوا دیکھا تھا۔ ایک کتنا وحشتناک خواب تھا۔ ذرا غور کیا تو پتہ چلا ؏

برق سو بار گر کے خاک ہوئی ٭ رونقِ خاکِ آشیاں سے رہی

اک جگ بیتا، فیض قید سے رہا ہوئے انھیں لینن انعام ملا۔ اُن کے ترکِ وطن کی افواہیں تھیں لیکن ۱۹۶۴ء میں وہ وطن لوٹ آئے پھر یہ سنا کہ فیض ہارون کالج میں پرنسپل ہو گئے۔ اتفاق سے میرے نام کالج کی سالانہ تقریب میں شرکت کا دعوت نامہ آیا۔ وہاں ایک مذاکرہ کا پروگرام تھا۔ مذاکرہ فیض صاحب کے زیرِ اہتمام تھا۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں اور دور کا جلوہ! عزلت گزینی کے سبب دعوت نامے جتنے زیادہ ملتے ہیں تقاریب میں اتنی قدر کم شریک ہوتا ہوں۔ یہاں فیض کا معاملہ تھا، پہونچا اور ضرور پہونچا اور کیوں نہ پہونچتا ؏

وہ نور دیدہ ہے تمہیں جو ملے گی الفت کی ٭ ایک نظر تم مرا محبوبِ نظر تو دیکھو

مذاکرہ ختم ہوا دس بارہ اصحاب باقی رہ گئے۔ ان میں میں بھی تھا، پرنسپل کے کمرے میں ہم سب داخل ہوئے ۱۹۶۴ء میں پھر وہی منظرِ گفتگو سامنے تھا جس کی ایک جھلک ۱۹۵۱ء میں رائلسٹوز میں دیکھی تھی۔ آج ہارون کالج میں دوسری بار تھی، جتنا دامن کشاں رہا فیض نے اسی قدر دامنِ دل کھینچا۔

مذاکرہ کا موضوع تعلیم تھا، وہی شاید گفتگو کا موضوع بنا کچھ خوش گپی ہوئی، چاہیے تو یہ تھا کہ میں فیض کے خیالات یا گفتگو کا ماحصل محفوظ کر لیتا مگر میرے ذہن میں تو ۱۹۵۱ء سے ۱۹۶۴ء تک یادوں کا ہجوم تھا، یہ کہہ سکتے کہ عالمِ محویت میں بت بنا ہوا تھا تو کچھ بیجا نہ ہوگا۔ ؏

اس طرح اپنی خامشی گونجی ٭ گویا ہر سمت سے جواب آئے

میری نگاہ کتابی سے آفتابی چہرے سے ہٹتی نہ تھی۔ پندرہ بیس منٹ بعد میں نے اجازت چاہی۔ فیض صاحب نے چائے کیلئے روک لیا پندرہ بیس منٹ اور رکنا ہوا۔ واپسی میں فیض صاحب مہمانوں کو آفس وان تک رخصت کرنے آئے۔ لیجئے جلوۂ قرب ختم ہوا۔

آپ فرمائیں گے یہ تو اپنا قصیدہ زیادہ ہوا اور فیض کا تذکرہ کم، کیا کروں مجبور ہوں، مجھے فیض عزیز ہیں فیض کی یادیں بھی جو ۱۹۳۲ء سے دم کے ساتھ ہیں۔ ان یادوں نے ہی میرے من میں فیض کی لگن لگائی اور فیض کی جوت جلائی ہے۔ کتنا انانیت پسند ہوں، اپنے من، اپنے ذہن کے لئے سب تانا بانا بُنتا ہے۔

آخر وہ کیا کشش ہے جس نے عقیدت کا تانا بانا بن دیا، غمِ زندگی، غمِ جہاں تو بہت جگہ مل جاتا ہے۔ فیض کی شاعری میں زندگی کی ایک کسک

اور خلش ہے۔ زندگی فیض کی "محبوب نظر" ہے۔ اور فیض دعوت دیتے ہیں۔ ع

ایک نظر تم مرا محبوب نظر تو دیکھو

فیض کو زندگی سے لگاؤ ہے پیار ہے ان کا شعور ان کے فن زندگی کا ہم سفر ہے۔ فیض کے یہاں زندگی کی وہ تڑپ ہے جو تسکین نا آشنا ہے
فیض کی نظر میں زندگی نہ ایک گورکھ دھندا، ایک الجھاؤ ہے اور نہ محض جذباتی یا نفسیاتی کھیل۔

زندگی ایک متاع بے پایاں ہے، مسلسل تغیر پذیر DYNAMIC ہے، پیہم رواں دواں ہے۔ ہر وقت جواں ہے۔ اور زندگی کی جوانی، یہ نشوونما، یہ پائندگی تصادم پسند ہے اس کا تضاد افسردگی سے ہے۔ افسردگی اپنے ہر الجھاؤ کے ساتھ ساتھ اپنا تضاد بھی پیش کرتی ہے اور فیض کا عزم جواں افسردگی کے اس تضاد سے ٹکر لیتا ہے۔

"شورش بربط و نے" میں فیض اشاریت اور رمزیت سے نکل کر قدرے کھل کر بات کرتے ہیں۔ اس نظم میں پہلی آواز کہتی ہے ع

جینے کے فسانے رہنے دو، اب ان میں الجھ کر کیا لیں گے
اک موت کا دھندا باقی ہے، جب چاہیں گے نمٹا لیں گے

دوسری آواز کا جواب ہوتا ہے ع

ہستی کی متاع بے پایاں جاگیر تری ہے نہ میری ہے
اس بزم میں اپنی مشعل دل بسمل ہے تو کیا رخشاں ہے تو کیا
یہ بزم چراغاں رہتی ہے اک طاق اگر ویراں ہے تو کیا

افسردہ ہیں گر ایام ترے بدلا نہیں مسلک شام و سحر
ٹھہرے نہیں موسم گل کے قدم قائم ہے جمال شمس و قمر

پہلی آواز: جب خون جگر برفاب بنا، جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں
اس دیدۂ تر کا کیا ہوگا، اس ذوق نظر کا کیا ہوگا

دوسری آواز: یہ ہاتھ سلامت ہیں جب تک، اس خوں میں حرارت ہے جب تک
ان طوق و سلاسل کو ہم تم، سکھلائیں گے شورش بربط و نے

اس تصور زندگی کی رو سے ہر زوال عروج ہے۔ یہ لذت درد جگر، یہ نعمت دیدۂ تر، یہ شعور حیات، کوئی داخلی ایذا کوشی، یا خود اذیتی نہیں۔ یہ تو ایک عزم مسلسل ہے۔ جس کا کام "رنگ لب و رخسار صنم" پیدا کرتا ہے۔ اور جہاں کہیں نظر زندگی سے "محبوب" سے مطلوب سے ہم آغوش ہوگی ع

پھوٹ نکلے گی وہاں اور کوئی راہ گذر

زندگی فیض کے "طاق ویراں" سے واقفیت ہے، تصوریت سے بے نیاز ہے، زندگی نام ہے "سایۂ زلف" اور "جنبش بازو" کے ساتھ انسان کے "تقاضائے پیہم" کا۔ زندگی بقا ہی میں ہے، اس کی نشوونما اسی میں ہے کہ وہ زندگی سے ہم رکاب رہے۔

ظاہر ہے افسردگی زندگی کی ضد ہے، افسردگی خود ہی حامل تضاد ہے۔ افسردگی دراصل سراسر ظلمت اور مجسم ظلم ہے۔ افسردگی اپنے تئیں قائم رکھنا چاہتی ہے۔ یہ سعی ہی ظلم محض ہے۔ اس ظلمت، اس ظلم سے زندگی کا تصادم ناگزیر ہے ع

ہاں تلخیٔ ایام ابھی اور بڑھے گی ؛ ہاں اہل ستم مشق ستم کرتے رہیں گے

ظلمت کی تیرگی شدید سے شدید تر ہے۔ مگر عزم جواں ہے۔ ؏

ابھی گرانیِ شب میں کمی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

یقیں عزم کا رہنما ہے، یہ تیرگی لاکھ کثیف سہی، اک شب کی مہمان ہے۔ شامِ غم لمبی سہی مگر شام ہی تو ہے۔ خود شامِ غم کی درازی اور شب کی تاریکی سحر کی دلیل ہے۔ ؏

یہ غم جو اس رات نے دیا ہے ✽ یہ غم سحر کا یقیں بنا ہے
یقیں جو غم سے کریم تر ہے ✽ سحر جو شب سے عظیم تر ہے

فیض شب غم کے کیسے مزدر ہیں؟ ان سیات اس پر دال ہیں، اگر خود تیرگی کی شدت انھیں سحر بداماں بناتی ہے، فیض مری نظر میں بس شاعرِ سحر ہیں، وہ سحر جو زردگیوں کی تیرگی کا سینہ چاک کر کے نکلی ہو۔

یہی فیض کا فن ہے جو کسی صنعت گری یا زندگی کے ساتھ کھیل سے، آنکھ مچولی سے وابستہ نہیں۔ ایک مخصوص تصورِ حیات کی غیر محسوس نے ہی فیض کے فن کو جاری ہے اور یہ وہ مقام ہے جہاں فن اور مواد، ہیئت اور مقصد باہم یکجان اور ایک دوسرے سے غیر منفک ہیں۔ اس فن میں رمز و کنایہ ہے، اشاریت ہے، معنویت ہے، ایک ایسی رمزیت و اشاریت جو فارسی میں صرف حافظ کا حصہ ہے۔ اسی طرح فیض کی جمالیات کو بھی حیثیت فن میں درجہ حاصل ہے۔ جو فارسی میں سلمان ساوجی کو، جو کیا کم ہے کہ فیض شعر کی دنیا میں ایک روایت ہیں اور خود ایک روایت کے موجد ہیں ؏

ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیض گلشن میں وہی طرزِ فغاں ٹھہری ہے

روایت کے ساتھ تصور اور مقصد کا یہی رچاؤ فیض کے یہاں کلاسیکی روایت کو جدید روایت بناتا ہے، یہ اک ایسا سیاقی رشتہ ہے جو شعر کو حرکت اور غزل کو تغزل بخشتا ہے۔

فیض نے روایتی اصطلاحات، شیخ، میکدہ، محتسب، ناصح، دستِ صیاد، کنجِ قفس، کوئے جاناں، گل و بلبل کو اپنے تصورات، اپنے مقصد کی کٹھالی CRUCIBLE میں پگھلا کر جلا بخشی ہے جیسے حافظ نے ان اصطلاحات سے تصوف کی عقدہ کشائی یا رمز شناسی کی ہے ؏

ان جانیں، بانٹنے والے
فیض، فرہاد و جم کی بات کرو

یہ ضرور ہے کہ فیض کہیں کہیں رمزیت اور اشاریت سے باہر آ کر جوشِ اظہار میں مبارز نظر آتے ہیں۔ یا شعلہ بادباہیں رہتا بلکہ شعلہ بن جاتا ہے۔ ایسے مقامات کی کمی نہیں جہاں فیض نشتر ترک کر کے تیشہ سے کام لیتے ہیں۔ بعض وقت یہ تیشہ قدرے گراں معلوم ہوتا ہے۔ سنگ و خشت اور سنگ۔ "منی کے اٹھائی گیرئے" کا بوجھل پن ظاہر ہے۔ مثلاً ؏

طیش کی آتشِ جرار کہاں ہے لاؤ
وہ دہکتا ہوا گلزار کہاں ہے لاؤ

اس قبیل کے اشعار میں رجز کا عنصر زیادہ ہے اور نرم و نازک تیکھی حسیات کا آتار چڑھاؤ اور نکھار کم ہے۔

کیا "دستِ صبا" "پرنس لیڈر کے نام اور ... متعلق" "افواہ" جیسی نظموں کا متحمل ہے؟ یقیناً ان کے لئے کوئی دوسرا مقام ہے۔
صبا تو یوں پاس سے گزرتی ہے۔ . .

جیسے کہہ دی کسی نے پیار کی بات

فیض کی زبان میں بھی جواز پیش کیا جاسکتا ہے۔

سب پہ بیتی تھی مگر ایامِ درد فیض
ہم ہی کلام پہ مائل ذرا سے تھے

ممکن ہے مائل بہ تبلیغ حضرات کو یہ نکتہ ناگوار گزرے۔ ان سے کیا کہا جائے۔ ع

کیسے مانیں حرم کے سہل پسند
رسم جو عاشقوں کے دیں کی ہے

فیض کے فن کا ایک اور عنصر جس کی جانب اشارہ ضروری ہے۔ وہ ہے الفاظ کی تکرار۔ مثلاً داغ داغ اجالا، سسک سسک تمنا، دبی دبی گھٹن وغیرہ وغیرہ۔ فیض کے یہاں حسنِ تکرار بجائے خود ایک دل آویزی رکھتا ہے۔ مگر شکر کی زیادتی بھی تلخ ہو جاتی ہے یہ تکرار اب تو خود اک روایت سی بنتی جا رہی ہے۔ کاش فیض کے یہاں یہ تکرار بقدرِ نمک ہی رہے۔ کہیں زبان و محاورہ بھی دل میں کھٹکتا ہے۔ جیسے بجھا روزنِ زنداں۔

بہرحال فیض فیض ہیں۔ فیض خود اک روایت بن گئے ہیں۔ یہ فیض کم ہے! مجھے تو فیض عزیز ہیں کہ اپنے قاصدوں کے دم سے ان قاصدوں سے میں نیم شبی تنہائیوں میں ہم کلام ہوا ہوں۔ کیسے اچھے قاصد ہیں! نمونے کے طور پر چند قاصد چند شعر پیش ہیں۔ ان سے بہتر بھی شعر ہیں اور یقیناً یہ اشعار حاصلِ کلام نہیں لیکن مجھے پسند ہیں۔

زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

جلوہ گاہِ وصال کی شمعیں
وہ بجھا بھی چکے اگر تو کیا
چاند کو گل کریں تو ہم جانیں!

چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رخ پر بکھر گئی ہوگی

دل میں اب یوں ترے بھولے ہوئے غم آتے ہیں
جیسے بچھڑے ہوئے کعبے میں صنم آتے ہیں

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

محبوب اللہ مجیب

فیض الہ آباد میں

مثل تو کچھ اسی طرح ہے ـــــ چہ نسبت خاک را با عالم پاک ـــــ مگر حقیقت بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ کہاں الہ آباد اور کہاں فیض صاحب! ـــــ ہم لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ کبھی فیض صاحب یہاں بھی تشریف لائیں گے! مگر یہ خواب حقیقت بن گیا اور فیض صاحب یہاں تشریف لائے۔

مئی سنہ ۶۰ء کی بات ہے کہ الہ آباد کے کچھ سرپھرے نوجوانوں اور سنجیدہ بزرگوں نے ایک مشاعرہ کرنے کی ٹھانی اور حضرت فراق گورکھپوری کے حضور جا کر اپنی اسکیم بتائی۔ ان اسکیم بنانے والوں میں مدیر شاہکار محمود احمد ہنر صاحب، اُن کے رفیق کار اختر سندیلوی، اور عشرت صاحب وغیرہ تھے

فراق صاحب نے ان کی باتیں بڑے غور سے سنیں اور تعاون دینے کا وعدہ فرمایا۔

فراق صاحب سے تعاون کا وعدہ لے کر جب یہ لوگ واپس ہوئے تو مشاعرہ کے کام کو اس کی عملی سطح پر پرکھنے لگے۔ اب کام کرنے والے درکار تھے۔ یعنی دوسرے الفاظ میں ایسے لوگوں کی ضرورت تھی جو خشوع و خضوع سے اس بار گراں کو اپنے کاندھے پر اٹھا سکتے۔ چنانچہ یہ مرحلہ سر کرنے کے لئے بھی دوستوں پر نگاہ گئی اور وہ آڑے وقت میں کام آئے۔ انوار اللہ خاں اور ماسٹر مصطفےٰ (ممبران الہ آباد کارپوریشن)، انوار الحسن، آصف انصاری، نعیم صدیقی، رمیش چندر دویدی اور ستیش چندر بھترا نے مشاعرہ کے سلسلے میں خدمات ایک کر دیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ الہ آباد کی تاریخ میں یہ مشاعرہ امر ہو گیا۔

فراق صاحب نے اس مشاعرے میں سچ مچ بڑی دلچسپی کا ثبوت دیا۔ انہوں نے ذاتی طور سے فیض صاحب، ساحر لدھیانوی اور مخدوم محی الدین کو اس مشاعرے میں آنے کی دعوت دی۔ فراق صاحب کے ہاتھوں ان شعراء کے نام سمن جاری ہوا تھا تو آپ ہی بتایئے کہ اس کی تعمیل کیسے نہ ہوتی!

فیض صاحب کا خط آیا، ضرور آئیں گے۔

ساحر اور مخدوم کے ٹیلیگرام موصول ہوئے: مشاعرے میں شرکت کروں گا۔

اب حال یہ تھا کہ ہم لوگوں کا سینہ گز گز بھر کا ہو گیا تھا۔

ظاہر ہے کہ مشاعرے کو ایک صدر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لئے ہم نے ایک صدر تلاش کیا اور وہ بھی ایسا صدر جس کے

خاندان کا اردو شاعری پر بڑا احسان ہے۔ ہمارے مشاعرے کے یہ صدر جناب سرش نرائن مُلّا بار ایٹ لا تھے، جو اردو کے مشہور و معروف شاعر آنند نرائن مُلّا کے خاندان سے (غالباً بھتیجے) ہیں۔

جب صدر مل گیا تو مشاعرے کے لئے جگہ درکار ہوئی۔ لیکن یہ مرحلہ بھی جلد سر ہو گیا۔ اچھا صدر بھی ملا، اور مشاعرے کے لئے اچھی جگہ بھی۔ الٰہ آباد میں سول لائن اور چوک کے بیچوں بیچ ایک جگہ ہے جسے میو ہال کہتے ہیں۔ میو ہال سے ملحق کرکٹ کھیلنے کی ایک بڑی زمین ہے، اسی جگہ کو ہم لوگوں نے مشاعرہ گاہ بنایا۔ مشاعرے کے اس پنڈال اور احاطے میں بیس ہزار آدمیوں کے بیٹھنے کا انتظام تھا۔ مشاعرے کے لئے دریاں اور صوفہ سیٹ فراہم کرنے کے علاوہ ایک اونچا ڈائس بھی تیار کیا گیا تھا۔

۴ مئی کو ساحر اور مخدوم کے ٹیلی گرام آگئے۔ ہم الٰہ آباد ۵ رکی صبح کو پہونچ رہے ہیں۔ مگر تشویش اب اس بات کی تھی کہ فیض صاحب کا کیا ہوگا؟ —— دوبارہ ان کا کوئی خط نہیں آیا —— وہ آئیں گے یا نہیں آئیں گے؟ —— بہت سے سوال ایک ساتھ اپنا جواب مانگ رہے تھے —— ہم لوگ دیوانوں کی طرح فراق صاحب کے مکان کا چکر کاٹتے —— حضور! اب کیا ہوگا؟ فیض صاحب پر غصہ کرتے۔ عجیب شاعر ہیں۔ نہ دوسرا خط اور نہ کوئی ٹیلیگرام۔ شہر بھر میں بڑے بڑے پوسٹروں پر فیض صاحب کا نام جگمگا رہا تھا۔ لوگ فیض کے بارے میں انکوائری کر رہے تھے۔ کیا کیا جائے؟ —— لوگوں کو منہ کس طرح دکھایا جائے؟ —— جن کے پاس جائیں گے وہ کیا کہیں گے؟ —— عجیب لوگ ہیں —— کس دم خم پر فیض کا اعلان کیا تھا —— بہرحال یہ ہمت شکن بات تھی اور عزتِ سادات خطرے میں تھی۔

صدر موصوف نے ہم لوگوں کو اکٹھا کیا۔ دلاسے دیئے۔ فیض صاحب نے خط لکھا ہے تو ضرور آئیں گے۔ میں اُن کی عادت سے واقف ہوں۔ سرش صاحب کی بات سے ہم وقتی طور پر بہل گئے لیکن اندر ہی اندر پریشان رہے۔ اگر فیض صاحب نہ آسکے تو —— ؟

اب ۵ رمئی سنہ ۶۰ء بھی آگئی۔ ساحر لدھیانوی، مخدوم محی الدین، اور جاں نثار اختر کے علاوہ بہت سارے شعراء الٰہ آباد میں تھے۔ تین بجے دن تک فیض صاحب کا کوئی پتہ نہ تھا۔ چار بجے، اور فراق صاحب کے مکان پر تار والا وارد ہوا۔ یہ تار فیض صاحب کا تھا۔ لکھا تھا ——

"سات بجے شام کو الٰہ آباد پہونچ رہا ہوں"

اب کیا تھا۔ دل باغ باغ ہو گئے۔ بجھے ہوئے چہرے مسکرا اٹھے۔ سرش صاحب کو فیض کے آنے کی اطلاع دی۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "میں کہہ رہا تھا نا —— !"

اب سارے شہر میں پھر ایک بار فیض کی آمد کا اعلان ہوا۔ لوگوں کو پھر یقین نہیں آیا کہ فیض یہاں بھی آسکتے ہیں۔ لیکن خواب حقیقت میں تبدیل ہو گیا تھا۔ لوگ مشاعرہ سننے کے لئے ٹکٹ خریدنے لگے۔

وہی ۵ رمئی سنہ ۶۰ء تھی۔ رات کے ساڑھے آٹھ بجے تھے۔ مشاعرہ گاہ لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ بے شمار مرد، عورتیں اور بچے۔ سب کی نگاہیں ڈائس پر تھیں —— فیض آئے ہیں! —— دل کو گدگدانے والے شاعر آئے ہیں —— اُن کی صورت دیکھیں گے —— ان کا کلام سنیں گے اور اُن سے آٹو گراف لیں گے۔

ان منتظر نگاہوں کے بیچ شاعروں کی پہلی کھیپ مشاعرے میں داخل ہوئی۔ لوگ اپنی اپنی جگہ سکون اور خاموشی سے بیٹھ گئے کچھ گلے باز شاعروں نے لوگوں کے دل بہلائے۔ پھر تھوڑی ہی دیر میں فراق صاحب کے پیچھے پیچھے ساحر لدھیانوی، جاں نثار اختر

محبوب اللہ مجیب

مخدوم محی الدین، اور انور معظم آئے۔ مجمع بالکل ساکت تھا ـــــ سارے شعراء ڈائس پر آگئے ـــــ کم عمر لڑکے اور لڑکیاں آٹوگراف لینے بڑھے۔ بد نظمی کے خوف سے کارکنانِ مشاعرہ نے انہیں روکا۔ معصوم صورت اپنی اپنی تمنا سمیٹے واپس چلے گئے۔

نو بجے اور سریش نرائن ملا صاحب صدر کی جگہ بیٹھ گئے۔ مدیر "شاہکار" محمود احمد ہنر صاحب نے اناؤنسر کے فرائض انجام دیئے۔ فراق صاحب سے گذارش کی گئی کہ وہ تقریر کریں۔ فراق صاحب اٹھے۔ لوگ خوش ہوگئے۔ تحسین کی تالیاں بجیں۔ اب مقامی شعراء اپنا کلام سنا رہے تھے۔ اسی بیچ فیض صاحب اپنے دیرینہ رفیق شیکھر ترن بار ایٹ لا اور اُن کی بیوی چندا دتہ سرن کے ساتھ تشریف لائے۔ لوگ اُٹھ اُٹھ کر انہیں دیکھنے لگے۔ شاید ان کو اب بھی یقین نہیں آرہا تھا۔ ہوسکتا ہے فیض کا "ڈمی" تیار کر لیا ہو۔ یہ دیکھ کر ہم لوگوں نے فیض صاحب کو گود میں اٹھایا اور ڈائس پر پہنچا دیا۔ گوشت پوست کے فیض مجمع کے سامنے تھے۔ مجمع کو اطمینان ہوگیا تھا، یہ فیض ہی ہیں۔ سو فی صدی فیض۔

اس وقت فیض صاحب کا تعارف فراق صاحب سے بہتر اور کون کرا سکتا تھا۔ اناؤنسر نے فراق صاحب سے درخواست کی وہ سامنے آئے اور فیض صاحب کی شخصیت اور شاعری پر جس بھرپور طریقے سے انہوں نے روشنی ڈالی اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ آج یہ مضمون لکھتے وقت مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ کاش فراق صاحب کی وہ تقریر ٹیپ کر لی گئی ہوتی تو میں اُن کے خیالات بھی من وعن پیش کر دیتا۔

اس مشاعرے کی شان ہی کچھ نرالی تھی۔ پڑھنے والے بڑے خلوص سے پڑھ رہے تھے اور سننے والے دل لگا کر سن رہے تھے۔ فراق صاحب نے آج جم کر پڑھا تھا۔ ہر شعر پہ داد لی۔ اُن کے انداز، اُن کے تیور، اور اُن کے اشارے سے پتہ چل رہا تھا کہ کوئی عظیم شاعر نغمہ سرا ہے ؎

اوڑھنی اس کی ہوائیں ہیں کہ تاروں بھری رات
کسی گھونگھٹ ہی کو سرکاؤ کہ کچھ رات کٹے
یادِ ایام کی پُروائیو! دھیمے دھیمے
میر کی کوئی غزل گاؤ کہ کچھ رات کٹے

اب ساحر لدھیانوی مائک کے سامنے تھے۔ مجمع اپنی اپنی فرمائشوں کی بھرمار کر رہا تھا۔ ساحر گھبرا رہے تھے۔ آخر میں "توڑ" اس بات پر ہوا کہ وہ اپنی پسند کی کوئی نظم سنانے کے بعد مجمع کی پسند کی چیزیں بھی سنائیں گے۔ اب وہ اپنی نظم "انتظار" پڑھ رہے تھے ؎

چاند مدھم ہے آسماں چُپ ہے
نیند کی گود میں جہاں چُپ ہے

دُور وادی میں دُودھیا بادل
جھک کے پربت کو پیار کرتے ہیں
دل میں ناکام حسرتیں لے کر
ہم ترا انتظار کرتے ہیں

چپ نہ مدتوں سے آسماں چپ ہے
نیند کی گود میں جہاں چپ ہے

ساحر لدھیانوی کے بعد مخدوم محی الدین آئے۔ لوگوں نے فرطِ شوق سے تالیاں بجائیں۔ انہوں نے ہمک ہمک کر پڑھا اور مجمع نے جھوم جھوم کر داد دی۔ اُن کی نظم "جانِ غزل" سے مشاعرے میں ایک کیفیت پیدا ہوگئی۔ لوگ گنگنا رہے تھے ؎

اے دلِ نارسا آج اتنا مچل
مست آنکھوں کی جھیلوں میں کھلنے لگیں آنسوؤں کے کنول
مل گیا راہ میں اجنبی موڑ پر کوئی جانِ غزل
آج تو یاد آئیں نہ دنیا کے غم
آج دل کھول کر مسکرا چشمِ نم

مجمع سے اب ضبط کا دامن چھوٹ گیا تھا۔ لوگ آوازیں لگا رہے تھے۔ فیض صاحب کو بلایئے۔ ناظمِ مشاعرہ نے مجمع سے ہار مان کر فیض صاحب کو بلایا۔ فیض صاحب مسکراتے ہوئے اٹھے اور اپنی دھیمی اور کومل آواز میں شعر سنائے۔ انہوں نے اس مشاعرے میں جو غزل سنائی، وہ بالکل تازہ تھی۔ اس غزل کو میں نے محفوظ کر کے اس پر اُن کے دستخط بھی لے لئے۔ اُن کی اس غزل کی اہمیت اس لئے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ اسے پہلی بار انہوں نے ہمارے مشاعرے میں پڑھا۔ اس کے بعد یہ رسالوں میں شائع ہوئی ؎

ترے غم کو جاں کی تلاش تھی ترے جاں نثار چلے گئے
تری رہ میں کرتے تھے سر طلب سرِ رہگذار چلے گئے
تری کج ادائی سے ہار کے شبِ انتظار چلی گئی
مرے ضبطِ حال سے روٹھ کے مرے غم گسار چلے گئے
نہ سوالِ وصل نہ عرضِ غم نہ حکایتیں نہ شکایتیں
ترے عہد میں دلِ زار کے سبھی اختیار چلے گئے
یہ ہمیں تھے جن کے لباس پر سرِ رہ سیاہی لکھی گئی
یہی داغ تھے جو سجا کے ہم سرِ بزمِ یار چلے گئے
نہ رہا جنونِ رخِ وفا، یہ رسن یہ دار کرو گے کیا
جنہیں جرمِ عشق پہ ناز تھا وہ گناہ گار چلے گئے

اس کے بعد فیض صاحب سے لگاتار فرمائشیں ہوئیں اور انہوں نے اپنے سننے والوں کو مایوس نہیں کیا۔ فرمائشی کلام سُنایا اور خوب داد تحسین حاصل کی۔ الٰہ آباد کا یہ مشاعرہ بڑی کامیابی سے رات گئے ختم ہوا۔ دوسرے دن فراق صاحب کے دولتکدے پر فیض صاحب اور دیگر شعراء کو چائے پر مدعو کیا گیا۔ فیض صاحب نے وہاں جو بات کہی تھی وہ آج بھی میرے ذہن میں محفوظ ہے "الٰہ آباد کا یہ مشاعرہ مجھے زندگی بھر یاد رہے گا" انہوں نے بڑے خلوص کے ساتھ فرمایا تھا۔ ہوسکتا ہے فیض کو الٰہ آباد کا یہ مشاعرہ زندگی بھر یاد نہ رہے لیکن ہم لوگوں کو یہ مشاعرہ یقیناً زندگی بھر یاد رہے گا کیونکہ اتنا کامیاب اور تاریخ ساز مشاعرہ الٰہ آباد کی ادبی تاریخ میں اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا۔

اس میں راز کی کیا بات ہے؟
مناسب دیکھ بھال کی جائے تو جلد کی تازگی اور ملائمت برقرار رہتی ہے۔
اپنے چہرے کی آب و تاب قائم رکھنے کیلئے ہمیشہ تبت سنو
استعمال کیجئے۔ اس سے رنگ روپ میں نکھار اور حسن میں
دلکشی پیدا ہو جاتی ہے۔
Tibet
تبت سنو
ایشیا کی مشہور ترین بیوٹی کریم
کوہِ نور کیمیکل کمپنی لمیٹڈ۔ کراچی۔ ڈھاکہ
united
TS 4/64
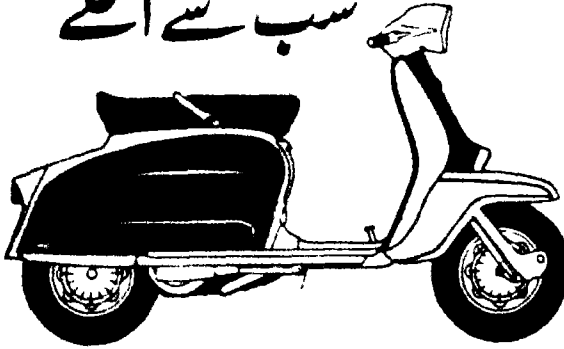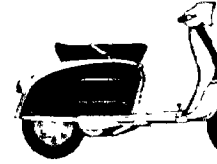
لمبریٹا اسکوٹر
سب سے اعلیٰ
وزیر علی انجینیرنگ لمیٹڈ
۵۶ مال روڈ
لاہور۔ فون:- ۶۳۵۰۸
المرکز بندر روڈ - کراچی
فون:- ۷۲۵۹۸/۷۳۸۷۳
PRESTIGE WAE 333/372

مال
اور
جان
کی
سلامتی
حفاظت
اطمینان
نہایت ضروری ہے
سینٹرل
انشورنس کمپنی لمیٹڈ
سینٹرل لائف
ایشورنس کمپنی لمیٹڈ
ہیڈ آفس
نیشنل اینڈ گرینڈلیز بنک بلڈنگ میکلوڈ روڈ کراچی
اور شاخیں پاکستان میں ہر جگہ
یکے از داؤد گروپ انٹرپرائز

اب
سیلوفین
میں پیک کیا جاتا ہے
CAVANDER'S
MEDIUM
NAVY CUT
MAGNUM
کیونڈرز
میگنم سگریٹ
بڑے - اچھے اور تازہ

ذکرِ یار

خیالِ یار کبھی ذکرِ یار کرتے رہے

نشانِ مستقبل ★ فیض میرا ساتھی

فیض ایک چراغِ فکر ○ رفیقِ منزل

شاعرِ عصر ★ آہوئے رعنا

فیض ○ نقشِ فریادی

سفیرِ درد ★ فیض ڈھاکے میں

اک دیدۂ بیدار ○ فیض احمد فیض

شاعرِ خوباں ★ روشنیوں کی آواز

انتظار ○ اے نغمہ کار

البیلا فن کار ★ شاعرِ رنگیں نوا

فیض، تنویرِ حیات ○ بشارت

محرمِ جذبِ دروں ★ فیض، بڑا فن کار

اندھیری رات کا چراغ ○ پرستارِ امن

وہ شعلہ بیاں وہ شعلہ نفس ★ فیض

فیض پارے ○ نذرِ فیض

مسعود اختر جمال

نشانِ منزل

اچھے صہبا! کلامِ فیض اس عہد کی امانت ہے۔ انہوں نے سب سے زیادہ عوام و خواص کو متاثر کیا ہے جس زمانے میں فیض جیل میں تھے میں نے ان کے چند اشعار سے متاثر ہو کر ایک نظم لکھی تھی وہ حاضر ہے۔
(مسعود اختر جمال)

جھکے گا خاک پہ یہ قصرِ آسماں اک دن
ہمارے زیرِ قدم ہوگی کہکشاں اک دن
بڑھے گا جانبِ منزل یہ کارواں اک دن
فضائے ارض و سما ہوگی ہم عناں اک دن
حیاتِ خضر ملے گی ہر ایک ذرّے کو
ہمارا نقشِ قدم ہوگا جاوداں اک دن
ابھی جو خرمنِ اہلِ وفا پہ گرتی ہیں
چراغِ راہ بنیں گی وہ بجلیاں اک دن
سحر کے نور سے چھٹ جائے گی یہ تیرہ شبی
افق پہ مہرِ مبیں ہوگا ضوفشاں اک دن
فضائیں گونج اٹھیں گی ہمارے نغموں سے
زفرش تا بہ سرا پردۂ مکاں اک دن
ہماری مائیں ہمارے ہی گیت گائیں گی
انہیں سے دیں گی وہ بچوں کو لوریاں اک دن
انہیں کی لے سے جوانانِ بزم جاگیں گے
انہیں سے ذوقِ جنوں ہوگا کامراں اک دن
انہیں سے منزلِ نو کا ملے گا ہم کو سراغ
انہیں سے راہ پہ آئے گا کارواں اک دن
یہ "خونِ دل" جو ابھی صرفِ دامنِ غم ہے
اسی کے رنگ سے نکھرے گا گلستاں اک دن
ثبوت دے گی ہماری وفا شناسی کا
"ہر ایک حلقۂ زنجیر کی زباں اک دن"
"وہ بات جس کا نہیں ذکر داستاں میں ابھی
جمال ہوگی وہی زیبِ داستاں اک دن"

الطاف مشہدی

فیض میرا ساتھی

ایک کوی نے من آنگن میں کومل گیت بکھیرے
کالی رین کی کوکھ سے جھانکے سندر روپ سویرے
سوچ کی اگنی تاپ رہے ہیں بیٹھے سانپ سپیرے
ٹوٹ رہے ہیں چھن چھن کرتی زنجیروں کے گھیرے
جیون کی پلکوں پر رکھ دے سُورج، ساتھی میرے

کٹیاؤں کی چھت سے اُبھرے ہر جیون اُجیارا
اندھیارے کی مٹھی میں ہو سُورج، چاند ستارا
گلی گلی میں کوک لگائے جیون کا بنجارا
اپنی ندی کا بیٹا ہو اپنا کھیون ہارا
ڈگر ڈگر پر ہم سب دیں گے ساتھی ساتھ تمہارا

بین کا سُر دیپک بن کر سندیا روگ گنوائے
دھرتی کے پاتال میں اُترے سونا اور انیائے
چھاتی کو تپتی پر رکھ دیں مٹی ماتا جائے
امتا کا من جیت پھریرا گام گام لہرائے
آشاؤں کی پھلواری پر ساتھی آنچ نہ آئے

گیت کی سُندر پھلواری میں پریت کے پھول کھلائے
مسکاتے ہونٹوں کی خوشبو سے دھرتی مہکا دے
چیخ کو اپنی سُرکاری سے اک مُسکان بنا دے
پگڈنڈی کے ماتھے پہ تاروں کے دیپ جلا دے
کرودھ کپٹ کے کھلیانوں میں ساتھی آگ لگا دے

سلام مچھلی شہری

فیض اک چراغِ فکر

صہبا! میں روشنی کا پجاری ہوں اور مجھے
ہر اک چراغ فکر و تخیل سے پیار ہے
یہ شمع جس جگہ ہو جہاں بھی ہو ضوفگن
میری نگاہ صدقے، مرا دل نثار ہے

دُور از قیود وقت ہے شعر و ادب کی راہ
جس دل میں بھی خلوص ہے منزل اُسی کی ہے
طوفاں سے بھی لڑے گا جو آدرش کے لئے
ناہیدِ بزمِ جلوۂ ساحل اُسی کی ہے

پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ ہے مجھ کو ربطِ خاص
ہم عصر دوست "فیض" سے ان کے کلام سے
ہم ایک مےکدے ہی کے ہیں رندِ تشنہ کام
ممکن ہے میں نے پی بھی ہو کچھ اُن کے جام سے

کہتا ہوں اُن کو "دوست" مگر واقعہ یہ ہے
رہ کر بہت قریب بھی دیکھا ہے دُور سے
وہ اک چراغِ فکر ہیں، جن محفلوں میں ہوں
اے دوست واسطہ ہے مجھے صرف نور سے

اُن کا خیال، اُن کا بیاں، اُن کا تذکرہ
ہر بزمِ شاعری میں ہے اِک موجِ رنگ و بو
یہ ماننا پڑے گا کہ ہیں فیض بے مثال
اکثر دبی زبان سے کہتے ہیں خود عدو!

انسان دوستی کا وہ عالم کہ جیسے پھول
جو چاہے رنگ مانگ لے، نکہت سمیٹ لے
ہے اُن کے دل میں خون کے بدلے شمیمِ گُل
جو آئے زندگی کی لطافت سمیٹ لے!

سجدہ گزارِ معبدِ گیتی ہیں وہ مگر....
اُن کی نگاہ انجم و مہتاب دیدہ ہے
خوش ہوگی روحِ غالبِ خستہ کہ اے ندیم!
اب ایک بلبلِ چمن آفریدہ ہے!

صہبا! میں اُن سے دُور ہوں لیکن خدا گواہ
وہ فخرِ شاعری ہیں مجھے اُن پہ ناز ہے
وہ صبحِ احمریں جو ہے اُن کی نگاہ میں
میرے لئے تو شامِ غزل کا گداز ہے!

اشکوں کے گیت، گیت کے آنسو، گُلوں کا درد
فکر و خیالِ فیض کے دامن میں کیا نہیں
ہے زخمِ ماہ اُن کے لئے زخمِ زندگی
اُن کی نظر سے کوئی مگر دیکھتا نہیں

صہبا! یہ خط تمہارے لئے ہے، قبول ہو
تم اور تمہاری "محفلِ افکار" زندہ باد!
زخموں کے پھول اب تو کھلانے چلا ہوں میں
کہتی ہے شام، "فیض کے اشعار زندہ باد!"

رفعت سروش

رفیقِ منزل

تجھے رفیق کہوں، ہم سفر، کہ راہ نما
مری نوا میں ترا سوز و سازِ شامل ہے
مچل رہی ہے جو منزل ترے تصور میں
وہی مرے بھی شعورِ جنوں کی منزل ہے

جہانِ درد میں ہم سب ہیں نقشِ فریادی
جہاں کا درد ترے نغمہ و کلام میں ہے
عجب ادا سے تو اس دور میں ہے نغمہ سرا
نوا کی گونج تری بزمِ خاص و عام میں ہے

یہ داغ داغ اُجالا، یہ شب گزیدہ سحر
کہ جس کی تاب نہ لائے شعورِ اہلِ نظر
ترے جنوں کو نیا عزم اُسی نے بخشا ہے
تری غزل ہے کہ اک نغمۂ عروجِ بشر

فرازِ دار و رسن پر ہوا تو نغمہ سرا
حیات تیرے لیے بے قرار گذری ہے
نشانہ سنگِ ملامت کا کیوں نہ بن پایا
یہ بات اُن کو بہت ناگوار گذری ہے

فارغ بخاری

شاعرِ عصر

تیری باتوں میں وقت کی دھڑکن
تیرے شعروں میں زندگی کا گداز
شاعرِ عصر تیرے نغموں میں
ڈھل گئی ہے اس عہد کی آواز

نبضِ جمہور پر ہے ہاتھ ترا
تیرے افکار کی اساس ہے یہ
چاندنی، رقص، روشنی، خوشبو
تیرے اشعار کا لباس ہے یہ

تو نے کتنی ہی دکھ بھری راتیں
دل بیدار میں سمو لی ہیں
چھن گئے جب بھی تجھ سے لوح و قلم
انگلیاں خون میں ڈبو لی ہیں

کبھی یکسر ہے نقشِ فریادی
کبھی شہرِ صبا تری منزل
درد کا رشتہ استوار رہا
کبھی پاؤں فگار ہیں کبھی دل

کوئے دار و رسن کیا آباد
صحنِ زنداں کبھی بساتا رہا
آسمانِ وطن کے رخشاں چاند
تو بہر طور جگمگاتا رہا

موجِ دردِ فراقِ یار میں بھی
شانۂ بام پر دمکتا رہا
مشعلِ نور بن کے تیرا قلم
ظلمتِ یاس میں چمکتا رہا

کبھی چھلکا کے جامِ محفل میں
گرمیاں پھونک دیں مناں کی طرح
کبھی اپنے لہو کے سو داغ
پُر کیا جامِ ارغواں کی طرح

اشک ٹپکا کے گلستاں میں کبھی
رنج کم ظرفیٔ بہار کیا
کبھی اپنی نوائے خونیں سے
دامنِ گل کو لالہ زار کیا

تیرے ہی دم سے گلستاں میں سدا
گرمِ الفت کا کاروبار رہا
تیرے ہی فیض سے زمانے میں
پرچمِ امن کا وقار رہا

فضا ابنِ فیضی

آہوئے رعنا

یہ ترے اسلوب کی قوسِ قزح یہ چاندنی
یہ تری تخئیل کی پیکر تراشی کا فسوں
یہ ترے جذبات کی سنبھلی ہوئی سیماب بیت
یہ ترے احساسِ غم کی دل رُبا سنجیدگی
یہ ترے ذوق و نظر کی خلوتِ پاکیزہ میں
آنکھ جھپکاتا ہوا لمس اور لذت کا سُرور
یہ ترے لہجے کی شوخ و منفرد شائستگی
شہد میں ڈوبی، شرابِ ناب میں بھیگی ہوئی
کھینچ رکھا ہے تری پُرکار شخصیت کے گرد
ایک ہالہ تیرے فن کے "جلوۂ صد رنگ" نے
تجھ سے ہیں مشک آشنا "فکر و تخیل کے ختن"
"وادیٔ شعر و سخن" کا "آہوئے رعنا" ہے تو
سچ تو یہ ہے، تیری "رودادِ جنوں" کے سامنے
"گلستاں کی بات رنگیں ہے نہ مے خانے کا نام"
"پھر نظر میں پھول مہکے، دل میں پھر شمعیں جلیں
پھر لیا میں نے کسی کی بزم میں جانے کا نام"
حسن کی دلدار نظروں کی خنک شبنم نے جب
تیرے دل کے لالۂ شاداب کو بوسہ دیا
تیری محفل میں قباؤں کی شفق لہرا گئی
بس گئیں سانسوں میں تیرے، پیرہن کی خوشبوئیں
خال و خط کی موجِ صہبا میں ڈھلی سی صبح نے

تیرے احساسات پر چھڑکا ہے اپنا آب و رنگ
سوچتا ہے اپنے دل میں یہ لہو بھر کے گلاب
کتنے دل کش ہیں ترے رنگِ طبیعت کے کنول
درد کے بے خواب تاروں کو بھی جھپکی آ گئی
تو نے جب ڈالی ہیں باہیں گردنِ مہتاب میں
اور بھی ہیں اہلِ دل، لیکن مجھے معلوم ہے
دہر میں تجھ سے ہوئی "تہذیبِ رسمِ عاشقی"
اپنے دل کے خونِ تازہ میں ڈبو کر انگلیاں
تو نے لکھی داستانِ "آرزو و آگہی"
کہ ترے ذوقِ لطیف و شوخیٔ رندانہ نے
سُرخیٔ صہبا سے "تزئینِ در و بامِ حرم"
تیرے فن کا ماحصل "لوح و قلم" کی پرورش
تیرے دل کا مدعا، عقل و جنوں کی تربیت
تجھ سے باقی "آبروئے شیوۂ اہلِ نظر"
تجھ سے زندہ "حرف و الفاظ و معانی" کا بھرم
تیرے خامے کو ملیں "دستِ صبا" کی جنبشیں
فکر کو تیری ملا آہوئے صحرا کا خرام
سر سے پا تک ہیں مرقع "شوقِ افکار" کا
وہ تری نظموں کے پیکر ہوں کہ غزلوں کے صنم
یہ ترے پیرایۂ اظہار کی گل کاریاں
پھول بن جاتی ہے "خار و تیشۂ آہن" کی بات
آج جب کہ فن کی قدروں کا نہیں کچھ احترام
یہ غنیمت ہے کہ تیرے "پیکرانِ فکر" میں
کچھ نہ کچھ باقی ہے "وضعِ احتیاطِ فن" کی بات
اتنے دل کش کب تھے تیری "فکر کے رخسار و لب"
پر فسوں کب تھی تری "چشمِ کرشمہ فن" کی بات
میرے اظہارِ محبت کی شفق میں ڈوب کر
اور رنگیں ہو گئی کچھ تیرے "پیراہن" کی بات

نریش کمار شاد

فیض

(فیض احمد فیض کی گرفتاری کی خبر پڑھ کر)

کہاں یہ غم ہے زنداں کے گھپ اندھیروں کو
کہ ان کی چھاؤں میں تیرے چراغ جلتے ہیں
تری نظر میں جو رقصاں ہے التہاب کے ساتھ
اس ایک لو میں کئی آفتاب جلتے ہیں
جنہیں شعور کی تابانیوں نے سینچا ہو
وہ ولولے بھی کہیں تیرگی میں ڈھلتے ہیں

نسیم صبح کے نکہت بدوش جھونکوں کو
نہ کوئی روک سکا ہے نہ روک سکتا ہے
ستم گروں کے ستم جس قدر مسلتے ہیں
ترے خلوص کا پھول اور بھی مہکتا ہے
بہار بن کے کئی داغدار سینوں میں
تری جوان اُمنگوں کا دل دھڑکتا ہے

پگھل رہی ہیں ترے عزم کی حرارت سے
جفا و جبر میں ڈھالی ہوئی یہ زنجیریں
نئی حیات کی گل ریز شاہراہوں میں
بکھر رہی ہیں ترے ولولوں کی تنویریں
ترے ہی ناچتے خوابوں کو چومنے کے لئے
اُبھر رہی ہیں اُفق سے حسین تعبیریں

نظام آتش و آہن پہ مسکراتی ہے
تری نوا کی لطافت ترے خیال کی تاب
ترے جنوں میں وہ خوشبوئے سوز ہے جس سے
مہک رہے ہیں شرارے دہک رہے ہیں گلاب
ترے ضمیر کی معصومیت کا کیا کہنا
گناہگار نظر کو بھی آ رہا ہے حجاب

ترے عمل نے یہ ثابت کیا کہ اہلِ وفا
کبھی ہوس کے اشاروں پہ چل نہیں سکتے
ہزار طوق و سلاسل ہوں راہ میں حائل
وہ اپنی راہ گزر کو بدل نہیں سکتے
مُسافروں پہ اندھیرے جھپٹ تو سکتے ہیں
مُسافروں کو اندھیرے نگل نہیں سکتے

صعوبتوں کے انہیں سنگدل اندھیروں میں
کیا ہے عظمتِ آدم کو ضوفشاں تو نے
"زباں پہ مُہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں تو نے"
"متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں تو نے"

سید فیضی

نقشِ فریادی

مجھے یاد ہے!
میری دنیا کے اندھے اُجالوں میں اک روشنی سی ہوئی تھی
اسی روشنی سے کئی ٹمٹماتے چراغ تمنا
فضاؤں کو پُرنور کرنے لگے تھے
اُجالا اندھیروں میں بھرنے لگے تھے
نئے ولولوں نے نئے خواب زاروں کی دنیا سجا کر
اُداس اور غمگیں چمن کی وہ رونق بڑھائی
کہ افسردگی کی فضا پھول بن کر شگفتہ ہوئی، لہلہائی
کہیں دور سے ایک آواز آئی
محبت کے رسیا محبت کا کیف و جنوں چاہتے ہیں
نہ دولت نہ ثروت نہ عزت نہ رتبہ
دکھی دل فقط اک سکوں چاہتے ہیں
—— یہ آواز تھی یا کوئی سحر تھا!
فیض سُن کر جسے تو ربابِ تمنا پہ گاتا رہا ہے
تری آرزو کے، ترے عشق کے، تیری بیباک مستی کے پُرسوز نغمے
جگر دوز نغمے —— جو رُوحِ ازل کے فسانوں کی تابندگی ہیں
وہ نغمے کہ جو حاصلِ زندگی ہیں
غمِ عشق کی تلخ سی یاد بن کر پریشاں ہوئے نقشِ فریاد بن کر
انہیں بڑھ کے دستِ صبا نے سہارا دیا تھا
پریشانیوں کا سب الزام زنداں نے خود اپنے سر لے لیا تھا
زمانے کی مشکوک آنکھوں سے پھر بھی تجھے بچ کے رہنا نہ آیا، نہ آیا
محبت کی پیاسی نگاہوں پہ اب تک جبھی تو لرزتا ہے دہشت کا سایا

شبنم رومانی

سفیرِ درد

بھائی صہبا! سلامِ شوق و نیاز!

باوجودیکہ ہے نقرس مجھکو — اپنے وعدے کا پاس ہے اے دوست!
فیض پر نظم خاص حاضر ہے — کیا کہوں جی اُداس ہے اے دوست!
یاد رکھئے مجھے دعاؤں میں — بس یہی التماس ہے اے دوست!

آپ کا دوست! آپ کا دمساز — شبنم رومانی

فیض، چراغِ طاقِ زنداں، داغِ دلِ مہتاب
فیض، ندیمِ حالِ پریشاں، مستقبل کا خواب

فیض، وہ اک نقاش کہ جس کا نقش ہے فریادی
فیض، وہ اک عکاس کہ جس کا عکس ہے آزادی

فیض، جوانوں کی سرمستی، بوڑھوں کے نزدیک
فیض، نئی آواز — نئی آوازوں کی تحریک

"دستِ صبا" جس کے درِ دل پر دستک دیتا ہے
شبنم کو شعلہ، شعلے کو ٹھنڈک دیتا ہے

فیض، وہ کافر جس کو ساری دنیا سے ہے پیار
فیض، وہ گوتم، جس کا قلم ہے ایک اپنی تلوار

جس کا شعر (بقیدِ حسن) اک "زنداں نامہ" ہے
نظمِ وقت کی حامی، جس کی جنبشِ خامہ ہے

فیض، کہ ہے محبوبِ حسیناں، فیض کہ ہے گمبھیر
فیض، کہ جس کے سینے میں ہیں سودا، غالب، میر

جس کا نعرہ، نعرۂ مستی، مستوں سے جنگ اور
اور مظالم اے دلِ ناداں! "دستِ تہِ سنگ" اور

فیض، امیرِ قافلۂ غم — فیض سفیرِ درد
فیض، کہ جس کے چہرے پر ہے احساسات کی گرد

تم بھی شبنم رُسوا شاعر، وہ بھی ہے مشہور!
فیض تمہارے شہر میں رہ کر تم سے کیوں ہے دُور؟

ادیب سہیل

فیض ڈھاکے میں

آج پھر کوئی ہوا ہے میہماں

آج پھر ہے انجمن رشکِ چمن

آج لیکن ہے جُدا اُس کی پھبن

جمع ہیں سب آشنا آشنا گردیگی کے پھول چہرے پر کھلائے

ناچتی ہے سرخوشی ہر میز کے گلدان میں

منفرد ہے بزم کا انداز اپنی شان میں

ہر طرف صوفوں پہ آیا ہے نکھار

جیسے یہ صوفے ہوں کُنجِ خوش نما

جیسے سارے میزباں ۔ یہ شاعر و افسانہ گو، نغمہ گر و تصویر کار

خیر مقدم کی خوشی کے پھول سے آراستہ ہوں شاخسار

اور کُنجِ خوش نما ہیں یہ ورودِ میہماں ۔ جیسے ہوائے نوبہار

جوہر سعیدی

اک دیدۂ بیدار

فیض، اک فکر ہے غیرت کو جگانے والی
فیض اک آگ ہے حدت کو بڑھانے والی

فیض، اک ذہن ہے بڑھتا ہوا ہر دل کی طرف
فیض اک دل ہے بلاتا ہے جو مشکل کی طرف

فیض اک تلخ احساس ہے میٹھی ..... میٹھی
فیض اک روح کی آواز ہے ٹھہری ٹھہری

فیض اک نغمۂ افکار ہے، نا آسودہ
فیض اک دیدۂ بیدار ہے خواب آلودہ

فیض کے نام سے ہوتے ہیں جواں سال جواں
کم اُجالا تو نہیں فیض کی راہوں کا دھواں

فیض اک شعبدۂ فکر و نظر ہے شاید
فیض اک خندۂ تقدیر سحر ہے شاید

فیض یوں "پرورش لوح و قلم" کرتا ہے
"دل پہ جو اُس کے گذرتی ہے رقم کرتا ہے"

دیکھنے والی نگاہوں پہ فسوں طاری ہے
چشمۂ فیض کی رفتار بڑی پیاری ہے

فیض تصویر تصور کو چمک دیتا ہے
فیض انداز تحیر کو دمک دیتا ہے

فیض کی فکر کا صحرا بھی چمن ہے یارو
فیض گلہائے معانی کا وطن ہے یارو

فیض اک بزم ہے اُلجھی ہوئی تعبیروں میں
فیض اک عزم ہے جکڑا ہوا زنجیروں میں

فیض ارماں زدۂ سایۂ دیوار بھی ہے
فیض اک جسم ہے جو جاں کا طلبگار بھی ہے

فیض کے کرب کا مفہوم بہت سادہ ہے
فیض آزادئ افکار کا دلدادہ ہے

فیض اخلاص کا شعلہ ہے بھڑکنے والا
فیض جگنو ہے اندھیروں میں چمکنے والا

فیض انساں کو حقائق کا وطن کہتا ہے
فیض خوابوں کے جزیرے میں نہیں رہتا ہے

فیض دل کو خلشِ نام و نشاں دیتا ہے
فیض "زنجیر کے حلقوں کو زباں" دیتا ہے

فیض کی جراتِ اظہار میں دارائی ہے
فیض عذرائے مہ و سال کی انگڑائی ہے

حزیں لدھیانوی

فیض احمد فیض

فسردہ شاخساروں کو گل افشاں کر دیا تو نے — چمن کے پتے پتے کو غزل خواں کر دیا تو نے
فضائے زیست پر جب ظلمتوں نے دام پھیلائے — تو اپنی مشعلِ جاں کو فروزاں کر دیا تو نے
وہ تارے جو غموں کے ابر میں پنہاں رہے برسوں — بنا کر آفتاب اُن کو نمایاں کر دیا تو نے
وہ صحرا جس کے سینے پر شرارے رقص کرتے تھے — اُسے آنسو گرا کر شبنمستاں کر دیا تو نے
گلوں میں رنگ بھر کر آبرو رکھ لی گلستاں کی — خزاں کی شام کو صبحِ بہاراں کر دیا تو نے
جلے دل کے پھپھولوں سے تپاں سینے کے داغوں سے — فضائے دشتِ ہستی میں چراغاں کر دیا تو نے

ترے دم سے معطر ہے نگارِ نظم کا گیسو
مرے شاعر، شبستانِ غزل کی روشنی ہے تو

کبھی نے "نقشِ فریادی" کو بخشی تابِ گویائی — بھر سوموت کی وادی میں جینے کی صدا آئی
بہاروں کی قسم "دستِ صبا" کے فیض سے آخر — چمن کے پتے پتے، بوٹے بوٹے پر بہار آئی
ترے ہی "زنداں نامہ" سے یہ آزادی کا شہرہ ہے — اسی نے ذہنِ انساں کی کڑی زنجیر پگھلائی
تہہِ سنگ آ گیا جب ہاتھ انساں کا اُسے تھاما — تری آنکھوں میں اشک آئے، ہنسے جب دم تماشائی
فضا سے نغمگی برسی، ہوا نے راگنی چھیڑی — سکوتِ بیکراں میں جب تری آواز لہرائی
اسے سُن کر رگوں میں برق کی رَو دوڑ جاتی ہے — ترے تدھم سروں میں ہے کچھ ایسا جوشِ برنائی

تری تخلیق سورج بن کے چمکی ہے اندھیروں میں
ترے لفظوں کی افشاں جگمگاتی ہے سویروں میں

قمر ہاشمی

شاعرِ خوباں

اٹھی ہے جبر و ستم کی جہاں سے بھی آواز
ہوا ہے شورِ سلاسل کہیں بھی دفن وہیں
جہاں بھی ظلم ہوا کچھ نسیوا کے سائے ہیں
ہر ایک حلقۂ زنجیر نے زباں کھولی
قریبِ صبح ستارا جو کوئی ٹوٹ گیا
تو یہ سنا کہ اسیروں کی کٹ گئی زنجیر
کھلا جو روزنِ زنداں تو فیض کی آواز
نویدِ عشرتِ فردا سنا گئی آ کر

بہارِ لالہ و گل پر جو آنچ آئی ہے
وطن کے شاعرِ خوباں نے یہ کیا محسوس
جلا ہے اپنا ہی دامن لگے ہیں اپنے ہی داغ
وطن کی آگ بھڑکتی رہی ہے جس دل میں
متاعِ روشنی سمجھا ترے قلم نے اسے
ترے قلم نے جو لفظوں کے پھول مہکائے
ترے خیال نے جو گیت پیار کے گائے
وہ آبرو ہیں وطن کی، وہ دھڑکنیں دل کی

سنی گئی ہے جہاں بھی ترے قدم کی چاپ
دھڑک اٹھا ہے محبت سے اُس زمیں کا دل
ترے وطن کے جیالوں کو پیار ہے تجھ سے
کہ تو نے اُن کو سنائے ہیں انقلاب کے گیت

عبدالرؤف عروج

روشنیوں کی آواز

پھر ملے یا نہ ملے فکرِ معیشت سے نجات
فیض صاحب سے ملو ملیں کے مسرت ہوگی
ہم نے پڑھ کر انہیں مفہومِ وفا سمجھا ہے
ہم نے پڑھ کر انہیں آدابِ جنوں سیکھے ہیں
غم کے اعجازِ محبت کے فسوں سیکھے ہیں
منزلِ صبحِ طرب دور نہیں۔۔ دور نہیں
یہی ظلمت گہہ دنیا کبھی جنت ہوگی
فیض صاحب سے ملو ملیں کے مسرت ہوگی

فیض صاحب نے نئی فکر نیا ذہن دیا
ان سے بیدار نظر اہلِ جنوں کم ہوں گے
انگلیاں اپنی ڈبولی ہیں لہو میں اپنے
تاکہ جو دل پہ گذرتی ہے رقم ہو جائے
گر نہ ہو معرکۂ لفظ و بیاں کا یارا
یوں سہی، پرسشِ لوح و قلم ہو جائے
جب کبھی زخمِ زمانہ کا خیال آئے گا
ان کے اشعارِ دل آویز ہی مرہم ہوں گے

فیض صاحب نے محبت کے حسیں رشتے سے
دردمندوں کی غریبوں کی حمایت کی ہے
غمِ دوراں کو بھی چاہا غمِ جاناں کی طرح
اور پھر اپنے رقیبوں سے محبت کی ہے
وقت کے ٹوٹتے شیشوں کا مسیحا بن کر
بند ہوتی ہوئی کلیوں کو حیا کے ہاتھوں
عہدِ صرصر میں بہاروں کے سندیسے بھیجے

شب کی [illegible] ہوئی خلق کے نام
ماہتابوں کے ستاروں کے سندیسے بھیجے

فیض صاحب نے دیا تو صدِ زیست جیسی
صورتِ دستِ تہِ سنگ نہیں ہو سکتے
شکستِ غم کی سحر چہرۂ غمگیں کا نکھار
جس نکتی ہے انہی شعر سے فریادی بہار
جو سمجھتے ہیں کہ لب میرے زباں میری ہے
جو سمجھتے ہیں کہ سچ زندہ و پائندہ ہے
وہ کم آواز و کم آہنگ نہیں ہو سکتے

فیض صاحب کا جو دکھ ہے وہی سب کا دکھ ہے
ہم تو کہتے ہیں انہیں روشنیوں کی آواز
دیر سے جس کے لئے ہونٹ ترستے تھے
وہ سخن نہ کبھی نگاہوں نے بیاں کر ڈالا
پسِ دیوارِ قفس طرزِ فغاں کی ایجاد
اور اسے [illegible] کے گلستاں کی زباں کر ڈالا
طوق کے دور کے زنجیر کے ہر موسم میں
بھیگتی آئی ہے یہی زخم کھلا کرتے ہیں
کوچۂ عشق سے تا دشتِ بلا بہرِ رفو
فیض صاحب ہی سے کچھ لوگ ملا کرتے ہیں
فیض صاحب سے ملاقات کے مسرت ہوگی
ورنہ اس کشمکشِ دہر میں رکھا کیا ہے
ایک معبودۂ بے نام کی چاہت کے سوا
ہجر کے دکھ کے سوا، وصل کی راحت کے سوا

محسن بھوپالی

انتظار

جس نے آزادیٔ فکر و تقدیس لوح و قلم کے ترانے لکھے
جس نے اہلِ وفا، اہلِ دل، اہلِ حق کے فسانے لکھے
جس نے عصمت کو جنسِ تجارت بنانے پر دلدوز نوحے لکھے
جس نے سرکش جیالے جوانوں کے رنگیں قصیدے لکھے
جس نے زنداں میں بھی زندگانی سے بھرپور نغمے لکھے
جس نے تاریک راہوں کو قندیلِ غم سے فروزاں کیا
جس نے یادوں کے زخموں سے دشتِ وفا میں چراغاں کیا
جس نے ناموسِ ارضِ وطن کے لئے خود کو رُسوا کیا
ہم اسی فیض کے منتظر ہیں — !

جو پھر خونِ دل میں ستم آشنا اُنگلیوں کو ڈبو کر
رُخِ اہرمن پر چھڑک دے
اندھیرے کی زنجیر کے گنگ حلقوں کو پھر سے زباں بخش دے
ہم اسی فیض کے منتظر ہیں — !

معشر احسان

اے نغمہ کار!

موسیقیوں کو درد کے سانچے میں ڈھال کر
تاریکیوں سے سوچ کا سورج اُچھال کر
بے دردیوں کی رات میں جگنوں کو پال کر
اے نغمہ کار، اہلِ وطن سے سوال کر

"کیا مل گیا ہے اپنا لہو چاٹ کر مجھے
تخلیق و آگہی کا سفر کاٹ کر مجھے

سینہ سدا سُلگتا رہا غم کی آنچ سے
گھلتا رہا ہوں آتشِ پیہم کی آنچ سے
شعلے اُٹھے ہیں دیدۂ پرنم کی آنچ سے
پھولوں کو آگ لگ گئی شبنم کی آنچ سے

دامانِ موج سے میں نشہ ہے کہ زہر ہے
کیا آئینہ دکھاؤں کہ اندھوں کا شہر ہے

ہر ہونٹ پر ہے کرب کی پپڑی جمی ہوئی
ہر آنکھ میں ہے نور کی مشعل بجھی ہوئی
ہر صبح میں ہے شب کی سیاہی گھلی ہوئی
احساسِ آگہی نہ ہوا جاں کنی ہوئی

کورانِ شہرِ دید کے شیدائی ہی نہیں
سُرمہ کسے لگاؤں کہ بینائی ہی نہیں"

منظر ایوبی

البیلا فن کار

فیض ہے عصرِ حاضر کا وہ البیلا فن کار
جس کی تحریروں میں رقصاں خونِ جگر کی دھار
راہیں روشن روشن جس کی منزل منزل نور
جس کے ہونٹوں پر بکھرے ہیں نغمات جمہور
انساں کی آزادی جس کا بنیادی دستور
ادنیٰ ۔ اعلیٰ کی تفریق سے ہے جو کوسوں دُور
کاہکشانی جلووں سے جس کا سینہ معمور
سُورج کی مانند ہے تابندہ جس کا کردار
فیض ہے عصرِ حاضر کا وہ البیلا فن کار

جس کا خامہ سازِ ادب کے واسطے اک مضراب
جس نے سکھائے دل والوں کو جینے کے آداب
انسانوں کی عظمت ہے جس کا جزوِ ایمان
جس کی نظر میں سب ہی یکساں میر ہو یا دہقان
اپنے وطن کی گلیوں پر ہوتا ہے جو قربان
پاک زمیں کی سوندی مٹی سے ہے جس کو پیار
فیض ہے عصرِ حاضر کا وہ البیلا فن کار

کوئے نگاراں کے چرچے یا دار و رسن کی بات
رقص ہو انگاروں کا یا ہو نغموں کی برسات
سنگ و خشت کی بارش ہو یا دریاؤں کا شور

خوشیوں کا سایہ ہو یا ہو غم کی گھٹ گھور
نور کا اک چشمہ پھوٹے یا اندھیاروں کا زور
کہیں جھکا جو ہر طوفاں کی موجوں سے سوبار
فیض ہے عصرِ حاضر کا وہ البیلا فن کار

دیوانوں اور فرزانوں کے لب پر جس کا نام
بستی بستی نستر یہ نستر یہ جس کا پرچا عام
نگری نگری، صحرا صحرا، جس کے نغمے میں چور
جس کا سینہ حبِ وطن کے جذبے سے معمور
زنداں کی تاریک فضا کو جس نے کیا پُر نور
جس نے توڑا دیوانوں کی خاموشی کا تار
فیض ہے عصرِ حاضر کا وہ البیلا فن کار

اونچے خواب دکھاتی گھڑیاں، گاتے ماہ و سال
اڑتے آنچل، بکھری زلفیں، بہکی بہکی چال
رنگین لمحے، مہکی راتیں، اجلی صبح و شام
شان و شوکت، جاہ و حشمت، راحت یا آرام
عزت، شہرت، دولت، عظمت، دنیا کے انعام
ان جھوٹے سکوں کا جس نے سرد کیا بازار
فیض ہے عصرِ حاضر کا وہ البیلا فن کار

جس کی نظر میں موتی ہیرے سب ہیں پتھر مول
سونے چاندی سے بڑھ کر ہیں جس کے میٹھے بول
بحر کی بپھری موجوں سے جو کھیل چکا سو بار
جس کی ایک نظر سے بدلی طوفاں کی رفتار
جس کے تیور دیکھ کے لرزاں ظلم کی ہر دیوار
فیض ہے عصرِ حاضر کا وہ البیلا فن کار
ملکوں ملکوں جس کے فن کی دھوم مچی ہے دھوم
پاک وطن کی جنتا! تو بھی اس کا ماتھا چوم

تابؔ اسلم

شاعرِ رنگیں نوا

اے مرے پیارے وطن کے شاعرِ رنگیں نوا
تیرے اسلوبِ بیاں پر میرے جان و دل فدا!
تیرے شعروں میں نگارانِ غزل کی شوخیاں
تیری آوازوں میں خوابوں کی حسیں سرگوشیاں

مدھ بھری آنکھوں کا جادو رس بھرے ہونٹوں کے جام
عارضِ گلگوں کی صبحیں طرزِ زلفوں کی شام
روشنی کے پھول لے کر آ رہی ہے چاندنی
ذہن پر اک کیف بن کر چھا رہی ہے چاندنی

حسن کے خلوت کدے میں عشق کی بے تابیاں
شوق میں ڈوبے ہوئے جذبات کی انگڑائیاں
کتنے افسانے لب و رخسار کی تحریر میں
کتنے موتی دل نشیں الفاظ کی زنجیر میں

دل کی وادی میں مہکتے ہیں ترے گیتوں کے پھول
نور و نکہت کے شگوفے اجنبی رنگوں کے پھول
تو نے وہ شمعیں فروزاں کیں سرِ بزمِ سخن
جن کو مدھم کر نہیں سکتی ہوائے شعلہ زن

تیرے گیتوں، تیرے خوابوں، تیرے رومانوں کی خیر!
ظلمتوں میں چاندنی کے آئینہ خانوں کی خیر!

وقار خلیل

فیض۔ تنویرِ حیات

فیض شعر و نغمہ و تہذیب و مے خانے کا نام
علم و دانش کا، ایاغوں کے صنم خانے کا نام

فیض، رقصِ نکہتِ گل، فیضِ بادِ نوبہار
کفر و ایماں کی حدوں سے ماورا جانے کا نام

فیض ذہن و فکر کے ویران کا ذوقِ لطیف
فیض بامِ وقت پر زلفوں کے لہرانے کا نام

فیض، کلکِ صبح کی تحریر، تنویرِ حیات
شاعرِ شہرِ نگاراں بھی ہے دیوانے کا نام

فیض کے اشعار اوراقِ شعورِ زندگی
فیض بزمِ مہوشاں میں صبح کے آنے کا نام

فیض کا فکرِ رسا چہرہ نما حالات کا
عصرِ حاضر کی غزل کے آئینہ خانے کا نام

فیض اقلیمِ سخن میں طرحِ نو اندازِ حسن
مقتلِ شہرِ ستم میں جام چھلکانے کا نام

فیض غالب کی غزل کی آبرو، حافظ کا جام
دشتِ میر و مومن و آتش کے خم خانے کا نام

مسکراتی، گنگناتی زندگی، فن کا وقار
فیض اک گل رنگ شخصیت کے افسانے کا نام

احمد رئیس

بشارت

ہزاروں برس تک
زمانہ
تری رہگزر میں
بچھائے گا پلکیں
ترا ہر نشانِ قدم چومنے کو
زمیں پر ستاروں کی بارات اترا کرے گی
تری پیشوائی میں تعظیم میں
چاند، سورج کئی کرنوں کی افشاں لٹاتے رہیں گے
ترے ہم قدم، ہم سفر —
ابر پارے رہیں گے
شفق، آبجو، چاندنی،
کہکشاں
نیلگوں آسماں
موج در موج بہتے ہوئے تیز دھارے رہیں گے

ترے فکر و فن کی
مہکتی ہوئی وادیوں سے
گزرتے رہیں گے
خراماں، خراماں
کئی منچلے رہروانِ بہاراں

ہزاروں تبسم
ہزاروں دعائیں
ہزاروں نگاہیں
ترے ضوفشاں جاوداں جسم و جاں پر
حسیں پھول بن کر
بکھرتی رہیں گی

ہزاروں برس تک
ہر اک لب پہ تیرے ترانے رہیں گے
ہزاروں برس تک
ہر اک گھر میں تیرے فسانے رہیں گے

طلعت اشارت

محرمِ جذبِ دروں

ان گنت صدیوں کے نیچے آج انساں کا ضمیر
زیست کی پامال قدروں کی طرح پائندہ ہے
بے ستم گر آج بھی پرویز کا احساس ملک
کوہکن کا جذبۂ شیریں ابھی تابندہ ہے
اہلِ سطوت اب بھی فردوسی کو دیتے ہیں فریب
جراَت سقراط اندازِ جنوں میں زندہ ہے

محورِ بیدادِ بے مہریِ صیاد ہے
پر فسانہ عشق کا دنیا کو اب تک یاد ہے

"نقشِ فریادی" ہوئی ہے عظمتِ شانِ وطن
کیا صدائے درد ہے کہ گونج اٹھے کوہ و دمن
کر چکی "دستِ صبا" خوشبوئے گل کو منتشر
لاکھ گلچیں نے کئے پامال پھولوں کے بدن
فیضِ "زنداں نامۂ" دل ہے کہ روشن ہو گئی
راہِ جاناں سے زیادہ منزلِ دار و رسن

شوق! تو دستِ تہِ سنگِ جفا کو تھام لے
تیری خاطر مل رہے ہیں چاک دامانِ چمن

عظمتِ انساں کا حامل دائمی امن و سکوں
محرمِ شعر و سخن آگاہِ رمزِ زندگی
فیض شیدائے وطن کو نازِ محبوبی ہے آج
اور زنجیرِ جنوں کی دلربائی بڑھ گئی

ہر زمانے میں زباں کو طوق پہنائے گئے
اور انا الحق ہر جگہ منصور چلاتے رہے
جراَتِ رندانہ زندہ ہی رہی ہر حال میں
دار پر کھینچے ہوئے منصور چلاتے رہے

محرمِ جذبِ درونِ جلوہ ساماں تو بھی ہے
فیض پندارِ دل و جاں کا غزل خواں تو بھی ہے
تو علامت ہے شکستِ اہلِ استبداد کی
اور ہجومِ خار و خس میں گل بداماں تو بھی ہے

اجمل اجملی

اندھیری رات کا چراغ

ترے وجود نے بخشا ہے یہ یقین مجھے
کہ تیرگی میں بھی کچھ آفتاب پلتے ہیں
خزاں کی گود میں کھلتا ہے عہد نو کا چمن
اندھیری رات کے دل میں چراغ جلتے ہیں

ہمارے دور کی اس بے کراں سیاہی میں
ترا وجود نئے دور کا اشارا ہے
ترے وجود نے بخشی ہے زندگی کی امنگ
ترا وجود ہمارے لئے سہارا ہے

تجھے خبر بھی نہیں جب اٹھی ہماری نظر
تو قافلے کے ہراول میں تو نظر آیا
اٹھائے غم تو تری شکلوں سے آنکھ لڑی
سجائے دار تو تیرا گلو نظر آیا
لگے جو زخم تو زخموں کو تیرے یاد کیا
بہا جو خون تو تیرا لہو نظر آیا

ترے خلوص کی سوگند کھا کے کہتا ہوں
ترے وجود نے بخشا ہے یہ یقین مجھے
کہ تیرگی میں بھی کچھ آفتاب پلتے ہیں
اندھیری رات کے دل میں چراغ جلتے ہیں

آفاق صدیقی

فیض، بڑا فنکار

فیض ہمارے پیارے پاکستان کا اک فن کار
فیض ہماری اردو کے دلداروں کا دلدار
فیض ہے ایسا شاعر جس کے البیلے اشعار
شعر و ادب کے شہکاروں میں لافانی شہکار

فیض کے پیارے دل میں سارے دل والوں کا پیار
فیض ہمارے لاکھ غموں کا سنجیدہ غم خوار
فیض کو سب سے ہمدردی ہے فیض ہے سب کا یار
فیض کے سُندر سپنوں میں ہے ایک نیا سنسار

'دستِ صبا'، 'نقشِ فریادی' جیسے دو گلزار
'زنداں نامہ' فکر و نظر کی چاہت کا معیار
فیض کے فن میں رچی ہوئی ہیں تہذیبی اقدار
فیض ہے سچی آزادی کا ایک علَم بردار

فیض کے فن سے وابستہ ہیں شائستہ افکار
فیض بڑا انسان ہے یارو فیض بڑا فن کار

مشال رضوی

وہ شعلہ بیاں، وہ شعلہ نفس

غنچوں کا دہن!
پھولوں کی زباں
ہستی کا سخن
فطرت کا بیانیہ
گلشن کی خزاں پر جو برسا وہ مس
شبنم کی طرح جو اشک فشاں
جو بات وہ دل میں رکھ کے بھی
خاموش نہیں رہتے کبھی
نغمے جس کے شعلے بن کر
بن جاتے ہیں اک آزادی
وہ شعلہ بیاں، وہ شعلہ نفس
وہ دشمنِ جانِ اہلِ ہوس
ہے میرے وطن کی آنکھوں میں جیسے تارا!
کہتا ہے زمانہ فیض اسے
وہ شاعر ہے حساس محبت کا متوالا
شمعِ وطن کا پروانہ
اک دیوانہ!
رکھتا ہے نظر میں اپنی جسے
اس شہرِ خرد کا
فرزانہ!!

نسیم سعید

پرستارِ امن

تیرہ شب کی روایات ہیں زندہ تجھ سے
حسن کا، امن و محبت کا پرستار ہے تو
کسی حکمت سے ترے سر کو جھکایا نہ گیا
نفرت و ظلم سے آمادۂ پیکار رہے تو

ترا اسلوبِ نگارش ہے زمانے سے جدا
غنچہ و گل کو ہیں بخشے نئے معنی تو نے
تیرا ہر نقش حقیقت میں ہے اک نقشِ جمیل
محفلِ مانی و بہزاد سجا لی تو نے

تیرے اشعار میں یوں حسن و محبت ہے رواں
اہلِ دل سنتے ہیں دل تھام کے رہ جاتے ہیں
ترے ہر لفظ میں وہ رنگِ معانی ہیں نہاں
ذہن میں قوسِ قزح بن کے جو لہراتے ہیں

تیرا نغمہ صرف ترا غم ہی نہیں ہے اس میں
قصۂ دردِ وطن بھی، غمِ احوال بھی ہے
ہے تری فکر میں وہ پرتوِ دنیا جس میں
دل کی دھڑکن بھی ہے روداد مہ و سال بھی ہے

سلیم خواجہ

فیض

کچھ دن ترے افکار کی دنیا میں رہا میں
کچھ روز ترے شعر کے گلشن میں گزارے
اس پھول کو چھیڑا کبھی اس خار کو چوما
آنکھوں پہ سجائے کبھی اشکوں کے ستارے

سن خواں کو [illegible] کبھی مستانہ ادا سے
راحت کبھی پیڑوں کے گھنے سائے میں پالی
چین آیا کبھی سبزۂ نورستہ پہ مجھ کو
بلبل کے ترانوں نے کبھی نیند اڑالی

اور آج ترے گلشنِ معنیٰ سے بہت دور
محسوس یہ ہوتا ہے کہ ہر چاپ میں تو ہے
ہر روح ترے نغمۂ الفت کی ہے گھائل
ہر چاکِ گریباں ترے نغموں سے رفو ہے

اے غالب و اقبال کی محفل کے مغنی
اے عظمتِ انساں کا جنوں پالنے والے!
ہے راہروِ منزلِ تقدیرِ بشر تو
ہیں مطربِ فردا کا ترنم ترے نالے

نغمات کا رس گھول رہا ہے مرے دل میں
لگتا ہے کہ تو بول رہا ہے مرے دل میں

فیض پارے

سالک ہاشمی

نقشِ فریادی نہ ہو بے فیض تاثیرِ نوا
نامۂ زنداں میں ہو جس سے ہوئی تازگی
علم و فن سے تیرا دستِ ہنر سنگ [illegible]
اہلِ فن سے درد کی تفسیر ہے تیرا کلام

ہر دلِ بیدار کا جبریل ہے دستِ صبا
اہلِ زنداں کو پسند آئے نہ کیوں اُس کی ادا
شاہکارِ عصر کی صورت گری کرتا رہا
گونجتی ہے شہرِ استبداد میں تیری صدا

شوکت عابدی

جو اہتمامِ بہارِ دوام کرتے ہیں
ہیں ارتقا کے نشانوں کی سرخیاں جن سے
فرازِ دار انہیں کو نصیب ہوتا ہے

بصد خلوص انہیں ہم سلام کرتے ہیں
وہ لوگ دیدہ و دل میں قیام کرتے ہیں
جو کائناتِ محبت میں نام کرتے ہیں

شمسی طہرانی

ذرّوں میں تابشِ مہ و انجم تجھی سے ہے
موجوں میں آرزوئے تلاطم تجھی سے ہے
تیرے جنوں سے عظمتِ فصلِ بہار ہے

قطروں کے دل میں دولتِ قلزم تجھی سے ہے
محنت کشوں کے لب پہ ترنم تجھی سے ہے
ہاں تو جہانِ شعر کا پروردگار ہے

رشید احمد لاشاری

اے نگاہِ فیض! اس لطف و کرم کا شکریہ
دم نہ تھا کچھ اپنے دم میں تیرے دم کا شکریہ
شہریارِ علم و فن، لوح و قلم کا شکریہ

نذرِ فیض

رعنا اکبرآبادی

رنگِ پیراہن کا خوشبو زلف لہرانے کا نام

جاودانی ہے وفا میں جل کے مرجانے کا نام — شمع آغوش میں روشن ہے پروانے کا نام

ربطِ غم کی صدائے مستقل ہے زندگی — موت ہے اس ساز کے خاموش ہوجانے کا نام

دیکھئے اب آپ کی نظروں پہ الزام آئے گا — آپ کیوں شرما رہے ہیں حسن کے دیوانے کا نام

مجھ کو دیوانہ بنے اک زمانہ ہوگیا — یاد بھی اب تو نہ ہوگا ان کو دیوانے کا نام

میں کسے سمجھاؤں رعنا اپنے ویرانے کی قدر — بستیاں اجڑیں تو پھر ملتا ہے ویرانے کا نام

رعنا ہمدانی

بیزار فضا، درپئے آزار صبا ہے

معمورۂ افکار میں اک حشر بپا ہے — ادراک بھی انساں کے لئے دارِ بلا ہے

ہونٹوں پہ ہنسی سینوں میں کہرام بپا ہے — دیوانوں نے جینے کا چلن سیکھ لیا ہے

اب دشتِ جنوں بھی جو سمٹ آئے عجب کیا — دیوانہ کوئی لے کے ترا نام اٹھا ہے

ہم ذوقِ سماعت سے ہیں محروم وگرنہ — ہر قطرۂ شبنم میں دھڑکنے کی صدا ہے

دھڑکا یہ لگا ہے کہ سحر آئے نہ آئے — اس غم سے سرِ شام ہی دل ڈوب رہا ہے

انداز کچھ ایسا ہے رعنا اپنی غزل کا — سنتا ہے جو بے ساختہ کہتا ہے رضا ہے

مرتضیٰ برلاس

بے دم ہوئے بیمار دوا کیوں نہیں دیتے

اک بار ہی جی بھر کے سزا کیوں نہیں دیتے — گر حرفِ غلط ہوں تو مٹا کیوں نہیں دیتے

ایسے ہی اگر مونس و غمخوار ہو میرے — یارو! مجھے مرنے کی دعا کیوں نہیں دیتے

فردا کے جھروکوں میں مجھے ڈھونڈنے والو — ماضی کے دریچوں سے صدا کیوں نہیں دیتے

موتی ہوں تو پھر سوزنِ مژگاں سے پرو لو — آنسو ہوں تو دامن پہ گرا کیوں نہیں دیتے

سایہ ہوں تو پھر ساتھ نہ رکھنے کا سبب کیا — پتھر ہوں تو رستے سے ہٹا کیوں نہیں دیتے

خلیل رامپوری

نہ گنواؤ ناوکِ نیم کش، دلِ ریزہ ریزہ گنوا دیا

دلِ[1] داغ داغ لٹا دیا، تن ریزہ ریزہ گنوا دیا — وہ لباسِ جاں کہ جو رہ گیا تھا ہوا میں آج اڑا دیا

[1] معذرت کے ساتھ تصرف کر رہا ہوں ۔ خ

نثار میمن پوری

کوئی کوئے جاناں کے بام و در پہ سجائے مجھ داغِ دل
یہ سب راہ دم تھا کہ ذرہ بھی نہ تھا تو خود کو چڑھا دیا

کبھی کیا کہ بیٹھے ... سے مجھ کو خیال تیرا بجھا گیا
مجھے چاہ ... جیسے بجھا دیا ... ہوئے تم کو جلا دیا

یہ ترے جنوں کا نیاز ہے کہ ... ہے نقش نقش
یہ ... خاک کو گل آفتاب بنا دیا

ابوالخیر کشفی

سب قتل ہوکے تیرے مقابل سے آئے ہیں

ارباب ہوش منزلِ آسودگی میں ہیں
ہم تو تری تلاش میں منزل سے آئے ہیں

جس دل سے زندگی کو ملی ... سرمدی
نغمے مرے خیال کے اُس دل سے آئے ہیں

صحرا کی ریگ چشمۂ مہتاب بن گئی
جگنو نفر کے روزنِ محمل سے آئے ہیں

تیغِ جفا بھی عشق کے قدموں پہ جھک گئی
مایوس ہوکے کوچۂ قاتل سے آئے ہیں

کشتی ادائے دوست سے ساحل ...
خود ڈوبنے ... مقابل سے آئے ہیں

حمید اللہ شاہ

گردشِ شوق ... کا اثر تو دیکھو!

دوستو! خونِ شہیداں کا اثر تو دیکھو
کاسۂ سر سے آئی ہے سحر تو دیکھو

دردِ دل دولتِ کمیاب مرے پاس بہت
ظرف کی داد تو دو میرا جگر تو دیکھو

منزلِ شوق گریزاں ہے گریزاں ہی سہی
رہ گم کردہ مسافر کا سفر تو دیکھو

کون ہے دیا اثبات بہار دل کا مذاق
مجھ کو الزام نہ دو اپنی نظر تو دیکھو

خوگرِ ہم ... دیدہ ویراں جلنے دو
داغ ہم ... ہنر تو دیکھو

منظر مفتی

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے

سرو و سمن نہ جانے کہاں اس دیار کے
گم ہوگئے ہیں رُت میں کانٹے اُتار کے

شبنم کی بوند بوند کو ترسی کلی کلی
دریا بکف ہے قافلے ابرِ بہار کے

برقِ خیال و شعلۂ احساس و سوزِ دل
سب بجھ گئے چراغ تری رہگذار کے

احمد وحید اختر

کچھ دن سے انتظارِ سوالِ دگر میں ہے

سازِ حیات لذتِ سوزِ جگر میں ہے
سوزِ جگر کا راز تمہاری نظر میں ہے

کب تک حجابِ لالہ و گل میں چھپوگے تم
کس کا جمال دیدۂ صورت نگر میں ہے

عنوان بدل بدل کے سناتے ہو بار بار
افسانۂ حیات تمہاری نظر میں ہے

آؤ چائے
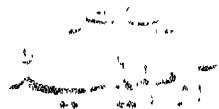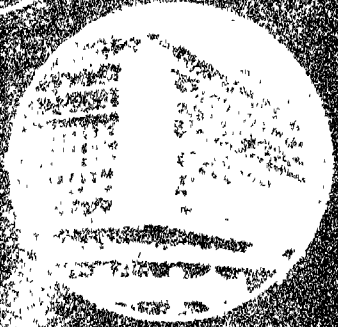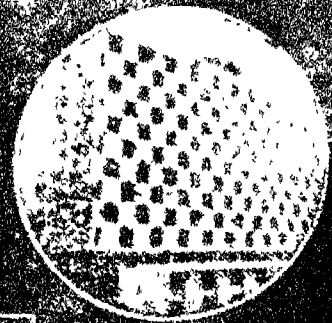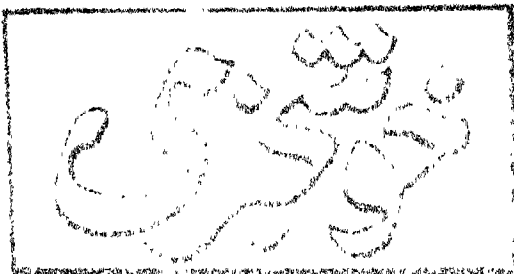
منٹگمری
سوئیٹ اور ٹافیاں
پیش کرتے ہیں!
جرمن ماہرین کی نگرانی میں خودکار مشینوں پر تیار شدہ!
تیار کردہ
منٹگمری فلور اینڈ جنرل ملز لمیٹڈ، منٹگمری
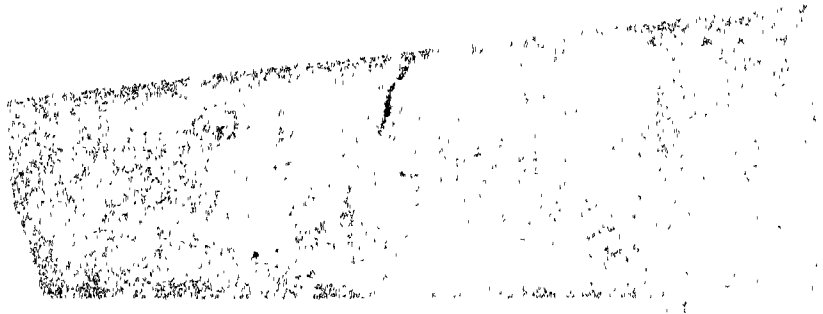
ملیریا سے نجات

برَوز ویلکم اینڈ کمپنی (پاکستان) لمیٹڈ
کراچی
BWP

بارشِ سنگ

تھم گیا شورِ جنوں ختم ہوئی بارشِ سنگ
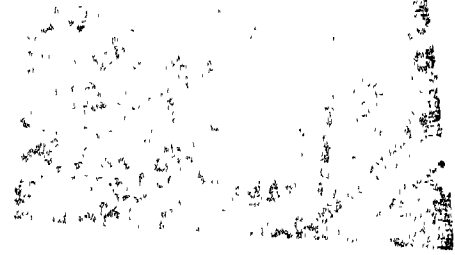
★ فیض کی انفرادیت
○ فیض نقش فریادی سے زنداں نامہ تک
★ دل پُرخوں کا ہنر تو دیکھو
○ فیض کا فن شاعری
★ کچھ فیض کے بارے میں اور بہت کچھ اپنے بارے میں
○ شاعر محبت، شاعر انسانیت
★ شاعر حیات و کائنات
○ شاعر با عمل
★ زنداں نامہ پر ایک نظر
○ تار حریر دو رنگ
★ فیض: ایک تقابلی مطالعہ
○ رقت، نقش فریادی، ہم اور میں
★ فیض کی غزل
○ فیض کی داخلیت پسندی
★ فیض میری نظر میں
○ فیض، ایک صحافی
★ فیض کا اسلوب شاعری
○ مرکز داستاں ہے فیض
★ فیض کی شاعری، چند فنی پہلو
○ فیض، ایک نثر نگار
★ فیض کے دو عشق
○ فیض کی شاعری میں محبوب کا تصور
★ فیض کی شاعری اور زبان و بیان
○ فیض کی شاعری۔ پس منظر و پیش منظر
★ فیض، غم جاناں سے غم دوراں تک

پروفیسر سید احتشام حسین

فیض کی انفرادیت

بعض مقدس اور دیانتدار لوگوں کے اظہارِ عقائد میں بھی ایک ایسی منزل آتی ہے جہاں "زاہدِ تنگ نظر" کفر کا فتویٰ دیتا ہے اور کافر مسلمان قرار دے کر ان سے اپنی بیزاری کا اظہار کرتا ہے۔ یا پھر وہ صورت پیدا ہوتی ہے کہ کچھ دل موہ لینے والی ادائیں اپنا کام کر جاتی ہیں اور کفر و اسلام کی چھان بین کرنے کے بجائے گبر اور مسلمان دونوں ان کا ہاتھ چومنے لگتے ہیں۔ یہ دونوں باتیں ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ جب مسلمان دوسروں سے اپنی علاحدگی ظاہر کرنے کے لئے ان میں صرف کفر تلاش کرتا ہے اور کافر ساری انسانی خصوصیات کو نظر انداز کرکے اپنی بیزاری کے جواز کے لئے دوسروں میں صرف اسلام کی جستجو کرتا ہے تو چاہے حقیقت کا خون ہی کیوں نہ ہو جائے، انسان جذبۂ منافرت کی تسکین ضرور ہو جاتی ہے۔ دوسری صورت میں صرف چند مشترک پہلوؤں پر نظر رکھ کر کفر میں اسلام اور اسلام میں کفر کا جلوہ دیکھ لینے کی آسودگی حاصل ہو جاتی ہے۔ دونوں نقطۂ نظر جذباتی ہیں لیکن پہلے سے منافرت اور دوسرے سے رواداری کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ شعر و ادب سے لطف اندوز ہونے میں غالباً دوسری شکل زیادہ مفید ہے کیونکہ اس میں کم سے کم ناانصافی اور بیزاری کی صورت نہیں پیدا ہوتی بلکہ لطف اندوزی اور ہمدردانہ تنقید کے لئے زمین ہموار ہوتی ہے۔

فیض کی شاعری پر اظہارِ خیال کرتے وقت تمہید کے طور پر یہ چند سطریں بے اختیار قلم سے نکل گئیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ان کی شاعری پر تنقید کے لئے قلم اٹھانے والوں میں سے اکثر کا کفر ٹوٹا ہے اور ترقی پسندی کو آنکھ بند کرکے کوسنے والوں نے بھی کسی نہ کسی حیثیت سے ان کو مستثنیٰ کر دیا ہے۔ ان لوگوں کا ذکر نہیں جنھیں صرف تذکیر و تانیث، واحد اور جمع، روزمرہ اور محاورہ وغیرہ کی چند غلطیاں ڈھونڈ نکالنے کے بعد فیض کے اشعار کی ساری معنوی سحرکاری اور باطنی گیرائی ہیچ نظر آتی ہے کیونکہ ایسے لوگ قابلِ معافی ہیں، ان میں سے بعض زبان کے تخلیقی استعمال اور اظہار کے پر پیچ آہنگ سے واقف ہی نہیں ہیں لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ اکثر ناقدوں نے بہت سے عیوب گنا لینے کے بعد بھی فیض کے ہنر سینہ کاوی کی داد دی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ پڑھنے والے کس بات سے متاثر ہوتے ہیں اور فیض کی غزلوں یا نظموں میں انھیں کیا ملتا ہے؟ کچھ خاص خیالات؟ خاص طرزِ اظہار؟ خاص قسم کے اشارات اور علامات؟ کوئی ایسا نیا پن جو متوجہ کرتا ہے؟ کوئی ایسی جذباتی فضا جو ہم آہنگی کے دائرے میں [illegible] جو ہم خیالی اور ہم سفری کا احساس پیدا کرتی ہے؟ یہ باتیں بھی ہو سکتی ہیں اور ایسی ادبی ا[illegible] وہ ہیں کہیں کہیں بہت [illegible] حت پر ترجیح دی گئی ہے۔

پیدا کرکے آسودگی بخشتی ہیں۔ میرا خیال ہے یہ ساری باتیں مل کر کیف اور ذوق کا سامان فراہم کرتی ہیں۔ لیکن کوئی اسی سطحی ایک ہی بات پاکر مطمئن ہو جاتا ہے کیونکہ شاعری کا اصل مقصد اس کے لئے وہی ہوتا ہے۔ اور دوسرا دوسری بات دیکھ کر خوش ہوتا ہے کیونکہ اس کے خیال میں شاعری کا بنیادی کام اسی بات کی تکمیل ہے جو اسے پسند ہے۔ اس طرح ذوق کی انفرادیت، شاعری کے اصل مقصد کے مطابق ادبی اور تنقیدی نقطۂ نظر اور شاعر کی ذات سے نجی تعلق کی بنیاد پر پسندیدگی اور عدم پسندیدگی کا معیار قائم ہو جاتا ہے۔ اسے محض ذوق کے ابتدائی نقوش سمجھنا درست نہیں کیونکہ اکثر تنقید فن کے اعلیٰ اصول بھی انھیں تعصبات کی پشت پناہی کے لئے توجیہ اور تاویل کا کام دیتے ہیں۔ بہت اعلیٰ پایہ کے تنقیدی شعور سے لیس یہ ہو جاتا ہے کہ نگاہ میں تھوڑی سی معروضیت اور فلسفیانہ پرکھ اور اصول و روایات فن کی روشنی میں اظہار اور ترسیل کی صلاحیت کو جانچنے کی قوت پیدا ہو جاتی ہے ورنہ اسی سے تعصبات اور تاویلات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے (فیض کے مطالعہ کے سلسلہ میں بھی بات وہی ہے فرق صرف یہ ہے کہ پڑھنے والے کو اتنی جہات سے متاثر کرتے ہیں کہ اس کے تعصبات کا دائرہ بالکل تنگ ہو جاتا ہے۔ اگر وہ ان کی ایک بات کو ناپسند کرتا ہے تو دوسری بات کو پسند کرتا ہے، اگر ایک خیال سے اختلاف ہوتا ہے تو دوسرا اپنے ذہن اور دل کی آواز معلوم ہونے لگتا ہے، اگر کہیں کوئی ادبی یا لسانی سقم نظر آتا ہے تو وہ ایسی خوب صورت ترکیبیں سامنے پیش کر جاتی ہیں جن سے کسی غلطی کا وزن بہت کم ہو جاتا ہے۔ اس طرح فیض کی پسندیدگی کا دائرہ وسیع ہوتا رہتا ہے اور ان کا شعور فن شعر و ادب سے مختلف قسم کے معاملات کرنے والوں کو بیک وقت متوجہ اور متاثر کرتا ہے۔)

ویسے تو کسی شاعر کو عام طور سے پسند کرنے میں متعدد منفی اور مثبت اثرات کی کارفرمائی ہوتی ہے اور ذوق کی اضافیت پسندیدگی کے مدارج قائم کر سکتی ہے لیکن کچھ باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کا وجود ذوق اور فکر کی مختلف سطحوں کو یکساں طور پر بھی ہو سکتی ہیں۔ ہموار کرتا ہے اور کچھ ایسی بنیادی قدریں پیش نگاہ کر دیتا ہے جن سے احساس جمال اور احساس سود و زیاں دونوں کی تسکین ہوتی ہے (میرے خیال میں فیض کی شاعری یہی صورت فراہم کرتی ہے۔ اس لئے مختلف الخیال نقاد اور قاری انھیں شاعرانہ اور فکری دونوں حیثیتوں سے کہیں اپنے سے قریب پاتے ہیں۔ انفرادیت سے جنم لینے کے باوجود یہ وہ خاص قسم کی آفاقیت اور ہمہ گیری ہے جو فن اور زندگی کے بنیادی تقاضوں کو سمجھنے سے وجود میں آتی ہے۔ فن کے تقاضے روایت اور بغاوت، کلاسیکیت اور رومانیت، طرز اظہار کا نفس مضمون اور نئے پن کی آمیزش چاہتے ہیں۔ اور زندگی کے تقاضے انفرادیت اور اجتماعیت، ہنگامی انقلابات اور دائمی انسانی اقدار، حقائق اور خواب، آزادی اور ضبط و نظم کے درمیان ایسا توازن چاہتے ہیں جو انسانی اور تہذیبی اقدار کو درہم برہم نہ کر دے اور اگر کسے بھی تو اس عہد جدید کا مظہر بن کر جو بہتری اور برتری کی جانب رہنمائی کرتا ہے۔ فیض کی شاعری کے ہیئت اور مواد میں آفاقیت کے یہی عناصر ہیں اور یہ مختصر مضمون انھیں کی نشاندہی کی کوشش ہے)

فیض ہی کا نہیں ہر شاعر کا مطالعہ کرنے والا سب سے پہلے یہ جاننا چاہتا ہے کہ وہ جب شعر پڑھ رہا ہو تو اسے شعری ملیں۔ ایسے شعر جو محض الفاظ کا ذخیرہ نہ ہوں، محض عروض کی واقف کاری سے وجود میں نہ آگئے ہوں، محض مترنم مصرعے یا بامعنی بول نہ ہوں بلکہ احساس ... ترسیل کرتے ہوں جو شاعر اور قاری کے درمیان کوئی داخلی (اور اسی کے اندر سے ہو کر خارجی) رشتہ اور قوی اور جتنے زیادہ لوگوں سے ہوگا۔ شاعر اتنا ہی ہر دلعزیز ہوگا۔ فیض کی شاعری انھیں حیثیتوں سے دیکھی جائے جس میں اگر خود بیشتر یہ پاتے ہیں تو انگریزی رومانی شاعری کا اثر نمایاں ہے یا اردو کی غزل

فیض کی انفرادیت

پروفیسر سید احتشام حسین

ہم آہنگی سے پیدا ہونے والے تاثر کا جادو اپنا کام کرتا رہتا ہے اور قاری
سرائی کا انداز پیدا ہوگیا ہے، اُن کا مختصر مجموعہ قبول کرلیتا ہے۔ ان کے کلام پر وہی شخص غیر متاثر رہ سکتا ہے جو شاعری
حیرت انگیز مثال پیش کرتا ہے) یہ ریاض، عشق سے کے تجربوں کو محض تجربہ ہونے کی حیثیت سے اولیت دیتا ہے، جو ان تمام
دیباچہ میں ہے۔ اس کے بعض حصے اس لئے نقل کر دیتا ہوں کہ یہ تے ہیں۔

"آج سے کچھ برس پہلے دیہ الفاظ آتے ہیں دہ زندگی کے تمام مظاہر کو اس کی پیچیدگیوں کے ہوں گے، ایک معین جذبے کے زیر اثر اشعار خود بخود وارد ہونے لگتے ہیں، جو انفرادی طور پر اس کے تجسس کرنا پڑتا ہے، علاوہ ازیں ان نوجوانی کے تجربات کی جڑیں بہت گہری نہیں ہوتیں اپنے قارئین کو ہر تجربہ زندگی کے بقیہ نظام سے الگ کیا جا سکتا ہے اور ایک کیمیاوی مرکب کی طرح اس کی ہر ہیئت مطالعہ کی جا سکتی ہے۔ اس منفرد اور معین تجربے کے لئے کوئی موزوں پیرایۂ بیان وضع یا اختیار کرلینا بھی آسان ہے لیکن اب یہ تمام عمل مشکل بھی دکھائی دیتا ہے اور بے کار بھی۔ اول تو تجربات ایسے خلط ملط ہو گئے ہیں کہ انہیں علیحدہ علیحدہ ٹکڑوں میں تقسیم کرنا مشکل ہے پھر ان کی پیچیدگی کو دیانت داری سے ادا کرنے کے لئے کوئی تسلی بخش پیرایۂ بیان نہیں ملتا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ تجربات کا قصور نہیں، شاعر کے ذہن کا عجز ہے، ایک کامل اور قادر الکلام شاعری طبیعت ان مشکلات کو آسانی سے سر کرلیتی ہے، اسے یا اظہار کے نئے اسالیب ہاتھ آجاتے ہیں یا وہ پرانے اسالیب کو کھینچ تان کر اپنے مطالب پر موزوں کرلیتی ہے۔ لیکن ایسے شعراء کی تعداد بہت محدود ہے۔ ہم میں سے بیشتر کی شاعری کسی داخلی یا خارجی محرک کی دست نگر رہتی ہے اور اگر ان محرکات کی شدت میں کمی واقع ہو جائے یا ان کے اظہار کے لئے کوئی سہل راستہ پیش نظر نہ ہو تو یا تجربات کو مسخ کرنا پڑتا ہے یا طریق اظہار کو۔ ذوق اور مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ ایسی صورت حالات پیدا ہونے سے پہلے شاعر کو جو کچھ کہنا ہو کہہ چکے، اہل محفل کا شکریہ ادا کرے اور اجازت چاہے۔

.... پہلے حصے میں طالب علمی کے زمانے کی نظمیں ہیں، انہیں حذف نہ کرنے کی ...
.... نفسیاتی وجہ یہ ہے کہ ان نظموں میں جس کیفیت کی ترجمانی کی گئی ہے وہ اپنی سطحیت کے باوجود عالمگیر ہے۔ ایک خاص عمر میں ہر کوئی یہی کچھ محسوس کرتا ہے اور اسی انداز سے سوچتا ہے لیکن عام طور سے ان تجربات کا خلوص تمام عمر قائم نہیں رہتا۔ کچھ عرصے کے بعد انسان اپنی ذات کو مرکز دو عالم سمجھنا چھوڑ دیتا ہے اور اسے عالمگیر ظلم اور بے انصافی کے پیش نظر اپنی ذراذراسی ناکامیاں بے حقیقت دکھائی دینے لگتی ہیں۔ اب اسے تجربات کی نئی تراکیب اور اظہار کے نئے فارمولے تلاش کرنے پڑتے ہیں اور یہی وہ وقت ہے جس کی طرف میں پہلے اشارہ کرچکا ہوں .... ان نظموں میں میں نے روایتی اسالیب سے غیر ضروری انحراف مناسب نہیں سمجھا، بحور میں کہیں کہیں بہت ہلکا سا تصرف ہے۔ اور قوافی میں دو ایک جگہ صوتی مناسبت کو لفظی صحت پر ترجیح دی گئی ہے۔

دوسری نظم جسے شاید کچھ لوگ غزلِ مسلسل کہیں یہ ہے۔

یک بیک شورشِ فغاں کی طرح　　　　فصلِ گل آئی امتحاں کی طرح

صحنِ گلشن میں بہرِ مشتاقاں　　　　ہر روش کھنچ گئی کماں کی طرح
پھر لہو سے ہر ایک کاسۂ داغ　　　　پُر ہوا جامِ ارغواں کی طرح
یاد آیا جنونِ گم گشتہ　　　　بے طلب قرضِ دوستاں کی طرح

جانے کس پر ہو مہرباں قاتل　　　　بے سبب مرگِ ناگہاں کی طرح
ہر صدا پر لگے ہیں کان یہاں　　　　دل سنبھالے رہو زباں کی طرح

جو شخص اردو شاعری کی روایات، اشاریت اور بلیغ ایمائیت سے کچھ بھی واقفیت رکھتا ہے وہ بڑی آسانی سے یہ سمجھ لے گا کہ پہلی نظم دوسری نظم سے مختلف ہے۔ وضاحت کے طور پر پہلی کو عشقیہ اور دوسری کو سیاسی کہا جا سکتا ہے، دونوں کے محرکات بالکل مختلف ہیں، دونوں کی دنیائیں الگ الگ ہیں۔ یہی ہونا بھی چاہیے تھا، ایک کا موضوع خالصتاً داخلی ہے، دوسرے کا قطعاً خارجی۔ لیکن فیض نے کیا کیا ہے؟ پہلی نظم کے لمحۂ حال کو ماضی اور مستقبل میں اس طرح پھیلا یا ہے کہ تجربے کی بکھری ہوئی کڑیاں خیال کے ایک لمحہ میں مرکوز ہو گئی ہیں۔ ایک ایسے لمحے میں جو ابھی وجود میں نہیں آیا ہے لیکن جسے شاعر کی قوتِ تخئیل نے موجود کر دیا ہے شاید یہ ہر محبت کرنے والے کی داستان ہے جس میں واقعات کے خارجی عمل سے وہ داخلیت جنم لیتی ہے جو پورے وجود کا احاطہ کر لیتی ہے۔ علامات اور استعارات کی بلاغت نے ایک دنیا کی تخلیق کی ہے جس میں گذرے ہوئے وصل اور فرقت کے مناظر بھی ہیں اور وقفے بھی جن میں کھو کر یہ مناظر سائے اور سراب کی شکل اختیار کر گئے ہیں (فیض کا ذاتی تجربہ محبت کا آفاقی تجربہ ہے۔ اور یہی ہونے کے باوجود وسیع المعنی اشعاروں میں بیان ہوا ہے اس لئے اظہار کی انفرادیت میں بھی جامعیت اور آفاقیت ہے۔)

دوسری نظم وقت کی شاہراہ پر صرف دو منزلوں یعنی ماضی اور حال کا سفر کرتی ہے۔ دیکھنے میں مختصر ہے لیکن درحقیقت اسی کے اندر کئی جگ بیت جاتے ہیں جن میں تجربوں کے بہت سے نقش بنے اور مٹے ہیں۔ یہ بھی انفرادی تجربوں ہی کی کہانی ہے۔ داخلی کم اور خارجی زیادہ، لیکن سب شعور اور فن کی بھٹی میں پگھل کر ایک عظیم الشان نقش میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ اس کہانی کو پھیلا یا جائے تو ایک داستان بن سکتی ہے جس کا نتیجہ ابھی مستقبل میں ہے۔ مختصراً کچھ یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایک دیوانہ شوق جس نے ماضی میں بڑی آشفتہ سری دکھائی تھی، بہت سے زخم کھائے اور بہت سے داغوں کا سودا کیا تھا ——— آج پھر اچانک فصلِ گل کی آمد محسوس کر رہا ہے۔ گذرے زمانے میں اس کے بہت سے ساتھی تھے اور سب مل کر خونوں کی شراب پی لیا کرتے تھے۔ آج وہ اپنی خاصی تنہائی محسوس کر رہا ہے۔ فصلِ گل کا جو دام بچھایا جا رہا ہے یا جس کا وہ مشتاق ہے اس کے حاصل کرنے کے لئے پھر اسی جنونِ گم گشتہ کی ضرورت ہے۔ طریقِ کار کیا ہو، ہمارے قاتلوں (یا صرف ایک قاتل) سے کس طرح نمٹا جائے، یہ بات واضح نہیں ہے کیونکہ قاتل مطلق العنان اور خود مختار ہے اس کی محبت اور مہربانی بھی جان لیوا ہو سکتی ہے

(باقی صفحہ ۳۱۴ پر)

پروفیسر آل احمد سرور

فیض

نقشِ فریادی سے زندان نامہ تک

رابرٹ فراسٹ نے اپنی ایک نظم میں بڑے پتے کی بات کہی ہے: "میرا اور دنیا کا جھگڑا دو پریمیوں کا جھگڑا ہے"۔ شاعر زندگی سے محبت کرتا ہے اور کبھی کبھی زندگی کے ایک بلند تصور کی خاطر اس کے کسی ادنیٰ اور رسمی تصور سے لڑتا ہے۔ شاعر کے خواب محض خیالی دنیا کی پرچھائیاں نہیں ہوتے۔ ان میں ایک گہری اور تابندہ حقیقت کی کرن ہوتی ہے۔ اس کرن کی خاطر وہ ظلمات سے ہی نہیں سورج سے بھی لڑنے کو تیار ہوتا ہے۔ زندگی کی بصیرت اور ایک درد مند دل، یہی شاعر کی دولت ہیں۔ یہ بصیرت فطرت سے ملتی ہے مگر اس پر جلا زندگی کے سوز و ساز اور درد و داغ سے ہوتی ہے۔ میر نے خوب کہا ہے ؎

اے آہوانِ کعبہ نہ اینڈو حرم کے گرد
کھاؤ کسی کا تیر کسی کا شکار ہو

کعبے کی فضیلت آہوانِ کعبہ سے نہیں بلکہ ان سے ہے جو اس کے زخم خوردہ ہیں۔ جنھیں زندگی اور اس کے حسن سے محبت ہے۔ وہ ہر بدصورتی، تاریکی، سنگدلی، پستی اور بے انصافی سے برسرِ پیکار ہوتے ہیں۔ ایک تو حسن کے ترانے گا کر وہ کم بینوں کو نظر، پتھر کو دل، اور دل کو گداز عطا کرتے ہیں۔ ان میں ذوقِ جمال بیدار کرتے ہیں۔ ان کو تناسب، توازن، رعنائیت اور ترتیب و تہذیب سے آشنا کرتے ہیں۔ ان کی روحانی پیاس بجھاتے ہیں۔ دوسرے ان کے سہارے انھیں خود غرضی، جنگ جوئی، نفرت، حسد، بے حسی اور جہالت کے خلاف نبرد آزما کرتے ہیں۔ شاعر کے نغمے سے بھی لطف اندوز ہوتے ہیں۔ مگر سرورِ مے میں نالۂ نے، نغمے میں تلخی اور تبسم میں زہر کی کائنات پر لوگوں کی نظر نہیں جاتی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک یونانی دیوتا کے ناسور سے سب عاجز تھے، مگر اس کی قادر اندازی کی وجہ سے اس سے بے نیاز بھی نہیں رہ سکتے تھے۔ اس لئے شاعر کے نغموں پر سر دھننے والوں کو اس کے دل کے داغوں کی بھی جستجو کرنی چاہئے۔ اس کے بغیر وہ ان داغوں کے چراغاں سے پوری طرح لطف اندوز ہو سکتے ہیں اور نہ اس چراغاں کی اہمیت کا صحیح معنوں میں انہیں حق پہونچتا ہے۔ اپنے زخموں سے دوسروں کے دلوں میں پھول کھلانا اور اپنے داغوں سے عالم میں چراغاں کرنا شاعر کا زندگی پر بہت بڑا احسان ہے۔

فیض ہمارے ایسے ہی شاعروں میں سے ہیں جنھیں زندگی اور اس کے ہزار شیوہ حسن سے محبت ہے اور اس محبت کی وجہ سے ان کو اور زندگی کا جھگڑا بھی چلا جاتا ہے۔ فیض کو آتش خانوں کی مقدس آنچ ملی ہے مگر اس نے انہیں جھلسایا نہیں بلکہ

ان کی شخصیت کو توانائی اور ان کی شاعری کو تب و تاب عطا کی ہے۔ فیض نے فن پیکری پر اکتفا نہیں کیا۔ اسے ہوا کے رخ گزرے
دیکھا یا دور اس سے ایک شے کا کام لیا ہے۔ انہوں نے ایک طرف مشرقی اور مغربی ادب کے خزانوں سے فیض اٹھایا اور حسن کاری کے
کتنے ہی اسلوب اور عبارت و اشارت اور ادا کے کتنے ہی ڈھنگ جذب کئے۔ دوسری طرف انہوں نے ہر وادیٔ خیال کو طے
کرنے اور جگر کی طرح یہ کہنے پر قناعت نہیں کی ہے کہ

فکر منزل ہے نہ ہوش جادۂ منزل مجھے
جا رہا ہوں جس طرف لے جا رہا ہے دل مجھے

بلکہ آگہی سے عشق کیا اور منزل اور جادۂ منزل کے عرفان کی بھی سعی کی۔ دوسرے الفاظ میں فیض محض واردات قلب کے شاعر نہیں
ہیں۔ ان کا کمال یہ ہے کہ زندگی کے ایک سنجیدہ شعور کی توانائی میں واردات قلب کی گرمی و گداز پیدا کرتے ہیں۔ آئی اے رچرڈس
کے نزدیک شاعرانہ حقیقت مادی حقیقت سے الگ اپنا ایک وجود رکھتی ہے۔ اقبال نے یہ ثابت کر دیا کہ جب شاعر مادی
حقائق سے غذا حاصل کرے تو اس کی توانائی کس درجے کی ہوتی ہے۔ فیض کے یہاں یہ توانائی حسن بن گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ
ایک ضرب کلیمی سے پتھر کے سینے سے طوفان جاری ہو جاتا تھا۔ فیض نے زندگی کی صداقتوں سے جو نغمگی حاصل کی ہے وہ جدید شاعری
میں اپنی مثال آپ ہے۔ مجاز کی طرح اور مجاز سے بہتر طور پر انقلاب کے نغمے فیض نے گائے ہیں۔

یہ نغمگی فیض میں کہاں سے آئی؟ زندگی کے عرفان سے، ادب اور انسانیت پر ایمان سے، ایک بہتر زندگی کے جہاد میں
تن من دھن سے حصہ لینے سے، اپنے خوابوں کی خاطر سستے [illegible] سے نبرد آزما ہونے سے، حسن کے ادا شناس ہونے کی وجہ سے،
پھر ایک کنجوس کی طرح اپنے علم کی دولت کی حفاظت کے بجائے اسے لٹانے اور کھلانے لگانے کی آرزو کی وجہ سے، اچھے مقاصد
کی لگن اور سعی پیہم کی حرارت سے، ستانے اور تھک کر بیٹھ جانے کے بجائے گرم طلب رہنے سے۔

اس سے ان کی شاعری میں رجائیت، زندگی پر اعتماد اور قوت شفا آئی۔ میں شاعر کی بصیرت کو مانتا ہوں، مگر
فراسٹ کی طرح اس شاعری کا قائل ہوں جو پہلے مسرت اور پھر بصیرت عطا کرے۔ محض بصیرت کی دعوت میں کشش نہیں ہوتی۔ ہاں
مسرت کی تلاش عام ہے۔ جو مسرت کو بصیرت بھی عطا کر دے وہی سچا شاعر ہے۔ آگ ڈھونڈنے والوں کو پیمبری بھی مل جائے تو کیا
کہنا۔ فیض کی حسن کاری، اس کی شیرینی، اس کی نغمگی ہمیں سلاتی نہیں، جھنجھوڑتی بھی نہیں، یہ بڑی سادہ دلکار ہے۔ یہ چپکے چپکے
ہمیں ایک خاموش عزم عطا کرتی ہے۔ یہ ہمیں زندگی سے محبت کرنا سکھاتی ہے اور اس محبت کو ایک فضیلت اور اس کی خاطر جہاد کو
ایک عبادت سمجھنے کا ولولہ دیتی ہے۔

پھر فیض کی لے میں بڑی کشش ہے۔ اس میں ہماری پرانی شاعری کی رچی ہوئی کیفیت نہیں، مگر ایک نیا رچاؤ ہے جس
میں انگریزی ادب کے ایک خوش گوار اثر، جدید انسان کے ذہن اور ایشیائی تہذیب کے قابل قدر عناصر کی ایک قوس قزح
جلوہ گر ہے۔ فیض کی شاعری DIRECT کم، OBLIQUE زیادہ ہے۔ وہ صراحت کے نہیں رمز کے شاعر ہیں،
مگر اس کے باوجود ان کا ذہن اتنا مرتب اور فنی شعور اس قدر تربیت یافتہ ہے کہ وہ نہایت واضح طور پر اپنی بات کہہ دیتے ہیں
اس میں کوئی شک نہیں کہ فیض اپنا ایک الگ اسلوب رکھتے ہیں جس میں کتنے ہی اردو اور انگریزی شعراء کی گونج سنائی دیتی
ہے مگر آواز ان کی اپنی ہے۔

"نقش فریادی" میں فیض ایک نظم گو کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ تنہائی، موضوعِ سخن، چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز، رقیب سے، کتے، یہ نظمیں اس مجموعے کی شکل متعین کرتی ہیں، مگر "دستِ صبا" میں فیض نے دونوں کا ایک پاکیزہ اور قابلِ قدر معیار پیش کیا ہے۔ صبحِ آزادی کے موضوع پر ہمارے کئی شاعروں نے نظمیں کہیں مگر فیض کی یہ خوبصورت نظم اپنی بھرپور اور شعریت کی وجہ سے سب سے منفرد ہے۔ پھر دو عشق، شیشوں کا مسیحا، زنداں کی ایک صبح، یاد کے علاوہ اس مجموعے میں کئی ایسی غزلیں بھی ہیں جو حدیثِ دلبری کو صحیفۂ کائنات بنا دیتی ہیں۔ اس سے یہ حقیقت اور بھی آئینہ ہو جاتی ہے کہ غزل اور نظم کا جھگڑا لیے کا ہے، شاعری اور داستان سرائی دونوں میں حسن ہے۔ ؎

تلوار کاٹتی ہے مگر ہاتھ چاہیے

زنداں نامہ بھی پچھلے دونوں مجموعوں کی طرح مختصر ہے لیکن دستِ صبا سے زیادہ بھرپور ہے۔ اس مجموعے کی نظمیں اور غزلیں سب فیض کی اسیری کی یادگار ہیں۔ اس اسیری نے فیض کو نہ مایوس کیا نہ جھنجھلاہٹ۔ اس غم خانے میں فیض نے انسانیت اور تہذیب حسن اور عشق کی شمع روشن رکھی۔ دونوں نے زندگی کی حسین نعمتوں، لطیف یادوں، پرکیف لذتوں کو دھندلا اور کمزور نہیں کیا بلکہ انہیں خواب و خیال کا ایک ہالہ دے کر اور حسین اور دل آویز بنا دیا۔

"ملاقات" کا درد اور اس درد کی لذت دیکھئے ؎

یہ رات اس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے
مگر اسی رات کے شجر سے
یہ چند لمحوں کے زرد پتے
گرے ہیں اور تیرے گیسوؤں میں
الجھ کے گلنار ہو گئے ہیں
اسی کی شبنم سے خامشی کے
یہ چند قطرے، تری جبیں پر
برس کے، ہیرے پرو گئے ہیں

"اے روشنیوں کے شہر" میں زنداں کے گھر کی دیوار فیض کو اس طرح لبھاتی ہے ؎

شب خوں سے منہ پھیر نہ جائے ارمانوں کی رو
خیر ہو تیری لیلاؤں کی، ان سب سے کہہ دو
آج کی شب جب دیئے جلائیں اونچی رکھیں لو

مگر اس مجموعے کی جان دو نظمیں ہیں۔ ایک "دریچہ" اور دوسری "ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے"۔ "دریچہ" چھوٹی نظم ہے اس لئے یہاں نقل کی جا سکتی ہے ؎

گڑی ہیں کتنی صلیبیں مرے دریچے میں

ہر ایک اپنے مسیحا کے خوں کا رنگ لیے
ہر ایک وصلِ خداوند کی اُمنگ لیے
کسی پہ کرتے ہیں ابرِ بہار کو قرباں
کسی پہ قتل مہِ تابناک کرتے ہیں
کسی پہ ہوتی ہے سرمست شاخسارِ دونیم
کسی پہ بادِ صبا کو ہلاک کرتے ہیں
ہر آسمانِ دل پہ خداوندگانِ مہر و جمال
سو ہیں غرق مرے غم کدے میں آتے ہیں
[illegible] مرے شہروں کے سینے [illegible]
شہید جسم سلامت اُٹھائے جاتے ہیں

(زنداں کی سلاخوں سے صلیب کا استعارہ، خدا گرنا، حسن، نیکی، تہذیب، انسانیت کا دورِ حاضر کی مجرمانہ ذہنیت کے ہاتھوں صلیب پر چڑھایا جانا اور تاہم انسانیت کا ان زخموں کے باوجود زندہ و تابندہ رہنا۔ اس نظم میں بڑی خوبصورتی اور بلاغت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ یہ نظم فیض کی تازہ کاری اور للہ کاری کا بہت اچھا ثبوت ہے۔)

"ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے" دراصل ایتھل اور جولیس روزن برگ کی یاد میں لکھی گئی ہے۔ ساری دنیا میں اس المیہ کا تذکرہ ہوا اور تمام انصاف پسندوں نے امریکہ کے برسرِاقتدار طبقے کی انتقامانہ ذہنیت اور شقاوتِ قلب کو محسوس کیا۔ فیض نے اس المیہ کو زندگی کی پیاس اور ولولے کا ایک رجز بنا دیا ہے اور نظم پڑھ کر بے ساختہ مظہر جانِ جاناں کا یہ شعر یاد آجاتا ہے ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

نظم اس طرح شروع ہوتی ہے ؎

تیرے ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت میں ہم
دار کی خشک ٹہنی پہ وارے گئے
تیرے ہاتھوں کی شمعوں کی حسرت میں ہم
نیم تاریک راہوں میں مارے گئے

ان عاشقانِ پاک طینت کا عزم دیکھئے ؎

جب گھلی تیری راہوں میں شامِ ستم
ہم چلے آئے لائے جہاں تک قدم
لب پہ حرفِ غزل، دل میں قندیلِ غم

پروفیسر آل احمد سرور

اپنے غم کی گواہی ترے حسن کی
دیکھ قائم رہے اس گواہی پہ ہم
ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

فیض کی اس نظم میں دو تین باتیں قابلِ توجہ ہیں۔ اول تو ان عشاق کے منصب کی بلندی کا احساس، دوسرے ان کے کارنامے کا حسن کارانہ تجزیہ —— جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہنگامی واقعات سے شعر نہیں بنتا، اُن کے لئے یہ نظم بہت اچھا جواب ہے ہاں ہنگامی واقعات میں ابدی صداقت دیکھنے والی نظر درکار ہے۔

"زنداں نامہ" کی غزلیں "دستِ صبا" کی طرح بھرپور جاندار نہیں ہیں لیکن ان میں بھی ایسے اشعار ملتے ہیں۔

خیالِ یار کبھی ذکرِ یار کرتے رہے
اسی متاع پہ ہم روزگار کرتے رہے
انہیں کے فیض سے بازارِ عقل روشن ہے
جو گاہ گاہ جنوں اختیار کرتے رہے

دل ناامید تو نہیں، ناکام ہی تو ہے
لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے
دستِ فلک میں گردشِ تقدیر تو نہیں
دستِ فلک میں گردشِ ایام ہی تو ہے

کچھ محتسبوں کی خلوت میں کچھ واعظ کے گھر جاتی ہے
ہم بادہ کشوں کے حصے کی اب جام میں کم تر جاتی ہے
ہاں جاں کے زیاں کی ہم کو بھی تشویش ہے لیکن کیا کیجے
ہر رہ جو ادھر کو جاتی ہے مقتل سے گزر کر جاتی ہے

شوق والوں کی حزیں محفلِ شب میں اب بھی
آمدِ صبح کی صورت ترا نام آتا ہے

وہ جو اب چاکِ گریباں بھی نہیں کرتے ہیں
دیکھنے والو کبھی اُن کا جگر تو دیکھو
دامنِ درد کو گلزار بنا رکھا ہے
آؤ اِک دن دلِ پُرخوں کا ہنر تو دیکھو

شمع نظر، خیال کے انجم، جگر کے داغ
جتنے چراغ ہیں تری محفل سے آئے ہیں
اٹھ کر تو آ گئے ہیں تری بزم سے مگر
کچھ دل ہی جانتا ہے کہ کس دل سے آئے ہیں

تیرے دستِ ستم کا عجز نہیں
دل ہی کافر تھا جس نے آہ نہ کی

• زنداں نامہ ہمارے اس باشعور اور صاحبِ طرز شاعر کی روداد اسیری ہی نہیں، عہدِ حاضر کی اس زخمی روح کی پرسوز اور پرکار لے بھی ہے جس کے اثر سے زندگی کا حسن کچھ اور نکھر جاتا ہے، اور انسانیت اور تہذیب پر ایمان کچھ اور تازہ ہو جاتا ہے۔

فیض کی انفرادیت

(صفحہ ۲۰۸ سے آگے)

اس کی آزردگی بے سبب وقت اور انصاف کی پابند نہیں، نہ جانے اس کے جاسوس اسے کیا خبر دیں اور کس طرح دیں۔ ایسی کڑی نگرانی ہے کہ زبان تو زبان دل کے دھڑکنے کی صدا بھی وہاں تک پہونچا دی جاتی ہے، بڑی ہوشیاری، بڑی سوجھ بوجھ اور بڑے ضبط سے کام لینے کی ضرورت ہے ۔۔۔ یہ کس کی داستان ہے اور کس عہد کی یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے قفس کے در پر کئی بار آہٹ ہوئی مگر در نہیں کھلا سحر کی روشنی کئی بار دکھائی دی لیکن اُجالا داغ داغ تھا، پھر بھی وہ دارفتہ شوق فصل گل کا منتظر ہے۔ فیض نے یہی کہانی بارہ مصرعوں میں کہی ہے اور کیسی بلیغ اشاریت کے ساتھ، کیسی ایمائی ندرت کے ساتھ۔ لفظوں میں وہ توانائی ہے جسے جوہری کہہ سکتے ہیں، اظہار میں وہ انفرادیت ہے جس کے اندر سے فیض کا شعور بول رہا ہے۔ باہر کی دنیا اور دل کی دنیا میں مکمل ہم آہنگی ہے اور تغزل نے اس میں ایسی نشتریت پیدا کر دی ہے کہ ہر نصل گل کا تمنائی اس کی چبھن محسوس کر سکتا ہے (یہی فیض کا فن ہے اور یہی ان کا شعور، یہی ان کے کلام کی انفرادیت ہے اور یہی آفاقیت۔ یہ شاعری کسی کی نقل نہیں ہے، یہ شعورِ حیات و شعورِ ذات کا نتیجہ ہے، یہ طرزِ اظہار تخلیقی کرب سے وجود میں آیا ہے۔ یہاں اظہار کو خیال سے الگ کرنا پھول سے اس کی خوشبو اور رنگ کو الگ کرنا ہوگا۔

(فیض نے اپنے انسان دوست خیالات، زندگی میں ناانصافی اور عدم توازن کے خلاف اپنے صحت مند ردِ عمل اور انفرادی تجربات کو ایسے حسین شعری پیکر میں پیش کیا ہے کہ جو لوگ ان کے نصب العین کے مخالف ہیں وہ بھی آسانی سے اس کے اثر اور جادو کی گرفت سے باہر نہیں نکل سکیں گے۔)

ممتاز حسین

دلِ پرخوں کا ہنر تو دیکھو

شبنم بہ گل و لالہ نہ خالی ز ادا ہے
داغِ دلِ بے درد نظرگاہِ حیا ہے

فیض جب بھی محفل میں آتے تو کوئی ایک چھوٹی سی کتاب، ایک قطعہ، کسی نامکمل غزل کے چند اشعار کچھ دق نثر اور کچھ معذرت کی باتیں لے کر آتے لیکن ہر بار کا مبارک آئے۔ دوست دشمن نے سر ہلایا۔ یا دوستوں میں چرچا ہوا۔ کچھ نوک ٹوک کتاب پھینک بھی دی۔ اس میں لکھا ہی کیا ہے۔ اجنبی خاک نے دھندلا دئے قدموں کے سراغ ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم۔ لیکن جب کسی نازک سی کسک نے چٹکی لی اور دل کی شمعیں لرزاں ہوئیں۔ تو پھر وہی فیض کو گنگنانے لگے۔ پھر کوئی آیا دل زار نہیں کوئی نہیں، آؤ کہ مرگِ سوزِ محبت منائیں ہم، اپنے اجداد کی میراث سے معذور ہیں ہم، چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی، جب ملے جلے جذبات ہیں کیسی ایسی شگفتگی اور سادگی جو سودا کو بھی نہ ملی ہو کبھی ایسی افسردگی کہ غالب کو بھی اس حد تک آئے۔ تس پر امید کا یہ عالم سید تیغ رانی کا سینہ بھی منور ہو جائے۔ ان ساری چیزوں کو گھلا کر وہ کیونکر اپنے کلام میں پیش کرنے میں اس کو سمجھنے کے لئے ان کے دو ای خصوصیت سے غور کرنا ضرورت ہے۔

غالب نے کہیں لکھا ہے کہ جب سے یہ ہے یہ ناسور بند ہو گیا ہے میں نے شعر لکھنا بند کر دیا ہے۔ ناسور کا بند ہو جانا عجب ہے۔ شاعر آدمی نہ ہوا اچھا خاصا مریض ٹھہرا لیکن اسے کیا کیا جائے کہ اس کے لئے کسی نہ کسی ناسور کا ہونا ضروری ہے ورنہ خونِ جگر کی تراوش کہاں سے ہوتی۔ کسی بڑے شاعر کے یہاں وہ ناسور صرف اپنی حرماں نصیبی کا نہیں ہوتا۔ اس کے یہاں وہ ناسور اپنی اکائی کے خول سے نکل کر دوسروں کے دکھ درد کو اپنانے یا پھر کسی ایسی ناآسودگی کا ہوتا ہے جسے انگریزی زبان میں ازلی ناآسودگی کہتے ہیں۔ فیض کے یہاں اس حد تک یہ ناسور ابتدا ہی سے تھا۔ کچھ دنوں کم کم رستا رہا لیکن حالات کے بدلنے کے باعث اب کچھ زیادہ رس رہا ہے۔ لیکن تنہا یہی ایک شے فیض کے فن کی وضاحت نہیں کرتی۔ فیض کی شخصیت میں لذت احساس اور احساسِ لذت دونوں ہی قوی ہیں۔ اگر مصرعے کی تشکیل میں کچھ سوز کچھ ساز، کچھ برادشت کی رنگ و بو نہ ہو تو وہ مصرع فیض

کے جی تو نہیں لگتا ہے۔ یوں تو یہ حوصلہ ہر شاعر رکھتا ہے لیکن کچھ لوگ اس معاملے میں اس قدر آورد سے کام لیتے ہیں کہ معدوم اثر صرف صنعت رہ جاتی ہے۔ فیض کا کلام اس قسم کے آورد سے پاک ہے۔ وہ بسا اوقات تشبیہ سے زیادہ استعارے سے زیادہ کسی ایک صنعت کی اضافت اپنا کام نکال لیتے ہیں۔ یہیں پر وہ غالب کے فن سے زیادہ قریب ہیں۔ بے خواب کواڑوں، بے خواب ستاروں، ترسی ہوئی بے سود بے صرفگی میں اور بعض اوقات تو وہ صنعت مقلوب یعنی معکوس سے بھی کام لیتے ہیں۔ اور یہ بڑا خوبصورت استعمال کرتے ہیں۔ نہ دل سا دھڑکتا ہوا امید کا ہنگام، وہ کبھی کبھی مختلف امیج یعنی احساساتی تصویروں کو کسی ایک امیج میں اس طرح سمو دیتے ہیں کہ جو بات دو چار مصرعوں میں کہی جانے کی ہوتی ہے وہ ایک ہی مصرع میں ادا ہو جاتی ہے۔

پھر نظر میں پھول مہکے دل میں پھر شمعیں جلیں
پھر تصور نے لیا اس بزم میں جانے کا نام

ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ فیض کے انداز بیان میں اردو شاعری کا وہ مخصوص کلچر بھی ہے جس کی پرداخت دلی کے شعرا نے کی تھی۔

ہے خبر گرم کہ پھرتا ہے گریزاں ناصح
گفتگو آج سرِ کوئے نگاراں ٹھہری ہے

زبان کا یہ لطف دستِ صبا میں زیادہ نکھر آیا ہے۔ شاید اس لئے کہ دورِ اسیری میں فیض نے اساتذہ کے کلام سے خوب دل بہلایا ہے۔ لفظوں کے حسنِ انتخاب اور احساساتی تصویروں کے حسنِ آرائش کے ساتھ ساتھ ان کے کلام میں ایک حسن غنائیت یا لیریزم کا بھی ہے۔

شاعری اور موسیقی کا ساتھ چولی دامن کا ہے۔ کیونکہ شعر کے پہچاننے کی ایک شرط آہنگ بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ بحروں کا تعین اور ردیف وقافیے کی پابندی، یہ ساری باتیں شعر کے آہنگ ہی سے اخذ کی گئی ہے۔ لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ لازمی طور سے یہ سامان موسیقی کسی کلام کو نغمے کی لذت سے آشنا نہیں کرتے۔ وہ لذت بنیادی حیثیت سے احساسات کی لرزش پر گنگنانے سے پیدا ہوتی ہے اس سے یہ نتیجہ بھی نکالا جا سکتا ہے کہ الفاظ اپنی شعری سامانی کا اکتساب زیادہ تر احساسات کے تلازمات سے کرتے ہیں نہ کہ آواز محض سے۔ فیض کی شاعری میں غنائیت اسی نسبت سے ہے نہ کہ اس نسبت سے کہ وہ لفظوں کے اصوات کو ان کی معنویت پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس کا کھلا ہوا ثبوت یہ ہے کہ اظہارِ جذبہ کی ضرورت کے تحت وہ اپنی ایک ہی نظم میں موسیقی کا پیٹرن بدلتے رہتے ہیں۔ نثار میں تیری گلیوں پہ اے وطن کہ جہاں، اس نظم میں انہوں نے اس کے مختلف بندوں میں موسیقی کا مختلف پیٹرن استعمال کیا ہے کہیں ردیف اور قافیے دونوں کی پابندی ہے تو کہیں صرف ردیف کی پابندی ہے اور کہیں ان دونوں سے گلوخلاصی ہے۔ آہنگ کے اس تنوع کے باوجود جسے ایک ہی نظم میں از روئے روایت مستحسن نہیں سمجھا جاتا۔ اس نظم کی نغمگی میں کوئی عیب پیدا نہیں ہو پایا ہے فیض کے کلام میں موسیقیت اسی انداز کی ہے۔ کہیں تند و تیز تو کہیں مدھم اور ہلکی سی۔ (۱۹۵۴ء)

حافظ کی غزلوں کے جس حسن نے ایک عالم کو لوٹ لیا اور اہل یورپ کو متحیر کر دیا وہ اس بات میں پوشیدہ ہے کہ حافظ کے یہاں مشاہدۂ حق مشاہدۂ خلق سے متحد ہے۔ حق خلق میں ہے نہ کہ خلق سے باہر۔ خلق حق کا خارجی پیکر ہے اور حق خلق کی اندرونی حقیقت۔ خلق نہ تو حق کا عکس ہے اور نہ سایہ بلکہ اتنا ہی حقیقی جتنا کہ حق۔ ادبی نقطۂ نظر سے یہ فلسفۂ زندگی کی تمام کیفیتوں کو طہارت

دل پُرخوں کا ہنر تو دیکھو

ممتاز حسین

اس طرح شاعر پست و بالا عرش و فرش حق و خلق کی دوئی سے آزاد ہو کر اپنے تمام محسوسات
اور تقدس کا درجہ دیتا ہے۔ اس طرح شاعر پست و بالا معرش و فرش
اور مشاہدات کو ایک ہی رشتہ وحدت میں پروتا ہے اور انہیں کسی معقولیت کے تابع کرتا ہے اس فلسفے کے تحت وہی حقیقت
سے قریب تر ہے جو عرفانی زندگی ہے نہ کہ وہ جو حقیقت کی جستجو میں ترکِ زندگی کو راہ دیتا ہے۔
ہماری شاعری نے انسان دوستی کی روایت اسی فلسفیات سے مستحکم ہوئی۔ جو اپنے ساتھ بہت سی جمہوری قدریں
کو بھی لائی ــــ مگر گزشتہ ڈیڑھ سو سال کے زمانے میں جب سے انسان نے اپنی تقدیر کے بدلنے کا گر سیکھا ہے اس انسان
دوستی نے مجاہدانہ انسان دوستی کا روپ اختیار کر لیا ہے اور اس کی جمہوری اقدار میں بھی بڑی وسعت پیدا ہوئی ہیں پہلے چونکہ ظالم کے گریبان تک
پہنچنے کی کوئی اجتماعی صورت نہ تھی اس لئے مظلوم کا ہاتھ اپنے ہی گریبان پر پڑتا تھا۔ قہر درویش بجان درویش تھا لیکن آج
وہ صورت حال نہیں۔ آج ظالم کے اقوام متحدہ الاقوامی سطح پر بھی روکا جا رہا ہے۔ یہی نہیں اس سے تاوان ظلم بھی وصول کیا جا رہا ہے
یہ چیز تبدیلی زمانہ میں آئی ہے۔ اس سے دردمندی اور انسان دوستی کی راہ بھی بدل گئی ہے۔ کل کی انسان دوستی میں مقہور انسانوں
کی خود فراموشی، نیاز مندی اور سیاسی خموشی تھی۔ آج کی انسان دوستی میں مقہور انسانوں کی خود نمائی۔ نافرمانی اور سیاسی
تکلم ہے۔ اس سے زندگی کی اخلاقیات کا محور بدل گیا ہے۔ با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا کے بجائے دوستوں کے ساتھ نرمی
اور دشمنوں کے ساتھ سختی کا اخلاقی محور پیدا ہو گیا ہے۔ فیض کی دردمندی عہدِ حاضر کی اسی حقیقت کی ترجمان ہے۔ کل تک جس
راہِ عشق میں صرف مجاہدہ نفس حکمران تھا۔ آج اس راہ میں مجاہدہ منصر ہے۔ کل تک جو سیاست امورِ جہانبانی کی چالوں تک
محدود تھی۔ آج وہ ایک اخلاقی قدر ہے اور غالباً زندگی کی سب سے بڑی اخلاقی قدر ہے۔ یہ جو تبدیلی زندگی کے اخلاقی محور
میں پیدا ہوئی ہے اس نے زندگی اور تعلقِ عالم کی طرف نئے انداز نظر پیدا کئے ہیں۔ زندہ رہنے کی آرزو آرزوئے مرگ پر غالب
آگئی ہے۔ عمل، عزلت نشینی پر غالب آگیا ہے۔ یہ نقطۂ نظر آج ہمارے جذبۂ عشق پر بھی اثر انداز رہا ہے۔ جذبۂ عشق آج بھی کار
فرما ہے اور غالباً اتنے ہی کرب و درد کے ساتھ مگر آج وہ تکمیل شخصیت کے بہت سے دوسرے تقاضوں کے ساتھ مل کر اظہار پا رہا ہے
اور چونکہ تکمیل شخصیت کی راہ میں سیاست ہر قدم پر حائل ہے اس لئے جذبۂ عشق آج سیاسی جذبے کے ساتھ متحد ہو گیا ہے عشق
بے نیاز سیاست آج بے معنی ہے۔ انہی معنوں میں فیض کے یہاں جذبۂ عشق اس کے سیاسی جذبے سے متحد ہو گیا ہے اور وہ اس
حد تک متحد ہو گیا ہے کہ انہوں نے اس کی ساری کیفیات کو سیاسی جذبے کی کیفیات میں منتقل کر دی ہیں۔
دکھ سکھ کے نغمے خواہ وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی کب اور کس نے نہیں گائے ہیں۔ پھر بھی وہ نئے سے نئے معلوم ہوتے ہیں
بشر طیکہ ان کی تخلیق میں اس عہد کے دکھ سکھ کی انفرادیت کا بھی اظہار ہو۔ فیض کی شاعری نے جو ہمیں اس قدر زیادہ مسحور کر رکھا
ہے۔ اس میں جہاں اس عنصر کو دخل ہے وہاں اس بات کو بھی دخل ہے کہ اس کے اظہارِ غم، لذت کشیِ چشم و گوش، انبساطِ دیدہ و دل
اور آشوب آگہی میں جدید ذہن اور جدید کلچر کی جلوہ آرائیاں بھی ہیں۔ فیض کی شاعری لطافتِ غم سے کچھ کم ہم کنار نہیں ہر کلام، ہر قدم پر غم ہے گر محرومی
جاوید کی صورت میں نہیں بلکہ ناکامئ عمل کی صورت ــــ

وست فلک میں گردشِ تقدیر تو نہیں
دستِ فلک میں گردشِ ایام ہی تو ہے

شاعر نے گردشِ تقدیر کو گردشِ ایام کے تخالف میں رکھ کر یہ واضح کر دیا ہے کہ وہ حسن رندئے سحر یا یارِ خوش خصال کے

دیدار کی بشارت دیتا ہے ؎

آخر تو ایک روز کرے گی نظر وفا
وہ یارِ خوش خصال سرِ بام ہی تو ہے

اس کا دیدار صرف گردشِ ایام ہی کا رہینِ منت نہیں ہوگا بلکہ ہمارے اپنے عمل کا بھی۔
فیض کی یہ رجائیت مجہول نہیں کہ ع

ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا۔

بلکہ حرکی اور انقلابی ہے۔ یہی سبب ہے کہ کبھی کبھی جب وہ اپنے ہم سفروں کی سست رفتاری سے اکتا سا جاتا ہے اور سیاہیٔ شب کا دامن اسے چاک ہوتا ہوا نظر نہیں آتا ہے تو وہ ان کا رجز خواں بھی بن جاتا ہے۔

لاؤ سلگاؤ کوئی جوشِ غضب کا انگار۔

مگر چونکہ ان کا یہ عمل اضطراری ہوتا ہے اسلئے ایسی نظموں میں وہ حسن نہیں ملتا ہے جو ان کے اپنے رنگ کی نظموں اور غزلوں میں ملتا ہے اس رنگ میں تو ان کا کوئی بھی حریف اس وقت نہیں ہے ؎

گرمیٔ شوقِ نظارہ کا اثر تو دیکھو
گل کھلے جاتے ہیں وہ سایۂ در تو دیکھو
ایسے ناداں بھی نہ تھے جاں سے گذرنے والے
ناصحو، پندگرو، راہ گزر تو دیکھو
وہ تو وہ ہے تمہیں ہو جائے گی الفت مجھ سے
ایک نظر تم مرا محبوبِ نظر تو دیکھو
دامنِ درد کو گلزار بنا رکھا ہے
آؤ اک دن دلِ پُرخوں کا ہنر تو دیکھو
صبح کی طرح جھمکتا ہے شبِ غم کا افق
فیض تابندگیٔ دیدۂ تر تو دیکھو

فیض کی یہ دلآرام رجائیت جو اس کے دیدۂ تر سے جھانکتی ہے اور شبِ ہجر کی مانگ ستاروں سے بھر دیتی ہے اس کے سیاسی شعور کی غماز ہے نہ کہ کوئی واہمہ یا فریبِ خوردگیٔ آرزو ہے۔ تکرارِ سحر اس یقین کی آواز ہے جس کی بنیاد مشرق کے انقلابات نے چنی ہے جبھی تو اس کا یہ دعویٰ ہے ؎ چاند کو گل کریں تو ہم جانیں

اور وہ اپنے اس یقین کو غم سے کریم تر جانتا ہے کیونکہ سحر بہرحال شب سے عظیم تر ہے۔ فیض کی یہ رجائیت اگر ایک طرف شبِ غم کی سنگینیاں اٹھائے ہوئے ہے تو دوسری طرف دلیلِ سحر سے روشن بھی ہے۔ فیض کی اس حقیقت نگاری کے آستانے پر رومان اور حقیقت دونوں ہی کے پجاریوں نے سجدے کئے ہیں کیونکہ اس کے یہاں حق اور حسن متحد ہیں۔ اس کی حسن شناس نگاہیں حقیقت نگر ہیں اور ایسی حقیقت نگر کہ وہ اس بات کو بھی محسوس کرتا ہے کہ لوہا اور جنگ میں کچھ میل نہیں ہے لئے دست

وہ جنھیں پرستش تھا کہ حسنِ دلآرا کی یہی وجہ ہی فیض کی نسبت آرزو ہے وہ آلودگیں یہ سربلند مجاہد حیات کیونکہ مقامات دار و رسن سے گزرا ہے۔ (۱۹۵۵ء)

فیض نے اپنی شاعری کا آغاز (غالباً طالب علمی کے زمانے میں) ۱۹۲۹ء کے اس عالمگیر اقتصادی بحران کے جبر میں کیا جس نے پورے یورپ میں بائیں بازو کی ادبی تحریک کو جنم دیا۔ اس ادبی تحریک کا اثر یہاں کے ادیبوں نے بھی قبول کیا لیکن صرف اس اثر کی بنا پر یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ ۱۹۳۶ء کی ترقی پسند تحریک تمام تر یورپی اثرات کی رہینِ منت ہے۔ اس تحریک کو جنم دینے میں جہاں تک کہ اس کے ادبی روپ کا تعلق ہے حالی اور اقبال کی شعری روایت کو بھی دخل ہے۔ یہاں اس کا موقع نہیں کہ اس روایت کی تاریخ بیان کروں۔ لیکن فیض کی شاعری کے ادبی پس منظر کو سمجھنے کے لیے کچھ ذکر ضروری ہے۔

حالی کی جدید شاعری کا بیان (دلکش) نہیں ہے۔ براہ راست تھا۔ ابتدائی بیشتر معنی اور اس خوش مذاقی پر مبنی تھا جسے انگریزی میں کامن سنس کہتے ہیں۔ کبھی کبھی انہوں نے اپنے اخلاقی تصورات کی ترسیل میں اس شوخ طبع فیضی کو بھی جگہ دی ہے جو تشبیہات سے کھیلتی ہے اور اس طرح گرانی پند و وعظ کو سفید بنا لیا۔ لیکن ان کی شاعری میں اس کا استعمال اس قدر کم ہے کہ اس کا ذکر ان کی جدید شاعری کی تفہیم میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا ہے۔ مجموعی حیثیت سے ان کی جدید شاعری معقولاتی تجزیہ اور اخلاقی تعلیم کی ہے۔ اس میں احساسات اور تخیل کی زبان نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے واقعیت اور اخلاقیات کی تصوراتی تعلیم پر اس قدر زیادہ زور دیا کہ ان کی جدید شاعری سے شعریت کا تقریباً ازالہ ہو گیا۔

حالی کی یہ جدید شاعری اس عہدِ مصلحت اندیشی اور مدافعت کی پروردہ تھی جو حقائق سے سمجھوتہ کرنے ہی میں زندگی کی راہ صواب دیکھتی۔ لیکن جب آزادی کی جدوجہد ہند و پاک کی تاریخ میں آگے بڑھی اور اس نے انیسویں صدی کے اس سمجھوتے کو رد کر دیا اور اس کی جگہ ایک باغیانہ جذبہ نوجوانوں کے دلوں کو گرمانے لگا تو شاعری جو جذبے کی سطح پر پروان چڑھتی ہے پھر لوٹ آئی اور اب کی بار اس نے اس رومانی بغاوت کا آغاز کیا جس کا مذہبی روپ اقبال کی شاعری میں اجاگر ہوا اور غیر مذہبی روپ جوش اور اختر شیرانی کی شاعری میں۔

اس رومانی بغاوت کے ادب میں محبت کے جذبے نے ایک انقلابی اہمیت اختیار کر لی۔ اس دور میں محبت کا جذبہ تمام تر جنسی جذبہ نہ رہا بلکہ حسن پرستی یا وطن پرستی کا بھی ایک جذبہ بن گیا۔

اسی رومانی شاعری کے پس منظر میں فیض نے اپنے ابتدائی دور کی عشقیہ نظمیں لکھیں اور وہ افسونِ محبت ان میں اس قدر زیادہ رچ بس گیا تھا کہ اگر بائیں بازو کی تحریک نے انہیں متاثر نہ کیا ہوتا تو وہ اسی کے ہو کر رہ جاتے۔ بہرحال فیض کو یہ دریافت کرنے میں دیر نہ لگی کہ وہ

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

یہیں سے فیض کی شاعری حقیقت نگاری کا موڑ اختیار کرتی ہے، لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجے۔ لیکن فیض کی یہ حقیقت نگاری، اشتراکی تحریک کی پروردہ ہے۔ یہ محنت کش طبقے کی جانب داری اور اشتراکی نقطۂ نظر کی حامل ہے۔ فیض نے اسی اشتراکی انسان دوستی کے درد کو اپنایا جو وطن کی آزادی کو اس کے حصول کا ایک لازمی ذریعہ تصور کرتی ہے لیکن اس کے اظہار میں انہوں

نے نہ تو حالی کے اندازِ بیان کو اپنایا جو راست گفتاری کا تھا اور نہ رومانوی شعراء کے اس اندازِ بیان کو جس میں وفورِ جذبہ،
کثرتِ الفاظ اور مبالغہ ہے۔ اس کے برعکس انہوں نے نظم و ضبط، عدم مبالغہ اور ایجاز سے کام لے کر بیان میں گہرائی اور تہہ داری پیدا کی اور خارجی
حقیقت کو تخیل اور احساس کی مدد سے داخلی حقیقت میں تبدیل کر کے پیش کیا۔ فیض کی شاعری میں اثرِ خواب کم ہے بلکہ
اوقات وہ بیداری ہے لیکن یہیں پر کوئی فکر و خیال نہیں ملتا ہے ان کا ہر خیال جذبے میں تحلیل ہو کر کسی نہ کسی محسوس صورت
میں نمودار ہوتا ہے۔ اشتراکی حقیقت نگاری کے ادب میں ان کا یہ اسلوب جو سمبالزم کا ہے بالکل منفرد ہے۔ فیض کی
سمبالزم فرانس کے انحطاطی شعراء کی سمبالزم سے مختلف ہے۔ میں سمبل کے لئے علامت کا لفظ اس لئے استعمال نہیں کرتا ہوں
کہ علامت [illegible] کا ترجمہ ہے نہ کہ سمبل کا۔ فیض کے سمبل بھی نوعیت کے نہیں ہیں ورنہ وہ اس قدیم طرز کے ہوتے جس کا
استعمال تمثیل نگاری میں مجرد تصورات کی نمائندگی کے لئے کیا جاتا۔ اس کے برعکس وہ مجسم ([illegible]) کی زبان میں
گفتگو کرتے ہیں اور نئی جگہ پر علامتوں کی اہمیت رکھتے ہیں۔ بالفاظ دیگر وہ استعاروں سے زیادہ قریب ہیں۔

فیض کی شاعری کا حسن اس ایک شے پر ختم نہیں ہوتا ہے۔ ہمارے ترقی پسند شعراء کا کلام عمل کی تعلیم اور ترغیب
سے بھرا پڑا ہے لیکن ان سے قبل فیض کوئی بھی ایسا شاعر نہیں آتا ہے جس نے جذبۂ عمل کو اس اندرونی کرب کے
ساتھ پیش کیا ہو جو عمل سے پہلے کسی ذہن کو اپنی گرفت میں لیتا ہے۔ ہر وہ جنگ جو باہر لڑی جاتی ہے اس کا ایک ریہرسل
دل و دماغ کی دنیا میں ہو چکتا ہے جہاں وہ خوف و دہشت، مسرت و الم کے خون کی کتنی لڑائیاں ذہن کی رزمگاہ میں لڑی جا چکی ہیں تب کہیں
جا کر کوئی قدم انسان اٹھاتا ہے۔ شاعر وہی ہے جو عمل کو اس کے اس اندرونی کرب کے ساتھ پیش کرے ورنہ تصورات کا ذکر
وہ صرف نعرہ لگا کر رہ جاتا ہے۔

فیض کی کوئی بھی ایسی نظم لے لیجئے جس میں کوئی تمہیدِ عمل ہے۔ "چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی" اس میں وہ
اندرونی کرب ضرور ملے گا۔ "چلے جو یار تو دامن پہ کتنے ہاتھ پڑے"

لیکن جب بحیثیت مجموعی ان کے کلام پر ہم نظر ڈالتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ان کی شاعری سیاسی دکھ کی
ہے نہ کہ سیاسی اقدام کی۔ اور اس سلسلے میں ان کی تکنیک مظلوم کو کسی عدالت میں پیش کر کے اس کی وکالت کرنے کی نہیں ہے
بلکہ خود ہی فریادی بن جانے کی ہے۔ شیلی اور کیٹس دونوں ہی اس خیال کے حامی تھے کہ شاعر میں اپنے کو کائنات کی اشیاء
کے ساتھ متحد کرنے کی ایسی بے پناہ قوت ہوتی ہے کہ اگر یہ کہا جائے کہ اس کی کوئی اپنی شخصیت ہوتی ہی نہیں تو بے جا نہ ہوگا
فیض میں یہ صلاحیت بھرپور طور پر ہے اور یہ اسی فنی صلاحیت کا فیض ہے کہ وہ ایک ایسی نظم لکھ گئے جس پر ہماری زبان ہمیشہ
فخر کرتی رہے گی۔

"ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے" یہ نظم ان کی اس صلاحیت کی شاہکار تخلیق ہے اور اپنے حسنِ بیان میں
امر ہے۔ لیکن فیض اپنے اس فریادی کے روپ میں نہ تو روتے دھوتے ہیں اور نہ دوسروں کے احساسِ رحم کو ابھارتے ہیں
اس کے برعکس نہایت ثابت قدمی کے ساتھ سنگینوں کی چھاؤں میں یہ گنگناتے ہوئے رہ نوردی کرتے جاتے ہیں

ظلم کا زہر گھولنے والے
کامراں ہو سکیں گے آج نہ کل

(باقی صفحہ ۲۹۸ پر)

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

فیض کا فنِ شاعری

دست صبا کے شروع میں فیض نے ابتدائیہ کے عنوان سے ایک نہایت مختصر دیباچہ لکھا ہے۔ جس میں شاعر اور شاعری کے بارے میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت یوں کی ہے ——

"یوں کہیے کہ شاعر کا کام محض مشاہدہ ہی نہیں، مجاہدہ بھی اس پر فرض ہے گرد و پیش کے مضطرب قطروں میں زندگی کے اجزا کا مشاہدہ اس کی بینائی پر ہے اسے دوسروں کو دکھانا، اس کی فنی دسترس پر، اس کے بہاؤ میں دخل انداز ہونا اس کے شوق کی صلابت اور لہو کی حرارت پر"

آگے چل کر اس کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے "نظام زندگی کسی حوض کا ٹھہرا ہوا ہنگ بستہ مقید پانی نہیں ہے۔ جسے تماشائی کی ایک غلط انداز نگاہ احاطہ کر سکے، وہ دور دراز اور دشوار گذار پہاڑیوں میں برفیں پگھلتی ہیں، چشمے ابلتے ہیں، ندی نالے پتھروں کو چیر کر چٹانوں کو کاٹ کر آپس میں ہمکنار ہوتے ہیں۔ اور پھر یہ پانی گھٹتا بڑھتا گھاٹیوں وادیوں جنگلوں اور میدانوں میں سمٹتا اور پھیلتا چلا جاتا ہے۔ جس دیدۂ بینا نے ہم زندگی کے یہ نقوش دراصل نہیں دیکھے اس نے جزو کو کیا دیکھا ہے —— پھر شاعر کی نگاہ ان گذشتہ اور حالیہ مقامات تک پہونچ بھی گئی، لیکن اس کی منظر کشی میں نطق و لب نے یاوری نہ کی یا اگلی منزل تک پہونچنے کے لئے جسم و جان جہد و طلب پر راضی نہ ہوئے تو بھی شاعر اپنے فن سے پوری طرح سرخرو نہیں ہے"

اپنے اس نقطۂ نظر کا خلاصہ فیض ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

"مجھے کہنا صرف یہ تھا کہ حیات انسانی کی اجتماعی جدوجہد کا ادراک اور اس جدوجہد میں حسب توفیق شرکت زندگی کا تقاضا ہی نہیں فن کا بھی تقاضا ہے —— فن اسی زندگی کا ایک جزو اور فنی جدوجہد اسی جدوجہد کا ایک پہلو ہے ——"

اس نقطۂ نظر کی وضاحت کے لئے فیض کے کلام کا جائزہ لینے سے پہلے میں فیض کی ایک اور تحریر کا ذکر کرنا چاہتا ہوں "شاعر کی قدریں" کے عنوان سے "سویرا" میں فیض نے جو مضمون لکھا ہے، اس کے بعض اقتباسات یہ ہیں ؟۔

"جمالیاتی فرحت آپ جب ہی محسوس کریں گے جب حسن کا کوئی مظہر آپ کو متاثر کرے، جمالیاتی تاثر بھی آخر تاثر کی ایک صورت ہے، ظاہر ہے کہ اس تاثیر میں ایک جذباتی عنصر لازمی ہے، لیکن یہ تاثر جامع اور تسلی بخش جب ہی ہوتا ہے جب اس سے دل اور

بہرحال اس نقطۂ نظر میں جو تبدیلیاں یا ارتقا ہوا ہے اور اس کی تشریح و تفصیل میں جتنا کچھ لکھا گیا ہے اس کے لیے ایک نیا دفتر درکار ہے۔ میں یہاں نہایت اختصار کے ساتھ اس بحث کے صرف چند پہلو پیش کرنے پر اکتفا کروں گا ـــــــ

فن کیا ہے؟ فن دراصل اور بنیادی طور پر اظہار کا نام ہے۔ اس اظہار کا موضوع زندگی اور کائنات ہے اور اس کے مظاہر بے شمار ہیں، کہیں حرف و صوت، کہیں رنگ و خط، کہیں رقص و حرکت اسی اظہار کا ذریعہ بنتے ہیں۔ شاعر اور موسیقار، مصور اور مجسمہ ساز، رقاص اور اداکار ان ہی مختلف ذرائع اور وسائل سے زندگی اور کائنات کا اظہار کرتے ہیں۔ زندگی اور کائنات خود انہیں ذرائع سے اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہے اور اس اعتبار سے زندگی خود بڑی فنکار ہے اور فطرت سب سے بڑی ماہر فن۔ لیونارڈو ڈاونچی کا مونالیزا بلاشبہ مصوری کا شاہکار ہے لیکن خود مونالیزا فطرت کا حسین شاہکار ہے جس کے ذریعے سے فطرت نے اپنے حسن و جمال کا اظہار کیا ہے۔ اس اظہار یا فن کا سرچشمہ احساس یا جذبہ ہے۔ جتنا احساس یا جذبہ شدید ہوگا، اتنا ہی یہ اظہار یا فن زیادہ واضح اور موثر ہوگا اور اس اظہار یا فن کا مقصد ایک طرف وہ جمالیاتی فرحت ہے جو خود فنکار محسوس کرتا ہے اور دوسری طرف وہ تاثر ہے جو اس اظہار کے ذریعے فنکار دوسروں میں پیدا کرتا ہے، اور انہیں بھی اس جمالیاتی فرحت میں حصہ لینے کا موقع دیتا ہے ـــ جو اسے اپنے احساس جذبے یا تجربے سے حاصل ہوتا ہے۔ اس منزل پر پہنچ کر فن کی دنیا میں موضوع فن اور فنکار کے علاوہ ایک تیسری ذات بھی شامل ہو جاتی ہے یعنی فن کے مخاطب کی ذات۔ یہ قاری، سامع اور ناظر بھی تخلیق فن میں ایک تقاضا بن کر داخل ہوتے ہیں اور یہیں سے فن محض اظہار کی جگہ اظہار اور ابلاغ کا مجموعہ بن جاتا ہے۔ احساس یا جذبہ اور جمالیاتی فرحت اپنی پہلی منزل میں انفرادی یا ذاتی ہوتی ہے لیکن یہاں پہنچ کر اسے بعض اجتماعی تقاضوں کو بھی پورا کرنا پڑتا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ذاتی اور انفرادی احساس یا جذبہ اور جمالیاتی فرحت خود فنکار کی شخصیت اور زندگی کی طرح ایک اجتماعی سرچشمے سے پیدا ہوتی ہے۔ فنکار کا شعور، اس کا احساس، اس کی جمالیاتی اقدار اور تصورات، وہ سانچے، ذرائع اور وسائل جو وہ اس احساس یا جذبے کے لیے اختیار کرتا ہے، صدیوں کی اجتماعی کوششوں کا نتیجہ ہوتے ہیں اور اس کے ہر تجربے اور خیال کا سلسلہ دور ماضی کے دھندلکوں تک پہنچا ہوا ہوتا ہے۔ جس طرح اس کا جسم، اس کا لباس، وضع قطع وراثت کے مرہون منت ہوتے ہیں اس کا شعور اور احساس بھی ماضی کی روایت کے سلسلے کی ایک کڑی ہوتے ہیں۔ لیکن انفرادی یا اجتماعی زندگی سیدھی سادی اکائی نہیں اور کوئی جذبہ یا احساس اکیلا اور تنہا پیدا نہیں ہوتا۔ شعور اور تحت شعور میں جذبات، احساسات، کیفیات، تصورات، افکار اور مقاصد کی ایک رو ہر وقت رواں دواں رہتی ہے۔ خاص حالات، خاص لمحات اور خاص اسباب کی بنا پر ان میں سے کوئی جذبہ یا احساس یا کیفیت زیادہ شدت اختیار کر لیتا ہے اور دریا کی بیتاب موج کی طرح سطح سے بلند ہو جاتا ہے۔ اس بلندی کا انحصار اور اس کا قیام اور ثبات جذبہ کی شدت پر منحصر ہے، اور اس کی اہمیت کا دارومدار اس سلسلے پر ہے جس کی یہ صرف ایک کڑی ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ زندگی جو فن کا موضوع ہے اپنی تمام وسعتوں کے ساتھ اس موضوع میں شامل ہے۔ اگر فن میں زندگی کی محض سطحی، معمولی یا وقتی لہریں شامل ہیں تو فن بھی سطحی اور معمولی ہوگا، لیکن یہ موجیں اگر زندگی کی گہرائیوں سے اٹھیں اور ان میں اس طوفان کی کچھ جھلک ہو جو زندگی کے سمندر میں سطح سے نیچے سینے میں موجزن ہیں تو فن کی اہمیت، شدت اور اثر انگیزی میں اضافہ ہو جائے گا ـــــــ لیکن زندگی اور کائنات محض اظہار نہیں چاہتی، آگے بڑھنا اور ترقی کرنا بھی چاہتی ہے۔ اس لیے فن اور فنکار کا کام محض تعبیر حیات نہیں تعمیر حیات بھی ہے۔ یہ تخلیق ایک عمل مسلسل اور ایک جہاد پیہم ہے۔ زندگی کے الجھے ہوئے گیسوؤں کا سنوارنا، کائنات کی پیشانی پر سے رنج و الم، افسردگی اور پامالی کی شکنوں کو دور کر کے مسرت اور شادمانی کے نور سے چمکانا، اور فنکار

کا مقصد ہے جسے دوسرے لفظوں میں فن کی افادیت سے تعبیر کر سکتے ہیں ۔۔۔ یہ جہاد بڑی ہمت اور حوصلہ چاہتا ہے۔ فنکار کے خونِ جگر کی تلاش ہوتی ہے۔ اور اس بلبل کی طرح جس نے ایک نوخیز کلی کے قریب ایک کانٹے کو اپنے سینے میں پیوست کر لیا تھا اور رات بھر ہر لحظہ وہ اس کانٹے کو اپنے دل سے قریب اور قریب تر کرتی رہتا کہ صبح کو کھلنے والے گلاب کا سرخ پھول پوری طرح شاداب ہو جائے۔ یہاں تک کہ صبح کی پہلی کرن ایک شاداب گلاب پر پڑتی ہے جس کی سرخی اور شگفتگی قرد و دس بدامن ہوتی ہے اور جس کے قریب بلبل کا مردہ جسم پڑا ہوتا ہے۔ جس کا سارا خون گلاب میں منتقل ہو چکا ہے ۔۔۔ بالکل اسی طرح فنکار جسے کا رنگ تخلیق کرتا ہے۔ لوح و قلم کے عنوان سے فیض نے اسے یوں ادا کیا ہے ۔۔۔

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے
ہے خانۂ سلامت ہے تو ہم سرخیِ مے سے
تزئینِ در و بامِ حرم کرتے رہیں گے
باقی ہے لہو دل میں تو ہر اشک سے پیدا
رنگِ لب و رخسارِ صنم کرتے رہیں گے

"دستِ صبا" میں اس انداز کے اشعار بار بار آتے ہیں ۔۔۔

ہمیں سے سنتِ منصور و قیس زندہ ہے
ہمیں سے باقی ہے گل دامنی و کجکلہی

اور وہ پوری غزل جو نذرِ سودا ہے جس میں یہ اشعار بھی ہیں ۔۔۔

یوں بہار آئی ہے امسال کہ گلشن میں صبا
پوچھتی ہے گزر اس بار کروں یا نہ کروں
گو یا اس سوچ میں ہے دل میں لہو بھر کے گلاب
دامن و جیب کو گلنار کروں یا نہ کروں

ایسی مثالیں دستِ صبا میں بکثرت اور نقشِ فریادی میں بھی جابجا ملتی ہیں۔ انھیں پڑھ کر یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ فیض کے فن شاعری کا مقصد جسم اور روح دونوں کی آزادی ہے اور یہاں آزادی کا مفہوم محض آزادی کا اعلان یا آزادی کا منشور اور دستور نہیں بلکہ اسی حقیقی آزادی جہاں انفرادی اور اجتماعی طور پر فنکاروں کو خود بخود حاصل یا تفرحت کے حصول اور رنگ و بو تک اس کا بلاغ کا ماحول اور مواقع میسر ہوں یہی وجہ ہے کہ برطانوی سامراج دستوری طور پر ختم ہوا لیکن حقیقی آزادی کی منزل فیض کو اب بھی بہت دور معلوم ہوتی ہے ۔۔۔

چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

صرف ایک مصرع نہیں فیض کی تمام شاعری کی آواز ہے۔ لیکن انقلاب کے نعرے لگانا اور بات ہے اور اس کے لئے دار و رسن قبول کرنا اور بات ہے اور نعرہ لگانے والے خود اپنے نعروں کی حقیقت سے آشنا نہیں ہوتے، اور فنکار یہ جانتا

جبکہ اس انقلاب کے لئے خلوص اور عمل دونوں کی ضرورت ہے ہماری نام نہاد انقلابی شاعری کا بڑا حصہ انقلاب کا نعرہ ہے انقلاب نہیں —— اس میں ہیجان اور طمطراق ہے۔ خلوص کی شدت اور اثر آفرینی نہیں۔ یہاں میں شاعری کے صنم کدے کے ان بڑے بڑے بتوں کا نام لینا نہیں چاہتا جنھیں انقلابی شاعری کا نقیب اور پیغمبر بتایا جاتا ہے لیکن جو خلوص اور عمل سے محروم ہیں فیض کی آواز ان سے مختلف ہے وہ صرف ایک نعرہ نہیں ایک دعوت ہے۔ اس میں ہاہمی کی جگہ ٹھہراؤ اور دھیما پن ہے الفاظ کی گھن گرج کی بجائے اس کی سادگی میں ایک شکوہ اور عظمت ہے

کسی مقصد کے حصول کے لئے فن کو آلۂ کار بنانے میں دو پہلو قابلِ غور ہوتے ہیں۔ ایک فن کا موضوع دوسرے اس کا اسلوب بیان۔ مقصد کا تعین خود بخود فن کے موضوع کا تعین کر دیتا ہے۔ لیکن اگر اس مقصد سے فنکار کا رشتہ ذہنی رکھے تو پھر ایک مرتب اس کا فن خلوص سے محروم رہ جاتا ہے یہاں پہنچ کر مقصد اور فنکار کی زندگی میں مکمل اور غیر مشروط ہم آہنگی کا پیدا ہونا ضروری ہے۔ یہ مقصد اس کے ظاہر و باطن اس کے قول و عمل اس کے فکری اور جذباتی شعور سب پر حاوی ہو جائے۔ جب ہی فنکار تخلیق فن کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔ فیض کے بارے میں یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ تخلیق فن کے تقاضوں سے پوری طرح عہدہ برآ ہوئے ہیں۔

لیکن محض کسی اعلیٰ مقصد کا تعین اس کے حصول کے لئے خلوص اور جذبہ۔ وجدان سے اپنی پوری زندگی پر محیط کر لینا ہی تخلیق فن کے لئے کافی نہیں۔ فن اظہار بھی اس کے لئے ضروری ہے اسی سے فنکار کی انفرادی حیثیت اور اہمیت کا تعین ہوتا ہے۔ ایک ظاہر ہے کہ شاعر کے لئے اس اظہار کا وسیلہ تو بہت شاعری ہے اور شاعری کے انھی سانچوں کے ذریعے سے وہ اپنے افکار و خیالات، احساسات و جذبات دوسروں تک منتقل کر سکتا ہے۔ یہ سانچہ جس قدر زیادہ واضح اور مکمل ہوگا اور اس کی ظاہری ہیئت، اسلوب اور تکنیک سے جس حد تک مقصد کے حصول کے ساتھ ساتھ جمالیاتی فرحت حاصل ہوگی اتنا ہی اعلیٰ فن کا نمونہ اور مظہر ہوگا۔ شاعری کا یہ سانچہ کچھ تو ہمیں وراثت میں ملا ہے جس میں وزن ردیف قافیہ صوتی آہنگ، تشبیہ، استعارہ اور کنایہ شامل ہیں اور کچھ ان وسائل میں نئے تجربے اور اضافہ ہوتے ہیں۔ سانچے سے جمالیاتی فرحت کا حصول صرف اسی وقت ممکن ہے جب شاعر میں روایت اور تجربے کے اس تسلسل کا احساس ہو۔ اس نے کلاسیکی اساتذہ اور معاصرین کے کلام کا مطالعہ کیا ہو روایت کی عظمت کا بھی قائل ہو اور تجربے کی اہمیت کا بھی۔ اور ان دونوں میں ایک مناسب توازن سے ہی ایک اچھا سانچہ تیار ہو سکتا ہے۔ اس اعتبار سے اگر آپ فیض کا مقابلہ معاصرین سے کریں تو محسوس ہوگا کہ جدت پسند انتہا پسندوں کے مقابلے میں وہ کلاسیکی روایت کا حامل اور روایت پرستوں میں ترقی پسند اور انقلابی ہے۔ اس کے یہاں پرانی شاعری کی مختلف حیثیتیں اپنے تمام لوازم کے ساتھ موجود ہیں۔ اس کی غزل میں وہی طائیت، رس اور رچاؤ ہے جو میر اور مصحفی کے دور ... ہے بلکہ اس کے پہلے دور تغزل میں ہی کلاسیکی فارم آہستہ آہستہ فیض کے ہاں بھی نمایاں تر ہوتا جا رہا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اب فیض کی اہمیت میر اور مصحفی سے مختلف ہے اور ہم لوگ جو فیض کے زمانے میں ہیں ان کی ان علامتوں اور اشاروں کو پوری طرح سمجھ سکتے ہیں۔ کلاسیکی اساتذہ کی اس اہمیت پر زمانے کی دھول سے نقاب ہے جسے اٹھا کر دیکھنے سے ہی ان کی حقیقت تک رسائی ہو سکتی ہے۔ مثال کے طور پر وہ غزل دیکھیے جو نذر غالب ہے اور جس کا مطلع ہے ؎

کسی گماں پہ توقع زیادہ رکھتے ہیں　　　　پھر آج کوئے بتاں کا ارادہ رکھتے ہیں

اور یہ اشعار دیکھیے مضامین وہی ہیں جو پہلے بھی ادا ہوتے ہیں سانچہ (PATTERN) بھی وہی ہے لیکن فیض کے یہاں ان میں ایک نئی معنویت پیدا ہو گئی ہے ؎

ذکر دوزخ بیان حور و قصور　　　　بات گویا یہیں کہیں کی ہے

اشک تو کچھ بھی رنگ لا نہ سکے　　　خوں سے تر آج آستین کی ہے
کیسے مانیں حرم کے سہل پسند　　　رسم جو عاشقوں کے دین کی ہے

وصل کی شب تھی تو کس درجہ سبک گزری تھی　　　ہجر کی شب ہے تو کیا سخت گراں ٹھہری ہے
دستِ صیاد بھی عاجز ہے کفِ گلچیں بھی　　　بوئے گل ٹھہری نہ بلبل کی زباں ٹھہری ہے

روشن کہیں بہار کے امکاں ہوئے تو ہیں　　　گلشن میں چاک چند گریباں ہوئے تو ہیں
اب بھی خزاں کا راج ہے لیکن کہیں کہیں　　　گوشے چمن چمن میں غزل خواں ہوئے تو ہیں
ان میں لہو جلا ہو ہمارا کہ جان و دل　　　محفل میں کچھ چراغ فروزاں ہوئے تو ہیں
ہے دشت اب بھی دشت مگر خونِ پا سے فیض　　　سیراب چند خارِ مغیلاں ہوئے تو ہیں

فیض کے فن کے سلسلے میں اور بہت سی باتیں کہنے کے قابل ہیں لیکن وقت کی تنگی کے خیال سے میں فی الحال اس بیان کو یہیں ختم کرتا ہوں۔ حاصلِ کلام یہ ہے کہ فیض کے نزدیک فن کی اقدار میں افادیت اور جمالیاتی مسرت دونوں شامل ہیں خود فیض کی نظر میں افادیت کا تعین ایک مقصد کے تعین سے ہوتا ہے یہ مقصد افراد کی اور اجتماعی آزادی ہے جسم اور روح دونوں کی آزادی۔ فنکار کا کام اسی مقصد کے حصول کے لئے خلوص اور عمل سے راستہ تیار کرنا ہے اور اس کا انجام تاحال شبہی نہیں دارو رسن ہے اور یہی فنکار کے فن کی معراج ہے کہ وہ چاہے دشت کو گلشن نہ بنا سکے لیکن خونِ پا سے کم از کم چند خارِ مغیلاں سیراب کر سکے۔ اس لئے فیض کے فن میں انقلاب محض ایک نعرہ نہیں حقیقت ہے اور اس کا اظہار محض نعرے کی طرح نہیں ہوا ہے بلکہ اس کا ایک شاعرانہ اسلوب اور انداز ہے جسے فیض کی شاعری کا سانچہ یا PATTERN کہہ سکتے ہیں۔ اس سانچے میں روایت کے تسلسل اور عظمت کا نشان اور تجربوں کی اہمیت کا احساس ایک متوازن نئے سانچے کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فیض کی غزلوں میں کلاسیکی رچاؤ اور ان کی نظموں میں صحت مند ترقی پسندی[1] آ نا دخیالی جھلکتی ہے۔

اپرادیہ

فیض کے فن اور شاعری کے بارے میں یہ مضمون آج سے دس سال پہلے لکھا گیا تھا[1]۔ یہ دس سال ہماری قومی اور تہذیبی زندگی کے ایک نہایت اہم دور سے تعلق رکھتے ہیں، اس دور میں فیض کے دو مجموعے زنداں نامہ اور دستِ تہِ سنگ شائع ہوئے ہیں دستِ تہِ سنگ میں فیض از فیض کے عنوان سے فیض صاحب لکھتے ہیں کہ بنیادی طور پر یہ تحریریں انھیں ذہنی محسوسات اور معاملات سے منسلک ہیں جن کا سلسلہ مجھ سے پہلی سی محبت سے شروع ہوا تھا لیکن جیل خانہ عاشقی کی طرح خود ایک بنیادی تجربہ ہے جس میں فکر و نظر کا ایک آدھ نیا دریچہ خود بخود کھل جاتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ نیا ایک آدھ دریچہ کونسا ہے اور اس سے فیض نے کیا دیکھا ہے۔

نقشِ فریادی کے پڑھنے والے کو احساس ہوتا ہے کہ ان دونوں مجموعوں میں بھی فرق ہے۔ زنداں نامہ کچھ حصہ نقشِ فریادی

---

[1] یہ مقالہ "فیض کے ساتھ ایک شام" منعقدہ لاہور (نومبر ۱۹۵۵ء) میں پڑھا گیا تھا۔ (ادارہ)

کے آخری دور کا حصہ معلوم ہوتا ہے اور فیض کی شاعری کے شباب کا دور معلوم ہوتا ہے لیکن دست تہ سنگ تک پہنچتے پہنچتے فیض
کی آواز میں کچھ تھکن کے آثار پیدا ہو چلے ہیں جیل کی مدت چار سال کی مختصر مدت تھی لیکن چار سال کا یہ تجربہ بھی ایک نیا تجربہ تھا
لیکن جو بات حسرت موہانی یا مولانا محمد علی کے یہاں نظر آتی ہے وہ فیض کے یہاں نہیں دکھائی دیتی ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ اس وجہ
سے ہے کہ حسرت اور محمد علی کے یہاں زندگی اور نظریہ میں کوئی فرق نہیں اور فیض کے یہاں نظریہ زندگی پر چھایا جاتا ہے، ان دونوں
میں جو نازک امتیاز ہے، مثلاً فیض نے دست تہ سنگ کے آغاز میں اپنی ایک تقریر یا ایک تحریر شامل کی ہے۔ یہ دونوں اسکو
ہیں فیض کو لینن انعام ملنے کی تقریب سے متعلق ہیں، اس پوری تقریر میں وہی باتیں ہیں جو آپ روزانہ اخباروں میں بھی
پڑھتے ہیں یعنی امن کی تلاش اور سوویٹ فضلا کا تازہ کارنامہ لیکن مجھے اس تقریر میں فیض صاحب سے کچھ زیادہ کی توقع تھی۔
مجھے اعتراف ہے کہ میں نے روس کے بارے میں یا روسی ادیبوں کے بارے میں یا ادب کے اس نقطۂ نظر کے سلسلے میں جسے اشتراکی
کہا جاتا ہے بہت زیادہ نہیں پڑھا ہے لیکن جو پڑھ چکا ہوں اس تقریر سے اس میں کچھ بھی اضافہ نہیں ہوا شاید اس لئے کہ اب یہ
نظریہ فن پر غالب آگیا ہے۔ کسی فنکار کے ساتھ اس سے بڑا حادثہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے فن کو براہ راست یا بالواسطہ کسی نظریہ
کے لئے قربان کر دے پھر وہ سب کچھ سہی ایک فنکار کی حیثیت سے اپنے سے وابستہ توقعات کو مشکل سے پورا کر سکتا ہے۔ میں نے آج
سے کوئی بیس بائیس سال پہلے ترقی پسند شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے فیض صاحب کے بارے میں لکھا تھا کہ اپنے ہم سفر ساتھیوں
میں فیض بلاشبہ میر کارواں ہیں اور ذہنی نیز فنی اعتبار سے شاید اس پورے حلقے میں انہی کے کلام میں زندگی کے آثار زیادہ ملتے ہیں
یہ رائے میں آج بھی رکھتا ہوں اور اسی لئے جب فیض کے کلام میں مجھے ان کی آواز گھٹی گھٹی معلوم ہوتی ہے تو مجھے دکھ ہوتا ہے۔
شاعری محض نعرہ یا محض جذبہ یا محض الفاظ کی بازیگری نہیں۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے ایک مشاعرہ میں جو کسی حد تک بین الاقوامی اجتماع
کی حیثیت رکھتا تھا فیض صاحب نے "افریقہ" والی نظم سنائی۔ افریقہ کی بیداری ایشیا کی بیداری کی ایک عظیم نشانی ہے جیسے
چین کی بیداری ہے۔ اور بلاشبہ ایشیا اور افریقہ کی عظمت اور جلال کی ایک اعلیٰ علامت بھی ہے لیکن میں بڑے ادب سے عرض
کروں گا کہ پوری نظم فیض صاحب کے شایان شان مرتبہ کی نہیں۔ اب بھی فیض صاحب بہت اچھے شعر کہتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں انہیں
افریقہ اور ایشیا کی بیداری پر اس سے جاندار نظم لکھنا چاہئے تھی۔ کیا فیض صاحب تھک گئے۔ کیا زندگی کے نئے دور میں ان
کی مصروفیات کی نوعیت اب ایسی بدل چکی ہے کہ وہ خون جگر جو فن کا تقاضہ ہے وہ فیض کو کہیں اور صرف کرنا پڑتا ہے یا کہیں
ایسا تو نہیں کہ بقول فیض۔ "جیسے کبھی انہیں" فراغت ہجراں میں فکر و مطالعہ کے ساتھ عروس سخن کے ظاہری بناؤ سنگھار پر توجہ
دینے کی زیادہ مہلت ملتی تھی ___" اب ان کو اس قسم کی فراغت نصیب نہیں اور جس طرح کی فراغت اب انہیں نصیب
ہے وہ نقش فریادی کے دور کے بجائے دست تہ سنگ کی نظموں کے لئے ہی سازگار ہے۔

یہ جو کچھ میں نے کہا ہے فیض کی نظموں کے بارے میں میرا عام تاثر ہے۔ ان کی بعض نظمیں اس مجموعے میں بھی اچھی ہیں
اور غزلیں تو خاص طور پر اب بھی پرکیف ہیں۔

میرے خیال میں فیض صاحب کو ابھی غزل کے گیسو سنوارنے کا اور موقعہ ملے گا اور ان کی اس دور کی
غزلیں بھی غزل کے ایک نئے دور کی ترجمان ثابت ہوں گی

مجتبیٰ حسین

کچھ فیض کے بارے میں
اور
بہت کچھ اپنے بارے میں

۱۹۵۵ء میں ایک طویل مضمون میں جس میں مختلف شعرا اور ادبا سے بحث کی گئی تھی میں نے فیض کی شاعری سے بھی بحث کی تھی جس کے چند مختصر اقتباسات یہ ہیں۔

"ہماری جدید شاعری میں فیض کی آواز بالکل نئی تھی اور اس آواز سے اردو شاعری پہلی بار مغربی شاعری کی غنائیت ([illegible]) سے آشنا ہوئی۔ یوں تو مغربی ادب کے اثرات اردو شاعری فیض سے بہت پہلے ہی قبول کر چکی تھی مگر اردو شاعری پر تمام مغربی اثرات اور ہیئتی تجربات کے باوجود اس کا کلاسیکی مزاج غالب تھا۔ فیض کی شاعری ان تمام روایات تشبیہوں استعاروں اور علامتوں سے ہٹی ہوئی تھی جو ہماری شاعری میں نئی معنویت یا قدیم مناسبتوں کے ساتھ مستعمل تھیں۔ فیض کے لہجے کی نغمگی اور خوابناکی اردو فارسی شاعری کی نغمگی سے مختلف تھی۔"

اس کے بعد میں نے کوشش کی تھی کہ فیض کے لہجے میں جو "پراسراریت" "ماورائیت" اور خوابناکی کی تہیں ہیں ان کی توضیح کے لئے فارسی اور اردو کے ایسے اشعار پیش کروں جو موضوع کے لحاظ سے تو ضرور "پراسراریت" اور "ماورائیت" رکھتے ہیں مگر اپنے اظہار میں کوئی ابہام نہیں رکھتے۔ میں نے لکھا تھا

"ہماری شاعری موضوع سے براہ راست (Direct) گفتگو کرتی رہی ہے"۔ اس کے بعد فیض کی لہجہ کی توضیح میں لکھا تھا۔ "اس میں وہی خوابناکی وہی نغمگی وہی رمزیت ہے جو ہمیں Yeats، Eliot اور دوسرے مغربی شعراء کے یہاں ملتی ہے یہ لہجہ فارسی اور اردو شاعری کا نہیں رہا ہے۔ ہندوستان میں ٹیگور کے یہاں البتہ ملتا ہے:"

اس کے بعد میں نے Yeats، Eliot اور دوسرے مغربی شعرا کے کلام سے مثالیں پیش کر کے فیض کے لہجے کی اس خصوصیت کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ اس کے بعد فیض کی شاعری کی ایک اور خصوصیت کو سمجھاتے ہوئے لکھا تھا۔

"ان کی شاعری میں موضوع سے زیادہ وہ فضا اہم ہے جو موضوع کے تقاضوں سے پیدا ہوتی ہے فیض کے یہاں ایک رچا ہوا

اور حسین تصور (Luxury of imagination) پایا جاتا ہے انہوں نے تشبیہوں اور استعاروں کا سہارا بہت کم لیا ہے۔ ان کے لہجے کی جذباتی کشمکش ہمارے سامنے مختلف ذہنی تصویریں پیش کرتی جاتی ہے ؎

چاندنی راتوں کا بے کار دہکتا ہوا درد
ایک گہرا درد کہ جو گیت میں ڈھلتا ہی نہیں　　　دل کے تاریک شگافوں سے نکلتا ہی نہیں

شدت تاثر سے جو ذہنی تصویریں (Images) پیدا ہوتی ہیں وہ شعری تقاضوں کے ماتحت از خود ابھرتی ہیں۔ ان میں پیوند اور جوڑ نہیں معلوم ہوتا۔ . . . . . . وہ جدید شاعری میں جدید ترین آواز سے کترائے تھے اس آواز کو ہماری شاعری کی روایتوں نے اتنا نہیں اچھالا تھا جتنا سماجی پیچیدگیوں اور مغربی ادب کے رچے ہوئے تاثرات نے ——— سی شاعری میں اس نئے پن کی بنا ڈالی نہیں فیض کہا جا سکتا ہے۔ راشد نے روایات سے صرف نظر اور تکنیکی انحراف کیا ہے مغرب سے ہوا نے اتنا ہی حاصل کیا تھا جتنا ذہن نے بچا یا انہوں نے بجائے سمجھ کر الفاظ کو مسلسل شروع کیا۔ ذہنی تصویروں کے معاملے میں بھی انہوں نے مغربی ادب کی پیروی کی ہے مگر یہ پیروی بھونڈی اور ناکام ہو کر رہ گئی ہے۔ ان کی ذہنی تصویریں جذبات میں ڈھلنے کے بجائے خیال بندی سے مل گئی ہیں . . . . . ''

آگے چل کر لکھا تھا: ''ایک طرف مجاز کی شاعری ہے جہاں روایتی تسلسل اور رنگا رنگ شگفتہ مناسبات اور متعلقات کے ساتھ حسین اور زندہ انداز میں ملتا ہے۔ دوسری طرف فیض کی شاعری ہے جس نے راشد کے برعکس اپنے جدید ترین ہونے کا کوئی اعلان نہیں کیا ہے . . . . فیض کی شاعری میں ارمانوں اور خوابوں کا خون ملتا ہے۔ یہ شکست کا حسین ترین گیت ہے لیکن اس شکست میں قنوطیت اور فرار نہیں ہے۔ اس میں انسانی تاریخ کا المیہ پوشیدہ ہے۔ تاریخی قوتوں کے ادراک اور دکھ درد کے کٹ جانے کے احساس نے اسے نحس اور بیمار (Morbid) نہیں ہونے دیا ہے . . . . .
پھر بھی ان کی شاعری آگے بڑھ کے اپنی شدید داخلیت کی وجہ سے زمانے کے سنگین مطالبات کو پورا نہیں کر سکی۔
. . . . . اس شبستاں میں میلے کچیلے لوگوں کا گذر مشکل ہی سے ہو پاتا ہے . . . . . .''

۱۹۵۲ء ——— ایک مضمون میں Images کی بات نکل آئی تھی۔ فیض کا ذکر بھی ضمنی طور پہ آگیا تھا۔ ایک اقتباس اس کا بھی دیکھتے چلیے۔

''فیض کے یہاں جذبات اور Images میں ہم آہنگی ہے جذبات قاری کو Images کی طرف بڑھاتے ہیں اور Images جذبات کی طرف ——— ان میں کوئی فصل نہیں ہے۔''

۱۹۶۵ء ——— نقش فریادی، دست صبا، زنداں نامہ، دست تہ سنگ، اتنے مجموعے فیض کے اب تک چھپ چکے ہیں۔ اب میں دوبارہ سوچتا ہوں کہ فیض کے بارے میں جو کچھ لکھ چکا ہوں اس میں کچھ ترمیم کی ضرورت ہے یا نہیں؟ ——— اپنی تحریروں کو دوبارہ پڑھنے اور ''جھک مارنے'' میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔ پھر ان کے اقتباسات دینا اس سے بھی زیادہ ''کارِ فضول'' ہے بالخصوص قاری کے لئے ——— مگر مجھے فیض پر لکھنا ہے۔ 'افکار' فیض کا مخصوص نمبر نکال رہا ہے۔ شاعروں اور ادیبوں پر ان کی زندگی ہی میں مخصوص نمبر نکالنا یقیناً صحت مند روایت ہے اور ان کی تخلیقات کی اہمیت کے اعتراف کا یہ بہت اچھا طریقہ ہے۔ مگر میرا اس طرح مضمون لکھنا (دوسروں کے بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتا) یقیناً اس صحت مند روایت کے حق میں مضر ہے اس کے

علاوہ طرحی غزلوں کی طرح یہ مخصوص نمبر طرحی مضامین کے گلدستے بنتے جارہے ہیں۔ طرحی غزلوں کے قوافی طبع آزمائی کے لئے وسیع میدان فراہم کردیتے تھے۔ مختلف قافیے مختلف شعرا کے یہاں اچھے بندھتے تھے۔ بعض قافیوں پر تمام شعرا مشترکہ طور پر زور لگاتے تھے۔ اور فیصلہ سامعین پر چھوڑ دیا جاتا تھا کہ کس نے اس قافیہ کو اچھا باندھا ہے۔ بعض قافیے چھوٹ بھی جاتے تھے۔

فیض پر نقش فریادی سے دست تہِ سنگ کی درمیانی مدت میں جو خاصی طویل ہے متعدد مضامین لکھے جاچکے ہیں اور بعض مضامین بہت اچھے ہیں جن میں فیض کی شاعری کا تقریباً ہر پہلو سے جائزہ لیا جاچکا ہے۔ محض موضوع کے لحاظ سے ہم ان مضامین کی ترتیب کچھ یوں دی جاسکتی ہے۔

۱. ۳۶ء کے بعد کے نئے شعرا میں فیض کا کلام۔
۲. فیض کا سماجی شعور اور ان کی شاعری کا لہجہ۔
۳. فیض کی رومانیت۔
۴. فیض کی امیجری۔
۵. فیض کی غزلیں۔
۶. نئی نسل اور فیض۔

ادھر کچھ ایسے مضامین بھی لکھے گئے ہیں جو فیض کی نظموں کے تکنیکی تجزیے سے متعلق ہیں — یہ نئے انداز کی تقریباً ویسی ہی کوشش ہے جو ہمارے بزرگوں کے یہاں اشعار کی تعریف و توصیف میں مل جاتی تھی۔ قوافی اور ردیف کے رشتوں، الفاظ کی مناسبت، تشبیہوں، استعاروں اور صنعتوں کے استعمال کے سلسلے میں قدیم ناقدین نے جن کاوشوں سے کام لیا ہے اسی سے ملتی جلتی یہ کوشش بھی ہے۔ ایک طرح کا فنی جائزہ یہ بھی ہے۔ ایک امیج بڑھ کر کس طرح دوسری امیج پر ڈھل جاتی ہے۔ ایک دلچسپ تکنیکی تجزیہ ہے اور شاعر کے لئے شاید ایک دلچسپ تجربہ۔ فیض کی نظموں کا جائزہ اس نوعیت سے بھی لیا جاچکا ہے۔ ایک موضوع اور رہ جاتا ہے — وہ فیض کی بین الاقوامی شہرت ہے۔ ممکن ہے اس پر بھی لکھا جاچکا ہو مگر میری نظر سے نہیں گزرا۔ مجھے اپنی کوتاہی کا اعتراف ہے۔

اب میں سوچتا ہوں کہ اتنے بہت سے مضامین کے ہوتے ہوئے جو فیض کے تقریباً تمام پہلوؤں سے بحث کر چکے ہیں اُن پر مضمون لکھنے کی کتنی گنجائش رہ جاتی ہے — کون کون سے "قافیے" نہیں باندھے گئے ہیں۔ یا وہ کون سے قوافی ہیں جو بہتر طور پر باندھے جاسکتے ہیں — یا خود میں نے جو مضمون لکھا ہے اس میں ابھی کون سا قافیہ رہ گیا ہے۔ فیض کی شاعری کا وہ کون سا پہلو تلاش کیا جائے جس پر اب تک کچھ نہیں لکھا گیا ہے یا کم لکھا گیا ہے — لکھنے کا یہ عمل بڑا مصنوعی ہے۔ مگر اس لحاظ سے دیکھا جائے تو سوچنے کا عمل بھی مصنوعی ہوجاتا ہے۔ لکھنا ہر صورت ایک صنعت ہے خواہ نظم میں ہو یا نثر میں — مگر یہ بات کچھ دل کو لگتی نہیں — اور اب میں چند سوالات خود اپنے آپ سے کرتا ہوں۔ پہلا وہی سوال ہے جو میں اوپر لکھ آیا ہوں۔

۱. آیا جو کچھ میں فیض پر لکھ چکا ہوں اس میں کچھ ترمیم کرنا چاہوں گا — غالباً نہیں۔
۲. فیض اپنے جدید لب و لہجہ، امیجری اور معنویت کے جذباتی ابہام کے باوصف بڑے مقبول شاعر ہیں وہ ادنیٰ اور اعلیٰ دونوں طبقوں میں یکساں طور پر مقبول ہیں — ایسا کیوں ہے؟ یہ ان کی شاعری کا حسن ہے یا نقص؟

بہت زیادہ مقبول شاعر سے بعض ناقدین کو بدگمانی ہوجاتی ہے۔ جگر بہت مقبول شاعر تھے، ان کی وارفتگی، ان کا ترنم اور ان کی شاعری

کا نوجوان مزاج ان کی مقبولیت کا سبب تھا۔ مگر اب ان کی شاعری زرد پڑتی جا رہی ہے۔
ساحر لدھیانوی بھی بڑے مقبول شاعر ہیں ـــ سنا گیا ہے کہ "تلخیاں" کئی ہزار کے ایڈیشن تک پہنچ گئی ہے اس مقبولیت کا راز بھی سمجھ میں آجاتا ہے۔ ساحر کا لہجہ جو فیض کے لہجہ سے متاثر ہے اور زیادہ شخصی جراحت لئے ہوئے ہے نا بالغ ذہنوں کے لئے ایک دلکشی رکھتا ہے اس کے علاوہ فلم کے گیتوں نے بھی اس کو چمکا دیا ہے۔

مگر فیض کی شاعری اس نوع کی شاعری نہیں ہے۔ بعض نظموں میں یقیناً عنفوان شباب کی تصویریں اور عشق یا تجربہ کا رنگ ابہام پسندی ملتی ہے مگر بالعموم ان کا لہجہ اتنا آسان نہیں ہے کہ فوراً مقبول ہو جائے ان کے لہجہ میں بڑی بات یہ ہے کہ اس کی لے جس میں کسک، خواب اور زنجیر ملا ہوا ہے نقش فریادی سے لے کر دست تہ سنگ تک اپنی انفرادیت کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ اس میں کہیں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی ہے۔ بعض دفعہ البتہ فیض نے کوشش کی ہے کہ اس لہجہ کو بدل کر اس میں ذرا "کڑا پن" پیدا کریں۔ "کتے"، "شورش بربط و نے" میں اس بات کی کوشش ملتی ہے مگر نتیجہ یہ ہوا کہ یہ نظمیں اپنے مزاج، آہنگ اور بیان تک کہ فکری ڈھانچے کے لحاظ سے فیض کی نظمیں ہوتے ہوئے بھی دوسرے شاعروں کی کچھ نقالی سی بن گئیں۔ فیض کے مزاج میں تلخی، تندی اور طنز کی کوئی گنجائش بظاہر نظر نہیں آتی۔ اسی لئے وہ جب کوئی تو ند کا بڑھتا ہوا سیلاب لئے ـــ یا جس طرح تیز ی کہسار پہ یلغار کرے ـــ قسم کے مصرعے مضحکہ خیز ہو کر رہ جاتے ہیں اور اپنی مجوزہ تلخی یا تندی کھو بیٹھتے ہیں۔

خیر صیغہ گذری کہ فیض نے اس قسم کے تجربات بہت کم کئے ہیں ـــ ادھر البتہ انہوں نے امیجری کی تعمیر کے سلسلہ میں کچھ تجربات کئے ہیں ان کی نظم منظر سے رہگذر سائے، شجر منزل و در حلقۂ بام ـــ علامت نگاری کے سہارے ایک نئے تجربے کی خواہش معلوم ہوتی ہے، ـــ مگر یہ تجربہ بھی انہوں نے بہت ڈرتے ڈرتے اور اپنے لہجہ کے جیسے پن کو سمیٹتے ہوئے کیا ہے ـــ ممکن ہے وہ اس طرح جدید دور کے جدید تر ادبی تقاضوں سے اپنی نظموں کو ربط دینا چاہتے ہوں اور اپنے لہجہ سے ان کا عشق کم ہو کر دور پڑ چلا ہو، یا وہ اس لہجہ کو جو بڑا نرم و نازک ہے اس انتہائی تیز رفتار دور میں "زنجیر شکن" سمجھ بیٹھے ہوں ـــ اگر ایسا ہے تو بڑا سانحہ ہوگا فیض کا سارا سرمایہ فیض کا لہجہ ہے اس لہجہ کی شدید داخلیت بعض اوقات اکتا دینے والی ہو سکتی ہے مگر یہ تمام باتیں اس لہجہ سے دست بردار ہونے کا جواز تب ہی بن سکتی ہیں جب فیض اپنی شاعری سے دست بردار ہونا چاہیں۔ علامت نگاری کے تجربات ان کے لہجہ کو زیادہ وسیع اور متنوع شاید نہ کر پائیں بلکہ اس کا اندیشہ ہے کہ ان کی شاعری میں "ثقالت" پیدا ہو جائے۔ بہرحال بات ان کے لہجہ کی ہو رہی تھی۔ یہ لہجہ ایسی ابہامیت لئے ہوئے ہے کہ شائستہ مزاجی کے بغیر اس سے لطف نہیں لیا جا سکتا ہے۔ پھر ان کی شاعری اتنی مقبول کیوں ہے؟ ـــ اس کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ اپنے کو یا چند آدمیوں کو شائستہ مزاج اور دوسرے تمام لوگوں کو غیر شائستہ سمجھ لینا ـــ شائستہ ہونے کی کوئی ایسی قوی دلیل نہیں ہے اور نہ مقبولیت کی بنا پر کسی شاعر سے بلا وجہ بدگمان ہونے کی ضرورت ہے۔ اگر تنگ چڑھے ناقدوں کی یہ بات ہم مان لیں کہ ادیب و شاعر کی مقبولیت ان کی تخلیقات کے ناقص اور سطحی ہونے کا ثبوت ہے تو پھر یہ بات بھی مان لینی چاہئیے کہ غیر مقبولیت ہی شاعر اور ادیب کے بلند ہونے کی سب سے بڑی پہچان ہے۔ اس سے بعض نا قدوں، ادیبوں اور شاعروں اور ادب کے پڑھنے والوں کے لئے شاید کوئی تسکین کا پہلو نکل سکے، لیکن اچھا ادب چند مخصوص آدمیوں کی پسند کے تنگ دائرے میں محدود ہو کر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس کا کام حدیں قائم کرنا نہیں حدوں کو توڑنا ہے اسی لئے وہ صدیوں کو طے کرتا ہوا بے شمار پڑھنے والوں تک پہنچتا رہتا ہے۔ فردوسی کا شاہنامہ شاعری کے بلند ترین معیار کو قائم کرتا ہے مگر اس کے پسند کرنے والے اور وظیفے کے طور پر پڑھنے والے کچھ کم لوگ نہیں رہے ہیں۔ فیض کی شاعری اس قسم کی کوئی چیز نہیں ہے

کو بدل نہیں سکیں۔ اور جہاں ان کا لہجہ بدل گیا ہے وہ فیض کی شاعری نہیں رہی ہے جیسے عنوان بدل دینے سے لہجہ نہیں بدل جایا کرتا۔ یہ چیز جہاں فیض کی شاعری میں منفرد کردار کو ظاہر کرتی ہے وہاں ان کی شاعری کے محدود ہونے کی بھی غماز ہے۔ ان کی شاعری بلکے سروں کی شاعری ہے۔ ذرا کے اونچی ہوئی یہ بے سری ہو گئی۔ جہاں تک غالب، اقبال اور جوش کے اسالیب کی بات ہے۔ یہ ہزار شیوہ زندگی کو سمیٹ لینے کی صلاحیت رکھتے ہیں (فیض کی شاعری اتنی تو نا اور اتنی نہیں ہے) اور نہ ان کی شاعری سے یہ مطالبہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کا مطالعہ اس کی اپنی فضا میں کیا جانا چاہیے۔ فیض کی شاعری کا سارا حسن اسی فضا سے جھلکتا ہے ان کے یہاں معروض کی معنویت اتنی اہم نہیں ہے جتنی وہ فضا جو ان کی نظموں کی اکائی سے ترتیب پاتی ہے۔ اس فضا میں اب تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ اسی لئے ان کی نظموں میں تنوع کی تلاش بے سود ہے۔ اصل میں اس فضا کو تلاش کرنا چاہیے جو درد کی طرح بے سمت ہے اور تاریکی کی چمک رکھتی ہے۔ فیض کے یہاں اتنا بھی تنوع نہیں جتنا ہمیں مجاز کی شاعری میں ملتا ہے۔ گر مجاز کی شاعری فکری بلوغ تک پہنچنے سے پہلے ہی ختم ہو گئی۔ اس کے علاوہ مجاز کی شاعری کے لئے جسے Topical کہیں گے۔ وہ ان میں سوچے اور محسوس کئے ہوئے موضوعات میں زیادہ دن تک جوان نہیں رہتی۔ فیض کی شاعری Topical نہیں ہے۔ اس میں غم ایک مثبت کردار کی حیثیت رکھتا ہے جو ہنگامی موضوعات کو بھی اپنی غمگین فضا میں ڈھال کر پائیدار بنا دیتا ہے۔ فیض اپنے لہجہ اور اپنے لہجہ کی تعبیر کردہ فضا سے باہر نہیں آسکتے۔ اسی لئے ان کے سارے تجربات محدود ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اور ان کی شاعری اپنی تمام خوبصورتی کے باوصف ابھی تک پہلو دار نہیں ہو پائی ہے۔

ان سوالات کے بعد اب میں سوچتا ہوں کہ فیض کے بارے میں مزید کیا لکھا جا سکتا ہے۔ یا ان کے اور کن پہلوؤں کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ غالباً اس کا جواب فیض نمبر میں مل جائے۔ میرے لئے یہ بڑی تقویت کی بات ہوگی۔ اس لئے کہ مجھے کچھ اندیشہ سا چلا ہے کہ کہیں فیض کی شاعری فضا کی یکسانیت کا اپنا حسن کھو نہ بیٹھے۔ اور اگر فیض نے فنی تجربات کے ذریعہ اس فضا اور اسلوب میں تبدیلی پیدا کرنی چاہی تو زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ ان کی شاعری تجربات اور محسوسات کے تنوع کی جگہ تکنیک کا تنوع بن کر نہ رہ جائے اور اس میکانکی انداز کی شاعری میں جائے جب ساتھ احساسات کی شاعری کو بے روح بنا رکھا ہے۔

میں سوچتا ہوں کہ میں نے فیض کی شاعری سے بحث کرتے ہوئے بار بار لہجہ اور فضا کا ذکر کیا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ کیا فیض کی شاعری میں سب کچھ یہی ہے یا اس کے علاوہ بھی کچھ ہے۔ میرے لئے اس کے علاوہ شاید اور کچھ نہیں ہے اور جتنی بھی چیزیں ہو سکتی ہیں وہ سب ضمنی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ ان کا سیاسی شعور، ان کی ترقی پسندی، ان کی انسان دوستی سب اسی فضا کو تعبیر بھی کرتی ہیں اور اسی فضا سے ابھرتی بھی ہیں۔ اب میرے لئے صرف ایک چارہ کار ہے۔ میں فیض کی شاعری کی جگہ اپنا جائزہ لوں۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ میں نے اپنی ذہنی کیفیات کو فیض کی شاعری پر مسلط کر دیا ہے۔ عین ممکن ہے۔ مگر اچھی شاعری اپنے پڑھنے والوں کو اس طرح بھی تقویت پہنچاتی ہے۔ تو کیا بہتر نہیں ہوگا کہ میں اپنے محسوسات کے ذریعہ اس فضا کا تجزیہ کروں جو مجھے فیض کی شاعری میں نظر آتی ہے۔ اس سے حاصل؟ شاید ذہنی دیانت کے ساتھ میں از سر نو ان کی شاعری کو اپنے ذہن میں تازہ کر سکوں۔

بہت پہلے کی بات ہے۔ میں یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔ فیض کی "نقش فریادی" ابھی چھپی نہیں تھی۔ نیا ادب اور کلیم کا تازہ پرچہ جو ان دنوں لکھنؤ سے چھپتا تھا، مجھے گاؤں میں ملا۔ اس میں فیض کی نظم "موضوع سخن" شائع ہوئی تھی۔

گل ہوئی جاتی ہے افسردہ سلگتی ہوئی شام

میں نے پہلی مرتبہ فیض کی نظم پڑھی میں ایک عجیب تاثر میں ڈوب گیا جس کو بیان نہیں کر سکتا — گُل ہوئی جاتی ہے افسردہ سلگتی ہوئی شام، میں اس نظم کے پہلے مصرعے کی اس تصویر کو پوری طرح گرفت میں نہیں لے سکا جو اس مصرعے سے پیدا ہوتی ہے۔ ہر لفظ ایک دوسرے میں پیوست ہو کر گھل کر جس طرح ایک ذہنی اور جذباتی تاثر پیدا کرتا ہے اس کی باریکیوں تک اس وقت میری نظر نہیں پہنچ سکی مگر میں نے اس میں ایک ایسی کیفیت پائی جو مجھے اس دور کے کسی نئے شاعر میں نہیں ملی — اس میں افسردگی تھی، تھکن تھی، تنہائی تھی اور زندگی کے بے سود ہونے کا احساس — پھر ان مصرعوں نے مجھے ایک خواب کی دنیا میں پہنچا دیا ؎

جانے اس زلف کی موہوم گھنی چھاؤں میں
ٹمٹماتا ہے وہ آویزہ ابھی تک کہ نہیں۔

یہ بے یقینی کی فضا جس میں قربت اور دوری دونوں کا شدید احساس ہے، دل میں اتر گئی — پھر میں نے ان کی اور نظمیں پڑھیں، تنہائی نے مجھے وہ چیز دے دی جسے میں محسوس کرنا چاہتا تھا مگر محسوس نہیں کر پاتا تھا — تنہائی میں مجھے ایک اور چیز بھی ملی جسے آدمی — یا شاید اس عمر کا آدمی سمجھنا چاہتا ہے مگر سمجھ نہیں پاتا، جس کو Frustration ناکامی کا پر شدت احساس کہیے — میں فیض کی نظمیں پڑھتا گیا اور ہر نظم ایک ایسے لہجے سے مجھے پکارتی رہی جس میں بڑی سرگوشی ہوتی ہے، بڑی قربت ہوتی ہے اور بڑا دکھ ہوتا ہے۔ اور میں ایک ایسی فضا میں پہنچتا گیا جس میں ہندوستان کے نوجوانوں کی تنہائی، بے یقینی، جانبازی اور بے جہتی سبھی کچھ تھا۔ یہ بڑی غمگسار فضا تھی، اس میں آج بھی غمگساری ہے، مگر کچھ اس قسم کی ؎

مرے ضبطِ حال سے روٹھ کر مرے غمگسار چلے گئے

آج جب میں فیض کی نظمیں پڑھتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فیض کی ہر نظم مجھے اسی فضا کی یاد دلاتی ہے جس میں میں تھا، جو مجھے بہت عزیز تھی، مگر اب وہ صرف ایک یاد بن کر رہ گئی ہے۔ اور اسی لحاظ سے یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ جیسے فیض کی ہر تازہ نظم ان کی پرانی نظم کی یاد دلاتی ہے۔ یہ فیض کے کلام کی بڑی خوبی بھی ہے — ان کا کلام ایک وحدت میں سوچا جا سکتا ہے — الگ الگ کر کے یا ادوار میں تقسیم کر کے شاید اس کا دیکھنا محال ہے۔

آج میں سوچتا ہوں کہ فیض کے یہاں جو فضا ہے وہ کن عناصر سے مل کر ترتیب پاتی ہے — میرا خیال ہے وہ دو رنگوں سے مل کر بنی ہے — سیاہ اور سرخ —

نقشِ فریادی

ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخواب میں بنوائے ہوئے
جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم،
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے

آج تک سرخ و سیہ صدیوں کے سائے کے تلے
آدم و حوّا کی اولاد پہ کیا گذری ہے

مجتبیٰ حسین

دیکھ کر آہنگر کی دکاں میں
تند ہیں شعلے سرخ ہے آہن (آہنگر سیاہی کا بدل ہے)

دستِ صبا

رات کا گرم لہو اور بھی بہ جانے دو
جواں لہو کی پر اسرار شاہراہوں سے (پر اسرار — اندھیرا لئے ہوتے ہے)
اور اب رات کے سنگین و سیہ سینے میں
اتنے گھاؤ ہیں کہ جس سمت نظر جاتی ہے (گھاؤ — سرخ لہو کا بدل ہے)

ان میں لہو جلا ہو ہمارا کہ جان و دل
محفل میں کچھ چراغ فروزاں ہوئے تو ہیں

شفق کی راکھ میں جل بجھ گیا ستارۂ شام

جتنا لہو تھا صرف قبا کر چکے ہیں ہم (قبا یقینی طور پر آزہیں لیکن سیاہی کا تصور بھی رکھ سکتی ہے)

زنداں نامہ

اسی سیاہی میں رونما ہے
وہ نہر خوں جو مری صدا ہے

ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے (خون کی سرخی چھپی ہوئی ہے)

لہو میں غرق مرے غمکدے میں آتے ہیں (غمکدہ — ظلمت کدہ)

دشمن جاں ہیں سبھی سارے کے سارے قاتل
یہ کڑی رات بھی یہ سائے بھی، تنہائی بھی

شام گلنار ہوئی جاتی ہے دیکھو تو سہی

رات ڈھلنے لگی ہے سینوں میں
آگ سلگاؤ آبگینوں میں

(دستِ تہِ سنگ)

اب کوئی جنگ نہ ہوگی، نہ کبھی رات گئے
خون کی آگ کو اشکوں سے بجھانا ہوگا

زردئ شبِ ہجراں کی خبر کیوں نہیں دیتے
خونِ دلِ وحشی کا صلہ کیوں نہیں دیتے

ساری دیوار سیہ ہو گئی تا حلقۂ بام

— — — — — — — — —

— — — — — — — — —

اک تصویر ہے خنداں ایک تحلیل ہے لہو

خونِ عشاق سے جام بھرنے لگے، دل سلگنے لگے، داغ جلنے لگے
محفلِ درد پھر رنگ پر آ گئی، پھر شبِ آرزو پر نکھار آ گیا

اور ہر تشنہ واماندگیٔ آخرِ شب

پھر لہو سے ہر ایک کاسۂ سر
پُر ہوا جامِ ارغواں کی طرح

(داغ اور لہو)

اس شام کا سورج ڈوبے گا
(شفق کی سرخی)

زہر کا رنگ، لہو رنگ، شبِ تار کا رنگ

آسمانوں کا لہو پی کے سیہ رات چلے

میں اگر فیض کی نظموں کی فضا کا تصور کروں تو وہ کچھ یوں ہوگا ــــ شام کا وقت، لاؤنج میں کرسیاں اور میزیں قاعدے سے لگی ہوئی ہیں جن پر سبز میز پوش ہیں اور نیلے شیڈ کے ٹیبل لیمپ رکھے ہوئے ہیں ــــ سبز گوشوں میں خاموشی سلگ رہی ہے۔ شام ڈھل چکی ہے اور چاند ابھر رہا ہے ــــ نور میں گھس گیا ہے عرشن کا نیل ــــ کرسیوں پر عورتیں اور مرد آہستہ آہستہ گفتگو کر رہے ہیں سرگوشیوں میں ــــ اندر بڑے سے ہال میں پیانو مدھم سروں میں بج رہا ہے ــــ

مضمحل ہے رباب ہستی کی	ہلکے ہلکے سروں میں نوحہ کناں

یہ عورتیں اور مرد جو آپس میں گفتگو کر رہے ہیں خواب کے زن و مرد معلوم ہوتے ہیں ــــ یہ گفتگو کرتے کرتے چپ ہو جاتے ہیں ان کے سونے چہروں پر ایک کرب سا پیدا ہو جاتا ہے ــــ یاد ماضی ہے عذاب، دہشت زدہ نڈھال ـ فیض کی شاعری اسی فضا میں گھومتی رہتی ہے ــــ اس فضا سے باہر نکل کر وہ شاعری نہیں سکتی۔ تیز روشنی میں اس کی آنکھیں خیرہ ہو جائیں گی چہرہ زمین پر اور اس کا سا چہرہ پسینے میں تر بتر ہو جائے گا۔ اور اس کا پاؤں چوٹ کھ جائیگا، اس کے جذبے بیرزتی ہو جائیں گے زندگی کی کڑی دھوپ میں اس کا حسن کمھلا جائے گا۔

میں جب اس فضا کو اپنے ذہن میں تازہ کرتا ہوں تو ماضی اپنے تھکے ہوئے قدموں سے میرے قریب پہنچ جاتا ہے اور بڑی اپنائیت سے مجھے دیکھنے لگتا ہے ــــ زرد کا چاند بجھ گیا ہجر کی رات ڈھل گئی ــــ مجھے اس فضا سے عشق ہو جاتا ہے اور غالباً فیض کو بھی جتنا عشق اس فضا سے ہے اتنا کسی اور سے نہیں ــــ فیض نے اس فضا کو جس طرح قائم رکھا ہے، وہ ان کا کارنامہ ہے۔ ان کی شاعری دوسری جنگ عظیم سے پہلے شروع ہو چکی تھی ــــ اس نے آزادی کی جد و جہد کو دیکھا، دوسری جنگ عظیم دیکھی ــــ تقسیم سے گذر کر یہاں تک پہنچی ــــ اب وہ جوہری توانائی کے دور میں داخل ہو چکی ہے۔ کتنے بڑے تغیرات سے ہم گذر کر یہاں تک آئے ہیں اور کتنے بڑے تغیرات ہمارے سر پر منڈلا رہے ہیں اور زندگی کس قدر عجلت پسند، متلون مزاج اور بے مروت ہو چلی ہے ــــ لیکن فیض کی شاعری نے اپنے ضبط و وقار کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ــــ وہ اس سخت ہیجانی دور میں بھی اپنے کو لیئے دیئے رہی اور حسن کے خواب دیکھتی رہی ــــ یہ بڑی بات ہے۔ فیض کی مربوط شعری شخصیت اس دور میں ہماری جدید شاعری کو سہارا دے رہی ہے۔

فیض کی یہ شاعری میرے لئے آج بھی کبھی کبھی دلداری کا باعث بن جاتی ہے۔ اسے پڑھ کر یہ احساس قدرے کم ہو جاتا ہے کہ اتنے بڑے شہر میں آدمی تنہا ہے۔

ــــ غزل گوئی باریک کام ہے اور جو عیوب اور کمزوریاں دوسری اصناف سخن میں دل و نظر گوارا کر لیتے ہیں۔ غزل میں بہت زیادہ کھٹکتی ہیں۔ اسی سبب سے کامیاب غزل کے لئے اور اصناف سخن کے مقابلے میں عاشقی اور ہنرمندی کی زیادہ ہی مقدار چاہئے۔ اور دور حاضر میں ان اجناس کی کچھ ایسی افراط نہیں۔

ــــ فیض

پروفیسر سلامت اللہ خاں

شاعرِ محبت شاعرِ انسانیت

یہ مضمون جو سنہ ۵۷ء میں لکھا گیا تھا، ایک متاعِ نایاب بن چکا تھا ــ افکار نے اسے آج کی خاطر اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ پروفیسر سلامت اللہ خاں صاحب نے اس مضمون کے سلسلے میں ہمیں لکھا ـــــ ۔ فیض صاحب پر میرے جس مضمون کا آپ نے ذکر کیا ہے وہ آج سے انیس یا بیس سال پہلے لکھا گیا تھا۔ اس زمانے تک صرف ۔ نقشِ فریادی شائع ہوئی تھی اور وہ مضمون صرف اسی مجموعہ تک محدود ہے۔ خود میرے پاس وہ مضمون نہیں ہے لیکن یاد پڑتا ہے کہ ان کی کچھ نظموں کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی ـــــ اچھی تنقید اچھی شاعری کی طرح ماہ و سال کی گردشوں سے محفوظ رہتی ہے۔ پروفیسر سلامت اللہ خاں کا یہ مقالہ اسی خیال کی صداقت کا آئینہ دار ہے۔ (ادارہ)

انگریزی شاعری پڑھتے ہوئے قاری کے ذہن میں کتنے بہت سے دائرے واضح ہو جاتے ہیں۔ ہر عہد کی شاعری کی کچھ مشترک خصوصیات ہیں اور ہر شاعر کسی نہ کسی گروپ سے تعلق رکھتا ہے۔ اسی لئے جب کبھی وہ ایک سرسری نظر بھی دوڑانا چاہتا ہے تو اسے ہر دور اور شعراء کے ہر گروپ کا ایک نام مل جاتا ہے۔ کلاسیکی، نیم کلاسیکی، قبل رومانی، رومانی، نیم رومانی، جدید، باغی وغیرہ چاسر سے ٹی ایس ایلیٹ تک کا یہ طویل سفر نظروں کے سامنے پھیل جاتا ہے، اور اس کے تخیل کے دھندلکے میں وہ تمام شاہراہیں جھلملاتی جگمگاتی رہتی ہیں۔ بعض کتنی کشادہ اور حسین اور بعض کتنی سنگلاخ اور دشوار گزار، بعض کتنی الجھی ہوئی اور پیچیدہ، لیکن ہر راہ کی پہچان الگ ہے اور بعض فرسودہ اور پامال راہیں بھی قاری کے ذہن میں محفوظ رہتی ہیں۔

اس کے برعکس جب وہ اردو شاعری پڑھتا ہے تو اسے ایک عرصہ تک شاید بے کیف یکسانیت کا احساس ہوتا ہے۔ کتنے دائرے ابھرتے ہیں اور وہ مکمل بھی نہیں ہونے پاتے کہ دوسرے دائرے آ ملتے ہیں۔ ایک دائرے سے دوسرا اور دوسرے سے تیسرا اسی طرح ملتا

رہتا ہے یہاں تک کہ ہر چیز گڈمڈ ہو کر بے حد مبہم اور غیر واضح ہو جاتی ہے۔ جس میں آپ خصوصیات شاعری کی بنیاد پر کسی دور کو متعین کر سکتے ہیں اور نہ شعراء کا گروپ۔ اور اگر اس کی کوشش کریں بھی تو محض زمانہ بیان کے سہارے کچھ خاکے شاید تیار ہو سکیں، لیکن ان میں رنگ آمیزی نہ صرف قاری بلکہ ذہین نقادوں کے لئے بھی مشکل ہے۔

غدر سے پہلے کی شاعری تک کی مسافت آپ اس طرح طے کریں کہ غدر کے بعد کی شاعری تک بھی۔ بہت دور تک انہیں روکھی پھیکی پامال راہوں سے گذرتے ہیں یہاں تک کہ آپ انیسویں صدی کی آخری دہائی اور بیسویں صدی کی ابتدا میں کچھ نئے زاویئے اور نئے دائرے بنتے دیکھتے ہیں۔ لیکن یہاں آپ کی دشواری کی نوعیت کچھ اور ہو جاتی ہے۔ اگر انگریزی شاعری میں شعراء کا ایک گروپ ایک دور کے دائرے کی تکمیل کرتا ہے تو اردو میں جنگ عظیم کے پہلے اور بعد کی شاعری میں بہت سے دائرے مل کر ایک شاعر کی تکمیل کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر جوش کو لے لیجئے۔ نقش و نگار سے سیف آخر تک کتنے دائرے بنتے ہیں ——— جوش، جمالیاتی شاعر ——— جوش، شاعر قدرت ——— جوش، رومانی شاعر ——— جوش، انقلابی شاعر ——— جوش، رباعی شاعر ——— غرض کہ آپ کو محسوس ہوتا ہے کہ جوش سبھی کچھ ہیں ——— اسی طرح اقبال اگر ایک طرف مرد مومن کے مشیر بنے ہوئے ملتے ہیں تو دوسری طرف دنیا کے غریبوں کو جگانے کا عزم بھی رکھتے ہیں ——— مجاز اصنام عاشقی کی پرستش کرتے ہیں۔ اپنے محبوب کی ملاقات پر خوشیاں مناتے ہیں، اور دعائیں دیتے ہیں، اور پھر وہی مجاز انقلابی بن کر در بدر آوارہ بھی پھرتے ہیں ——— راشد اگر اپنے سادہ و معصوم محبوب کو واقف الفت کرنے سے گھبراتے ہیں تو ایک برہنہ جسم سے اپنے ارباب وطن کی بے بسی کا انتقام بھی لیتے ہیں۔

آخر یہ ہنگامہ خیز دوڑ کیوں؟
قاری الجھتا ہے کہ آخر یہ کیوں؟

ان وجوہات کو بیان کرنے کے لئے کافی جگہ اور وقت کی ضرورت ہے۔ مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ انیسویں صدی کے آخر میں اردو ادب میں ادب کو زندگی سے قریب لانے کی کوشش بہت کامیاب ہوئی۔ ہمارے ادیبوں میں خصوصاً شعراء میں ایک طرف اس کا احساس تھا کہ معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی پستی کے علاوہ ہمارا ادب بھی دوسری زبانوں سے صدیوں پیچھے ہے۔ زمانہ قدیم کے شعراء کولہو کے بیل کی طرح صدیوں تک ایک ہی دائرے پر چکر کاٹتے رہے تھے۔ ان کی تنگ نظری اور قدامت پرستی نے اردو شاعری کو اس کی موجودہ وسعتوں سے محروم رکھا تھا۔ اسی لئے وہ اس کوشش میں تھے کہ وہ ان تمام شاہراہوں کو اپنائیں جو اردو شاعری کے لئے اجنبی تھیں۔ ان حالات میں اردو شاعری کا انگریزی ادب سے اثر پذیر ہونا تعجب انگیز نہیں ہے۔ اس اثر سے مل جل کر مارکس اور فرائڈ کے وہ خیالات بھی آئے جو ہمارے بہت سے معاشرتی مسائل کا حل سمجھے جاتے ہیں۔

دوسری طرف ادب کو زندگی سے قریب لانے کی کوشش نے وہ بہت سے موضوعات سخن دیئے جو اب تک اردو شاعری میں نہ لا سکے۔ وہ موضوعات جو اب تک ناشائستہ سمجھے جاتے تھے انہیں شعراء نے نوازا۔ اور ان کے سہارے عوام کی زندگی کے کئی پیچیدہ مرحلوں سے روشناس کرایا ——— نئے موضوعات سخن کے ساتھ نئے اسالیب بیان کی تلاش ہوئی ——— بعض اوزان میں نئی، بعض میں مفید اور مضر قطع و برید ہوئی اور اس طرح صدیوں کی مسافت چند سالوں میں طے ہو گئی ——— مختلف دائرے سمٹ کر ایک ہی شاعر کے دامن میں آ گئے اور اردو شاعری کا یہ مرجھایا ہوا پودا دیکھتے ہی دیکھتے ایک تناور درخت بن گیا اور مختلف سمت میں شاخیں پھوٹ نکلیں۔

انہیں شاعروں میں ایک شاخ نیم رومانی شعراء کی بھی ہے جس میں فیض، جذبی اور اختر الایمان کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ فیض اور جذبی جیسا کہ میں نے اپنے "اردو کے پنجابی شعراء" میں لکھا ہے، رومان اور حقیقت کے ملاپ ہیں۔ ان میں نہ وہ جوش اور بانکی ٹھسک ہے اور نہ ان پر خونی اور آتشیں انقلاب کا جنون سوار ہے۔ ان کے یہاں یہ لیلیٰ دبی سی کراہ ــ ایک گھٹی ہوئی سی کسما اور ایک خاموش الم ہے ــــ ان کے دلوں کے ایوان ویران اور تاریک ہیں جن میں شکست شدہ شمعوں کی قطار کے سوا کچھ بھی نہیں۔ یہ اپنی رومانی فطرت کے باوجود اپنے ملک اور قوم کی پکار سنتے ہیں۔ اور حقیقتاً زندگی ان کے لئے ایک کڑا درد ہے جو گیت میں ڈھلتا ہی نہیں اور یہ صرف اشکوں کی زبان میں کہتے ہیں اور آہوں میں اشارہ کرتے ہیں۔ لیکن فیض، جذبی، اختر الایمان کو پڑھتے ہوئے بھی اسی ہنگامہ خیز دور کا احساس ہوتا ہے۔ جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ انگریزی شاعری میں نیم رومانی شاعری کے پیشوا سوئن برن (Swinburne) ہیں جو بظاہر وکٹورین دور کی شاعری کے لطیف پہلو سے منسلک ہیں۔ لیکن دراصل سوئن برن کی شاعری اور ان کے موضوعات شیلے، بائرن، کیٹس، اور لینڈر کے موضوعات کی بازگشت ہیں۔ وہی آزادی کا وجدو انبساط، وہی مظلوم قوموں کی جدوجہد، وہی باقاعدہ مستند مذہب سے بغاوت، وہی رہبانیت سے جنگ، وہی وحدت الوجود کے رجحانات، وہی حسی یا حواسی حسن سے محبت، سب کچھ وہی ہے۔ اسی طرح فیض، جذبی اور اختر الایمان کی شاعری میں اگر ورڈسورتھ کے ادراک اور تخیل کا ملاپ اور تخیلی بصیرت ہے تو وکٹورین شاعری کی طرح ان کی شاعری میں مرکزی مقصد اور محرک عقلی یا ذہنی بھی ہے۔ ان میں آرنلڈ کا انکسار اور اعتدال ہے۔ اور آرنلڈ کی طرح یہ اپنی آواز میں متناسب تبدیلی بھی پیدا کر سکتے ہیں۔ آرنلڈ کی طرح ان شخصیتوں میں بھی دو متضاد قوتوں کی پیکار ہے۔ ان کی شاعری میں حسن و محبت کی دل گداز داستانیں بھی ہیں، اور بیزار کن ماحول کی تلخی بھی۔ ان میں حسن کی رنگینی میں کھو جانے کی جرأت بھی ہے اور اجنبی ہو جانے کی تمنا بھی ــ یہ شغل مے کرتے ہیں لیکن مے ناب میں تلخی زہر بھی محسوس کرتے ہیں۔ یہ عہد حاضر سے مایوس ہیں لیکن شکست خوردہ نہیں۔ ان کی شاعری میں ایک فکرمند تجسس ہے۔ یہ جانتے ہیں کہ غلامی کا دور چند روز فقط چند ہی روز ہے۔ یہ بساط الٹ جائے گا، اور وہ دن دور نہیں جس کے لئے وہ کیا کچھ گوارا نہیں کرتے۔ انہیں خصوصیات نے انہیں نیم رومانی کا لقب دیا۔

فیض کی شاعری میں جو چیز ابتداء سے کھٹکتی ہے وہ ان کی روح کی تنہائی ہے خواہ وہ ایک نظم ہو یا پورا مجموعہ لیکن پڑھتے ہوئے قاری ان کی روح کی تنہائی کبھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ بہت کچھ شیلے کی طرح ان کی اکتائی اکتائی سی نظریں اپنے گردو پیش پھرتی ہیں۔ اپنے دور کی زوال پذیر منظروں سے مایوس ہوتی ہیں اور پھر وہ اس نئے دور کی منتظر رہتی ہیں جب یہ تاریک غبار چھٹ جائے گا۔ اور وہ بھی جذبی کی طرح ہمالہ کے جگمگاتے کلس دیکھ سکیں گے لیکن یہ انتظار جو کئی معنوں میں جسمانی بھی ہے اور روحانی بھی، بہت کچھ رومانی ہے۔ اور اسی نے فیض کی شاعری میں ایسا حزن و ملال، ایسا درد و الم، ایسی غم انگیزی ہے جس میں ہارڈی یا فانی کی قنوطیت کی خشکی نہیں بلکہ جو حسین ہے ــــ جو پیاسا ہے ــــ جو خواب آور ہے ــــ جو جمالیاتی لذت سے پُر ہے ــــ فیض کی آنکھیں فکرمند بھی ہیں اور دردمند بھی ــــ لیکن جس چیز کا ہمیں شدت سے احساس ہوتا ہے وہ یہ کہ اُن کی آنکھیں منتظر بھی ہیں۔ آنے والے محبوب کی ــ کسی رنگین آنچل کی ــــ تھکے درختوں پر ٹھٹکی ہوئی، سوئی ہوئی چاندنی کی ــــ سرگوشیوں کی ــــ ایک اُلجھے ہوئے موہوم سے درماں کی ــــ اور اس عہد نو کی جس پر انہیں یقین ہے ــــ یہ انتظار کبھی ختم نہیں ہوتا ــ دل میں کھوئی ہوئی یاد سے لے کر سوختہ شکوں کی کہانی تک یہ انتظار قائم رہتا ہے۔ ان کی تنہائی ہر لمحہ بوجھل ہوتی جاتی ہے لیکن انتظار کی آخری امیدوں

کہ وہ کبھی مایوس نہیں ہوتے۔

کہا جاتا ہے کہ شیلے کی زندگی جمالیاتی و فنی اعتبار سے ایک حسین داستان ہے اور اس کی زندگی کے ہر چھوٹے بڑے واقعہ پر سمندر، جھیل اور پانی کا پُراسرار پرتو ہے۔ جھیل میں کاغذ کی ناؤ چلانا، سمندر کا سفر کرنا، ہیرٹ کا پانی میں ڈوب کر خودکشی کرنا، سمندر کے جھاگوں میں اپنے مرحوم بچے کی شبیہ دیکھنا، پانی میں ڈوب مرنے کی دعائیں مانگنا اور بالآخر خود پانی میں ڈوب مرنا یہ سب ایک ہی ہار کی مختلف کڑیاں ہیں، جو بظاہر مختلف بھی ہیں اور یکساں بھی۔ اسی طرح فیض کی ابتدائی شاعری کا مرکزی محرک تنہائی اور انتظار ہے۔ ایک خیال سے دوسرے خیال تک، ایک شعر سے دوسرے شعر تک۔ ایک نظم سے دوسری نظم تک یہی دھاگا پرویا ہوا نظر آتا ہے۔ موتی کے آبدار دانوں کی طرح ان کی ہر نظم انفرادی طور پر اپنا وجود رکھتی ہے لیکن مجموعی طور پر وہ سب ایک ہی مالا ہیں۔ ان کی پہلی نظم خدا وہ وقت نہ لائے۔ بغیر کسی تمہید کے اس انتظار کا اظہار ہے۔

وہ اپنی محبوبہ سے مخاطب ہیں اور اس وقت سے ڈرتے ہیں جب ؎

طویل راتوں میں تو بھی قرار کو ترسے
تری نگاہ کسی غم گسار کو ترسے
خزاں رسیدہ تمنا بہار کو ترسے

اور ؎

خدا وہ وقت نہ لائے کہ تجھ کو یاد آئے
وہ دل کہ تیرے لئے بے قرار اب بھی ہے
وہ آنکھ جس کو ترا انتظار اب بھی ہے

اس نظم کو پڑھتے ہی کھٹکتا ہے کہ فیض کے یہاں وصل کی سرشاری اور عریاں باری نہیں۔ ہندی شاعر کے محبوب کی طرح شاید فیض کا محبوب بھی پردیسی ہے اور ان کی شاعری میں فراق اور جدائی کا سوز، گھلاوٹ اور لذت ہے۔ لیکن یہ فراق اردو غزل کے فراق کی طرح نہیں جو چند بندھے ٹکے فقروں کے علاوہ مبہم اور ضعیف احساسات سے عاری ہے۔ فیض کے فراق میں دھوپ چھاؤں ہے، رنگینی ہے، دھڑکن ہے، کسک ہے، امید کی جھلکیں ہیں۔ فیض "تارے گنتے" ہیں تو اس لئے نہیں کہ یہ فرقت کی ایک علامت ہے، بلکہ اس لئے کہ تاروں میں ان کی بے خوابی کا اضمحلال ہے۔ فرقت کی چاندنی فیض کے لئے بے کیف نہیں، بلکہ تھکی ہوئی، کھوئی ہوئی، سوئی ہوئی، سرگوشیاں کرتی ہے، اور اسی لئے فیض کی جدائی یا فراق حسین ہے

فیض کی شاعری میں تنہائی اور انتظار مختلف شکلوں میں اُبھر کر آتے ہیں۔ آپ بھی یہ دھوپ چھاؤں دیکھئے ؎

یہ دل فگار نہیں تو ستم شعار نہیں
بہت دنوں سے مجھے تیرا انتظار نہیں
ترا ہی عکس ہے ان اجنبی بہاروں میں
جو تیرے لب، ترے بازو، ترا کنار نہیں

یا ؎

پروفیسر سلامت اللہ خاں

میری تنہائیوں پہ شام رہے!
حسرتِ دید نا تمام رہے!
دل میں بے تاب ہے صدائے حیات
آنکھ گوہر نثار کرتی ہے
آسماں پہ اداس ہیں تارے
چاندنی انتظار کرتی ہے
آ کہ تھوڑا سا پیار کر لیں ہم
زندگی زر نگار کر لیں ہم

یا ـــ

مری روح اب بھی تنہائی میں تجھ کو یاد کرتی ہے
ہر اک تارِ نفس میں آرزو بیدار ہے اب بھی
ہر اک بے رنگ ساعت منتظر ہے تیری آمد کی
نگاہیں بچھ رہی ہیں راستہ زرکار ہے اب بھی

وہ ناصبور نگاہیں وہ منتظر راہیں
وہ پاسِ ضبط سے دل میں دبی ہوئی آہیں
وہ انتظار کی راتیں طویل تیرہ و تار

انتظار و تنہائی کے یہ سائے ایک لمحے کے لئے قاری کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوتے ـــ بالآخر "انتظار" اور "تنہائی" دو باقاعدہ نظمیں بن کر آتی ہیں۔ نظم "انتظار" میں شاعر بہت حد تک روایتی ہے اور جذبات کا اظہار سیدھا اور سپاٹ ہے، شاعر نہ کوئی لطیف فن ہی استعمال کرتا ہے، اور نہ الفاظ کے انتخاب میں ہی کوئی خاص رعایت برتتا ہے۔ اسی لئے اس نظم کی اپیل بہت حد تک محدود ہے اور اس انتظار میں جو بظاہر شاعر کو اپنی محبوبہ کا ہے۔ کوئی گہرا یا معنی خیز پہلو نظر نہیں آتا۔ شاعر صرف عام احساسات کا ترجمان ہے۔ ریاضِ زیست جیسا کہ ہونا چاہئے آزردہ بہار ہے۔ شاعر کے خیال کی دنیا سوگوار ہے وغیرہ۔ اور ـــ

جو حسرتیں ترے غم کی کفیل ہیں پیاری
ابھی تلک مری تنہائیوں میں بستی ہیں
طویل راتیں ابھی تک طویل ہیں پیاری
اداس آنکھیں ابھی انتظار کرتی ہیں

نظم کا خاتمہ بھی اگر مایوس کن نہیں تو کچھ زیادہ خوش گوار بھی نہیں۔ فیض ایک تھکے ہوئے بچے کی طرح نڈھال ہو کر سہارا چاہتے ہیں ـــ

قسم تمہاری بہت غم اٹھا چکا ہوں میں
غلط تھا دعوئے صبر و شکیب آ جاؤ
قرارِ خاطرِ بے تاب تھک گیا ہوں میں

لیکن اس نظم کے برعکس تنہائی معنوی اور فنی اعتبار سے فیض کی شاعری کی معراج ہے۔ "تنہائی" اور "انتظار" جیسا میں سطور پر کہہ آیا ہوں فیض کی شاعری کی مرکزی و بنیادی خصوصیت ہے اسی لئے ان کی ساری نظمیں اس ایک نظم کے گرد گھومتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ یہ نظم بظاہر داخلی واردات کی داستان ہے لیکن بے حد معنی خیز ہے۔ نظم کی ابتدا اس لمحے سے ہوتی ہے جب شاعر کا سارا وجود سمٹ کر صرف انتظار کے ایک نقطے پر مرکوز ہے۔ خفیف سے خفیف آہٹ سے وہ چونک اٹھتا ہے اور اسے اپنے محبوب کے قدموں کی آہٹ کا دھوکا ہوتا ہے۔ یہ وہ لمحے ہے جہاں امید و مایوسی کی حدیں ملتی ہیں۔ جہاں امید کی لو ٹمٹاتی ہے۔ لیکن بجھ نہیں جاتی اور آخری لمحہ میں جیسے امید کی قندیل بھڑک اٹھتی ہے اور اس کے بعد ڈوبتی جاتی ہے، مدھم ہوتی جاتی ہے، یہاں تک کہ بجھ جاتی ہے۔

۱۔ پھر کوئی آیا دلِ زار نہیں کوئی نہیں
۲۔ راہرو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا
۳۔ ڈھل چکی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار
۴۔ لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
۵۔ گل کرو شمعیں بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
۶۔ اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
۷۔ اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا

نظم کے پہلے مصرعہ میں شاعر کا وجود ساری دنیا سے بے خبر ہے۔ وہ صرف ایک کیفیت، ایک جذبے میں مدہوش ہے۔ دوسرے مصرعے میں مایوسی کے ساتھ انتظار کی شدت کم ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اسے راہرو کا خیال آتا ہے جس کی منزل کوئی اور ہے۔ پھر انتظار کی شدت گھٹتی ہے اور مایوسی بڑھتی جاتی ہے۔ راہرو سے دھندلائے ہوئے تاروں تک، تاروں سے ایوانوں میں لڑکھڑاتے ہوئے چراغوں تک یہ مایوسی تاریک تر ہوتی جاتی ہے۔ اور اسے یقین ہو جاتا ہے کہ اب کوئی بھی نہیں آئے گا۔ اور اسی لئے شمعیں گل کرنے، مے و مینا و ایاغ بڑھا دینے اور بے خواب کواڑوں کو مقفل کرنے کی التجا ہے۔ آخری مصرعے میں "کوئی نہیں، کوئی نہیں" کی تکرار سے شاعر اپنی بے حد بوجھل ہوتی ہوئی مایوسی اور تنہائی کا ذکر کرتا ہے۔ ڈوبتی ہوئی، لڑکھڑاتی ہوئی شمعِ امید آخر بجھ جاتی ہے اور ریت کے محل جو اتنی آرزوؤں سے بنائے تھے، بے آواز مسمار ہو جاتے ہیں بس۔

نظم کے پہلے اور دوسرے مصرعے میں شاعر کو اپنے گرد و پیش ماحول کی گراں باری کا احساس نہیں۔ اس لئے کہ اس کے وجود کا ذرہ ذرہ ہمہ تن انتظار ہے۔ لیکن تیسرے، چوتھے اور پانچویں مصرعوں میں شاعر کی روح پر گرد و پیش کی گراں باری مسلط ہو جاتی ہے۔ اسی مناسبت سے شاعر مشکل قافیہ اور ثقیل الفاظ سے اس گراں باری کا اظہار کرتا ہے۔ یہاں تک کہ آخری دو مصرعوں میں شاعر کو محبوب کے نہ آنے کا یقین ہو جاتا ہے اور الفاظ سہل ہو جاتے ہیں۔ قافیے کی پابندی بھی ہٹ جاتی ہے۔

آپ نظم کو پھر پڑھئے تیسرے مصرعے سے ساتویں مصرعے تک ایک رنگ ڑاتی ہوئی، نکھری ہوئی، گہرا تو دسی کیفیت ہے۔ اور ذہن کے رگ رگ میں حرکت، بھٹکتی، رکتی، جھجکتی اور ٹھٹھکتی ہوئی سی ہے۔ ڈوبتی ہوئی قندیل کی طرح۔ ٹوٹتی ہوئی ہیروں کی طرح۔ دراصل یہ شاعر کی دھندلائی ہوئی امیدوں کا پرتو ہے۔ شاعر مایوس ضرور ہے لیکن اسے یقین نہیں آتا کہ حقیقتاً اب کوئی نہیں آئے گا۔ اس تذبذب میں اس کی روح بھٹکتی ہے، اور کسی چیز پر یقین کرنے سے کتراتی ہے۔ فن کی یہ سطیت اور نازک ترکیبیں نظم کی مجموعی تاثیر کو اور گہرا اور دیرپا کر دیتی ہیں۔ اور شاید فیض کی یہ نظم نہ صرف ان کی شاعری میں بلکہ تمام اردو شاعری میں ایک نمایاں نشانِ راہ ہے۔

فیض کی اس نظم "تنہائی" کو اگر صرف داخلی اور انفرادی واردات قلب سمجھا جائے جب بھی اس نظم کی عظمت میں کوئی فرق نہیں پڑتا، لیکن حقیقتاً یہ نظم محض انفرادی نہیں۔ یہ تنہائی اور انتظار جس کا اظہار اس فن کارانہ انداز سے فیض کرتے ہیں وہ صرف شاعر کا نہیں بلکہ اجتماعی طور پر پوری ہندوستانی قوم کا ہے۔ میں نے کہیں کہا ہے کہ فیض اپنے گرد و پیش کی چھائی ہوئی تاریکی میں شعاعِ اُمید سے محروم نہیں ہوتے۔ وہ لوگ اک جہانِ نو میں بستہ یقین رکھتے ہیں۔ اور شاید یہ یقین انہیں شکست خوردہ ہونے سے بچا لیتا ہے، اور ان کی تلخ سے تلخ اور ٹھوس سے ٹھوس حقیقت بھی خواب کے دھندلکے میں لپٹی ہوئی نظر آتی ہے۔ حساس شاعر کے لطیف ادراک پر جن تاثرات نے گھل مل کر اس نظم کی تخلیق کی اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید شاعر اپنے محبوب کے ساتھ اس جہانِ نو کا بھی منتظر ہے جس میں اسے یقین ہے۔ اگر محبوب کی آمد ایک جہانِ نو کی تعمیر کر سکتی ہے تو جہانِ نو محبوب کی طرح محبوب بھی ہو سکتا ہے۔ اس نظم کی بیشتر علامتیں اس کے انفرادی ہونے کی دلیل ہیں۔ اور سب سے بڑی دلیل اس کے سیاسی ہونے کی ہو سکتی ہے وہ یہ کہ اگر یہ نظم محض انفرادی ہوتی تو فیض اسے اپنے دور کی نظموں میں کبھی نہ رکھتے۔ اس کے علاوہ نظم کا چھٹا مصرع

اجنبی خاک نے دھندلا دیئے قدموں کے سراغ

بے حد معنی خیز ہے۔ راشد نے اجنبی خاک کا جو مطلب مقدمے میں بیان کیا ہے وہ قرینِ قیاس نہیں۔ کیونکہ اسی لفظ اجنبی کا ایک اور استعمال سنئے ؎

اجنبی ہاتھوں کا بے نام گراں بار ستم
آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے

اور شاید انہیں معنوں میں اس لفظ کا استعمال "تنہائی" میں ہوا ہے۔ تاروں کے بکھرے ہوئے غبار اور ایوانوں کے ٹمٹماتے چراغ کا مطلب راشد تہذیب کا بکھرتا ہوا شیرازہ بتلاتے ہیں، لیکن یہ بھی بہت دور از کار ہے۔ فیض کی شاعری میں رمزیت مبہم نہیں ہے۔ اور تنہائی میں اس کا استعمال تو نظم کے حسن کو بے طرح مجروح کر سکتا ہے۔ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ شاعر کے ادراک میں "محبوب" اور "عہدِ نو" گھل مل گئے ہیں اور یہ نظم انہیں ملے جلے تاثرات کی تخلیق ہے۔

فیض کی محبت کی نظموں میں اس مرکزی خصوصیت کی دھوپ چھاؤں کے بعد اور بھی بہت کچھ ملتا ہے۔ میں نے ابھی کہا ہے کہ فیض کے ہاں وصل کی سرشاری نہیں، ان کی شاعری میں جدائی کی خاموش تڑپ ہے، اس کے علاوہ کچھ روایتی محبت کے پہلو ملتے ہیں جن میں تغافل، ستم اور وفا کا مضمون دہرایا گیا ہے۔ جس میں محبوب "قاتل" ہے۔ ان کی نظم "انجام" اس سلسلے میں خاص طور پر قابلِ ذکر ہے ؎

محبت کی دنیا پہ شام آ چکی ہے

بے ہوش ہیں زندگی کی فضائیں
تغافل کے آغوش میں سو رہے ہیں
تمہارے ستم اور میری وفائیں
مگر پھر بھی اے میرے معصوم قاتل
تمہیں پیار کرتی ہیں میری دعائیں

سرود شبانہ۔ میں اس تغافل کے خلاف فیض کی ترغیب بھی سنئے ؎

پھول لاکھوں برس نہیں رہتے
دو گھڑی اور ہے بہار شباب

آخری خط کی جھڑکیاں بھی دلچسپی سے خالی نہیں ؎

وہ وقت مری جان بہت دور نہیں ہے
جب درد سے رُک جائیں گی سب زیست کی راہیں

اور فیض اس سانحہ کے انجام کے دونوں پہلو بھی واضح کرتے ہیں ؎

شاید مری الفت کو بہت یاد کرو گی
اپنے دلِ معصوم کو ناشاد کرو گی
آؤ گی مری گور پہ تم اشک بہانے
نوخیز بہاروں کے حسیں پھول چڑھانے

یا ؎

شاید مری تربت کو بھی ٹھکرا کے چلو گی
شاید مری بے سود وفاؤں پہ ہنسو گی

"مری جاں اب بھی اپنا حسن واپس پھیر دے مجھ کو" اور "تہہ نجوم" میں ہجوم شوق کی داستان ہے۔ تہہ نجوم کے خاکے اور بہت سی خوبیوں کے علاوہ بے حد دلفریب ہیں ؎

خمارِ خواب سے بریز احمریں آنکھیں
سفید رُخ پہ پریشان عنبریں آنکھیں

"تین منظر" میں یہ عکاسی مصوری کا رنگ اختیار کر لیتی ہے اور "تصور" "سامنا" اور "رخصت" کی جو تصویریں پیش کی گئی ہیں وہ جذبات کی مصوری کی عمدہ مثالیں ہیں۔

نظموں کے اس گروہ میں "میرے ندیم" خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ یوں یہ کشمکش "یاس" اور "آج کی رات" میں بھی موجود ہے لیکن "میرے ندیم" میں محبت اور رومان کے دروازے بند ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ محبت اور رعنائیاں جن میں شاعر الجھا ہوا تھا، اب اسے پہلی بار ان میں شاعرانہ وجدان کے ختم ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ "میرے ندیم" پوری نظم ایک سوالیہ نشان

ہے۔ شاعر حیران ہے کہ وہ احساسات، وہ آرزوئیں کہاں ہیں جن سے شعر کی دنیا میں جان تھی، جن سے فضائے فکر و عمل رنگین تھی۔ جن کے نور سے مہ و انجم شاداب تھے اور جن سے عشق کی ہمت جوان تھی۔ یہ تجسس بند ہوتے ہوئے اور کھلتے ہوئے دروازوں کا رازدار ہے۔ یہی نظم وہ حد ہے جہاں فیض شاعر محبت سے بڑھ کر شاعر انسان بن جاتے ہیں۔ اب تک اُن کی نگاہوں نے بقول راشد صرف حریری گلابی ملبوسوں میں لپٹی ہوئی — خواب سے چور اور لذت سے سرشار تصویریں ہی دیکھی تھیں لیکن اب وہ ان مناظر کی طرف بڑھتا ہوا نظر آتا ہے جو تلخ ہیں جن میں ملبوس کی سرسراہٹ اور خواب کی ضیا پاشیاں نہیں بلکہ زندگی کی حرارت، زندگی کی تڑپ اور پکار ہے۔ "میرے ندیم" اسی تجسس پر ختم ہوتی ہے۔ بہت کچھ میتھو آرنلڈ کی طرح اگلی محبتوں کے مزار پر فیض چراغاں کر کے خاموشی سے دبے پاؤں نکل جاتے ہیں۔ مشتاق اور بے آواز کواڑ بند ہو جاتے ہیں، شاید کبھی نہ کھلنے کے لئے۔ البتہ فیض کے دوسرے دور کی شاعری میں جس میں اکثر ان کواڑوں پر ہلکی دستک سنائی پڑتی ہے میتھو آرنلڈ کی نظم فارسیکن مرمین (Foresaken — Merman.) کی طرح جہاں بہت سی مایوس اور غم انگیز آوازیں "مارگریٹ" کو پکارتی اور واپس بلاتی ہیں، لیکن مارگریٹ جا چکی ہے اور لوٹ کر نہیں آسکتی۔ یہ مارگریٹ سوئیزرلینڈ کے ایک ہوٹل میں ملازمہ یا گورنس تھی، جس سے آرنلڈ نے پہلی بار محبت کی، اور اسے اپنانے کی جرأت نہ کر سکے۔ زندگی کی اعلیٰ قدروں اور مقاصد کی قربان گاہ پر آرنلڈ نے بھینٹ بڑے عزم اور استقلال سے دی۔ لیکن وہ کھوئی ہوئی مارگریٹ کی یاد کبھی فراموش نہ کر سکے۔ بقیہ زندگی میں مارگریٹ نہ صرف ایک لڑکی اور ان کی کھوئی ہوئی محبوبہ تھی بلکہ آرنلڈ کے لئے رومان اور محبت کا سمبل (Symbol) تھی۔ فیض کی رومانی فطرت بھی انہیں اکثر اور بار بار واپس بلاتی ہے، لیکن یہ بند کواڑ نہیں کھلتے صرف دستک کی آواز آتی ہے۔ کواڑوں کے اس طرح مقفل ہو جانے کے بعد اور نئے دروازے دوسری شاہراہوں پر کھلتے ہیں۔ وہ شاہراہیں جہاں رنگین و حریری ملبوسات ہیں نہ کیف شراب نہ خمار خواب سے لبریز آنکھیں۔ نہ رخساروں کے عشرت آلود غازے۔ نہ سرخ ہونٹوں پہ تبسم کی ضیا۔ نہ مرمریں ہاتھوں کی لرزشیں۔ نہ مخملیں باہیں اور نہ ڈھلکتے ہوئے آنچل۔ یہ شاہراہیں بدنما ہیں، ٹھوس ہیں اور ان میں حقیقت کی جھلک ہے۔ جہاں خاک و خون میں لتھڑے اور نہائے ہوئے جسم، بازاروں میں مزدوروں کا بکتا ہوا گوشت بھوک اگنے والے کھیت، ناتوانوں کے نوالوں پر جھپٹے ہوئے عقاب۔ آرزوؤں کی مقتل گاہیں، اجنبی ہاتھوں کا بے نام ستم، دلوں کی بے سود تڑپ اور جسموں کی مایوس پکار ہے۔

اس نئے دور کی پہلی نظم "مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ" ہے اور اس میں شاعر کی اس ناسمجھی کا ذکر ہے جب اس نے محبت کو اپنی زندگی کا مقصد اور ماحصل سمجھا تھا اور اس ناسمجھی پر ندامت بھی ہے۔ اور ماتم بھی ہے۔ لیکن شاعر نے انسانیت کی پکار سن لی ہے۔ اور اسے یہ احساس مکمل طور پر ہو چلا ہے کہ ؎

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

حسن و عشق کی رعنائی اسے اس حد تک اپیل نہیں کرتی کہ وہ زندگی کی اور بہت سی اہم حقیقتوں سے آنکھیں بند کر لے ؎

ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخواب میں بنوائے ہوئے

جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے

اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجے
لوٹ جاتی ہے اُدھر کو بھی نظر کیا کیجے

"چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز" ان کی پہلی سیاسی نظم ہے۔ اس میں انہیں اس ظلم و ستم کا شعور بھی ہے جو ہندوستان کی سیاسی تحریک پر روا رکھا گیا۔ اور اس کے ساتھ اس کا یقین بھی ہے کہ شنشاہی کی سفاک ختم چند روز میں ٹوٹ کر بکھر جانے والی ہے ؎

لیکن اب ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں
اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں

اس زنجیر کی دوسری کڑی ان کی نظم "سیاسی لیڈر کے نام" ہے۔ سالہا سال کی جدوجہد کچھ ایسی ہی تھی کہ جیسے تنکا سمندر سے زور آزمائی کرے۔ لیکن ان ناکامیوں اور بے شمار زخموں کے باوجود فیض "طلوعِ نو" کی پیشین گوئی کرتے ہیں۔ انہیں دور سے صبح کی آواز آتی ہے۔ "اے دلِ بے تاب ٹھہر" میں عہدِ نو کی امیدیں اور قوی ہو جاتی ہیں ؎

یہ تاریکی تو ہے غازۂ رخسارِ سحر
صبح ہونے ہی کو ہے اے دلِ بے تاب ٹھہر

اور ؎

جلوۂ سطوتِ اسباب بھی اُٹھ جائے گی
یہ گراں باریٔ آداب بھی اٹھ جائے گی
خواہ زنجیر چھنکتی ہی چھنکتی ہی رہے

چوتھی سیاسی نظم "کتے" میں عوام کی خفیہ قوتوں کا اظہار ہے۔ ان ممکنات پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ عوام متحد ہو کر بغاوت پر آمادہ ہو جائیں تو حکومت کی مضبوط سے مضبوط بنیاد کو ہلا سکتے ہیں۔ لیکن ؎

کوئی ان کو احساسِ ذلت دلا دے
کوئی ان کی سوئی ہوئی دُم ہلا دے

اس آخری دور کی نظموں کو پڑھتے ہوئے تعجب ہوتا ہے کہ فیض اقتصادی بربادی یا معاشرتی الجھاؤ کو اپنا موضوعِ سخن نہیں بناتے۔ شاید ان تمام مسائل کا حل وہ سیاسی آزادی سمجھتے ہیں۔ اس لئے جہاں کہیں بھی مزدور یا سرمایہ کار کا ذکر آتا ہے وہ ضمنی طور پر۔ جس چیز کا احساس فیض کو تمام جدید شعراء سے زیادہ ہے وہ سیاسی غلامی ہے جو اجداد کی میراث بھی ہے اور ذلت اور بربادی کا باعث بھی ——— اس سیاسی غلامی کے مہلک اثرات کا مکمل اظہار ہمیں ان کی نظم "ہم لوگ" میں ملتا ہے ؎

پروفیسر سلامت اللہ خان

راہ کے ایواں میں لٹے گرد شدہ شمعوں کی قطار
در خورشید سے بہتے ہوئے اکتائے ہوئے

نوجوان طبقہ نہ صرف پہلے ہی کی ذاتوں سے شکستہ تھا بلکہ اپنے زمانے میں ہی سیاسی تحریکوں کی شکست بھی دیکھ چکا تھا۔ اس لئے وہ مستقبل سے بھی مایوس تھا۔ اس کے نزدیک مستقبل ہی ایک طویل تاریکی تھی اور یہ محرومیاں مل جل کر اس کے اندر ایک عجیب حد غم انگیز طریقے سے اظہار ہوتی تھیں

مضمحل ساعتِ امروز کی بے رنگی سے
یادِ ماضی سے غمیں دہشتِ فردا سے نڈھال
تشنہ افکار جو تسکین نہیں پاتے ہیں
سوختہ اشک جو آنکھوں میں نہیں آتے ہیں
اک کڑا درد کہ جو گیت میں ڈھلتا ہی نہیں
دل کے تاریک شگافوں سے نکلتا ہی نہیں
اور اک الجھی ہوئی موہوم سی درماں کی تلاش
دشت و زنداں کی ہوس چاکِ گریباں کی تلاش

زندگی کے ان تلخ اور سنگین حقائق سے دوچار ہو کر یہ بھی ممکن تھا کہ فیض، راشد کی طرح ہزیمت خوردہ ہو کر شراب اور عورت میں پناہ لیتے یا ان تمام مسائل کا حل میرا جی کی طرح احتمالی خودکشی میں دیکھتے لیکن فیض کی شاعری میں ایسے رجحانات نہیں ملتے۔ انہیں طلوعِ نو پر یقین ہے۔ جسے ہم ایک قسم کی رجائیت بھی کہہ سکتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جہاں فیض کے موضوعات میں موت و زیست کی صف آرائی، شہر کی فراواں مخلوق پر مرگ کی دیواریں اور خوابوں کی مقتل گاہیں ہیں وہاں وہ کسی شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹ یا کسی جسم کے کم بخت دلآویز خطوط نہیں بھولتے۔ دراصل یہ وہی رنگ ہے جو ہمیں رومان اور محبت کے مقفل دروازوں پر شناسائی بخشتا ہے۔ تمام کی ساری مہجور اداسی میں وہ چشمۂ مہتاب سے دھلی ہوئی رات کا حسن فراموش نہیں کرتے۔ اور:

آج پھر حسنِ دلآرا کی وہی دھج ہوگی
وہی خوابیدہ سی آنکھیں وہی کاجل کی لکیر
رنگِ رخسار پہ ہلکا سا وہ غازے کا غبار
صندلی ہاتھ پہ دھندلی سی حنا کی تحریر

یا:

جانے کس زلف کی موہوم گھنی چھاؤں میں
ٹمٹماتا ہے وہ آویزہ ابھی تک کہ نہیں

احساس کی اس شدت کے باوجود انگریزی رومانی شعراء کی طرح اپنے جذبات کی رو میں نہیں بہتے۔ اُن کے یہاں

چیخ پکار نہیں ملتی۔ صرف ایک دبی دبی سی آہ ہے۔ ان کے نغمے کے شعلوں میں جلتی ہوئی چتاؤں کی لپک نہیں ہے۔ صرف ایک ہلکی ہلکی سی آنچ اور دمک ہے۔ یہی خود ضبطی یا ٹھہراؤ ان کو وکٹورین دور کی انگریزی شاعری کے توازن سے ملا دیتی ہے۔ ان کی شاعری کی اپیل زیادہ تر ذہنی ہے اور توازن اور ٹھہراؤ کی وجہ سے جو فیض اور جذبی کی نمایاں خصوصیت ہے ان کی شاعری میں آرنلڈ کی شاعری کی طرح عظمت اور سکون کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے شب و روز میں چکا چوند کرنے والی روشنی نہیں بلکہ اُن کی غم انگیز دنیا چاندنی کی مدھم روشنی میں جھلملاتی نظر آتی ہے۔

فیض کے کلام کے مجموعے میں نظموں کا ایک گروپ ایسا بھی ہے جو شاعر کی فن کاری اور مصوری کا اعلیٰ نمونہ ہے "سرود شبانہ" "ستہ نجوم" "یاس" اور "ایک منظر" میں ایک پُر اسرار خاموشی اور معنی خیز سرگوشی ہے۔ پُر سکون اور خواب آور مناظر شاعر کی روح کی طرح بوجھل اور نڈھال ہیں، لیکن ان مناظر کی افسردگی اور اضمحلال میں سرگوشیاں سنائی پڑتی ہیں۔ ان نظموں میں نئی شاعری کا تجسس ہے اور دراصل یہی نظمیں اس عبوری دور کی نشانی ہیں، جہاں شاعر شاعر محبت سے شاعر انسان بنتا ہے۔ ان نظموں کا حسن و سکون آنے والے طوفان کا پیش خیمہ ہے۔ "سرود شبانہ" خاص طور پر قابل ذکر ہے کیونکہ اس نظم میں شاعر نہ صرف عالم خود فراموشی میں ہے بلکہ اس کے وجود کا ذرہ ذرہ اپنے گردوپیش کے منظر سے ہم آہنگ ہے ؎

سو رہی ہے گھنے درختوں پر
چاندنی کی تھکی ہوئی آواز
کہکشاں نیم وا نگاہوں سے
کہہ رہی ہے حدیث شوق نیاز

ساز دل کے خموش تاروں سے
چھن رہا ہے خمار کیف آگیں
آرزو، خواب تیرا روئے حسیں

ان نظموں میں منظر نگاری کے باوجود جس اختصار سے کام لیا گیا ہے وہ فنی اعتبار سے بے حد بلند ہے، اور بعض مصرعے بذات خود ایک نظم ہیں۔ اس کے علاوہ ان نظموں میں جو اوزان استعمال کئے گئے ہیں، ان کے رکن میں روانی و دوانی کیفیت نہیں ہے بلکہ ٹھہری ہوئی حرکت ہے جو نظم کی کیفیت کی مناسبت سے نہ صرف موزوں ہے بلکہ جس سے شاعر کو اظہار میں بڑی مدد ملتی ہے۔

فیض کی شاعری میں راشد یا میراجی کی اشاریت یا رمزیت نہیں ہے کیونکہ زندگی کے جن مسائل پر ان کی نظر پڑتی ہے وہ فکر انگیز ہونے کے باوجود سادہ ہیں۔ ان میں وہ پیچیدگی نہیں جو راشد یا میراجی میں ہے۔ اس لئے فیض کا بیان سلجھا ہوا اور صاف ہے۔ چند ترکیبوں اور نظموں میں قوافی کے رد و بدل کے علاوہ ہمیں ان کے اسلوب بیان میں کوئی نئی بات نہیں ملتی۔ لیکن دیگر جدید شعراء کی طرح فیض نے بھی اردو شاعری کو بہت سے نئے الفاظ اور تشبیہوں سے روشناس کرایا۔ راشد نے "نقش فریادی" کے مقدمے میں لکھا ہے، "فیض ہمارے زمانے کے بعض دوسرے شاعروں کی طرح تشبیہات کا دلدادہ نہیں۔ اگر آپ اس کی نظموں کو

پروفیسر سلامت اللہ خاں

غور سے دیکھیں تو شاید ہی کوئی تشبیہ آپ کو مل سکے۔ تعجب ہے راشد جیسے شاعر کو فیض کی تشبیہات کا حسن نظر نہیں آتا۔ یہ صحیح ہے کہ فیض کی شاعری میں تشبیہات کی بہتات نہیں لیکن جو تشبیہیں ہمیں ملتی ہیں وہ بڑی انوکھی اور بے حد حسین ہیں۔ ان تشبیہات کی کچھ مثالیں آپ بھی سنئے۔ ؎

سرخ ہونٹوں پر تبسم کی ضیائیں جس طرح
یاسمن کے پھول ڈوبے ہوں مے گلنار میں

حسن محبوب کے سیال تصور کی طرح
اپنی تاریکی کو بھینچے ہوئے لپٹائے ہوئے

سیاسی جدوجہد کے متعلق ؎

جس طرح تنکا سمندر سے ہو سرگرم ستیز
جس طرح تیتری کہسار پہ یلغار کرے

تیرگی ہے کہ امنڈتی ہی چلی آتی ہے
شب کی رگ رگ سے لہو پھوٹ رہا ہو جیسے

یا ؎

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آ جائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے باد نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آ جائے

ایک افسردہ شاہراہ دراز
دور افق پر نظر جمائے ہوئے
سرد مٹی پہ اپنے سینے کے
سرمگیں حسن کو بچھائے ہوئے

جس طرح کوئی غمزدہ عورت
اپنے ویراں کدے میں محو خیال
وصل محبوب کے تصور میں
مو بمو چور، عضو عضو نڈھال

ڈاکٹر شوکت سبزواری

شاعرِ حیات و کائنات

فیض اردو کے جدید شاعر ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جدید شعرائے اردو میں ان کا کیا مقام ہے؟ میرا خیال ہے کہ اردو کے جدید شعرا کے، جن میں نظم اور غزل گو دونوں ہی شامل ہیں، دو بڑے حلقے ہیں۔ پہلا حلقہ ان شاعروں کا ہے جو جدید ہونے کے ساتھ ساتھ ماضی سے بھی اپنا رشتہ جوڑے رکھتے ہیں اور قدیم کلاسیکی رنگِ شعر کے کسی رنگ سے ان کا فنی اعتبار سے تعلق ہے۔ یہ تعلق بڑی بات ہے کیونکہ ۔ ۔ ۔ ۔ جو انہیں متاثر کرے اور آپ بھی اسی کی طرح ترقی پذیر ہے۔ بعض نے تجربوں کی مدد سے اس نے شعری روایت کو دو قدم نہیں بلکہ آگے بڑھایا ہے۔

ٹھہرے نہیں موسمِ گل کے قدم تاہم ترے جمالِ شمس و قمر کی کیفیت

فیض اسی حلقے کے شاعر ہیں۔ ان کا تعلق قدیم اردو شعرا میں سے خصوصیت کے ساتھ غالب سے ہے۔ اقبال کے ذریعے سے غالب تک پہنچے۔ غالب و اقبال دونوں کی روایت کو انہوں نے آگے بڑھایا۔ وہ اس سلسلے کی تیسری کڑی ہیں جس کا آغاز غالب سے ہوا۔ فیض کی شاعری، اقبال کی شاعری کا پہلا قدم ہے۔ لیکن سمت کسی قدر بدلی ہوئی ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ غالب فکر و فن دونوں اعتبار سے اردو کا انقلابی شاعر ہے۔ اس کے فکر کی بنیاد "دیدۂ بینا" ہے جیسے قطرے میں دجلہ نظر آیا اور اس کا فن دلِ گداختہ کا رہینِ منت ہے جس نے فروغِ شمعِ سخن کو حسن کی کروڑ میں جگمگایا۔ غالب کے فکر و فن کے اس امتزاج نے غالب کے لئے حیات و کائنات کو کوئی حجاب حجاب نہ رکھا، پردہ ساز بنا دیا۔ غالب نے قطرے میں دجلہ کو جلوہ گر دیکھا، اقبال نے قطرے میں دجلہ کا مشاہدہ کرایا۔ غالب نے ذوقِ نظر سے کام لیا۔ اقبال نے ذوقِ نظر کے ساتھ ساتھ دستِ نظر کو بھی کار فرما رکھا۔ غالب کا فن حسن کاری ہے۔ اقبال کا فن جہاں بینی اور کارسازی۔ غالب کی آواز میں لوچ اور شیرینی ہے اقبال نے نغمہ تیز تر کرنے کے لئے لَے کو کسی قدر کرخت اور تلخ کر دیا ہے۔ غالب کے سلسلے میں مشاہدہ کی اہمیت بھی ہے اور مجاہدے کی بھی۔ غالب کے یہاں مشاہدے کی لَے بڑھی ہوئی ہے۔ اور اقبال کے یہاں مجاہدے کی اور یہ مقام ہے جہاں اقبال غالب سے آگے بڑھ کر ضربِ کلیمی سے کام لیتے نظر آتے ہیں۔ غالب اور اقبال کا تقابل اس وقت پیشِ نظر نہیں۔ ان دو قدموں کا سہارا لے کر ذہنی اور فنی ارتقا کے ان نقوش اور منزلوں کو اجاگر کرنا مقصود ہے جن سے گزر کر فیض اپنے موجودہ مقام تک پہنچے۔

[غالب اور اقبال کی طرح فیض کی شاعری کے مزاج کی تعمیر بھی دیدۂ بینا اور دلِ گداختہ کے عناصر سے ہوئی ہے۔ اس لئے ان کے یہاں

حسن کاری کے پہلو بہ پہلو جہاں بینی بھی ہے ۔ اور کارآگہی بھی، شیریں بیانی بھی ہے اور تیغ زنی بھی ۔ غالب و اقبال کی طرح ہر چند فیض نے مشاہدہ و مجاہدہ دونوں سے یکساں کام لیا ہے ۔ لیکن انھوں نے اپنی فکر کو حیات و کائنات یا انفس و آفاق کے مناظر و مظاہر تک محدود نہیں رکھا ۔ اس سے آگے انسانی زندگی کی تخریب و تعمیر کی دلچسپی اور اس کے ہنگاموں میں شرکت بھی کی تب نے تماشائی کی طرح کنارے سے دریا کا مشاہدہ کیا تھا ۔ اقبال نے اپنی فکر کو ذرے کے دل میں خورشید کا اور پھول کی پنکھڑیوں میں حسن حقیقی کے جلوے تڑپتے دیکھا ۔ ہر چند اقبال نے کہا تھا ؎

سبا ما بزم بر ساحل کہ آنجا
نوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و با موجش درآویز
حیات جاوداں اندر ستیز است

لیکن یہ حقیقت ہے کہ اقبال نے ساحل زندگی پر بزم آرائی کی اور دریا کی موجوں سے گتھ جانے کی انھیں کبھی ہمت نہ ہوئی انسانی جدوجہد یا معاشرے کی اجتماعی جدوجہد سے آخر تک وہ الگ تھلگ رہے ۔

فیض نے اس جدوجہد میں حصہ لیا اور اپنی اس زندگی کے تجربات کو شاعری میں ڈھال کر پیش کیا ۔ فیض کی شاعری کا آغاز ۱۹۲۸ء کے لگ بھگ ہوا ۔ اس زمانے میں سیاسی تحریکوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا ۔ ملک سیاسی اور معاشی بحران سے گزر رہا تھا ۔ فیض جیسا حساس شاعر اپنے زمانے کے سیاسی انتشار اور معاشرے کے بحران سے بے نیاز نہیں رہ سکتا تھا ۔ لیکن سیاسی اور سماجی فضا سے زیادہ فیض ادبی فضا سے متاثر ہوئے جو کسی نے کہا ہے کہ شاعر شاعری کی کوکھ سے جنم لیتا ہے فیض نے حسرت، جوش، اختر اور حفیظ کی تقلید کی اور ان کی طرح حسن سے لو لگائی اور عشق و محبت کے گیت گائے ۔ وہ ابھی عشق کی اولین منزل ہی میں تھے اور جیسا کہ انھوں نے لکھا ہے تو اس دور کی ایک جھلک بھی اچھی طرح دیکھ نہ پائے تھے کہ صحبت یار آخر شد ۔

فیض کی شاعری کا یہ پہلا رومانی دور ہے جو اس کی شاعری کے لئے ایک نقش اول کی حیثیت رکھتا ہے ۔ فیض کی شاعری کا دوسرا موڑ غالباً ۱۹۳۵ء کے بعد اس وقت آیا جب ترقی پسند تحریک کی داغ بیل پڑی ۔ اس سے پہلے مزدور تحریکوں کا ایک سلسلہ شروع ہو چکا تھا [illegible] صاحبزادہ محمود الظفر اور ان کی بیگم رشید جہاں کی رفاقت نے فیض کو ترقی پسند تحریک سے قریب تر کیا ۔ اور ترقی پسند تحریک نے فیض کو شدت کے ساتھ یہ احساس دلایا کہ وہ انسانی معاشرے کے ایک فرد اور دجلہ کے ان گنت قطروں میں سے ایک قطرہ ہیں ۔ اس احساس نے فیض کی دنیا بدل دی ۔ اب تک وہ ایک ناظر کی حیثیت سے کنارے پر دریا کا مشاہدہ کرتے رہے تھے ۔ اس کے بعد قطرہ بن کر ۔ اقبال کے لفظوں میں دریا میں ڈوب کر ۔ انھوں نے دریا کی اور اس کی بے چین لہروں کی سیر کی اس وقت تک انہوں نے محبت کے گیت گائے تھے ۔ خواب اور خیال کی اپنی الگ دنیا بسا کر محبوب سے کہا تھا ؎

پھول لاکھوں برس نہیں رہتے
دو گھڑی اور ہے بہار شباب
آؤ کچھ دل کی سن سنائیں ہم
آؤ محبت کے گیت گائیں ہم

آسماں پر اداس ہیں تارے
چاندنی انتظار کرتی ہے
آ کہ تھوڑا سا پیار کر لیں ہم
زندگی زرنگار کر لیں ہم

اجتماعی شعور کے بیدار ہوتے ہی فیض کو محبوب سے یہ کہہ کر معذرت کرنی پڑی ؎

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخواب میں بنوائے ہوئے
جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے
لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجے
اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

اس نظم کا معروف مصرعہ

اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجے ؎

فیض کی شاعری کے مزاج کی غمازی کرتا ہے۔ فیض کی شاعری حسن و حقیقت کے متوازن اور حکیمانہ امتزاج کا دلکش مرقع ہے جس میں حسن کی دلکشی بھی ہے۔ اور حقیقت کی تلخی روح فرسا تلخی بھی۔ کائنات کی حسین و جمیل مناظر دیکھتے دیکھتے فیض کی نظر یکایک معاشرے کے دلدوز اور بھیانک مناظر کی طرف لوٹ جاتی ہے۔ وہ ان کی تصویر کشی کچھ اس انداز سے کرتے ہیں کہ قاری ان سے متاثر ہو کر ان کی اصلاح کی فکر میں لگ جاتا ہے۔ قدیم اردو شاعری کا مزاج تھا جو غم ہوا اسے غم جاناں بنا دیا۔ غم جاناں اردو کے کلاسیکی شعرا کے لئے درد و درماں کا گویا ایک مداوا تھا ؎

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا

اس دور کی جدید انقلابی شاعری کا مزاج ہے "کیوں نہ جہاں کا غم اپنا لیں"۔ فیض کے یہاں غم جاناں اور غم دوراں، جیسا کہ انھوں نے کہا بھی ہے، ایک تجربے کے دو پہلو ہیں۔ ان کی شاعری میں دونوں کی جھلک ہے۔ انھوں نے زندگی کے دونوں پہلوؤں کی ترجمانی کی ہے لیکن گھلا ملا کر ایک جان یک قالب بنا کر۔

فیض کی شاعری میں قوس و قزح کی سی رنگینی ہے۔ اس میں کئی رنگ گھل مل کر ایک ہو گئے ہیں جس کے بیچ میں دھیان غالباً ان نازک رنگوں کی آنکھ مچولی کی وجہ سے ہے جس نے ایک گہری لطیف، نازک "ایمائیت" یا اشاریت کو جنم دیا ہے۔ فیض جو کہنا چاہتے ہیں صراحتاً اس کا ذکر نہیں کرتے ؎

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا

وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

فیض کے اندازِ بیان کی دلکشی، نشتریت، رچاؤ، اور حسن منتج ہے ان کے جذبات کے خلوص، فکر کی روشنی، نظر کی بے باکی، خیالات کی پختگی اور فن ریاض کا۔ فیض نے محبت کر کے اور داغِ دل پا کے دل کو مرتاض، خیالات کو پختہ، جذبات کو حسنِ معصوم کی طرح پاک اور لطیف بنایا اور آخر کار وطن اور اہالیانِ وطن کا دکھ درد اپنا کر سوا سرانداز ہوئے۔ فکر و فن کے ریاض رچاؤ کی یہ داستان فیض کی حسین نظم "شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں" میں تفصیل سے بیان ہوئی ہے۔ اس کے تین موڑ ذکر کے قابل ہیں۔ اول میں کسی کی محبت کی شمع روشن ہوتی ہے ؎

شاید کہ انہیں ٹکڑوں میں کہیں

وہ ساغرِ دل ہے جس میں کبھی

صد ناز سے اترا کرتی تھی

صہبائے غمِ جاناں کی پری

دنیا والے ساغروں کو ٹھکرا دیتے ہیں اور صہبائے غمِ جاناں مٹی میں مل جاتی ہے تو دل کو دیا رہنے جگمگایا جاتا ہے ؎

یہ رنگیں ریزے ہیں شاید

ان شوخ بلوریں سپنوں کے

تم مست جوانی میں جن سے

خلوت کو سجایا کرتے تھے

تیسرے موڑ میں سنگین حقائق کا تیشہ دل پر پتھراؤ کرتا ہے ؎

ناداری دفتر بھوک اور غم

ان سپنوں سے ٹکراتے رہے

بے رحم تھا چومکھ پتھراؤ

یہ کانچ کے ڈھانچے کیا کرتے

بیان کی ان تین منزلوں سے گزر کر فنکار کے فن میں رچاؤ، فکر میں پختگی، جذبے میں گہرائی، احساس میں شدت اور خیالات میں استواری آئی۔ فیض کی قادر الکلامی اور صنعت کاری کے نمونے ان کے کلام میں آبدار موتی کی طرح بکھرے ہوئے ہیں۔ میں ایک نظم کے صرف دو بندوں کے اقتباس پر اکتفا کروں گا

یہ کون سخی ہیں

جن کے لہو کی اشرفیاں، چھن چھن، چھن چھن

دھرتی کی پیہم پیاسی

علی عباس حسینی

شاعرِ باعمل

قدیم و جدید کی آویزش بہت پرانی ہے۔ قدامت نے ہمیشہ جدت کو ٹوکا، نئے نے سدا پرانے کی ہنسی اڑائی لیکن حال برابر ماضی کی جگہ مستقبل پر برابر نگاہیں جمائے رہا۔ وجہ ظاہر ہے۔ انسانی فطرت یکسانیت سے گھبراتی ہے۔ وہ ہمیشہ جدید سے جدید تر کی تلاش میں رہتی ہے۔ اسی جستجو نے علوم کے نئے جھمیلے اور نئے اکتشافات و ایجادات کی بانی بنی۔ آرٹ اور ادب کی دنیا بھی اس کلیہ سے بری نہیں۔ اس لیے شعر و نظم میں بار بار تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ہیئت بھی بدلتی ہے، مواد بھی۔ اردو شاعری پر بھی اسی ڈھنگ سے تجدد کا رنگ چڑھا۔ بھاشا، کھڑی بولی اور دکنی کے ڈھانچوں کو ترک کر کے وہ فارسی کے ڈھانچے میں ڈھلی۔ آزاد و حالی نے اسے ایک نئی راہ دکھائی۔ موضوعات میں بھی تبدیلی ہوئی۔ اقبال نے اس میں اسلامی تفکرات کا اضافہ کیا۔ چکبست نے اسے حب الوطنی سے مالا مال کیا۔ ایک اور قدم آگے بڑھا۔ سیاست بھی داخل ہوئی۔ حسرت کی غزل میں چکی کی مصیبت بھی برابر کی شریک بن بیٹھی۔ جوش نے انقلاب کا نعرہ بلند کیا۔ نظم میں ہندی اور انگریزی ہیئتوں نے بھی اپنی جھلک دکھائی۔ ترقی پسند نوجوانوں نے اسے قافیہ و ردیف کی باگ ڈور ہاتھ سے چھوڑ کر آزمایا اور آزاد نظم وجود میں آئی۔

غرض قدیم شعرا "از ماجرائے حکایت مہر و وفا مپرس" کہہ کر اپنے دائرہ بیان کو تنگ کر لیا کرتے تھے۔ نئی نسل کے شعرا نے "اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا" کہہ کر زندگی کے ہر پہلو کو موضوع سخن بنا لیا۔ وہ معاش کی حکایات بھی سنانے لگے اور معاشرت کے نکات بھی بیان کرنے لگے۔ انھوں نے سیاستِ مدن سے بھی بحث کی، بین الاقوامی تعلقات سے بھی۔ نجی اور ذاتی احساسات و جذبات اور شعوری و غیر شعوری کیفیات کو بھی انھوں نے بے باکی سے بے نقاب کیا اور اجتماعی میلانات اور رجحانات و اقتصادیات و افادیات کو بھی۔ اب جو شاعری میں مزدور و کسان، سرمایہ دار اور پونجی پتی کی آویزشیں بھی سنائی دینے لگیں اور خلا میں پرواز کی حکایات اور ستاروں سے آگے کے جہان کی باتیں بھی۔ غرض ہر طرح کا خیال، جذبہ، احساس، احتساب، کیفیت، مشاہدہ، تجربہ، اکتشاف و ایجاد ہماری شاعری کا موضوع بن گیا۔

ظاہر ہے کہ کینوس کے بڑے ہونے سے ہیئتِ اظہار میں تبدیلیاں ہوئیں، قافیہ و ردیف کی پابندیاں ٹوٹیں، ایمائی الفاظ کو نئے اور وسیع تر معنی دیئے گئے، زبان و محاورے سے چھیڑ دستیاں کی گئیں اور ترنم و غنائیت نئی شاعری سے تقریباً غائب ہونے لگی۔ بعض ترقی پسندوں نے شاعری کو پروپیگنڈہ اور نعرہ کا مترادف بنا لیا۔ بعض نے ایسا کلام پیش کیا کہ نظم و نثر میں فرق کرنا محال ہو گیا۔ اور بعض نے ایسی زبان اور انداز بیان اختیار کیا کہ وہ نہ خود مفہوم سمجھے اور نہ ناظر و سامع ہی کے کچھ سمجھ میں آیا۔

بحروں کے اوزان اور قافیہ و ردیف شعر کے تال و سم ہیں۔ یہ کلام موزوں کی غنائیت کو بڑھاتے ہیں اور اس میں ایک سامع نواز کیف پیدا کرتے ہیں۔ پرانی شاعری کے انہی گلکوں نے اپنی نغمگی کی وجہ سے ہر دلعزیزی حاصل کر لی تھی۔ اس کے نغز اشعار اور اس کی غزلیں ہر اردو سمجھنے والے کے لیے رفیقِ زندگی اور رفیقۂ حیات بن گئی تھیں۔ عام زندگی کی تنظیم کا ایک ضروری اور حسین جز۔ نئی نظمیں اور خاص طور سے آزاد نظمیں صرف کتابوں اور رسالوں میں پڑھی جا سکتی ہیں۔ لیکن نہ وہ زبانوں پر چڑھتی ہیں اور نہ دلوں میں اترتی ہیں۔ اسی لیے وہ صحیح معنوں میں قدیم شاعری کی طرح زندگی کا ساتھی نہیں بن سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک مشاعرے کی مرغوب عام ہیں اور ہر ایک غزل ہی کے شعر گنگناتا پھرتا ہے۔ اور نئی شاعری نے بجائے قبولیتِ عام حاصل کرنے کے جدت کی لذت بھی کھو دی اور عام پسندی بھی۔

لیکن ان جدید شاعروں میں فیض کا ایک خاص مقام ہے۔ ان کا ہر طبقے اور ہر گروہ میں احترام ہے۔ ان کے کلام نے قبولِ عام کی سند حاصل کر لی ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ وہ قدیم و جدید کا سنگم ہے۔ فیض غزلیں بھی کہتے ہیں اور نظمیں بھی۔ انھوں نے قدیم روایات کا وقار بھی قائم رکھا ہے اور جدید خیالات کو ان کا ہم آہنگ بھی بنایا ہے۔ انھوں نے اپنی وسعتِ بیان کو تنگنائے غزل تک محدود نہیں رکھا ہے۔ انھوں نے موضوع کے لیے ہیئت کو تلاش کیا ہے ہیئت کی خاطر موضوع کی قطع و برید نہیں کی ہے۔ ان کی نظموں میں گت اور راگ، آہنگ و ساز کی ہم آہنگی میں کوئی خراش نہیں آئی ہے۔ نہ لے بگڑی ہے اور نہ بےسرا پن پیدا ہوا ہے۔ گفتار میں کتنی ہی گرمی سہی لہجے کی نرمی اور شیرینی میں بال نہیں پڑا ہے۔ ان کی زبان سے سیاسی نظریات تک شعر و نغمہ کا جامہ پہن کر نکلے ہیں۔

فیض ایک ایسی سیاسی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں جس نے افادیت کو شعریت پر ترجیح دے کر اپنا وطیرہ بنا لیا ہے اور شعر و ادب کو پروپیگنڈے اور تحریک میں تبدیل کر دیا ہے۔ اس کا آرٹ بھی میکانکی ہو کر رہ گیا ہے اور اس کا ادب بھی صرف اشتراکیت کا پرچارک۔ لیکن گو فیض نے اپنے اصول کے لیے طرح طرح کی تکلیفیں دیں، معاش کی تنگی برداشت کی، قید و بند کی بلاؤں کو بار بار جھیلا، بلکہ دار کی دھمکی بھی سچ مچ چکھ آئے۔ مگر اپنے کلام میں بدمیتی نہ آنے دی، نہ تو شاعری کو صحیفۂ سمع خراشی بننے دیا اور نہ انھوں نے "پہلا جام کریں گے" کی قسم کی شاعری کو منھ لگایا۔

عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ سیاسی عقوبتیں اور قید و بند کے آلام مزاج میں درشتی اور لب و لہجہ میں تلخی پیدا کر دیتے ہیں لیکن فیض کا کلام سارے مصائب جھیلنے کے بعد بھی غزل ہی کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ وہی شیرینی، وہی رس، وہی مٹھاس، وہی نغمگی، وہی موسیقیت، وہی ترنم اور زیر و بم کا وہی توازن "جو پہلے تھا سو اب بھی ہے۔" ان کے کلام کے تین[1] مجموعے ہیں۔ نقشِ فریادی، دستِ صبا اور زنداں نامہ۔ نقشِ فریادی سب سے پہلا مجموعہ ہے۔ دستِ صبا اس کے بعد طبع ہوا اور زنداں نامہ سب سے آخر میں۔ نقشِ فریادی کی غزلیں ہوں یا نظمیں پورا کلام رومانیت میں ڈوبا ہوا ہے۔ نقشِ فریادی کا دور فیض کا عہدِ شباب ہے اس لیے جنسی تحریک و ترغیب فطری ہے۔ وہ اس طرح کے شعر بھی کہتے ہیں۔

پھول لاکھوں برس نہیں رہتے
دو گھڑی اور ہے بہارِ شباب

---

[1] فیض صاحب کا چوتھا مجموعۂ کلام "دستِ تہِ سنگ" بھی گزشتہ دنوں شائع ہو گیا ہے۔ (ادارہ)

یا

آ کہ کچھ دل کی سن سنا لیں ہم
آ محبت کے گیت گا لیں ہم

اور . . . . مجھے دے
رسیلے ہونٹ، معصومانہ پیشانی، حسیں آنکھیں
کہ میں اک بار پھر رنگینیوں میں غرق ہو جاؤں

مگر دست صبا کا مجموعہ اس کا شاہد ہے کہ نظر میں زیادہ پختگی آ گئی ہے اور مسائل حیات کو زیادہ مفکرانہ انداز میں دیکھا گیا ہے تیسرا دیوان زنداں نامہ جو حقیقتاً زنداں میں ہی بیٹھ کر لکھا گیا ہے عمیق تر تفکر اور تیز تر جذبۂ انقلاب کا حامل ہے مگر اس میں بھی فرمودۂ غالب کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا ؎

گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر
کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

جھنجھلاہٹ، طعنہ، غیظ و غضب، تکدر، حقارت اور نفرت جیسے رکیک جذبات کا ان کے کلام میں پتہ نہیں بس میٹھے ہی میٹھے بول ہیں۔ کونین جیسی کڑوی بات بھی شکر میں لپٹی حلق سے اتر جاتی ہے۔ فیض کے کلام سے ظاہر ہے کہ انھوں نے عشق و محبت کی بلائیں بھی جھیلی ہیں اور وصل و وصال کی لذتیں بھی چکھی ہیں لیکن انھوں نے اپنے کو مجنونِ صحرا نورد اور فرہاد تیشہ بدست نہیں بننے دیا ہے۔ وہ صاف صاف کہتے ہیں ؎

میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات
تیرا غم ہے تو غم دہر کا جھگڑا کیا ہے

لیکن

اب بھی دل کش ہے ترا حسن، مگر کیا کیجے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں، وصل کی راحت کے سوا!

انھوں نے عشق میں جہاں کچھ کھویا ہے، وہاں کچھ پایا بھی ہے۔

ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے کیا پایا ہے
جز ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں
عاجزی سیکھی، غریبوں کی حمایت سیکھی
یاس و حرمان کے دکھ درد کے معنی سیکھے
زیر دستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھا
سرد آہوں کے رخِ زرد کے معنی سیکھے

اور غالباً اس حد کی صاف گوئی بھی سیکھی :-

تو اگر میری بھی ہو جائے
دنیا کے غم یونہی رہیں گے
پاپ کے پھندے، ظلم کے بندھن
اپنے کہے سے کٹ نہ سکیں گے

مگران مصرعوں سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہوگا کہ فیض یاسیت کے پیام بر ہیں۔ جی نہیں فیض نے زندگی کے خاتماسوں میں ۔ اگر چہ نوا نے لب و لہجہ کی شیرینی کھوئی ہے اور نہ اپنی رجائیت اور نہ مستقبل کی درخشندگی میں اپنا اعتقاد ہاتھ سے جانے دیا ہے۔ وہ بار بار کہتے ہیں ؎

چند روز اور مری جان! فقط چند ہی روز
ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پہ مجبور ہیں ہم
اور کچھ دیر ستم سہہ لیں، تڑپ لیں، رو لیں
- - - - - - - - - - - فقط چند ہی روز

یہ غم جو اس رات نے دیا ہے
یہ غم سحر کا یقیں بنا ہے

صبا نے پھر در زنداں پہ آکے دستک دی
سحر قریب ہے، دل سے کہو نہ گھبرائے
یہی تاریکی تو ہے غازۂ رخسار سحر
صبح ہونے ہی کو ہے اے دل بیتاب ٹھہر!

لب و لہجہ کی نرمی اس وقت بھی باقی رہتی ہے جب وہ سرفروشوں کو سر دھڑ کی بازی لگانے کو للکارتے ہیں اور زباں بندی کے حکم تحدیدی کے باوجود زبان کھولنے اور سچ کو نہ چھپانے کی ترغیب دیتے ہیں ؎

مشکل ہیں اگر حالات وہاں دل بیچ آئیں جاں دے آئیں
دل والو کوچۂ جاناں میں کیا ایسے بھی حالات نہیں،
جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے اس جاں کی تو کوئی بات نہیں،

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول زباں اب تک تیری ہے
بول! یہ تھوڑا وقت بہت ہے
جسم و زباں کی موت سے پہلے
بول! کہ سچ زندہ ہے اب تک
بول! جو کچھ کہنا ہے کہہ لے

(باقی ۳۶۵ پر)

شاد عارفی

زنداں نامہ ایک تاثر

— شاد عارفی (مرحوم) اپنے رنگ کے منفرد شاعر تھے۔ "زنداں نامہ" کا یہ مطالعہ ان کی ایک غیر مطبوعہ تحریر ہے جسے ہم جمیل اختر خان ستار شعبۂ اردو جامعہ کراچی کے شکریہ کے ساتھ پیش کر رہے ہیں ——— شاد عارفی کے تنک مزاج کو سبھی جانتے ہیں، اُن کی یہ تنقیدی بصیرت اور سوجھ بوجھ اُن کی شخصیت کا وہ گوشہ ہے جس سے کم لوگ واقف ہیں۔ (ادارہ)

دلی اور لکھنؤ کے ٹکسالی نظم نگار سب سے پہلی غلطی تو یہ کرتے آئے ہیں کہ وہ اقبال اور پنجاب کے شعراء کو زبان کی کسوٹی پر کسنے کی عقل مندی فرماتے رہے ہیں۔ اور یہ سلسلہ آج بھی ختم نہیں ہوا۔ چنانچہ فیض احمد فیض کے ادبی کارناموں پر بھی اسی نقطۂ نظر سے تنقید کی جا رہی ہے۔ ان حضرات کا کہنا ہے (ان حضرات میں کچھ ترقی پسند ناقد بھی شامل ہیں) کہ فیض احمد فیض کے پہلے دو مجموعے "نقشِ فریادی" اور "دستِ صبا" اپنے مواد اور ہیئت کے اعتبار سے جن بلندیوں کو چھو چکے ہیں۔ "زنداں نامہ" میں ایسی کوئی اُپج اور علوئے خیال نہیں پائی جاتی جس سے یہ توقع کی جائے کہ "زنداں نامہ" کا شاعر تھک نہیں گیا ہے۔ اور نہ اس کے ہاں افکار و احساسات میں کوئی انحطاط پیدا ہوا ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن نے بھی اپنے حالیہ مضمون میں جو نقوش ماہ رواں میں شائع ہوا ہے دبے دبے لفظوں میں یہی بات کہی ہے کہ فیض احمد فیض کا رجحان کچھ اپنے رستہ سے بھٹک کر کسی نامعلوم منزل کی طرف جا رہا ہے۔ جب کہ شاعر کے لئے اس کی منزل روشن اور واضح ہونی چاہئے لیکن میرا خیال ہے کہ وہ ڈاکٹر محمد حسن ہوں یا عبادت بریلوی۔ حتیٰ کہ احتشام صاحب بھی اپنی تنقیدوں میں کسی ترقی پسندانہ رجحان کی نشان دہی نہیں کر رہے ہیں۔ ان حضرات کی بیشتر تنقیدیں آپس میں یا تنقیص کرتی ہیں یا تائید۔ ہر پھر کر وہی تخیل وہی مغربی مفکرین کے نام' وہی نپی تلی عبارت اور وہی الفاظ کی نشست، اگر کچھ مابہ الامتیاز ہوتا بھی ہے تو عبارت کے الٹ پھیر سے ہوتا ہے نفسِ مضمون سے نہیں۔ جو تنقید میر پر ہوتی ہے وہ سودا کے لئے بھی اتنی مناسب ہو سکتی ہے۔ حالی اور غالب پہ یہ کچھ لکھتے ہیں، تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک تیر سے دو ہرن زخمی کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان حالات میں ان حضرات کا یہ کہنا کہ فیض احمد فیض کا "زنداں نامہ" اتنا بلند

نہیں جتنا کہ اس کے دوسرے مجموعے۔ میرا ذاتی خیال ہے۔ اور ممکن ہے کہ میرے اس ذاتی خیال کے ہمنوا سیکڑوں کی تعداد میں ہوں کہ "زنداں نامہ" کے لکھے جانے کے عہد میں فیض احمد فیض جس ذہنی کش مکش اور کش مکش سے گزرا ہے۔ اس کی عکاسی کے لئے زنداں نامہ کی تدوین لازمی تھی۔ اب آپ اس شخص کا تصور کریں جس کے سامنے زندگی اور موت کا سوال نئے نئے رُخ اور چالیں بدل کر آ رہا ہو اور وہ شخص شاعر بھی ہو۔ اگر یوں کہہ اُٹھے ؎

تیرے دستِ ستم کا عجز نہیں
دل ہی کافر تھا جس نے آہ نہ کی

ضبط و تحمل کا کتنا آہنی آئینہ دار ہے۔ یہی نہیں بلکہ اسی غزل میں وہ آگے بڑھ کر اپنے اُلجھے حالات کی ترجمانی اس طرح کرتا ہے ؎

کٹے شبِ ہجر کام اور بہت
ہم نے فکرِ دلِ تباہ نہ کی

"زنداں نامہ" کی پہلی غزل کے یہ دو شعر اگر "زنداں نامہ" کا دیباچہ تصور کر لئے جائیں تو وہ کون کافر ہوگا جو فیض احمد فیض کی . . . عظمتِ شعری سے انکار کرے۔ کیونکہ یہ میرا "زنداں نامہ" پر ایک سرسری مطالعہ ہے۔ اس لئے میں "زنداں نامہ" کی غزلوں کے چند شعر چُن کر یہ ثابت کروں گا کہ فیض احمد فیض کا یہ مجموعہ ان کے پہلے دو مجموعوں سے کسی طرح کم وزن اور کم عیار نہیں ؎

شمعِ نظر، خیال کے انجم، جگر کے داغ
جتنے چراغ ہیں تری محفل سے آئے ہیں

ہو سکتا ہے کہ اثر صاحب لکھنوی یا اور کوئی صاحبِ زبان اس میں زبان کی کوئی کوتاہی تلاش کر لے لیکن میں سمجھتا ہوں ہیئت اور مواد کے اعتبار سے "زنداں نامہ" کی دوسری غزل کا یہ دوسرا شعر اپنے اندر ایک داستانِ ہوش رُبا چھپائے بیٹھا ہے۔ یہاں ہوش رُبا کا مطلب الف لیلہ کی پینگ نہیں ہے۔ بلکہ وہ خونی تصور ہے جو ماحول میں ہر شخص کو محسوس ہو رہا ہے۔
اب تیسری غزل کا مطلع لیجئے ؎

ستم کی رسمیں بہت تھیں لیکن نہ تھیں تری انجمن سے پہلے
سزا خطائے نظر سے پہلے، عتاب جرمِ سخن سے پہلے

کیا قانونِ زباں بندی، اور عدم قانونِ انصاف و عدل کی عکاسی اس سے بہتر صورت میں کی جا سکتی ہے؟ ماحول کا وہ کون سا گوشہ ہے جس پر یہ شعر روشنی نہیں ڈالتا۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر فیض احمد فیض کے "زنداں نامہ" میں صرف یہ مطلع ہی شائع کر دیا جاتا تو "زنداں نامہ" کی قدر و قیمت پر کوئی حرف نہیں آتا، اور پھر اسی غزل کا یہ دوسرا شعر تو سونے پر سہاگے کا کام کرتا ہے۔ سنئے ؎

نہیں رہی اب جنوں کی زنجیر پر وہ پہلی اجارہ داری
گرفت کرتے ہیں کرنے والے خرد پہ دیوانہ پن سے پہلے

اس غزل کا آخری شعر بھی اپنی اہمیت کے اعتبار سے نمایاں حیثیت رکھتا ہے ؎

ادھر تقاضے ہیں مصلحت کے اُدھر تقاضائے دردِ دل ہے
زباں سنبھالیں کہ دل سنبھالیں اسیر ذکرِ وطن سے پہلے

اتنا کچھ لکھنے کے بعد "زنداں نامہ" کا ایک ہلکا سا انتخاب پیش کرتا ہوں تاکہ ناظرین میری تائید میں "زنداں نامہ" کو وہی درجہ دیں جو میری نظر میں ہے ؎

جب تجھے یاد کر لیا صبح مہک مہک اٹھی
جب ترا غم جگا لیا رات مچل مچل گئی
دل سے تو ہر معاملہ کر کے چلے تھے صاف ہم
کہنے میں اُن کے سامنے بات بدل بدل گئی
آخرِ شب کے ہم سفر فیضؔ نہ جانے کیا ہوئے
رہ گئی کس جگہ صبا صبح کدھر نکل گئی

یہاں ایک بات اور عرض کر دوں کہ میں فی الحال "زنداں نامہ" کی غزلوں پر روشنی ڈال رہا ہوں۔ نظموں پر تبصرہ کے لئے کسی فرصت کا منتظر ہوں۔ اگر ماحول نے اجازت دی تو اس پہ الگ سے بات ہوگی۔ اب پھر غزل کا مطلع ملاحظہ فرمایئے ؎

بات بس سے نکل چلی ہے
دل کی حالت سنبھل چلی ہے
لاکھ پیغام ہو گئے ہیں
جب صبا ایک پل چلی ہے
یا یونہی بجھ رہی ہیں شمعیں
یا شبِ ہجر ٹل چلی ہے
اشک خونناب ہو چلے ہیں
غم کی رنگت بدل چلی ہے

یہ چاروں شعر جس زاویۂ نگاہ کی ترجمانی کرتے ہیں، اگر آپ کے اندر وہاں پہونچ کر پرکھ و نظر کی عادت ہے تو غالباً آپ میرے ہمنوا ہو کر فیضؔ کو کھلے دل سے داد دیں گے۔ ایک غزل کے یہ دو شعر بھی دیکھئے ؎

اب جہاں مہرباں نہیں کوئی
کوچۂ یار مہرباں ہے وہی
چاند تارے اِدھر نہیں آتے
ورنہ زنداں میں آسماں ہے وہی

سجے کمروں میں بیٹھ کر نعت نگاری کرنے والے "ذاکر" ان اشعار کی قدر و قیمت کا کیا اندازہ کر سکتے ہیں۔ ان ناقدین کی مثال جوشؔ کے اُن اشعار سے ملتی ہے جو اُنہوں نے عیش و آرام کی زندگی گذارتے ہوئے غریب اور محنت کش طبقہ سے متعلق کہے ہیں۔ فیض احمد فیضؔ کی یہ غزل بھی

ان تمام مسائل پر روشنی ڈالتی ہے جو اُس کے ماحول سے ہم کنار رہے ہیں۔ مطلع ہے ؎

دل نا امید تو نہیں ناکام ہی تو ہے
لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے
دستِ فلک میں گردشِ تقدیر تو نہیں
دستِ فلک میں گردشِ ایام ہی تو ہے

سبحان اللہ، اس شعر میں جو بے ساختگی اور چٹیلاپن ملتا ہے۔ اس کی مثالیں بہت کم دیکھنے میں آتی ہیں۔ کیا ایسا شاعر جو
اس قسم کے بھرپور شعر کہتا ہو۔ یا جس مجموعے میں اس قسم کے مکمل اشعار موجود ہوں ان پر یہ تنقید نگار ڈاکٹر ڈاکٹر نسیم حکیم نہ جانے کس اعتبار
سے اس کہنے میں کوئی تکلف نہیں کرتے کہ یہ مجموعہ فیض احمد فیض کے دوسرے مجموعوں کے برعکس انفعالی کیفیت کا حامل ہے ؎

کچھ محتسبوں کی خلوت میں، کچھ واعظ کے گھر جاتی ہے
ہم بادہ کشوں کے حصے کی اب جام میں کم تر جاتی ہے
ہاں جاں کے زیاں کی ہم کو بھی تشویش ہے لیکن کیا کیجے
ہر رہ جو ادھر کو جاتی ہے مقتل سے گزر کر جاتی ہے

اس غزل کا آخری اور لاجواب شعر اس طرح ہے ؎

ہم اہلِ قفس تنہا بھی نہیں ہر روز نسیمِ صبحِ وطن
یادوں سے معطر آتی ہے، اشکوں سے منور جاتی ہے

ان اشعار کی برجستگی پر مقدمۂ شعر و شاعری حالی قربان کیا جا سکتا ہے۔ میں چونکہ مضمون ختم کر رہا ہوں اس لئے دو تین شعر
اور سنئے اور اجازت دیجئے ؎

ایسے ناداں بھی نہ تھے جاں سے گزرنے والے
ناصحو، پندگرو، راہگذر تو دیکھو
وہ تو وہ ہے تمہیں ہو جائے گی الفت مجھ سے
اک نظر تم مرا محبوبِ نظر تو دیکھو
وہ جو اب چاکِ گریباں بھی نہیں کرتے ہیں
دیکھنے والو، کبھی اُن کا جگر تو دیکھو

ان اشعار کی موجودگی میں کون کہہ سکتا ہے کہ ادب میں جمود ہے، انحطاط ہے، اور ترقی پسند مصنفین تھک کر بیٹھتے جا رہے ہیں
سجاد ظہیر نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ —

"فیض کا ہر شعر اُن بلندیوں کو چھو رہا ہے
جس کی آج ترقی پسند ادب کو ضرورت ہے۔"

([illegible] ۱۹۵۹ء)

ڈاکٹر مسعود حسین خاں

تارِ حریرِ دو رنگ

مقامِ فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

فیض ہماری محفلِ شعر میں "اعترافِ شکست" اور "ارتکابِ گناہ" کی رومانی معذرت کے ساتھ داخل ہوا ہے۔ اس دور میں ان کا تمام تر متاع "کھوئی ہوئی یار" "انتظار" "بے انداز" "خونِ ناکامیٔ امید" "دکھتا ہوا دل" "ذرے دو کے ٹکڑوں" "مجبور جوانی کے داغ دار ہونٹ" پر مشتمل تھی۔ یہ عنفوانِ شباب کی شاعری تھی لیکن اس میں بھی لذت کی بجائے ایک تقدس ہے، وہ تقدس جو جسم کے نرم و گرم احساس اور اس کی جمالیاتی حرمت سے پیدا ہوتا ہے۔ اور حسن کا تکملہ "سرودِ شبانہ" کے اس مصرع میں ہوتا ہے۔

آمدِ خواب، ترا روئے حسیں

اداس اور معصوم! یہ دو لفظ نوجوان فیض کے دل کی گہرائیوں کا پتہ دیتے ہیں۔ اداس خود اور معصوم محبوب۔ اسی اداسی اور معصومیت سے فیض نے حسن کا وہ خالص رومانی تصور پیدا کیا ہے جو بیک وقت اِس دنیا کا بھی ہے اور اُس دنیا کا بھی جو موت کا محبوب منظر ہے۔ فاصلہ، دوری اور انتظار اس کا خمیازہ ہے۔ یہ ملازماً اس وقت اور حسین دکھائی دیتا ہے۔ جب فیض کسی ارضی پیکر ہی کو منتصبہ کرتے ہیں اور رسیلے ہونٹوں، احمریں آنکھوں مرمریں باہوں دراز قد اور گداز جسم کے انسانے شبِ مہتاب میں بنتے ہیں ان افسانوں کا پس منظر وہ بام و در، یہ گزار اور اشجار ہیں جو کبھی کبھی منظرِ فطرت کے طور پر اس دور کی شاعری میں جھلک اٹھتے ہیں۔

رومان کی اس سرزمین میں انجامِ محبت کی نشان دہی تمناؤں کے ان مزاروں سے کی جاتی ہے جن کی خراشیں شاعر کے دل میں محفوظ ہیں۔ لیکن جب یادوں کے ان مقبروں سے بھی ناصبور نگاہیں اور مخملی باہیں جھانکتی اور بلاتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ تو شاعر یوں پھوٹ پڑتا ہے۔

وہ ناصبور نگاہیں، وہ منتظر راہیں
وہ پاسِ ضبط سے دل میں دبی ہوئی آہیں

وہ انتظار کی راتیں طویل و تیرہ و تار
وہ نیم خواب شبستاں وہ مخملیں بانہیں
کہانیاں تھیں کہیں کھو گئی ہیں میرے ندیم!

فیض نے جب ان کہانیوں کو کھویا تو اپنے آپ کو پایا۔ خود کو اس طرح پایا کہ بیچ بازار میں کھڑے تھے جہاں خاک میں لتھڑے ہوئے اور خونوں میں نہلائے ہوئے جسم جا بجا بک رہے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہمارے ادب میں نئی سماجی اقدار کا شعور رخ ہو گئی تھیں، زندگی کے نئے تقاضوں کی ترجمانی ہونے لگی تھی۔ اور بعض سیاسی تحریکیں ادب میں پھیل رہی تھیں۔ فیض نے بھی محسوس کیا ؎

لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجے

یعنی زمانے کے دکھوں کی طرف!

؎ "مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ" تک فیض کے یہاں دو قسم کی تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ پہلی یہ کہ رومانی اور جمالیاتی اقدار کے علاوہ زندگی کی دوسری قدریں بھی ان کے یہاں ابھرنے لگتی ہیں۔ دوسری یہ کہ حقیقت پسندی کے نقطۂ نظر کی وجہ سے محبوب کے سیال تصور کی مثالیت ختم ہونے لگتی ہے قبل اس کے کہ ہم ان تبدیلیوں اور پھر انجام کار کا ذکر کریں، فیض کی ابتدائی نظموں کے بارے میں یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان پر انگریزی اور اردو کی رومانی شاعری کی گہری چھاپ ہے۔ ان کا تخیل کوئی تشبیہیں اور استعارے تراشتا ہے۔ جذبہ اور تخیل کا حسین توازن ہے جو کہیں کہیں پر غلو رہنے اور ان پر پوری قدرت نہ ہونے کی وجہ سے بگڑ جاتا ہے۔ شاعر مبتلائے واردات بھی نظر نہیں آتا۔ بلکہ دونوں کے درمیان ایک لیانی بے تعلقی ہے جس سے نقوش جمیل تر ہو گئے ہیں۔ اجنبی دنیا، خواب گاہ اور انتظار کے رومانی تصورات اور گداز جسم دراز اور طویل راتوں کی خوابیدہ راحتوں" کے افسانوں نے اس دور کی شاعری کو چاندنی کی سی چمک بخشی ہے، اور آخر میں ملال دکھ کے بار بار آنے والے سادہ اور گہرے الفاظ ہیں جن میں درد کی کسک اور کڑوی مٹھاس کا لطف ہے ؎

یہ سادہ، دکھ سے بھرا جمال کا پرستار معصوم ذہن جب غم دہر کے جھگڑے میں پڑتا ہے تو محبوب کا رومانی تصور بدل جاتا ہے۔ نئی سماجی اقدار کا شعور یک لخت اور پہلی بار جب ہمارے سامنے یہ نقشہ لاتا ہے کہ ؎

جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے
جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے

تو ہمارے جمالیاتی احساس کو ٹھیس سی لگتی ہے۔ اگر یہ اشعار جوش کے قلم سے ٹپکتے تو دھچکا نہ لگتا کیونکہ ان کی انقلابی رجز آلودوں کے ہم عادی رہے ہیں۔ لیکن فیض کے یہاں غازہ و رخسار اور ضیائے تبسم کے ساتھ خون اور پیپ کا تصور بہت سے شاعر اور نقاد چیخ اٹھے! وہ تو خود ہی فیض نے جب نظم کے خاتمہ پر اس کا ازالہ اس طرح کیا کہ ؎

اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجے

تو گویا تسکین ملی۔

لیکن یہیں سے فیض کی یک رنگی شاعری میں دوسرے رنگ کا آغاز ہوتا ہے۔ اس نئے شعور نے فیض کا تصورِ محبت ہی بدل دیا

تو گر میری بھی ہو جائے
دنیا کے غم یوں ہی رہیں گے

چونکہ فیض نے جمالیاتی قدر کو افادیت کے سانچے میں ڈھالنا ابھی شروع ہی کیا تھا اس لئے وہ ٹیکنیک میں اس عمل کو مسلسل استعمال کرتے ہیں۔ وہ حسن کے پس منظر میں قاری کے ذہن کو بے ہنگم سماجی استعارات سے دھچکا پہنچاتے ہیں۔ اس کی بڑی اچھی مثال ان کی نظم "رقیب سے" ہے جس کے ابتدائی حصے میں ساحر آنکھوں اور ان کی بے سود عبادت کا ذکر ہے۔ اس واردات کا ذکر ہے جو ان کے اور رقیب کے درمیان مشترک ہے۔ اور اس کے بعد اس مشترک سبق کا ذکر ہے جس کے سمجھنے کا صرف رقیب اہل ہے۔ نظم اپنے مضحکہ خیز منتہا کو اس وقت پہنچتی ہے جب شاعر اس شعر پر آتا ہے:

یا کوئی توند کا بڑھتا ہوا سیلاب لئے
فاقہ مستوں کو ڈبونے کے لئے آتا ہے

یہ جست شعر کا سوز جمال سے افادیت تک، ساحر آنکھوں سے توند کے سیلاب تک! اس قسم کے نمونے ان کے کلام میں اور بھی ہیں شاید اسی لئے "دستِ صبا" میں جا کر فیض نے اس ٹیکنیک کو بالکل ترک کر دیا ہے بلکہ اس طرح گھلا ملا دیا ہے کہ آتشِ گل اور آنچ کا فرق ہی مٹا دیا ہے اس قسم کی ایک اچھی مثال "نقشِ فریادی" ہی میں "موضوعِ سخن" کے اندر مل جاتی ہے جس میں جذبے کا سفر حسنِ دل آرا کی دھج سے لے کر آدم و حوا کی اولاد کے تذکرے تک ہے۔ لیکن جس میں شبخون کی سی کیفیت نہیں ملتی۔ "میرے ہمدم میرے دوست" میں یہی جذبہ فیض کے لہجے کی نرمی اور خلوصِ رفاقت کی وجہ سے بے نور اور اجڑے ہوئے دماغوں کو روشنی بخشتا ہے۔

فیض کی اس زمانے کی کچھ نظمیں ایسی بھی ہیں جن میں وہ "مری جان" کے سہارے کے بغیر "ستونِ جسم" تک آ گئے ہیں میری مراد ان کی نظم "بول کہ لب آزاد ہیں تیرے" سے ہے جو محکوم و مجبور قوم کے لئے نئے استعاروں میں قلندرانہ للکار کا حکم رکھتی ہے۔ "بول" کی للکار میں ہماری تہذیب کی صدیوں کی حق پرستی اور حق گوئی کی آواز مضمر ہے۔ اس قسم کی ایک اور نظم "سیاسی لیڈر کے نام" ہے جس میں رات کا استعارہ اور سیاسی حقائق اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ سیاسی شاعری کا کھردرا پن بالکل غائب ہو گیا ہے۔ اس میں نور اور صداقت کے اجالے کی ظلمت پر مسلسل یلغار معلوم ہوتی ہے۔

فیض کی مشہور نظم "تنہائی" کو میں فیض کے سیاسی شعور سے بلاواسطہ منسلک کرنے کے حق میں نہیں۔ "سیاسی لیڈر کے نام" میں رات کا استعارہ مسلسل سیاسی پس منظر میں استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن "تنہائی" میں "تاروں کے غبار کا بکھر جانا" ایوانوں میں خوابیدہ چراغوں کا لڑکھڑانا اس قدر عام علائم ہیں کہ ان کے معنی کو محدود کرنا ستم ہوگا۔ یہ انتظار ہے جو زندگی کے ہر گام پر موڑ اور ہر منزل پر آتا ہے اور اس میں شعری وجدان کے لئے ان گنت تہیں ہیں۔

پچھلی جنگ کے خاتمے سے فیض کے یہاں 'دلِ بیتاب' کے معنی بھی بدل جاتے ہیں۔ اس زمانے کی نظموں میں وہ فنا، تیرگی اور ظلمات کے الفاظ اور استعاروں سے اس دور کی اس سیاسی اور سماجی فضا کو مرتب کرتے ہیں جس کے لئے شاعر کی ضرورت ہے۔ ظلمت اسیری کو وہ اپنے نورِ یقین سے کم کرتے ہیں۔ اور آمد صبح کے منتظر ہیں۔ یہ دور تک فیض کی

صبح کا منتظر رہا اور جب وہ آئی۔ تو اس طرح ؎

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لیکر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل

لیکن ؎

ابھی گرانیٔ شب میں کمی نہیں آئی
نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

صبحِ آزادی پر یہ ایک ایسے شاعر کا ردِ عمل ہے جسے پارٹی لائن سے زیادہ اپنی بصیرت پر اعتماد تھا۔ اس لئے جہاں بہت سے نیب آزادی کا گیت گا رہے تھے، فیض کی نظر اجالے کے داغوں پر رہی۔ اور اردو شاعروں کی ہماری اکثریت نے فیض کی بصیرت کی تائید کی اور آخر اہلِ سیاست نے بھی اس کی صداقت پر گواہی دی۔

فیض کی نظم صبحِ آزادی کے داخلی اور رمزیہ انداز پر بھی اعتراض کئے گئے ہیں۔ یہ اعتراض ان مخصوص نقطۂ نظر رکھنے والوں نے کئے ہیں۔ جو بلاواسطہ شاعری کے قائل ہیں۔ اور جن کی شاعری میں سرخ ستارہ، سرخ پرچم اور سرخ ہاتھ اسی طرح شعریت سے عاری استعارے بن چکے ہیں جس طرح لکھنوی شاعری میں دوپٹہ اور چوٹی، بلبل اور صیاد آشیاں پر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ شاعری نہ تو خطابت ہوتی ہے اور نہ سیاسی خطبہ۔ یہ بارود، توپ، ٹینک اور ایٹم بم سب کی متحمل ہو سکتی ہے۔ لیکن بہر رنگ اس میں ریشم کے کیڑے کی سی داخلی کڑھائی لازمی طور پر ہونی چاہیئے۔ اس کے دریچے کسی مخصوص فضا اور ہوا پر بند نہیں ہوتے۔ یہ فضائے چمن پر بھی کھل سکتے ہیں اور پُر شور تلاطم پر بھی لیکن ہر صورت میں فنی خم و پیچ سے شاعر کو مفر نہیں۔ اگر کچھ لوگ بزعمِ خود اپنی دفنی شاعری پر مطمئن ہو جاتے ہیں تو یہ ان کا اپنا فعل ہے لیکن فیض ہر تاثر کو اپنی شخصیت، ذہن اور مزاج کے مخصوص پیچ و خم سے گزارتے ہیں۔ اور گزارنے کے عمل میں وہ اسے نئی تہیں حسن و جمال اور اپنی وہ بصیرت اور لہجہ عطا کرتے ہیں جو جدید شاعری میں ان کا اپنا ہے۔

یہ لہجہ "لوح و قلم" اور "دو آوازیں" میں قدرے تیز ہو جاتا ہے۔ جہاں ذوقِ نظر سے زیادہ خون کی حرارت، دل کی صداقت اور نطق کی طاقت پر زور پایا جاتا ہے۔ سنہ ۱۹۵۰ء کے بعد غور ابو لوح و قلم اور اس کے ناتے سے سماجی تحریکات میں ادیب کے مقام کا احساس فیض کے یہاں بہت زیادہ ملتا ہے یہی زمانہ ہے جب لوح و قلم کی متاع چھین لی جاتی ہے اور زبان پر مہریں لگانے کی کوشش ہوتی ہے۔ تو ان کے یہاں طوق و دار، مقتل اور سلاسل کی علامتیں ابھرتی ہیں۔)

یہاں سے شاعر نے ادب کو عمل میں سمو دیا۔ یعنی وہ ہمہ تن مردِ حُر کی صف میں آگیا۔ اور اب فیض کے ذہن کی تربیت قفس و زنداں کے استعاروں میں ہو رہی ہے۔ ان کی زنداں کی شاعری کے بارے میں دو باتیں قابلِ ذکر ہیں۔ پہلی یہ کہ

وہ غالب و سودا یعنی قدیم شعری سرمایے کے ساتھ کافی وقت گزارنے لگے ہیں ــــــ دوسری یہ کہ فراقِ رخِ محبوب کا غم، اور یاد کے زخم، بری طرح پھر ابھرنے لگے ہیں۔ ہیئت کے اعتبار سے یہ ان کی غزل گوئی کا دَور ہے اور اس ہیئت کا کثرت سے اختیار کرنا اساتذۂ قدیم کے مطالعے اور حدیثِ یار کے عنوان نکھرنے کے لیے ضروری بھی تھا۔ زنداں میں فیض کے نطق و لب کی بخیہ گری تو نہ ہو سکی لیکن عقل اور خون کی حرارت کا وہ ابال جو درِ زنداں سے باہر ہوتا تھا اب کم ہو گیا ہے۔ ایک اور اہم علامت جس کا ماخذ اساتذۂ قدیم کا کلام ہے اور جس کی ضرورت اس وقت محسوس فیض کو بہت زیادہ محسوس ہوتی ہے، صبا کا استعمال ہے جس کے ہاتھ صحنِ چمن اور حسن دونوں کو سلام بھیجے جا رہے ہیں۔ قید کی تنہائی میں سایۂ رخسار و لب کا تصور اور گہرا ہو گیا ہے اور روزنِ زنداں کی اہمیت اس طرح بڑھ گئی ہے۔

بجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہو گی
چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رخ پر بکھر گئی ہو گی

زنداں میں حسن و حیات کی دو رنگی فیض کے یہاں پھر شدت سے ابھری ہے اور شاید ہی کوئی اچھی نظم ہو جہاں غمِ جہاں کے وقت وہ بے حساب یاد نہ آئے ہوں۔ یہ تارِ حریرِ دو رنگ غزلوں میں بھی جلوہ گر ہے۔ لیکن غزلوں میں اردو کے قدیم شعری ادب کے مطالعے کی وجہ سے ان کے یہاں غزل کی محدود زبان اور مخصوص علائم بھی نمایاں ہیں شیخ اور ناصح، ہجر اور فراق ستم اور کرم، دیر اور حرم، صبا اور صنم، چمن قفس، زنداں، گلچیں اور بلبل۔ یہ الفاظ فیض نے غزلوں میں بار بار استعمال کئے ہیں۔ ان میں سے کچھ مثلاً قفس، صبا، ہجر اور فراق ان کے حسبِ حال ہیں۔ لیکن بعض مثلاً شیخ اور ناصح، بلبل اور گلچیں بالکل روایتی طور پر آئے ہیں اور ان سے مرتب واردات میں کوئی نیا اشارہ نہیں ملتا۔

شیخ سے بے ہراس ملتے ہیں
ہم نے توبہ ابھی نہیں کی ہے
کیسے مانیں حرم کے سہل پسند
رسم جو عاشقوں کے دین کی ہے

اردو غزل معرصہ ہوا ان سے آگے نکل چکی ہے، اور انہیں دوبارہ زندہ کرنے میں نہ تو فیض کو اپنا اسلوبِ غزل میں کوئی مدد ملی ہے اور نہ ان سے نئے اشاروں اور نئی تفہیم کا پتہ چلتا ہے۔ فیض کے ماحول سے مربوط کر کے اگر میں ان کے مفہوم میں کوئی توسیع کر سکتا ہوں تو یہی کہ پاکستان کے مخصوص مذہبی ماحول کا شاید فیض کے یہاں یہ ردِ عمل مرتب ہو گیا ہے۔

یہ تھی فیض کے ذہنی ارتقا کی داستان۔ یہ ارتقا مسلسل جمال سے افادہ کی طرف ہو رہا ہے۔ میں مقصد کے مقابلے میں افادہ کی نیاز وسیع اصطلاح اس لئے استعمال کر رہا ہوں کہ آگے چل کر مجھے شاعر اور مبلغ شاعر کا فرق بتانا ہے، ترقی پسند شاعری کے ان دو گروہوں کا ذکر کرنا ہے جن میں سے ایک کی قیادت فیض کر رہے ہیں۔ جو شعر میں افادیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس میں ادر خطابت پر مغز فکر لے ہیں۔ اور فنی خم و پیچ کو جوشِ تبلیغ پر قربان کر دیتے ہیں۔ ان کے فنی خم و پیچ اور رجحانات کے پیچھے فیض کا وہ

ستھری نظر ہے جہاں جمالیت اور افادیت کی منظروں کا تناقض دور ہو جاتا ہے کیونکہ فیض کے خیال میں حسن کی تخلیق صرف جمالیاتی فعل ہی نہیں۔ افادی فعل بھی ہے۔ اور "یہ افادیت محض ایسی تحریروں کا اجارہ نہیں جن میں کسی دور کے خاص سیاسی یا اقتصادی مسائل کا براہِ راست تجزیہ کیا گیا ہو۔" ان کی یہ رائے بھی بلحاظ شاعری کے تازہ واردان کے لئے قابلِ غور ہے کہ: "محض مزدور، کسان، امن یا ایسا ہی کوئی دوسرا عنوان یا استعاروں دوسری موضوعوں کی غیر موجودگی میں کسی تحریر کی ترقی پسندی کا واحد ضامن نہیں ہو سکتا۔"

فیض نے اپنے ان تنقیدی خیالات کا اپنی شاعری میں عملی ثبوت دے کر ترقی پسند ادب کی انتہا پسندی کو کافی حد تک معتدل کیا۔ اس کے بارے میں یہ اعتراضات بھی ہیں کہ ان کی شاعری میں شمشیر کی سنائی نہیں جس کی سیاست کے نقیبوں کو ضرورت ہوتی ہے۔

اس طرح فیض اور ان کے معترضین کا اختلاف فلسفۂ حیات کی سطح پر نہیں بلکہ جمالیات کی سطح پر ہے اور اس لئے دونوں کائنات کا ایک ہی بنیادی تصور رکھتے ہوئے ادب اور سیاست کے رشتوں کی اہمیت کو مانتے ہوئے اپنے طریقِ شعر میں مختلف ہو جاتے ہیں۔ ایک بیشتر وقتی موضوعات پر خطیبانہ یا صحافتی انداز میں طویل نظمیں لکھنے کا عادی ہے اور دوسرا اختصار و ایجاز کے ساتھ سیاسی واقعات پر نہیں بلکہ ان سے مرتب شدہ تاثرات فنی حجابات کے ساتھ پیش کرتا ہے ان حجاباتِ فن کے پیچھے فیض کی مکمل شخصیت ہوتی ہے جو متوازن ہے، معتدل ہے اور زندگی کے نرم و گرم کو عزیز رکھتی ہے فیض محض سیاسی انسان نہیں۔ ان کا اپنا ایک جمالیاتی وجدان ہے۔ ایک ستھری نظر ہے۔ جو اس عہد کے بہت کم شاعروں کو نصیب ہوئی ہے۔ بہت ممکن ہے ان کے معتدل اور دھیمے انداز سے سیاسی تحریکوں کو اس قدر مدد نہ ملے جتنی کہ اردو کے خطیب شاعروں کی شعلہ افشانیوں سے، لیکن اس عہد کے جمالیاتی وجدان میں ان کی شاعری سے وہ غیر معمولی تبدیلیاں ضرور پیدا ہوں گی جو تہذیبی نقطۂ نظر سے زیادہ اہم ہیں۔ "کسی عہد کے جمالیاتی تصور کو متاثر کرنے والے شاعر کا کارنامہ سینکڑوں مبلغ شاعروں کے کارناموں پر بھاری ہوتا ہے۔" اس لئے فیض ترقی پسند ادب کے مبلغ شاعروں کے خیال میں کمزور انقلابی ہیں جو دیس کے درد کے ساتھ "فراقِ رخِ محبوب کے غم" سے کڑھتے ہیں۔ یلغار کرنے والے مجاہدین کا یہ شیوہ نہیں ہوتا۔ یہ سیلِ تند کا مقام ہے یہاں جو نغمہ خواں سے بھلا کیا کام چلے گا۔ میں یہاں ادب اور سیاست کے باہمی رشتوں کی طولانی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا چند الفاظ میں صرف اس قدر وضاحت کر دینا چاہتا ہوں کہ سیاست کی طرح ادب بھی اجتماعی زندگی کا ایک مخصوص عمل ہے اور اس کے آداب کسی سیاسی حکم کے خطِ مستقیم میں نہیں ڈھل سکتے۔ اس لئے سیاسی نقطۂ نظر سے جو فیض کی کمزوری ہے فنی اور جمالیاتی لحاظ سے وہی ان کی منفرد خصوصیت ہے۔ اور اس میں ان کے ساتھ بہت سے دوسرے بھی شریک ہیں۔ اور ان کا اثر ترقی پسند شاعری پر پڑ رہا ہے۔

ہنگامی واقعات سے متاثر ہو کر فیض نے صرف ایک نظم "ایرانی طلباء کے نام" سے لکھی ہے۔ جو بہت زیادہ لائقِ اعتنا نہیں۔ ورنہ ان کا موضوعِ سخن اور ان کی خوش نوائی کا مقام ہنگامی واقعات سے زیادہ اور بلند مجموعی تاثرات و واقعات تک رہتا ہے جس میں وہ عکسِ رخِ یار اور سیلابِ وطن دونوں کے درد اور غم کو اجال اور سنوار کر تازہ تحریر و دو رنگ کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔

لیکن فیض اپنی اس دو رنگی شاعری میں جوش کی طرح شعلہ و شبنم یا سنگ و سبو کے خانوں میں بٹ کر ہمارے سامنے نہیں آتے۔ جوش کی طرح ان کی دو شخصیتیں بھی نہیں۔ ان کا شاعرانہ ادراک تارِ حریرِ دو رنگ کو بٹ کر اپنے فن میں اس طرح پیش کرتا ہے کہ صداقت، حسن اور انقلاب کی قدریں ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتی ہیں۔ فیض کا تنقیدی شعور بھی ان کی اس شعری عمل کی گواہی دیتا ہے جب وہ یہ لکھتے ہیں کہ "ادب برائے ادب کی طرح انقلاب برائے انقلاب کا عقیدہ گمراہ کن ہے"۔ اس لئے فیض کے کلام میں ایک داخلی وحدت ملتی ہے جو حق پرستی اور حسن پرستی دونوں سے عبارت ہے۔ ان کی حق پرستی انہیں "آدم و حوا کی اولاد" سے قریب تر رکھتی ہے۔ اور ان کی حسن پرستی نئی آداب کے احترام اور اس متوازن، لطیف اور معتدل انداز کی طرف انہیں کھینچتی ہے جو آج صرف ان کا ہے اور جس کی وجہ سے ان کی تخلیق میں عصری نظر، دل آویز خطوط اور سرخی حسن پائی جاتی ہے۔ اسی شعری نظر کی بدولت ان کے یہاں ادب و زندگی کی انسانی کمزوریاں، نرم و گرم احساس کی صداقتیں ملتی ہیں جہاں ہجر سایۂ رخسار و لب کا تصور بھی ہے۔ اور زہر غم کی مایوسی بیکار بھی!

اس طرح فیض کی جذباتی اور تخیلی سطح جس قدر راسخ اور متوازن ہو جاتی ہے اس کی مثال کسی دوسرے نوجوان شاعر کے یہاں مشکل سے ملتی ہے۔ ان کے کلام سے مستقبل کا نقاد اس عہد کی تاریخ کے نقوش بہت ممکن ہے کہ نہ ابھار سکے لیکن اس میں ایک حساس، نازک خیال اور نرم گو شاعر کے دل کی دھڑکن ضرور ملے گی جو عمل یا عقیدے کے لحاظ سے بھی کسی سے پیچھے نہیں رہا جس نے لوح و قلم کی پرورش اپنا شعار بنایا اور جب وہ چھین لئے گئے تو خونِ دل میں انگلیاں ڈبو کر یہ لکھا ہے

یہ غم جو اس رات نے دیا ہے
یہ غم سحر کا یقیں بنا ہے
یقیں جو غم سے کریم تر ہے
سحر جو شب سے عظیم تر ہے

فیض کے ذہنی ارتقا سے بحث کرتے وقت میں جا بجا ان کی فنی جدت طرازیوں کی طرف اشارہ کرتا رہا ہوں۔ یہ فنی اختراع عام طور سے انہی شاعروں سے سرزد ہوتا ہے جو ایک سے زیادہ زبانوں کے شعری ادب پر عبور رکھتے ہوں۔ جدید شاعری میں فراق کے اسلوب کا سارا اچھوتا پن ان کی اس واقفیت پر مبنی ہے جو انہیں ہندی شعر و ادب سے ہے۔ فیض کا تمام تر اختراعی عمل اس واقفیت اور شغف پر مبنی ہے جو انہیں انگریزی شاعری سے ہے۔ ورنہ اسی قسم کی واقفیت تو انگریزی شاعری سے ہم سب کو ہوتی ہے۔ لیکن اس سے اس حد تک متاثر ہونا کہ اپنے شاعرانہ ادراک کا ایک جزو بنا لیا جائے بہت کم لوگوں کے بس کی بات ہے۔ فیض کی شاعری میں اس قسم کے اثرات جا بجا نمایاں ہیں۔ یہ اثرات تشبیہات و استعارات تک محدود نہیں۔ بلکہ نظموں میں بندوں کی ترتیب، قوافی کی کڑی بندشوں سے ہلکی ہلکی آزادی یا ہم وزن مصرعوں کا انگریزی شاعری کے انداز میں چھوٹا بڑا لکھنا۔ (مثلاً ان کی نظم 'بول' دیکھئے) ان تمام جدتوں کا ماخذ انگریزی شاعری ہے۔ فیض نے اپنی بہت کم نظموں میں اردو نظم کی مروجہ ہیئتوں کو جوں کا توں استعمال کیا ہے۔ کہیں قافیہ بدل کر، کہیں تخفیفِ مصرع کر کے، کہیں قافیہ کے آہنگ کی کمی کو آلودۂ خواب، نیم وا تشبیہات سے پورا کر کے۔ انہوں نے روایت پسندوں کے مذاقِ شعری پر ن۔ م راشد کی طرح ضرب نہیں لگائی۔ اس لئے پرانوں نے بھی ذرا منہ بنا کر یہ کڑوا گھونٹ پی لیا۔

تیکنیک کے لحاظ سے فیض کا ایک اور قابلِ قدر اضافہ ایک ہی بند میں دُہرے قوافی کا استعمال ہے جو براہِ راست انگریزی شاعری سے لیا گیا ہے۔ مثلاً "مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ" کے پہلے بند کی ترتیب ملاحظہ ہو۔

میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات
تیرا غم ہے تو غمِ دہر کا جھگڑا کیا ہے
تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے

اس قسم کا التزام دستِ صبا کی نظموں تک میں پایا جاتا ہے۔ فیض نے ان جدت طرازیوں سے اپنے پیرایۂ اظہار کو حسین بھی بنایا ہے اور سہولتیں بھی پیدا کی ہیں۔ مذکورہ بالا نظم میں اگر شاعر قافیوں کے اسی تلازمے کے ساتھ چلتا تو نہ معلوم اس نظم کا کیا حشر ہوتا۔ تنوع کا اندازہ کرنا ہے تو اسی نظم کے قافیوں کو اس ڈھانچے میں دیکھئے:-

الف - ب - ج - ب - ج - ح - ج - د - د - ر - س - ر - س - ش - ش - ص - ص - ہ - ط - الف -

تقریباً اسی انداز کا تنوع ہمیں "موضوعِ سخن" "سیاسی لیڈر کے نام" "تنہائی" "یہ رات اس درد کا شجر ہے" اور ان کی دوسری نظموں میں ملتا ہے۔ فنی لحاظ سے یہ جدتیں اردو نظم میں ایک اہم اضافہ ہیں۔ گو ن۔ م۔ راشد، نقشِ فریادی کے دیباچے میں اسے "کوئی قابلِ ذکر تبدیلی" نہیں تسلیم کرتے اور آزاد نظم کا ایک رسیا یہ کرتا بھی کیسے، لیکن فیض کا یہ اضافہ خود ان کے شاعرانہ ذہن کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ یہ ان کے مزاج ہی اور پرکارِ تخیل کے عین مطابق ہے۔ قدیم اصنافِ سخن میں تھوڑی دور چل کر شاعر اپنے آپ کو قوافی کے شکنجے میں پاتا ہے۔ اور یہیں سے وہ اپنے عجز کو چھپانے کے لئے استادی اور خطابت سے کام لیتا ہے۔ فیض خیالات اور جذبات کے کیف و کم کے ساتھ ساتھ بحر تو نہیں لیکن ہیئت کے سانچوں کو بدلتے جاتے ہیں۔ اس طرح ان کی نظمیں وحدتِ فکر کے لحاظ سے زیادہ مکمل ہیں۔ ان کا حسن کہیں گھٹتا ہوا نہیں معلوم ہوتا ہے، قدم قدم پر نادر تشبیہات کی شکل میں یا تو تخیل کی اٹھکیلیاں بنتی ہیں۔ یا استعارے کی ٹمٹماہٹ اس طرح کہ ہر ہر مصرع میں چراغ جل اٹھتے ہیں۔

لیکن فیض کی متاعِ ہنر اس قدر کم ہے کہ اردو شاعری کی تاریخ میں ابھی سے ہم ان کا بہت اونچا مقام متعین نہیں کر سکتے ہمارے نئے شاعروں کو اس بارے میں بہت زیادہ عجلت بھی نہیں کرنا چاہئے۔ ہر نئی آواز کو اپنے دور کے مذاقِ شعری میں اپنی جگہ خود بنانی پڑتی ہے۔ یہ عمل بڑی کاوش اور جد و جہد چاہتا ہے۔ اور جیسا کہ دستِ صبا کے دیباچے سے معلوم ہوتا ہے فیض تسلیک کے ان رموز سے واقف ہیں! لکھتے ہیں ؎

"طالبِ فن کے مجاہدے کا کوئی نروان نہیں اس کا　　　　فن ایک دائمی کوشش ہے اور مستقل کاوش"

اسی کی بدولت فیض کے یہاں وہ تکسالی علم ملتا ہے جو نقشِ فریادی تا دستِ صبا قائم ہے۔ اور جس کا دوسرے شاعروں کے یہاں مضحکہ خیز حد تک فقدان پایا جاتا ہے۔

جدید تنقید نے ابتدا سے فیض کی نئی آواز کو پہچانا ہے۔ اور تنقیدی عمل کے ردّ و قبول میں صرف فیض کا نام ہے، جو پچھلے بیس سال کی تنقیدات میں بار بار دہرایا گیا ہے۔

یہ فیض کی شاعرانہ انفرادیت کے لئے کافی ضمانت ہے۔ اور اس بات کی طرف اشارہ بھی کہ ہم ان کی شاعری پر نظر جمائے رکھیں۔

جمیل جالبی

فیض ایک تقابلی مطالعہ

ذیل کا فکر انگیز مضمون جمیل جالبی کے زیرِ ترتیب مجموعہ مضامین سے لیا گیا ہے۔ جس کے لئے ہم آپ کے ممنون ہیں۔ یہ مضمون ۲۰ سال پہلے لکھا گیا تھا، اس وقت تک فیض کا صرف پہلا مجموعہ کلام — 'نقشِ فریادی' شائع ہوا تھا۔ فیض کے فنی اور فکری ارتقاء کے سلسلے میں اس مضمون کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔

(ادارہ)

ویسے تو فیض کا شعری سرمایہ بہت تھوڑا ہے لیکن جتنا کچھ ہے وہ اپنی جگہ اس قدر ٹھوس اور وزنی ہے کہ بہت سے ہم عصر شعراء کا ضخیم شعری سرمایہ اس کے سامنے سبک اور کم تر معلوم ہونے لگتا ہے۔ فیض کی اس چھوٹی سی وسیع دنیا میں وہ سب کچھ ہے جو دوسروں کے یہاں تھا ہے اور وہ سب کچھ بھی ہے جو دوسروں کے یہاں نہیں تھا۔

فیض کی شاعری کو ہم دو ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا دور وہ ہے جس میں اس نے رومانی نظمیں اور عشقیہ اشعار کہے۔ اس دور کو ہم رومانی دور کہہ سکتے ہیں۔ اس دور میں فیض نے زیادہ تر تخیلی دنیا میں دن گزارے۔ عشق کی تلخ جامی، غموں کی زہرہ گدازی، لبریز آہوں کی سیہ پوشی اور ناکام تمناؤں سے دوچار ہوا۔ اور حسینۂ خیال کے رسیلے ہونٹ، مغرورانہ پیشانی اور حسین آنکھوں کے سہارے، زندگی کے دن گزارے۔ اس دور کی شاعری میں بورژوائی، یاس و قنوطیت زیادہ جھلکتی ہے، وہ اب غم اٹھانے کی تاب نہیں رکھتا۔ دعوائے صبر و شکیب غلط ثابت ہوتا ہے۔ خاطرِ بے تاب کا قرار قبضہ سے باہر ہو جاتا ہے۔ خمارِ خواب سے لبریز احمریں آنکھیں، سفید رخ پہ پریشاں عنبریں زلفیں۔ دراز قد اور لچکیلا گداز جسم ہونٹوں پہ تبسم کی ضیائیں، حسنِ محبوب میں پنہاں جنتیں خمارِ شباب۔ بیاضِ رخ پر سحر کی سی صباحت، اور مخملیں باہیں اس کے لئے مادی دنیا سے زیادہ قابلِ التفات اور بیش بہا ہیں۔ اس دور میں وہ زندگی سے گریزاں نظر آتا ہے۔ وہ دنیا کے ہر دکھ سے اور ہر چیز

کو محبت کے نقطۂ نگاہ سے دیکھتا ہے، اور دنیا کی ہر چیز پر عشق و محبت کے حسین افسانوں کو ترجیح دیتا ہے۔ اس دور میں اس کی محبوبہ تو تخیل ہے جس کا تصور اس کے لئے جاں آفریں اور روح فزا ہے۔ اس دور میں اس کی شاعری زیادہ تر روائتی شاعری ہے۔ لیکن اس روائتی شاعری میں بھی اس کی انفرادیت الگ جھلکتی ہے۔ وہ بہت سے گذشتہ شعراء کا تاثر قبول کئے ہوئے معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ان تمام تاثرات، مسائل پر اس کا اپنا انفرادی تاثر غالب معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ شعوری طور پر ایک جداگانہ منفرد راستہ خود بخود نکال آتا ہے۔ اسی دور میں وہ کہنہ پیکر میں نئی روح آباد کرتا ہے اور اس نئی روح کو عشقیہ روایت میں تحلیل کر دیتا ہے۔ پہلے دور میں آخری خط، حسینۂ خیال سے، مری جاں اب بھی .. سرود شبانہ، انتہائے کار، آج کی رات، اور ایک رہگذر پر، ابھی تنہا ہیں۔

فیض کی شاعری کا دوسرا دور، وہ دور ہے جس میں وہ زندگی کا حقیقی مشاہدہ و تجربہ کئے ہوئے معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ انفرادیت جو پہلے دور میں نمایاں طور پر مترشح ہوتی ہے۔ دوسرے دور میں تغزل اور دانش میں ملتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ عشق اس دور میں بھی اس کی روح اور جان ہے۔ لیکن محبوب کے گداز سینے پر سر رکھے ہوئے اس کی نظر ان گنت صدیوں کے بہیمانہ طلسم، بہتی ہوئی پیپ، اور رِستے ہوئے ناسوروں پر بھی جا پڑتی ہے، اور وہ تڑپ اٹھتا ہے، محبت کا شدید جذبہ ایک دم کم ہو جاتا ہے، اور خاک میں لتھڑے ہوئے اور خون میں نہلائے ہوئے جسموں کے خیالات سے وہ کانپ جاتا ہے۔ اور تھوڑی دیر کے لئے وہ حسن کی دلکشی بالکل بھول جاتا ہے۔ اور زمانے کے دکھ اور درد کو محبت پر ترجیح دینے لگتا ہے اور زمانے کی راحتوں کو وصل کی راحتوں سے زیادہ پسند کرنے لگتا ہے۔ پاپ کے پھندے اور ظلم کے بندھن، ستم، ناتوانوں کے نوالوں پر جھپٹتے ہوئے عقاب، پر تولے ہوئے چاروں طرف منڈلا رہے ہیں۔ اس کی نظروں کے سامنے آجاتے ہیں۔ اور شاہراہوں پر غریبوں کا بہتا ہوا لہو اس کے لئے ناقابل برداشت ہو جاتا ہے جس کی ایوس پکار، دل کی بے سود تڑپ، جسم کی مجلسی ہوئی ویرانی، سفاک سپاہ اور سرفروش جوانی دیکھ کر وہ تڑپ اٹھتا ہے اور ہر تباہی و بربادی کو نظر انداز کرتے ہوئے مظلوم غریبوں کو سرکشی اور بغاوت پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ؎

بے فکرے دھن دولت والے
یہ آخر کیوں خوش رہتے ہیں
ان کا سکھ آپس میں بانٹیں
یہ بھی آخر ہم جیسے ہیں

اور اس ذلیل و خوار زندگی پر موت کو ترجیح دیتا ہے۔ کیوں کہ موت، غم سے نجات کا سہل ذریعہ ہے۔ ؎

ہم نے سامان جنگ کر دی ہے
سر کچھ نہیں گے خون بہے گا!
خون میں غم بھی بہہ جائیں گے
ہم نہ رہیں، غم بھی نہ رہے گا!

یہ دور اس کی شاعری کا بہترین دور ہے۔ تمام مشہور نظمیں، جن پر اس کی شہرت کا زیادہ دارومدار ہے، اسی دور کی پیداوار ہیں، مجھ سے پہلی سی محبت میری محبوب نہ مانگ، سوچ، رقیب سے، چند روز اور میری جان، کتے، موضوع سخن وغیرہ، اسی دور کی بہترین نظمیں ہیں۔

فیض کی شاعری کی سب سے اہم اور نمایاں خصوصیت اس کے خیالات کی سنجیدگی، شخصیت کا متوازن پن، ذہنی ٹھہراؤ اور شعری اعتدال ہے۔ وہ واقعہ سے شدت کے ساتھ ضرور متاثر ہوتا ہے اور اسے دل کی گہرائیوں میں گونجتا ہوا ضرور محسوس کرتا ہے اس واقعہ سے اس کے شاعرانہ سر درنگ تار بھی مرتعش ہوتے ہیں لیکن جب وہ اسے شعر کا جامہ پہناتا ہے تو اس شدید جذبے میں ہلکی سی نرماہٹ اور لہجے میں دبا دباپن پیدا ہو جاتا ہے اور وہ جھنجھلاہٹ اور غصہ جس سے دامن اور گریبان کے تار میں فصل باقی نہیں رہتا اس کی شاعری میں نہیں پیدا ہوتا۔ وہ ہر حقیقت کو باریک پردوں سے چھانتا ہے اس وقت اس کی تیوری پر بل ضرور ہوتے ہیں لیکن ہونٹوں پر معصوم سی نرمی بھی دکھائی دیتی ہے۔ وہ زندگی کے ٹھوس حقائق پر شاعری کا ایسا رنگین پردہ ڈالتا ہے جس سے واقعہ کی شدت ایک حد تک کم ہو جاتی ہے۔ لیکن شعریت کشش اور جاذبیت میں بلا کا اضافہ ہو جاتا ہے اور اس کے اشعار رنگین تیلیوں کی طرح دل و دماغ کے سبزہ زار میں ادھر ادھر اڑنے پھرنے لگتے ہیں فیض اپنے شدید احساسات کو مدھم اور ہلکا کر کے شعر کا لطیف جامہ پہناتا ہے۔ اسی لئے اس کی شاعری کی آواز مدھم، سریلی اور دبی دبی سی ہوتی ہے۔ وہ قاری کے ذہن کو کچوکوں کی طرح تھپکتا ہے لیکن سونے نہیں دیتا۔ پڑھنے والے پر ایک نسبتی بیدار نیم خوابی طاری رہتی ہے۔ وہ قاری کو شاعرانہ رنگینی اور حقیقت کی شگفتہ بھول بھلیوں میں گم کر کے کچھ سوچنے اور سمجھنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس کی شاعری براہ راست جذبات سے اپیل نہیں کرتی بلکہ آہستہ آہستہ دل و دماغ میں اپنا گھر کرتی ہے۔ اور قاری کے ذہن کو اپنی طرف متوجہ کرنے اور خاموش رہنے پر زور دیتی ہے۔ اس کی شاعری ایک ایسے چور کی طرح ہے جو رات کی مہیب افزا تاریکی میں دروازے پر بیٹھے ہوئے خوف ناک کتے کو ایک گوشت کا ٹکڑا ڈال کر مکان میں داخل ہو جاتا ہے یہ اس کی روح، اس کی شاعری میں تحلیل ہو کر قاری کی روح میں سرایت کر جاتی ہے یہی اس کی کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے۔ وہ جو کچھ کہتا ہے اسی نقطۂ نظر سے کہتا ہے اور جو کچھ محسوس کرتا ہے وہ اسی نقطۂ نظر پر مبنی ہوتا ہے۔ خود ضبطی، فیض کی وہ خصوصیت ہے جو اسے ترقی پسند شاعری میں ایک ممتاز درجہ دلاتی ہے۔ انتہا پسندی کے باعث بہت سے ترقی پسند شعراء اچھا شعری سرمایہ تخلیق نہ کر سکے فیض انتہا پسندی سے گریز کر کے ہر چیز کو اعتدال میں سمو دینے کا عادی ہے۔

فیض کسی خاص مرکزی خیال کا شاعر نہیں۔ وہ کسی پیغام یا فلسفہ کو اپنے کلام میں بار بار نہیں دہراتا۔ اس کا اجتماعی احساس، انفرادی احساس میں شیر و شکر ہو کر شعری صفات کا جامہ پہنتا ہے۔ اس کی شخصیت سوسائٹی کے خاکے میں مدغم نظر آتی ہے۔ اس کی شاعری اس کی شخصیت پہلے اور اس کی شخصیت معاشرہ کا خاکہ۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اسے زندگی کا شاعر کہنے پر مجبور ہیں۔ اور اس مفراریت کو کچھ دیر کے لئے بالکل بھول جاتے ہیں جو اس کے دورِ اول کی نظموں میں خصوصاً اور دورِ دوم کی نظموں میں کہیں کہیں پائی جاتی ہے۔ جس خیال اور احساس کو وہ ایک مرتبہ شعر کے لطیف پردوں سے دکھاتا ہے، اسی خیال کے بالکل متضاد پہلو کو دوسری جگہ نظم کر کے اپنے گزشتہ خیال کی تردید کر دیتا ہے۔ فیض محض وقت کا شاعر نہیں، وہ سماج کو انسانیت کی حقیقی اور جائز بلندی پر پہنچانا چاہتا ہے۔ ان تمام ظلم کے بندھن اور رسم و رواج کی قیدوں اور سیاہ طلسمات سے انسان کو نجات دلانا چاہتا ہے جن کی وجہ سے سماج میں برسوں سے ناسور بہہ رہے ہیں ؂

جسم پر قید ہے جذبات پہ زنجیریں ہیں
فکر محبوس ہے گفتار پہ تعزیریں ہیں
اپنی ہمت ہے کہ ہم پھر بھی جئے جاتے ہیں

فیض حسن کے پردوں سے انقلاب کو دیکھتا ہے اور اس انقلاب کے ذریعہ دل کی بے سود تڑپ اور جسم کی مایوس پکار کو دور کرنا چاہتا ہے کیوں کہ ؎

اپنے اجداد کی میراث ہے معذور ہیں ہم

مگر ؎

اور کچھ دیر ستم سہہ لیں، تڑپ لیں، رو لیں
چند روز اور مری جان! فقط چند ہی روز

جن خیالات کی تشریح فیض نے اپنی مشہور نظم "مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ" میں کی ہے اور محبوب کے حسن کی دلکشی اور وصل کی راحت پر زمانے کے دکھ درد کو ترجیح دیتے ہوئے معنی نہیں پیش نظر کیا ہے ؎

اب بھی دل کش ہے ترا حسن مگر کیا کیجے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

اور چند لمحات کے لئے محبوب کے رسیلے ہونٹوں، دل کش حسن اور گداز لچکیلے جسم کو بالکل بھول گیا ہے۔ انہی خیالات کی تردید، موضوع سخن میں صاف طور سے کر دی ہے، وہ جانتا ہے کہ سرخ و سیاہ صدیوں کے سائے تلے آدم و حوا کی اولاد پہ کیا کیا گزری ہے۔ جہاں ہر سمت پُراسرار کڑی دیواریں ہیں اور جہاں ہزاروں کی جوانی کے چراغ جل بجھے ہیں اور جہاں ہر گام پر قتل گاہیں موجود ہیں۔ لیکن ؎

یہ بھی ہیں ایسے کئی اور بھی مضموں ہوں گے
لیکن اس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹ
ہائے اس جسم کے کم بخت دل آویز خطوط
آپ ہی کہئے کہیں ایسے بھی افسوں ہوں گے

اور اسی لئے ؎

اپنا موضوع سخن ان کے سوا اور نہیں
طبع شاعر کا وطن ان کے سوا اور نہیں

فیض اپنی ساری شاعری میں ایک غیر ذمہ دار ثالث کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ غیر ذمہ داری عشق اور تغزل کی شدید تحلیل کا نتیجہ ہے۔ ایک بات کہہ کر مکر جانا فیض کا خاص حصہ ہے۔

فیض کی شاعری میں دستور پرستی اور حقیقت نگاری کا ایسا امتزاج ہے جیسے سچے موتیوں میں آب کی جھلک۔ اس کی شاعری ایک اسی دل پذیر قوس و قزح کی طرح ہے جس میں بارش کے بعد ساتوں رنگ ایسے نکھر آتے ہیں کہ ہر شخص اس کی طرف انگلی اٹھا کر دیکھنے اور دکھانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس کی شاعری ہمارے احساسات کے لطیف پردوں سے ٹکراتی ہے۔ اس کی شاعری میں ایک خاموش جھنجھلاہٹ، ایک ہلکی بیداری۔ مدہم جذبات کی شدید فراوانی اور انقلاب کی خفیف لہر رواں دواں نظر آتی ہے۔ تسلسل، ربط، احساسات کی

نزاکت اور رچا ہوا حزن اس کی شاعری کی چند خصوصیات ہیں۔

فیض نفسیات کا شاعر ہے، نفسیات اور فیض کی شاعری دو جدا چیزیں نہیں ہیں بلکہ شاعری کا تار و پود، اور نظم کے تانے بانے سب اسی سے بُنے گئے ہیں۔ انگریزی ادب کے شعرائے نفسیات مثلاً جیکن، ایلیٹ، اوڈن اور سپنڈر وغیرہ کا تاثر اس کے دل و دماغ میں اس قدر رچ گیا ہے۔ جس کی وجہ سے اردو ادب میں اس کے لئے خود ایک الگ راستہ پیدا ہو گیا ہے۔ اس کی شاعری ہمارے سماجی ناسوروں کو منزور کریدتی ہے لیکن تیزی اور سختی سے نہیں، بلکہ نرمی اور ملائمیت سے: ملائمیت فیض کی شاعری کی اہم خصوصیت ہے۔ مرے ہمدم! مرے دوست! اسی ملائمیت کی بہترین مثال ہے۔

ہم بار بار کہتے چلے آئے ہیں کہ فیض لطیف پردوں کا شاعر ہے وہ ایک انسان کی حیثیت سے سب کچھ محسوس کرتا ہے۔ بہت کچھ اپنے موضوع اور رسالے کے لئے فراہم کرتا ہے۔ جنسیت۔ معاشرت، اقتصادیت اور سیاست غرضکہ سب سے متاثر ہوتا ہے لیکن وہ ان سب چیزوں کو شعر کے لطیف پردوں میں ایسا ملبوس کر دیتا ہے کہ اس کی نظم یا شعر، سیاست یا مقصد کے ماسوا سب سے پہلے شعر رہتا ہے۔ فیض شعور طور پر ان سے گریز نہیں کرنا چاہتا کیونکہ سیاست اور ملکی زبوں حالی وخستگی، ذہنی پس ماندگی اور گراوٹ، ملک وقوم دونوں کی ترقی کے راستہ میں رخنہ پیدا کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ شاعر کی حیثیت سے وہ ان تمام واقعات اور گرد وپیش کے زبوں ماحول سے فرار کرنا چاہتا ہو، لیکن شاعر ہونے سے پہلے وہ انسان ہے۔ اس لئے اگر شعری عناصر اسے گریز کرنے کی تلقین کرتے ہیں تو انسانیت آڑے آجاتی ہے اور اس طرح سیاسی ملکی اور قومی کیفیات اس کی شاعری میں از خود اثر انداز ہو کر خلط ملط ہو جاتی ہیں۔ یہاں پر ایک بہت باریک فرق کو سمجھنا نہایت ضروری ہے۔ شاعر کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ سیاسی اور ملکی وقومی حالات کو ایک انسان کی حیثیت سے سمجھے، لیکن شعری جامہ پہنانے وقت اسے چاہئے کہ وہ یہ بات ضرور ذہن نشین رکھے کہ جہاں وہ انسان ہے، وہاں وہ شاعر بھی ہے۔ اس لئے اپنے جذبات میں سیاسی، ملکی وقومی تاثرات کو شاعرانہ لہجہ میں ڈھالے۔ تاکہ بیک وقت شعر وسیاست کا بہترین امتزاج اور کومل اختلاط کا رابطہ استوار رہ سکے۔ یہ خصوصیت فیض کی شاعری میں نمایاں طور پر جلوہ گر ہے۔ ویسے تو قدماء ومتاخرین سے ہر ایک نے اپنے ماحول سے متاثر ہو کر شعر کہے لیکن ان میں زیادہ تر ایسے ہیں جن کی سیاسی تشریح کرنا شعر وشعریت کا خون کرنے کے مترادف ہو گا۔ حسرت موہانی، جوش، مجاز، جواد، علی سردار، ن۔م۔ راشد، احمد ندیم، ساحر، مخدوم، نے بھی اپنی شاعری میں سیاسی عناصر کو کھلایا اور ان میں کامیاب اشعار کہے، فیض اسی دبستان کا ایک فرد ہے۔ فیض کے سیاسی اشعار میں شعریت، شاعرانہ بہاؤ، رنگین لہجہ، لطیف وخوشگوار احساسات، دائمی ارتسامیت مدہم جذبات کی روانی اور منطقی سلجھاؤ، کامیاب امتزاج کے ساتھ، ایک دوسرے میں ملے جلے ہیں۔ "مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ" میں شعریت وسیاست کا شیریں امتزاج قابل غور ہے ؎

ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم واطلس وکمخواب میں بنوائے ہوئے
جابجا بکتے ہوئے کوچہ وبازار میں جسم،
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے

جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے

موضوع وہی ہے جس پر متعدد شعرائے نے طبع آزمائی کی اور اپنی نظموں کا مرکزی خیال بنایا مگر جو پیرایۂ بیان فیض نے اختیار کیا وہ

دوسروں کے یہاں مشکل سے ملتا ہے۔ واقعات کی شدت کو کس طریقے سے شعریت کے لطیف پردوں میں جا بٹھایا ہے کہ شعریت اور سیاست دونوں ایک دوسرے میں بالکل شیر و شکر ہو گئے ہیں۔ اس سلسلہ میں "سوچ" "رقیب سے" "چند روز اور مری جان" "کتے" "سیاسی لیڈر کے نام" "اے دلِ بے تاب ٹھہر" "مرے ہمدم، مرے دوست" قابلِ قدر نظمیں ہیں۔ وہ عشق سے بھی ایک نیا سیاسی سبق سیکھتا ہے اور اپنے تمام گزشتہ اسباق بھول جاتا ہے جو ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے کیا پایا ہے ؎

عاجزی سیکھی، غریبوں کی حمایت سیکھی
یاس و حرمان کے، دکھ درد کے معنی سیکھے
زیردستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھا
سرد آہوں کے، رخِ زرد کے معنی سیکھے

وہ سماج کی اس غلط تقسیم، ظلم و تشدد اور ناجائز دباؤ کو برداشت نہیں کر سکتا۔ شعری بلبلے اس کے منہ سے نکلنے لگتے ہیں اور وہ چاروں طرف سے مایوس ہو کر پکار اٹھتا ہے ؎

زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں!

یا ؎

ان دمکتے ہوئے شہروں کی فراواں مخلوق
کیوں فقط مرنے کی حسرت میں جیا کرتی ہے

قید و بند پر اسرار کڑی دیواریں، بندشوں، پابندیوں، بھندوں اور بندھنوں سے وہ بہت گھبراتا ہے اور ان سب کو توڑ تاڑ کر چاہتا ہے کہ آنے والی نسلوں کے لئے راستہ صاف کر دے۔ عرصۂ دہر کی جھلسی ہوئی ویرانی۔ اجنبی ہاتھوں کا بے نام گراں بار ستم، ہمن سے لپٹی ہوئی آلام کی گرد، دل کی بے سود تڑپ، جسم کی مایوس پکار، یہ سب پیچیدگیاں اور الجھنیں اس کے لئے ناقابل برداشت ہو جاتی ہیں اور وہ ان سب سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ ضرور اس مسئلہ کے حل میں کامیاب ہو سکے گا یہی وجہ ہے کہ ایسے موقعوں پر اس کا لہجہ رجائی ہوتا ہے ؎

لیکن اب ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں
اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں

ہم کو رہنا ہے پہ یونہی تو نہیں رہنا ہے
آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے

چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز

فیض کی یہ پیشین گوئی ایک حد تک پوری ہوتی جا رہی ہے، ہندوستان غلامی کے شکنجوں سے نجات پا چکا ہے اور یقیناً ... کچھ عرصہ بعد وہ مطلوبہ سماج کہ جس کی تلاش فیض اور اس کے رفقائے کار کو ہے، مل جائے گی۔

فی زمانہ اشتراکی شاعر ایک عام لفظ ہو گیا ہے۔ اشتراکی شاعر ہم اس شاعر کو کہتے ہیں جو غریبوں کی حمایت کرتا ہے، مزدوروں

کو سراہتا ہے، سرمایہ داروں کی مخالفت کرتا ہے، شہنشاہیت اور استبدادیت کے خلاف آواز بلند کرتا ہے۔ لیکن موجودہ دور میں یہ باتیں اس قدر ضروری ہوگئی ہیں کہ کوئی شاعر براہِ راست یا بالواسطہ روس کے نظریات سے متاثر ہوا نہ ہو، یہ خیالات جزوِ شاعری بنا تا ہے۔ کیونکہ یہ زمانہ کی سب سے بڑی ضرورت، وقت کی سب سے بڑی پکار اور تاریخی تقاضا ہے۔ اس طرح فیض بھی اشتراکی شاعر ہے۔ یہ رجحان ترقی پسند شاعری میں بالخصوص بہت عام ہے۔ علی جواد زیدی کی شاعری کا مجموعی دارومدار اسی نوع کی شاعری پر ہے ؎

ایسا بھی زمانہ آتا ہے ایسا بھی زمانہ آئے گا

مفقود دنیا ہو جائیں گے جو ظلم و ستم کے خوگر ہیں
افلاس بچائے گا ان کو جو زرداروں کے یاور ہیں
مزدوروں نے کی ہے صدیوں سے دنیا بھر میں تیاری
ہٹ جائے گی پرسطانت شاہنشہی، سرمایہ داری

ایسا بھی زمانہ آتا ہے ایسا بھی زمانہ آئے گا۔

اور فیض مزدوروں کی حمایت یوں کرتا ہے ؎

ناتوانوں کے نوالوں پہ جھپٹتے ہیں عقاب
بازو تولے ہوئے منڈلاتے ہوئے آتے ہیں
جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت
شاہراہوں پہ غریبوں کا لہو بہتا ہے
یا کوئی توند کا بڑھتا ہوا سیلاب لئے
فاقہ مستوں کو ڈبونے کے لئے کہتا ہے۔

آگ سی سینہ میں رہ رہ کے اُبلتی ہے نہ پوچھ
اپنے دل پر مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے۔

دونوں شاعر سرمایہ داری کی مخالفت اور مزدوروں کی موافقت کے لئے آواز بلند کرتے ہیں، مگر دونوں کا لہجہ، دونوں کا اسلوب، دونوں کا طریقۂ اظہار کس قدر مختلف ہے۔ آج کل انقلاب کے اصل معنی یہی ہیں کہ مزدوروں کی موافقت کی جائے، ان کے لئے اپنی تمام شاعری کو وقف کر دیا جائے۔ ضروری نہیں کہ وہ خیالات عملی جامہ بھی پہنیں۔ مخدوم محی الدین کی شاعری میں بھی بہت خلوص قسم کی جھلکیاں موجود ہیں۔ جس سے اس کی شاعری میں وزن اور انفرادیت پیدا ہو گئی ہے۔ وہ بہت مضبوط قسم کا اشتراکی شاعر ہے اور اس لئے انقلابی بھی۔ علی سردار جعفری کی شاعری تو محض اشتراکیت ہے۔ وہ تو اشتراکیت کے علاوہ کسی دوسرے موضوع پر سوچنا اچھا اور مصلحت وقت کے مطابق تصور نہیں کرتا۔ اب کچھ اس کی شاعری کا دھارا عشقیہ اور رومانی شاعری کی طرف بڑھ رہا ہے۔ دیکھئے اس کے بعد وہ کدھر رجوع ہوتا ہے۔ اس کی نظم "مزدور لڑکیاں" کا مقابلہ ہم فیض کی نظم "کتے" سے کر سکتے ہیں۔ چونکہ بغاوت پر آمادہ ہونے کے بعد انسان اچھا یا برا سوچنے پر مائل نہیں ہوتا۔ اس لئے انتہا پسندی اور تغزل و شعریت کی کمی کا احساس ہمیں علی سردار جعفری کی شاعری میں اکثر ہونے لگتا ہے ؎

بغاوت میرا مذہب ہے بغاوت دیوتا میرا
بغاوت میرا پیغمبر، بغاوت ہے خدا میرا

بہرحال وہ اشتراکی شاعری میں ایک کامیاب شاعر ہے۔ اس کی شاعری اکثر ہنگامی اور وقتی ہے۔ فیض مزدوروں کی ضرور حمایت کرتا ہے۔ یہ موضوع وقت کی تبدیلی سے ضرور بدل جائے گا۔ مگر فیض کی شاعری میں وہ دوامی جھلکیاں ہیں جو اسے اور اس کی شاعری کو ہمیشہ برقرار رکھیں گی۔ وہ اشتراکی شاعری کو بھی ایسے عالمگیر لہجہ میں بیان کرتا ہے کہ اس کی شاعری اشتراکی و انقلابی ہوتے ہوئے بھی بڑی موثر و دلپذیر ہے۔ ساحر لدھیانوی بھی کامیاب انقلابی و اشتراکی شاعر ہے لیکن اس کے بیان میں بھی بعض ایسی کرنیں موجود ہیں جو اس کی شاعری میں جان ڈال کر اس کو چمکا دیتی ہیں۔ وہ "تاج محل" کو بزمِ شاہی تصور کر کے اپنی محبوب کو اس سے گریز کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ اسی لئے "تاج محل" جو اصل میں "مظہرِ الفت" خیال کیا جاتا ہے اور جہاں محبت کی تجدید ہو سکتی ہے وہ عشق کو فراموش کر کے اس منظر سے کانپ جاتا ہے۔ اور اپنی محبوبہ سے کہیں اور ملنے کی التجا کرتا ہے ؎

میری محبوب پسِ پردۂ تشہیرِ وفا
تو نے سطوت کے نشانوں کو تو دیکھا ہوتا
مُردہ شاہوں کے مقابر سے بہلنے والی
اپنے تاریک مکانوں کو تو دیکھا ہوتا

ان گنت لوگوں نے دنیا میں محبت کی ہے
کون کہتا ہے کہ صادق نہ تھے جذبے اُن کے

لیکن ان کے لئے تشہیر کا سامان نہیں
کیونکہ وہ لوگ بھی اپنی ہی طرح مفلس تھے
یہ عمارات و مقابر یہ فصیلیں یہ حصار
مطلق الحکم شہنشاہوں کی عظمت کے ستون
سینۂ دہر کے ناسور ہیں، کہنہ ناسور
جذب ہے ان میں ترے اور مرے اجداد کا خون

میری محبوب! انہیں بھی تو محبت ہوگی
جن کی صناعی نے بخشی ہے اسے شکلِ جمیل

یہ چمن زار یہ جمنا کا کنارا یہ محل
یہ منقش در و دیوار یہ محراب یہ طاق
اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لیکر
ہم غریبوں کی محبت کا اُڑایا ہے مذاق

میری محبوب! کہیں اور ملا کر مجھ سے!

زیریں جسم پر نظریں گاڑ دیتا ہے، اور پھر دوری کا یہ منظر تحت الشعور کے پاتال سے گھل گھلا کر مختلف بھیس بدل کر اس کی نظروں میں گھل مل جاتا ہے۔ میرا جی کی نیم شعوری تخلیقات جنسی آسودگی کی بے اعتدالی کے سبب تخریبی ہیں، ان کی نظم "آب جو کنارے" اس نوع کی بہترین مثال ہے ؎

ہاتھ آلودہ ہے نم دار ہے، دھندلی ہے نظر
ہاتھ سے آنکھوں کے آنسو تو نہیں پونچھے ہیں

ن ۔م ۔ راشد جب ماضی کو یاد کرتا ہے تو اس میں گناہ نہ کرنے کا جرم پاتا ہے ؎

گناہ ایک بھی اب تک کیا نہ کیوں میں نے

اور اس گناہ نہ کرنے کا نتیجہ یہ ہے ؎

کہ ایک زہر سے لبریز ہے شباب مرا،

وہ اس پر ملال کرتا ہے ؎

لے کاش چھپ کے کہیں اک گناہ کر لیتا
حلاوتوں سے جوانی کو اپنی بھر لیتا

اس جنسی خواہش کی شدت کی وجہ سے وہ زندگی سے گریزاں رہتا ہے اور اس کے خیالات قنوطیت یا الحاد بھی اسی شدت خواہش کے باعث اس کی شاعری میں پیدا ہو گیا ہے۔ وہ زندگی کو زمستان کی اس حسین رات میں جو اتفاق سے مل گئی ہے، لمس طویل میں بتا دینا چاہتا ہے اور جنسی جبر کو اس قدر فراوانی اور شدت سے بجھانا چاہتا ہے کہ زندگی پر اس کو ترجیح دینے لگتا ہے کیونکہ زمستان کی حسین اور جنون خیز رات میں لمس طویل ہی کے ذریعہ تشنگی روح آسودہ ہو سکتی ہے اور ارباب وطن کی بے بسی کا انتقام لیا جا سکتا ہے۔ اس کے یہاں شدت کا یہ عالم ہے کہ تمام رات کے بعد ؎

شبنمی گھاس پہ دو پیکر یخ بستہ ملیں
اور خدا ہے تو پشیماں ہو جائے

مگر فیض نے فکر و احساس کی ایک نئی تکنیک اس میں دی جو اس دور کی ترجمانی کے لئے موزوں ہے۔ ان کے مصرعوں کی لے میں وہ کھنک یا زمزمہ (T، T) ہے اور ان کی فقرہ سازی (PHRASING) میں جو تازگی اور موزونیت ہے وہ ان کے اسلوب میں ایک خلاقانہ انفرادی خصوصیت پیدا کر دیتی ہے۔ فیض نے ایک نیا مدرسہ شاعری قائم کر دیا انھوں نے جس بصیرت اور احساس، خلوص اور فن کارانہ چابکدستی سے عشقیہ واردات کو دوسرے اہم سماجی مسائل سے متعلق کر کے پیش کیا۔ یہ اردو کی عشقیہ شاعری میں ایک بالکل نئی چیز تھی۔ نئی اور قابل قدر بھی۔ عشقیہ شاعری میں جنسی رجحان کو ایک لطیف طریقہ سے ملانا فیض کا خاص حصہ ہے، جسے اردو شاعری تمام عمر نہیں بھلا سکتی۔

فیض حسن کے پردوں سے انقلاب کو دیکھنے کا عادی ہے۔ دور اول میں جس کو ہم نے رومانی دور کے نام سے موسوم کیا ہے، تمام نظمیں عشقیہ و رومانی ہیں دنیا کی ہر شے سے بے نیاز وہ محبوب کے سینے پر سر رکھ کر اس کے دل کی خاموش و شیریں دھڑکنوں کے سننے کا متمنی نظر آتا ہے۔ یہ جذبہ اس کے اس دور کی نظموں کے ہر ہر مصرع سے مترشح ہے۔ دوسرے دور میں انقلاب اور حسن و عشق، ایک دوسرے

گداز جسم، قبا جس پہ سج کے ناز کرے
دراز قد جسے سرو سہی نماز کرے
غرض وہ حسن جو محتاج وصف و نام نہیں
وہ حسن جس کا تصور، بشر کا کام نہیں

یہ رنگ جوش ملیح آبادی کے لئے مختص سا ہو گیا ہے اور اسی رنگ میں جوش نے متعدد کامیاب نظمیں اور اشعار کہے۔ لیکن فیض چونکہ (شاید) لاشعوری طور پر جوش سے بھی متاثر ہے اس لئے اس رنگ کا اس کے کلام میں آجانا ناگزیر ہے۔ مختصراً یہ کہ فیض کی عشقیہ شاعری کامیاب شاعری ہے۔ اور اس کامیابی کا راز نفسیاتی طریق پر شعر کے لطیف عامر میں پرخلوص جذبات کی تحلیل کہی جا سکتی ہے۔

"میرے ندیم" دور اول کی آخری نظم ہے۔ فیض کے تیور بدلتے جا رہے ہیں اور اس کے خیالات نئے سانچوں میں ڈھلتے اور نئے انداز بیان میں ڈھلتے معلوم ہوتے ہیں جو دوسرے دور کی شاعری میں نمایاں ہو گئے ھیں۔

فیض کی عشقیہ شاعری کے متعلق آخر میں ایک بات اور کہنی ہے کہ وہ اکثر ماضی و مستقبل سے بے خبر حال کا دلدادہ نظر آتا ہے۔ وہ ہر چیز کو فانی سمجھتا ہے اس لئے جو لمحہ عیش میسر آ جائے وہی اچھا ہے۔ وہ عارضی لمحہ کو دائمی بنانا چاہتا ہے، وہ گذشتہ سرور کے داغ دل سے دھو اور فکر فردا سے آزاد ہونے کے لئے رسیلے ہونٹ، معصوم پیشانی، حسین آنکھوں کا متلاشی نظر آتا ہے کہ ع

مرے ماضی و مستقبل سراسر محو ہو جائیں

تاکہ ضیاء حسن سے وہ ظلمات دنیا میں بکھیر سکے اور دائمی طور پر اس دام میں محسوظ ہو سکے تا۔ ان تمام دنیاوی معاملات سے جن میں تکالیف و مصائب کے علاوہ کچھ نہیں ہے، کنارہ کشی اختیار کر کے ع

کہیں اک بار پھر رنگینیوں میں غرق ہو جاؤں

وہ جانتا ہے کہ پھول ہمیشہ بس نہیں رہتے۔ بہار شباب صرف دو گھڑی ہے، اس لئے ضروری ہے ؎

آ کہ کچھ دل کی سن سنا لیں ہم
آ محبت کے گیت گا لیں ہم

نہ معلوم پھر کبھی دل کی صدا سن سنا سکیں یا پھر کبھی محبت کے گیت گا سکیں۔ اس لئے تنہائیوں کی شام کو دور کرنے اور صدائے حیات کو سکون دینے کے لئے ضروری ہے کہ ؎

آ کہ تھوڑا سا پیار کر لیں ہم
زندگی زر نگار کر لیں ہم

اور قبل اس کے کہ اجنبی دنیا کا اندھیرا اور ظلمت گھیر سکے، ایک مرتبہ بس ایک مرتبہ ع

مری جاں، اب بھی اپنا حسن واپس پھیر دے مجھ کو

اور پھر ایسے موقع پر ؎

اب نہ دہرا فسانہ ہائے الم
اپنی قسمت پہ سوگوار نہ ہو

جمیل جالبی

فکرِ فردا اتار دو دل سے
عمرِ رفتہ پہ اشکبار نہ ہو
عہدِ غم کی حکایتیں مت پوچھ
ہو چکیں سب شکایتیں مت پوچھ
آج کی بات رازِ درد نہ چھیڑ

وہ ذرا سے وقت کو جو سینکڑوں حسرتوں اور بے شمار آرزوؤں کے بعد میسر آیا ہے شکوہ و شکایت میں ضائع کرنا نہیں چاہتا، بلکہ اس کو دوسرے کاموں کے لئے وقف کرنا چاہتا ہے۔ اس موقع پر فیض اور راشد ایک واضح فرق کے ساتھ ایک دوسرے کے بہت قریب ہو جاتے ہیں۔

جدید شاعری کا ایک میلان یہ بھی ہے کہ وہ صنائع و بدائع و دیگر صناعی خوبیوں کا کم لحاظ کرتی ہے۔ وہ شعر کو جمہور کا ترجمان سمجھتی ہے اس لئے اس کی زبان سادہ اور لفظی و مبالغہ سے مبرا ہوتی ہے۔ اکثر اشعار سہل ممتنع کی روش کے ہوتے ہیں۔ فیض کی شاعری کی یہ اہم خصوصیت ہے جو اسے دوسرے ترقی پسند شعراء سے ممتاز کرتی ہے۔ ن۔م۔ راشد بلا تکلف فارسی و عربی کے الفاظ کا سہارا لیتا چلا جاتا ہے۔ جوش و مجاز بھی عربی و فارسی کے الفاظ کا استعمال کرتے ہیں، لیکن فیض جو بات کہتا ہے سیدھے سادے الفاظ میں کہتا ہے اور اس سادگی میں اس بلا کا درد، تاثیر، تاثر، متوازن تشریت اور سنجیدہ جذبات سمو دیتا ہے کہ وہ شان و شوکت جو فارسی الفاظ کا حصہ ہے، اس کی شاعری میں پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ چیز فیض کے جوہرِ قابل اور فنکارانہ قوتوں کو واضح طور پر ظاہر کرتی ہے۔ کوئی نظم، کوئی شعر لیجئے سب میں یہی سادگی و پرکاری ملے گی۔ اس کی زبان جمہور کی زبان ہے اس میں شعری چٹخارہ اور لذت بدرجۂ اتم موجود ہے۔

فیض کی تشبیہات، راشد کی طرح غیر مانوس نہیں ہوتیں کہ جن پر ہم چونک پڑتے ہیں۔ بلکہ ایسے مواقع پر ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ دورانِ شعر میں تشبیہ از خود قلم سے نکل گئی ہے جس کا احساس شاعر کو خود بعد میں ہوا۔ اس کی تمام تشبیہات، نفسیاتی تحلیل سے اثر پذیر ہوتی ہیں۔ اس کی تشبیہات کو ہم "زیریں تشبیہ" کا نام دے سکتے ہیں۔

مکمل سکوت، چاندنی رات، نیم وا کہکشاں اور بزمِ انجم کی افسردہ سامانی کو دیکھ کر یہ کہہ دینا کس قدر نادر ہے کہ ؎

زندگی جزو خواب ہے گویا
ساری دنیا سراب ہے گویا

رات کے وقت کھوئی ہوئی یاد کے آ جانے کو یوں کہنا کہ ؎

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی!
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آ جائے،
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آ جائے

کس قدر اچھوتا اور نرالا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اشعار و تشبیہات، دونوں ایک دوسرے کے ممنونِ احسان ہیں۔

ایک تشبیہ ہے ؎

زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں

فیض نے زندگی کو مفلس کی قبا سے تشبیہ دی ہے۔ مفلس کی قبا کا نام سنتے ہی مختلف پیوند ہمارے ذہن میں ابھرنے لگتے ہیں اور پھر دوسرے مصرعہ میں پیوندوں کا ذکر کرکے درد کے ساتھ مخصوص کر دینے سے، نفس مضمون میں گہرائی اور تاثر غیر معمولی بڑھ گیا ہے۔ فیض اپنی شاعری میں تشبیہات، داخلی و خودی جذبات سے پیدا کرتے ہیں۔ اس کی تشبیہات خارجی و داخلی، نفسیاتی ماحول کے بہترین نمونے ہیں جو لاشعوری طور پر ان کے قلم سے نکل جاتی ہیں۔

"ہم لوگ" کی تشبیہ داخلی کیفیت کی مکمل ترجمان ہے ؎

دل کے ایوان میں لئے گل شدہ شمعوں کی قطار
نورِ خورشید سے سہمے ہوئے اکتائے ہوئے
حسنِ محبوب کے سیال تصور کی طرح
اپنی تاریکی کو بھینچے ہوئے لپٹائے ہوئے

تاریکی کو دل کے ایوان کی گل شدہ شمعوں کی قطار میں حسنِ محبوب کے "سیال تصور" کی طرح، بھینچے ہوئے کہنا کس قدر نادر اور انوکھا ہے، اہلِ ذوق اس سے بخوبی لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

"سیاسی لیڈر کے نام" نظم میں، ہندوستانی سیاسی لیڈروں کی کم مائگی و بیچارگی کے اظہار کا طریقہ، تشبیہ کے باعث کس قدر موثر ہو گیا ہے ؎

جس طرح تنکا سمندر سے ہو سرگرمِ ستیز
جس طرح تیتری کہسار پہ یلغار کرے

تشبیہ سے ہندوستان کے سیاسی لیڈر کا تصور ہمارے ذہن میں رقص کرنے لگتا ہے اور تھکا ہوا، سالہا سال سے بے آسرا بیچارہ لیڈر اپنی کم مائگی اور بے بضاعتی کے ساتھ ہمارے ذہن کے صفحۂ قرطاس پر نقش ہو جاتا ہے۔

فیض کی ایک نظم ہے "شاہراہ" ؎

ایک افسردہ شاہراہ ہے دراز
دور افق پر نظر جمائے ہوئے
سرد مٹی پہ اپنے سینے کے
سرمگیں حسن کو بچھائے ہوئے
جس طرح کوئی غمزدہ عورت
اپنے ویراں کدے میں محو خیال
وصلِ محبوب کے تصور میں

کی تراکیب اور تصویروں میں شعریت اپنے سوز و گداز کے ساتھ جلوہ افروز نظر آتی ہے۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

خزاں رسیدہ تمنا۔ جنبشِ مجرمِ عقیدت۔ بے رنگ ساعت۔ آتشِ سکوت
دیدۂ سرشار۔ فضائے فکر و عمل۔ تاریک بیابانِ طلسم۔ افسردہ سبک۔ اجنبی خاک۔ بے خواب کواڑ
جھلستی ہوئی ویرانی۔ بے نام گراں بار ستم۔ چشمِ تر۔ سلگتی ہوئی شام۔ پُر اسرار کڑی
دیدۂ تر۔ آزمائش صبر گریز۔

فیض کی دو نظمیں ہیں۔ تنہائی اور گئے۔ فیض کی نظم "تنہائی" میں جس قدر شاندار الفاظ اور عمدہ اسلوب ہے۔ یہ نظم اسی قدر مبہم اور بے معنی ہے۔ یہ رجحان بھی انگریزی سے اردو میں آیا۔ کچھ دنوں سے انگریزی شاعری میں یہ رجحان بہت عام ہے۔ اس میں اس قسم کی نظمیں لکھی جا رہی ہیں جن کو پڑھ کر ہم یہ تو ضرور محسوس کر سکتے ہیں کہ کوئی افسردگی اور دل کی سی بات بیان کی جا رہی ہے۔ لیکن وہ پاس و افسردگی کس لئے ہے؟ اور کیوں ہے؟ یہ نہ شاعر سمجھتا ہے اور نہ پڑھنے والا اس لئے اس قسم کی نظموں کی ہم حسب منشا تفسیر و تاویل کر سکتے ہیں۔ اس میں ایک مصرعہ کا تعلق دوسرے مصرعہ سے بہت کم ہوتا ہے۔ ایک تصویر کے بعد دوسری تصویر بہت تیزی سے آتی چلی جاتی ہے، اور پھر ایک دم نظم ختم ہو جاتی ہے۔ فیض کی نظم "تنہائی" بھی اسی طرح کی مثال ہے۔ پڑھتے وقت ہم افسردگی اور یاس ضرور محسوس کرتے ہیں۔ اور راشد کے الفاظ میں مجرد تاثر بھی کسی حد تک محسوس کرتے ہیں لیکن شاعر کب، کہاں "ذہنی تجربہ" جس سے راشد صاحب کا مطلب شاید زندگی کا مسلسل افسردگی سے گزرنے سے ہے، ظاہر نہیں ہوتا۔ اگر میں یہ کہہ دوں تو غلط نہ ہوگا۔ یہ راشد صاحب کی محض خوش فہمی ہے جدید انگریزی شاعری کے اس رجحان کو اردو شاعری میں عام کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن اگر محض افسردگی یا یاس طاری کرنے کے لئے اتنے سارے مصرعے لکھے گئے تو کوہ کندن و کاہ برآوردن کے مترادف ہوگا۔ میر کا ایک شعر بھی اتنی یاس یا اس سے زیادہ افسردگی کا شدید احساس دلا سکتا ہے۔

اگر اس نظم کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کی جائے تو چارہ جوئی کا حاصل یہی ہوگا کہ یہ نظم سیاسیات میں الجھے ہوئے لمحے کی پیداوار ہے اور نہ تہذیب و مذہب کے شیرازہ بکھرنے سے کوئی واسطہ رکھتی ہے۔ اور بظاہر طور پر اس نظم کے مصرعوں میں بھی کوئی ربط اور وابستگی نہیں ہے۔ محض یاس کے زور سے ایک مصرعہ دوسرے سے منسلک کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ شاعر کے ذہن لاشعور سے ایک وقت میں متعدد و متضاد خیالات ابھرے۔ جس کو اس نے بلا امتیازِ تسلسل و ربط، شعر کا لطیف جامہ پہنا دیا جو اس کا خاص حصہ ہے۔ شاندار الفاظ، موسیقیت اور بلند لفظی غرضیکہ بہت کچھ ہے، اور ہاں یاس بھی مگر معنی ....؟ یہ سوال ذرا وقت طلب ہے۔ جذباتی ترتیب نے اس نظم کو اور مبہم بنا دیا ہے۔ جدید اردو شاعری کا یہ بھی ایک تجربہ ہے۔ تجربہ کامیاب بھی ہوتا ہے یا نہیں۔ یہ شاید آنے والی نسلیں فیصلہ کر سکیں گی۔

ایک بات اور۔ نظم کا پہلا مصرعہ ہے۔ ع

پھر کوئی آیا دلِ زار نہیں کوئی نہیں

لفظ "پھر" قابلِ غور ہے۔ لفظ "پھر" سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کسی کے بار بار آنے سے اکتا سا گیا ہے اور اب بجائے چوکنا ہونے کے وہ ایک قسم کی بیزاری سی محسوس کر رہا ہے۔ تنہائی میں قدم کی آواز سے چوکنا ہو کر منتظر لفظ "پھر" استعمال نہیں کرتا۔ اس سے نظم کی مجرد تاثیر مجروح ہوتی ہے نظم یہ ہے:

پھر کوئی آیا دلِ زار نہیں کوئی نہیں
راہرو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا۔

ڈھل چکی رات، بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گزار
اجنبی خاک نے دھندلا دیے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا

فیض کی نظم "تنہائی" اردو ادب میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔ اردو میں بہت کم نظمیں ایسی ہیں جو اس نوعیت اور صنف میں ملتی ہیں اور جن میں وہ اتنی خوش اسلوبی سے لکھی گئی ہوں۔ یہ نیم سیاسی تمثیل کی مثال ہیں۔ جس میں مضمون و معانی کے خزانے بکھرے پڑے ہیں۔ سو برس کی ہندوستانی زندگی کے اخلاق و کردار، تہذیب و تمدن، ذہنی رجحان، پستی و ذلت اور احساس کمتری کو اس نظم میں اتنے مختصر اور اس قدر جامع الفاظ میں سمو دیا ہے کہ نظم ایک معجزہ سی معلوم ہونے لگی ہے۔ شدتِ تاثیر، سادگی، وضاحت و صفائی اس نظم کے پہلے مصرع سے آخری مصرعہ تک ملتے ہیں۔ اس نظم کو دیکھ کر ہمیں فیض کی فنکاری کی داد دینی پڑتی ہے۔ اور اسے صحیح معنوں میں جمہور کا شاعر کہنا پڑتا ہے۔ جمہوری شاعری کے لئے ضروری ہے کہ اس میں الفاظ سادہ ہوں، بات کا انداز بھی عام فہم ہو۔ خیالات میں ابہام اور پیچیدگی نہ ہو۔ جو کچھ کہا جائے اس میں تاثیر و تاثر ہو۔ اور جس وقت وہ پڑھی جائے تو آدمی کا ذہن، دل و دماغ اس کی طرف متوجہ اور خاموش ہو جائے۔ اس قسم کی شاعری جادو کا اثر رکھتی ہے۔

اس قسم کی دو چار نظمیں اگر ترقی پسند ادب میں اور لکھی جائیں تو اردو ادب میں جمہوری شاعری مکمل کہی جا سکتی ہے۔ یہ نظم ایک نئی منزل کی طرف رہبری کرتی ہے۔ اس نظم میں ذہنی و باطنی ربط اور اس کی معنویت خاص طور سے ذکر کے قابل ہے۔ فیض رسمی باتیں نہیں دہراتا، بلکہ مشاہدہ اور تجربہ اپنی شاعری میں سموتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اخلاص اور تاثیر اس کی شاعری میں ہر جگہ مترشح اور ظاہر ہوتی ہے۔

فیض کے فن کی نمایاں خصوصیت اس کا خلوص ہے۔ اور یہی چیز اس کو اکثر ترقی پسند شعراء میں ایک ممتاز درجہ دلانے میں مددگار و معاون ثابت ہوتی ہے۔ وہ جو کچھ لکھتا ہے اپنے دل کی گہرائیوں میں محسوس کر کے اور سمو کر کہتا ہے۔ اگر شاعری میں خلوص اور آمد نہ ہو تو وہ محض پروپیگنڈا ہو کر رہ جاتی ہے۔ مشہور چینی مصنف لن یو تانگ (LIN YUTANG) کا یہ کہنا کہ "جو چیز ادب کو پروپیگنڈہ سے علٰحدہ کرتی ہے وہ مصنف کا آرٹ اور اس کا خلوص ہے"۔ فیض کی شاعری پر منطبق ہوتا ہے۔ "نقش فریادی" میں اکثر نظمیں اس نوعیت کی ہیں، جن سے خلوص، شیریں چشمہ کی طرح ابلتا محسوس ہوتا ہے۔ اور یہی چیز اسے ترقی پسند شاعری کے آسمان پر ایک بلند ستارہ کی خوشگوار درخشانی عطا کرتی ہے۔

فیض کا اسلوبِ بیان پسندیدہ ہے۔ اس کا طرزِ گفتار اور طریقۂ بیان بالکل منفرد ہے اس کا طرز قدیم و جدید رنگ کے تصادم سے پیدا ہوا ہے۔ وہ ایک باغی شاعر ہے لیکن باغی شاعر ان معنوں میں نہیں کہ وہ انقلاب زندہ باد کے نعرے بلند کرتا ہے۔ باغی ان معنی میں نہیں کہ اس نے اشتراکیوں کی فہرست میں اپنا نام درج کرا لیا ہے۔ باغی ان معنی میں نہیں کہ اس نے جا و بیجا ترقی پسند تحریک کو سراہا ہے۔ بلکہ وہ باغی ان معنی میں ہے کہ اس نے ہیئت کو جوں کا توں برقرار رکھ کر صرف مواد میں بغاوت کی۔ اس کی شاعری تنگنائے ردیف و قافیہ

ورنہ تجھ سے تو مجھے کوئی پیار نہیں!

عشق دل میں رہے تو رسوا ہو

لب پہ آئے تو راز ہو جائے!

عمر بے سود کٹ رہی ہے فیضؔ

کاش افشائے راز ہو جائے!

اب تری دید چھین گئی مجھ سے

ورنہ دنیا میں کیا نہیں باقی

چشم مستی کوں ذرا ادھر کر دے

دست قدرت کو بے اثر کر دے

یہ وہ خصوصیت ہے جو انہیں ترقی پسند غزل گو شعراء میں سب سے نمایاں و ممتاز و منفرد بنانے کے لئے کافی ہے۔

فیض کی غزلیں پڑھتے ہیں تو ... اور وہ بات بھی الٰہی ہی کہتا ہے کہ ایک شدت کے ساتھ ... قائل ہوتے ہیں مگر اس کی ان سیدھی سادی باتوں میں وہ ... حقیقت اور سچائی [illegible] پتا ہے۔ —

ساری دنیا سے دور ہو جائے

جو ذرا تیرے پاس ہو بیٹھے۔

زندگی تیری بے رخی رہ گئی!

ہم تری آرزو بھی کھو بیٹھے

راز الفت چھپا کے دیکھ لیا

دل بہت کچھ جلا کے دیکھ لیا

اور کیا دیکھنے کو باقی ہے

آپ سے دل لگا کے دیکھ لیا

ایک خاص بات اور ...... فیضؔ کی دوسرے دور کی غزلوں میں زندگی سے قربت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اور وہ بیمانہ طلسم کی طرف متوجہ معلوم ہوتا ہے۔ یاد محبوب پہ غم روزگار حاوی آجاتے ہیں۔ اور اس کو محبوب کی یاد سے زیادہ زمانے کے رنگ میں دلفریبی نظر آتی ہے ؎

دنیا نے تری یاد سے بیگانہ کر دیا!

تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

فیضؔ کی غزلیں دیکھ کر مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ ابھی غزل میں زندہ رہنے کی سکت اور صلاحیت موجود ہے۔

مختصراً فیضؔ کی شاعری نے جہاں نئی شاعری میں ایک نئے اسکول کی بنیاد رکھ کر ہمیں دعوتِ فکر دی ہے۔ وہاں ہمیں خارجی منفرد زاویہ ہائے نگاہ سے بھی مانوس کیا ہے۔ وہ قدیم و جدید شاعری کے سنگم پر کھڑا ہے۔ فیضؔ جانتا ہے کہ شاعر ایک سائنس داں

سید ابوالخیر کشفی

وقت، نقشِ فریادی، ہم اور میں

یہ مضمون جمیل صاحب (مایا آپا کے نصف بہتر) کی نذر ہے جن کی ہر بات سنہ ۱۹۲۱ء سے شروع ہوتی ہے ـــــ ان کی محفل میں ماضی حال بن جاتا ہے۔

WHATEVER LIFE MAY BE, IT IS AN EXPERIENCE

Whatever experience may be, it is a flow through time, a duration, a many-colored episode in eternity.

IRWIN EDMAN

فیض کا پہلا شعری مجموعہ "نقشِ فریادی" قیامِ پاکستان سے پہلے شائع ہو چکا تھا۔ اس وقت میں ثانوی اسکول کی ابتدائی جماعتوں تک ہی پہنچا تھا۔ نقشِ فریادی سے زنداں نامہ تک ۔۔۔ بلکہ اب تو "دستِ تہِ سنگ" (آمدہ کی خبر مجھے نہیں) تک وقت کے کتنے مرحلے گزر چکے ہیں۔ مہ و سال کی گردشوں نے مجھے اور آپ سب نے کیا کچھ جھیلا ہے اور کیا کچھ دیکھا ہے۔ فیض کی شاعری بھی کن راہوں سے گزر کر حریمِ ادب کے اس مقام تک پہنچی ہے کہ آج فیض نمبر شائع کیے جا رہے ہیں۔

اب تک میں نے جو کچھ عرض کیا اس میں وقت، فیض، میں اور ہم (میرے ساتھی اور آپ سب) آ گئے ہیں۔ اشارہ ہی سہی، مگر تذکرہ ہم سب کا ہو چکا۔

میٹرک یا کالج کے پہلے سال سے لے کر اب تک فیض پر مضمون لکھنے کی خواہش ہمیشہ شدت کے ساتھ دل میں موج زن رہی ہے میں شاید دانستہ طور پر اپنی کئی عزیز خواہشوں کی تکمیل کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ رہا ہوں۔ آدمی بھی خوب ہے، بت شکنی کرتا ہے اور اپنی شخصیت کے بت کو توڑ نہیں پاتا۔

ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور

اور ویسے بھی ہر خواہش کا پورا ہو جانا (میرا مطلب ہے آسانی کے ساتھ) کوئی اچھی بات نہیں ـــــ جو خواہش پوری نہیں ہوتیں وہ

دل کے قریب اس خلش کی طرح رہتی ہے جسے کسی کا نام کہتے ہیں۔ — میری ایک خواہش تو پوری ہو رہی ہے، کوئی بیس سال بعد ابھی میں فیض پر مضمون لکھ رہا ہوں —— میری بعض دوسری خواہشوں میں سے کچھ زندہ ہیں اور کچھ مر چکی ہیں مثلاً میں چودھری محمد علی ردولوی سے نہ مل سکا —— رشید احمد صدیقی اور راجندر سنگھ بیدی سے ملاقات میرے لئے خواہش کا درجہ رکھتی ہے اور جب میں بمبئی یا علیگڈھ گیا تو یگانہ یاس کا یہ شعر پڑھتے ہوئے کسی دوسری طرف مڑ گیا ؎

بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے
وہ بدنصیب جسے بخت نارسا نہ ملا

خدا —— "والعصر" —— اور پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بھی تو ہے —— "وقت کو برا نہ کہو۔ وقت خدا ہے" —— دیکھئے "خدا" ارادہ پرستی اور بخت نارسائی بھی "وقت" کا عنصر وجود ہے۔

۱۹۴۳ء میں میں مشکل سے گیارہ بارہ برس کا تھا ۱۹۴۳ء کے اندولن کے ساتھ ساتھ فضا پاکستان زندہ باد کے نعروں سے گونج رہی تھی۔ دوسری طرف ترقی پسند تحریک اپنے شباب پر تھی۔ پاکستان کی تحریک کے ساتھ ساتھ ترقی پسند تحریک کے ساتھ بھی اس عہد میں کتنوں کا ذہنی رشتہ نوجوانی ہی سے ملکہ لڑکپن سے قائم ہو گیا تھا۔ یہ تو بہت دنوں بعد قیام پاکستان کے بعد کی بات ہے جب بمبئی سے یہ اعلان کیا گیا کہ جو اشتراکی نہیں وہ ترقی پسند نہیں اور یہی اعلان اس تحریک کی موت بنا۔

۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۵ء تک کا دور میری اور میرے دو تین عزیز ساتھیوں کی زندگی کا تشکیلی دور رہا ہے۔ ایک طرف ہم ٹرکوں میں سوار ہو کر بیٹھ کے رہے گا ہندوستان، بٹ کے رہے گا ہندوستان، لے کے رہیں گے پاکستان کے نعرے لگاتے تھے اور دوسری طرف نئے ادب کا مطالعہ کر رہے تھے۔ ہائی اسکول پاس کرنے سے پہلے ہی اقبال اور جوش کو تو چھوڑئیے۔ فیض، راشد، میرا جی، مخدوم محی الدین، مجاز، جذبی، جاں نثار اختر، سلام مچھلی شہری، اختر الایمان، اختر رائے پوری، احمد علی، کرشن چندر، ملٹو، عصمت سے ہمارا ذہنی رشتہ قائم ہو چکا تھا۔

"ساقی" اور "ادبی دنیا" یہ دو رسالے اس عہد میں نئے ادب کے نشان کا درجہ رکھتے تھے۔ ادب کے ان راستوں پر شمیم صاحب ہمارے قافلہ سالار تھے ادبی دنیا اور ساقی وہ پابندی سے منگاتے تھے اور پھر ہمارے باہمی تعلقات اس بات پر بگڑ جاتے کہ شمیم صاحب کے بعد ساقی یا ادبی دنیا پہلے کون پڑھے۔

ترقی پسند تحریک اور نئے ادب کے فروغ کے ساتھ ساتھ شاعری کے قدیم اسالیب بھی زندہ تھے۔ غزل کو تو عہد حاضر کے سب سے بڑے باغی شاعر میرا جی نے سدا سہاگن کہا تھا۔ نیا ادب ہمارے گرد و پیش کے لئے کوئی غیر کی پیداوار نہ تھا ہم باغ و بہار، فسانہ عجائب، میر اور غالب کی ذہنی دنیا سے تعلق کر کے ہی ہوشربا کی چھاؤں میں دم لینا سیکھ چکے تھے۔ اب ذرا "ہم" کی تشریح بھی ہو جائے۔ شمیم صاحب کے علاوہ حسین کاظمی، غلام علی، احمد حسین خاں عزیزی اور مظہر الحق اس گروہ میں شامل تھے۔ مظہر، شمیم صاحب کے حلقہ بگوش نہ تھے۔ وہ اسلم ہندی صاحب کے مقلد تھے۔ اور یوں ان کی دوستی کے وسیلے سے اسلم ہندی صاحب سے بھی ہم نے بہت کچھ سیکھا۔ ۱۹۴۶ء میں بھوپال سے ایک ہونق سا لڑکا آیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ہماری زندگی کا حصہ بن گیا۔ یہ لڑکا کالج میں پڑھنے آیا تھا مگر دنیا کے ساقی نامہ سے فیض کے نقش فریادی تک، یہ لڑکی ہم نے ایک ساتھ طے کیں۔ کل کا یہ لڑکا آج کا

ڈاکٹر حنیف فوق ہے۔ حسنین کاظمی صاحب نیشنل کالج کراچی کے وائس پرنسپل اور ادب کے استاد ہیں اور احمد حسین خاں اب زیب[1] غوری ہیں۔

لوگ مجھے ماضی کا مرثیہ خواں سمجھنے لگے ہیں حالانکہ میں زندگی کو سعادت جانتا ہوں۔ نہیں تو فیض پر مضمون ہی کیوں لکھے بیٹھتا جس زمانے کو حضرت جوش ملیح آبادی نے "بیوہ عالم" کہا تھا اور اس دور میں کی میں بات کر رہا ہوں۔ ہم اس نتیجہ پر پہنچ چکے تھے کہ فانی اپنے غم سے بڑے تھے۔ اپنے غم سے بڑے نہ ہوتے تو شعر کہنے کی جگہ خودکشی کر لیتے۔

سنہ ۴۲ء سے سنہ ۴۳ء تک، تو ہم محمد حسن عسکری، اختر الایمان، شفیق الرحمٰن اور قرۃ العین حیدر سے بھی آشنا ہو چکے تھے۔ غوری پطرس کے مضامین پڑھتے پڑھتے آدھی رات کو اس زور سے قہقہہ لگاتا کہ پڑوسی نے اپنی بیوی اور اپنے ہونے والے بچے کی خاطر اپنا مکان خالی کر دیا۔ عسکری کی "پھسلن" چودھری محمد علی ردولوی کی "تیسری جنس" اور عصمت کے "لحاف" کے مفاہیم بھی سمجھ میں آنے لگے تھے (ادب کا مطالعہ آدمی کو ذہنی اور جسمانی طور پر وقت سے پہلے بالغ کر دیتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ کوئی اچھی بات ہے) مجھے ساقی کا سولہ صفحات کا وہ شمارہ آج بھی یاد ہے جس میں قرۃ العین حیدر کا افسانہ "دیودار کے سائے" شائع ہوا تھا۔ اور شاہد صاحب کا نوٹ بھی۔

یہ سب باتیں میں اس لئے عرض کر رہا ہوں کہ وقت کا تصور ادب کی تفہیم میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ سجاد ظہیر کی کتاب "روشنائی" کی اہمیت اسی نکتہ میں مضمر ہے۔ ان دنوں ادب ہمارے لئے ایک شیریں دیوانگی تھا۔ اچھے شعر ہیروں سے بھی معلوم ہوتے تھے۔ اداس شامیں ہم فراق کے شعر پڑھتے۔ اس وقت جب سورج ڈوب رہا ہوتا۔ دھندلکا ہمیں پسند تھا آج ادب کے نقاد بہت ہیں اور اچھے قاری بہت کم۔ اس وقت قاری اور لکھنے والے کا رشتہ زیادہ قوی تھا۔ پڑھنے والے ایک قوت کا درجہ رکھتے تھے اور زندگی کے اس موڑ پر فیض کی شاعری سے ہماری ملاقات ہوئی۔

فوق، غوری، میں اور حسنین یہ اکثر لکھتے تھے کہ "راہ گزر" کا مضمون غالب کی ملکیت ہے۔ اب شاعری میں رہ گزر کو کوئی اور راہی

---

[1] غوری اپنے آپ کو "مستقبل کا شاعر" سمجھ کر اپنے کلام کو چھپائے" بیٹھا ہے مگر اسکا منتخب کلام میرے ہاتھ لگ گیا ہے اور میں اسے "چھپانے" کا منصوبہ بنا چکا ہوں اس وقت دو چار شعر سن لیجئے۔ غزل کے ایوان میں آپ اس لہجے سے مستقبل قریب میں انکار نہ کر سکیں گے۔

خاموش داغ دل کی طرح ہو گیا ہے چاند　　　مدت سے چھیڑتا ہی نہیں کوئی اسکی بات

ہے خم دیپیچ بدن سیر گہ مستی و کیف　　　تیری سانسوں کا تموج ہے کہ دریا کا بہاؤ
زندگی کی کوئی آہٹ تو ہو غم خانے میں　　　اے ہواؤ! انہیں دروازے کی زنجیر ہلاؤ

دل کی صورت گھٹ رہی ہے ڈوبتے سورج کی لو　　　اٹھ رہا ہے کچھ دھواں سا در ملی کھاتا ہوا
جیکلا ہے مقدر کیا اس تیرہ نصیبی کا　　　سورج بھی شب غم کا پرچم نظر آتا ہے

نہ ملے گا۔ اچانک فیض کا یہ شعر محمدی نے سنایا ہے

نہ جانے کس لئے امیدوار بیٹھا ہوں
اک ایسی راہ پہ جو تیری رہگزر بھی نہیں

اور ہمیں پتہ چلا کہ غزل کی رہگزر کو ایک نیا راہی مل گیا اور اس کا نام فیض ہے۔

میں نے کسی جگہ لکھا ہے کہ "بعض وقت کسی کی گرفت میں آیا ہے جو میری گرفت میں آئے گا"۔ لیکن میں کوشش کر رہا ہوں کہ اس دور کو تحریر کے زنداں میں مقید کر سکوں جب فیض ہمیں ملے۔ کتنے ہی نام پہلے آ چکے ہیں اور کتنی ہی باتیں ——— یہاں دو تین باتیں ذرا ترتیب سے کہنا چاہتا ہوں۔ نمبر ۱ اور نمبر ۲ وغیرہ سے مجھے نفرت ہے۔ مگر یہ بھی سہی۔

۱۔ اس دور میں پندرہ سولہ سال کے لڑکے محض اپنے عہد کے مقبول ادب کو سامنے رکھ کر فیصلے نہیں کرتے تھے۔ ہم خوش گلوئی کو عظمت قرار نہیں دیتے تھے۔ وہ دور مشاعروں کا دور تھا۔ ہر سال سردیوں میں مشاعروں کا سیزن آتا تھا جگر مراد آبادی، حفیظ جالندھری، احسان دانش، ساغر نظامی، ماہر القادری، شعری بھوپالی۔ راز مراد آبادی مشاعروں کے دولہا تھے۔ ان کے کچھ بعد شکیل بدایونی اور خمار بارہ بنکوی چکے۔ جوش صاحب مشاعروں میں ذرا کم ہی آتے تھے۔ ہماری کتنی ہی راتیں مشاعروں میں جاگتے گذرتیں۔ ان لوگوں کے شعر ہم سنتے، پسند بھی کرتے، مگر اب ہماری توجہ کا مرکز راشد، فیض، مجاز اور جذبی بن رہے تھے۔ مشاعروں کے اس عہد کے کتنے ہی شاعر اب تو طاق نسیاں کے گلدستے بھی نہ رہے، لیکن کل کے وہ نام تاریخ ادب کا حصہ بن گئے ہیں۔

۲۔ اچھے اور پھڑکتے ہوئے اشعار پر ہم لوگ کھل کر داد دیتے لیکن انہیں اپنے پورے شعری ادب کا حصہ نہ سمجھتے تھے۔ فیض کا پہلا شعر ہم نے سنا اور اسے اپنے شعری ادب کے پس منظر میں دیکھا اور لوح ذہن پر لکھ لیا۔ آج یہ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ سال بھر ہم جن طالب علموں کو میر سے فیض تک اپنا بہترین شعری ادب پڑھاتے ہیں۔ مشاعروں کے زمانہ میں وہ ہر ادبی معیار سے بے نیاز ہو کر خوش آوازی کا شکار ہو جاتے ہیں اور ہر شاعر کے آگے آٹوگراف بک پھیلاتے نظر آتے ہیں (ایسے شاعر کبھی کبھی طلباء کے قلم بھی لے جاتے ہیں اور طالب علم بیچارے کچھ نہیں کہتے۔ ہاں ایک دن کراچی یونیورسٹی کے ایک طالب علم نے بڑے اطمینان سے فیض صاحب کا قلم اپنی جیب میں لگا لیا تھا)

۳۔ اس دور کا تذکرہ کرتے ہوئے میں یہ کہنا تو بھول ہی گیا تھا کہ کتنے ہی بڑے شاعر ہمارے گھر آتے۔ ہمارا گھر جو خانقاہ کا حصہ تھا وہاں جوش صاحب اور جگر صاحب تحمل فرماتے تھے۔ شادانی صاحب کی آواز بھی نہیں پردہ دل پر پہلی بار سنائی۔ اثر لکھنوی بھی اکثر کرم فرماتے۔ ساغر نظامی اور روش صدیقی بھی آتے۔ ان آتے جاتے شاعروں کے ہجوم میں فیض مجھ سے قریب تر ہوتے گئے۔ نیفض جنہیں میں نے دیکھا بھی نہیں تھا۔

۴۔ آپ اپنے عزیز ترین دوست کے بارے میں ذرا یہ تو سوچیے کہ اس سے پہلی بار کب اور کہاں ملاقات ہوئی تھی؟ مجھے یقین ہے کہ آپ کو یہ بات یاد نہ آئے گی۔ مگر یہ کیسی عجیب بات ہے کہ یہ "بات" اچھی طرح یاد ہے کہ فیض کا سب سے پہلا شعر ہم تک

لہ مضمون کے عنوان کو نہ بھولیے۔

کب اور کیسے پہنچی، اور ہمارا ردعمل کیا تھا۔ شاید اسی آخری بات کی خاطر میں نے کچھ اور باتیں آپ سے کہہ دیں۔

۵۔ ایک بات اور یاد آئی ۔ وہ بھی کہتا چلوں۔ ہماری غزل کو تاریخی حالات نے "دلی" اور "لکھنؤ" کے دبستانوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ جلال لکھنوی، شاد عظیم آبادی، ریاض اور صفی لکھنوی کے بعد حسرت، اصغر، فانی، جگر، یاس یگانہ چنگیزی اور فراق نے نئی اردو غزل کو جنم دیا ــــ اردو غزل جو "قید مقامی" کے زنداں میں اسیر ہو گئی تھی۔

یو پی والے جدید ادب اور شاعری میں پنجاب کے حصہ کو تسلیم کرتے تھے اقبال تو جدید شاعری کا گویا بانی تھا (رشید احمد صدیقی کے الفاظ میں کون نیا کہہ سکتا ہے) بھلا اسے کون نظر انداز کر سکتا تھا ظفر علی خان کی صحت زبان سنگلاخ زمینوں کو مانوس کر دینے کی صلاحیت بدیہہ گوئی کو بھی تسلیم کرتے تھے، مگر یوپی والوں کا عام تاثر یا تعصب یہ تھا کہ پنجابی اچھی غزل نہیں کہہ سکتے۔ یہ تعصب اس وقت بھی قائم تھا جب بال جبریل کی غزلوں کے ذریعہ اقبال نے غزل کو حیات و کائنات کا آئینہ دار بنا دیا تھا۔ ذہنوں میں غزل کا ایک مخصوص تصور تھا غزل تغزل سے عبارت تھی۔ حرف گفتن با زنان یا پھر ؎

غزل ہے نام عشق کے معاملات خام کا

فیض کی نظموں سے پہلے ان کی غزلوں نے ہمیں اپنی طرف متوجہ کیا۔ اس کا مطلب واضح تر الفاظ میں یہ ہے کہ وہ اردو کلچر کے نمائندوں میں سے ایک ہیں۔ وہ ان روایات کو اپنی ذات میں سمو چکے ہیں۔ جوش و حافظ سے حسرت تک ایک زندہ زنجیری سلسلہ کا درجہ رکھتی ہیں ــــ حفیظ جالندھری بہت مقبول ہوئے "ابھی تو میں جوان ہوں"، "جاگ سوز عشق" اور "شاہنامہ" کے ذریعہ ــــ فیض ہماری زندگی میں غزل لے کر آئے۔ اور دست صبا میں "نذر سودا" اور "نذر غالب" کوئی اتفاقی بات نہیں ــــ فیض کی شہرت کے بعد سے اب تک پنجاب نے کئی ایسے غزل گو پیدا کئے ہیں جو اس صنف سخن کی آبرو ہیں جو ہماری "شاعری کی آبرو" ہے ــــ لیکن میری یادداشت (اور ناچیز رائے) کے مطابق قیام پاکستان سے پہلے فیض، ڈاکٹر تاثیر مرحوم، حفیظ ہوشیار پوری، صوفی تبسم اور عابد علی عابد کی غزلوں نے ہمیں یہ یقین دلایا کہ ہماری زبان کی طرح غزل بھی کسی مقام کی جاگیر نہیں۔ اور اچھی غزل گوئی کا مطلب یہ ہے کہ یہ شخص ان روایات اور اس کلچر کا امین ہے جس کا سلسلہ امیر خسرو سے چلا ان روایات میں تذکرۂ شاہ خوباں بھی ہے اور ذکر نکلی بھی۔ یہ مضمون فیض پر ہے مگر تاثیر مرحوم کی یاد بھی تازہ کرتے چلیں ؎

خانقاہوں کی ترقی، مسجدوں کی رونقیں ؛ میرے گھر میں وہ عدوئے جان ایماں آ گیا
ہوش میں آ، سر اٹھا، تاثیرؔ آنکھیں کھول دے ؛ تیری آنکھوں کی قسم وہ شاہ خوباں آ گیا

داور حشر مرا نامۂ اعمال نہ دیکھ ؛ اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں

خنائے ناخن پا ہو کہ حلقۂ سر زلف ؛ چھپاؤ لاکھ یہ جادو نکل ہی آتے ہیں

حفیظ ہوشیار پوری کا تذکرہ بھی ناگزیر ہے ؎

تعمیر کیا تو نے اے عشق سے ورنہ ؛ کس کے لئے دوست پریشاں نہ ہوئے ہم

جب کبھی ہم نے کیا عشق پشیمان ہوئے   زندگی ہے تو ابھی اور پشیماں ہوں گے

حسرت کی غزل کی طرح حفیظ ہوشیار پوری کی غزل کا لہجہ ہماری عام زندگی کے لہجہ کی یاد دلاتا ہے۔ ہمارا وہ لہجہ جس میں ہم اپنے محبوب سے یا تنہائی میں اپنے آپ سے باتیں کرتے ہیں۔

ہاں صاحب تو ہمیں غزل کی رہ گزر پر ایک نئے راہی کا نقش قدم مل گیا ــــــــــــــ ہمارے لیے پہلا نقش قدم تھا۔

نہ جانے کس لیے امیدوار . . . .

نقش فریادی کی اشاعت ہمارے لیے ایک ادبی واقعہ تھی۔ آج ہوتا یہ ہے کہ کتاب کو ادبی انعام پہلے ملتا ہے اور کتاب بازار میں بعد میں دیکھی جاتی ہے۔ ہائے رے ہمارے ادب کے قافلے کی یہ شکستہ پائی۔ وہ قافلہ جو کبھی تلاش بہاراں میں نکلا تھا شاید ایک ایسے جنگل میں گم ہو گیا ہے، جسے ہم اپنے آپ کو دھوکا دینے کے لیے "دشت دعا" کہنے لگے ہیں۔ کبھی تو ہمارے ایک شاعر نے دشت امکان کو محض نقش پا قرار دے کر تمنا کے دوسرے قدم کا تقاضا کیا تھا اور وہ بھی کس سے، خالق کائنات سے اور آج ہم "دشت امکان" کے تصور سے بھی گھبرا کر کسی قلمی منظر یہ کے گانوں کو یا اس سے متعلق شاعری کو سب کچھ سمجھ بیٹھے ہیں۔

میں آپ سے یہ عرض کر رہا تھا کہ قیام پاکستان سے پہلے اچھی کتابوں کی اشاعت ادبی واقعہ بن جاتی تھی۔ کتاب کا نسخہ نہ ملتی تھی تو ہم لکھنؤ جا کر لاتے۔ دانش محل امین الدولہ پارک، لکھنؤ ہی ہمارا محبوب ٹھکانہ تھا۔ نسیم صاحب کل بھی ویسے ہی مسکراتے تھے جیسے آج مسکراتے ہیں۔ ان کے "استقبالیہ انداز" میں رتی بھر فرق بھی نہ آیا۔ مولانا آزاد کے خطوط کے مجموعہ "غبار خاطر" کی اشاعت سے پہلے ہی اس کی سینکڑوں کاپیاں اسی طرح محفوظ کرالی گئی تھیں جیسے آج کل سینما کی نشستیں محفوظ کرالی جاتی ہیں۔ نقش فریادی کی اشاعت ہمارے لیے ہی نہیں بلکہ ہمارے جدید ادب کے لیے ایک واقعہ تھی اور ایسے واقعات ان دنوں ہی ہوا کرتے تھے۔ کبھی "مادر" کے روپ میں کبھی "شکست" کی صورت میں یا کوئی ایسا ہی واقعہ "چوٹیں"، "ٹیڑھی لکیر"، "بجھتا شعلہ"، "لندن کی ایک رات"، "جزیرے"، "گریز" کہاں تک نام گناؤں۔

وقت آ مناسب گیا ہے۔ نقش فریادی کی اشاعت سے اب تک کی کتاب اشعار کے ذکر کی جگہ نقش فریادی کا تذکرہ مناسب ہوگا۔ مگر پہلے فیض کی غزلوں کے دو تین شعروں کی بات تو ہو لے۔

"نہ جانے کس لیے" . . . . . کے بعد فیض کے جو اشعار ہم نے بار بار پڑھے اور جن پر بار بار بحثیں ہوئیں۔ رباعیاں ہوئیں وہ یہ ہیں

ادائے حسن کی معصومیت کو کم کر دے   گناہگار نظر کو حجاب آتا ہے

اپنی نظریں بکھیر دے ساقی   مے باندازۂ خمار نہیں
اپنی تکمیل کر رہا ہوں میں   ورنہ تجھ سے تو مجھ کو پیار نہیں

فریب آرزو کی سہل انگاری نہیں جاتی   ہم اپنے دل کی دھڑکن کو تری آواز پا سمجھے

اک تری دید چھن گئی مجھ سے — ورنہ دنیا میں کیا نہیں باقی [1]

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا — تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

آخری شعر کے ما باقی سارے شعر نقش فریادی کے پہلے حصے سے متعلق ہیں۔ پہلا حصہ جو "دل کی دنیا" ہے اور دوسرے حصے کے آغاز میں شاعر نے یہ اعلان کرتے ہوئے ایک دنیا سے دوسری دنیا کی طرف ہجرت کی ہے کہ

"دلے بفروختم جانے خریدم"

—— ویسے یہ اعلان مجھے ہمیشہ مشکوک معلوم ہوا ہے کہ دل کی قیمت پر جان خریدی جا سکتی ہے؟ —— میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ

دل زندہ و بیدار اگر ہو تو بتدریج — بندے کو عطا کرتے ہیں چشم نگراں اور

اس سلسلے میں عزیز احمد نے "ترقی پسند ادب" میں کچھ لکھا ہے۔ یعنی فیض کے اس اعلان نامے کے متعلق۔ کتاب سامنے الماری میں رکھی ہے لیکن

وقت، فیض، میرے اور آپ کے درمیان کوئی دوسرا کیوں حائل ہو۔ میرے ساتھیوں کو یہ شعر بہت پسند تھا

اپنی تکمیل کر رہا ہوں میں

ورنہ تجھ سے تو مجھ کو پیار نہیں

مجھے یہ شعر اس زمانہ میں بھی ہمیشہ نوکین کا ملتا ہوا دانت "معلوم ہوا۔ آدمی کی تکمیل پیار سے ہوتی ہے مگر جب یہ احساس باقی ہو کر "ورنہ تجھ سے تو مجھ کو پیار نہیں" تو تکمیل ممکن ہی کیسے ہے۔ حنیف فوق مجھ سے متفق تھے۔ حسنین، عزری، اور غلام علی لڑتے تھے ان پر غالب کا اثر غالب تھا۔ وہ غالب جس نے عشق بھی کیا تو یوں سد

وفا کیسی، کہاں کا عشق، جب سر پھوڑنا ٹھہرا

تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

ہم دونوں کے خیال میں عشق کی تہذیب کے معلم میر اور حسرت تھے۔ وہ لوگ جو ابتدائے عشق میں آگ تھے اور خاک ہو کر اپنے آپ کو زندہ کر گئے۔ عشق کے شعلوں میں جلنا بھی تو "سامان وجود" ہے۔ فیض صاحب کے اس شعر کے سلسلے میں ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک خاتون کہنے لگیں "...... نے مجھے یہ شعر سنایا تو ایسا محسوس ہوا جیسے پتھر کے مجسمے پر کینچوا رینگ گیا ہو۔" اظہار مجھے اچھا معلوم ہوا —— میں نے اظہر سے یہ بات دہرائی۔ طاہر بڑے سکون سے بولا —— "مگر پتھر کے مجسمے کو احساس کیسے ہوا؟"

فیض اپنی شاعری کے اس عہد میں بھی عشق کو تکمیل ذات کا وسیلہ جانتے تھے۔ یہ بات میں مانتا ہوں، مگر آخر تھے کچھ پن کے ساتھ اس اظہار کو کیسے قبول کر لیتا۔ اب آئیے آخری شعر کی طرف سہ

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا

تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

بعض نقادوں سے آج بھی "فیض" کے اچھے اور منتخب اشعار میں شمار کرتے ہیں۔ یہ شعر نقش فریادی کے دوسرے حصے کی پہلی

---

[1] تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے — ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا (مومن)

غزل کا شعر ہے۔ گویا "ول کی فروخت" اور "جان کی خریداری" کا عملی ثبوت ہے۔ غم روزگار کا ایسا تذکرہ اس عہد کا فیشن تھا۔ اس کے بغیر آدمی ترقی پسند نہیں سمجھا جاتا تھا۔ یار لوگوں نے زندگی کو خانوں میں بانٹ رکھا تھا۔ یہ غم عشق ہے۔ یہ غم روزگار ہے۔ کبھی غم عشق کو غم جاناں بھی کہا اور غم روزگار کو غم دوراں ——— "غم دوراں" کی ترکیب نے جدید اردو شاعری کو اسی طرح بے آبرو کیا جس طرح "عظیم" کی اصطلاح نے جدید اردو تنقید کو۔ دیکھئے عظیم ادبی کارنامے اردو زبان و ادب کی تین چار صدیوں میں دکھائی دئے تھے ہمارے دور کے دس پندرہ سال کے "عظیم شہ پاروں" کی تعداد ان سے کچھ زیادہ ہی ہوگی۔

غم دنیا اور غم عشق کے سلسلے میں ہمارے شاعروں کا ایک رویہ تو یہ رہا ہے۔ خالص متغزلانہ رویہ ؎

آلام روزگار کو آساں بنا دیا　　　　جو غم ہوا اسے غم جاناں بنا دیا

(اصغر گونڈوی)

غم جہاں سے جسے ہو فراغ کی خواہش　　　　وہ ان کے درد محبت سے ساز باز کرے

(حسرت موہانی)

اور دوسرا ترقی پسند رویہ تھا کہ ؎

مجھے نفرت نہیں ہے عشقیہ اشعار سے لیکن
ابھی ان کو غلام آباد میں گا نہیں سکتا

فیض کا شعر کم و بیش اسی سطح کا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ فیض کے یہاں یہ کھردراپن نہیں۔ ان کا اسلوب بہتر ہے۔ میں جانتا ہوں کہ کبھی دمشق میں ایسا قحط پڑا تھا کہ "یاراں فراموش کردند عشق"۔ مگر صاحب یہ بات تو ماتم کرنے کی ہے اور سعدی نے ماتم ہی کیا تھا بھلا یہ بھی کوئی خوشی کی بات ہے کہ "تجھ سے بھی دل فریب ہیں غم روزگار کے"۔ ایک وہ بھی تھے مرزا اسداللہ خاں غالب جن کے نزدیک غم دوراں اور غم جاناں توام حقیقتیں تھیں۔ یا یوں کہئے کہ وہ ایسے منصف مزاج اور مرد آدمی تھے کہ دونوں بیویوں کو خوش رکھ سکتے تھے

گو میں رہا رہین ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

مجھے یہ بات اچھی طرح یاد ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے دوران یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ انگریز سپاہی راتوں کو اپنی خندقوں میں موم بتیوں کی دھیمی روشنی میں یا تو اپنی ماؤں، بیویوں اور محبوباؤں کو خط لکھتے ہیں یا شکسپیئر کا مطالعہ کرتے ہیں۔ موت کے سائے میں زندگی سے یہ پیار دراصل ایک سچائی ہے۔ اور زندگی اکائی ہے۔ وحدت ہے۔ ہندوستان پاکستان کی ریل گاڑی نہیں۔ جس میں زنانہ مردانہ ڈبے الگ ہوتے ہیں۔ یہ ہماری شاعری کی ریل گاڑی ہے۔ یہ غم دوراں کا ڈبہ ہے، یہ غم جاناں کا۔

فیض کے اس شعر پر میری یہ تنقید آج کی نہیں ہے۔ یہ اسی دور کے تاثرات ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ غالب کے علاوہ ایک اور ہم عصر آواز (یا "عصری آواز") ہماری رہنمائی کر رہی تھی۔ یہ فراق کی آواز تھی ؎

ایک عمر فراق یوں ہی بسر کی
کچھ غم جاناں، کچھ غم دوراں

"نقش فریادی" کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا تھا اور اسی زمانے کے لگ بھگ لکھنؤ اغلباً ۱۹۴۲ء میں مجاز کا مجموعہ

آہنگ بھی شائع ہوا تھا۔ ماورا اور فروزاں کی اشاعت کا زمانہ بھی یہی ہے۔ میں اس سے پہلے ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۵ء تک کے زمانہ کا ذکر کر چکا ہوں۔ وہ تین سال ہمارے لیے تشکیلی دور کا درجہ رکھتے ہیں۔ وقت بہت بیت چکا ہے مگر یقین یہی ہے کہ نقش فریادی جب تک ہمارے ہاتھ نہ لگا تھا۔ اس وقت تک صرف فیض کی غزل کے اشعار تک ہماری رسائی ہوئی تھی۔

نقش فریادی جب ہمارے ہاتھ لگی تو فیض کی نظمیں زندگی کا حصہ بنتی گئیں ۱۹۴۲ء سے قیام پاکستان تک مجاز، فیض، جذبی یہ تین آوازیں جدید شعری ادب میں بہت نمایاں تھیں۔ مخدوم کا ذکر ضرور ہوتا تھا مگر چند نظموں کی حد تک۔ ہمیں یہ اعتراف تھا کہ انقلاب کا صحیح تصور سب سے پہلے مخدوم نے پیش کیا ہے۔

گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

مگر ہم (کم از کم میں) یہ رائے رکھتے تھے کہ مخدوم کی شاعری میں کہیں ایک آدھ آنچ کی کسر ہے۔ تلی سردار جعفری کے شعری مجموعہ نے ہمیں چنداں متاثر نہیں کیا تھا۔ مگر نئی دنیا کو سلام (یہ ذرا بعد کی بات ہے) نے ان کے مرتبے کے از سر نو تعین پر مجبور کیا۔ جدید تر شاعروں میں اختر الایمان کا مجموعہ گرداب شائع ہو چکا تھا اور مجھے یاد ہے کہ ۱۹۴۵ء یا ۱۹۴۶ء میں ہم نے اس پر ایک پنچایتی مضمون لکھا تھا اختر الایمان کے یہاں ہمیں اس دور میں بھی فیض سے گہری اشاریت نظر آتی تھی (آدمی نام دہرانے پر آتے تو یہی کام مدتوں کر سکتا ہے علی جواد زیدی۔ سلام مچھلی شہری وغیرہ۔ مگر میرا موضوع تو فیض ہے، شاید حال، ماضی کی حدود میں داخل ہونے لگا ہے۔ میں پھر ماضی کی طرف لوٹتا ہوں۔ حال اور ماضی کی یہ کشمکش ناگزیر ہے۔ وقت کون تقسیم کر سکتا ہے۔

فیض نے نقش فریادی کے دیباچہ میں لکھا تھا۔

"اس مجموعے کی اشاعت ایک طرح کا اعتراف شکست ہے۔ شاید اس میں دو چار نظمیں قابل برداشت ہوں لیکن نظموں کو کتابی صورت میں طبع کروانا ممکن نہیں۔ اصولاً مجھے جب تک انتظار کرنا چاہئے تھا کہ ایسی نظمیں کافی تعداد میں جمع ہو جائیں"

یہ سطریں آج مجھے سچ معلوم ہو رہی ہیں، مگر اس وقت ہم دیباچہ کیوں پڑھتے۔ حسرت نے اپنی غزلوں میں ایک نئی عاشقانہ واقعیت کو جنم دیا۔ جوش اور اختر شیرانی نے عشقیہ تجربوں کو نظموں کا پیکر عطا کر کے شعریت و حقیقت کو تسلسل کے ساتھ یکجا کر دیا۔ ایک طرف فضا میں جگر کی آواز گونج رہی تھی اور دوسری طرف ہم لوگ فیض، جذبی اور مجاز کے ساتھ ساتھ اختر شیرانی کو بھی پڑھتے تھے۔ ان دنوں احسان دانش کی ایک نظم بھی ہمیں بہت پسند تھی۔ سہ

بیتے ہوئے کچھ دن ایسے ہیں تنہائی جنہیں دہراتی ہے

اور اس نظم کو ہم حسرت کی اس غزل کے پہلو میں جگہ دیتے

ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے

اختر شیرانی کی سلمیٰ سے متعلق نظمیں اور مجنوں گورکھپوری کا افسانہ "نقش ناہید" پڑھ کر میں اپنے تخیل میں کسی حسینہ کا مجسمہ بنانے لگتا مجھے یہ کہتے ہوئے حجاب نہیں کہ مجاز کے الفاظ میں (شاید قدرے تغیر کے ساتھ) ؎

لطف ہے آرزو تھی کسی دل میں ہم بھی ہوں

نقش فریادی کی نظمیں "سرود شبانہ" "آخری خط" "حسینۂ خیال سے" "انتہائے کار" یہ سب نظمیں وہ محرکات ہیں جنہوں نے ہمیں عنفوان شباب کی منزلوں تک پہنچا دیا۔ ان نظموں کے ساتھ آہنگ اور فروزاں کی نظموں اور ساحر انصاری

کے قطعات کو بھی شامل کر لیجیے۔

میری آپا جان (آپا جان میری حقیقی بہن نہیں، لیکن وہ میری خوردیوں کا آسمانی جواب ہیں۔ میں اپنے بھائی بہنوں میں سب سے بڑا ہوں جسکیں ہمارے قریب رہتے تھے۔ آپا جان ان کی بڑی بہن ہیں۔ وہ ہم دونوں کی آپا جان ہیں، برابر کی آپا جان۔ نہ کم نہ زیادہ) ۱۹۴۶ء میں امی کے انتقال کے بعد آپا جان میرے لیے کچھ اور ضروری ہو گئی تھیں، ان کی شادی ہو چکی تھی۔ غالباً ۱۹۴۳ء میں وہ میرٹھ سے کانپور آ گئیں۔ ادیب کے امتحان کی تیاری کے لیے۔ میں نویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ عمو جان (حضرت ثاقب کانپوری مدظلہ) کے پاس سلسلے کے کچھ طالب علم کبھی کبھار اردو پڑھنے آ جاتے تھے۔ اگر عمو جان گھر پر نہ ہوتے تو انہیں میں ہی پڑھاتا تھا۔ یہ عمو جان اور میرے استاد مولوی محمد سعید خاں رزمی کا فیض تھا۔ رزمی صاحب جنہوں نے مجھے فارسی اس لگن سے پڑھائی تھی کہ نو دس سال کی عمر میں میں بے تکان فارسی میں تقریر کر سکتا تھا۔ ہاں تو آپا جان کو میں ادیب کا نصاب پڑھانے لگا۔ دیوان غالب اور بانگ درا کی فضاؤں سے نکل کر ہم نقش فریادی اور زنداں کی دنیا میں پہنچ جاتے (آہنگ اور رحجانات سے ذہنی رشتہ اور ذاتی ملاقات ۱۹۶۱ء سے شروع ہوئی تھی)

۱۹۵۲ء میں میں نے ایک ناول لکھنی شروع کی تھی جس کے تین باب اب بھی میرے پاس رکھے ہیں۔ اس کا پہلا باب کسی اور نام سے ایک رسالہ میں شائع ہوا تھا۔ اس کا ایک اقتباس پیش کرتا ہوں۔

"پھر آپا جان ادیب کا امتحان دینے آ گئیں۔ وہ انہیں سنجیدگی سے پڑھانے لگا۔ لیکن وہ قہقہے لگاتیں اور اس کی سنجیدگی کا مذاق اڑاتیں ——— آپا جان کس قدر ذہین تھیں۔ اردو شاعری یا اردو تنقید پر وہ جو اعتراض کرتی تھیں ان سے وہ پریشان ہو جاتا تھا۔ وہ کہتیں ہمارے یہ نقاد بھی ہر شاعر کے بارے میں ایک ہی سی باتیں کہتے ہیں کہ کلام میں سوز و گداز ہے۔ بندشیں چست ہیں ادب میں بڑا اونچا مقام ہے۔ اور وہ ان باتوں کے جواب میں خاموش ہو کر دل ہی دل میں اردو کے نقادوں کو گالیاں دینے لگتا..... آج تو آپا جان اسے بری طرح یاد آنے لگیں۔ ہر چیز ذہن کی سطح پر ابھر آئی ——— اسے فیض بہت پسند تھا اور آپا جان کو جذبی۔ آپا جان بیٹھے بیٹھے گنگنا اٹھتیں۔

وہ جو خود دار ہیں خود دار ہیں اے غم دل   ان سے کہہ دو کہ انہیں یوں تو نہ چاہے گا کوئی ——— یا

اے موج بلا ان کو بھی ذرا دو چار تھپیڑے ہلکے سے   کچھ لوگ ابھی تک ساحل سے طوفاں کا تماشا کرتے ہیں

اس نے آپا جان کو نقش فریادی لا کر دی ——— فیض کی نظمیں ——— "مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ" "رقیب سے" اور "سرود شبانہ" سنائیں، لیکن نہ جانے کیوں فیض، جذبی کی جگہ نہ لے سکا اور آخر اس نے جل کر آپا جان کی کتابوں میں سے "سرود زنداں" غائب کر دی۔ جب فروزاں نہ ملی تو آپا جان کس قدر افسردہ تھیں۔ ——— یہ سوچ کر اسے مزا آنے لگا۔"

ظاہر ہے کہ اس ناتمام ناول کا "وہ" "میں" ہوں۔ اور آج ناتمام ناول کے تینوں باب جو مجھے ۱۹۵۲ء میں شاہکار معلوم ہوتے تھے۔ ویسے ہی معلوم ہو رہے ہیں۔ جیسے فیض کو نقش فریادی کی ابتدائی نظمیں معلوم ہوتی ہوں گی۔ فیض تو خیر ان نظموں کے خالق ہیں اور ہر تخلیق وجود میں آ جانے کے بعد خالق کی نظر سے گر جاتی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ اس دور میں "آخری خط" اور "انتظار" جیسی نظمیں مجھے بھی تر سا بہار ادبی تخلیقات معلوم ہوتی تھیں۔ وقت بھی کیا چیز ہے۔ کیسے کیسے نقوش بناتا اور مٹاتا ہے۔

ہم جنس پرستانہ رجحانات ثانوی اسکول کے آخری درجوں میں ۔ ہوتے ہیں (زمانے کے خیال کے مطابق زندگی کے کسی دور میں ابھر سکتے ہیں) بعض انہیں عمل بنا لیتے ہیں، بعض کی شخصیت کی تشکیل میں یہ رجحانات ذہنی طور پر اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ اور یہ سطریں لکھتے ہوئے مجھے اپنے دو دوست یاد آ رہے ہیں یہ دور وہ تھا کہ اگر ان میں سے کسی سے لڑائی ہو جاتی تو میں اسے بڑا جذباتی سا خط لکھتا اور ان میں سے بیشتر خط فیض کی نظم "خدا وہ وقت نہ لائے"۔۔۔۔ کے ان مصرعوں پر ختم ہوتے کہ

خدا وہ وقت نہ لائے کہ تجھ کو یاد آئے　　　وہ دل کہ تیرے لئے بے قرار اب بھی ہے
وہ آنکھ جس کو ترا انتظار اب بھی ہے

اس دور کا (۱۹۴۳ سے ۱۹۴۵) خاصا تذکرہ ہو چکا ہے۔ آئیے اب ذرا آگے بڑھیں ۱۹۴۵ میں غالباً نقش فریادی کا تیسرا ایڈیشن شائع ہو چکا تھا۔ اس سے اس مجموعے کی مقبولیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہ مقبولیت فیض کے بعد غالباً صرف مجاز اور ساحر لدھیانوی کے حصے میں آئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ "نقش فریادی" "آہنگ" "تلخیاں" کے ایڈیشن اس طرح شائع ہوتے رہیں گے۔ وجہ ظاہر ہے کہ ہماری طرح کتنے ہی اور لوگ یوں لڑکپن سے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھیں گے اور اگر انہیں ادبی ذوق ہوگا تو وہ اختر شیرانی، فیض، مجاز اور ساحر کو اسی طرح پڑھیں گے جس طرح ہم نے پڑھا تھا ـــــ لیکن ہماری نشو و نما میں جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں دیوان غالب سے کر بانگ درا تک کا حصہ تھا اسی لئے ہم اس عہد میں بھی فیض کی شاعری کا "ریہا" نہیں سمجھتے یہ شاعر ہماری نوجوانی کے جذبات تھے یا یوں کہئے کہ ان جذبات کے ترجمان تھے۔

۱۹۴۵ سے ۱۹۴۷ تک اس عہد میں بھی نقش فریادی کا مطالعہ ------- جاری رہا۔ مگر شاید ہم لوگ پندرہ سولہ سال کی عمر میں جذباتی اور ذہنی طور پر زیادہ پختہ ہو چکے تھے۔ ہم کلام غالب میں اس "ریہا" کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہے تھے جو غنچے کے پردے میں پہنچ کر رشک شبنم بن جاتی ہے۔ یہیں یہ احساس ہو چلا تھا کہ "نقش فریادی" کی اشاعت قبل از وقت ہوئی ہے اس کے ساتھ ساتھ یہ اعتماد بھی تھا کہ اس مجموعے کی بعض نظمیں اور اشعار ہمارے شعری ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ یہی بات فروزاں اور آہنگ کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ آج میں سمجھتا ہوں کہ ان مجموعوں کی اشاعت ضروری تھی (قبل از وقت نہ تھی) کیونکہ ان کے بغیر ہم ان شاعروں کے ذہنی ارتقاء کے بارے میں بات بھی نہیں کر سکتے تھے یہ شاعر خواجہ میر درد اور اصغر گونڈوی کی طرح ایک سطح پر نظر آتے۔

(۲)

اب تک میں نے جو کچھ لکھا ہے اس ضمن میں نقش فریادی کے "دیباچۂ طبع اول کی چند سطریں پڑھتی ہیں (جو نقل کر چکا ہوں) یا اپنے ادھورے ناول کو تلاش کر کے ایک اقتباس نقل کرنے کا گناہ گار ہوا ہوں۔ دل چاہتا ہے کہ ذرا نقش فریادی کا جائزہ آج لوں اور اس کی قدر و قیمت کے تعین کی کوشش کروں۔ مگر یہ کام تو "افکار" کے "فیض نمبر" کے دوسرے نقاد کریں گے اور یقیناً مجھ سے بہتر طور پر۔ لیکن میں وقت کے عنصر کو سامنے رکھتے ہوئے نقش فریادی کے بارے میں کچھ اور باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔

عمر کے تقاضوں سے قطع نظر نقش فریادی کا فیض مجھے اس لئے پسند تھا کہ اس نے دہشت ناک طور پر ہماری ادبی روایات اور رموز و علائم سے بھاگنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ جیسے میراجی نے راشد کی بغاوت پر روایت کا سایہ بہت گہرا ہے، پھر فیض کے اسلوب میں ایک تازگی، نیا پن اور انفرادیت تھی۔ فیض کے اسلوب نے عہد حاضر کے شاعروں کو جس حد تک متاثر کیا ہے اس

کی سب سے نمایاں مثال ساحر لدھیانوی کی شاعری ہے۔ فیض کے یہاں ایک طرف اردو شاعری کی روایات تھیں اور دوسری طرف وہ انگریزی شاعری کی امیجری کو خلاقانہ طور پر اردو میں منتقل کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اس اعتبار سے ان کی نظم "سرود شبانہ" مجھے بہت اچھی معلوم ہوتی تھی اور بالخصوص یہ دو مصرعے

سو رہی ہے گھنے درختوں پر
چاندنی کی تھکی ہوئی آواز

یہ امیجری، اسلوب اور پھر "صفت معکوس" فیض کی شاعری کی بنیادی صفت معلوم ہوتی تھی۔ صفت معکوس
اپنے "بے خواب کواڑوں" کو مقفل کر لو

لیکن ہم لوگ اور خاص طور پر فوق اسے اردو شاعری میں ایک بالکل نئے عنصر کا درجہ دینے کے لئے تیار نہ تھے۔ "چاندنی کی تھکی ہوئی آواز" کے جواب میں فوق، اختر شیرانی کی جوگن کا یہ مصرع نے آتے ؎

سوئی ہوئی فضا کا شانہ ہلا رہی ہے

جوگن تھیں، جوگن کی آواز۔ فیض اپنے ہمعصروں کے ذکر سے بچتے رہے ہیں۔ وہ یاد حریفاں کہن کے قائل نہیں، مگر یہ بات قابل غور کہ راشد اور فیض دونوں اختر شیرانی کے دامن کشاں نہ گذر سکے بہرحال یہ ایک ادبی اور تاریخی صداقت ہے کہ نقش فریادی نے ہماری جدید شاعری کے لہجہ۔ اور اسالیب بیان کو متاثر کیا ہے۔

مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ "نقش فریادی" کا نسخہ سب سے پہلے میں نے ہی مولانا حسرت موہانی کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ مولانا نے کہا "تم اپنی پسند کا کوئی شعر سناؤ۔" میں نے فیض کی کسی غزل کا شعر سنانے کی جگہ "موضوع سخن" کا یہ شعر انہیں سنایا

ان کا آنچل ہے کہ رخسار کہ پیراہن ہے
کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے چلمن رنگیں

مولانا یہ شعر سنکر بیقرار ہوگئے۔ وہ اچھے سے اچھے شعر پر اگر گردن ہلا کر اور "ہوں" کہہ کر اظہار پسندیدگی کرتے تھے ایسا کم ہی ہوتا کہ وہ کسی شعر کو دہراتے۔ انہوں نے فیض کے اس شعر کو دہرایا۔ کہنے لگے۔

"خوب ہے، اچھا ہے۔ بہت اچھا ہے"

میں نے کہا اور مولانا مجھ کو احساس تو آپ کی شاعری میں زیادہ مکمل اور حسین تر ہے۔ آپ کا یہ شعر فیض کے شعر سے بہتر ہے

اللہ رے جسم یار کی خوبی کہ خود بخود
رنگینیوں میں ڈوب گیا پیراہن تمام

مولانا نے جواب دیا۔ "نہیں فیض کا شعر بہتر ہے۔ میرے یہاں تصویر ساکت ہے۔ فیض کی تصویر متحرک ہے۔ کسی متحرک تصویر کو لفظوں کی گرفت میں لانا مشکل ترکام ہے۔" یہ واقعہ میں "حسرت کی تنقید" میں "ملفوظات حسرت" کے سلسلے میں لکھ چکا ہوں (یہ کتاب میرا درم...... کے پاس بارہ برس سے پڑی ہوئی ہے۔ اب انہوں نے کتابت شدہ اجزا مجھے دیئے ہیں، مگر میں سوچتا ہوں بن باس کے چودہ سال پورے ہو جائیں)۔ حسرت اپنے عہد کے سب سے بڑے غزل گو ہی نہیں تھے بلکہ ایسے صاحب نظر بھی تھے کہ مجنوں گورکھپوری کے خیال کے مطابق اگر حسرت شاعر بھی نہ ہوتے تو محض اپنے "انتخاب سخن" کی بنا پر ہمارے

ادب میں ایک بلند جگہ کے مستحق ہوتے   ویسے بھی کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ فیض کے اس شعر میں ہماری حیات معاشقہ کی صدیاں بولتی ہیں

نقش فریادی کے پہلے حصے کے بارے میں میں اس عہد کے اور آج کے ملے جلے تاثرات بیان کر چکا۔ اس حصہ کی نظمیں ثانوی مدارس کی آخری جماعتوں اور کالجوں کے طلباء و طالبات کو ہمیشہ پسند آئیں گی (اگر ہمارے طلبا کا اپنے ادب سے رشتہ قائم رہا۔ ویسے مستقبل کی نسل تو ٹوئسٹ رقص اور مغربی موسیقی کی فضا میں جوان ہو رہی ہے) لیکن اس حصے میں ایسی چیزیں بھی ہیں جنھیں فیض بلکہ جدید شاعری کے ہر انتخاب میں جگہ دینی ہوگی۔ فیض کی شاعری میں تشبیہات کی تعداد کچھ ایسی زیادہ نہیں لیکن جن اشعار سے نقش فریادی کا آغاز ہوتا ہے (میں ان دونوں اشعار کو قطعہ کیوں نہ کہوں؟) وہ جدید اردو شاعری میں تشبیہ کی بہترین مثالوں میں شامل کئے جا سکتے ہیں ؎

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی ..... الخ

علم بیان اور صنائع و بدائع پر ایک چھوٹی سی کتاب[1] ہم نے ۱۹۵۹ء میں لکھی تھی، اس میں تشبیہ کے باب میں جدید شاعری میں سے تین مثالیں منتخب کی تھیں ایک تو فیض کا یہ قطعہ، دوسری مجاز کی نظم آوارہ کا چاند سے متعلق بند اور تیسری مثال راشد کے یہ دو مصرعے ؎

آرزوئیں ترے سینے کی کہستانوں میں
ظلم سہتے ہوئے حبشی کی طرح رینگتی ہیں

پہلے حصہ میں ایسے ہی دو دو اشعار اچھے ہیں مثلاً ؎

میں دل فگار نہیں تو ستم شعار نہیں — بہت دنوں سے مجھے تیرا انتظار نہیں
ترا ہی عکس ہے ان اجنبی بہاروں میں — جو تیرے لب، ترے بازو، ترا کنار نہیں

جہاں تک نظموں کا تعلق ہے "نقش فریادی" کے پہلے حصہ کی نظمیں اب فنی اور جذباتی اعتبار سے اپنی نوجوانی کی حماقتوں اور ادھ کچرے جذبات کی طرح نظر آتی ہیں، جن پر ہم ہنستے بھی ہیں اور جو ہمیں عزیز بھی ہیں۔ اگر میں فیض کی شاعری کا کوئی انتخاب کروں تو اس حصے سے آج صرف دو نظمیں منتخب کروں گا۔ ایمانداری کے ساتھ "سرود شبانہ" اور "میرے ندیم" یا پھر اخلاقاً "حسن مجسم" بھی۔

نقش فریادی کا دوسرا حصہ فیض کی بہت مشہور نظم

"مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ"

سے شروع ہوتا ہے۔ اگر نقش فریادی کے پہلے حصے کو ہم ایک قصیدے کی تشبیب قرار دیں تو یہ نظم گریز کا درجہ رکھتی ہے۔ ہم سب ساتھی اس نظم کو نئی شاعری کا موڑ قرار دیتے تھے لیکن آج میں زیادہ سے زیادہ اسے فیض کی شاعری کا نیا موڑ کہہ سکتا ہوں بالکل اسی طرح جس طرح "پہلی کرن" راشد کی شاعری میں ایک نئے موڑ کا درجہ رکھتی ہے۔ لیکن راشد نے نئی منزل میں زیادہ پختگی کے ساتھ قدم رکھا تھا۔ فیض کے لہجے میں جو معذرت ہے وہ بڑی کربناک ہے اور ذہنی ناپختگی کی علامت بھی۔ غم عشق اور غم دوراں کے درمیان تضاد کی فرضی دیوار کو فیض اس نظم میں بھی نہیں توڑ سکے۔ وہ محبوب سے یہ تو کہتے ہیں کہ مجھ سے پہلی سی محبت نہ مانگ"۔ یہ نہیں کہتے کہ آ اور میرے ساتھ مل کر ان نازیبا مناظر کو دور کرنے کی جدوجہد کر جن کی طرف نظر لوٹ جاتی ہے۔ راشد تک کے یہاں عورت کا تصور پہلی کرن سے بے حد محدود تھا۔ جو محض بستر کی ساتھی

---

[1] رہنمائے ادب حصہ اول۔ فیڈرل بک ڈپو کراچی

تھی دلبر کی قید بھی نہ تھی ۔ زمستان کی سرد رات میں کنج باغ ہی سہی ان کی اس نظم میں عورت ایک رفیق کی طرح سامنے آتی ہے ۔ ایک رفیق کی طرح جسے زندگی کو بدلنے کی تمناؤں نے شاعر سے وابستہ تر کر دیا تھا ؎

کہاں ہیں وہ دنیا کی تزئین کی آرزوئیں
جنھوں نے تجھے مجھ سے وابستہ تر کر دیا تھا

میں نے ذہنی ناپختگی کہا ہے ۔ فنی طور پر نقش فریادی کے دوسرے حصے کے آغاز ہی سے الفاظ پر فیض کی گرفت مضبوط ہو گئی ہے ۔ ہم تذکروں کی تنقید کو رسمی کہتے ہیں ۔ "اونہہ ۔ یہ تذکرہ نگار ۔ لفظوں ، ترکیبوں اور بندشوں کی باتیں کرتے ہیں ۔ اور تذکروں پر ایسے اعتراض کرتے ہوئے ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ الفاظ تو معنی کی ملفوظی تصویریں ہیں ۔ لفظ ثقافت کی تاریخ بیان کرتے ہیں بلکہ ثقافت کی روح بن کر ماضی کی امانتوں ، جذبوں اور رشتوں کو حال اور مستقبل کے حوالے کرتے ہیں ۔ اردو کے دو تین ہی لفظ لیجیے " صاحب " "میاں " ۔ "قاتل " الفاظ تو ابلاغ کی ایک متحرک اور پر تخیل صورت ہیں ؎

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

وہ بھی خوب دن تھے جب لوگ کہتے تھے " سبحان اللہ ! کیا زبان کا شعر ہے " گویا زبان ذریعۂ ابلاغ نہ ہوئی فضا میں تنا ہوا رسہ ہو گئی اور شاعر نٹ ، جو اس رسے پر چل رہا ہے ۔ نقش فریادی کے دوسرے حصے میں فیض کے یہاں زبان کی نمود کا کوئی شوق نہیں ہے یہ شوق شاید انھیں کبھی نہیں رہا ، لیکن اس حصہ میں معانی و اظہار کا رشتہ قوی تر ہو گیا ہے ۔

اجتماعی احساسات نقش فریادی کے دوسرے حصہ میں بہت نمایاں ہیں اور اسی کو فیض نے غلطی سے " جانے حزیدم " کہہ کر اپنے ساتھ ساتھ نظامی کے ساتھ بھی زیادتی کی ہے ۔ آدمی بھی زندگی کی طرح ایک اکائی ہے ۔ یہاں جان و دل کی تفریق ممکن نہیں بڑی عشقیہ شاعری میں بھی تو اجتماعی احساسات ہوتے ہیں ۔ اگر نہ ہوں تو ہمیں دوسرے کی جوماجائی ، شب وصل ، کنج تنہائی ، گوشۂ چمن ، وغیرہ وغیرہ سے دلچسپی کیوں ہو ؟ " سوچ " میں انتہائی سادگی کے باوجود " جان " ملتا ہے ۔ وہ جان جو معاشرے سے ہم آہنگ ہو کر نصیب ہوتی ہے ۔ جب قطرہ دریا بنجاتا ہے ، جب " میں " " ہم " بنجاتا ہے جب آدمی یہ کہہ اٹھتا ہے ؎

کیوں نہ جہاں کا غم اپنا لیں ؟ "

" سوچ " کے بعد ہی وہ غزل ہے جس نے ہمیں اردو غزل کی راہ گزر پر آئینۂ راہی کی نوید سنائی تھی ۔ میرے ماضی کے پس منظر میں یہ بات صرف غالب کی کی تھی ۔ مگر یہ غزل پڑھیے ۔ یہاں ان کے لہجہ اور انداز و اسلوب پر فراق گورکھپوری کا اثر نظر نہیں آتا ؎

وفائے وعدہ نہیں وعدہ دگر بھی نہیں
وہ مجھ سے روٹھے تو تھے لیکن اس قدر بھی نہیں

متضاد کیفیات کا اجتماع فراق کی ادائے خاص ہے ۔ ویسے حسرت بھی ذہن کی اس سطح تک فراق سے پہلے پہنچ گئے تھے مگر فیض ؎

نہیں آتی جو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

کی اس غزل کے سلسلے میں اس وقت میں فراق کی، اس غزل کی جانب آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں ؎

سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں　　　لیکن اس ترکِ محبت کا بھروسا بھی نہیں
مدتیں گزریں تری یاد بھی آئی نہ ہمیں　　　ہم تجھے بھول گئے ہوں مگر ایسا بھی نہیں

رہ گزر میرے لئے غزل بھی ہے اور زندگی بھی ۔ فراق کا شعر ہے ؎

یہ موڑ وہ ہے کہ پرچھائیاں بھی دیں گی نہ ساتھ　　　مسافروں سے کہو اس کی رہ گزر آئی

رہ گزر زندگی بھی ہے اور غزل بھی یہ رہ گزر کبھی خالی نہ ہوگی آبلہ پا اس راہ سے گزرتے ہی رہیں گے۔

جہاں تک مجھے علم ہے فیض نے اپنے کسی مضمون میں اپنی شاعری پر اپنے ہمعصروں کے اثرات کا تذکرہ نہیں کیا۔ ویسے فراق صاحب شاید پہلے نقاد تھے۔ جنہوں نے نہایت تفصیل کے ساتھ فیض کی نظم "رقیب سے" پر "اردو کی عشقیہ شاعری" میں تبصرہ کیا تھا۔ فراق نے جس کھلے دل اور خلاقانہ انداز میں فیض کی اس نظم کو سراہا ہے۔ اس لہجہ میں آج لوگ اپنے معاصرین کا تذکرہ نہیں کرتے۔

اردو شاعری میں رقیب کا ایک خاص تصور پیدا ہو چکا تھا۔ "رقیب روسیاہ"۔ رقیب کے حصے میں جتنی گالیاں آئی ہیں شاید اتنی گالیاں معشوق نے بھی عاشق کو (ہماری شاعری میں) نہیں دیں۔ "رقیب سے" ایک اہم نظم ہے۔ فکر انگیز۔ ایک تصور کو تفصیلات عطا کرنے والی نظم۔ میں اس تصور کو نیا نہیں کہوں گا۔ جس طرح اقبال کے تصورِ عشق کی اوجِ نمود ہمیں نہایت قوت اور ذہنی توانائی کے ساتھ میر کے یہاں ملتی ہے اور اقبال نے عظمتِ آدم کے جس فلسفے کو نقطۂ کمال تک پہنچایا اس کے ابتدائی نقوش میر و غالب (اور بعض دوسرے شاعر (ان میں ذوق اور داغ جیسے شاعر بھی شامل ہیں) کے یہاں نظر آتے ہیں اسی طرح رقیب کا یہ انسانی تصور اور رقیب کے ساتھ تعلقات کی یہ نوعیت بھی ہماری شاعری کے لئے کوئی انوکھی چیز نہیں ہے۔ مومن اس راہ میں فیض کے پیشرو ہیں ؎

غیر کے ہمراہ وہ آتا ہے میں حیران ہوں　　　کس کے استقبال کو جی تن سے میرا جائے ہے[1]
خاک میں ملیے یارب بے کسی کی آبرو　　　غیر میری نعش کے ہمراہ روتا جائے ہے

ایک اور شعر سنئے ؎

سامنے اس کے نہ کہتے، مگر اب کہتے ہیں
لذتِ عشق گئی غیر کے مر جانے سے

یارانِ معتبر کا کہنا ہے کہ یہ شعر بھی مومن کا ہے۔ مجھے یہ شعر کوشش کے باوجود "کلیات مومن" میں نہیں مل سکا، مگر ہے یقیناً کسی بڑے شاعر کا۔ یہ شعر مومن کا ہو یا کسی اور کا اتنی بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ رقیب کا انسانی تصور اردو شاعری کے لئے فیض کی دین نہیں

---

[1] کلیات مومن۔ مطبوعہ نول کشور ۱۹۲۳ء - بہت سے نسخوں میں دوسرا مصرع یوں ہے ؎
کس کے استقبال کو جی تن سے نکلا جائے ہے
کلیات مومن مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی میں پہلے مصرعے میں "آتا" کی جگہ "ہوتا ہے"۔ جو درست نہیں۔

قدیم شاعرانہ مرحلوں سے گزر چکے ہیں، ویسے غزل اور نظم کے کینوس میں فرق ہے۔ فیض نے لذتِ عشق کی تشریح کی ہے اور یوں کی ہے کہ کسی اور نئے شاعر سے بن نہ پڑی۔ عشق اس کے اور رقیب کے درمیان مشترک تجربہ ہے۔ ایسا تجربہ ہے کہ ؎

ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے کیا پایا ہے　　　جز ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں

عاجزی، غریبوں کی حمایت، یاس و حرماں اور دکھ درد کے معنی ۔۔۔ مگر ۔۔۔ کیا اس مصرع میں بھی ایک دنیا آباد نہیں ؎

لذتِ عشق گئی غیر کے مر جانے سے

"رقیب سے" کو میں اردو شاعری کے ہر انتخاب میں جگہ پانے کا مستحق سمجھتا ہوں، لیکن آج نقش فریادی پر نظر ڈالتے ہوئے اس نظم کا آخری حصہ مجھے ان مل بے جوڑ ۔ سستا اور اس عہد کے فیشن کے مطابق نظر آتا ہے (اتنی بات اور سن لیجئے کہ کلیاتِ مومن کی ورق گردانی کرتے ہوئے غیر یا رقیب سے متعلق جتنے اشعار میری نظر سے گزرے ان میں سے بیشتر میں انسانیت ہے اور روایتی تضحیک و تذلیل نہیں ۔)

ابھی کچھ دیر پہلے میں نظم اور غزل کے کینوس کی بات کر رہا تھا۔ فیض نے نظم کے کینوس پر سلیقے سے ذہن و دل کی تصویریں بنائی ہیں مثلاً "تنہائی"[1] تنہائی نو مصرعوں کی چھوٹی سی نظم ہے اور اردو کی مختصر نظموں میں خیال کے ارتقا، اظہارِ بیان کے ارتکاز جذبے کی شدت اور فنی پختگی کی ایک نہایت اعلیٰ اور نادر مثال ہے، اس نظم پر راشد نے "نقش فریادی" کے "مقدمہ" میں جو کچھ لکھا تھا اس پر ہم نے اس دور میں "بارہا" بحث کی تھی۔

"مجھے بارہا خیال آیا ہے کہ شاید یہ نظم بھی کسی سیاست میں الجھے ہوئے لمحے کی پیداوار ہو۔ کیا راہرو سے مراد کوئی نیا حملہ آور ہے؟ کیا تاروں کا ڈھلنا ہوا غبار اور ایوانوں میں لڑکھڑاتے ہوئے چراغ ہماری تہذیب اور مذہب کے بکھرے ہوئے شیرازے کی طرف اشارا کرتے ہیں۔ لیکن شاید اس حسین اور انتہا درجے کی اثر آفریں نظم پر یہ الزام لگانا اسے مجروح کرنا ہوگا اس نظم کی کامیابی تو اس کی مجرد تاثیر ہی میں مضمر ہے ــــــ جس ذکی الحس شخص کو اپنی زندگی میں کبھی کوئی اداس اور غمناک شام بسر کرنے کا تجربہ ہوا ہو، اگر اسے اس نظم کے مطالعہ سے تنہائی کا بوجھ ایک سنگِ گراں کے مانند اپنے کندھوں، اپنے جسم بلکہ اپنے سارے وجود پر محسوس ہونے لگے تو یہ نظم یقیناً ایک بہت بڑی تخلیق ہے۔"

وہ دور سیاسی ہنگاموں کا دور تھا مگر جو "خیال" "بارہا" راشد کو آیا ہم نے اسے کبھی قبول نہیں کیا، اس خیال کو تو انہوں نے خود بھی قبول نہیں کیا۔ اپنے خیال کو "الزام لگانے" سے تعبیر کرنا پڑی۔ جرأت کی بات ہے۔ ویسے غم ناک شام کی جگہ اگر وہ "رات" یا شام سے صبح تک لکھ دیتے تو مناسب تھا۔

انہیں دنوں (۱۹۴۴ء یا ۱۹۴۵ء) میں ایک کل ہند اردو مباحثہ کرائسٹ چرچ کالج کانپور میں ہوا تھا۔ اختر الایمان مسلم یونیورسٹی سے مقرر کی حیثیت سے آئے تھے اور پہلی بار میں نے اس شاعر کو دیکھا تھا جو شاعری میں ایک نئی آواز کی حیثیت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ اختر الایمان کے علاوہ اس زمانے میں ہم لوگ عزیز حامد مدنی اور ضیا جالندھری کی طرف بھی سنجیدگی سے متوجہ ہو گئے تھے، مباحثہ غزل اور نظم کے موضوع سے متعلق تھا۔ میں حلیم مسلم کالج کی نمائندگی کر رہا تھا۔ ان دنوں "تنہائی"

---

[1] انگریزی کے ایک استاد کا کہنا ہے کہ اس نظم کا بنیادی خیال انگریزی سے ماخوذ ہے اگر یہ درست بھی ہو تو بھی اس نظم کا فنی درجہ پست نہیں ہوگا

فضا میں گونج رہی تھی۔ مجھے غزل کے حق میں تقریر کرنی تھی (میرے نزدیک یہ مروجہ مباحثے "ذہنی طوائفیت" کی ایک مثال ہیں ہم ادارے کا ایک آدمی موافقت میں بولے گا ایک مخالفت میں۔ یہی رسم ہے) میں نے فیض کی یہ نظم پڑھنے کے بعد اس کی تعریف بھی کی تھی اور غالباً اس نظم کے بارے میں، میں نے اپنے خیالات کا اظہار کچھ اس طرح کیا تھا۔

"تنہائی میں الفاظ رینگ رینگ کر چلتے سہمے سہمے محسوس ہوتے ہیں۔ لمحات جو سنگین ہیں۔ جو تبلائے نہیں بنتے۔ یہ رات جیسے تسخیر کرنے کے لیے "دل وجگر کو تیشۂ فرہاد بنانا پڑتا ہے۔ فیض اس تاثر کے اظہار میں پوری طرح کامیاب ہیں۔ مگر صدر محترم ایک اسی تاثر کو فانی نے اپنے شعر میں زیادہ ارتکاز، قوت اور شدت کے ساتھ بیان کر دیا ہے ؎

صبح تک فانی ہر آوازِ شکستِ دل کے ساتھ
کیا قیامت تھا وہ میرا جانب در دیکھنا

اور فانی کے شعر میں آوازِ شکستِ دل کا جو اشارہ ملتا ہے وہ، فیض کی نظم میں نہیں"

"تنہائی" کے سلسلے میں یہ واقعہ میں نے اس لیے لکھ دیا کہ نظم اور غزل کے رشتوں کی بات پہلے ہی چھڑ چکی تھی۔ راشد نے اپنے مقدمے کے آخر میں فیض کے بارے میں اپنی اس مجموعی رائے کا اظہار کیا ہے: "فیض کسی مرکزی نظریے کا شاعر نہیں۔ صرف احساسات کا شاعر ہے" مجموعی طور پر میری رائے "نقش فریادی" کے دوسرے حصے کی آخری نظموں کے پیش نظر درست نہیں ہے یہ نیم صداقت ہے اور نہ جانے وہ کون تھا جس نے آدھے سچ کو ایک جھوٹ سے زیادہ خطرناک قرار دیا تھا۔ "سوچ" "چند روز اور میری جان" "کتے" اور "بول" کے مرحلوں تک پہنچ کر احساسات کا شاعر ایک مرکزی نظریہ کا شاعر بن چکا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ نقش فریادی کے طبع اول کی آخری نظم کون سی تھی۔ غالباً "موضوع سخن" طبع اول کی آخری نظم تھی "ہم لوگ" "شاہراہ"، "سیاسی لیڈر کے نام" "اے دل بیتاب ٹھہر" اور "میرے ہمدم، میرے دوست!"..... ان پانچ نظموں کا اضافہ طبع دوم میں کیا گیا تھا۔ "شاہراہ" کے علاوہ یہ نظمیں آج بھی فیض کے "کلام بہترین" کا ناگزیر حصہ ہیں۔

"فروزاں" کی دو نظمیں "موت" اور "[illegible]" دو غزلیں اور چند اشعار وقت کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ آہنگ کی نمایاں ترین نظمیں "آوارہ" اور "اعتراف" ہیں۔ ان کے بعد "خواب سحر" اور "رات اور ریل" دو غزلوں اور اشعار کو شامل کر لیجیے "مجاز" کی بعض اور نظمیں بھی ہیں جنہیں وقتی نہیں کہا جا سکتا) لیکن آج میں یہی سمجھتا ہوں کہ نقش فریادی کے دوسرے حصے میں فیض نے اس عہد میں ہمیں جو کچھ دیا ہے۔ وہ مقدار میں مجاز اور جذبی دونوں سے زیادہ ہے اور ادبی اعتبار سے بھی زیادہ قابل قدر۔ اس مضمون کا دائرہ فنی طور پر فیض کی شاعری کے ہر پہلو پر مفصل تنقید نہیں ہے۔ میں وقت کے آئینے میں ان کی شاعری اس کے ارتقا اپنی نسل اور بدلتے ہوئے ادبی مذاق اور خود اپنی رائے کو دیکھنا اور پرکھنا چاہتا ہوں اس لیے "نقش فریادی" کی آخری پانچ نظموں پر شدید خواہش کے باوجود تفصیل سے تنگنائی الوقت میرے لیے ممکن نہیں ہے۔

موضوع سخن کی ابتدا جیسے ہماری تہذیب اور اردو غزل کا نگار خانہ ہے۔ چند مصرعے ہیں کہ "سیر میں" "آنچل" رخسار۔ آویزے۔ خوابیدہ سی آنکھیں اور کاجل کی لکیر۔ فیض نے الفاظ کو رنگ بنا دیا ہے۔ نظم کی ابتدا مشرق کے حسن کا مرقع اور نغمہ بن گئی ہے۔ شاعری میں زبان کی تین حیثیتیں ہیں۔ ذریعہ ابلاغ (اس میں رمز و اشارہ بھی شامل ہے) رنگ اور نغمہ (محض آواز نہیں)۔ موضوع سخن میں ہمیں زبان کے یہ تینوں پہلو ملتے ہیں۔ شاعر رنگ، نغمہ اور آواز کے نگینوں سے شعر

کے زیور تیار کرتا ہے۔ آتش نے شاعری کو مرصع سازی کہا تھا۔

بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

یہ محض شاعری نہیں بلکہ تنقیدی حقیقت ہے اور اس تنقیدی حقیقت کو SANTAYANA & IRWIN EDMAN کی مدد سے سمجھا ہے (اور ہم آتش سے کچھ نہ سیکھ سکے۔ میر سے حسرت تک ہمارے شاعروں نے اپنے اشعار میں تخلیقی عمل کی جیسی وضاحت کی ہے، ہمارے سارے نقاد ملکر اب تک نہیں کر سکے ہیں)

> The poet is, as Santayana somewhere says, elementally a goldsmith in words. He arrests the attention of the reader as he is himself arrested by the sensuous qualities of the sound of words.

فیض کی نظم "موضوع سخن" میں خواب بھی ہے اور ان کا تذکرہ بھی جو خواب آشنا تھے اور خواب دیکھنے والوں کے آشنا ہیں۔ لیکن آج اٹھارہ سال کے اندر ہی اندر حسن کا تصور کتنا بدل گیا ہے۔ جب یہ نظم پڑھتا ہوں تو آنکھیں بند ہوتے ہی تصویر ابھرتی ہے تو عورت کے علاوہ ایک ہی زیور پسند تھا۔ آویزہ — آویزہ جو حسین عورت کے حسن کا خلاصہ یا ضمیمہ معلوم ہوتا تھا۔ اب ایرنگ اور ٹاپس کا دور ہے۔ آج کی نسل بی بی اور صوفیہ لارین کو جانتی ہے، کسنے تو پری چہرہ نسیم کو بھی نہیں دیکھا۔ اور زمانہ کی ان تلخیوں میں زلفوں کی گھنی چھاؤں، پرانے برگد کے درختوں کے سائے کی طرح غائب ہوگئی ہے۔ یہ یونی ٹیل کا عہد ہے

میں نے حضرت تابش دہلوی کے مجموعے "نیم روز" پر تبصرہ[1] کرتے ہوئے عرض کیا ہے کہ "الفاظ کے معنی لغت سے نہیں معلوم ہوتے، اچھے شاعروں کے کلام سے معلوم ہوتے ہیں۔ شاید ڈاکٹر مجنوں کی مرحوم نے یہ بات کہی تھی کہ بڑے شاعر کی شاعری میدان حشر ہوتی ہے جس میں الفاظ جلائے جاتے ہیں اور پھر میں نے چند مثالیں پیش کی تھیں، ان میں سے ایک مثال میں نے "موضوع سخن" سے نقطہ "کم بخت" کے سلسلے میں پیش کی تھی

ہائے اس جسم کے کم بخت دل آویز خطوط[2]

فیض کی زبان پر دوسروں نے بہت کچھ لکھا ہے اور خاص طور پر ہماری زبان کے مزاج شناس حضرت اثر لکھنوی نے جو نکتہ سنج بھی ہیں اور سقف مزاج بھی ہیں، اس نکتے کو نہیں چھیڑنا چاہتا مگر "موضوع سخن" میں "مقتل گاہیں" مجھے ہمیشہ ڈراتی رہی ہیں — میں فیض صاحب کی طرح مقتل سے نہیں ڈرتا اور میرے لیے بھی بہ عید نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا" مگر مقتل گاہیں؟ ٹھیک ہے آپ فارسی سے مثال پیش کردیں گے کہ صاحب دیکھیے یہ اتنا بڑا شاعر ہے اور مقتل گاہ کی ترکیب اس کے یہاں ہے لیکن یہ الزامی جواب ہے اور غلطی کبھی سند نہیں ہوا کرتی۔

---

[1] مطبوعہ ماہ نو۔ کراچی

[2] مضمون کے متن میں اور مثالیں ——————

"ہم لوگ" پڑھتے ہوئے مجھے ہمیشہ مجاز کی نظم "آوارہ" کا خیال آیا ہے۔ مجاز کی نظم نے اس کی زندگی ہی میں کلاسیکل حیثیت حاصل کرلی تھی۔ اس کی نظم میں خارجی مظاہر کے پس منظر میں اس نسل (آج کی نسل بھی کہہ لیجیے) کے نوجوانوں کی شکست خوردگی، انتشار، مایوسیوں، فرسٹریشن اور پھر کچھ کر گزرنے کی خواہش آوارہ میں زیادہ تعمیری نہیں مگر ہے ضرور۔ اقبال اور جوش نے عہد حاضر کے نوجوانوں کو اپنے پیغام کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ اقبال نے علمی، فکری اور شاعرانہ لحاظ سے جوش نے جذباتی اور شاعرانہ انداز سے، لیکن نوجوانوں کے جذبات کو اور اس کے محسوسات کو مجاز نے انتہائی کمال فن اور شدت تاثر کے ساتھ پیش کیا۔ "ہم لوگ" اپنے حدود میں ایک کامیاب اور اچھی نظم ہے، مگر "آوارہ" کے درجہ اور بلندی تک نہیں پہنچتی۔ مجاز کی نظم آوارہ کے بند میں نے کراچی میں اپنے آپ کو بارہا سنائے ہیں۔ آوارہ کے بند کراچی کی جگمگاتی جاگتی سڑکوں پر راتوں کو آوارہ گردی کرتے ہوئے میرا ساتھ دیتے رہے ہیں۔ جب کبھی آسمان پر کوئی تارا ٹوٹتا ہوا دیکھا تو ہمیشہ ذہن میں یہ بات آئی کہ نہ جانے آج رات ہمارے ناہموار معاشرے میں کتنے مفلسوں کی محبوبائیں کسی نہ کسی سیٹھ یا سرکاری افسر کی گود میں، ان کے حجلۂ عروسی میں موتی کی لڑی کی طرح بکھری ہوں گی لیکن فیض کی نظم "ہم لوگ" ہمیشہ کسی اداس شام کو اپنے کمرے میں یاد آئی —— فیض کی نظم میں بڑی شدت ہے مگر داخلی، اس میں داخلیت اور خارجیت (جب معروضیت اور موضوعیت کی جگہ یہ دو اصطلاحیں چل ہی پڑی ہیں تو قبول کر لیجیے۔) کی وہ آمیزش نہیں جو مجاز کے یہاں ہے —— مجاز نے دو نوں کو یوں ملایا ہے کہ من و تو کا فرق مٹ گیا ہے —— "ہم لوگ" ہماری ذہنی تصویر ہے اور "آوارہ" سماجی تصویر بھی ہے اور ذہنی بھی

آج فیض کی شاعری کی سب سے نمایاں خصوصیت ان کی انسان دوستی قرار دی جاتی ہے۔ مجھے اس سے اتفاق ہے۔ میری رائے میں ان کی انسان دوستی نے پہلی بار پوری طرح ان کی نظم "میرے ہمدم، مرے دوست" میں آنکھیں کھولی تھیں۔ ایک دن مجاز کہنے لگے:

"میں نے فیض سے کہا دیتہ نہیں کہا بھی تھا یا نہیں) کہ تم نے جو کچھ کہا ہے، میں وہ سب کچھ کہہ سکتا ہوں اور اپنے انداز میں بہت کچھ تم سے اچھا کہا ہے، مگر یہ مصرع میں نہیں کہہ سکتا۔

"اگر مجھے اس کا یقین ہو مرے جانثار مرے دوست"

—— (پچھلے صفحے کے حاشیہ کا بقیہ) یا ٹکڑے پیش کروں تو تسلسل مجروح ہوگا۔ (یہ حرکت اس مضمون میں میں کئی جگہ کر چکا ہوں) اس لیے حاشیے میں شاعری کے ذریعہ لفظوں کے معانی کی تفہیم کی کم از کم دو تین مثالیں تو لکھ دوں۔

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو　　　یہی اک شہر میں "قاتل" رہا ہے

(مرزا مظہر جان جاناں)

یوسف کو نہ سمجھے کہ حسیں بھی ہے جواں بھی　　　شاید "نرے" "لیڈر" تھے زلیخا کے میاں بھی

(اکبر الہ آبادی)

ذرا آہستہ لے چل کاروان کیف و مستی کو　　　کہ سطح ذہن انسان "سخت ناہموار" ہے ساقی

(جوش)

مجھے پتہ نہیں مجاز نے یہ بات سنجیدگی سے کہی تھی یا مذاق سے (شاید وہ بھائی کو شاعری کا موضوع نہ سمجھتے ہوں) مگر بات ہے سچی۔ محبوب سے ہمارے شاعروں نے کیا کچھ نہیں کہا مگر انسان سے، آدمی سے جو ہمدم بھی ہے دوست بھی ہے اور بھائی بھی ہے، اتنے پیار سے شاید ہمارے کسی نئے شاعر نے بات نہیں کی، جیسے فیض نے اس نظم میں کی ہے۔ یہ نظم ایک حمکار ہے، ایک تبسم ہے جو آنسوؤں کے مطلع سے طلوع ہوا ہے۔ یہ تبسم مجھے تو جاوداں لگتا ہے۔ نظم پڑھیے اس میں سخت الفاظ بھی ہیں" اجڑا ہوا بے نور دماغ" "تذلیل کے داغ" "مدقوق جوانی"۔ مگر نظم کی فضا میں یہ تنقید اپنے دوست، اپنے ہمدم، اپنے بھائی سے ہم کناری بن جاتی ہے۔ خودی کا درس اقبال نے پیغمبر کی طرح دیا ہے۔ وہ اپنے علم کے پہاڑ کی بلند ترین چوٹی پر کھڑے ہو کر کہتے ہیں ؎

ستارے جس کی گردِ راہ ہیں وہ کارواں تو ہے۔

یہ آواز بہت بلند آہنگ ہے۔ ان بلندیوں سے ہم تک پہنچ تو جاتی ہے۔ ہم دو چار قدم چلتے ہیں مگر پھر اپنے آپ سے کہنے لگتے ہیں کہ

کون ستارے چھو سکتا ہے، راہ میں سانس اکھڑ جاتی ہے

مگر فیض نے یہی خودی کا درس کیسے اور کسے دیا ہے اپنے ہمدم اور دوست کو جیسے اپنے کلیجے سے لگا کر۔ لہجے کو شہد بنا کر۔ بات کو سرگوشی میں ڈھال کر۔

تیرے آزار کا چارہ نہیں نشتر کے سوا
اور یہ سفاک مسیحا مرے قبضے میں نہیں
اس جہاں کے کسی ذی روح کے قبضے میں نہیں
ہاں مگر تیرے سوا، تیرے سوا، تیرے سوا

اختتامیہ

یہ مضمون "وقت، نقش فریادی، ہم اور میں" دراصل میرے کتابچہ "وقت، فیض، ہم، میں اور وہ" کا ابتدائی حصہ ہے۔ اختتامیہ میں اب صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اقبال کے بعد جوش ہماری شاعری میں نظم کے قافلہ سالار ہے۔ پھر یہ رہنمائی فیض صاحب کے حصہ میں آئی۔ لیکن آج کے نوجوان شعرا کی جو ذہنی سطح ہے اس کے پیش نظر مجھے یقین ہے کہ اب ہماری شاعری نئی دنیاؤں کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی ہے فکری مسائل بہت بدل گئے ہیں۔ انسان اور کائنات کا رشتہ بہت پیچیدہ ہو گیا ہے۔ اختر الایمان کے مجموعہ "یادیں" کی اشاعت کے بعد عزیز حامد مدنی کے مجموعہ "دشت امکان" کی اشاعت اردو شاعری کے نئے سفر کا اشارہ ہے۔ فیض کی غزل کے بارے میں اپنے ایک مضمون "اردو ادب کے بیس سال" میں، میں نے یہ عرض کیا ہے کہ فیض نے دار و رسن کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔

گلوئے عشق کو دار و رسن پہنچ نہ سکے
تو لوٹ آئے ترے سر بلند کیا کرتے

۱۹۵۵ء میں میں نے جس رائے کا اظہار کیا تھا وہ درست تھی لیکن ۱۹۵۹ء میں دار و رسن کی روایت نے "عشق" سے آگے بڑھ کر وقت کی رو سے اپنا رشتہ جوڑ لیا۔

وقت کی رو جو سر دشت صفا دھندلی تھی
کس قیامت سے سر دار و رسن آئی ہے (عزیز حامد مدنی)

ڈاکٹر اسلام سندیلوی

فیض کی غزل

فیض دورِ حاضر کی غزل گوئی کے ایک نمائندہ شاعر ہیں۔ اگر میر سے لے کر دورِ حاضر تک چند بڑے غزل گو شعرا کا نام لیا جائے، تو اس فہرست میں فیض کا نام ضرور آئے گا۔ فیض کی شاعری کی ابتدا رومان سے ہوئی۔ مگر رومان سے حقیقت تک کا فاصلہ انہوں نے چند برسوں میں طے کر لیا۔ فیض کی وہی شاعری قابلِ قدر ہے جو سماج کے حقائق سے سنجیدگی کے ساتھ مربوط ہے۔

فیض کی غزل میں گہرائی اور گیرائی دونوں کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ فیض غم کی عکاسی بھرپور طریقے سے کرتے ہیں۔ یہ غم ذاتی بھی ہے اور کائناتی بھی۔ فیض کی غزل ان کے ذاتی تجربات کا عکس ہے۔ انہوں نے زندگی کی جن منزلوں کو طے کیا ہے انہیں کا عکس چاندنی بن کر اُن کی غزل میں موجود ہے۔ فیض کا غم رسمی اور سطحی نہیں ہے۔ اس لئے وہ محرک اور جاندار ہے۔ دورانِ اسیری فیض نے جو غزلیں کہی ہیں وہ ان کے دکھ بھرے دل کی آوازیں ہیں۔ اس قسم کی دکھ بھری آوازیں اردو شاعری میں ہم اس سے قبل بھی سن چکے ہیں۔ چنانچہ منیر شکوہ آبادی نے کالے پانی کی سزا کے دوران میں جو رباعیاں کہی ہیں ان میں ان کی آہوں کا دھواں اور آنسوؤں کی سرخی موجود ہے۔

اس قسم کے دل خراش نالے فارسی شاعری کی فضا میں بھی گونج رہے ہیں۔ مسعود سعد سلمان نے اپنی عزیز زندگی کے اٹھارہ سال قید میں گذارے۔ اس اٹھارہ سال کے دوران میں اس پر جو گذری اس کا اظہار اس نے ذیل کے اشعار میں کیا ہے ؎

تارے از موئے من سفید نہ بود
چوں بہ زنداں مرا فلک بنشاند
ماندم اندر بلا و غم چنداں
کہ یکے موئے من سیاہ نہ ماند

قید میں مسعود سعد سلمان کا دل خون ہو گیا۔ جس کی سرخی اس کے ہر شعر میں موجود ہے۔ یہی حال فیض کی شاعری کا بھی ہے، فیض کے بھی ہر شعر سے ان کے دل کا خون ٹپکتا ہوا نظر آتا ہے۔

بہرحال فیض نے دورانِ اسیری جو اشعار کہے ہیں اُن میں درد و کرب کے تاثرات بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اس سے زیادہ المناک سانحہ کیا ہو سکتا ہے کہ چمن میں بہار آئے پھر بھی شاعر کو بہار کا انتظار رہے۔ جب یہ حال ہو تو اُسے خرام ابرِ سرکوسار کا شکوہ کیا آتے

روش روش ہے وہی انتظار کا موسم
نہیں ہے کوئی بھی موسم بہار کا موسم
حدیث بادہ و ساقی نہیں تو کس مصرف
خرام ابر سر کوہسار کا موسم
برا سہی ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
فروغ گلشن و صوت ہزار کا موسم

فیض نے اگر فروغِ گلشن اور صوت ہزار کا موسم بذاتِ خود نہیں دیکھا تو ان کو کوئی غم نہیں۔ انہیں اس بات کو سوچ کر تسکین ہو جاتی ہے کہ دوسرے نونہالان چمن بہار چمن سے لطف اندوز ہوں گے۔ فیض کی یہی شاعری ان کی انسان دوستی کی دلیل ہے۔ دراصل فیض کے یہاں صرف ذاتی غم نہیں پایا جاتا ہے بلکہ کائناتی غم بھی موجود ہے۔ "بنی آدم اعضائے یک دیگر اند" کا اصول ہمیشہ ان کے مدنظر رہتا ہے۔ انہوں نے انسانیت کا درد اپنے دل میں محسوس کیا ہے۔ آزادی کے بعد بھی پاکستان میں مفلسی، جہالت، سراسیمگی کا دور قطعی طور پر ختم نہیں ہوا۔ اور جن امیدوں کو لوگوں نے اپنے دل میں پروان چڑھایا تھا وہ اُمیدیں بر نہ آئیں۔ اس لئے پرامید دلوں کو مایوسی ہوئی۔ اس یاس کی جھلک ہم کو فیض کے یہاں ملتی ہے۔ دراصل فیض نے اپنی غزلوں میں اپنے دور اور اپنے سماج کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ ان کے مندرجہ ذیل اشعار دور حاضر کی مکمل طور سے عکاسی کرتے ہیں ؎

اسباب غم عشق بہم کرتے رہیں گے
ویرانیٔ دوراں پہ کرم کرتے رہیں گے
ہاں تلخیٔ ایام ابھی اور بڑھے گی
ہاں اہل ستم مشق ستم کرتے رہیں گے

نہ گُل کھلے ہیں نہ ان سے ملے نہ مے پی ہے
عجیب رنگ میں اب کے بہار گذری ہے
چمن میں غارتِ گُل چیں سے جانے کیا گذری
قفس سے آج صبا بے قرار گذری ہے

دراصل فیض کی غزل اپنے دور کے دوش بدوش چلتی ہے۔ رفتارِ زمانہ کے نقوش فیض کی غزل میں ہم کو نمایاں طور پر مل سکتے ہیں۔ انہوں نے جو غزل اگست سنہ ۱۹۵۲ء میں کہی ہے اس کا لب و لہجہ مذکورہ بالا اشعار سے جُدا ہے ؎

روش کہیں بہار کے امکاں ہوئے تو ہیں
گلشن میں چاک چند گریباں ہوئے تو ہیں
اب بھی خزاں کا راج ہے لیکن کہیں کہیں
گوشے چمن چمن میں غزل خواں ہوئے تو ہیں

ٹھہری ہوئی ہے شب کی سیاہی وہیں مگر

کچھ کچھ سحر کے رنگ پرافشاں ہوئے تو ہیں

ان میں لہو ملا ہو ہمارا کہ جان و دل

محفل میں کچھ چراغ فروزاں ہوئے تو ہیں

ان اشعار میں امید کی کرنیں جگمگا رہی ہیں اور دھوپ پھیلتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔ فیض کو اس بات کی خوشی ہے کہ اب اُن کے ملک میں کچھ آزادی اور ترقی کے آثار نمایاں ہو چلے ہیں۔

دراصل فیض کو اپنے وطن سے بے حد محبت ہے۔ وہ اپنے وطن سے اس طرح محبت کرتے ہیں جس طرح کوئی مرد کسی عورت سے محبت کرتا ہے۔ انگریزی شاعر جان کلیر نے عورت کی محبت کو فطرت کی محبت میں منتقل کر دیا تھا۔ مگر فیض نے عورت کی محبت کو وطن کی محبت میں منتقل کر دیا ہے۔ وطن ان کی نظر میں ایسا ہی حسین ہے جس طرح کوئی محبوبہ حسین ہو۔ اسی لئے وہ کہتے ہیں ؎

بجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے

کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی

چمک اُٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے

کہ اب سحر ترے رُخ پر بکھر گئی ہوگی

بہرحال فیض کی شاعری مجروح دلوں کے لئے مرہم کا کام کرتی ہے۔ ان کی شاعری کا افادی پہلو یہی ہے۔ اُن کی غزل ہم کو یاس میں امید کا جلوہ دکھاتی ہے۔ وہ ہم کو نئی راہ اور نئی منزل سے آشنا کرتی ہے۔ اور انسانی حیات کے لئے ایک لائحہ عمل مرتب کرتی ہے۔ فیض کا یہ شعر قوتِ حیات کا مظہر ہے ؎

پھر سے بجھ جائیں گی شمعیں جو ہوا تیز چلی

لا کے رکھو سرِ محفل کوئی خورشید اب کے

ظاہر ہے کہ اجرامِ فلکی میں سب سے زیادہ تابناک اور توانا خورشید ہے۔ خورشید ہر طوفان کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ لہٰذا آج کی پیچیدہ زندگی میں جب تند و تیز طوفان جاری ہے شمع ہمارے کام نہیں آ سکتی ہے۔ بلکہ ہم کو خورشید کا سہارا لینا ہوگا۔ اپنے ایک دوہے میں تلسی داس نے بھی خورشید کی عظمت کا اعتراف کیا ہے ؎

راکا پت سوڑس اوہ، تاراگن سمودائے

سکل گرن دوالیئے، روبن رات نہ جائے

چاہے سو چاند اُبھریں، چاہے ستاروں کا ہجوم جلوہ دکھائے، چاہے سارے پہاڑوں میں آگ لگ جائے۔ مگر رات کی ظلمت بغیر سورج کے نہیں دور ہو سکتی۔

اگرچہ تلسی داس اور فیض کا مضمون بالکل یکساں نہیں ہے۔ مگر تلسی داس اور فیض اس نکتہ پر متفق ہیں کہ خورشید تابش و توانائی میں سب سے بڑھ کر ہے۔ فیض اسی خورشید کے ذریعے محفلِ کائنات میں اُجالا کرنا چاہتے ہیں جو رات کی ظلمت کو دور کر سکتا ہے اور تیز ہوا کا مقابلہ کر سکتا ہے۔

فیض کی شاعری موضوع اور اسلوب دونوں اعتبار سے اہم ہے۔ فیض کا اسلوب قدیم اردو غزل سے بہت مختلف نہیں ہے۔ بلکہ ان کے یہاں وہی رسمی اور روایتی انداز بیان ملتا ہے۔ انہوں نے دیگر شعراء کی طرح اپنے دل کی بات کنایاتی انداز میں بھی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے یہاں قدیم استعارات، تصورات اور تراکیب بھی ملتی ہیں۔ اہلِ ستم، مداوائے اَلم، طرزِ تغافل، عرضِ تمنا وغیرہ تراکیب اردو کے قدیم سرمائے سے ماخوذ ہیں۔ حسن و عشق کے بیان میں بھی انہوں نے قدیم روایات کو برقرار رکھا ہے۔ چنانچہ اُن کے یہاں شبِ وصل اور روزِ ہجر کا بھی ذکر ملتا ہے۔ اُن کی محفل میں حضرت ناصح بھی تشریف لاتے ہیں، اور اُن کی انجمن میں فقیہہ شہر سے بھی چھیڑ چھاڑ ہوتی ہے۔ مگر اس کے باوجود اُن کے اس روایتی انداز بیان میں ایک خاص قسم کی شگفتگی اور تازگی ملتی ہے۔ اور یہی خصوصیت ان کی غزل کو دورِ قدیم کی غزل سے ممتاز کر دیتی ہے۔

فیض کہتے ہیں ؎

جنوں میں جتنی بھی گذری بکار گذری ہے
اگرچہ دل پہ خرابی ہزار گذری ہے

جنوں کا لفظ بہت فرسودہ ہے۔ مگر فیض کا جنون قیس و فرہاد کے جنون سے مختلف ہے یہ حب الوطنی کا جنون ہے۔ اس کے باوجود اگر ہم چاہیں تو اس سے رسمی جنون بھی مراد لے سکتے ہیں۔ فیض کے شعر کا یہی حسن ہے۔ اسی طرح کا ایک اور شعر ملاحظہ فرمایئے ؎

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات اُن کو بہت ناگوار گذری ہے

بات بڑا عام لفظ ہے۔ قدیم شعراء کے ہاں بات سے مراد عشق کی بات ہے۔ فیض نے بھی بات کا ذکر کیا ہے، مگر یہاں بات کا مفہوم بہت زیادہ وسیع ہے۔ اس بات کا تعلق سیاسی بات سے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض اوقات یہ پتہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ فیض کے عشقِ مجازی کی سرحد کہاں پر ختم ہو گئی۔ اور حب الوطنی کی سرحد کہاں سے شروع ہو گئی۔ محبوب اور وطن اُن کے یہاں اس طرح شیر و شکر ہیں کہ دونوں عناصر کو جدا کرنا مشکل کام ہے۔ یہی فیض کی غزل کا طرۂ امتیاز ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ فیض نے اردو غزل کو ایک خاص لب و لہجہ عطا کیا ہے۔ ان کی وجہ سے غزل کافی جاندار اور صحت مند ہو گئی ہے۔ اس کے باوجود فیض کے اسلوب اور انداز بیان میں کہیں کہیں خامیاں بھی نظر آتی ہیں جن کا ذکر اس سے قبل حضرت اثر لکھنوی کر چکے ہیں۔ (ملاحظہ ہو "زنداں نامہ کا سرسری جائزہ" ملی گڑھ میگزین) ان خامیوں کو یہاں دہرانا مقصود نہیں ہے۔ تاہم بعض خامیوں کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے۔ جن کا ذکر اثر صاحب نے نہیں کیا ہے۔ فیض کے مندرجہ ذیل شعر میں "کہ" بروزن "کی" نظم ہوا ہے جو درست نہیں ہے ؎

کٹتے بھی چلو بڑھتے بھی چلو، بازو بھی بہت ہیں، سر بھی بہت
بڑھتے بھی چلو کہ اب ڈیرے منزل ہی پہ ڈالے جائیں گے

مندرجۂ ذیل شعر میں شترگربہ کا عیب ہے ؎

حضرتِ اہلِ دیر جیسے ہیں　　　آپ اہلِ حرم کی بات کرو،

کہیں کہیں تعقیب کا عیب ملتا ہے۔ یعنی مولانا آزاد اور مولانا حالی والی لفظی بے ترتیبی موجود ہے۔ مثلاً ؎

بڑا ہے درد کا رشتہ یہ دل غریب سہی
تمہارے نام پہ آئیں گے غم گسار چلے

"آئیں گے چلے" کے بجائے "چلے آئیں گے" زیادہ فطری انداز ہے۔

بعض اشعار میں وجہ شبہ کا خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ مثلاً ؎

چاند دیکھا تری آنکھوں میں نہ ہونٹوں پہ شفق
ملتی جلتی ہے شب غم سے تری دید اب کے

ہونٹوں کو سُرخی کی بناء پر شفق سے تشبیہ دینا بالکل درست ہے مگر آنکھوں کو چاند سے کیا مناسبت ہے۔ آنکھوں کو جام کہا جا سکتا ہے۔ (جام دیکھے تری آنکھوں میں)۔ اور چہرے کو چاند کہنا درست ہے۔ (چاند دیکھا ترے چہرے پہ)۔ بعض جگہ توالیٔ اضافات کا نقص موجود ہے۔ مثلاً ؎

گر سنگر زخم کی تو خطا وار ہیں کہ ہم
کیوں محو مدح خوبیٔ تیغ ادا نہ تھے

یہاں چار اضافتیں مسلسل آگئی ہیں جو ذوقِ سلیم پر گراں گزرتی ہیں۔

سجاد ظہیر صاحب نے اس شعر کی بہت تعریف کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

"اس کی داد تو فیض مرزا نوشہ سے بھی لے لیتے۔ جعفر علی خاں اثر تو الگ رہے۔" (زنداں نامہ دیباچہ صفحہ ۲۲)

ممکن ہے کہ اکبرآباد والے مرزا نوشہ اس شعر کی داد دیتے مگر دلی والے مرزا نوشہ اس شعر کی داد کبھی نہ دیتے۔ اثر لکھنوی نے بھی اس شعر کو پسند نہیں کیا ہے۔ بلکہ کہا ہے کہ اس شعر میں "خفی حشو" ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے۔ میں اس شعر کو حسین نہیں سمجھتا دراصل تمام اضافات نے شعر کو بہت بھونڈا بنا دیا ہے۔ اس شعر کا مرکزی مضمون دلکش ہے مگر انداز بیان نے مرکزی مضمون کے حسن کو مجروح کر دیا ہے۔ شراب حسین سہی مگر دیکھنا یہ ہے کہ وہ جام جم میں پیش کی گئی ہے کہ جام سفال میں۔ سجاد ظہیر صاحب کی اس تعریف میں صداقت کے بجائے عقیدت کی جھلک ہے۔ اس عقیدت مندی کی بناء پر آج غالب سے وہ فلسفہ منسوب کیا جاتا ہے جس کی خبر خود غالب کو بھی نہیں تھی۔ اس سلسلہ میں مہدی افادی نے ٹھیک کہا ہے کہ :

"جو رکھ رکھاؤ غالب سے منسوب کیا جاتا ہے، ان میں سے اکثر

نکات پیدا لوقوع ہیں۔"

ہم کو بھی فیض سے کسی قسم کے رکھ رکھاؤ کو منسوب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم کو فیض کی شاعری کو پرکھتے وقت ہمارے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ ان کے یہاں کہیں کہیں کانٹے جو نظر آتے ہیں۔ ہم اُن کو بھی گل رنگیں سمجھ لیں۔ بلکہ ہم کو فیض کے اُن پھولوں سے محظوظ ہونا ہے جن کی مہک تا ابد قائم رہے گی اور جو آئندہ نسلوں کے مشام کو دائمی طور پر معطر کرتے رہیں گے۔ نگار

انجم اعظمی

فیض کی داخلیت پسندی

مریض داخلیت زندگی کے تجربے سے آزاد اور اپنے خول میں بند رہتی ہے۔ زندگی کی وسعت بے پایاں سے آنکھیں چرا کر وہ ایک ایسی نفرت کا بانی ہے جو اندر ہی اندر خود اپنے خالق کا کفن بنتی ہے لیکن فیض کی داخلیت پسندی اردو شاعری کا ایک واضح حد ہے جو اسے شعرا کے ایک خاص سلسلہ سے منسلک کرتا ہے۔ اس گروہ کے سربراہ میر، غالب اور مومن جیسے شعرا ہیں جن کے یہاں داخلیت زندگی کے جمال کا استعارہ ہے۔

جدید اردو نظم کا جب آغاز ہوا تو اس پر قصیدہ، مرثیہ اور مثنوی کا اثر بے حد نمایاں تھا۔ منظر نگاری اور واقعات عالم کی تفصیلات سے دلکش کیا جاتا جو بے اثر اور غیر فردی جذبات کی نظم بندی تک محدود رہ جاتا تھا۔ حتیٰ کہ اس عہد کی مشہور ترین نظم "مسدس حالی" پر بھی جتنے ستے کئے جاتے ہیں ان کی بنیاد بھی یہی خامی ہے۔ سب سے پہلے علامہ اقبال نے اس خامی کو دور کرنے کی طرف توجہ دی اور ایسی نظمیں کہیں جو داخلی محرکات اور تو انا ہو کر اختتام تک پہنچتی ہیں۔ اقبال کی حیثیت چونکہ ایک بڑے قومی شاعر کی ہے جن کے پاس ایک پیغام بھی تھا اس لئے شاعری میں موضوعات اور داخلی صداقت کا جھگڑا مٹ گیا۔ اور دونوں کے درمیان بظاہر جو تضاد نظر آتا تھا، ایک آہنگ کی شکل میں وسعت ذات کا عرفان ذات اور عرفان حیات کا رجحان بن گیا۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اقبال نے نظم کی ہیئت کو جوں کا توں قبول کر لیا تھا وہ ہیئت کے ہی کے تجربے سے غفلت برتنے کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اگر وہ لوگ اقبال کی نظموں میں داخلی آہنگ کی تلاش کریں اور اس پہلو پر توجہ دیں، تو اندازہ ہوگا کہ حالی کی نظم اقبال تک پہنچ کر یکسر بدل گئی ہے۔ اس تبدیلی کا سبب اقبال کی وہی داخلیت ہے جو حالی کے یہاں صرف غزل کی ابتدائی حد تک محدود ہے۔ حالی نے بعض باتوں سے متاثر ہو کر اپنا شعری انداز بدل لیا تھا لیکن جن واقعات و حالات کا تاثر وہ اپنی جدید نظموں میں ابھارنا چاہتے تھے انھیں پہلے اپنی داخلی زندگی کا اس طرح جز بنا لینے کی ضرورت تھی کہ وہ ساری باتیں حالی کی ذات سے اپنا استعارہ قومی شاعری کا موضوع سمجھتے تھے۔ اس اعتراض کے باوجود حالی ہمارے بڑے محسنوں میں سے ایک ہیں۔ ان کے اندر کم از کم اتنی جرأت تھی وہ اپنی ناکامی برداشت کرتے ہوئے نئی سمت میں اردو شاعری کی رہنمائی کر سکتے تھے۔ ان کا المیہ ہی دراصل ان کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ بخلاف اقبال کی کامیابی اس میں مضمر ہے کہ انھوں نے موضوع اور شخصیت کے تضاد کو ختم کر کے جدید نظم کو باوقار، متوازن اور کلاسیکی پہلو عطا کر دیا۔ اور اس طرح ان لوگوں کے لئے راہ ہموار کر دی جن کا مزاج غزل کے اختصار کے بجائے وسعت بیان اور جن کی فکر امکان تعمیر بام و در کا تصور بھی رکھتی تھی۔ جوش، فراق، مجاز اور فیض کے یہاں ان کی انفرادیت سے الگ نظم کا جو حسن ملتا ہے وہ اقبال کی روایت

ہے اس کے بعد اس میں مشرق و مغرب کے بہت سے دھارے ملتے گئے ہیں۔

جوش نے فارسی شاعری سے براہ راست اور بھرپور اثر قبول کیا۔ فراق انگریزی، سنسکرت اور ہندی شاعری سے بہت کچھ لےکر اردو میں آئے۔ مجاز کا بانکپن اپنے اندر زندگی کے نئے تیور اور تاثرات چھپائے ہوئے ہے (فیض کی شعری گھلاوٹ اور مدھم لہجے میں ان کے انگریزی اور عربی ادب کے مطالعہ کا بڑا دخل ہے۔ جس کا تجزیہ مشکل ہے، لیکن احساس اسے قوس قزح کی شکل میں پیش کرتا ہے اور مختلف رنگوں کے باہمی امتزاج سے جنم لینے والی اس دھنک کو دیکھ کر اس کی تازگی، ندرت اور حسن کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ ایک نئی صنف سخن کی مختصر داستان بھی ہے اور اس حقیقت کی تلاش بھی جو ہر عہد کے باکمال شعراء کا جوہر تھی۔ جسے میں نے داخلیت کا نام دے کر ایک نیا جھگڑا کھڑا کر دیا ہے۔ جہاں لوگوں نے داخلی اور خارجی حقائق کی بحث چھیڑ رکھی ہو وہاں میرا یہ کہنا کہ داخلیت وہ نقطۂ اتصال ہے، جہاں زندگی کے موضوعات شاعر کی ذات سے ہم آہنگ ہوتے ہیں ایک فتنہ کا سد باب بھی ہو سکتا ہے لیکن اس کے لئے شرط اس بات کی ہے کہ لوگ میری بات بھی ذرا غور سے سنیں ممکن ہے میرا تجزیہ صحیح ہو ورنہ کم از کم میری نیت پر حرف نہیں آتا میں نے نہایت ایمانداری سے داخلیت کے مفہوم کی جانب اشارہ کیا ہے جو ہماری بستیوں میں رہنے والوں میں سے چند کو فن کا خالق بناتا ہے۔ اور شاعر کو الفاظ کے باطنی حسن کی جستجو پر مائل کرتا ہے الفاظ کے باطنی حسن سے مراد اظہار کا وہ پیرایہ ہے جو زندگی کے ادراک کی منزل کی نشاندہی کر سکے یا کم از کم اس راہ کا پتہ دے جو ادراک حیات کی جانب لے جاتی ہے جہاں یہ کام خوش اسلوبی کے ساتھ انجام پا جاتا ہے ہم کہتے ہیں کہ ہماری شاعری میں چند نئی علامتوں اور چند نئے استعاروں کا اضافہ ہو گیا جن سے شاعری کے نئے باب وا ہوتے ہیں۔

[۱۱] فیض کی داخلیت کا مطالعہ بھی دراصل ان کے پیرایہ اظہار کو سمجھنے کی ایک کوشش ہوگی کیونکہ فن ہی اپنے خالق کا صحیح پتہ دے سکتا ہے کہ شاعر عرفان ذات کی کس منزل میں ہے۔

یہاں پہنچ کر قلم تھوڑی دیر کے لئے ٹھٹک جاتا ہے۔ کوئی شاعر عرفان ذات کی کس منزل میں ہے اس کا اندازہ لگانا کتنا مشکل کام ہے اسے کچھ وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جنھیں اشیاء کی ماہیت پر غور و فکر کی عادت ہو۔ تنقید کو اسی بناء پر صرف ادب کے تجزیئے تک محدود نہیں سمجھنا چاہیئے بلکہ یہ ادب اور زندگی دونوں کے تجزیے سے نئی اقدار کی دریافت کرتی اور ادب کے تاثر کو ابھارنے کے علاوہ فکر و خیال تک اس کی رہنمائی کا کام بھی کرتی ہے۔ تنقید فلسفہ اور ادب کے بیچ بین ہے۔ فلسفہ اور ادب کی وجہ سے حقیقت نے دو نام پائے فلسفہ اسے صداقت کہتا ہے۔ ادب اسے جمال سے تعبیر کرتا ہے۔ تنقید صداقت اور جمال کا سنگم ہے۔ جہاں زندگی کے تاثرات اور تجربوں کے دو دھارے مل کر گنگا جمنی کا سماں پیش کرتے ہیں۔

فیض کی داخلیت نے اکتساب جمال کو ادراک حیات کا پیمانہ بنایا ہے اس کسب کی مختلف کڑیوں کو ملا کر دیکھنا ہے کہ ان کے یہاں احساس و جذبہ کی نشو و نما میں زندگی کے جمال کا کتنا ہاتھ ہے۔

سنہ ۳۶ء میں ابھی اقبال زندہ تھے ٹیگور، نذرالاسلام اور جوش جیسے باکمال شعراء موجود تھے، اس وقت چند ادیبوں اور شاعروں نے ملک میں نئے رجحانات کی داغ بیل ڈالی تھی۔ ان کے پاس کوئی ادبی سرمایہ نہیں تھا۔ لیکن ان کے ذہنوں میں وہ آگ بھڑک اٹھی تھی جو نئے خیالوں کا اثبات چاہتی تھی۔ وہ لوگ ادب میں باغی کی حیثیت سے آئے تھے، لیکن عجیب بات ہے کہ ان کے بزرگ ہی اُن کے رہنما تھے۔ پھر ان کی بغاوت کا رُخ کس جانب تھا۔ اور کون لوگ تھے۔ جو اس کی زد میں آئے تھے۔ دراصل سیاسی غلامی اور تحریک آزادی کے پلیٹ فارم پر سب ایک ہی صف میں کھڑے

تھے، وہ لوگ اختلاف کی حدیں پھلانگ کر یکجا ہو گئے تھے اس کے باوجود وہ باغی تھے۔ ان کے رجحانات بزرگوں سے الگ تھے انھوں نے بساط
عالم پر نئی حقیقتوں کو ظہور پذیر ہوتے دیکھا تھا۔ اور ان کے دل جذبات کے ایک نئے دھارے سے دوچار تھے۔ اقبال کا اسلامی طریقۂ فکر ان سے لگا
نہیں کھاتا تھا وہ براہ راست آدمی اور اس کے مسائل کو موضوع فن بنانا چاہتے تھے۔ ادب و فن دلیپی عقائد کی دیوار ڈھاتے رہتے ہیں۔ ان کی سوچ پر
یورپ کے عروج و زوال کا گہرا اثر تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے شعلے ابھی نہیں بھڑکے تھے لیکن عالم امکان میں ان کی آنچ کا اثر تھا۔ روس کا اشتراکی
سماج ایک معجزہ کی صورت میں ان کے سامنے موجود تھا جو یورپ کے تہذیبی زوال سے کٹ کر اپنی تعمیر میں مگن تھا۔ شعراء کا نیا گروہ عالمی تہذیب کے ان ابعاد
میں ان حقائق کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا اس کے علاوہ نظم جدید کا تاریخی سفر جاری تھا۔ وہ اقبال کی روایت کو اقبال سے آگے لے جانا چاہتی
بھی اور جس آزاد نظم کو لکھنے میں عبدالحلیم شرر ناکام رہ گئے تھے۔ اس کے لئے کامیابی کی منزل تک پہنچنے کے امکانات پیدا ہوگئے
تھے۔ ان حالات میں فیض، مجاز، مخدوم، راشد، سردار، وغیرہ نے اپنی آواز سے روشناس کیا۔ راشد کی بغاوت آہستہ
آہستہ میئت پرستی میں بدل گئی، سردار جعفری نے بغاوت کے زور میں اس آہنگ کی پرورش نہیں کی جسے۔ ـ ـ ـ ـ ـ ـ
داخلیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مخدوم نے شاعری ترک کر کے ایک مدت تک سیاست کو اپنائے رکھا" اندھیرا" جیسی نظم کے
خالق کا یہ رویہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے کوئی بلا وجہ امر بالمعروف سے انکار کر دے۔ مجاز خود اپنی آگ میں جل بجھے مجاز کی یاد سدا لوگوں دلوں
کو تڑپاتی رہے گی۔ فیض کا لہجہ شروع سے بڑا نرم، خواب ناک اور رگداز تھا۔ اس کے دل میں محبت اور زمانے کے غم مدغم ہو کر اپنا نگ
روپ آہستگی سے پروان چڑھاتے رہے۔

چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز

یہ جسین کھیت پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا
ان میں کیوں آج فقط بھوک اُگا کرتی ہے

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول کہ سچ اب تک زندہ ہے

فیض کی شاعری کی یہ چند مثالیں ہیں جو میں نے کسی کاوش کے بغیر جمع کر دی ہیں۔ ان میں فیض کی شاعری کا ضبط،
گداز اور حسن اس کی انفرادیت اور لہجہ کی ضمانت ہے۔ لیکن ان کے تجزیے سے اس کے شاعرانہ کمال کے ساتھ ساتھ اس کی
خامیوں پر بھی نظر پڑتی ہے اور اس کا سراغ ملتا ہے کہ اصلی شخصیت کہاں کہاں پھیلتی بڑھتی رہی ہے اور کہاں سمٹ گئی ہے۔
ان مثالوں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ فیض بنیادی طور پر شاعر ہے اس کی فکر شاعرانہ ہے اس کے یہاں وہ جمال ملتا ہے۔
جو زندگی کو فن کے قالب میں نیا پیرہ عطا کرتا ہے وہ تاثر ہے جو دل کی آگ کے سیال ہونے سے پیدا ہوتا ہے ان
میں حوادث زمانہ کا عکس ہے وہ سچ کے زندہ ہونے اور لب کے آزاد ہونے کی خبر دے کر سچ بولنے کی ہمت دلاتا ہے کھیتوں
میں فقط بھوک کا اُگنا فیض کی داخلیت کی ایک بے حد خوب صورت مثال ہے۔ کھیتوں میں تو اب بھی اناج اُگتا ہے لیکن ان دو مصرعوں

میں زندگی کا ایک بڑا المیہ منظر بن کر سامنے آگیا ہے۔ اس کے پس منظر میں بھوکی اور ننگی انسانیت کا بہت بڑا قافلہ ہے۔ ان دو مصرعوں کے استفہام میں نئی زندگی کی جانب ایک بلیغ اشارہ ہے۔ "چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز" میں رجائیت کے بجائے مستقبل پر یقین اور اعتماد ملتا ہے۔ یہ ایک عہد کی فکر ہے لہجہ ایسا ہے جیسے کوئی مانوس آواز بہت قریب سے سنائی دے۔ لیکن آخری دو مصرعوں میں فیض کے یہاں جو قوت ملتی ہے وہ ان کی شاعری میں خال خال ہے۔ اگر فیض نے سپیج کے زندہ ہونے کی بشارت کو اپنی پوری شاعری میں پھیلا دیا ہوتا تو ان کے یہاں اقبال سے مختلف لیکن ایک بڑا پیغام ملتا۔ اس کے بجائے وہ زندگی کے غموں کی دہلیز پر بیٹھے رہ گئے۔ دوسرے انھوں نے ان غموں کو اتنا سمیٹا کہ ان کے نام تک انھیں یاد نہ رہے۔ غم جاناں اور غم روزگار کے بعد ان کے یہاں وہ جدید استعارے نہیں ملتے جو کشاکش حیات سے گہرے طور پر متعارف کرا سکیں دار و رسن کی آزمائش غالب کے زمانے میں بھی تھی۔ فیض کے نئے سیاسی احول میں ان کے مفہوم کی دل کشی کچھ اور بڑھ گئی ہے لیکن جس آدمی کے لئے فیض نے سارے غموں کے زہر کو امرت سمجھ کر پی لیا تھا وہ شش جہت میں پھیلا ہوا ہے۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
میں نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا

غالب نے اس آدمی کا سراغ لگا لیا تھا۔ اسی لئے وہ میر سے بھی بڑا شاعر ہے۔ لیکن فیض کی شاعری آدمی کے روحانی وجود کی اس وسعت سے واقف نہیں ہے۔ اس کے لئے چشم کو ہر رنگ میں وا ہونا پڑتا ہے۔ فیض اپنے عہد کا ایک معتبر شاعر ہے جو ہمارے غم میں شریک ہے۔ اس کے یہاں موضوعات کی نوعیت خارجی نہیں ہے اس کی آواز مانوس ہے دل میں اتر جاتی ہے وہ ہمارا دوست اور محبوب ہے ہمیں اپنی محبت دیتا ہے اور بہت کچھ نہیں دے سکتا۔ جس کے لئے ہم در بالا میر، اقبال اور غالب کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان عظیم شعراء کے یہاں ہمارے عہد کی وہ فکر نہیں ملتی جو آج کے شاعر سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ زندگی کے ادراک کی اس سطح تک پہنچے جہاں میر اور اقبال نے اپنے آدرش بنائے میر نے آدمی کو ڈھونڈھ کر اور اسے کائنات سمجھ کر اپنے سینے میں چھپا لیا اقبال نے نئے جہان کی تخلیق کی ذمہ داری اس پر ڈال دی اور غالب نے شش جہت کو اس کی جولاں گاہ بنا دیا۔ آج کی دنیا میں آدمی کا قدم کس سمت اٹھے گا وہ تعمیر کے کن مراحل سے گزرے گا اور اپنے آپ کو کس طرح پائے گا۔ اس کی نشاندہی آج کے شاعر کو کرنی ہے فیض اس سطح کا شاعر نہیں ہے وہ ایک خوب صورت لہجہ کا شاعر ہے۔ اس کے یہاں ادراک کے بجائے سیاسی شعور کی منزل ہے اس نے اپنی شخصیت میں زندگی کے دکھوں کو سمو لیا ہے اور ان کا ترجمان بن گیا ہے لیکن بڑی حد تک اپنی ذات کے اندر سمٹ گیا ہے۔ اس نے اگر اپنے سیاسی شعور اور محبت کے غم کو خود آگہی کے درجہ تک پہنچایا ہوتا تو اس کی شاعری گردش روزگار کی پہلو بہ پہلو آئینہ دار ہوتی اور آدمی کا چہرہ لہولہان ہونے کے باوجود ایک مکمل تصویر بن جاتا جو فیض کی عظمت کا گواہ ہوتا۔ فیض نے آدمی کے درد کو پہچانا ہے لیکن ان کے نرم لہجہ میں اس درد کا پورا کرب نہیں آیا۔ اس کے لئے انھیں یگانہ چنگیزی سے رجوع کرنا تھا۔ پہاڑ کاٹنے والے زمیں سے ہار گئے زندگی کے جبر سے نبرد آزما ہونے والے انسان کی بے پناہ قوت فیض کے نیم غنودہ لہجہ کی متحمل ہو ہی نہیں سکتی۔ فیض کی داخلیت کا یہ ایک بڑا نقص ہے کہ ان کے یہاں صداقت کی

بھرپور آواز کر ان کی شاعری کا خواب آلود حسن دبا دیتا ہے۔ البتہ یہ داخلیت اپنا محدود دائرہ اثر رکھتی ہے جہاں خوب کلام کہی ہے لیکن اس آدمی کو اداس کر جاتی ہے جیسے بیک وقت زمین کی بستی میں روٹی کا مطالبہ کرنا اور ستاروں پہ کمند بھی پھینکنی ہے۔

'زنداں نامہ' اور 'دست صبا' کی نظموں اور غزلوں میں فیض کا سیاسی شعور نسبتاً نکھر گیا ہے۔ لیکن اس شعور کو وہاں بھی عرفان ذات کی منزل نہیں ملتی ورنہ سیاست تو ساری زندگی پر محیط ہے۔

آدمی کی محبت کا ایک پہلو نفرت بھی ہے۔ زندگی کے حسن سے محبت کرنے والے تاریکی، ظلم اور تغلب سے شدید نفرت کرتے ہیں۔ فیض نے بھی نفرت کی ہے۔ لیکن کم کم حسن کے ابتدا ہی سے ایک رومانوی وابستگی نے ان کی نفرت میں وہ کرب نہیں پیدا کیا جو مائل بہ گفتار و عمل ہو کر زندگی کے ہر جھوٹ کا طلسم توڑ جاتا ہے۔ اقبال نے نئی دنیا کا خواب دیکھا تھا لیکن جس آدمی کو نئے جہان کی تشکیل کرنی تھی اسے فیض اپنی گرفت میں نہ لا سکے۔ اور فیض ہی پر کیا منحصر اس عہد کا کوئی شاعر ابھی اس منزل پر نظر نہیں آتا۔ فیض نے 'نقش فریادی' کے دوسرے حصے میں جو نظمیں شامل کی ہیں ان کا سیاسی اور رومانی انداز 'زنداں نامہ' اور 'دست صبا' میں بھی ملتا ہے۔ مضامین یا علامتوں میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکا۔ البتہ فیض کی سیاسی فکر ان دونوں مجموعوں میں پہلے سے زیادہ واضح اور گہری ہے۔ اور بعض نظموں میں فیض اپنے نرم و نازک لہجے کی حدیں توڑ کر اپنے عہد کے سیاسی کرب کا احاطہ کر لیتا ہے ؎

یہ طفل و جواں
اس آگ کی کچی کلیاں ہیں
جس میٹھے نور اور کڑوی آگ
سے ظلم کی اندھی رات میں پھوٹا
صبح بغاوت کا گلشن

یہ رات اس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے۔

یہ رات جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے۔ فیض کے لہجہ کو بلند آہنگ بنانے کے امکانات سامنے لا رہی تھی۔ لیکن فیض یہاں تک آ کر لوٹ گئے۔ 'دست صبا' کے بعد کی ایک نظم کے دو مصرعے ؎

چاند نے مجھ سے کہا
اور ذرا آہستہ

رومان کی جانب شاعر کی مراجعت کا پتہ دیتے ہیں۔ فیض کا بار بار رومان کی جانب لوٹ جانا اس کی داخلی زندگی کی سب سے بڑی کمزوری ہے جو اس کے فن کو لازوال عظمت سے ہم کنار نہیں ہونے دیتی۔ عشق و محبت بھی زندگی کے مستقل موضوعات ہیں اور عمر کی کسی منزل میں انہیں کفر نہیں قرار دیا جا سکتا۔ لیکن عمر کے ساتھ شاعر کے تجربے اور احساس میں گہرائی، وسعت اور وزن پیدا نہ ہو تو اس کی عشقیہ شاعری ماضی کے تجربوں کو دہرانے لگتی ہے۔ فیض کے ساتھ بھی اب یہی ہو رہا ہے۔ وہ جب محبت کے موضوع سے ہٹتا ہے تو اس کا سیاسی غم اسے آواز دیتا ہے ؎

مقامِ فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

اس شعر میں اُس نے خود اپنا لائحہ عمل پیش کر دیا ہے۔ اس سے زیادہ کا مطالبہ بے سود ہے اور سچ پوچھئے تو فیض کے غنائی لب و لہجہ کی لذت سے الگ کوئے یار سے دار تک بھی دل کی بڑی وسعتیں ہیں۔ یہ بھی ہر ایک کو کہاں نصیب۔ اس کے نرم غنائی لہجہ کی بنیاد پر اسے بھی مومن کی طرح جمال پرست شاعر کی حیثیت حاصل ہے ؎

گُل ہوئی جاتی ہے افسردہ سلگتی ہوئی شام
دُھل کے نکلے گی ابھی چشمۂ مہتاب سے رات

تھک گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہگذار
اجنبی خاک نے دُھندلا دیئے قدموں کے سراغ
صحنِ زنداں میں رفیقوں کے سنہرے چہرے

رات باقی تھی ابھی جب سرِ بالیں آکر
چاند نے مجھ سے کہا، "جاگ سحر آئی ہے"

یہ خواب آلود شاعری اس کی جمال پرستی کی غماز ہے۔ لیکن فیض کی داخلیت کا جب بھی پورا جائزہ لیا جائے گا تو بعض فنی شہ پاروں کی بلند آہنگی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ؎

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول کہ سچ اب تک زندہ ہے

ہر اک سیہ شاخ کی کماں سے
جگر میں ٹوٹے ہیں تیر جتنے
جگر سے نوچے ہیں اور ہر اک
کا ہم نے تیشہ بنا لیا ہے

ان مصرعوں میں فیض کے سوگوار لہجہ کی جگہ ایک طاقتور آواز نے لے لی ہے جو سیاسی بصیرت کا پتہ دیتی ہے ماں سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اگر فیض کی شاعری میں کوئی اضافہ ہو سکا تو وہ کس سمت میں ہوگا۔ لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ فیض اپنی رومان پسندی کے حصار سے نکل کر اس سیاسی بصیرت کو اپنی داخلی زندگی میں مکمل طور پر رچا لے جہاں مصرعوں میں جھلک رہی ہے ؎

یہ مات اس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے

(کیپٹن میجر) اسحٰق محمد

فیض میری نظر میں

بحیثیت شاعر فیض کے بارے میں جب میں غور کرتا ہوں تو فیض کی انسانیت میرے تصور میں اُبھر آتی ہے۔ یہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں اُس کے پورے خدوخال دکھائی دیتے ہیں اور اسی طرح مجھے فیض میں ایک شاعر اور ایک انسان کی حیثیت سے کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ شیکسپیئر نے شاید اس تفاوت کو قائم رکھا ہے اور اپنے شاہی سامعین کے سامنے سرنگوں ہوتے ہوئے بھی، محلات میں رہنے والی سنگدل شہزادیوں، دل پھینک شہزادوں اور نظرباز بیگمات یا اسی نوع کے دوسرے کرداروں کو پیش کرنے میں اپنے دلی خلوص سے کام نہیں لیا۔ بالزاک کو دیکھئے وہ بڑے ٹھاٹھ کی زمیندارانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ لیکن جب اظہارِ خیال کی نوبت آئی تو اسی کے قلم نے جاگیردارانہ نظام پر بڑی بے رحمی سے ایسے چرکے لگائے جن کا تجربہ شاید اس نظام کو پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ فیض میں یہ بات نہیں تھی۔ اس میں خلوص تھا۔ دیانت تھی، اس کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی اس نے کسی تبدیلی کو قبول کیا تو فکری و شخصی ہر دو لحاظ سے قبول کیا اور ایسے مواقع چونکہ زندگی میں بہت کم آیا کرتے ہیں، اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اپنی نرم مزاجی اور انسان دوستی کے باوجود فیض اپنی جگہ پر چٹان کی طرح مضبوطی سے قائم رہا۔ اس کا یہی وصف ایک حسین امتزاج کی طرح فنی لحاظ سے بھی اس کی شاعری میں نمایاں ہے اور وہ بھی عصرِ جدید کے فنکار کی مانند نہیں بلکہ مغلیہ دور کے منقش و مطلا قلمی فن پاروں میں تصویروں کے باریک سے باریک نقوش کی طرح ظاہر ہے۔ میرے خیال میں یہی ایک وجہ ہے جس سے فیض کے اندازِ بیاں میں وضاحت اور نکھار پیدا ہو گیا ہے۔ فیض اپنے خیال کو خام اور ناقص لفظوں میں پیش کرنے کی بجائے یہ بہتر سمجھتا ہے کہ اس خیال ہی کو ترک کر دیا جائے۔ بعض لوگوں کو اس کی شخصیت پُراسرار معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ وہ ماضی کو حال کی تازہ جھلکیوں سے سجانے میں مہارت رکھتا ہے۔ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ ہم میں سے بہتوں کی قوتِ متخیلہ حال یا ماضی ایک کے ساتھ ضرور وابستہ رہتی ہے۔ لیکن فیض کا یہ کمالِ فن ہے کہ وہ جدید کو بڑی عمدگی سے کلاسیکی پیرہن عطا کر دیتا ہے اور یہ شاید جدید و قدیم دونوں سے اس کی وابستگی ہی کا نتیجہ ہے جو اسے روایت سے بغاوت اختیار کرنے سے روکتا ہے اور ایک طرح سے اسے پابند بھی کر دیتا ہے۔ میں ۱۹۳۵ء میں پہلی مرتبہ فیض سے متعارف ہوا جبکہ وہ ایم اے او کالج امرتسر میں انگریزی کا پروفیسر تھا۔ یہ کالج بھی ایک عجیب ادارہ تھا اور محلہ کے ایک دورافتادہ کونے میں واقع تھا۔ یہاں کی اقامت گاہ، مسجد اور اس سے ملحقہ میدان تقریباً ایک ایکڑ زمین کے رقبہ میں محدود تھا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس وقت اس درسگاہ میں انگریزی لٹریچر کے فارغ التحصیل نوجوان گریجویٹ اساتذہ کے عہدوں پر فائز تھے اور ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر یہاں پرنسپل تھے۔ اس وقت ان میں

کچھ نوجوانوں کی حالت جو ۱۹۳۵ء کی تحریک اشتراکیت کے حامی تھے۔ اس درس گاہ کی انجمن کے مولویوں محلّے والوں اور دیہاتی طالب علموں کے ماحول میں قابلِ رحم سی تھی۔ ان لوگوں نے اپنی ایک علیحدہ انجمن بنا رکھی تھی جس میں کچھ طلبا بھی شامل تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک دفعہ میں نے ایک معمولی قسم کے طالب علم کو ایک پروفیسر صاحب کے گھر میں بیٹھے ہوئے اسٹڈی سرکل کی میٹنگ میں بڑے پرجوش طریقے سے کمیونزم کے ابتدائی دور کے شاندار کارناموں کی تعریف کرتے ہوئے سنا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ جذبہ جس کے تحت فیض فسطائیت کی تاریک قوتوں کے خلاف نبرد آزما ہونے کے لئے فوج میں شامل ہوا تھا۔ وہ اس انجمن کے گر ترہ سکھانے والے سبق سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوا تھا۔ یہیں سے نقشِ فریادی کے اصلی نقوش اجاگر ہوتے ہیں۔ فیض ان دنوں گرفتارِ محبت تھا۔ اور اس حیثیت سے ہر شخص کو اس سے ایک لگاؤ تھا۔ وہ کھلے بندوں اپنی محبت کا اظہار کیا کرتا تھا۔ اور غالباً یہ اس کا واحد عمل تھا جس میں کسی قسم کا حجاب مانع کبھی نہ ہوا۔ اس وقت کا فیض ہماری نگاہوں میں ایک تعلیم یافتہ تیتین چہرے والا انسان تھا جو محبت کے جنون میں کھویا ہوا رہتا تھا۔ ہمارے دل خود بخود اس کی طرف مائل ہو جایا کرتے تھے۔ اور ہر شخص اس کے تجربات میں سے کچھ نہ کچھ ضرور اپنایا کرتا تھا۔ ہفتہ وار مشاعروں کا سلسلہ جاری تھا اور ہم فیض کے ان میٹھے نغموں کو سننے کے منتظر رہا کرتے تھے جن میں خود ہمارے درد دل کی حکایتیں سموئی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ ایک محبت کرنے والے دل ہی کا یہ حوصلہ تھا کہ اپنا سب کچھ لٹا کر محبوب سے صرف معمولی رحم کا طالب تھا۔ وہ اپنے محبوب کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتا اور اس کی ذات میں وہ تمام وصف ڈھونڈنے کی کوشش کرتا رہتا جو حسن و رعنائی اور تقدیس سے عبارت ہیں۔ اس بات سے قطع نظر کہ وہ قدرتی ہوں یا مصنوعی۔ یہی وہ اثرات ہیں جن سے فیض کی شاعری مملو نظر آتی ہے۔ اکثر ایسے لوگ جو حال کی بے رحم حقیقتوں سے کنارہ کش ہو کر اپنے گزرے ہوئے بچپن کی خوشیوں میں کھوئے رہتے ہیں۔ انہیں فیض کی اس عادت کا توجہ گر پایا ہے کہ فیض اس طرح اپنی طفلانہ خوشیوں اور منتظر لگاریوں کے جذبات کی حدود سے اکثر آگے نکل گیا ہے۔

شاعری کے لحاظ سے فیض کا محبوب وہی اردو اور فارسی شاعری کا محبوب ہے جو بے پناہ تقدس کا حامل ہے اور جسے اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی دنیا کے درد و غم کا کوئی احساس نہیں۔ اس کا کام صرف اپنے حسن و جمال کو دوبالا اور نمایاں کرنا ہے اور اس کی فکری صلاحیتیں صرف اسی نقطے پر مرکوز رہتی ہیں کہ وہ اپنے چاہنے والوں کے ہر سوال پر نہیں کہنے کا عادی ہو۔ تاکہ عاشقوں کے دل ہمیشہ رنج و تعب میں گرفتار رہیں۔ اسے رقیب پیدا کر لینے میں بھی کوئی عار نہیں ہوتا۔ اور عاشق پر طرح طرح کے ظلم ڈھانے کے لئے وہ رقیب پہ لطف و کرم کی بارشیں کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ فیض انتہا پسند اہل فکر نوجوانوں کی صف میں ہوتے ہوئے بھی ان غم آگیں داستانوں سے ناواقف نہیں تھا جو امیر و غریب کے درمیان جنگ کا سبب تھیں۔ عاشق غریب کو اپنے محبوب کا گن گانے ہوئے بھی محروم محبت ہی رہنا پڑتا تھا اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ وہ خود اور اس جیسے دوسرے بھلے لوگ کس کس طریقے سے زندگی کے شدائد کا مقابلہ کرتے رہتے ہیں۔

فیض کی اس عاشق مزاج فطرت کو جو اس وقت ایک تجربہ کار لیکن ذکی الحس نوجوان پروفیسر کے روپ میں جلوہ گر تھی، دوسری عالمی جنگ کے دوران جلد جلد کچھ سبق بھی حاصل کرنا پڑے۔ ان میں سے بعض یہ تھے کہ لاکھوں انسان اپنی مجبوریوں کی بنا پر ہوس اقتدار کی بھینٹ چڑھ گئے۔ وہ فلسفہ جدید جس نے انسان کی ذات کو تصور املاک پر ترجیح دی۔ امتحان کی کسوٹی پر کامیاب ثابت ہوا۔ اور یہ کہ جدید زمانہ کی عورت ایسی روح اور ایسے دور کی مالک ثابت ہوئی کہ

تنہائی میں بیٹھ کر اپنے عاشق کی یاد میں رونے دھونے کا کام اسے پسند نہ آیا یہی وہ وقت تھا کہ فیض کی شاعری نے ایک نیا موڑ اختیار کر لیا اور رفتہ رفتہ بادی النظر میں گیت الاپنے والا یہ انسان کسی صورت میں بھی زرہ پوش فوجی مصاحب نہ بن سکا بلکہ وہ اپنی ذات میں کاڈویل سے زیادہ مشابہ ہوتا گیا۔ جو اسپین کی کسی خندق میں اپنی رائفل تھامے ہوئے کسی کی گھات میں بیٹھا ہو۔ محبوبہ کی یاد ذہنی طور پر اور بھی تسکین کا سہارا بن گئی۔ اور وصل و ہجر کے لمحات کا تاثر اور گہرا ہوتا گیا ان حالات میں خوش قسمتی سے فیض نے جسمانی لذت اور کیف و انبساط سے دلچسپی نہ چھوڑی بلکہ اب اس انسانی پیکر میں جو شخصیت جھلکتی نظر آئی وہ ایک سچے دوست، ایک فلاسفر اور ایک رہنما کی شخصیت تھی۔ اب اس کی محبوبہ میدان جنگ میں بھی اس کے ساتھ تھی اور اس کے دوش بدوش رہ کر دشمنوں سے مقابلہ کرتی تھی اب اکرنا ان کے فرائض میں داخل نہ تھا بلکہ ان کی زندگی کا تقاضا ہی یہی تھا۔

عالمی جنگ سیاسی و معاشرتی انقلاب کا ایک طوفان لے کر آئی تھی جس کی وجہ سے اس کے مثبت و منفی پہلو اجاگر ہو گئے تھے تاکہ بنی نوع انسان ان میں سے کوئی ایک پہلو اپنے لئے منتخب کر سکے۔ اس کا بہترین اندازہ فرانس کی ہنگامی محاذ کے سپاہیوں کے ان گیتوں سے ہوتا ہے۔ جو انھوں نے زندانوں میں اس رات گائے تھے۔ جس کی صبح ان کے لئے نازیت کی طرف سے پیغام اجل لے کر آئی تھی ؎

یوں تیری قید میں رہنے پہ جو مجبور رہیں ہم　　کیا کہیں اپنا مقدر ہے کہ معذور رہیں ہم
موت کا جام نگاہوں میں ہے، پینا ہوگا　　صبح ہوتے ہی نہ ہم ہوں گے نہ جینا ہوگا

اس جنگ کے ختم ہو جانے کے بعد بھی حساس دلوں کو ایک سخت مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ ایک اذیت ناک انتخاب سے دوچار تھے۔ ان کے ذہنوں میں یہ سوالات اٹھ رہے تھے کہ شرمناک مصالحت اور تکلیف دہ وفاداری میں سے کسے اپنایا جائے عافیت کوشی کے مذموم جذبوں کو ترجیح دی جائے کہ سکوں پاش شدائد کو ؛ جسمانی لذتوں سے حظ اٹھایا جائے کہ روحانی آسائش کو ڈھونڈا جائے ! حملے کے طور پر ملنے والے ردّ عمل ہی پر قناعت کی جائے یا ترقی پسندی کے نظریات کو اپنایا جائے۔ خوف گناہ پر غالب آیا جائے کہ حصول ثواب کی سعی جاری رہے ؛ انتخاب کی اس پر جوش لہر نے پورے ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے اہل فکر کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ یہی وہ براعظم ہیں جنہوں نے خاموشی کے ساتھ انسانیت عفریت کو جنگ کے میدانوں میں خاک و خون میں لت پت ہوتے دیکھا تھا۔ لیکن اب وہ ان داخلی و خارجی اہانتوں اور ناانصافیوں کے خلاف شور و غوغا کر رہے تھے۔ جن کے ظلم و ستم کا نشانہ وہ مدت سے بنے رہے۔

فیض بہرکیف اپنے لئے ایک راستہ متعین کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ پچھلی عالمی جنگ سے اس کی شاعری ان تمام انقلابات کی عکاسی کرتی چلی آ رہی ہے۔ جنھوں نے کرۂ ارض کو اپنی آغوش میں لے رکھا تھا۔ ۱۹۵۲ء ہی میں اس نے افریقہ میں آنے والے انقلاب کی آندھی کو محسوس کر لیا تھا۔ اور یہی وہ زمانہ تھا جب منٹگمری جیل کی تنگ و تاریک کوٹھری میں بیٹھ کر اس نے اپنی مشہور نظم "آجاؤ افریقا" لکھی تھی۔ وہ روزن برگ گھرانے کی معیت میں بھی رہا۔ اور یہ ایسا زمانہ تھا کہ روزن برگ نے موت کو ہتک آمیز زندگی پر ترجیح دے رکھی تھی۔ جب وہ ان ایرانی طلباء کی مدح کرتا ہے جنہوں نے اپنے لبوں کے یاقوت، اپنی آنکھوں کے زمرد اور اپنے خون کی سنہری اشرفیوں سے امن و ترقی کی دیوی کو تزئین بخشی تھی تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے وہ ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے نوجوانوں کی امنگوں کا عکاس ہے۔ وہ بار بار ہندوستان کی طرف لوٹتا ہے تاکہ وہ اپنی شاعری کے ذریعے ملک کو صدیوں کی پس ماندگی سے نکالنے کے لیے اپنے ہم وطنوں کی

مسرتوں اور نامرادیوں کو بیان کر سکے۔ ملی شاعری یقیناً ادب کا بہترین سرمایہ ہے۔ فیض فلاح انسانیت کے لیئے جذباتی وابستگی کے عالم میں اپنے آپ کو نہ بھولا۔ اس دور میں اس نے چند عمدہ نظمیں کہیں۔ لیکن یہاں بھی دہی دوئی کا احساس غالب ہے اور بعض اوقات تو ان دونوں قسم کی محبت کے جذبات میں امتیاز کرنے کی ضرورت بھی محسوس ہوتی ہے اور کبھی کبھی وہ متضاد جذبات سے کھیل کر اپنے لئے مزید الجھنیں پیدا کرنے کا سامان بھی مہیا کرتا ہے۔

اس عہد کے شاعروں میں غالباً فیض ہی وہ تنہا شاعر ہے جس نے دورِ حاضر کے انسان کی جذباتی زندگی کو پوری صداقت سے پیش کیا ہے اور ایسا کرتے ہوئے عام اردو شعراء کی طرح اسے بھی دو مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا ہے پہلی یہ کہ اردو زبان نے جدید دور کے سائنسی انکشافات اور نئے نئے ادبی رجحانات کا ساتھ نہیں دیا۔ فیض خوش قسمتی سے انگریزی زبان سے بخوبی واقف ہے۔ اسی لیئے اپنے اردگرد کی دنیا سے باخبر بھی ہے۔ لیکن شاعرانہ انداز میں ان باتوں کو انگریزی سے اردو میں ڈھالنا کوئی آسان بات نہیں جن سے اردو زبان ابھی تک نابلد ہے فیض کو اپنے سامعین کی ذہنی وسعتوں کا خیال رکھنا بھی منظور ہے تاکہ مشاعروں میں جہاں اشعار داد حاصل کرتے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ فیض کے اشعار بے اثر ہو کر رہ جائیں۔ دوسری مشکل یہ ہے کہ عربی و فارسی میں عوامی حکایتوں کے تمثیلی رموز کنائے جدید ذہن کو متاثر کرنے میں چنداں کامیاب ثابت نہیں ہوئے۔ چرخِ اخضری اور گنبدِ نیلوفری کے تمام متصورہ مناظر اب قصہ پارینہ بن چکے ہیں۔ اب تو آسمان کی انتہائی بلندیوں تک پہونچنے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ اور فرشتوں سے زیادہ مریخ کی آبادی کو معلوم کیا جا رہا ہے۔ لامکاں کی قید میں گھری ہوئی کسی ہستی کا ادراک کرنے کے لیئے اب پانچ ارب سالوں سے بھی زیادہ زمانی مدت درکار ہے۔ اس طرح عبد و معبود کے درمیان ذاتی رابطہ کا امکان ہی ختم ہو جاتا ہے اور نہ ہی اس کے لیئے انسان کے تقدس آدم ہم ہونے کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ اسی لیئے ایسے کنائے جو رسمی یا تشبیہی طور پر مستعمل ہوتے رہتے ہیں جیسے خدا، شیطان، جبرئیل، جنت، دوزخ، آدم، حوا اور اسی قبیل کے دوسرے استعارے آج کی دنیا کے لیئے اسی طرح ناقابل فہم ہیں جس طرح ہومر کے زمانے کی لاطینی زبان۔ بھلا یہ کیا ضروری ہے کہ اپنے جذبات کے اظہار اور اپنی زندگی کا مقصد معلوم کرنے کے لیئے گھوم پھر کر انہی راہوں کو تکتا رہے جہاں ان گنت صدیوں کی جولان گاہ رہ چکی ہیں۔

آج کی دنیا ماضی سے اچانک اپنا ناطہ توڑ بیٹھی ہے۔ یہ اس کا ماہیتی انقلاب ہے۔ جس کی وجہ سے پرانے اندازِ فکر اور اسلوب بیان پر تباہ کن اثرات کا ہونا لازمی ہے۔ موجودہ معاشرے ہی کو لیجئے شہنشاہیت تو قریب قریب ختم ہو چکی ہے اور اس کے بچے کچھے آثار اب تو یورپ کی سیرگاہوں اور عجائب گھروں ہی میں نظر آتے ہیں۔ آج ہتھوڑے سے کام کرنے والے مزدور کا زمانہ ہے۔ یہی مزدور ترقی کر کے تجربہ کار انجینئر کے درجے تک پہونچ گیا ہے۔ اور ایک معمولی کسان جو کل تک صرف ہل ہاتھ میں لیئے کشاورزی کیا کرتا تھا آج ٹریکٹر چلانے میں مصروف ہے۔ ہمارے سماجی ڈھانچے میں اس قسم کے اضافے بڑی تیز رفتاری سے عمل میں آ رہے ہیں اور اب ہیرو کا قدیم تصور بھی مضحکہ خیز سا بن چکا۔ پرانے زمانے کے بڑے بڑے فاتح اس ہائیڈروجن بم کے زمانے میں ایک معمولی سپاہی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے فیض نے اپنی ایک انگریزی نظم میں کہا ہے۔

بے زمانی کے بطن سے زماں کی ولادت
عام ولادت کی طرح
درد، امید، خوشی اور ادراک کی حامل ہوتی ہے

اور پاکستان میں اس کی ولادت
ایشیا اور افریقہ کے دوسرے نو آزاد ممالک کی طرح
ابھی تک آزادی کے اس ننھے سے پرچم کی مانند ہے۔
جو خوف، بھوک، مصیبت اور موت کی
نبرد آزما صفوں میں لہرا دیا گیا ہے۔

ان تصورات کی روشنی ہی میں فیض کی شاعری کا صحیح ادراک بہ آسانی ہو سکتا ہے۔ فارسی زبان کی ایک مشہور کہاوت ہے "شعر مرا بمدرسہ کہ برد؟" فیض کی شاعری معنی آفریں ہوتے ہوئے بھی اتنی نازک اور لطیف واقع ہوئی ہے کہ پورے طور پر اس کا تجزیہ کرنا بہت مشکل ہے۔ انگریزی زبان میں اس کا ترجمہ کرنے سے سارا لطف زائل ہو جاتا ہے، اس سے پورا پورا حظ تو وہی باذوق حضرات اٹھا سکتے ہیں جو عربی، فارسی اور اردو شاعری کی خوبیوں اور نزاکتوں سے بخوبی آشنا ہیں۔ انقلاب پسندی کے رد عمل سے بھی فیض کی شاعری میں کوئی تموج پیدا نہیں ہوا جیل کی چار دیواری میں جب اسے اپنے ایک ساتھی کی موت کا علم ہوتا ہے تو وہ اپنی شاعری سے لوگوں کو بغاوت پر آمادہ کرنے کا کام نہیں لیتا۔ بلکہ اس کے جذبات ساتھی کی میت کو دیکھ کر سرد آہوں میں ڈھلنا شروع ہو جاتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ مشاعروں کے لیے فیض اب ختم ہوتا جا رہا ہے اور اس کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ وہ زیادہ تر اپنے جذبات میں کھویا رہتا ہے۔ اور وہ بھی ایسی دنیا میں رہتے ہوئے جہاں فکری شعبدے دکھانے کی خاطر دنیا اندھیروں سے نکل کر اجالے کی طرف دوڑتی جا رہی ہے —— اور دیکھا جائے تو وہی شاعر مشاعروں کی جان ہوا کرتے ہیں۔ جو ایسی دنیا کا ساتھ دینے والے ہوں۔

بعض اوقات میری یہ خواہش ہوتی ہے کہ اے کاش! فیض اپنے آپ کو فارسی شاعری کے تجریدی کنایوں سے آزاد کر دے جو اس کے اسلوب نگارش کو بھاری بھر کم بنائے ہوئے ہیں اور جن کی وجہ سے قارئین فیض کو بھی جوئے عجم کے کنارے کنارے ہرے بھرے گلستانوں میں پہونچنے کے لیئے بڑی مسافت طے کرنی پڑتی ہے۔ آخر راوی کنارے کی شام کا ذکر کیوں نہیں ہوتا؟ مارچ کے مہینے میں پنجاب کے گندم بھرے سنہری کھلیانوں کی دل کشی کہاں چلی گئی۔ بسنت پر سرسوں کی وہ نرم و نازک لہلہاہٹ فکر کے لیئے کیوں مہمیز ثابت نہیں ہوتی؟ کیا ہی اچھا ہو کہ ہمارا دیہاتی ترجمان جو گاؤں کی پر مشقت زندگی سے منہ موڑ کر بھاگ رہا ہے پھر ان مناظر سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کرے۔ تاکہ ہم فیض کو دوبارہ حقیقی اور واقعی طور پر اپنے درمیان پا سکیں۔

— جو شعر پڑھنے والے کے دل میں کسی نوع کی جذباتی کیفیت مرتب کرے، اچھا شعر ہے۔ اور یہ بہت حد تک صحیح بھی ہے۔ ہر شعر عام طور سے ایک جذباتی تجربے کا آئینہ ہوتا ہے اور اگر پڑھنے والا اس کے جذباتی پہلو سے متاثر نہیں ہوتا تو شاعر کا اظہار کامیاب نہیں۔ لیکن تاثرات کو انواع میں تقسیم کرنا، اور پھر نوع کو بجائے خود ایک خوبی تصور کر لینا بہت گمراہ کن ہے۔ — فیض

احمد علی خاں

فیض ایک صحافی

پاکستان کے نامور صحافی احمد علی خاں نے ڈان دہلی سے اپنی صحافتی زندگی کا ۴۶ء میں آغاز کیا۔ قیام پاکستان کے بعد وہ کراچی آگئے اور ۴۹ء تک ڈان کراچی میں اسسٹنٹ ایڈیٹر رہے۔ ۴۹ء میں وہ پاکستان ٹائمز سے وابستہ ہو گئے اور دس سال تک اسسٹنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے اور اپریل ۵۹ء سے مئی ۶۲ء تک ایڈیٹر کی حیثیت سے گراں مایہ خدمات انجام دیں۔ اسی دوران میں انہیں فیض صاحب کے ساتھ کام کرنے کا موقع بھی ملا۔ چنانچہ فیض کی صحافیانہ زندگی پر احمد علی خاں کے ذاتی تجربے و مشاہدے کی صداقت مسلّم ہے۔ ہماری خصوصی درخواست پر انہوں نے ۲۴ سال کے بعد پہلی بار اردو میں یہ اہم مضمون لکھا ہے جس کے لئے ہم ان کے شکرگزار ہیں۔ ان دنوں آپ ڈان کراچی کے ادارے سے منسلک ہیں اور مشہور کالم Matters of the Moment لکھتے ہیں۔ (ادارہ)

فیض صاحب کو اخبار نویسی چھوڑے ہوئے کئی سال گزر چکے ہیں اور آج کل ان کا تعلق درس و تدریس سے ہے۔ بظاہر یہ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے کہ صحافت سے علیحدگی کے باوجود فیض صاحب صحافیوں کی کسی محفل میں کبھی اجنبی نہیں معلوم ہوتے۔ بلکہ سنجیدہ اخبار بین طبقہ انہیں اب بھی صحافت سے منسلک سمجھتا ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت اور اعتراف ہے کہ فیض صاحب کی صحافت سے وابستگی نے، جس کا عرصہ خاصا مختصر رہا، چند اہم اور یادگار اثرات چھوڑے ہیں۔

فیض صاحب نے صحافت کے میدان میں اس وقت قدم رکھا جب ملکی صحافت ایک نئے دور میں داخل ہو رہی تھی۔ تقسیم سے سال بھر پہلے تک برصغیر پاکستان و ہند میں جہاں کئی کثیر الاشاعت انگریزی روزنامے کانگریس کے ہمنوا تھے وہاں صرف تین قابل ذکر انگریزی روزنامے تحریک پاکستان کے حامی تھے۔ "ڈان" دہلی سے نکلتا تھا اور "اسٹار آف انڈیا" اور "مارننگ نیوز" کلکتے سے۔ ان دنوں اس علاقے میں جو اب مغربی پاکستان کہلاتا ہے انگریزی کے چار قابل ذکر روزنامے تھے۔ "ٹریبیون" اور "سول اینڈ ملٹری گزٹ" لاہور سے شائع ہوتے تھے اور "سندھ آبزرور" اور "ڈیلی گزٹ" کراچی سے۔ یہ چاروں اخبار غیر مسلموں کے ہاتھوں میں تھے اور ان میں سے کوئی بھی تحریک پاکستان کا موئید نہ تھا۔ ۱۹۴۷ء کے آغاز میں پنجاب کے مسلم لیگی رہنماؤں نے اس کمی کو شدت سے محسوس کیا۔ جب میاں افتخار الدین مرحوم نے "پاکستان ٹائمز" کی بنیاد ڈالی تو گویا دو کام بیک وقت انجام دیئے۔ ایک تو پاکستان کی تحریک کو جو نہایت نازک موڑ پر پہنچ چکی تھی، تقویت پہنچائی اور دوسرے نوزائیدہ مملکت کی آئندہ صحافت کی سمت اور معیار کا نشان دیا۔ لفظ پاکستان کے شیدائی پہلے تو "پاکستان ٹائمز" کے نام ہی پر جھوم اٹھے اور پھر بہت جلد اس اخبار کے صحافتی معیار اور اس کے پروقار اور متین انداز سے متاثر ہونے لگے۔

میاں افتخار الدین مرحوم کے ایک سیاسی شخصیت تھے اور ان کے مخالفین کی تعداد ان کے موافقین سے کم نہیں تھی۔ لیکن یہاں ان کی سیاست کا یا ان کی رہنمائی میں "پاکستان ٹائمز" کے سیاسی رحجانات کا ذکر بے محل ہے۔ البتہ ان کے مخالفین بھی اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ میاں صاحب مرحوم نے اپنے ضمیر کی روشنی میں ملکی صحافت کی اہم خدمت انجام دی۔ اخبار کے منتظمِ اعلیٰ کے طور پر انھوں نے جس اہلیت کا ثبوت دیا وہ اب بھی صحافتی اداروں کے منتظمین کے لئے ایک روشن مثال ہے۔ میاں صاحب بخوبی جانتے تھے کہ کوئی اخبار ایک قابل مدیر اور تجربہ کار اسٹاف کے بغیر اچھے صحافتی معیار پر پورا نہیں اتر سکتا۔ چنانچہ انہوں نے فیض صاحب کو مدیر بننے کی دعوت دی اور ادارتی عملے کے لئے اچھی ٹیم منتخب کرنے کا نہ صرف موقع دیا بلکہ اس کام میں ذاتی طور پر ان کی مدد بھی کی۔ سفارشوں کو وہ یہ کہہ کر ٹال دیا کرتے تھے کہ انتخاب کا حق ایڈیٹر کو ہے۔ دوسرا انھوں نے اس اصول کو اپنایا کہ اگرچہ اخبار کی انتظامیہ بنیادی پالیسی بنانے کی مجاز ہے مگر اسے یہ حق نہیں پہنچتا کہ ایڈیٹر کے روزمرہ کے کام میں مداخلت کرے۔ اخبار نویسی میں اس اصول کی اہمیت مسلمہ ہے۔ اگر اسے رد کیا جائے تو ایڈیٹر تجارتی مصلحتوں سے بلند اور مخصوص مفادات اور بااثر شخصیتوں کے دباؤ سے محفوظ نہیں رہتا اور نہ اس کا اہل ہوتا ہے کہ غیر جانبداری سے عوامی مفادات کی نگہداشت کر سکے۔ آج یہ کہنا مشکل ہے کہ ہمارے اخبارات کے سارے مالک اور منتظمین ان اصولوں پر کاربند ہیں۔

فیض صاحب نے جب ادارت کا بوجھ سنبھالا تو وہ اس ذمہ داری کے لئے نئے تھے۔ لیکن ان میں اس کام کی بنیادی صلاحیتیں موجود تھیں ـــــ علمی لیاقت، سیاسی ادراک، تاریخ کا شعور، معاشرے کے مسائل کا علم، ادب پر گہری نظر اور اچھی انگریزی یا اردو میں لکھنے کی صلاحیت۔ فیض صاحب نے اپنی صلاحیتوں کا پورا استعمال کیا۔ ان کے اداریئے اپنی سلاست، شگفتگی اور ادبیت کے باعث ابتدا ہی سے مقبول ہوئے۔ ملک کے سیاسی مسائل پر فیض صاحب کے تبصرے وسیع حلقے میں پڑھے اور پسند کئے جاتے تھے۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ قیام پاکستان کے کچھ عرصے بعد نواب ممدوٹ اور میاں ممتاز دولتانہ کی باہمی چشمک کی وجہ سے پنجاب مسلم لیگ دو متحارب گروہوں میں بٹ گئی تھی۔ اس قسم کے جھگڑے مشرقی بنگال اور سندھ میں بھی شروع ہوگئے تھے۔ اس گروہ بندی کا تعلق اصولی اختلافات سے نہیں تھا بلکہ اس کی تہہ میں ذاتی مفادات کارفرما تھے یہ ابتدا تھی اس بے اصولی اور سیاسی انتشار کی جس نے آگے چل کر جمہوریت کو بہت نقصان پہنچایا۔ چنانچہ اس بے راہ روی پر فیض صاحب نے متعدد اداریئے لکھے جن میں مسائل کا دیانتدارانہ تجزیہ پیش کرنے کے علاوہ طنز کے ہتھیار کا بھی خوب خوب استعمال کیا گیا تھا۔ ان کے علاوہ تعلیمی اور ثقافتی مسائل پر بھی کئی فکر انگیز اداریئے لکھے جو کافی مقبول ہوئے۔

ہر اخبار و جریدہ اپنے ادارتی عملے کے مزاج، ذہنی ساخت اور انداز نظر کا عکاس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دو اخبار ایک ہی پالیسی کے ہمنوا ہوتے ہوئے بھی کبھی ایک جیسے نہیں ہوتے۔ پاکستان ٹائمز کا انداز اور پالیسی متعین کرنے میں فیض صاحب کا بڑا ہاتھ تھا۔ لیکن یہاں اس طریقہ کار کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے جو انھوں نے ادارتی امور کو طے کرنے کے لئے اختیار کیا۔ کام شروع ہونے سے پہلے روز صبح ایک میٹنگ ہوتی تھی جس میں اس روز کی اشاعت کا جائزہ لیا جاتا تھا اور دوسرے روز کے لئے پروگرام کے سلسلے میں خاصی تفصیل سے بات چیت ہوتی تھی۔ اس میٹنگ میں تمام شرکاء کھل کر اپنی رائے دیتے تھے۔ اس جمہوری طریقہ کار سے بڑا فائدہ تھا کہ اسٹاف کا ہر سینئر رکن اخبار کی پالیسی اور اس کے معیار کو اپنی ذاتی ذمہ داری تصور کرتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اختلاف رائے کی صورت میں فیصلہ ایڈیٹر کے ہاتھ میں ہوتا تھا لیکن آزادانہ بحث اور خود تنقیدی کے باعث کوتاہیوں کو دور کرنے میں آسانی

پیدا ہو جاتی تھی اور اکثر بہتری کی شکل ان میں نکلتی تھیں۔ فیض صاحب آزادیٔ گفتار کے اتنے قائل ہیں کہ کسی کے منہ پر اس کی بات کی تردید نہیں کرتے خواہ بات کتنی ہی مہمل ہو چنانچہ ایڈیٹوریل کانفرنس میں بھی اکثر دس معقول باتوں میں چند بے حد ناقابلِ عمل خیالات پیش ہوتے تھے کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ کوئی صاحب بولے چلے جا رہے ہیں اور اس کا خیال نہیں کرتے کہ سب کا وقت ضائع ہو رہا ہے۔ اکثر لوگ چڑ جاتے تھے لیکن فیض صاحب کے چہرے پر بیزاری کی کوئی جھلک نہیں آتی تھی۔ غالباً وہ جانتے تھے کہ میٹنگ کی افادیت کی خاطر یہ چیزیں برداشت کرنا ضروری ہیں۔

فیض صاحب بنیادی طور پر شاعر ہیں (اگرچہ جن لوگوں نے انہیں اخبار میں انہماک سے کام کرتے دیکھا ہے یہ دعویٰ کریں گے کہ وہ بنیادی طور پر صحافی ہیں) شاعر کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ سیاستداں یا فلسفی یا مفکر بھی ہو۔ لیکن جو شعرا اپنی شخصیت کے بہت سے پہلو رکھتے ہیں ان کا مکمل اظہار صرف شعر کے ذریعے نہیں کر پاتے انھیں اظہار و ابلاغ کے لئے دوسرے راستے بھی ڈھونڈنے پڑتے ہیں صحافت فیض صاحب کے لئے ایسا ہی ایک راستہ ثابت ہوئی اور اپنی سماجی اور سیاسی فکر کا اظہار انھوں نے پاکستان ٹائمز کی تحریروں میں کیا۔

ایک لحاظ سے ان کے شعر کے قدردانوں کو صحافت کا شکرگزار ہونا چاہیے کہ اس کی وجہ سے ان کی شاعرانہ صلاحیت، بے ساختگی اور پاکیزگی برقرار رہی۔ ورنہ ان کے شعر کو اس سارے بوجھ کا متحمل ہونا پڑتا۔ بہرحال اس معاملے سے قطع نظر اس بات کا اعتراف ضروری ہے کہ فیض صاحب صحافیوں کے اس چھوٹے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جس نے پاکستانی صحافت کا رخ اور معیار متعین کرنے اور اس کی ترقی کے لئے رستہ صاف کرنے میں قابلِ قدر خدمت انجام دی ہے۔ ان کے دور کے ساتھی جو اب بھی صحافت میں ہیں ان کے اس رول کو کبھی نہیں بھول سکتے۔

شاعرِ باعمل (صفحہ ۴۰۳ سے آگے)

کاش! فیض کا یہ پیغام جمہوری نظام کے مؤیدین کے علاوہ آمریت اور اشتراکیت کے پرستاروں کے گوش شنوا تک پہنچتا اور خروشچوف جیسے قائدِ امن عالم کو بھی زبان کھولنے اور لبِ گفتار ہلانے کی جرأت دلا دیتا! مجھے اشتراکی نظام سے اسی مقام پر سب سے بڑا اختلاف ہے۔ اس نے پورے ملک کے ذہن کو ایک خاص سانچے میں ڈھالنے کی غرض سے اختلافِ رائے و اظہارِ خیال پر ایسی پابندیاں لگا دی ہیں کہ ان کا کل کا سب سے بڑا قائد اس طرح خاموش ہے کہ جیسے قدیم ایام کی طرح اس کی زبان گدی سے کھینچ لی گئی ہے۔

بہرحال ہر ملکے و ہر رسمے اور اپنی اپنی پسند!

فیض قابلِ قدر اس لیے ہیں کہ وہ شاعرِ باعمل ہیں۔ ان کی شاعری صداقت پر مبنی ہے۔ ان کے قول و عمل میں مطابقت ہے۔ ان کا کلام ان کے حقیقی جذبات کی ترجمانی کرتا ہے اور باوجود اشتراکی نظریات کی پرستش کے وہ صحیح و صالح انسانی اقدار کی تبلیغ کرتا ہے اس میں اخوت، و مساوات، شرافت و حمیت، و قربانی، مروت و غیرت، دلداری و دل دہی و دلبری سے ساری خصوصیتیں موجود ہیں نہ تو فیض نے قدیم روایات سے رشتہ توڑا ہے اور نہ وہ زور ترقی پسندی میں شعر کی نغمگی و شیرینیا کھو بیٹھے ہیں۔ وہ بات کے دھنی ہیں اشتراکیت کے پیام بر ہیں اور ان کی نرم گفتاری میں دلوں کے جیتنے کے ڈھب ہیں اور ان کا دل مصطفیٰ جیسی مشعل ہے۔ اس لئے ان کے کلام کو "جزویست از پیغمبری" کہنا نامناسب نہ ہوگا۔

فضیل جعفری

فیض کا اسلوبِ شاعری

فیض کی شاعری کو عظیم اور اس درجہ مقبول بنانے میں ان کے مخصوص و منفرد اسلوب کا بڑا ہاتھ ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہر صاحبِ اسلوب شاعر قطعیت کے ساتھ بڑا شاعر نہیں ہوتا، لیکن یہ بات بھی اتنی ہی سچ ہے کہ ہر بڑا شاعر ایک خاص اسلوب کا مالک ہوتا ہے، کیونکہ بڑا شاعر ہمیشہ زندگی اور اس کے متعلقات کے بارے میں ایک خاص طریقے سے غور و فکر کرتا ہے۔ اس کے کچھ اپنے انتہائی ذاتی لیکن گہرے تجربات و مشاہدات ہوتے ہیں جنہیں وہ اپنے پڑھنے والوں تک منتقل کرتا ہے اور جن پر اس کی شخصیت کی گہری چھاپ ہوتی ہے۔

اسلوب کیا ہے؟ یہ ایک متنازعہ فیہ مسئلہ ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے شاعری کیا ہے، یا ادب کیا ہے؟ لیکن اب تک اسلوب کی جو جامع ترین تعریف کی جا سکی ہے اس کے مطابق اسلوب کسی فن کار کی مجموعی شخصیت کے مکمل اظہار کا نام ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شاعری میں، اسلوب سے مراد صرف طرزِ بیان نہیں، بلکہ یہ صرف اسلوب کا ایک عنصر ہے اور جو دوسرے عناصر مثلاً شاعر کے سوچنے اور محسوس کرنے کا ڈھنگ، لہجہ، الفاظ کا انتخاب و ترتیب، مواد اور موضوع وغیرہ سے گھل مل کر ایک خاص اور مکمل شکل اختیار کرتا ہے۔

متذکرہ باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے جب ہم فیض کے اسلوبِ شاعری کی بابت سوچتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کا اسلوب ایک ایسا تخلیقی اسلوب ہے جس میں زندگی کی حرکت اور توانائی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ہمیں ان کے اسلوبِ شاعری میں بہتے ہوئے دریا کی روانی اور بے باکی بھی ملتی ہے اور زلفِ جاناں کی خوشبو بھی۔ یہ شعلۂ جوالہ کی طرح تند و تیز بھی ہے اور گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح نرم و نازک بھی۔ فیض نے عصری زندگی کا بڑی باریکی سے مطالعہ و مشاہدہ کیا ہے۔ وہ جدید انسانی ذہن کی تمام الجھنوں اور نفسیاتی پیچیدگیوں سے واقف ہیں۔ فیض کا اسلوب زندگی کے ہزار شیوۂ حسن کی دین ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں غمِ جاناں اور غمِ دوراں، دونوں الگ الگ راستوں پر نہیں، بلکہ پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے نظر آتے ہیں، اور اپنی نظم "دو عشق" میں اگر غمِ محبوب میں اس حد تک بے قرار ہوتے ہیں کہ

تنہائی میں کیا کیا نہ تجھے یاد کیا ہے
کیا کیا نہ دلِ زار نے ڈھونڈی ہیں پناہیں

آنکھوں سے لگایا ہے کبھی دستِ صبا کو
ڈالی ہیں کبھی گردن مہتاب میں بانہیں

تو دوسری طرف اتنی ہی شدتِ احساس و صداقتِ جذبات کے ساتھ اس حقیقت کا بھی اظہار کرتے ہیں کہ ؎

چاہا ہے اسی رنگ میں لیلائے وطن کو
تڑپا ہے اسی طور سے دل اس کی لگن میں
ڈھونڈی ہے یونہی شوق نے آسائش منزل
رخسار کے خم میں کبھی کاکل کی شکن میں

فیض کے اس پہلودار عشق نے ان سے ایسی نظمیں کہلوائی ہیں جن کا موضوع "پوری" زندگی ہے۔ جیسا کہ انگریزی کے مشہور نقاد مڈلٹن مرے (Middleton Murray) نے اپنے ایک مضمون میں کہا ہے کہ "شاعر کے موضوعات سخن کا اس کے اسلوب سے گہرا تعلق رہتا ہے"۔ ہمیں اردو کے موجودہ نظم گو شعراء میں فیض ہی ایسے تنہا شاعر دکھائی دیتے ہیں جن کی نظمیں موضوعات کی وسعت اور آفاقیت کی بنا پر فوراً پہچان لی جاتی ہیں۔ فیض نے عام انسان کی زندگی کے تپتے ہوئے صحرا اور محبوب کی سراپا گلزار شخصیت دونوں کے ساتھ برابر کا سلوک کیا ہے۔ وہ اپنی نظم "موضوع سخن" میں اس حقیقت کی جانب بڑا بلیغ اشارہ کرتے ہیں ؎

آج تک سرخ و سیہ صدیوں کے سائے کے تلے
آدم و حوا کی اولاد پہ کیا گذری ہے
موت اور زیست کی روزانہ صف آرائی میں
ہم پہ کیا گذرے گی اجداد پہ کیا گذری ہے

یہ ہر اک سمت پُراسرار کڑی دیواریں
جل بجھے جن میں ہزاروں کی جوانی کے چراغ
یہ ہر اک گام پہ ان خوابوں کی مقتل گاہیں
جن کے پرتو سے چراغاں ہیں ہزاروں کے دماغ

اور پھر اسی نظم میں تصویر کا دوسرا رخ بھی ملاحظہ فرمایئے ؎

آج پھر حسنِ دلآرا کی وہی دھج ہوگی
وہی خوابیدہ سی آنکھیں، وہی کاجل کی لکیر
رنگِ رخسار پہ ہلکا سا وہ غازے کا غبار
صندلی ہاتھ پہ دھندلی سی حنا کی تحریر

اپنے افکار کی، اشعار کی دنیا ہے یہی
جانِ مضموں ہے یہی، شاہدِ معنی ہے یہی

حسن اور زندگی کی دوسری قدروں کا یہ خوبصورت امتزاج، فیض کے اسلوب کی ایک نمایاں خصوصیت ہے جو انہیں دوسرے ہم عصر شعراء سے ممتاز کرتی ہے۔ ان کے اسلوبِ شاعری کی دوسری بڑی خصوصیت جو ہمیں نہ صرف مندرجۂ بالا اقتباسات میں بلکہ ان کی تمام نظموں میں ملتی ہے وہ ہے ان کے کلام کی پہلو دار اور بلیغ سلاست۔ بڑا شاعر صرف اپنے لئے یا صرف چند ذہین ترین لوگوں کے لئے ہی نہیں لکھتا۔ وہ تو پوری قوم بلکہ دنیا کی تمام قوموں کے لئے لکھتا ہے۔ ہمیں ہر زبان اور ہر ادب میں کثرت سے دوسرے اور تیسرے درجے کے ایسے شاعر مل جائیں گے جو تجربات اور احساسات کی گہرائی کی کمی پر پردہ ڈالنے کے لئے، اسلوب کی پیچیدگی کا سہارا لیتے ہیں۔ (فیض کے اسلوب کا کمال یہ ہے کہ وہ بڑی سے بڑی بات اور گہرے سے گہرے تجربہ کو اس سیدھے سادے لیکن لطیف انداز میں قاری تک منتقل کرتے ہیں کہ نہ فنی نفاست میں کوئی کمی آنے پاتی ہے نہ تاثر میں۔ فیض کی مشہور نظم "ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے"، جو ایتھل اور جولیس روزن برگ کی یاد میں لکھی گئی ہے۔ اپنی کئی دوسری اہم خصوصیتوں کے علاوہ، اسلوب کی گہری اور پہلو دار سلاست کا بھی بہترین نمونہ ہے) پوری نظم میں کہیں بھی قاری کا ذہن کوئی جھٹکا یا گرہ نہیں محسوس کرتا۔ لفظ بہ لفظ اور مصرع بہ مصرع پڑھنے والا اپنے آپ کو اونچا اٹھتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ اس کے دل و دماغ میں حقیقتوں کے چراغ روشن ہوتے چلے جاتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ نظم کا مرکزی خیال نہ صرف قاری کو پوری طرح متوجہ کرتا ہے بلکہ اپنی رواں دواں اور موزوں ترین بحر کے سہارے اس کے ہو میں تحلیل ہو کر جزوِ زندگی بن جاتا ہے ؎

تیرے ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت میں ہم
دار کی خشک ٹہنی پہ وارے گئے
تیرے ہاتھوں کی شمعوں کی حسرت میں ہم
نیم تاریک راہوں میں مارے گئے

جب گھلی تیری راہوں میں شامِ ستم
ہم چلے آئے لائے جہاں تک قدم
لب پہ حرفِ وفا دل میں قندیلِ غم

اپنا غم تھا گواہی ترے حسن کی
دیکھ قائم رہے اس گواہی پہ ہم
ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

طوالت کا خوف روک رہا ہے ورنہ جی تو چاہتا ہے کہ پوری نظم نقل کر دی جائے۔ فیض کے اسلوبِ شاعری کی یہ بھی ایک بڑی خوبی ہے کہ ان کی بیشتر نظموں میں ایک ایسی خوبصورت اور معنی خیز وحدت ہوتی ہے کہ نظم کو ٹکڑوں میں بانٹ کر پڑھنے سے مجموعی تاثر مجروح ہوتا ہے۔ ان کی اکثر نظمیں ایک اکائی کی طرح ابھر کر سامنے آتی ہیں جن کا ہر لفظ دوسرے لفظ سے، ہر مصرعہ

دوسرے مصرعے سے اور ہر خیال دوسرے خیال سے کچھ اس طرح متعلق و مربوط رہتا ہے کہ انہیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ خصوصیت فیض کی نہ صرف حیات و کائنات سے ہم آہنگی بلکہ ان کی شخصیت کی داخلی یکجہتی کا نتیجہ ہے۔ فیض کی نظم "ملاقات" اپنی دوسری تمام خصوصیتوں کے علاوہ اس معنی خیز وحدت کا بھی بڑا اچھا نمونہ ہے ؎

یہ رات اس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے
عظیم تر ہے - کہ اس کی شاخوں
میں لاکھ مشعل بکف ستاروں
کے کارواں، گھر کے کھو گئے ہیں
ہزار مہتاب، اس کے سائے
میں اپنا سب نور رو گئے ہیں

ہر اک سیہ شاخ کی کماں سے
جگر میں ٹوٹے ہیں تیر جتنے
جگر سے نوچے ہیں، اور ہر اک
کا ہم نے تیشہ بنا لیا ہے

یہ غم جو اس رات نے دیا ہے
یہ غم سحر کا یقیں بنا ہے
یقیں جو غم سے کریم تر ہے
سحر جو شب سے عظیم تر ہے

مندرجۂ بالا مصرعوں میں نہ صرف ہمیں موضوع کی عظمت اور مصرعوں کی اندرونی وحدت کا احساس ہوتا ہے بلکہ ان میں ہم ایک ایسے نرم و نازک لیکن کٹیلے لہجے سے دوچار ہوتے ہیں جو اردو شاعری میں سب سے الگ تھلگ ہی نہیں، ممتاز بھی ہے۔ فیض کے لہجے میں بلا کی نرمی و نغمگی اور کاٹ ہے۔ فیض کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ انتہائی نرم و لطیف الفاظ کی مدد سے گمبھیر سے گمبھیر موضوعات کو اس طرح قاری تک منتقل کرتے ہیں کہ قاری کا ذہن ان نرم و لطیف الفاظ کے پیچھے کام کرتی ہوئی برقی رووں کو آسانی سے اخذ کر سکتا ہے۔ برصغیر سے باہر فیض کی غیر معمولی مقبولیت کا ایک سبب ان کے لہجے کی آفاقیت اور آواز کی ہمہ گیر وسعت بھی ہے۔ فیض کی آواز ان کے ذہنی توازن و بلاغت کی آئینہ دار ہے۔ وہ کبھی براہ راست قاری کو کوئی اخلاقی یا سیاسی درس نہیں دیتے، بلکہ اپنی بات اور احساسات کا اظہار کچھ اس فن کارانہ چابکدستی سے کرتے ہیں کہ پڑھنے والا غیر شعوری طور پر ان کے لہجے کی متانت، خود اعتمادی اور روشنی کا گرفتار ہوتا چلا جاتا ہے۔ نظم ہو یا غزل ہر جگہ فیض کی یہ آواز الم نصیبوں اور جگر فگاروں کو ایک بھرپور شان سے ایقان و اعتماد کا نور بخشتی ہے۔ دل و دماغ کو ایک سوز ناصبور ناطاقت آگیں عطا کرتی ہے اور زندگی سے محبت کرنا سکھاتی ہے۔

ن۔م راشد نے فیض کے اولین مجموعۂ کلام "نقشِ فریادی" کے دیباچے میں لکھا تھا اور بالکل سچ لکھا تھا کہ:۔

"وہ عہدِ جدید کی شیطنت کو ضرور عریاں کرتا ہے کیونکہ اس کا تخیل مریض حقیقتوں کے روبرو ہو کر ان پر طعن کرنے پر مجبور ہے۔ لیکن وہ ان حقیقتوں کو خواب میں منتقل کرکے انہیں حسن کی پوشاک پہنانا جانتا ہے"

فیض کی آواز ارمان کے لہجے میں گھن گرج نہیں بلکہ ایک ایسی نرمی نغمگی اور گھلاوٹ ہے جس نے اُن کی شاعری کو گھن گرج والی اور بلند آہنگ شاعری کے مقابلے میں کہیں زیادہ دیرپا تاثر عطا کیا ہے۔ فیض کے اس لہجے کو کامیاب بنانے میں ان کے تاریخی شعور کو بھی بڑا دخل ہے اسی تاریخی شعور کی مدد سے انہوں نے اپنی مشہور نظم "نثار میں تری گلیوں پہ ...." میں کتنی خوبصورتی سے انسانی زندگی کی طویل دکھ درد تاریخ نظم کر دی ہے۔! ؎

یونہی ہمیشہ اُلجھتی رہی ہے ظلم سے خلق
نہ اُن کی رسم نئی ہے نہ اپنی ریت نئی
یونہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ اُن کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی

گر آج تجھ سے جدا ہیں تو کل بہم ہوں گے
یہ رات بھر کی جدائی تو کوئی بات نہیں
گر آج اوج پہ ہے طالعِ رقیب تو کیا
یہ چار دن کی خدائی تو کوئی بات نہیں

جو تجھ سے عہدِ وفا استوار رکھتے ہیں
علاجِ گردشِ لیل و نہار رکھتے ہیں

فیض کی پوری شاعری میں کہیں بھی مایوسی اور ناامیدی کے بادل چھائے ہوئے نظر نہیں آسکتے "گردشِ لیل و نہار" اُن کے لئے ناقابلِ علاج مرض نہیں۔ زندگی کے سخت ترین لمحوں میں بھی اُن کی آواز مضمحل نہیں ہو نے پاتی۔ اور شان کے لہجے کا بانکپن متاثر ہوتا ہے۔ جبکہ ان کی ہر نظم اور ہر غزل میں بے پناہ اور سدا بہار رجائیت نظر آتی ہے۔ انگریزی کے مشہور اور رومانوی دور کے نمائندہ شاعر شیلے کی طرح فیض پر یہ الزام نہیں لگایا جا سکتا کہ انہوں نے اپنی شاعری میں جن اصولوں کا پرچار کیا ہے ان کا حقیقی زندگی سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ فیض نے عملی طور پر بھی یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ سحر کی عظمت پر یقین رکھنے والے منزل دار و رسن سے بھی اسی بانکپن سے گزرتے ہیں جیسے کوچۂ جاناں سے۔ فیض کے پراعتماد لہجے کی ایک واضح مثال دیکھئے ؎

جو نہ ہوا اپنے قبیلہ کا بھی کوئی لشکر
منتظر ہوگا اندھیرے کی فصیلوں کے ادھر

ان کو شعلوں کے رجز اپنا پتا تو دیں گے
خیر ہم تک وہ نہ پہنچیں بھی، صدا تو دیں گے
دور کتنی ہے ابھی صبح بتا تو دیں گے   (دو رد آئے گا دبے پاؤں ....)

یہی احساس اور یہی جذبہ ہمیں فیض کی غزلوں کے اکثر اشعار میں بھی کارفرما نظر آتا ہے۔ مثلاً ایک غزل کے یہ دو شعر شعلوں کے رجز سے کم تر درجے کی چیز نہیں ہیں ؂

دل ناامید تو نہیں ناکام ہی تو ہے   لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے
دستِ فلک میں گردشِ تقدیر تو نہیں   دستِ فلک میں گردشِ ایام ہی تو ہے

فیض کے اسلوب شاعری کے متعلق بات ادھوری رہ جائے گی، اگر ان کی شاعری میں پائے جانے والے مخصوص استعاروں، تشبیہوں اور لفظی پیکر تراشی کا ذکر نہ کیا جائے۔ انگریزی کے مستند نقاد لوکس (F.L. Lucas) نے اپنی کتاب Style میں بڑے پتے کی بات کہی ہے "شاعری بغیر نادر تشبیہات و استعارات کے بغیر سورج کا دن اور بغیر چڑیوں کا مرغزار ہونے کے مترادف ہے۔" دنیا کے ہر بڑے شاعر کی طرح فیض نے بھی نہایت کامیابی و خوش اسلوبی کے ساتھ اپنے گہرے اور اچھوتے تجربوں کو دوسروں تک منتقل کرنے کے لئے بڑے ہی نادر اور خوبصورت استعارے تخلیق کئے ہیں۔ "زنداں نامہ" میں "دریچہ" کے عنوان سے ان کی ایک چھوٹی سی نظم ہے جو اس لحاظ سے بہت کامیاب ہے ؂

گڑی ہیں کتنی صلیبیں مرے دریچے میں
ہر ایک اپنے مسیحا کے خوں کا رنگ لئے
ہر ایک وصلِ خداوند کی امنگ لئے
کسی پہ کرتے ہیں ابرِ بہار کو قرباں
کسی پہ قتل مہِ تابناک کرتے ہیں
کسی پہ ہوتی ہے سرمست شاخسار دو نیم
کسی پہ بادِ صبا کو ہلاک کرتے ہیں
ہر آئے دن یہ خداوندگانِ مہر و جمال
لہو میں غرق مرے غم کدے میں آتے ہیں
اور آئے دن مری نظروں کے سامنے ان کے
شہید جسم سلامت اٹھائے جاتے ہیں

آل احمد سرور نے اس نظم کا تجزیہ کرتے ہوئے ایک جگہ بالکل سچ لکھا ہے کہ "زنداں کی سلاخوں سے صلیب کا استعارہ اخذ کرنا، حسن، نیکی، تہذیب، انسانیت کا دورِ حاضر کی مجرمانہ ذہنیت کے ہاتھوں روز صلیب پر چڑھایا جانا، اور تاہم انسانیت کا ان زخموں کے باوجود زندہ و تابندہ رہنا اس نظم میں بڑی خوبصورتی اور بلاغت کے ساتھ بیان ہوا ہے" بحیثیت مجموعی فیض کا اسلوب شاعری ایک ایسا تخلیقی اسلوب ہے جس میں حرکت بھی ہے توانائی بھی اور زندگی بھی۔ ان کی شاعری اپنے پڑھنے والوں میں بیک وقت روحانی بالیدگی، جذباتی آسودگی اور زندہ رہنے کی لگن پیدا کرتی ہے۔ فیض کو شہرۂ آفاق بنانے میں ان کے اس تخلیقی اسلوب کا بہت بڑا حصہ ہے جسے کسی بھی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

بریگیڈیر گلزار احمد

مرکزِ داستانِ فیض

بھیگی ہے رات فیض غزل ابتدا کرو
وقتِ سرود درد کا ہنگام ہی تو ہے

دردِ داغ سے بچنے کی تلقین کرنے والا فیض بھیگی راتوں میں غزل کی ابتدا کا قائل ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ رات کا اندھیرا جو یوں بھی بوجھل معلوم ہو رہا ہو اس وقت غم و اندوہ سے تاریک تر کیا جائے۔ اسے قلب انسانی کے اضطراب و اضطرار کی کیفیت کا علم ہے۔ وہ جانتا ہے کہ قلب کی پریشانی کس طرح ذہن کو ماؤف کر دیتی ہے۔ اسی لئے وہ چاہتا ہے کہ جب ہجر و فراق کا بوجھ قلب و ذہن پر چھانے لگے تو اسے غزل کے دلشاد نغموں سے ہلکا کیا جائے اور یوں درد میں لذت پیدا کر دی جائے۔

یہ مشورہ دینے والے شاعر یعنی فیض کا جب ذکر ہو رہا ہو تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس ذکر کا آغاز بھی بھیگی بھیگی رات کی جوانی کے وقت سے شروع کیا جائے۔ البتہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ داستان کا مرکز فیض کو رکھا جائے یا اس کے کلام کو۔ درست کہ شاعر کا کلام اُس کی سیرت کا آئینہ ہوا کرتا ہے۔ اور اگر اُس کے کلام پر کچھ کہا جائے یا اس کا جائزہ لیا جائے تو شاعر کو لامحالہ موضوع سخن بنانا پڑتا ہے۔ مگر یہی مقصد یوں بھی پورا ہو سکتا ہے کہ خود اسی کی ذات کو داستان کا مرکز بنایا جائے۔ جب شعر کہنے والا خود سامنے موجود ہو تو پھر اس کے خد و خال کو آئینہ میں دیکھنے سے کیا حاصل۔ بہتر یہی ہوگا کہ اس کے متعلق کچھ کہا جائے اور زیب داستاں کے لئے اس کی تخلیق کو بطور سند پیش کیا جائے۔

جیتا جاگتا فیض لطافت و نظافت کا مرقع ہے۔ وضعداری پاس خاطر اور مشرقی رکھ رکھاؤ اس کی فطرت ثانیہ ہے۔ وہ اس مشینی دور میں رہتے ہوئے بھی اس کی برق رفتاری سے متاثر نہیں ہو سکا اور اس کی آلودگیوں سے کنارہ کش رہا ہے۔ وہ دنیا کو حسن و نیرنگی کا ایک وسیع میدان تصور کرتا ہے اور اسے دنیا کی حسین چیزوں سے پیار ہے بلکہ یوں کہئے کہ وہ چاہتا ہے کہ ہر قباحت حسن میں بدل جائے چنانچہ اس کے لئے ممکن ہو گیا ہے کہ وہ دنیا کی ہر شے میں کسی نہ کسی پہلو حسن دیکھ سکے۔ وہ ہر ایسی شے سے نفرت کرتا ہے جو حسن پر داغ لگائے مگر چونکہ نفرت کا جذبہ اس کی طبیعت پر گراں گذرتا ہے اس لئے وہ شکوہ و شکایت بھی دبے الفاظ میں کرتا ہے ؎

لب پہ ہے تلخیٔ مے آیام ورنہ فیض
ہم تلخیٔ کلام پہ مائل ذرا نہ تھے

حسن کا متلاشی حسن نظر بھی پیدا کر لیتا ہے اور جب حسن نظر کو حسن ادا کا سہارا بھی میسر آجائے تو جو کلام وجود میں آتا ہے وہ لاجواب ہوتا ہے۔ ایسے موقعوں پر فیض الفاظ و بیان کی بلندیوں پر پہونچ جاتا ہے ؎

رنگ پیراہن کا خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسم گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام
دوستو اس چشم و لب کی کچھ کہو جس کے بغیر
گلستاں کی بات رنگیں ہے نہ مے خانے کا نام

شعر کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں۔ ایک تعریف یہ ہے کہ سننے والا یہ کہے کہ وہ خود بھی یہی کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر اظہار خیال کے لئے اتنے موزوں الفاظ نہ ڈھونڈ سکا تھا۔ الفاظ و بیان کے ذریعے ہی خیال کو مقید کیا جا سکتا ہے۔ اور یہی شاعر کا کمال ہوتا ہے، فیض کو قدرت نے یہ ملکہ دل فروشا کیا ہے۔ فیض کی صحبت جنہیں میسر آچکی ہے وہ جانتے ہیں کہ فیض کی گفتگو میں دھیمے سروں کی موسیقی کا سا رنگ ہوتا ہے۔ اس کے اشعار بھی بعینہ وہی تاثر پیدا کرتے ہیں۔ اس کی گفتگو کے ہر لفظ میں خاص معانی پنہاں ہوتے ہیں۔ اس کی باتیں ذو معنی نہیں ہوتیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے اشعار بھی اپنا مضمون وضاحت سے پیش کرتے ہیں۔ مگر شاعرانہ اختصار پر بھی آنچ نہیں آتی۔

فیض جب دوستوں میں بیٹھتا ہے اور وہ بھی ان دوستوں میں جو اس کی صحبت کے ہر لمحے کو دوامی بنانا چاہتے ہیں تو دیکھنے والوں کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ خود ان لمحوں کو طول دینا چاہتا ہے۔ اور اس کی ہر ہر نگاہ اظہار تشکر سے لبریز ہے۔ اور وہ اس محفل سے فیض حاصل کر رہا ہے۔ اپنی اس ادا کو یوں پیش کرتا ہے ؎

اپنی تکمیل کر رہا ہوں میں
ورنہ تجھ سے تو مجھ کو پیار نہیں

شرم و حجاب کا یہ پتلا چاہتا ہے کہ جس طرح عشق کو وضعداری کا پاس چھوڑنا نہ چاہئے اسی طرح حسن بھی حجاب کے پردے سے باہر نہ آئے۔ پردۂ حجاب خود حسن کو چار چاند لگاتا ہے اور عشق کی توجہ کو مرکوز کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ فیض کے مطابق جب حسن حجاب سے باہر آتا ہے تو اس کی جلوہ گری حجابات قلب و نظر کو چاک کر کے ایک ہیجان سا پیدا کرتی ہے اور انجام کار حسن حسن نہیں رہتا۔ کہتا ہے ؎

جلوۂ حسن کو مستور ہی رہنے دیتے
حسرت دل کو گنہگار نہ کر دینا تھا

ایک اور جگہ عشق کو اسی طرح کی تلقین کرتا ہے ؎

نگاہ شوق سر بزم بے حجاب نہ ہو
وہ بے خبر ہی سہی اتنے بے خبر بھی نہیں

مغربی علوم پر عبور حاصل کرنے اور عصر حاضر کی یورپی تہذیب کو قریب سے دیکھ چکنے کے بعد بھی زندگی کے ان بنیادی پہلوؤں پر فیض کی رائے میں سر مو فرق نہیں آیا۔
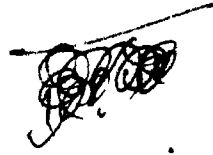
فیض نے علوم مشرق و مغرب سے مستفید ہونے کے بعد زندگی کی نئی راہوں پر سفر کیا۔ زندگی کے متعدد پہلو دیکھے اور ہر پہلو کا بغور مطالعہ کیا۔ چشم روشن، مشاہدات عمیق و وسیع اور قدرت بیان کا نتیجہ یہ ہے کہ جب وہ غیر مرئی اشیاء کا ذکر بھی کرتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان چیزوں کو بھی وجود حاصل ہو گیا ہے اور وہ بھی جسم و جان کی مالک بن گئی ہیں ؎

آنکھوں سے لگایا ہے کبھی دست صبا کو
ڈالی ہیں کبھی گردنِ مہتاب میں بانہیں

یہاں صرف الفاظ کا چناؤ اور خیال کا اچھوتا پن ہی شعر کی جان نہیں۔ موہوم اور غیر مرئی صفات کو وجود مل گیا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ صبا کے نازک نازک سے ہاتھ ہیں جو چہرے کو تھپکاتے ہیں تو نیند سی آنے لگتی ہے اور مہتاب بجائے خود یونانی دیو یا افروڈائٹ کی طرح مجسمۂ حسن بن گئی ہے جس کی گردن کا لمس خیال ہی میں نہیں بلکہ واقعتاً ممکن ہے۔ اگر تھوڑی دیر کے لئے انسان دست صبا اور گردن مہتاب کو ذہن کے سامنے رکھے تو نہ معلوم کون کون حسین و جمیل مگر ادھورے خواب پورے ہوتے نظر آنے لگتے ہیں۔ اسی انداز میں ایک اور جگہ کہا ہے ؎

اس قدر پیار سے اے جانِ جہاں رکھا ہے
دل کے رخسار پہ اس وقت تری یاد نے ہاتھ

یہ سعادت فیض ہی کو حاصل ہے کہ وہ سننے والے کو یقین دلاتا ہے کہ اس کا دل ایک جیتی جاگتی، سانس لیتی ہوئی اور احساسات رکھتی ہستی ہے جسے یادوں کے ہاتھوں تسکین و راحت بھی نصیب ہو سکتی ہے اور دکھ، درد اور رنج و الم بھی۔
زندگی کو اس باریک نظر سے دیکھنے کا ہی نتیجہ ہے کہ وہ غم و اندوہ کے دوران بھی زندگی کے حسین پہلوؤں سے غافل نہیں رہتا۔ کس اطمینان سے کہتا ہے ؎

نقش اُداس ہے یارو صبا سے کچھ تو کہو
کہیں تو بہر خدا آج ذکر یار چلے

ایام غم اور فیض کو وہ وافر عطا ہوئے ہیں ان کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ کہتا ہے ؎

جب تجھے یاد کر لیا صبح مہک مہک اٹھی
جب ترا غم جگا لیا رات مچل مچل گئی

درس نہ دینے والا فیض اب مدرس بن گیا ہے یعنی نوعِ انسان کو ایک نئے رُخ سے دیکھنے کے بعد اسے بہت کچھ کہنا ہو گا اور کہنا بھی چاہئے۔ صبر و ضبط برقرار رکھنے والا فیض ہی شباب کو انضباط کی اہمیت سمجھا سکتا ہے۔ اپنے اس فرض کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اس نے ایک بار کہا تھا ؎

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گذرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

دل پہ گذری ہوئی باتیں جب لوح و قلم کے سپرد کی جائیں تو وہ با اثر اور زود اثر ہوتی ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ اس عصر کا شباب فیض سے ضرور مستفیض ہو گا ——— اب رات بھیگ چکی ہے۔ اس لئے ہم اس تشنہ سے ذکر پر ہی اکتفا کرتے ہیں اور اجازت چاہتے ہیں ؎

مے خانہ سلامت ہے تو ہم سرخیٔ مے سے　　　تزئینِ در و بامِ حرم کرتے رہیں گے!

ابن فرید

فیض کی شاعری

چند فنی پہلو

فرد کی کائنات صرف اس کی ذات تک محدود نہیں رہتی، اس کے تجربات صرف اپنے ہی تجربات نہیں ہوتے، اس کے افکار کی تشکیل میں صرف اس کی تنہا ذات ہی کو دخل نہیں ہوتا۔ بلکہ بنی نوع کے قرن ہا قرن کے تاثرات و تجربات اس تک منتقل ہوتے رہتے ہیں اور یہ تاثرات و تجربات اس کے ماحول میں اس قدر رچ بس جاتے ہیں کہ جب ان کی زندگی کے انداز سے ان تاثرات و تجربات کو غیر معمولی مطابقت حاصل ہو جاتی ہے تو وہ اس کے جذباتی تجربات سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں، اور انہیں اظہار کا ویسا ہی انداز نصیب ہوتا ہے جیسا کہ اس ماحول کے دوسرے افراد کا انداز اظہار ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر جب اپنے جذبات کو شعر کے قالب میں ڈھال دیتا ہے تو ہم بھی اس سے ویسا ہی تاثر قبول کرتے ہیں جیسا شاعر ہم سے مطالبہ کرتا ہے۔ اگر اس مقصد کے لئے شاعر اور قاری کی زبان میں اجنبیت ہو تو شاعر اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا —— زبان سے مراد لینگویج نہیں ابلاغ ہے —— خام کار شاعر اپنی برتری جتانے کے لئے وسائل ابلاغ پر زیادہ زور دیتا ہے انوکھی تراکیب اور اجنبی الفاظ کے ذریعے اپنی فوقیت منوانے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن اس کے جذباتی تاثرات کی چھاپ اس کی فکر پر نہیں آتی۔ اس کے رنگ گہرے تو ضرور ہوتے ہیں لیکن متناسب نہیں ہوتے، چنانچہ وہ پھوہڑپن کا شکار ہو جاتا ہے۔ پختہ کار شاعر وسائل ابلاغ پر توجہ صرف کرتا ہے۔ وہ پیمانوں کے انتخاب پر وقت ضائع نہیں کرتا، شراب کے انتخاب کو اہمیت دیتا ہے، کیونکہ اُسے یہ اعتماد ہوتا ہے کہ وہ جس پیمانے میں بھی شراب ڈال دے گا وہی بیش قیمت ہو جائے گا۔

(’’فیض کے کلام کا مطالعہ کرنے کے بعد پہلا تاثر یہ ہوتا ہے کہ ہم مشرق اور خاص طور سے اردو کے شاعر کا مطالعہ کر رہے ہیں اس کے کلام میں جس [illegible] ہے وہ ہماری اپنی ہے۔ ہم اس سے اس طرح مانوس ہیں کہ ہمیں کسی طرح کا یہ احساس نہیں ہوتا کہ ہم [illegible] ایک اجنبی [illegible] گئے ہیں [illegible] یہ ملامت و [illegible] سب ہماری اپنی ہیں اس تاثر کی [illegible] فیض کی شاعری میں ہمیں ایک تہذیبی تسلسل ملتا ہے۔ حالانکہ افکار و نظریات سے وہ جس قدر متاثر ہوئے ہیں [illegible] ماضی کو بھی اپنے ذہنی سرمائے کا جزو بنا لیا ہے۔‘‘) دیکھو

ابن فرید

ان کے بیشتر کلام کی ہیئت وہی ہے جسے نئی نسل کے شعراء فرسودہ قرار دیتے ہیں)۔ جہاں فیض نے نئی ہیئتوں کو اپنا رکھا ہے وہاں بھی اظہار ذات کے لئے مناسب ترین ہیئتیں وہی اختیار کی ہیں جو اب تک مروج رہی ہیں۔ (فیض کے سلسلہ میں یہ ایک طویل بحث ہو سکتی ہے کہ) وہ غزل کے شاعر ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کا بیشتر کلام غزل پر مشتمل ہے، لیکن اس پہلو کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ جس دور میں انہوں نے غزلیں زیادہ کہی ہیں وہ ان کی دوبارہ اسیری ہے۔ ان کا ذہن جس کشمکش سے دوچار تھا، اور جذبات جن کچوکوں کو برداشت کر رہے تھے، ان کے لئے غزل سے زیادہ مناسب ہیئت کوئی اور نہیں ہو سکتی تھی۔ جذباتی تجربات کی رفتار بہت تیز تھی، اس لئے اظہار بھی کاری اور اختصار دلکش ہونا چاہئے تھا۔ غزل کا ہر شعر اپنی جگہ پر ایک اکائی ہونے کی وجہ سے اس کا متحمل ہو سکتا تھا۔)

(فیض نے غزل کے مزاج کو بھی بعینہٖ برقرار رکھا ہے۔ ان کی تلمیحات، استعارات، تشبیہات وہی ہیں جو غزل میں اب تک رائج رہی ہیں۔ لیکن ان کا جہانِ معنی بدل گیا ہے) اس بدلے ہوئے جہانِ معنی ہی کو دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ ریمی ڈی گورمونٹ (Remy De Gourmont) نے داخلی ادیب کے بارے میں جو کچھ کہا تھا وہ فیض پر بھی صادق آتا ہے —

"ایک مخلص انسان کی جد و جہد یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے ذاتی تاثرات کو آفاقی اصولوں میں ڈھال دے۔"

فن کار کا کمال یہ نہیں ہوتا کہ اس نے صنائع و بدائع سے مرصع کاری کا کام کس استادی کے ساتھ لیا ہے۔ بلکہ اس کی اصل معراج یہ ہوتی ہے کہ صنائع و بدائع جب اس کی نوکِ قلم پر آئیں تو اس کی شخصیت کا مظہر اور اس کے جذباتی تجربات کا تلاطم بن جائیں۔ بالکل اسی طرح مرصع کاری نہیں کرتا، اسے آرائش سے سروکار نہیں ہوتا، وہ تو ایک ایک لفظ کی رگ و پے میں اپنے "خونِ دل کی کشید" رواں دواں کر دیتا ہے۔ اس کے یہاں الفاظ ہیروں کی طرح چمکتے نہیں، دل کی طرح بولتے ہیں —

جاں بیچنے کو آئے تو بے دام بیچ دی
اے اہلِ مصر، وضعِ تکلف تو دیکھئے
انصاف ہے کہ حکمِ عقوبت سے پیشتر
اک بار سوئے دامنِ یوسف تو دیکھئے

زلیخا کی دراز دستی اور یوسف علیہ السلام کی پاک دامنی کی یہ مقبول ترین حکایت ہے جسے شعراء نے مسلسل استعمال کیا ہے۔ فیض نے بھی اسی فرسودہ داستان کو منتخب کیا ہے، لیکن اس قطعہ میں فیض کا اپنا تجربہ بول رہا ہے۔ ہمیں اس سے غرض نہیں کہ "راولپنڈی سازش" میں فیض بے گناہ تھے یا خطاوار، لیکن مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا ہوا شخص جب خود کو بے گناہ تصور کرے تو یوسف علیہ السلام کی بے گناہی میں اسے اپنے جذباتی تجربہ کی مماثلت نظر آئے گی اور اس کی نظر وہیں جا کر ٹھہرے گی، ورنہ پھر اسے حشر کا میدان یاد آئے گا —

پھر حشر کے ساماں ہوئے ایوانِ ہوس میں
بیٹھے ہیں ذوی العدل گنہگار کھڑے ہیں

جرم داس

ہاں جرمِ وفا دیکھئے کس کس پہ ہے ثابت
وہ سارے خطا کار سرِ دار کھڑے ہیں

(فیض کے علائم بھی وہی ہیں جو انہیں ماضی کے سرمائے سے ملے ہیں۔ انہوں نے مشرق کی طرف پیٹھ کر کے مغرب کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اپنے ہی چمن کے پھولوں کو نئی آب و تاب اور نیا پیرہن بخشا ہے) جنون، صبا، شیخ، ناصح، سنتِ منصور و قیس، گل، دامن، رنگ، کلی سے اردو شاعری سیکڑوں برس سے مانوس ہے۔ ان کی روایتی حیثیت عشقیہ ہے (فیض نے اس عشق کو وسعت دے کر ایک اور میدان میں استعمال کیا ہے جو سیاسی ہے۔ فیض ان علامتوں کے بجائے اگر راست طرزِ بیان اختیار کرتے تو ان کا موضوع محدود، کم عمر اور وقتی ہو جاتا۔ چنانچہ انہوں نے ایسے علائم کو اختیار کیا جو صدیوں کی آبیاری کا ثمرہ ہیں، اور جو اپنی ہمہ گیریت کی بنا پر ذہن کو بہ آسانی فیض کے مافی الضمیر کی طرف موڑ سکتے ہیں) فیض کے سامنے اس تجربہ کی کامیاب ترین نظیر اقبال رح پیش کر چکے ہیں۔ اقبال نے جہاں مردِ مومن، شاہین، خودی، کرگس وغیرہ کی نوعیت کے نئے علائم پیش کئے ہیں۔ وہیں ملا، دیر، حرم، بت کدہ، تتار، عشق، فراق، وصال وغیرہ کو بھی فراوانی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ اگر علائم کا کام ایمائیت کے ساتھ ایک وسیع تجربہ کی طرف موڑ دینا ہے تو یہ مقصد اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ علائم میں ابلاغ کی اہلیت ہو اور قاری ان سے مانوس ہو۔ ایسے علائم جن کی گتھیاں صرف شاعر سلجھا سکے، شاعر کی ذاتی ملکیت ہو سکتے ہیں، ادبی سرمایہ نہیں۔ فیض نے اپنے علائم کو ادبی سرمایہ بنانے کی کوشش کی ہے، ذاتی ملکیت نہیں ؎

نہ جانے کس لئے امیدوار بیٹھا ہوں
اک ایسی راہ پہ جو تیری رہگزر بھی نہیں

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گزار کے

پھر کہ معنت لگا رہا ہے خونِ دل کی کشید
گراں ہے اب کے مئے لالہ فام کہتے ہیں

ہے وہی عارضِ لیلیٰ، وہی شیریں کا دہن
نگہِ شوق گھڑی بھر کو جہاں ٹھہری ہے

مقام، فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

اپنے ناداں بھی نہ تھے جاں سے گزرنے والے
ناصحو، پندگرو، راہ گذر تو دیکھو

رقص مے تیز کرو، ساز کی لے تیز کرو
سوئے مے خانہ سفیرانِ حرم آتے ہیں

اور کچھ دیر نہ گذرے شبِ فرقت سے کہو
دل بھی کم دکھتا ہے، وہ یاد بھی کم آتے ہیں

(۲) فیض نے ماضی و حال میں تسلسل قائم کر کے مستقبل کے لئے بھی کچھ نئے تجربے کئے ہیں۔ ان تجربوں میں سب سے نمایاں حیثیت ان کی تمثالیت (Imageries) کی ہے۔ اردو شاعری میں ہی نہیں بلکہ مشرقی شاعری میں محاکات ایک ایسی صنعت ہے جو تمثال کے قریب ہے، لیکن محاکات کا کینوس بہت محدود ہے۔ مشرقی شعراء اس سے صرف اتنا ہی کام لیتے رہے ہیں کہ تصور میں خارجی منظر کا سماں بندھ جائے۔ گویا یہ ایک ٹھوس بصری ادراک (Visual Perception) ہے۔ اس میں تمثالیت کی طرح تہ داری نہیں ہوتی۔ اس کی تحریک ذہنی یا بالعموم براہ راست ہوتی ہے۔ یہ صرف مادّی (Concrete) ہوتی ہے۔ مجرّد (Abstract) نہیں ہوتی۔ محاکات حاسّہ بصر کے علاوہ دوسری حسّیات (Sensations) سے تقریباً نہ ہونے کے برابر تعرض کرتی ہے۔ تمثالیت ہر حس کو اپنے احاطے میں لے لیتی ہے۔ کیونکہ تمثالیت کسی بھی ایسی شے کو ذہنی یا تصوراتی طور پر پیش کر سکتی ہے جو اصلاً حواسِ خمسہ کے سامنے موجود نہ ہو۔ تمثالیت کی اصطلاح کے عمومی معنیٰ تو تصویر گری ہی کے ہوتے ہیں، لیکن یہ تصویر گری سے برتر ہے۔ اور اسی وجہ سے محاکات سے مختلف ہے۔ تمثالیت کے لئے استعاراتی و کنایاتی زبان کی ضرورت ہوتی ہے، چنانچہ حسیاتی دلفریبی حالانکہ تمثالیت میں ہمیشہ موجود ہوتی ہے لیکن اس کا موجود ہونا ضروری بھی نہیں ہے! اسی طرح تمثالیت کے لئے صنائع و بدائع کی زبان بھی لازمی نہیں، کیونکہ تمثالی شاعری صناعی نہیں ہے، بلکہ یہ تصوّر (Imagination) کو زیادہ بیش قیمت بنانے کا ذریعہ ہے۔ تمثالیت سے اگر شاعر صحیح کام لینے پر قدرت رکھتا ہے تو یہ نظم یا شعر کا جزوِ لاینفک بن جاتی ہے، اور شعر یا نظم کے جامع و کلی مفہوم کے ابلاغ کا وسیلہ بن جاتی ہے۔

اردو شاعری میں تمثالیت کا تجربہ بہت محدود ہے۔ جدید شعراء میں اس کی اچھی مثالیں راشد اور میراجی کے یہاں ملتی ہیں۔ دوسرے شعراء تمثالات میں جن علائم، استعارات یا تلمیحات سے کام لیتے ہیں۔ ان کا دائرۂ ابلاغ اتنا محدود ہوتا ہے کہ تصور میں حیات کی کائنات سکڑ کر رہ جاتی ہے (فیض کی تمثالات میں ایک جان بھی ہے (اور ایک وسعت بھی!۔ ان کے علائم پُر تصنع اور گنجلک نہیں ہوتے۔ حسیاتی و جذباتی تجربات کا سلسلہ ان سے دراز تر ہوتا چلا جاتا ہے ؎

گرمیٔ شوقِ نظارا کا اثر تو دیکھو
گل کھلے جاتے ہیں وہ سایۂ در تو دیکھو

ایک اک کر کے ہوئے جاتے ہیں تارے روشن
میری منزل کی طرف تیرے قدم آتے ہیں

تیرے ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت میں ہم
دار کی خشک ٹہنی پہ وارے گئے
تیرے ہاتھوں کی شمعوں کی حسرت میں ہم
نیم تاریک راہوں میں مارے گئے

تازہ ہیں ابھی یاد میں اے ساقیٔ گلفام
وہ عکسِ رخِ یار سے لہکے ہوئے ایام
وہ پھول سی کھلتی ہوئی دیدار کی ساعت
وہ دل سا دھڑکتا ہوا امید کا ہنگام

(ان اشعار میں صرف ایک علامت یا اشارہ ذہن کو ایک مکمل تمثال کی طرف متوجہ کر دیتا ہے۔ مثلاً گل اور سایۂ دیوار، دار اور قدم، ہونٹوں کے پھول، ہاتھوں کی شمعیں، عکسِ رخِ یار سے لہکے ہوئے ایام، امید کا ہنگام، میں تصور کے دروازے کھول دینے کی بے پناہ صلاحیت ہے) فیض نے صنعت تمثال کو بڑی فراوانی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ چنانچہ ان کے یہاں ایک جذباتی گداختگی اور رومانی فضا پیدا ہو گئی ہے جو قاری کو اپنی طرف قدم قدم پر متوجہ کر لیتی ہے۔)

کسی شاعر کی تمثالیت کا اگر بحیثیت مجموعی مطالعہ کیا جائے تو وہ اس کی ذات یا شخصیت کے بعض ایسے عقدے کھول دیں گی جن کی طرف سرسری طور پر ذہن نہیں جاتا۔ کیونکہ شاعر تمثالات کے ذریعے حیاتی تجربات کا سرمایہ پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جب حیاتی تجربات کی بات درمیان میں آجائے تو پھر شاعر کا انفرادی رجحان اور اس کی شخصیت کے بعض مضمر پہلوؤں کا موضوعِ بحث بن جانا ناگزیر ہو جاتا ہے۔

ہر فرد کے حیاتی تجربات یکساں نہیں ہوتے، اور نہ ہر فرد صرف ایک یا دو حواس (Senses) کو اہمیت دیتا ہے اور باقی کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ کوئی فرد حواس باصرہ و سامعہ کو اہمیت دیتا ہے تو کوئی حواس باصرہ و شامہ کو۔ کوئی حواس لامسہ و شامہ کو اہمیت دیتا ہے، تو کوئی حواس لامسہ و ذائقہ کو۔ یہ انفرادی طبائع پر منحصر ہوتا ہے۔ اور طبائع کے تعین میں ان کوائف کو بھی دخل ہوتا ہے جن میں شاعر کے حیاتی تجربات ہوتے ہیں۔ مثلاً میراجی کے یہاں ہمیں تمثالاتِ لامسہ اچھی خاصی تعداد میں مل جاتی ہیں۔ راشد کے یہاں تمثالات لامسہ و باصرہ کی تعداد زیادہ ہے (اسی طرح فیض کے یہاں بھی) ہمیں تمثالات باصرہ و شامہ کی فراوانی نظر آتی ہے۔ اس نوعیت کی تمثالات کی کثرت "دستِ صبا" اور "زنداں نامہ" میں ہے۔ زمانۂ اسیری میں فیض خارجی دنیا سے بالکل منقطع رہے۔ بہت سی یادیں اور بہت سی خواہشیں ان کے ذہن پر چھائی رہیں۔ یہ احساس ہی ان کے لئے کیا کم تھا کہ وہ پابند قفس ہیں۔ اس احساس نے ان کے حواس باصرہ و شامہ کو غیر معمولی طور پر متحرک کیا اور وہ جیل کی دیواروں سے باہر کی دنیا سے تصور کی دنیا میں ہم کنار رہنے لگے ——— اس جذباتی و حیاتی محرومی نے ان کے طرز فکر کو متاثر کیا ——— اور انہوں نے تمثالات کے پیمانے میں بڑے حسین جلوے دیکھنے شروع کر دیئے۔

رنگ پیراہن کا، خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسم گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام

پھر نظر میں پھول مہکے، دل میں پھر شمعیں جلیں
پھر تصور نے لیا اُس بزم میں جانے کا نام

جب تجھے یاد کر لیا، صبح مہک مہک اٹھی
جب ترا غم جگا لیا، رات مچل مچل گئی

صبح پھوٹی تو آسماں پہ ترے
رنگ رخسار کی پھوار گری
رات چھائی تو روئے عالم پر
تیری زلفوں کی آبشار گری

یہیں پہ غم کے شرار کھل کر
شفق کا گلزار بن گئے ہیں
یہیں پہ قاتل دکھوں کے تیشے
قطار اندر قطار کرنوں
کے آتشیں ہار بن گئے ہیں

ان اشعار میں اکثر تراکیب عام اردو قاری کو نامانوس معلوم ہوں گی۔ مثلاً نظر میں پھول مہکنا، رنگ کا پیرہن سے اور خوشبو کا زلف سے واسطہ ہونا، رنگِ رخسار کی پھوار، زلفوں کی آبشار، غم کے شرار، کرنوں کے آتشیں ہار، وغیرہ۔ لیکن اگر ان تراکیب کو عام قاری کے معیار سے بلند ہو کر ادبی اقدار کی سطح پر دیکھا جائے تو انہیں تشبیہات توسیعی ——— Extended) (similies. ——— میں رنگ و نور کی ایک دنیا آباد نظر آئے گی۔ محبوب کا شوخ و شنگ پیرہن، عنبریں زلفیں، تابناک رخسار وغیرہ سے ہم میں سے کون مانوس نہیں؟ صرف ایک علامتی اشارہ قاری کے ذہن کو کہاں سے کہاں لے جاتا ہے۔ زلفیں جب شانہ پر بکھر جاتی ہیں تو ایک آبشار سا گرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ غم میں دل کو جب جھٹکے لگتے ہیں تو درد کی چنگاریاں پھوٹنے لگتی ہیں، اور ان چنگاریوں میں جب الم نصیب گھر جاتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ کرنوں نے اس کے گرد ایک ہالہ بنا لیا ہے جو ہار کی طرح اس کے گرد پھیلی ہوئی ہیں۔ غرض فیض نے اپنے تاثرات اُس طرح پیش نہیں کئے، یں جیسے رسماً پیش کئے جاتے رہے ہیں، بلکہ جیسا انہوں نے محسوس کیا ہے، اور اس احساس ہی کو وہ پورے خلوص کے ساتھ قاری میں منتقل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے یہاں ادب "نقالی"

نہیں ہے (اظہارِ ذات ہے، اس لئے انہوں نے محاکات پر تکیہ نہیں کیا ہے تمثالات کی وسعتوں میں کھو گئے ہیں۔
فیض کی ابتدائی نظموں میں ہمیں مصرعے یا اشعار زیادہ تر اس نوعیت کے نظر آتے ہیں کہ شعر کے مکمل ہوتے ہی تمہید بھی مکمل ہو جاتا ہے۔ اس طرح مصرعے اور تمام اشعار اپنی جگہ پر ایک اکائی بن جاتے ہیں، ان کا آپس میں ربط صرف مفہوم کی یکسانیت کی حد تک ہوتا ہے۔ یعنی ربط صرف بحر یا وزن کی حد تک باقی رہتا ہے۔ چنانچہ غزل کے اشعار کی طرح اگر ان اشعار کو نظم سے الگ کر لیا جائے، تو مفہوم پر کوئی اثر نہیں پڑتا، مثلاً ؎

محبت کی دنیا میں شام آ چکی ہے
سیہ پوش ہیں زندگی کی فضائیں
"انجام" (نقشِ فریادی)

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
"مجھ سے پہلی سی محبت ...." (نقشِ فریادی)

اُن کا آنچل ہے کہ رخسار کہ پیراہن ہے
کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے چلمن رنگیں
"موضوعِ سخن" (نقشِ فریادی)

یہ انداز حال کی اکثر نظموں میں بھی ملتا ہے ؎

مے خانہ سلامت ہے تو ہم سرخیٔ مے سے
تزئینِ در و بامِ حرم کرتے رہیں گے
"لوح و قلم" (دستِ صبا)

روشن کہیں بہار کے امکاں ہوئے تو ہیں
گلشن میں چاک چند گریباں ہوئے تو ہیں
"اگست سنہ ۱۹۵۲ء" (دستِ صبا)

شعلۂ درد جو پہلو میں لپک اُٹھے گا
دل کی دیوار پہ ہر نقش دمک اُٹھے گا
"درد آئے گا دبے پاؤں" (زنداں نامہ)

اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اردو شاعری اب تک ابیاتِ مسلسل (Run on Lines) سے مانوس نہیں رہی ہے۔ قصیدہ، غزل، مرثیہ اور مثنوی میں اشعار کی مفرداتی حیثیت بہر نوع باقی رہی ہے۔ چنانچہ جدید اردو شاعری میں بھی یہ رجحان عام رہا، اور اقبالؒ جیسے عہد ساز شعرا نے بھی اسی ہیئت میں بلند ترین کلام پیش کیا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہیئت کے تجربے بند ہو چکے ہیں۔ اردو میں آزاد شاعری کا تجربہ اقبالؒ کی زندگی ہی میں ہو چکا تھا، اس کے روشن امکانات بیسویں

صدی کی تیسری دہائی میں آشکار ہوئے۔ لیکن آزاد نظموں میں کبھی مصرع یا شعر کے ساتھ ہی مفہوم مکمل ہو جاتا تھا۔ بہتر ہے کہ اس کی مثال بھی فیض ہی کے کلام سے پیش کی جائے ؎

بول، کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول، زباں اب تک تیری ہے
تیرا ستواں جسم ہے تیرا
بول، کہ جاں اب تک تیری ہے

لیکن رفتہ رفتہ فن کی پختگی کے ساتھ فیض کو یہ اندازہ ہوا ـــــ ریاضیاتی اندازہ نہیں ـــــ کہ جدید شاعری کے ہیئتی تجربہ میں ابیاتِ مسلسل خصوصی توجہ کی محتاج ہیں، ان سے نہ صرف بیان میں روانی پیدا ہوتی ہے بلکہ خیال بھی تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ مزید برآں آہنگ کے نشیب و فراز کو حسب ضرورت پیدا کیا جا سکتا ہے، جس کی بنا پر بدلتے ہوئے اطوار (moods) اور جذبات کا تاثر قاری تک منتقل کیا جا سکتا ہے۔

(میں فیض کا موازنہ شیکسپیئر سے کرنے کی حماقت کرنا نہیں چاہتا، صرف شیکسپیئر کی مثال سے ان کے لئے نور کی ایک شعاع لینا چاہتا ہوں۔ شیکسپیئر کے ابتدائی ڈراموں میں ہمیں ابیاتِ مسلسل نظر نہیں آتیں۔ ہر مصرع اپنے مفہوم کے ساتھ مکمل نظر آتا ہے، لیکن آخر دور میں جب اسے یہ احساس ہوا کہ مکمل مصرع روانی اور حرکت کا دَم گھونٹ دیتا ہے تو اس نے ابیاتِ مسلسل کو اپنا لیا۔ وہ اگر صناعی کرنا چاہتا تو مختلف شعری کرتب دکھا سکتا تھا کیونکہ اُسے کمال حاصل تھا، لیکن اس نے سادگی میں پرکاری اختیار کی اور شاعری کو معراجِ کمال پر پہنچا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ شیکسپیئر کے آخری دور کے ڈرامے شاعرانہ حسن کے لحاظ سے جس قدر مکمل اور فطری ہیں اتنے ابتدائی دَور کے ڈرامے نہیں ہیں۔ اس تفصیل کا اجمال یہ ہے کہ ابیاتِ مسلسل کا استعمال نہ صرف قدرتِ شعری کا مطالبہ کرتا ہے بلکہ پختہ کاری کا بھی۔ ایک مبتدی جب اس وادی میں قدم رکھتا ہے تو قدم قدم پر لڑکھڑا جاتا ہے اور نظم نہ تو نظم رہتی ہے اور نہ نثر، بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کسی ضعیف لاش کو عریاں کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا ہو۔ اسی بنا پر یہ کہنا درست ہوگا کہ ابیاتِ مسلسل بھی سلیقہ مندی اور ریاضت چاہتی ہیں، تب شاعر ان کے ذریعے نظم میں فطری حسن پیدا کرنے کا اہل ہو پاتا ہے۔)

(فیض نے ابیاتِ مسلسل کے جو تجربے کئے ہیں، وہ نہ صرف یہ کہ حسین ہیں بلکہ ان سے نظم آزاد و معریٰ کے لئے نئے امکانات روشن ہو جاتے ہیں کہ اگر ڈرامہ نگار اس تجربے کی طرف سنجیدگی سے توجہ دیں تو منظوم ڈراموں کا مستقبل سنور سکتا ہے۔ اردو کا یہ بہت بڑا حسن ہے کہ اس میں مرکب (compound) جملے نہیں ہوتے۔ اس لئے انگریزی یا دوسری مغربی زبانوں کی طرح ادیب یا شاعر جملے کے ہاتھوں مجبور نہیں ہو جاتا۔ اردو کا شاعر اپنی بات کو پیش کرنے کے لئے مفرد (Simple) یا حد سے حد ملتف (complex) جملوں کو استعمال کرتا ہے۔ اُسے مرکب جملوں کی ضرورت نہیں پڑتی، اسی وجہ سے ابیاتِ مسلسل کی ناگزیری کا بھی احساس نہیں ہوا۔ لیکن اردو میں ابیاتِ مسلسل کے تجربوں نے زبان کے لئے چھوٹی موٹی رکاوٹوں کو بھی رفع کر دیا ہے۔ مثلاً فیض کی نظم "ملاقات" میں کس قدر روانی، تیز رفتاری اور آہنگ کا احساس ہوتا ہے جیسے وقت و صالِ یار پلک جھپکتے گزر رہا ہو ؎

یہ رات اس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے، تجھ سے عظیم تر ہے

○ فرید

عظیم تر ہے کہ اس کی شاخوں
میں لاکھوں مشعل بکف ستاروں
کے کارواں، گھر کے کھو گئے ہیں
ہزار مہتاب، اس کے سائے
میں اپنا سب نور رو گئے ہیں
یہ رات اس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے

اور جب اس روانی اور تیز گامی کی ضرورت اس وقت ہوتی ہے جب زندگی کی شمع گل ہو رہی ہو۔ اور موت اپنے پر پھیلائے سروں پر منڈلانے لگے تو اس میں حزن پیدا ہو جاتا ہے ؎

جب گھلی تیری راہوں میں شامِ ستم
ہم چلے آئے، لائے جہاں تک قدم
لب پہ حرفِ غزل دل میں قندیلِ غم
اپنا غم تھا گواہی ترے حسن کی
دیکھ قائم رہے اس گواہی پہ ہم
ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

یہ کون سخی ہیں
جن کے لہو کی
اشرفیاں، چھن چھن، چھن چھن
دھرتی کی پیہم پیاسی
کشکول میں ڈھلتی جاتی ہیں
کشکول کو بھرتی جاتی ہیں
یہ کون جواں ہیں ارضِ عجم

طربیہ اور المیہ کیفیات کے ابلاغ کے علاوہ ابیاتِ مسلسل میں دل گدازی (Pathos) پیدا کرنے کی بھی پوری صلاحیت ہے ؎

یاد کی راہگزر جس پہ اسی صورت سے
مدتیں بیت گئی ہیں تمہیں چلتے چلتے
ختم ہو جائے جو دو چار قدم اور چلو

(باقی صفحہ ۸۷ پر)

سحر انصاری

فیض ایک نثر نگار

شاعری کی طرح فیض کی نثر بھی کمیت میں زیادہ نہیں ہے۔ ان کے مضامین کا ایک مجموعہ "میزان" کے نام سے شائع ہوا ہے اس کے علاوہ شعری مجموعوں کے دیباچے اور چند اور مضامین ہیں۔ جو فیض نے اپنے حالیہ دورۂ انگلستان و یورپ کے دوران پاکستان کے بعض روزناموں اور ہفت روزوں کیلئے سپرد قلم کئے تھے۔ یہ مضامین مختصر ہیں۔ لیکن تنوع کے اعتبار سے تقریباً تمام اہم موضوعات پر محیط ہیں۔ ان مضامین میں فکر اور اسلوب کے وہ تمام تر اجزا موجود ہیں جن کی روشنی میں فیض کی شخصیت اور مسائل کی جانب ان کی توجہ کے براہ راست زاویے نظر آتے ہیں فیض نے "میزان" کے دیباچے میں چند سطریں لکھ کر ان مضامین کی نوعیت واضح کردی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ان میں ادبی مسائل پر سیر حاصل بحث نہیں ہے اور اس میں سخن علماء سے نہیں بلکہ عام پڑھنے لکھنے والوں سے ہے۔ جو ادب کے بارے میں کچھ جاننا چاہتے ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ فیض کے ان مضامین میں رسمی اور روایتی تنقید کا انداز نہیں ملتا اس حقیقت کے باوجود کہ ان میں سے بیشتر مضامین اب سے بیس پچیس برس پہلے جوانی کے دنوں میں لکھے گئے تھے یہ اس لئے وقیع اور اہم ہیں کہ بنیادی طور پر فیض کو "ان تنقیدی مقاصد سے اب بھی اتفاق ہے۔" دراصل یہ مضامین ایک ذمے دار اور سنجیدہ شاعر کے اس ذہن کی پیداوار ہیں جس میں ادب، معاشرے اور زندگی کے بہت سارے مسائل ابھرتے ہیں۔ جیسا منصب شعر گوئی اور شعر فہمی کے علاوہ زندگی کے بعض اہم سماجی اور فلسفیانہ مسائل پر غور و فکر کرنا بھی ہے اور شاعر کے قلم سے نثر غالباً اسی صورت میں صفحۂ قرطاس پر جلوہ فرما ہوتی ہے۔ جب وہ اپنے بعض خیالات کو نظم میں من و عن پیش کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ تخیل اور تعقل سے وابستہ اور ایجاز و اختصار کے پیرائے میں ملبوس نظر آنے والے اشعار جب فکر و عمل اور مسائل کے ہجوم کو دیکھ کر اظہار کے لئے وسعت بیان کے طالب ہوتے ہیں تو تحریر کی وہ صنف معرض وجود میں آتی ہے جسے یونان میں "حرف برہنہ" کہا جاتا تھا۔ وہ ساری قطعیت اور معروضیت اس حرف برہنہ میں سمٹ آتی ہے جسے شعر کی حجاب اندر حجاب معنویت سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا۔

فیض کے نثری مضامین کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے ایک کامیاب نثر نگار کی طرح کسی موضوع پر قلم اٹھانے سے پہلے اس موضوع کے تمام پہلوؤں پر غور و خوض کیا ہے اپنے ذہن میں جزئیات اور تمام باریک سے باریک

تفصیلات کو مرتب کیا ہے اور اسکے بعد خیال کو تحریر کے میکانکی عمل سے گذارا ہے۔ انفرادی زاویوں کو اجاگر کرنے کے لئے فیض کو اپنے ذہن کے عکس بین کے سیکڑوں زاویے بدلنے پڑے ہونگے تاکہ خیالات کے رنگ برنگے شیشے کے ٹکڑوں کی ایک ایسی انوکھی، فطری اور بیساختہ ترتیب عمل میں آگئی کہ اس پر نگاہ ڈالتے ہوئے آپ سرسری نہیں گزر سکتے۔ اس عمل کے بعد معرض تحریر میں آنے والی نثر میں مصنف کے خیال کی رو الفاظ اور آپ کی نگاہوں کے ساتھ ساتھ سفر کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ آپ خود کو خیال کے تمام نشیب و فراز سے گزرتے ہوئے محسوس کرتے ہیں۔ تحریر میں یہ بات اس وقت پیدا ہوتی ہے جب الفاظ کے بجائے خیال کی اہمیت کو محسوس کر کے موضوع کی اچھی طرح تطہیر کر لی گئی ہو۔ فیض اس عمل کی اہمیت سے بخوبی واقف ہیں اور انہوں نے خیال کے مسئلے پر ہر پہلو سے غور کیا ہے اور اس کو وہ تحریر کی اثر آفرینی اور بے ساختگی کا بنیادی عنصر سمجھتے ہیں۔ خیال اور تشبیہ و استعارے کی وضاحت انہوں نے یوں کی ہے کہ "شاعر یا لکھنے والے کی منزل تو اسکا مضمون یا خیال ہے۔ اور اگر یہ منزل بالکل بنجر ہے تو راستے کی رنگینی اسے دلفریب نہیں بنا سکتی، پس تشبیہ استعارہ شعر یا ادبی تحریر میں کوئی مقصود نہیں"

تحریر کے بارے میں عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ آسان الفاظ استعمال کرنے سے تحریر قابل فہم اور سلیس ہو جاتی ہے۔ یہ نظریہ دراصل حقیقت سے بہت دور ہے آج کل یہ رجحان عام ہے کہ بیشتر فارسی یا عربی کے الفاظ پر مشتمل عبارت کو مشکل اور گنجلک سمجھا جاتا ہے حالانکہ خود فیض کے الفاظ میں یہ ضروری نہیں ہے کہ "جہاں کوئی فارسی ترکیب آئی تحریر میں پیچیدگی پیدا ہو گئی اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ ہندی بھاشا میں آج تک جو کچھ لکھا گیا ہے بہت سلیس ہے اور فارسی میں تو گویا خاقانی اور بیدل کے سوا کوئی پیدا نہیں ہوا"
فیض اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ بنیادی چیز خیال کی صفائی ہے۔ عبارت مغلق اور پیچیدہ، بے لطف اور سپاٹ اسی صورت میں ہوتی ہے جب لکھنے والے کے ذہن میں خیال الجھا ہوا ہو۔ تحریر کی روانی کے بارے میں فیض کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ روانی "معانی کی موزوں نشست کا مسئلہ ہے الفاظ کے خارجی تسلسل کی پیداوار نہیں، ان کی داخلی ہم آہنگی کا نتیجہ ہے" اب اس پورے موقف کی تفصیل جاننے کے لئے یہ عبارت پیش نظر رکھئے اس میں آپ کو ایک ایسے نثر نگار کا سوچتا ہوا ذہن ملے گا۔ جسے اپنے قاری تک واقعی کچھ پہنچانا ہے اور جس نے ان خیالات کے نشیب و فراز کا فشار برداشت کیا ہے جو ایک قدرتی چشمے کی طرح سطح سنگ کو توڑ کر باہر نکلنے کے لئے بیتاب ہیں"

> "اگر خیال لکھنے والے کے ذہن میں صاف ہے اور اس نے اسے سہولت سے آپ تک پہنچا دیا ہے تو اس کی تحریر میں فارسی کی (؟) بجائے لاطینی تراکیب ہوں تو بھی ہم اسے سلیس ہی کہیں گے۔ البتہ امکان یہ ہے کہ اگر الفاظ زیادہ مانوس ہوں تو مضمون زیادہ آسانی سے ہم تک پہنچے گا...... لیکن یہ امکان ہے، شرط نہیں ہے، سلاست اور روانی کے متعلق ہمارے تنقیدی خیال میں نقص یہ ہے کہ ہم نے مقدم کو موخر اور موخر کو مقدم کر دیا ہے"

فیض مقدم کو مقدم اور موخر کو موخر کی حیثیت سے پیش کرنے کا ملکہ رکھتے ہیں اس لئے ایک اچھے نثر نگار کی طرح ان کی تحریر میں تقلیل الفاظ، قطعیت، معروضیت اور تخلیقی تصرف بنیادی عنصر کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ایک جگہ موضوع اور طرز ادا پر بحث کرتے ہوئے الفاظ اور معانی کی نسبت سے انہوں نے خیال اور موضوع کی اہمیت ظاہر کی ہے " اچھے ادب میں موضوع اور طرز ادا اصل میں ایک

ہی شے کے دو پہلو ہوتے ہیں اور ان میں دوئی کا تصور غلط ہے۔ الفاظ اور ان کے معانی الگ الگ اور یکے بعد دیگرے نہیں ایک ساتھ اور بیک وقت ہم تک پہنچتے ہیں، اگر کسی کے پاس کہنے کے لیے کوئی بات نہیں ہے تو اس کا طرزِ بیان کیا رہے گا۔ اور اگر اسے بیان پر قدرت نہیں تو ہمیں یہ کھوج کیسے ملے گا کہ حضرت کیا کہنا چاہتے تھے۔"

فیض نے اپنے مضامین میں ہر جگہ یہی کوشش کی ہے کہ موضوع کو اپنے منفرد اسلوب کے ذریعہ ان حضرات تک پہنچا دیں جو اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس کوشش میں ان کا انداز بندھے ٹکے اصولوں کا پابند نہیں ہے۔

فیض نے نثر میں اپنی تخلیقی ذہانت سے پورا پورا کام لیا ہے۔ لیکن نثر "شعری نثر" ہونے کے بجائے معروضی اور تخلیقی نثر ہے۔ اصولی مسائل کی بحثوں میں بھی انھوں نے اپنا جمالیاتی شعور برقرار رکھا ہے۔ ویسے بھی عام طور پر بعض اہم ناقدوں اور نثر نگاروں کی رائے ہے کہ اچھا شاعر ہی اچھی نثر اور اچھی تنقید لکھ سکتا ہے۔ تعصب اور جانبداری کو بالائے طاق رکھ کر دیکھا جائے تو یہ بات خاصی واضح ہے کہ وجدان اور منطق، تخیل اور تعقل، جذبے اور تجربے، مشاہدے اور محاکے کے تمام نشیب و فراز کا ایک تخلیقی ذہن کو غیر تخلیقی ذہن کے مقابلے میں زیادہ تجربہ ہوتا ہے۔

کولرج، میتھیو آرنلڈ اور ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ وغیرہ سے قطع نظر خود اردو میں غالب، حالی، شبلی اور اقبال سے لے کر خلیفہ عبد الحکیم، آل احمد سرور، میراجی، عزیز حامد مدنی، انجم اعظمی اور حسن اکبر کمال نے نثر کے جمالیاتی اور تخلیقی ادب کو اپنے اپنے انداز میں بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

(اردو میں "خوبصورت نثر" کی ایک اور مثال محمد حسین آزاد، مہدی الافادی، سجاد انصاری، ابوالکلام آزاد اور میر ناصر علی دہلوی وغیرہ کی تحریریں ہیں، لیکن ان حضرات نے نوک پلک سے درست انشاپردازی اور زبان کے ظاہری رنگ روپ پر اس قدر توجہ دی ہے کہ معروضیت اور قطعیت مفقود ہو کر رہ گئی۔ اس اعتبار سے ان حضرات کو "رومانوی نثر نگار" کہنا زیادہ صحیح ہے جس کی گپ پروری کا گمان ہوتا، ممکن ہے تحریر کا کوئی خاص وصف ہو لیکن جہاں تک کامیاب نثر کا تعلق ہے اس میں دھی کو دھی اور گپ کو گپ ہی معلوم ہونا چاہیئے)

میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ فیض نے نثر لکھتے وقت اپنی تخلیقی ذہانت سے پورا کام لیا ہے۔ وجدان سے خیال اور الفاظ تک ایک تخلیقی ذہن کو کن کن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اس کی تصویر فیض نے کمال خوبی سے پیش کی ہے۔ وہ اس کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ تخلیقی اور غیر تخلیقی ذہن میں کیوں امتیاز کرتے ہیں۔ اگر کسی غیر تخلیقی ذہن سے یا ایسے تخلیقی ذہن سے جس نے خود اپنی اقلیم فن کا سفر ابھی مکمل نہ کیا ہو دریافت کیا جائے کہ خیال اور جذبہ اپنی تجریدی نوعیت سے گزر کر مخصوص الفاظ کے قالب میں منتقل ہو کر دوبارہ اثر انگیزی کی منزل تک پہنچنے میں کن کن مراحل سے گزرتا ہے تو شاید وہ اسکا یہ جواب دے کہ تخلیقی عمل کا تجزیہ ناممکن ہے۔ وجدانی طریق کار کے بارے میں صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر خیال اپنی ایک تصویر رکھتا ہے جو لفظ، رنگ یا خطوط کی صورت میں کاغذ کینوس یا پتھر پر منتقل ہو جاتا ہے۔

بعض سنجیدہ فکر شاعروں نے خیال اور جذبے بلکہ خود تخلیقی عمل کی بہت موثر انداز میں تصویر کشی کی ہے اور تجرید کو تجسیم کی منزل تک لانے میں کامیاب رہے ہیں۔ ایک ایسی ہی کامیاب کوشش فیض کی ایک تحریر میں ملتی ہے۔ اس میں سب سے پہلے انھوں نے تخیل کے

وضاحت کی ہے کہ وہ تخیل بجائے خود ایک تخلیقی عمل ہے خواہ فن کی صورت میں اسکا اظہار ہو یا نہ ہو۔ اس عمل کو ہم تخلیقی اس لئے کہتے ہیں کہ اسکے توسط سے جو ذہنی تجربہ مرتب ہوتا ہے اس کی صورت اور ماہیت اسی عمل سے ایجاد ہوتی ہے اور خارجی یا داخلی دنیا میں اس کی اور کوئی نظیر نہیں ملتی ۔ .... یہ تخیل کسی مخصوص مشاہدے، یاد، تصور یا جذبے کا سا منفرد اور الگ تھلگ ذہنی عمل نہیں ہوتا بلکہ ان سب سے مرکب ایک کیفیت ہے جو ان سب اجزا میں شامل اور جس میں یہ سب اجزا شامل ہوتے ہیں۔"

اس نظری بحث کی مزید تفہیم کی غرض سے فیض نے مصحفی کا ایک شعر منتخب کیا ہے جس کی تشریح کرتے ہوئے اپنے خاص اسلوب میں انہوں نے اپنے موقف کی وضاحت کی ہے ۔

"چلی بھی جا جرسِ غنچہ کی صدا پہ نسیم
کہیں تو قافلۂ نو بہار ٹھہرے گا !

جرس، غنچہ ، صدا، نسیم، قافلہ، بہار اپنی فطری اور حقیقی صورت میں شاعر کے مشاہدے سے متعلق ہیں۔ شاعر کے ذہن میں ان کے تصور کا وجود اس کی یادداشت سے وابستہ ہے، بہار کے حسن اور پاسداری سے شیفتگی اور سرمستی کی تلقین میں فکر اور جذبہ دونوں کا امتزاج ہے، الفاظ کا انتخاب نشست اور صوتی ترتیب شاعر کی صناعت اور فنی اکتساب کا اظہار ہیں لیکن ان میں سے کوئی جز بھی بجائے خود مصحفی کا شعر نہیں ہے ۔ وہ عمل جس سے شاعر نے غنچے کو جرس ، غنچے کے چٹکنے کو اس جرس کی صدا، تختۂ گل کو چھنکتا ہوا قافلہ اور چلتی ہوا کو مسافر بنا کر یہ کارواں اپنی منزل کو روانہ کیا ہے ۔ تخیل ہی کا عمل ہے، اس عمل سے پہلے غنچے اور جرس کے تصورات یا IMAGES میں رشتہ پیدا ہوا۔ اس رشتے سے غنچے کے چٹکنے سے جرس کی صدا کا تانا بندھا ایسے بہت سے غنچے مل کر نو بہار بنے۔ جرس اور غنچے کے تخیلی رشتے کی ایک کڑی اس بہار سے جا ملی اور اسے قافلہ بنا دیا اور پھر یہی زنجیر نسیم کو مسافر کے پیکر میں کشاں کشاں ساتھ کھینچ لائی شاعر کے تخیل نے پہلے اپنے مشاہدے اور یادداشت سے یہ سب تصورات چھانٹ کر الگ کئے، پھر ان میں ایسے رشتے ایجاد کئے، جن کا عالم موجودات میں کوئی وجود نہیں، اس شیرازہ بندی کے بعد ایک نیا مجموعہ مرتب کیا اور اس کے گرد وہی ان جذبات کی فضا قائم کی، جو مشاہدے اور یادداشت نے نجانے کب سے ان تصورات سے وابستہ کر رکھی تھی، تب کہیں جا کر ان سب عناصر اور ان کے مجموعے کو وہ الفاظ نصیب ہوئے جو مصحفی کا شعر ہے۔"

تخلیق اور تخیل کے رشتوں کی وضاحت سے قطع نظر اس طویل اقتباس میں فیض کی کئی حیثیتیں سامنے آتی ہیں۔ قاری، شاعر، مفکر اور نثر نگار۔ ان سب کی ایک مخصوص سطح ہے اور ان سب کی آمیزش اور فیض کی شخصیت کے پرتو سے پیدا ہونے والی چیز وہ عبارت ہے جس میں تخلیقی مطالعے کا عکس اور تخلیقی نثر نگاری کا عنصر منفرد انداز میں کارفرما نظر آتا ہے ۔

ادب کی نظری اور عملی تنقید پر بھی فیض نے غور و خوض کیا ہے۔ ان موضوعات پر انہوں نے ایک خاص انداز سے قلم اٹھایا ہے اور ایسی باتیں پیش کی ہیں جو پیشہ ور ناقدین کی تحریروں کے مطالعے یا اردو تنقید کے مزاج پر غور و فکر کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً ہماری زبان میں تنقید کے اصول کس طرح مرتب کئے جاتے ہیں۔ الفاظ اصطلاحات اور محاکمے کا کیا انداز ہے ہماری موجودہ تنقید سے تنقید کی ضرورت پوری ہوتی ہے اور اس طرح کے بہت سے سوالات خود فیض نے اپنے مضامین میں اٹھائے ہیں اور اپنے ایک خاص نقطۂ نظر سے ان کے جواب بھی دیئے ہیں اس طرح ان کے تنقیدی مضامین میں خود ان کے تنقیدی نظریات بھی سامنے آ گئے ہیں جن کے بارے میں فیض کا کہنا ہے کہ ـــــ ـــــ ـــــ

- - - - - - - - "ان تنقیدی عقائد سے مجھے اب بھی اتفاق ہے۔"

فیض نے "ہماری تنقیدی اصطلاحات" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے، جس کا آغاز ان فقروں سے ہوتا ہے۔

> "ایک تنقید نگار کو جہاں ہماری زبان سے اور بہت سی شکایات ہیں وہاں ایک شکایت یہ بھی ہے کہ اسے حسب ضرورت تنقیدی اصطلاحات نہیں ملتی۔ یہ زبان کے عجز پہ طعن نہیں ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ہماری زبان میں تنقیدی لغت موجود ہی نہیں۔ یا اس میں ایسے الفاظ کی کمی ہے جو مختلف تنقیدی تصورات کو ادا کر سکیں۔ اس شکایت کے معنی صرف اس قدر ہیں کہ ہمارے ہاں تنقیدی الفاظ و تراکیب کے استعمال میں اختلاف اور ابہام موجود ہے۔ ان کی اصطلاحی اہمیت زائل ہو گئی ہے... دوسری بات یہ ہے کہ ان اصطلاحات کی فنی یا قدری اہمیت بہت واضح نہیں۔ ہم نے ابھی تک یہ پرکھنے کی کوشش نہیں کی کہ ہمارے مجوزہ محاسن و معائب محاسن و معائب ہیں بھی یا نہیں اگر ہیں تو کیوں ہیں۔ مثلاً جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں شاعر کے کلام میں سلاست ہے، روانی ہے، خلوص ہے، جدت ہے وغیرہ وغیرہ تو نہ ہی اس شاعر کے کلام کی خصوصیات واضح ہوتی ہیں اور نہ اس کے کلام کے حسن و قبح کا پتہ چلتا ہے۔"

یہ بات ہماری زبان کے بیشتر تنقیدی مضامین پر صادق آتی ہے۔ کسی ایک لفظ یا اصطلاح کا مفہوم ہماری تنقید میں متعین نہیں ہے۔ چند ایک جدت طراز نقاد دو چار اصطلاحیں سب سے ہٹ کر ایجاد کرتے ہیں تو بقیہ حضرات اپنے بے شمار مضامین میں جا و بے جا طور پر انہیں استعمال کر کے ان کی اہمیت اثر آفرینی کی قوت کو کم کر دیتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ فیض نے تنقیدی مضامین میں مروجہ تنقیدی اصطلاحوں سے اور مسائل پر قلم اٹھاتے ہوئے سیاسی اور سماجی اصطلاحوں کے استعمال سے گریز کیا ہے۔ یہی خوبی فیض کی گفتگو میں بھی پائی جاتی ہے۔ وہ اپنے موقف کی وضاحت کے لئے سرمایہ داری نظام، جاگیرداری نظام، استحصال، پرولتاری، بورژوازی، آمریت، فاشیت وغیرہ قسم کی پٹی پٹائی فرسودہ اصطلاحیں استعمال نہیں کرتے ہیں۔ چنانچہ علمی موعظت کے بے درد اظہار کے بجائے روزمرہ زندگی سے الفاظ اور اصطلاحیں اخذ کر کے اپنی بات کو زیادہ موثر بنانے کے فن سے فیض بخوبی واقف ہیں، اسی لئے ان کی تحریر موثر اور شارع عام سے ہٹی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ایک مغنیانہ انداز گفتگو کے بجائے ان کی تحریر اور تقریر میں سیدھے سادے اور براہ راست الفاظ ہوتے ہیں جن میں زندگی، حرارت اور توانائی اور روزمرہ تجربات اور مشاہدات کا کرب ملتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ احساس بھی ہوتا جاتا ہے کہ ایک نظریے اور ایک مخصوص فکر کو انہوں نے اپنی ذات میں تحلیل کر لیا ہے۔ مسائل کے بارے میں ان کا تجزیہ اتنا مکمل ہے کہ وہ اصطلاحوں سے مرعوب کرنے یا "کتابی علم" کے بل بوتے پر تقریر کرنے کے بجائے افہام و تفہیم کی فضا میں لکھتے اور بات چیت کرتے ہیں۔ اسی لئے ان کی نثر LABOURED یا پرآورد نہیں معلوم ہوتی۔ البتہ جہاں کہیں وہ مجلسی آداب کے ضرورت سے زیادہ پابند ہو کر سوچتے یا لکھتے ہیں وہاں ان کی تحریر میں ایک نمایاں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ یہاں الفاظ بھی زیادہ تر وہ نہیں ہوتے جو وہ بے تکلفانہ انداز میں استعمال کرتے ہیں اور نہ ہی تحریر میں وہ روانی اور قطعیت ہوتی ہے جو نظری مسائل پر لکھتے وقت نظر آتی ہے۔ ایسے مواقع ان کے ہاں بہت کم آتے ہیں لیکن جب کبھی ایسا موقع آتا ہے تو انداز کلام کچھ ایسا ہو جاتا ہے۔

اورنٹیل کالج کے اساتذہ اور طلبائے قدیم کی جماعت میں اصحابِ علم و دانش کے بہت سے نام مرقوم ہیں۔ اس جماعت کی کسی تقریب میں شرکت بھی اعزاز سے کم نہیں۔ صدارت کا منصب تو ردیف بابید کے علاوہ اور بھی بہت سے کمالات چاہتا ہے۔ اربابِ انجمن کی اس مرحمت اور جنابِ صدرِ استقبالیہ کے کرم گستر الفاظ کے لیے میں انتہائی احسان مند ہوں تاہم اس مشفقانہ غلط بخشی کا بھید مجھ پر نہیں کھل سکا۔ مجھے اپنے کرم فرماؤں سے نہ تو ہرگز یہ گمان نہیں کہ مسندِ صدارت کے لیے ان کے انتخاب میں طنزِ ملیح کا کوئی پہلو نمایاں ہے۔"

مضمون خواہ کسی موضوع پر ہو فیض اس کا آغاز کسی غیر ضروری تمہید کے بغیر ایک ایسے جملے سے کرتے ہیں جس کے بعد نفسِ موضوع شروع ہی سے آپ کے خیال کا دامن تھام لیتا ہے۔ اور آپ ہمہ تن توجہ بن کر اس بحث میں شریک ہو جاتے ہیں۔ اکثر مضامین میں ان کا طرزِ اظہار منطقیانہ ہے۔ وہ چند اصول مرتب کر کے گفتگو شروع کر دیتے ہیں، دلیلوں اور سوالوں سے اپنی ہی قائم کردہ دلیلوں اور سوالوں کا جواب دیتے اور موضوع کے پرت کھولتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ وہ یک لخت پردہ کشائی کے قائل نہیں ہیں بلکہ چہرۂ معانی سے آہستہ آہستہ نقاب اٹھانا انہیں زیادہ پسند ہے۔ وہ تجلّیِ نور پاش نگاہوں کو خیرہ کر دینے والی روشنی کے بجائے مہتاب کی ہلکی ہلکی پھوار کے زیادہ دلدادہ ہیں۔ یہی ان کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو بھی ہے وہ عام زندگی میں بہت کم سخن، شرمیلے اور دھیمے لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر گفتگو کرنے کے عادی ہیں شاعری کی طرح ان کی نثر میں بھی ایک طرح کا دھیما پن پایا جاتا ہے۔ لیکن اس دھیمے پن سے استدلال کی کمزوری یا بیان کی نقاہت کے بجائے شرافت اور فنکارانہ انکسار مترشح ہوتا ہے۔

فیض کے ادبی فیصلوں سے، اصولوں کی بنیاد پر تو نہیں البتہ ذاتی پسند یا ناپسند کی بنا پر اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ ممکن ہے فیض کی ذاتی رائے یہ ہو۔ "حسرت موہانی کے بعد بہت کم شعرا ایسے ہوں گے جنہیں غزل کے مزاج سے ایسی صحیح مناسبت نصیب ہو جیسی خم کاکل دسیف کا مجموعۂ کلام ہے لیکن جہاں تک شعر کے مزاج اور شاعر کی ذہنی تعمیر کو سمجھنے کا تعلق ہے۔ اس منزل میں فیض نے خاصا ذمہ دارانہ رویہ اختیار کیا ہے اور ایسے موقعوں پر ان کی آرا بہت جچی تلی اور محتاط ہوتی ہیں۔ اور اس منزل پر پہنچ کر ان سے اختلاف کی گنجائش کم رہ جاتی ہے۔ مثلاً سیف کے بارے میں لکھتے ہوئے آگے چل کر اپنے موقف کی یوں وضاحت کر دی ہے۔ "اس سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ حسرت کے بعد سیف ہمارا سب سے بڑا غزل گو شاعر ہے یا سیف سے بہتر غزل کہی نہیں گئی، لیکن میں یہ ضرور سمجھتا ہوں کہ آج کل کے دور میں غزلیات کا ایسا مجموعہ مشکل ہی سے ہاتھ آئے گا۔ جس میں غزل کے مخصوص محاسن کا ایسا مسلسل اور ہموار اظہار ہو جیسا کہ سیف کے کلام میں ہے۔" یا اسی طرح جوش ملیح آبادی کو انقلابی شاعر کی حیثیت سے پرکھتے ہوئے پہلے انھوں نے انقلابی شاعر کا مفہوم متعین کیا ہے اور اسی مفہوم کی روشنی میں جوش کی انقلابی شاعری کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ وہ جوش کی عظمت اور اہمیت کے منکر نہیں ہیں، لیکن انقلابی ادب اور ترقی پسند ادب کو وہ نمایاں فرق کا حامل سمجھتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ "صحیح انقلابی شاعری وہی ہے جو اشتراکی عقائد کے مطابق ہے۔" کیونکہ آج کل عام طور سے "اصطلاحی معنوں میں انقلابی نظریئے سے اشتراکی نظریہ مراد لیا جاتا ہے۔" فیض کے خیال میں جوش نے کامیاب ترقی پسند نظمیں لکھی ہیں لیکن ہر ترقی پسند تحریر کا انقلابی ہونا لازمی نہیں ہے۔ اسی لیے فیض نے جوش کے کلام کے نظریاتی پہلو پر غور کرتے ہوئے ان سے اختلاف کیا ہے۔ انھوں نے جوش کے کلام کی قدر و قیمت کو کم نہیں کیا ہے وہ اسکے افادی اثرات کے قائل ہیں اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ جوش نے مروجہ نظام کے خلاف آواز اٹھائی ہے اور کسی نظام کے خلاف آواز اٹھانا، ہمیشہ جرات اور دلیری چاہتا ہے۔ اس

یہ شک نہیں کہ جوش کی مثال نے بہت سے نوجوان لکھنے والوں کا حوصلہ بڑھایا اور انہیں فکر و نظر کے نئے راستوں اور منازل کی جانب گامزن ہونے کی ترغیب دی۔ اسی طرح شرر اردو ناول، پریم چند، نظیر، اور حالی اور رتن ناتھ سرشار پر ان کے مضامین پڑھ کر فیض کے استدلال اور موقف سے اختلاف کے باوجود، جو بہرحال ذاتی ہے، ان کے تجزیاتی اسلوب کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔

فیض کی نثر اکثر و بیشتر شاداب، شگفتہ اور واضح اور برمحل ظرافت سے معمور ہوتی ہے۔ تحریر میں طنز و ظرافت کی یہ آمیزش سنجیدہ اور باوقار ہوتی ہے۔ جس کو پڑھ کر آپ کے ہونٹوں پر تبسم کی ایک ہلکی سی لکیر ابھر آتی ہے۔ چند جملے ملاحظہ ہوں۔

"اگر آپ اپنی شکایتیں بڑھئی کے پاس لے جا کر جائیں تو کیا اس جواب سے آپ مطمئن ہو جائیں گے کہ صاحب آپ کے سب اعتراضات "غیر کرسیانہ" ہیں۔"

"موجودہ اردو شاعری کی ایک علامت تو یہ علامات کا لفظ ہی ہے۔ ذرا غور کیجئے اگر آپ آج سے پہلے کسی سے یہ پوچھتے کہ کیوں جی آپ کی شاعری کی علامات کیا ہیں تو آپ کو جواب ملتا۔ شاعری کی علامات؟ لاحول ولا قوۃ، شاعری نہ ہوئی طاعون ہوا۔"

"جمالیات کے شیدائی اس پر یہ اعتراض کریں گے کہ سماجی مفاد اور سماجی اہمیت ایک شاعر کے لئے مہمل اور بیکار باتیں ہیں، کسی نقاد کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ملا عبدالرحمن کو اپنی غیر شاعرانہ روزمرہ زندگی کے مسائل میں الجھانے کی کوشش کرے۔"

"اہل نظر کو یہ الجھن اس لئے در پیش ہے کہ ان کا کاروبار اس شے سے بندھا ہے جسے اب سے پہلے کلچر یا تہذیب اور آج کل "ثقافت" کہتے ہیں۔ سب سے پہلے آپ اسی بات پر غور فرمایئے کہ ہم نے اسی لطیف شے کے لئے ایسا "ثقیل" لفظ کیوں چنا ہے۔ محض اس لئے کہ یہ لفظ کوئی بغداد کا باشندہ ہے اور اس لئے معتبر ہے۔"

"ہمارے فنی اور تہذیبی کاروبار کی کیفیت کچھ ایسی ہے جیسے بزرگوں کی آنکھ بچا کر سگریٹ پی جاتی ہے۔"

"سنان و خنجر، شمشیر و سناں، تیر اور کمند وغیرہ زیادہ دیکھنے میں نہیں آتے عاشقی کی دنیا میں DISARMAMENT (تخفیف اسلحہ) ہو چکی ہے۔"

ادبی تنقید کے ضمن میں فیض نے قدما اور معاصرین میں سے بعض ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے

ہوتے نہ صرف　　　ادب کی تنقید کے لئے ایک الگ اسلوب ایجاد کیا ہے بلکہ مصنف اور تصنیف دونوں کا جائزہ لیتے وقت ان کے سماجی، سیاسی اور اقتصادی پس منظر کو بھی پیش کیا ہے۔ اس صورت میں ادیب یا شاعر معاشرے یا زندگی سے الگ کوئی چیز معلوم ہونے کے بجائے زندگی کے سارے عوامل سے متاثر ہوتا ہوا ایک حساس اور ذمہ دار معاشرتی اکائی کی حیثیت سے جدوجہد حیات میں شریک نظر آتا ہے اس طرح مصنف کی تحریر میں محض "روح عصر" کا لفظ استعمال کر کے اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو جانے کے بجائے انھوں نے خود روح عصر کو پیش کر دیا ہے کہ آپ احساس کی شدت سے گزر کر اس سماجی اکائی کے ذہن تک پہنچیں جس نے کچھ محسوس کیا اور اس احساس کو آپ تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ جو باتیں نظری مسائل کے ضمن میں تخلیق اور تنقید سے متعلق انھوں نے سوچی ہیں۔ ان کی مزید وضاحت ان کے ادبی مقالات میں ملتی ہے۔

نثر نگار کی حیثیت سے فیض نے الفاظ کی ترتیب اور انتخاب میں بیشتر اوقات ذمہ داری سے کام لیا ہے۔ اور خیال کو صحیح الفاظ میں پیش کرنے کے لئے کلچر یافتہ، اہمیت اور نا اہمیت، تجزیات کا تجزیہ، جذباتی وفاداری اور اسی قسم کی بہت سی تراکیب وضع کی ہیں۔ تاہم کہیں کہیں نظم کی طرح نثر میں بھی وہ بعض ایسی غلطیوں کے مرتکب ہو جاتے ہیں جو فیض یا کسی بھی قابل تقلید شاعر یا ادیب کے لئے مناسب نہیں۔

آخر میں ایک بہت اہم مسئلہ باقی رہ جاتا ہے۔ وہ ہے کلچر یا تہذیب کا مسئلہ۔ فیض انسانی تاریخ کے مادی اور جدلیاتی عمل سے باخبر ہیں۔ ان کے مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے برصغیر کے مخصوص حوالے کے ساتھ بین الاقوامی اور عالمی مسائل کا جائزہ لیا ہے اس ضمن میں انھوں نے نہ صرف بعض بنیادی سوالات کے جواب دیئے ہیں بلکہ خود بہت سے سوال اٹھا کر قاری اور اہل قلم کو سوچنے کی طرف مائل کیا ہے۔ ہر باشعور ادیب تخیل، تعقل، جذبہ، فکر، ذریعہ اظہار، الفاظ، وجدان، تجربہ، مشاہدہ زمان و مکان عدم و وجود جیسے فلسفیانہ اور طبیعاتی و مابعد الطبیعاتی موضوعات کے بارے میں سوچتا ہے لیکن اقتصادی قوتوں کو اہمیت دینے اور مذہب کے تصور سے الگ ایک قومی تہذیب کے امکانات پر غور و خوض کرنے والے ادیب کے لئے سب سے اہم مسئلہ اس علاقے کی تہذیب کا ہے جس کے اجتماعی شعور کا وہ ایک حصہ ہے اور جہاں ماضی کے رشتوں میں وہ حال کے لئے تانے بانے تلاش کر سکتا ہے۔ مغرب میں تو خیر کلچر یا تہذیب کی تمام بحثیں کسی نہ کسی عنوان جاری رہتی ہیں اور ان دنوں وہاں سائنسی کلچر اور ادبی کلچر جیسی　　　ؤں پر بحث کی جا رہی ہے۔ لیکن برصغیر کا مسئلہ ذرا مختلف ہے۔ تقسیم پاک و ہند سے قبل ہندو مفکر ہندو کلچر اور مسلم مفکر مسلم کلچر کا مفہوم متعین کرنے کی فکر میں منہمک تھے تاکہ دو قومی نظریے کا جواز پیدا ہو سکے۔ ان تحریروں کا خاصا اثر ہوا جو "مسلم کلچر ان انڈیا" اور "ہندو کلچر ان انڈیا" جیسے عنوانات کے تحت منظر عام پر آئی تھیں۔ لیکن ان میں غور و فکر کی ٹھوس بنیاد اور سائنسی انداز نظر مفقود تھا۔

قیام پاکستان کے بعد کلچر کے مسئلے پر زیادہ سنجیدگی سے غور و خوض کیا گیا ہے مگر ابھی تک اس سلسلے میں کوئی بات واضح نہیں ہوئی ہے اور چند سوالات ابھی تک تشنہ ہی معلوم ہوتے ہیں اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ پاکستان ایک ایسی جغرافیائی مملکت ہے جس کی تہذیب گذشتہ [illegible] ٹیکسلا [illegible] سے ملتی ہے اور سیاسی اعتبار سے اس مملکت کی عمر صرف سترہ سال ہے۔ اس مملکت میں مختلف علاقائی کلچر اور ان کے باشندوں کے جذباتی ردعمل موجود ہیں۔ یہ سب علاقائی قومیں اسلام کے نام پر متحد ہونے کی دعویدار ہیں۔ لیکن کلچر کا مسئلہ ذرا مختلف چیز ہے اور اس پر ذرا مختلف نوعیت سے غور و خوض کرنے کی ضرورت ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مختلف علاقائی زبانوں، لباسوں اور علاقائی تہذیبوں کے دیگر مظاہر کے باہمی ارتباط و اختلاط سے ایک نیا کلچر پیدا ہو رہا ہے۔ جس کا نام ہم پاکستانی کلچر رکھ سکتے ہیں۔ لیکن کلچر صرف حال یا مستقبل

کا نام نہیں ہے۔ اس کا ماضی سے بہت گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ کلچر کا حال درخت کا تنا اور مستقبل اس کے پتے اور ٹہنیاں ہوتی ہیں لیکن ماضی درخت کی وہ جڑیں ہیں جو مٹی میں دور تک پوشیدہ ہوتی ہیں۔ ان جڑوں سے درخت کو الگ کر کے درخت کا وجود قائم نہیں کیا جاسکتا۔ اور جس طرح کسی کیمیاوی یا طبعی عمل کے ذریعہ درخت کو نئی جڑوں کی مدد سے یا جڑوں کے بغیر زندہ رکھنا ممکن نہیں اسی طرح کلچر کے ماضی کو اپنانے کے لئے کسی شعوری کوشش سے کام نہیں لیا جاسکتا۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کلچر کو عقلی بنیاد پر منتخب نہیں کیا جاسکتا۔ صدیوں پرانی روایات سے قوموں کا کچھ تاریخی اور جذباتی رشتہ ہوتا ہے اور یہ سارے رشتے ایک نامیاتی تسلسل میں آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ایک درخت میں کسی دوسرے درخت کی پیوند کاری سے پیوند لگتے ہیں اور پیوندی پھل پیدا کئے جاسکتے ہیں جو شکل و صورت، ذائقے اور دیگر خصوصیات میں بہت انوکھے اور منفرد ہوتے ہیں لیکن یہ سب کچھ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب اصل درخت کی جڑیں یعنی کلچر کا ماضی مصنوعی نہ ہو۔ ہمیں یہ سوچنا پڑے گا کہ سیاسی اعتبار سے سترہ سال پرانی اس مملکت کی پانچ ہزار سالہ تہذیب میں موہنجو ادڑو، ہڑپہ، اور ٹیکسلا کے بعد سندھ میں محمد بن قاسم کی آمد اور مغل تہذیب میں کس طرح ایک ربط، تسلسل اور توازن پیدا کیا جاسکتا ہے۔ ماضی کے ان مختلف النوع حقائق کو ایک نوع کی حقیقت کا مظہر کس طرح کہا جاسکتا ہے؟

ان میں سے بیشتر سوال خود فیض کے ذہن میں بھی فطری طور پر پیدا ہوئے ہیں۔ فیض نے تہذیب کے مباحث کو ان مضامین میں پیش کیا ہے جو تہذیب یا پاکستانی تہذیب پر لکھے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ فیض کے دیگر مضامین میں بھی جو ادب اور نظریے سے تعلق رکھتے ہیں تہذیب یا کلچر کے موضوع سے متعلق سوالات ابھرتے ہوئے نظر آتے ہیں اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ کلچر کے موضوع سے انہیں خصوصی دلچسپی ہے اور وہ کسی نہ کسی عنوان اس پر غور و فکر کرتے رہتے ہیں۔ تہذیب یا کلچر ان کے نزدیک "اقدار (VALUES) کا وہ نظام ہے جس کے مطابق کوئی سماج اپنی اجتماعی زندگی بسر کرتی ہے" تہذیب کے مسئلے کو فیض ایک سماجی سائنس کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں، انھوں نے سب سے پہلے تہذیب کے طول و عرض اور گہرائی سے بحث کی ہے یعنی تہذیب کی تاریخی عمر اس کے علاقائی یا جغرافیائی حدود اور مختلف قومی طبقوں اور عوام میں اس تہذیب کا نفوذ اور رسائی۔ پاکستان کی قومی تہذیب کے موضوع پر لکھتے وقت وہ سب سے پہلے یہ طے کرنا چاہتے ہیں کہ "پاکستانی قوم کیا چیز ہے۔؟" اور اس کا جواب فیض کے پاس یہ ہے کہ "یہ سوال تہذیبی نہیں سیاسی ہے" اس کے بعد تجزیئے کی پہلی منزل یعنی ہماری تہذیب کے نقطۂ آغاز کے سوال کا فیض نے اس انداز سے جائزہ لیا ہے:

پاکستان کی سیاسی تاریخ ابھی بسم اللہ کے مراحل میں ہے۔ لیکن اس خطے کے تہذیبی آثار کی عمر پانچ ہزار سال سے اوپر ہے چنانچہ ایک صورت تو یہ ہے کہ ہم اپنی قومی اور تہذیبی تاریخ سوانجو داڑو اور ہڑپہ سے شروع کریں اگر یہ صورت ہمیں قبول ہے تو ہمیں وہ تہذیبی ورثہ بھی اپنانا ہوگا جو وہ سیاسی ادوار میں ویدک، برہمنی، یونانی اور بعد معاشروں نے پیدا کیا اس میں الجھن یہ ہے کہ ہمیں اپنے فنی اور تہذیبی تصور اور تخیل میں کافی ترمیم کرنی پڑے گی۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ہم اپنی تاریخ، برصغیر ہند میں مسلمانوں کے دور سے شروع کریں۔ اس میں یہ الجھن ہے کہ ہمارے اجداد کسی واحد قوم وطن یا تہذیب کے نمائندہ نہ تھے۔ ان میں عرب بھی تھے ایرانی بھی تورانی بھی افغانی بھی۔ ہر ایک کی تہذیب الگ اور تاریخ جدا، مذہبی اور اخلاقی قدروں کے اشتراک اور طویل تاریخی اختلاط کے باعث ان تہذیبوں میں بہت سی باتیں مشابہ ضرور ہیں۔ لیکن کوئی ترک عرب، تہذیب یا قومیت کو اپنانے پر تیار نہیں، نہ کوئی عرب، ایرانی ——————

——— تہذیب و تاریخ کی وراثت قبول کرتا ہے پھر ان تہذیبوں کی ابتدا از منۂ قبل اسلام میں ہوئی ہے اور انکے موجودہ نام لیوا اس قدیم وراثت سے نہ منکر ہیں نہ شرمسار۔"

اس تجزیے میں فکر کے ساتھ ساتھ فیض کا وہ مخصوص اسلوب نثر نگاری بھی انتہائی نکھری ہوئی صورت میں نمایاں ہے جس کے ساتھ ادا کی تعمیر شعور اور احساس کے باہمی امتزاج اور متوازن ہم آہنگی سے ہوتی ہے اس بحث میں تہذیب کے ضمن میں جغرافیائی حدود کے مسئلے پر اس انداز سے غور و خوض کرنے کے بعد وہ جغرافیائی حدود کو بھی تہذیب کی بحث میں ایک مزاحم عنصر سمجھتے ہیں۔ البتہ اس بحث کی تیسری اور آخری شق یعنی تہذیب یا کلچر کی گہرائی کے سوال میں انہیں اس مسئلے کا حل اساسی دکھائی دیتا ہے۔ کیونکہ "اس کا انحصار بیشتر سماجی یا معاشرتی نظام پر ہوتا ہے۔ یوں بھی ہو سکتا ہے کہ کسی معاشرے میں علم و فن، تہذیب و شائستگی زندگی کی دوسری نعمتوں کی طرح ایک بہت ہی محدود طبقے سے مخصوص ہوں اور یوں بھی ممکن ہے کہ قومی معاشرہ بہت غیر مساوی ہو اور اسکے مختلف طبقوں میں بہت دوری نہ ہو۔"

فیض نے اس مسئلے کو بھی اصطلاحی زبان کا شکار ہوئے بغیر حل کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستانی تہذیب کا مسئلہ صرف اس کے عنصر ثالث ہی پر ارتکاز توجہ کے بعد حل ہو سکتا ہے۔ اسکے بعد ماضی اور حال کے بہت سے رشتوں سے ہم خود کو ہم آہنگ کر سکیں گے اور وہ تہذیب عالم وجود میں آسکے گی جس سے نہ ہم منکر ہونگے اور نہ شرمسار۔

تہذیب جیسے مسئلے پر سوچتے وقت ایک ایسے مصنف اور مفکر کے جو نہ ماہر سماجیات ہے اور نہ ماہر بشریات، ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اور لوگ اس مسئلے کو کس نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں اور سرے سے دیکھتے بھی ہیں یا نہیں۔؟ اس وقت ان لوگوں کے چہرے ذہن کے پردے پر ابھرنے لگتے ہیں "جو تہذیب یا فن کا نام سنتے ہی یہ سوال کرتے ہیں کہ اس شے کے فوائد بیان کیجیے اس سے قومی خزانہ میں کتنا پیسہ آتا ہے، زر مبادلہ میں کیا بچت ہوتی ہے، گندم کی پیداوار میں کیا اضافہ ہوتا ہے۔"

فیض نے اس سوال پر غور کرنے کے بعد اسکا جواب　یوں دیا ہے "ان بزرگوں کی خدمت میں یہی عرض کیا جا سکتا ہے کہ قومی تہذیب کی تشکیل سے یہ سب کچھ تو شاید نہیں ہوتا لیکن اسکے بغیر ان میں سے یقیناً کچھ بھی نہیں ہوتا وہ اس لیے کہ اپنا قومی مقام پہچاننے کی اولین شرط یہی ہے۔"

شائستہ کلچر کی تکوین کے لئے فیض کے ذہن میں کچھ باتیں بہت واضح ہیں اور انہوں نے نہایت وضاحت کے ساتھ انہیں بیان بھی کیا ہے۔ ان کے خیال میں ہمیں شائستہ کلچر کے قیام اور اس کی ترقی کے لئے ایک دوہرے عمل کی ضرورت ہے یعنی (۱) "کلچر کی نوعیت بدلی جائے تاکہ عوام کی زندگی کا جزو بن سکے۔" (۲) "عوام کی صلاحیتوں میں اضافہ کیا جائے تاکہ وہ اس کلچر کو قبول کر سکیں" اس کی مزید وضاحت یوں کی ہے "(۱) سماجی اقدار کی تربیت موزوں کی جائے اور صحیح اقدار کا پرچار کیا جائے (۲) ان اقدار کو عوام کے لئے اجتماعی طور پر سہل الحصول بنایا جائے۔"

فیض کی نثر کے مطالعے سے مجموعی تاثر یہی قائم ہوتا ہے کہ شعر و ادب کے مسائل ہوں یا تہذیب اور انسانی افکار کے مباحث،　فیض ان موضوعات پر اس وقت قلم اٹھاتے ہیں جب ان کے ذہن میں موضوع کی نہ صرف جزئیات واضح ہو جائیں بلکہ وہ ان جزئیات کی ایک　مجموعی تصویر بھی موثر اور مکمل الفاظ کے ذریعے آپ تک پہنچا سکیں۔ اسی لئے فیض کی نثر میں ایک انفرادی اسلوب نظر آتا ہے۔ لیکن اس اسلوب کو ہم اردو کے اسالیب نثر میں تاریخی یا تنقیدی اعتبار سے کیا درجہ دیں گے

اس کا فیصلہ فی الحال مشکل ہے اس لیے کہ شبلی یا حالی کی طرح فیض کی نثر کا ابھی کوئی "اعتبار" قائم نہیں ہوا ہے۔ تاہم یہ کہا جا سکتا ہے کہ فیض کی نثر ہمارے اپنے دور کی نثر ہے۔ جس میں دولت یا انقلاب پر اظہار خیال کرتے ہوئے بقول فیض صرف اتنا ہی لکھ دینا کافی نہیں کہ "ترا جسم ایک ہجوم ریشم و کمخواب ہے سلمیٰ" یا "انقلاب زندہ باد"۔ عہد جدید میں لکھنے والا ایک ایسی حساس سماجی اکائی ہے۔ جو اگر عاشق ہے تو اسے صرف "محبوبہ کے حسن اور اپنی بیقراری کا احساس نہیں ہوتا۔ بلکہ غم روزگار، گناہ کا خوف، جسم کی تشنگی، روح کی تنہائی، اپنی بے بضاعتی کا احساس اور ایسی ہی کئی ایک باتیں اس کے تجربے میں شامل ہوتی ہیں۔ سماج اور انقلاب پر غور کرتا ہے تو یہ بھی کچھ ایسی سیدھی بات معلوم نہیں ہوتی۔ اسکے اپنے طبقے کا مستقبل، مختلف سماجی قوتوں کے باہمی داؤ پیچ، بین الاقوامی مہرہ بازی اور کئی ایسے الجھاؤ دکھائی دیتے ہیں۔"

دور جدید کے اس مسلسل کرب اور شدید کشمکش سے گزرنے اور اس سے آگاہ ہو جانے کے بعد آگہی کا جبر سہنے کے لیے منزل یا نروان سے بے نیاز ہو کر لمحۂ موجود کی منطق پر خلوص اور سچائی سے عمل پیرا ہونا پڑتا ہے۔ ذات کے تمام گوشوں میں جھانکنے اور نظام زندگی کے گرداں سیاروں کو دانش و فکر کی دوربینوں سے دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور پھر اس سارے مشاہدے کو احساس کی وسعت میں جذب کر کے الفاظ کے محسوس پیکر تراشنے پڑتے ہیں یہ سارا عمل نظام زندگی کو دیکھنے کا عمل ہے جس کے بارے میں خود فیض کا یہ کہنا ہے کہ:۔

"نظام زندگی کسی حوض کا ٹھہرا ہوا ساکن بستہ مقید پانی نہیں ہے جسے تماشائی کی ایک غلط انداز نگاہ احاطہ کر سکے۔ دور دراز اوجھل دشوار گزار پہاڑیوں میں برفیں پگھلتی ہیں، چشمے ابلتے ہیں، ندی نالے پتھروں کو چیر کر، چٹانوں کو کاٹ کر آپس میں ہمکنار ہوتے ہیں اور پھر یہ پانی کہیں سرعت، وادیوں، جنگلوں اور میدانوں میں کٹتا اور پھیلتا چلا جاتا ہے۔ جس دیدۂ بینا نے انسانی تاریخ میں یہ زندگی کے یہ نقوش و مراحل نہیں دیکھے، اس نے دجلہ کا کیا دیکھا ہے۔"

"شاعر کا تجزیہ جتنا گہرا اور ہمہ گیر ہوگا، اتنا ہی زیادہ اس میں متاثر کرنے کی صلاحیت ہوگی، اور یہ صلاحیت جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں یقیناً ایک جمالیاتی خوبی ہے۔ اگر جمالیاتی قدر محض الفاظ کی شستگی اور بندش کی چستی پر منحصر ہوتی تو چرکین کو ہمارے چوٹی کے شعراء میں سے ہونا چاہیے تھا۔"

فیض

اختر جمال

فیض کے دو عشق

اس عشق نہ اس عشق پہ نادم ہے مگر دل
ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغِ ندامت

انصاف ہے کہ حکمِ عقوبت سے پیشتر
اک بار سوئے دامنِ یوسف تو دیکھیے

اور

قفس ہے بس میں تمہارے، تمہارے بس میں نہیں
چمن میں آتشِ گل کے نکھار کا موسم

یہ لہجہ اور یہ آواز بالکل نئی ہے! گیت نیا نہیں ہے۔ غمِ عشق اور غمِ روزگار یہ دو موضوع شاعروں کو ہمیشہ سے محبوب رہے ہیں ؎

تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا
فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے! (غالب)

اور

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا (غالب)

فیض کا کمال ان موضوعات کو نیا آب و رنگ دینا ہے۔ حقیقت کی اسی انفرادیت نے ان کی شاعری کو مقبولِ عام بنایا ہے ؎

ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیض گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے

نقشِ فریادی میں غمِ عشق غالب ہے لیکن دستِ صبا تک پہونچتے پہونچتے غمِ روزگار غمِ جاناں پر پوری طرح حاوی ہے اور پھر ایک منزل ایسی آتی ہے کہ دونوں غم پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں۔ غمِ جاناں روگ نہیں بلکہ علاج بن جاتا ہے۔ اور غمِ دوراں کا بار غمِ جاناں کے سہارے آسان لگتا ہے! غمِ روزگار کی ترجمانی میں جذباتیت کے بجائے عقلیت کارفرما ہے "اے دلِ بے تاب ٹھہر" — "سیاسی لیڈر کے نام" — "صبحِ آزادی" — "دو آوازیں" — "سرِ مقتل" — اور "شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں" ان کے سیاسی شعور کی ترجمان ہیں۔

فیض کی سیاسی نظمیں ادبی رنگ و آہنگ کے لحاظ سے ادبی زیادہ اور سیاسی کم ہیں! نعرے بازی، جوش، غصہ، للکار اور چیخ پکار کہیں سنائی نہیں دیتی۔ ایک پُرسکون سی خاموشی ہے جس میں ذہن الاؤ کی طرح سلگتا ہے اور سوچتا ہے اور پھر اس الاؤ کی چنگاریاں احساسات اور جذبات میں اس طرح آگ سی لگا دیتی ہیں کہ سارا وجود جلنے لگتا ہے۔ لیکن اس وقت جذبات اور احساسات کے لاوے میں گھبرا کر ذہن خودکشی پر مائل نہیں ہوتا۔ بلکہ اپنے ماحول اور حالات سے بھرپور نفرت کا ایک ایسا احساس لے کر اُٹھتا ہے کہ ماحول اور نظام کو یکسر بدل دینے کی آرزو جنم لیتی ہے!

ان سیاسی نظموں کا تاثر اس وجہ سے بھی زیادہ ہوتا ہے کہ ان میں لفاظی نہیں بلکہ پُرخلوص جذبات ہیں اور روایت و جدت کے کامیاب تجربے نے ان احساسات اور جذبات کو فنِ شعر میں اس طرح ڈھالا ہے کہ وہ خوب صورت اور پُراثر بن گئے ہیں ؎

روشن کہیں بہار کے امکاں ہوئے تو ہیں
گلشن میں چاک چند گریباں ہوئے تو ہیں

یُوں بہار آئی ہے امسال کہ گلشن میں صبا
پوچھتی ہے گذر اس بار کروں یا نہ کروں

یہ ضد ہے یادِ حریفانِ بادہ پیما کی
کہ شب کو چاند نہ نکلے نہ دن کو ابر آئے

وہ جب بھی کرتے ہیں اس نطق و لب کی بخیہ گری
فضا میں اور بھی نغمے بکھرنے لگتے ہیں

خوب صورت تشبیہات اور استعارات، نئی تراکیب، نغمگی اور پھر سیاسی شعور کی پختگی! بات بھی خوب صورت ہو، اور کہنے کا انداز بھی دل نشیں، تو وہ بات دل میں اُترتی چلی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے ان کی شاعری نے اتنی جلدی کلاسیک کا مرتبہ حاصل کر لیا!

فیض کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت اُن کا یقین سے بھرپور لہجہ ہے۔ جو نشاط اور اُمنگ کے جذبات پیدا کر دیتا ہے۔ کہیں بھی یاس و افسردگی کی پرچھائیں نہیں ملتی۔ یقین، تازگی، اُمنگ اور نشاط فیض کے لہجے کی خاص پہچان ہے۔ شبِ غم کتنی ہی تاریک سہی، طوق و سلاسل کتنے ہی گراں بار سہی، لیکن ان کے ہونٹوں کی دبی دبی مسکراہٹ، اُن کی آنکھوں کا پُر وقار عزم اور ان کے لہجے میں یقین کی جو پختگی نظر آتی ہے وہ اُن کے نصب العین کو بھی خوب صورت بنا دیتی ہے۔ امید اور روشنی کی

ایک ایسی کیفیت چھا جاتی ہے کہ آتشِ گل کے نکھار کا موسم جیسے واقعی قریب آ گیا ہو۔ فیض کے پڑھنے والے شکست خوردگی اور یاس کا کبھی شکار نہیں ہو پاتے!

فیض کو عوام کی طاقت پر کامل یقین ہے۔ اگرچہ وہ کبھی عوام کے ساتھ مل کر کورس نہیں گاتے لیکن اُن کی آواز میں جو خلوص اور اپنائیت ہے وہ انہیں عوام سے قریب کر دیتی ہے ؎

یہ شام و سحر یہ شمس و قمر یہ اختر و کوکب اپنے ہیں
یہ لوح و قلم یہ طبل و علم یہ مال و حشم سب اپنے ہیں

فیض کی شاعری کی ایک اور خصوصیت رومان اور حقیقت کا خوب صورت امتزاج ہے ؎

اور کچھ دیر نہ گزرے شبِ فرقت سے کہو
دل بھی کم دکھتا ہے وہ یاد بھی کم آتے ہیں

اور ؎

کر رہا تھا غمِ جہاں کا حساب
آج تم یاد بے حساب آئے

فیض کے ہاں مئے لالہ فام نئی ہے۔ خونِ دل کی کشید ہے! لیکن جام و مینا نئے نہیں ہیں۔ انہوں نے پرانی تلمیحات اور اشاروں و کنایوں میں نئی جان ڈال دی ہے۔ "آگ میں پھول کھلانا"۔ "سطوتِ منصور و قیس" اور "دامنِ یوسف" ایک نئے معانی و مطالب کے حامل ہیں۔ فیض نے اردو ادب میں نئی نئی خوب صورت تراکیب کا اضافہ کیا ہے۔ ان کی چند خوب صورت تراکیب دیکھئے: ——— فروغِ گلشن ——— صوتِ ہزار ——— شرطِ نوازگری ——— سطوتِ اسباب ——— گرانباریٔ آداب ——— شب گزیدہ سحر ——— نگارِ صبا ——— ملک شام و سحر ——— جلوہ گاہِ وصال ——— حدیثِ شعلہ رخاں ——— دلداریٔ عروسِ سخن ——— حریفانِ بادہ پیما ——— حدیثِ یار ——— وغیرہ ——— ان تراکیب نے ایک نئی معنویت اور حسن سے آراستہ ہو کر فیض کی شاعری کو چار چاند لگائے ہیں!

ایمائیت اور اشاریت اردو غزل کی خصوصیات ہیں۔ فیض نے ایمائیت اور اشاریت سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔ ان کی غزل کی سب سے بڑی خوبی اور سب سے بڑا حسن اُن کی اشاریت اور ایمائیت ہے ؎

نوائے مرغ کو کہتے ہیں اب زیانِ چمن
کھلے نہ پھول اسے انتظام کہتے ہیں

کیسی خوب صورت اشاریت ہے۔ اس پر زبان و شعر کو ہمیشہ ناز رہے گا!

فیض کے کلام کی ایک اور خصوصیت اس کی موسیقی، ترنم اور آہنگ ہے۔ اردو غزل کی دنیا میں ترنم اور آہنگ کا حسن میر غالب اور اقبال کے بعد سب سے زیادہ فیض کے ہاں نظر آتا ہے۔ ان کی مشہور غزل ؏

"گلوں میں رنگ بھرے بادِ نوبہار چلے"

اس ترنم اور آہنگ کی سب سے خوب صورت مثال ہے۔

فیض اساتذہ میں سوداؔ سے بہت متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ زنداں نامے کی ابتدا بھی سوداؔ کے ایک شعر سے کی ہے ماس شعر کا لب ولہجہ اور انداز بتاتا ہے کہ فیض کی آواز سودا سے کس قدر مشابہ ہے۔ سودا کے تخیل کی رنگینی اور رعنائی اور ان کی طبیعت میں خوشی اور سرمستی کا جو احساس ہے وہ فیض کو سوداؔ کے قریب لے آتا ہے!

کہیں کہیں فیض کے اشعار پڑھتے ہوئے مصحفی کی یاد بھی آتی ہے۔ مثلاً مصحفی کے مندرجہ ذیل اشعار!

چل بھی جا جرس غنچہ کی صدا پہ نسیم
کہیں تو قافلۂ نوبہار ٹھہرے گا

لاکھ ہوا بروئے خاک رنگ شفق برآسماں
خون کہاں کہاں گرا زخم دلِ فگار کا

اس گل کی باغ میں جو صبا نے چلائی بات
غنچے نے مسکرا کے کہا میں نے پائی بات

کھرہے رُخ پر ترے زلفوں کے بل کھانے کی طرح
سیکھے کوئی تجھ سے ہمارے دل کے لے جانے کی طرح

زلف رخسار پہ کھولی تھی سرِ شام اس نے
کہ سیاہی شب ہجراں کی تھی آغاز ہوئی

یہاں فیض اور مصحفی میں جو چیزیں مشترک ہیں وہ اعتدال، نرمی، حلاوت، رنگینی اور صوتی ہم آہنگی ہے! مصحفی کے ہاں جو لسیت ہے وہ بھی فیض کے ہاں زیادہ واضح اور پاکیزہ نظر آتی ہے۔

فیض کے دو ٹوک بات کرنے کا طریقہ داغؔ کی یاد دلاتا ہے ؎

پاؤں کٹوا کے بتاتے ہیں رہِ منزلِ شوق
ہاتھ کٹتے ہیں قلم لوح و قلم دیتے ہیں
(داغؔ)

داغؔ کی جرأت، صاف گوئی، اور دو ٹوک بات کرنے کا انداز فیض کا اپنا انداز ہے۔ صاف گوئی نے اُن کی شاعری کو زیادہ خوب صورت بنا دیا ہے۔ تشبیہوں، استعاروں اور کنایوں کے پردے میں اُن کی صاف گوئی کا حسن اور بھی دل کش معلوم ہوتا ہے ——— فیض کے ہاں صاف گوئی میں ایک قرینہ، احتیاط، اعتدال اور تہذیب ہے ——— داغؔ کہتے ہیں ؎

جناب شیخ ہیں؟ آداب عرض کرتا ہوں
اندھیری رات میں چھپ کر کہاں چلے اُستاد

فیض کہتے ہیں سے

فقیہہ شہر سے مے کا جواز کیا پوچھیں
کہ چاندنی کو بھی حضرت حرام کہتے ہیں

یا

خیر ہم اہلِ دیر جیسے ہیں
آپ اہلِ حرم کی بات کرو

فیض غالب سے بھی متاثر ہیں۔ لیکن اُن کی شاعری کا رنگ و آہنگ غالب سے جُدا ہے۔ غالب کی شاعری میں جو تنوع ہے وہ کسی کے بس کی بات نہیں ہے! اقبال اور غالب ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہیں۔ لیکن غالب کے اس تنوع اور رنگا رنگی کے سامنے اقبال کی شاعری بھی باوجود اپنی وسعت، عظمت اور ہمہ گیری کے کم پایہ معلوم ہوتی ہے! غالب کا اثر فیض کے فن پر کم اور فکر پر زیادہ ہے۔ اُن کے سوچنے کا انداز غالب کا سا ہے سے

ہمارے دم سے ہے کوئے جنوں میں اب بھی خجل
عبائے شیخ و قبائے امیر و تاجِ شہی
ہمیں سے سنتِ منصور و قیس زندہ ہے
ہمیں سے باقی ہے گل دامنی و کج کلہی

اور سے

گر فکرِ زخم کی تو خطا وار ہیں کہ ہم
کیوں محوِ مدحِ خوبیِ تیغِ ادا نہ تھے

ہوئی ہے حضرتِ ناصح سے گفتگو جس شب
وہ شب ضرور سرِ کوئے یار گذری ہے

کر رہا تھا غمِ جہاں کا حساب
آج تم یاد بے حساب آئے

جگہ جگہ پہ تھے ناصح تو کُو بہ کُو دلبر
انہیں پسند انہیں ناپسند کیا کرتے

گلوئے عشق کو دار و رسن پہنچ نہ سکے
تو لوٹ آئے ترے سر بلند کیا کرتے

تری نظر کا گلہ کیا، جو ہے گلہ دل کو
تو ہم سے ہے کہ تمنا زیادہ رکھتے ہیں

ان کے اس قسم کے اشعار کی مرزا غالب سب سے زیادہ داد دے سکتے تھے!

سچ تو یہ ہے کہ فیض نے صنفِ غزل کا حق جیسا ادا کیا ہے ترقی پسند شعرا میں کسی اور سے ممکن نہ ہوا۔ غزل کے روشن مستقبل کی سب سے بڑی ضمانت فیض کی غزل ہے!

فیض کی سیاسی شاعری

فیض کے ہاں براہ راست تخاطب بہت ہی کم ملتا ہے۔ وہ کسی سیاسی موضوع کو اپنی نظم کا عنوان نہیں بناتے۔ چند نظمیں "ایرانی طلبا کے نام" اور "آجاؤ افریقا" وغیرہ سیاسی موضوعات پر براہ راست کہی گئی ہیں! فیض کی سیاسی شاعری اشاروں اور کنایوں میں جھلک دکھاتی ہے۔ لیکن ان کے خوب صورت اشارے اور کنائے ادائے مطلب کو اور زیادہ واضح کر دیتے ہیں۔ جو بات صاف صاف کہی جائے وہ ایک وقتی تاثر رکھتی ہے۔ لیکن خوب صورت کنایوں، تشبیہوں اور استعاروں سے آراستہ ہو کر وہ بات ایک ایسی خوب صورت صداقت بن جاتی ہے جو ہر زمانے کے لئے ہوتی ہے! ایک فن کار کی یہی خوبی اسے کلاسیک کا درجہ دلواتی ہے!

اگر صرف سیاسی پیغام اور سیاسی پالیسی ترقی پسند شاعری ہوتی تو آج نیاز حیدر سب سے بڑے ترقی پسند شاعر کہے جاتے، کیوں کہ ایک خاص لمحے اور وقت میں ایک بڑے ہجوم کو متاثر کرنے والی شاعری صرف ان کی ہے۔ لمحاتی ادب ایک بڑے ہجوم کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اگر وہ اس لمحے کے لئے ہو جب کسی قوم کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہوتا ہے! —— تب وہ ادب قابل قدر ہے! —— لیکن ہر چھوٹے بڑے موڑ پر لمحاتی شاعری کی جائے تو وہ بے وقعت ہو جاتی ہے —— مثلاً ہنس راج رہبر کی یہ نظم ——

نو مارچ کو
یاد ہے ساتھی
ریل کا پہیہ جام کریں گے

آج کتنوں کو یاد ہے، اور اس کی ادبی اہمیت کیا ہے؟

لمحاتی ادب اس خوب صورت پھول کی طرح ہے جو چند ساعتوں کے لئے خوشبو بکھیر جاتا ہے، اور یہ خوشبو ہوا کے جھونکوں میں مل کر کھو جاتی ہے —— وہ ایک چنگاری ہے جو پل بھر کے لئے دہک کر راکھ بن جاتی ہے! —— اس کے برعکس دوامی ادب سمندر میں چاندنی ہے جو موجوں کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ ہر کنارے کو منور کر دیتی ہے۔ دوامی ادب وہ فصلِ بہار ہے جو حیاتِ انسانی کے سب سے نازک اور لطیف گوشوں کو رنگین بنا دیتی ہے!

فیض کا ادب الحاقی نہیں دوامی ہے !!!

زنداں نامے میں " رودادِ قفس " کے عنوان سے سجاد حیدر اسحاق نے ایک جگہ کہا ہے :

"فیض کی شاعری میں سمن و گلاب کی چاہت ہے مگر سمن و گلاب کو سینچ کر شاداب کرنے والے کا ذکر اس طرح نہیں ملتا جس طرح اس کا حق ہے :

اور ـــ

" فیض کی شاعری کو ڈرائنگ روموں، اسکولوں اور کالجوں سے نکل کر سڑکوں، بازاروں، کھیتوں اور کارخانوں میں ابھی پھیلنا ہے "

یہ بات صحیح ہے کہ فیض کی شاعری کا سب سے بڑا قدرداں وہ طبقہ ہے جو تعلیم یافتہ ہے ۔ ایک نئی نسل، ذہین اور ہونہار نسل فیض کی پرستار ہے ۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ یہ نئی نسل کا مکس پڑھتی ہے، ٹوئسٹ کرتی ہے اور بیٹلز کی پرستار ہے ـــ نہیں، یہ بات نہیں ! ایک خاص طبقہ کے نوجوان افراد کو چھوڑ کر نئی نسل حساس اور باشعور افراد پر مشتمل ہے جنہیں اپنے ماحول اور حالات کا گہرا احساس ہے !

ایک عرصے تک یہ نسل اقبال کی پرستار رہی ـــ آج بھی ہے ـــ مگر جب اقبال پر ایک خاص طبقہ نے قبضہ جما لیا اور جملہ حقوق اپنے لئے محفوظ کر لئے تو اس نسل کے پاس فیض ہی رہ گئے ! اقبال کے چھن جانے کا غم گیا نہیں لیکن فیض کو پاکر کم ضرور ہو گیا ہے ۔ اقبال کے اشعار بھی سڑکوں، بازاروں، کھیتوں اور کارخانوں میں نہ گونج سکے ۔ کیوں کہ اقبال ایک فلسفی تھے، عالم تھے، سیاست داں تھے ! اور پھر شاعر تھے !!

اقبال کا مخاطب بھی تعلیم یافتہ طبقہ تھا ۔ لیکن تعلیم یافتہ طبقہ ہی وہ طبقہ ہے جو ہر طبقے کی ذہنی رہبری کا فرض انجام دیتا ہے ! اس کے رہبر بن کر اقبال سب کی رہبری کرتے رہے ۔ اور اب فیض بھی اسی طبقہ کی رہبری کر رہے ہیں !

جوش کے ہاں یہ بات ہے کہ وہ خواص اور عوام دونوں کو رجھانے کا فن جانتے ہیں ۔ مجھے یہ بات اچھی معلوم ہوتی ہے کہ فیض پڑھے لکھے پرستاروں میں گھرے ہوئے ہیں ! شاعری اخبار کا ایڈیٹوریل نہیں ہوتی اور پھر اخبار کا ایڈیٹوریل بھی کتنے لوگ پڑھتے ہیں ؟ شاعری سنسنی خیزی اور نعرہ بازی بھی نہیں ہے ! شاعری تو شاعری ہے ! اور اس لئے جیسے جیسے تعلیم عام ہوگی طبقہ وارانہ سماج ختم ہوگا ۔ سب کو یکساں مواقع حاصل ہوں گے ۔ جب بقول فیض چمن میں آتشِ گل کے نکھار کا موسم آئے گا اور اس ملک کی آبادی میں کھیتوں، کارخانوں اور بازاروں میں ہر جگہ کتاب نظر آئے گی، تو فیض کے پرستاروں میں بھی اضافہ ہو جائے گا ۔ اور فیض عوامی شاعر کہلائیں گے !

فیض کی عشقیہ شاعری

فیض کی عشقیہ شاعری میں بھی اندازِ بیان کی وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جن سے اُن کی سیاسی شاعری میں آب و رنگ

ہے۔ عشقیہ شاعری میں زیادہ حسن اور شوخی ہے۔ رنگینی، رعنائی، لطافت اور احساس کی شدّت نے عشقیہ شاعری کو بھی ایک خاص مقام دیا ہے! ہم فیض کی عشقیہ شاعری اور سیاسی شاعری کو الگ الگ درجے نہیں دے سکتے، نہ الگ الگ خانوں میں بانٹ سکتے ہیں کیوں کہ ان کے فکر و شعور میں دونوں عشق اس طرح رچ بس گئے ہیں کہ انہیں الگ کرنا محال ہے!

نقش فریادی کی محبوبہ سے وہ دامن بچاتے نظر آتے ہیں، کیوں کہ اس وقت ان کے شعور اور جذبات میں وہ یگانگت نہیں ہے۔ جو شاعری کے دوسرے دور میں ملتی ہے۔ دوسرے دور میں شعور پختہ ہے، واضح ہے، اور جذباتِ عشق و جذباتِ حیات میں کسی قسم کا تصادم محسوس نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ اس وقت غم گسار محبوب کی اور زیادہ ضرورت محسوس ہوتی ہے ؎

تمہارے ہاتھ پہ ہے تابشِ حنا جب تک
جہاں میں باقی ہے دلداریٔ عروسِ سخن

تمہارا دم ہے تو دم ساز ہے ہوائے وطن
اگرچہ تنگ ہیں اوقات، سخت ہیں آلام
تمہاری یاد سے شیریں ہے تلخیٔ ایام

یہی نہیں بلکہ ایامِ اسیری میں محبوب کی خوشگوار یاد انہیں اُداس نہیں ہونے دیتی۔ اردو شاعروں کی وہ روایتی حرماں نصیبی اور ہجر کے آنسو فیض کے ہاں نہیں ملتے۔ اُن کو اپنی محبت پر اعتماد ہے اور محبوب پر بھی!

فیض کی عشقیہ شاعری میں ایک ایسا گداز ہے جو اُن کے لہجے اور آہنگ کے ساتھ مل کر ایک لطیف مسرت کا احساس پیدا کرتا ہے۔ ایک درد بھری سی خوشی! خاص طور پر ایامِ اسیری میں لکھی ہوئی نظموں میں یہ بات زیادہ ہے! ہجر میں بھی وہ اس کی یاد سے وصال کے مزے لیتے ہیں۔ اس کی یاد کی ٹھنڈک، اس کے پیراہن کی خوشبو، اس کی زلف کی مہک، ان سب چیزوں کا ذکر جہاں رنگینی رعنائی اور حسن پیدا کرتا ہے وہاں ایک بے نام سی اُداسی بھی چھا جاتی ہے!

فیض کا محبوب

فیض کا محبوب بے حد حسین ہے! سب ہی محبوب حسین ہوتے ہیں۔ مگر اردو ادب کی دنیا میں چند ہی محبوب اتنے حسین ہیں کہ ان کے حسن جہاں تاب پر وقت کی پرچھائیں نہ پڑ سکی۔ اور اس کی چمک چوند آج بھی ویسی ہی ہے۔

اردو ادب کی دنیا میں سب سے زیادہ حسین محبوب میرؔ کا ہے۔ میرؔ کی شاعری کی ساری مٹھاس، رس، موسیقی، کسک، گداز، سپردگی اور سچائی یہ سب اس کی دین ہے! اس کیفیت کی کمی سے غالبؔ کا عشق باشعور ہوتے ہوئے بھی متاثر نہیں کرتا! لو غالبؔ کا محبوب آفت ہو یا بلا ہو ہمارے دل میں اس طرح گھر نہیں کر لیتا جس طرح میرؔ کا سر میلا اور بے نیاز محبوب! گلاب کی پنکھڑی میں اُس کے لب، چشمِ غزل میں اس کی آنکھوں کی وحشت، رگِ گل میں اس کی کمر، کلی کے کھلنے میں اس کی نیم خوابی اور وہ بھی کم کم — ایک حسنِ مجسم، جسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہم خود بھی میرؔ کی طرح کھو جاتے ہیں!

میرؔ کا دل، ان کا درد، چوٹ اور شاید میرؔ کا سا محبوب بھی پھر اردو شعرا میں سے کسی کو نصیب نہیں ہوا!

اگر اردو شعرا کے محبوب مقابلۂ حسن میں حصہ لیں تو میر کا محبوب حسن کے اس تاج کا مستحق قرار دیا جائے گا جو صرف حسن اور سادگی کا مرقع ہے!

دوسرے نمبر پر غالب کا محبوب ہے۔ اس کا چہرہ فروغ مے سے گلستاں ہے۔ سر مست دشنۂ مژگاں تیز اور سیاہ زلف رخ پر پریشان ہے۔ جب وہ سامنے آتا ہے تو آنکھوں کے سامنے بجلی سی کوند جاتی ہے۔ غالب کی شاعری میں ان کے محبوب کی ہر ہر ادا میں بناوٹ اور لگاوٹ کے انداز اس طرح نمایاں ہیں کہ اس کی شخصیت کا ایک انمٹ اثر محسوس ہوتا ہے! لیکن غالب کے محبوب کے حسن سے زیادہ اس کی ذہانت متاثر کرتی ہے ؎

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیئے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

اس مقابلۂ حسن میں تیسرے نمبر پر حسرت کا محبوب ہے۔

اس کا گلابی پیرہن جو اس کے بدن کے گلابی پن سے اور زیادہ گلابی نظر آتا ہے۔ اس کے ساتھ پرشرم وحیا کے موتی، اس کے دانتوں میں دوپٹہ — تپتی ہوئی زمین پر ننگے ننگے پیر! — یہ محبوب اس محفل میں نہیں بیٹھتا جہاں ہر طرف کئی نیم بسمل اور کئی نیم جاں ہوتے ہیں۔ یہ گھریلو محبوب اپنی خوبصورتی سے زیادہ شرم وحیا اور سادگی کی وجہ سے دل میں گھر کر لیتا ہے!

جدید ادب میں سب سے زیادہ موہنی شخصیت فیض کے محبوب کی ہے۔ دوسرے نمبر پر مجاز کا محبوب ہے، اور تیسرے نمبر پر اختر شیرانی کی سلمیٰ۔ حالانکہ اس پر سب سے پہلے نظر پڑتی ہے۔ جوش اور جگر کے ہاں حسن کی نہیں عشق کی حکومت ہے۔ جوش کی محبوبہ کی "گل بدنی" کے باوجود ہمیں جنگل کی شہزادی اور جامن والی زیادہ بھاتی ہیں۔ اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ اگر "نجد ہیبت ناک" سے واپس نہ بھی آتی تو بھی جوش کی شاعری میں اتنی گہما گہمی اور رنگینی نظر آتی کہ کوئی خاص فرق پیدا نہ ہوتا!

جدید اردو شاعری پر جس حسن اور نور کی پھوار پڑ رہی ہے اسے دیکھنے کے لئے فیض کی شاعری کے ورق الٹیے —! ؎

پھول لاکھوں برس نہیں رہتے
دو گھڑی اور ہے بہارِ شباب

آ کہ کچھ دل کی سن سنائیں ہم
آ محبت کے گیت گائیں ہم

یہ آواز ہمیں ہمہ تن گوش کر دیتی ہے اور ہماری نظریں ایک کنج میں ٹھہر جاتی ہیں جہاں ؎

تہہ نجوم کہیں چاندنی کے دامن میں
کسی کا حسن ہے مصروف انتظار ابھی
کہیں خیال کے آباد کردہ گلشن میں
ہے ایک گل کہ ہے ناواقف بہار ابھی

پھر یہ احساس ہوتا ہے کہ بہار سے پہلے ہی شمع آرزوئے جمیل بجھ گئی اور ؎

ہو چکا ختم عہدِ ہجر و وصال
زندگی میں مزا نہیں باقی!

یہ کیفیت جلد ہی ختم ہو جاتی ہے۔ ایک حسین موڑ پر وہ پھر نظر آتی ہے ؎

وہ آنکھ جس کے بناؤ پہ خالق اترائے
زبانِ شعر کو تعریف کرتے شرم آئے

اور ؎

وہ ہونٹ فیض سے جن کے بہار لالہ فروش
بہشت و کوثر و تسنیم و سلسبیل بدوش

حسن کے اس سیلِ بے پناہ میں شاعر ڈوب جاتا ہے۔ لیکن وہ فلمی ہیرو نہیں ہے جسے سوائے عشق کے کوئی کام نہیں ہے۔ اسے روٹی کی فکر ہوتی ہے۔ زندگی کے چھوٹے بڑے مسائل الجھا لیتے ہیں۔ اپنے گرد و پیش کی فضا بڑی ہی کثیف، بوجھل اور تاریک معلوم ہوتی ہے۔ روٹیوں کے ساتھ کوچۂ و بازار میں جسم بکتے دکھائی دیتے ہیں۔ پھر اس کا حسن کتنا ہی دلکش اور جہاں سوز سہی شاعر کی نظر دوسری سمت بھی لوٹ ہی جاتی ہے۔ اور لہجہ پہلی مرتبہ تلخ ہو جاتا ہے ؎

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ!

حساس شاعر کو احساس ہوتا ہے کہ ؎

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

اور پھر یہ غم اس کا تنہا غم نہیں ہے۔ ساری دنیا غمگین نظر آتی ہے ؎

یہ دکھ تیرا ہے نہ میرا
ہم سب کی جاگیر ہے پیاری

اس غم کا کوئی علاج نہیں ہے شاید زندگی مر مر کے جیئے جانا ہی ہے۔ کیوں کہ ؎

تو اگر میری بھی ہو جائے
دنیا کے غم یونہی رہیں گے

شاید غم اور زندگی لازم و ملزوم ہیں ؎

ہم نہ رہیں — غم بھی نہ رہے گا

ایک ذہین اور حساس آدمی اپنی جنت تنہا نہیں بنا سکتا — جنت کا وجود جنت نہیں ہے جب تک کہ دوزخ موجود ہے — ہندوستان کی بدقسمتی اور تیرہ بختی کے دنوں میں شاعر کے روز و شب کیسے سنور سکتے ہیں۔ سماج کے ایک ذمہ دار فرد کی

حیثیت سے سماج کے مسائل اس کے مسائل ہیں! اور عشق خود غرضی نہیں آدمیت سکھاتا ہے۔ اس عشق نے اسے دردمندی، عاجزی، غریبوں کی حمایت کرنا اور یاس و حرماں سے، دکھ درد کے معنی سکھائے ہیں۔ ان حالات کے نتیجے میں زندگی جو کل تک ایک حسین خواب تھی ایک مفلس کی قبا بن گئی۔ جس میں ہردم درد کے پیوند لگ رہے ہیں! اس منزل پر شاعر حسن دل آرا کی سج دھج بھول کر زندگی کی بھول بھلیوں میں اس طرح گرفتار ہوجاتا ہے کہ اس کا "مرگ سوز محبت" منانے کو جی چاہتا ہے! لیلیٰ وطن کے گیسو سنوارنا محبوب کے غم کاکل سلجھانے سے زیادہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ایک عرصے تک وہ صرف کڑھتا ہے، رنج اٹھاتا ہے اور اذیت سہتا ہے۔ لیکن جوں جوں شعور آگے لے جاتا ہے شاعر کو ان مصائب کا حل مل جاتا ہے اور پھر یاس و نومیدی کے تلخ لہجے کی جگہ امید اور یقین کا اجالا نظر آتا ہے۔

یہاں سے فیض کی شاعری میں جو موڑ آتا ہے وہ ہندوستان کی تاریخ کا ایک اہم موڑ ہے، جب صدیوں کے ظلم و ستم کے بعد عوام نے غلامی کا طوق گلے سے اتار کر پہلی بار آزادی کی فضا میں سانس لیا! اب تک مصائب کی ایک ہی وجہ تھی ـــــ بدیسی غلامی! ـــــ مگر آزادی کے بعد بھی فاقہ کشی، بے روزگاری، جہالت اور افلاس کی تاریکی قائم رہی۔ پھر اس جگر فگاری اور نالہ کشی کی وجہ سمجھ میں آنے لگی۔ اگرچہ آزادی سے پہلے بھی طبقہ وارانہ سماج کی ناہمواریوں کا ادیبوں کو احساس تھا، مگر اب یہ احساس زیادہ شدت سے ابھرا۔ یہ بات واضح ہوگئی کہ جب تک دولت کی مساوی تقسیم نہیں ہوتی، اور طبقہ وارانہ سماج زندہ ہے۔ اس وقت تک آزادی کا لفظ بے معنی ہے! فیض نے بھی اپنے دور کا ہم نوا ہو کر معاشی مساوات اور اشتراک پر مبنی ایک نئے سماج کی تعمیر و تشکیل کا خواب دیکھا!

فیض نے یہ بات بڑی خوبصورتی اور آہستگی سے سمجھائی، مگر ایک ایسی بات جس کا سارے فسانے میں ذکر نہ تھا، ان کا جرم بن گئی۔ متاع لوح و قلم چھین لی گئی۔ ان کے ہاتھوں میں زنجیریں پہنا دی گئیں۔ مگر اسیری میں آتش زیر پا ہونے کے باوجود ہر حلقۂ زنجیر ہوئے آتش دیدہ نہ بنی، بلکہ انہوں نے ہر حلقۂ زنجیر میں زباں رکھ دی!

قفس میں فیض نے چمن کی محبت کے جو گیت گائے اور جس طرح اہل چمن کا جی موہ لیا، یہ بات شاید چمن میں رہ کر ممکن نہ ہوتی، بے بات کی سزا سے ایک بے گناہ کے دل میں جو آگ لگی وہی آگ وہی تپش اور حرارت اردو شاعری کا سوز دروں بن گئی! ـــــ اب محبت صرف آرزو کی بات نہ رہی! ـــــ محبوب زندگی کی جدوجہد میں رفیقِ کار بن گیا! ـــــ اس نے نہ صرف تنہائی کی زندگی کا بوجھ اٹھایا بلکہ فیض کو فکروں اور بکھیڑوں سے بالکل آزاد کر دیا! ـــــ آڑے وقت میں شخصیت کی پرکھ ہوتی ہے۔ آلام کی بھٹی میں اس کی شخصیت کا سونا اس طرح کندن بن گیا، اور فیض اسے اس طرح چاہنے لگے کہ نہ صرف فیض کے غمگین دل کو قوت اور یقین کی دولت مل گئی، بلکہ بے یقینی اور امید و بیم کے شکار تمام اہل چمن اس کے حسن کو سلام کرنے لگے:

اس دور میں فیض کی عشقیہ شاعری میں سچا خلوص ـــــ جذبات اور احساسات میں شدت، درد کی ایک ہلکی ہلکی سی آنچ۔ محبت صرف حسن و جمال، نکہت و لطافت اور رنگ و بہار کا احساس ہی نہیں بلکہ محبت رفاقت، ہمدردی اور اکٹھے دکھ سکھ اٹھانے کا جذبہ معلوم ہوتی ہے!

حالی نے اردو شاعری کی دنیا میں پہلی مرتبہ عورت سے پاکیزہ تخاطب کیا تھا ؎

اے ماؤ بہنو بیٹیو دنیا کی عزت تم سے ہے!

حسرت نے قاتل، سنگ دل، جفاجو اور ستم گر کو شریف محبوب کے روپ میں دیکھا تھا۔ مجاز نے اسے آنچل کو پرچم بنانے کی دعوت دی تھی۔ اور فیض کے یہاں وہ عورت خود راستہ دکھانے کی اہلیت رکھتی ہے۔ محبوب، ہمدم اور رفیق ہے! ؎

تجھ کو دیکھا تو سیر چشم ہوئے
تجھ کو چاہا تو اور چاہ نہ کی

فیض کے ہاں تنوع، رنگا رنگی، چہل پہل اور نظاروں کی فراوانی نہیں ہے! — لیکن فیض کی اس یکسانیت میں ہی ان کی انفرادیت ہے۔ اُن کی آواز اسی وجہ سے علیحدہ پہچانی جاتی ہے اور ان کی شاعری میں جو یقین اور گہرائی و گیرائی ہے اس کی وجہ بھی ان کی یہی یک رنگی ہے!

فیض کی شاعری ایک پُرسکون اور نرم رو دریا ہے جس کے کنارے بڑے خوبصورت ہیں۔ اور جس کے پانی کی لہروں کا ترنم ساری وادی میں رنگینی نور اور نکہت کی بارش کر رہا ہے!

کچھ عرصے سے ایسا لگتا ہے کہ دریا میں ٹھہراؤ سا آگیا ہے!
کاش یہ سکون کسی طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہو!!

فیض کی شاعری — چند فنی پہلو (صفحہ ۴۵۵ سے آگے)

موڑ پڑتا ہے جہاں دشتِ فراموشی کا
جس سے آگے نہ کوئی میں ہوں نہ کوئی تم ہو
سانس تھامے ہیں نگاہیں کہ نہ جانے کس دم
تم پلٹ آؤ، گزر جاؤ، یا مُڑ کر دیکھو!

ابیاتِ مسلسل کا استعمال حالانکہ ہیئتی حسن ہے، اس لئے خارجی وصف ہے۔ لیکن جب فکر (Thought) کے معینہ کے لئے ہیئت (Form) کی موجیں سازگار ہو جائیں تو فکر کی رفتار میں بڑی آسانیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ فکر اور ہیئت کو ہم آہنگ کر کے شاعر خارجی صناعی کو بھی باطن کا جزو بنا لیتا ہے، اور ایک ایسا کل وجود میں لاتا ہے جس کے اجزاء کی تحلیل ناممکن ہو جاتی ہے۔ ابیات مسلسل یوں تو تقریباً تمام جدید شعراء نے استعمال کی ہیں، لیکن فیض کی طرح روانی اور آہنگ شاید ہی کسی کے حصے میں آیا ہو۔ انہوں نے اس ہیئت کو اردو شاعری میں ایک حسین اور قابل توجہ تحریر بنا دیا ہے۔

اب تک فیض کے فکری سرمایہ کی طرف زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ ان کے فن کی طرف توجہ کم ہی دی گئی ہے۔ جو دو ایک مضامین ان کے فن کے بارے میں لکھے گئے ہیں، ان میں انہیں عروض کی میزان پر تولا گیا ہے۔ فیض کے یہاں بعض صنائع و بدائع کے استعمال اور عروض کی خامیاں ہیں، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ان خامیوں سے ان کے مرتبے میں کمی نہیں آتی۔ جب اہلِ قواعد نے شیکسپیر، میر، غالب اور اقبال کو نہیں بخشا تو فیض کی برأت کا امکان کیسے ہو سکتا تھا۔ اس لئے دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ فیض نے اگر ٹھوکریں کھائی ہیں تو کیا ان ٹھوکروں کے بعد سنبھلنے کی بھی کوشش کی ہے؟ — اگر انہوں نے سنبھلنے کی کوشش کی ہے اور آگے بڑھتے رہے ہیں تو یقیناً انہوں نے بلند آہنگ ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ اس مختصر سے مضمون میں ان کے جن فنی محاسن کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی ہے ان سے یہی واضح کرنا ہے کہ اگر ان کے پاس ایک طرف فکری سرمایہ ہے تو دوسری طرف فنی سرمایہ بھی ہے۔ اور یہ وہ فنی سرمایہ ہے جسے ہمیں نظر انداز نہ کرنا چاہئے۔

کشمیری لال ذاکر

فیض کی شاعری میں محبوب کا تصور

محبوب کا تصور شاعری کی جان ہے۔ چاہے وہ شاعری کسی بھی زبان کی ہو۔ محبت اور خوب صورتی شاعر کو شعر کہنے پر آمادہ کرتی ہیں۔ اس کے جذبات شعروں میں ڈھل کر نقش و نگار بناتے ہوئے آنکھوں کے سامنے رقص کرتے دکھنے لگتے ہیں۔ کانوں سے ٹکراتے ہیں تو رس گھولتے ہیں۔ محبت اور خوب صورتی ہی وہ خمیر ہے جس سے شاعری کی تخلیق ہوئی ہے۔ اردو شاعری میں محبوب کے خد و خال جس انداز سے ابھارے جاتے رہے ان سے جو تصویر بنتی تھی وہ کوئی بہت خوب صورت اور دلکش نہ تھی۔ محبوب کے ابرو، اس کی آنکھیں، اس کی ناک، اس کی کمر اور ان سب کا بیان پڑھ کر اور ان سب خوب صورت اجزا کو اکٹھا کر کے جو انسانی پیکر بنایا جا سکتا ہے وہ زیادہ پرکشش نہ بن پاتا تھا۔ محبوب کے ظلم، اس کی جفائیں، اس کے ستم ناقابلِ برداشت حد تک سخت تھے۔ بڑے سے بڑا سخت جان بھی انہیں برداشت نہ کر سکتا تھا۔ اردو شاعری کی یہ روایات عرصے تک قائم رہیں۔ ان کا اپنا ایک کیف تھا، اپنی ایک مستی تھی لیکن بدلتی ہوئی قدروں کے ساتھ یہ لطف زیادہ دیر تک قائم رہنا مشکل تھا۔ ان بدلتی ہوئی سماجی، اقتصادی، نفسیاتی قدروں کے ٹکراؤ سے ایک نئی کھنک ابھری اور یہ کھنک تھی نئی شاعری کی آواز۔ اور جب یہ شاعری اپنا روپ لے کر سامنے آئی تو اس کا چہرہ خوب صورت لگا۔ نئی شاعری کا محبوب اسی دنیا کا جیتا جاگتا انسان تھا، ایک بے رحم اور سنگدل بت نہیں، اس کے پاس دھڑکنوں کا سنگیت تھا، سانسوں کا زیر و بم تھا، خیالات کے حسین جالے اور سپنوں کے تاج محل تھے۔ اس لئے اس میں چاہنے اور چاہے جانے کی امنگ بھی تھی اور حوصلہ بھی تھا۔ اس کے ساتھ اس کی تہذیب کی پرچھائیاں بھی تھیں اور سماج کے رسم و رواج بھی۔ اس لئے کبھی کبھی وہ اپنے آپ کو اتنا ہی مجبور پاتا تھا جتنا کہ پرانی شاعری میں کراہتا ہوا عاشق۔ اردو شاعری میں یہ نیا انقلاب سماج کے بدلتے ہوئے شعور کی ترجمانی تھی۔ قریب قریب سبھی نئے لکھنے والوں نے اسی طرح سوچا اور محسوس کیا لیکن کھل کر بات کرنے والا صرف فیض تھا جس نے اپنے محبوب کو اس طرح مخاطب کیا ہے

ان کا آنچل ہے، کہ رخسار، کہ پیراہن ہے
کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے چلمن رنگیں
جانے اس زلف کی موہوم گھنی چھاؤں میں
ٹمٹماتا ہے وہ آویزہ ابھی تک کہ نہیں

محبوب کے آنچل اور اس کے آویزے کا ذکر اردو شاعری کے لئے نیا تھا۔ عورت کو محبوب کی حیثیت میں پیش کرنا بڑے حوصلے کا کام تھا۔ اور فیض نے یہ جرأت کی۔ اُس نے عورت کو سماج میں اس کی جگہ کا تعین کرتے ہوئے دکھایا۔ عورت اقتصادی مسئلوں کے پیش نظر دفتر میں کام کر سکتی ہے، اسکول کالج میں پڑھا سکتی ہے۔ اسپتال میں مریضوں کی دیکھ بھال کر سکتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ محبت بھی کر سکتی ہے اور جذبات اور احساسات کے تقاضے بھی پورے کر سکتی ہے۔ فیض نے جب عورت کو اس کی سماجی حیثیت دمی تو اسے محسوس ہوا کہ وہ اپنے چاہنے والے کے ساتھ پہلو بہ پہلو کھڑی ہو کر جد وجہد کر سکتی ہے۔ اور آنے والے حسین دور کے خواب دیکھ کر اُن کی تکمیل میں اس کا ہاتھ بھی بٹا سکتی ہے۔ اور پھر شاعر محبت کی اہمیت اور اپنے محبوب کی خوبصورتی کی عظمت کا خیال کرتے ہوئے بھی کئی بلد زندگی کی دوسری مانگوں کو زیادہ طاقتور اور پُر اثر محسوس کرتا ہے۔ اس کی نگاہیں بے کس اور مظلوم لوگوں کی طرف اُٹھ جاتی ہیں اور وہ کہہ اٹھتا ہے ؎

لوٹ جاتی ہے اُدھر کو بھی نظر کیا کیجے
اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجے
اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

اور اس کے ساتھ ہی ساتھ زندگی کی بھرپور رجائیت جو فیض کا کبھی ساتھ نہیں چھوڑتی سامنے آجاتی ہے۔ اُن دنوں میں بھی جب وہ قید و بند کی صعوبتیں سہہ رہا تھا، اور اس کی نظر کمزور ہوگئی تھی اس کی نگاہوں میں چاند تاروں کی روشنی تھی۔ رجائیت کا وہی روشن جذبہ فیض کو اپنے محبوب سے یوں مخاطب کرواتا ہے ؎

عرصۂ دہر کی جھلسی ہوئی ویرانی میں
ہم کو رہنا ہے پہ یونہی تو نہیں رہنا ہے
اجنبی ہاتھوں کا بے نام گراں بار ستم
آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے
یہ ترے حسن سے لپٹی ہوئی آلام کی گرد
اپنی دو روزہ جوانی کی شکستوں کا شمار
چاندنی راتوں کا بے کار دہکتا ہوا درد
دل کی بے سود تڑپ، جسم کی مایوس پکار
چند روز اور مری جان! فقط چند ہی روز

لیکن فیض یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ صرف اس کے حرف تسلی سے، اس کی دلجوئی اور پیار سے اس کے محبوب کی آنکھوں کی اُداسی اور دل کی جلن نہیں مٹے گی۔ اس کے لئے اُسے خود کش مکش کرنا ہوگی۔ مخالف قوتوں سے نبرد آزما ہونا ہوگا۔ محبوب کے آنچل کو بقول مجاز پرچم بنانا بہت ضروری نظر آیا، اور اس نے اپنے دوست سے کہا ؎

پر مرے گیت ترے دکھ کا مداوا ہی نہیں
نغمہ جرّاح نہیں، مونس و غم خوار سہی
گیت نشتر تو نہیں، مرہم آزار سہی
تیرے آزار کا چارہ نہیں، نشتر کے سوا
اور یہ سفاک مسیحا مرے قبضے میں نہیں
اس جہاں کے کسی ذی روح کے قبضے میں نہیں
ہاں مگر تیرے سوا، تیرے سوا، تیرے سوا

محبت کی یہ لطیف پرچھائیں ہمیشہ فیض کے ساتھ رہی۔ اور اس کی شخصیت میں اس طرح رس بس گئی کہ خود اس کی اپنی شخصیت بڑی موہنی ہو گئی۔ اس کا طرز تکلم، رفتار، انداز سب میں ایک دھیما سا ٹھہراؤ آگیا۔ ایک لوچ اور لچک۔ اور یہی لوچ اور لچک اس کی شاعری کی جان بن کر رہ گئی۔ یہ نغمگی قید خانے میں بھی اس سے کہلواتی رہی ؎

تم آرہے ہو کہ بجتی ہیں میری زنجیریں
نہ جانے کیا مرے دیوار و بام کہتے ہیں

اور جب جیل پر شام کے سائے ڈھل آئے تو محبوب کی یاد نے گدگدایا اور فیض کو محسوس ہوا ؎

یوں صبا پاس سے گزرتی ہے
جیسے کہہ دی کسی نے پیار کی بات

اور پھر اس کی روح میں رچی ہوئی موسیقی نے انگڑائی لی ؎

شانۂ بام پر دمکتا ہے
مہرباں چاندنی کا دست جمیل
خاک میں گھل گئی ہے آب نجوم
نور میں گھل گیا ہے عرش کا نیل

اور جیل کی دیواروں کے پہرہ داروں سے اس کی دھڑکنوں نے کہا ؎

جلوہ گاہِ وصال کی شمعیں
وہ بجھا بھی چکے اگر تو کیا
چاند کو گل کریں تو ہم جانیں

میں سمجھتا ہوں جیل میں گزرے ہوئے برسوں نے محبوب کے خدوخال نکھارنے میں فیض کی بڑی مدد کی۔ محبوب کے بارے میں اس کا تصور ارتقا کی وہ سب منزلیں طے کرتا رہا، جن میں سے ایک سماج کو بننے سنورنے کے لئے گزرنا پڑتا ہے۔ محبوب کا غم اب ان سب کا غم بن گیا ہے۔ جو محبت کرتے ہیں اور نوع انسان کے لئے ایک حسین مستقبل میں یقین رکھتے ہیں۔ ایک ایسی صبح کا یقین جو رات سے بہت عظیم ہے۔ اپنی بڑی ہی پیاری نظم "ملاقات" میں فیض کا یہ اشارہ کتنا پر معنی ہے ؎

یہ غم جو اس رات نے دیا ہے
یہ غم سحر کا یقیں بنا ہے
یقیں جو غم سے کریم تر ہے
سحر جو شب سے عظیم تر ہے

اور یہی کیفیت فیض کی اس نظم میں ہے جس کا عنوان ہے "درد آئے گا دبے پاؤں" ؂

حلقۂ زلف کہیں، گوشۂ رخسار کہیں
ہجر کا دشت کہیں، گلشنِ دیدار کہیں
لطف کی بات کہیں، پیار کا اقرار کہیں
دل سے پھر ہوگی مری بات کہ اے دل اے دل

اور پھر اس نظم کا آخری بند فکر تنہائی سے گذر کر افق کی حدوں کو چھو گیا ہے جہاں سے صبح کا اُجالا پھوٹنے والا ہے ؂

ہو نہ ہو اپنے قبیلے کا بھی کوئی لشکر
منتظر ہوگا اندھیرے کی فصیلوں کے اُدھر
ان کو شعلوں کے رجز اپنا پتا تو دیں گے
خیر، ہم تک وہ نہ پہونچیں بھی، صدا تو دیں گے
دُور کتنی ہے ابھی صبح، بتا تو دیں گے

فیض کے محبوب کی پیشانی، اُس کے عارضوں کا رنگ، اُس کی آنکھوں میں کاجل کی لکیر اُس کی زلف کی چھاؤں میں ٹمٹاتا ہوا آویزہ، یہ سب اکائیاں مل کر اس حسین صبح کا اُجالا بن کر سماتی ہیں، جس صبح کا ہم سب کو انتظار ہے۔ فیض کا محبوب انسانی سماج کے حسین دور کا پیامبر ہے اور اسی میں اس کی شاعری کی عظمت ہے۔

— مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ فنی تخلیق کے عمل میں مشاہدہ اور تجربہ گوشت پوست اور استخوان کے مترادف ہے۔ جذبہ اسے تخلیق میں لہو کی گرمی پیدا کرتا ہے۔ اور فکر و دماغ کی روشنی، متانت اور قدرتِ اظہار سے اس تخلیق کا ناک نقشہ اور نوک پلک سنواری جاتی ہے۔ اور تخیل وہ پراسرار شے ہے جس سے اس تن فرسودہ میں جان پڑ جاتی ہے۔ اسے آپ وجدان تصور کیجئے یا حرفِ کن فیکون۔

— فیض

ماہر القادری

فیض کی شاعری

اور زبان و بیان

ارباب علم و معنی، اہل نقد و نظر اور شعر و ادب پر رکھنے والوں میں یہ بحث مابہ النزاع رہی ہے کہ مضمون، لفظ اور خیال و اظہار میں کس کو ترجیح حاصل ہے۔ اس مسئلہ میں کتاب العمدہ کے شہرۂ آفاق مصنف ابن رشیق قیروانی کی رائے کا خلاصہ یہ ہے کہ مضمون اور الفاظ دونوں اپنی اپنی جگہ خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ مضمون اچھا نہ ہو تو اس کی خرابی الفاظ کو بھی عیب دار بنا دے گی، اور مضمون اچھا ہو اور اس کو ادا کرنے کے لئے الفاظ موزوں اور حسین نہ ہوں، تو بھی شعر بے کار ہوگا!

اس مسئلہ میں ارباب فن نے خاصی بحث و گفتگو کی ہے مگر اہل فن کی اکثریت کا یہ فیصلہ ہے کہ ــــ لفظ کو یعنی "اظہار" (EXPLANATION) کو مضمون یعنی "خیال" (IDEA) پر ترجیح حاصل ہے۔ علامہ شبلی نعمانی جو شعر و ادب کے سب سے بڑے نقاد ہیں۔ فرماتے ہیں ــ

> "حقیقت یہ ہے شاعری یا انشا پردازی کا مدار زیادہ تر الفاظ ہی پر ہے، گلستاں میں جو مضامین اور خیالات ہیں ایسے اچھوتے اور نادر نہیں، لیکن الفاظ کی فصاحت اور ترتیب و تناسب نے ان میں سحر پیدا کر دیا ہے، انہیں مضامین اور خیالات کو معمولی الفاظ میں ادا کیا جائے تو سارا اثر جاتا رہے گا۔ ظہوری کا "ساقی نامہ" نازک خیالی، موشگافی اور مضمون بندی کا طلسم ہے، لیکن "سکندر نامہ" کا ایک شعر پورے "ساقی نامہ" پر بھاری ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ "ساقی نامہ" میں الفاظ کی وہ متانت، اور شان و شوکت اور بندش کی وہ پختگی نہیں جو "سکندر نامہ" کا عام جوہر ہے!
>
> "...... جن مشہور شعراء کی نسبت کہا جاتا ہے کہ ان کے کلام میں غلطی ہے، اُس کی زیادہ تر وجہ یہی ہے کہ ان کے ہاں متانت، وقار اور بندش کی درستی

میں نقص پایا جاتا ہے۔ متوسطین اور متاخرین نے جو شاہنامے لکھے مضامین اور
خیالات میں فردوسی کے شاہنامہ سے کم نہیں ہیں۔ لیکن فردوسی کے شاہنامہ
کے سامنے ان کا نام لینا بھی سفاہت ہے، اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ فردوسی
جن الفاظ میں اپنے خیالات کو ادا کرتا ہے، اُس کے سامنے اوروں کے الفاظ
بالکل کم رُتبہ اور بے وقعت معلوم ہوتے ہیں ....

یہ واقعہ ہے بلکہ تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ نازک سے نازک خیال، حسین سے حسین تشبیہ اور اچھوتے خیال کو ادا کرنے کے لئے موزوں الفاظ میسر نہ آئیں تو خیال و مضمون کی نزاکت خاک میں مل جاتی ہے۔ شعر اسی وقت دل کش بلکہ "سحرِ حلال" بنتا ہے، جب خیال و اظہار اور مضمون و الفاظ دونوں حسین ہوں، عروسِ جمیل کے جوہر لباس فاخرہ میں اور زیادہ بہار دکھاتے ہیں! دنیا کے جتنے بڑے انشا پرداز اور عظیم شعراء گذرے ہیں، وہ سب کے سب زبان کی نزاکتوں کے جاننے والے تھے۔ الفاظ برتنے کا انہیں سلیقہ آتا تھا۔ اور اس فن سے وہ واقف تھے کہ نثر و نظم میں لفظوں کے نگینے کس طرح جڑے جاتے ہیں اور تشبیہ و استعارہ کے موتیوں کو الفاظ کی لڑیوں میں کس خوش ذوقی کے ساتھ پرویا جاتا ہے۔

شعر میں نغمگی لفظوں کے دروبست سے پیدا ہوتی ہے، الفاظ کو ساز کے پردوں کی طرح شعر میں مرتب کیا جاتا ہے!

غالب کی فارسی غزل کا مقطع ہے ؎

آسودہ باد، خاطرِ غالب کہ خوئے اوست
آمیختن بہ بادۂ صافی گلاب را

اس شعر میں موسیقیت کے علاوہ کس قدر حلاوت پائی جاتی ہے کہ شعر دہرانے میں زبان مٹھاس کا مزہ محسوس کرتی ہے،

اس کے برخلاف غالب کے اردو دیوان میں یہ مصرعہ ——— ؏

بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہئے

اہلِ ذوق کو کس قدر کھٹکتا ہے۔ بھوں پاس نے اس مصرعہ کو وجدان کے لئے کس قدر ناگوار بلکہ ناقابلِ برداشت بنا دیا۔

علامہ شبلی نعمانی کہنا یہ چاہتے ہیں کہ جہانگیر کے دور میں نور جہاں کو امورِ سلطنت میں بہت کچھ دخل حاصل تھا اور وہ جہانگیر کے پردے میں دراصل شہنشاہی کرتی تھی۔ اس خیال کو شبلی نے کس قدر معجزانہ انداز میں ادا کیا ہے ؎

اس کی پیشانیٔ نازک پہ جو پڑتی تھی گرہ
جا کے بن جاتی تھی اوراقِ حکومت پہ شکن

یہ خیال کہ فرد کو مرکز سے وابستگی رکھنی چاہئے، علامہ اقبال نے کس اچھوتے طرز سے بیان کیا ہے ؏

وابستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

شاعری میں اطناب یعنی پھیلاؤ کے مقابلہ میں ایجاز و اختصار اور رمز و اشاریت حسین تر سمجھی جاتی ہے، جس سے شعر میں معنوی لطف پیدا ہوتا ہے۔ مگر ایجاز اور رمزیت و اشاریت کا معاملہ بہت ہی نازک ہے۔ زبان و طرزِ ادا پر پوری قدرت نہ ہو تو یہ "ایجاز" ابہام بلکہ اجمال بن جاتا ہے! شعر کو چیستاں بنا دینا کوئی کمال کی بات نہیں ہے، شعر کا لطف تو اس میں ہے کہ اس کے

سنتے ہی سے

دشاد سامعہ در موجِ کوثر و تسنیم،

کی کیفیت محسوس ہونے لگے! ایسی رمزیت و اشاریت جس میں تہ داری پائی جائے، شاعری کا حسن نہیں عیب ہے، نازک سے نازک بات کہی جائے مگر اس طرح سلجھا کر کہ ——— از دل خیزد، بر دل ریزد ——— کا لطف آنے لگے! شعر و ادب ہی پر کیا منحصر ہے زندگی کے تمام مسائل کا لطف اُلجھانے میں نہیں سلجھانے میں ہے! انگریزی میں جسے "Clarity of mind" کہتے ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے

غلطیاں یہ دیکھ کر کوئی شک نہیں بڑی خوشی ہوتی ہے کہ اردو زبان میں رسالوں، اخباروں اور کتابوں کا بڑی تیزی کے ساتھ اضافہ ہوتا جا رہا ہے، اردو میں "خواندوں" کی تعداد بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ مگر اس تصویر کا دوسرا رُخ یہ بھی ہے کہ "خواندگی" یعنی "کمیت" میں تو اضافہ ہو رہا ہے مگر "کیفیت" ———!؟ اس کا حال نہ پوچھئے، خاص طور سے زبان و بیان اور اظہار و ادا کا معاملہ اُلجھا ہوا ہی نہیں کمزور بھی ہے اور نہ جانے کہاں کہاں پانی مرتا ہے۔ حد ہو گئی جہالت و بے خبری کی کہ اچھے خاصے مشہور افسانہ نگار اور نقاد و ادیب، "غیظ" کو "غیض" اور "تلاطم" کو "طلاطم" لکھتے ہیں، اور اس قسم کی غلطیوں کا ذمہ دار بے چارے کاتبوں کو ٹھیرانا "تہمت بے جا" کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ بعض انشا پرداز "اٹنے" اور "پٹنے" کے معنوی فرق سے ناواقف ہیں۔ وہ بڑی بے تکلفی کے ساتھ اپنی تحریروں میں یوں لکھ دیتے ہیں ———

"میز کتابوں سے اٹی پڑی تھی"

حالانکہ یہاں "پٹی پڑی تھی" لکھنا اور بولنا چاہئے۔ "اٹنے" کا محل استعمال یہ ہے

"کنواں مٹی سے اَٹ گیا"

یا

"میز گرد و غبار سے اٹی پڑی ہے"

فلمی گیتوں اور ڈراموں کا جب سے زور ہوا ہے، بعض لکھنے والے ہندی الفاظ اپنے مضامین میں استعمال کرنے لگے ہیں۔ مثلاً پریم، آدرش، کلاکار، سمبندھ، دیوتا ..... مگر کتنے ہی لکھنے والوں کے یہاں "گمبھیر" ملول و مغموم اور افسردہ کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ حالانکہ "گمبھیر" بُردبار اور متحمل مزاج شخص کو کہتے ہیں ——— لکھنے والوں کو لفظوں کے صحیح معنیٰ کا تو علم ہونا چاہئے

شعر و ادب دراصل زبان و الفاظ کے "تانے بانے" سے تیار ہوتے ہیں، جب یہ تانا بانا ہی کمزور، بدوضع اور اُلجھا ہوا ہو، تو جو "ادب" اس سے تیار ہوگا وہ "عظیم ادب" ہو ہی نہیں سکتا! بھول چوک کس سے نہیں ہوتی مگر بڑے ادیبوں اور شاعروں کا یہ شعار رہا ہے کہ انہیں اپنی غلطی جب بھی معلوم ہو گئی ہے تو انہوں نے اپنی غلطی کی تاویلیں نہیں کیں بلکہ اسے مان کر غلطی کو درست کر دیا ہے اور آئندہ کے لئے محتاط ہو گئے ہیں۔ مثلاً علامہ اقبال کے اس مصرعہ پر ؏

ہو رو رو کے میں روشن چراغاں کر کے چھوڑوں گا

جب گرفت کی گئی کہ "چراغاں" میں خود "روشن ہونے" کا مفہوم پنہاں ہے "چراغوں کو روشن کرنا" تو بولتے ہیں مگر "روشن چراغاں" نہیں بولا جاتا۔ روزمرہ "چراغاں کرنا" ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اس تنقید کے بعد اپنے مصرعہ کو اس طرح بدل دیا ؏

لہو سے محفل کو چراغاں کر کے چھوڑوں گا

جناب فیض احمد فیض اردو زبان کے شہرۂ آفاق شاعر ہیں، ایک دعوت میں زبان و بیان کا ذکر چھڑا تو انہوں نے فرمایا کہ بڑے شعرا "زبان و بیان کی زیادہ پروا نہیں کرتے"۔ ان کی زبان سے یہ الفاظ سُن کر مجھے بڑی حیرت ہوئی! اس دعوت میں بحث و گفتگو کا موقع نہ تھا! میں نے تقسیم ہند سے قبل سنہ ۱۹۴۶ء میں اُن کا مجموعۂ کلام ـــ نقشِ فریادی ـــ پڑھا تھا۔ تقریباً بیس سال کے بعد اس کتاب کے علاوہ ان کی دو اور کتابیں ـــ 'دستِ صبا' اور 'زنداں نامہ' ـــ بھی مطالعہ کیں، ان کتابوں کو پڑھ کر اندازہ ہوا کہ فیض صاحب نے واقعی ٹھیک کہا تھا۔ کہ اُن کے خیال کے مطابق بڑے شعرا، زبان کی زیادہ پروا نہیں کرتے! اس قسم کی بے پروائی اُن کے یہاں جابجا ملتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں ؎

اپنے معصوم تبسّم کی فراوانی کو
وسعتِ دید پہ گلبار نہ کر دینا تھا

تبسّم کی فراوانی کیا ہوتی ہے؟ پھر اس پہ مُستزاد "وسعتِ دید"! اس شعر میں حرفِ جار "پہ" اور زیادہ کھٹکتا ہے۔ شعر کا مفہوم کس قدر الجھا ہوا ہے ؎

خمارِ خواب سے لبریز احمریں آنکھیں
سفید رُخ پہ پریشان عنبریں آنکھیں

زلفیں تو پریشان ہوا کرتی ہیں مگر "آنکھوں" کا رُخ پہ پریشان ہونا' پہلی بار پڑھنے میں آیا' پھر "عنبریں" آنکھوں کی نہیں زلف و گیسو کی صفت ہے! اس لئے کہ زلفوں کا سیاہ اور خوشبودار ہونا زلفوں کی صفات میں داخل ہے، آنکھوں کا خوشبو سے دور کا تعلق بھی نہیں ہے! ؎

جھلک رہی ہے جوانی ہر اک بُن مُو سے
رواں ہو برگِ گُل تر سے جیسے سیلِ شمیم

خوشبو (شمیم) کے لئے "سیل" کا لفظ خوشبو کی لطافت پہ بار ہے "موجِ شمیم" کہنا تھا۔

چشمِ میگوں ذرا اِدھر کر دے
دستِ قدرت کو بے اثر کر دے

چشمِ میگوں کو عاشق کی طرف کر دینے سے' دستِ قدرت کس طرح بے اثر ہو کر رہ جائے گا۔ مصرعِ ثانی میں شاعر جو کچھ کہنا چاہتا ہے' وہ واضح نہ ہو سکا۔ یہی وہ "رمزیت" ہے جو موزوں الفاظ استعمال نہ ہونے کے سبب 'ابہام' بن جاتی ہے۔

فیض صاحب کی مشہور نظم کا مصرعہ ہے ؎

مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

"محبت مانگنا ـــ" یہ زبان و روزمرہ نہیں ہے۔ یوں کوئی نہیں بولتا کہ فلاں شخص، فلاں شخص سے محبت مانگ رہا ہے! شاعر کہنا یہ چاہتا ہے اور اسی طرح کہنا بھی چاہئے تھا ـــ کہ میرے محبوب مجھ سے پہلی سی محبت کی امید نہ رکھ' یا اگلے سے دوستانہ روابط کا تقاضا نہ کر!

لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہگزار

"خوابیدہ چراغ" یہ کس قسم کے چراغ ہیں، شاید وہ چراغ، جو گل ہو چکے ہیں۔ اگر گل ہو چکے ہیں تو پھر ان کا "لڑکھڑانا" حشو و زاید ہے! پھر شمع و چراغ اور فانوس کی صفت ڈگمگانا اور لڑکھڑانا زبان کے اعتبار سے درست نہیں ہے ؎

دل کے ایوان میں لئے گل شدہ شمعوں کی قطار
نورِ خورشید سے سہمے ہوئے اکتائے ہوئے
حُسنِ محبوب کے سیّال تصور کی طرح
اپنی تاریکی کو بھینچے ہوئے لپٹائے ہوئے

پہلے شعر کا دوسرا مصرعِ خاصہ محلِ غور ہے۔ نورِ خورشید سے سہم جانا اور اکتانا کیوں؟ شعر میں ہر بات کہنے کا قرینہ ضروری ہے! حُسنِ محبوب کا تصور "سیال" بھی ہوتا ہے! خوب! یہ لفظ (سیّال، غالباً "فعّال" یا "جان دار و متحرک" کے معنی میں استعمال ہوا ہے پھر —— اپنی تاریکی کو بھینچے ہوئے لپٹائے ہوئے —— اس کے بارے میں کوئی کہے بھی تو کیا کہے! —— وجدان کے لئے سخت امتحان اور کشمکش کا سامنا!

یہ چند اشعار "نقشِ فریادی" کے تھے۔ اب "دستِ صبا" اور "زندان نامہ" کی چند جھلکیاں پیش کی جاتی ہیں ؎

ابھی زنجیر چھنکتی ہے پسِ پردہ ساز
مطلق الحکم ہے شیرازۂ اسباب ابھی

"شیرازۂ اسباب" کو مطلق الحکم کہہ کر شعر کے مفہوم کو الجھا دیا

فیض صاحب کی ایک نظم ہے "سیاسی لیڈر کے نام" اس میں فرماتے ہیں ؎

سالہا سال یہ بے آسرا جکڑے ہوئے ہاتھ
رات کے سخت و سیہ سینہ میں پیوست رہے

بے آسرا جکڑے ہوئے ہاتھ، رات کے سخت و سیہ سینہ میں کس طرح پیوست رہے؟ شاعر کے ذہن میں کیا مفہوم ہے، جس کی ان لفظوں میں ترجمانی کی گئی ہے! مظلوم کے ہاتھوں کا رات کے سینے سے کیا تعلق ہے! ؎

اور اب رات کے سنگین و سیہ سینہ میں
اتنے گھاؤ ہیں کہ جس سمت نظر جاتی ہے
جابجا نور نے اک جال سا بُن رکھا ہے
دور سے صبح کی دھڑکن کی صدا آتی ہے

شعر کا مفہوم؟ طرزِ ادا؟ الفاظ کا استعمال؟ —— ذہن و فکر آخر کہاں تک "تاویلیں" کریں! پھر "گھاؤ" کو "بھاؤ" کے وزن پر بولتے اور شعر میں نظم کرتے ہیں۔ اس طرح ؎

ترچھی نظر سے دل میں مرے گھاؤ کر گئے

آیا کریں گے یاد جو برتاؤ کر گئے

اس کتاب (دستِ صبا) کے دو اور شعر ہیں ؎

صبا کے ہاتھ کی نرمی ہے ان کے ہاتھوں کی
ٹھہر ٹھہر کے یہ ہوتا ہے آج دل کو گماں
وہ ہاتھ ڈھونڈ رہے ہیں بساطِ محفل میں
کہ دل کے داغ کہاں ہیں نشستِ درد کہاں

صبا اور موجِ صبا کو محبوب کی رفتار سے تو تشبیہہ دیا کرتے ہیں مگر یہ کہ محبوب کے ہاتھ کی نرمی دستِ صبا سے ملتی ہوتی ہے، پہلی بار دیکھنے میں آئی! پھر "بساطِ محفل" کے ساتھ حرفِ جار "میں" نہیں "پر" آنا چاہئے۔ کوئی چیز بساط پر رکھی یا ڈھونڈی جاتی ہے۔ "بساط" میں نہیں رکھی اور ڈھونڈی جاتی! —— چوتھا مصرع اور زیادہ عجیب ہے: خاص طور سے "نشستِ درد" کھلی نظر ہے ؎

شفق کی راکھ میں جل بجھ گیا ستارۂ شام
شبِ فراق کے گیسو فضا میں لہرائے

"شفق کی راکھ" کیا ہوتی ہے، پھر اس راکھ میں ستارۂ شام کا جل بجھنا اور زیادہ تعجب خیز بلکہ وحشت انگیز ہے۔ شاعر شاید یہ کہنا چاہتا ہے کہ شام بیت چکی اور رات کی سیاہی پھیل گئی، مگر اس منظر کی "شفق کی راکھ" اور ستارۂ شام کا جل بجھنا، کہہ کر جو عکاسی فرمائی گئی ہے، وہ ...... !؟

تازہ ہیں ابھی یاد میں اے ساقیٔ گلفام
وہ عکسِ رُخِ یار سے لہکے ہوئے ایام

"عکسِ رُخِ یار" کا نتیجہ "چمکنا" ہو سکتا ہے نہ کہ "لہکنا"۔ یوں تو بولتے ہیں کہ سبزہ لہک رہا ہے... مگر اس طرح کون بولتا ہے کہ دن اور راتیں لہک رہی ہیں!

فقیہِ شہر سے مے کا جواز کیا پوچھیں
کہ چاندنی کو بھی حضرت حرام کہتے ہیں

"چاندنی" کہہ کر جانے شاعر نے اپنے ذہن میں کیا مفہوم متعین کیا ہے۔ اور یہ کس " Symbol " کی طرف اشارہ ہے؟ —— اب رہا واقعہ تو کوئی مفتی اور فقیہہ "چاندنی" کو یا چاندنی سے لطف لینے کو حرام نہیں کہتا ؎

وہیں ہے دل کے قرائن تمام کہتے ہیں
وہ اک خلش کہ جسے تیرا نام کہتے ہیں

مصرعۂ اولیٰ کس قدر ژولیدہ اور مبہم ہے ؎

صد نازسے اُترا کرتی ہے
صہبائے غمِ جاناں کی پری

"معبدِ ناز" کہنا چاہئے تھا! ؎

پھر دنیا والوں نے تم سے
یہ ساغر لے کر پھوڑ دیا
جو مے تھی بہا دی مٹی میں
مہمان کا شہپر توڑ دیا

یہ مہمان کوئی پرندہ معلوم ہوتا ہے جس بے چارے کا "شہپر" توڑ دیا گیا ؎

کچھ وہ بھی ہیں جو لڑ بھڑ کر
یہ پردے نوچ گراتے ہیں
ہستی کے اٹھائی گیروں کی
ہر چال الجھائے جاتے ہیں

اس قسم کے اشعار نوٹنکی کے زمانے میں کہے جاتے ہیں ؎

یوں بہار آئی ہے امسال کہ گلشن میں صبا
پوچھتی ہے گزر اس بار کروں یا نہ کروں

"گزر" سے مراد یا تو داخل ہونا اور گزرنا ہے یا "چمن میں رہ کر گزر کرنا" ہے! اس ایک لفظ "گزر" نے اچھے خاصے شعر میں الجھن پیدا کر دی ؎

بزمِ خیال میں ترے حسن کی شمع جل گئی
درد کا چاند بجھ گیا، ہجر کی رات ڈھل گئی

"درد کا چاند" کیا ہوتا ہے۔ پھر چاند کے ڈوب جانے کو "بجھنا" نہیں کہتے!

ایک نظم ہے "ملاقات" اس کے چند شعر ہیں ؎

یہ رات اس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے
عظیم تر ہے کہ اس کی شاخوں
میں لاکھ مشعل بکف ستاروں
کے کارواں گھر کے کھو گئے ہیں
ہزار مہتاب اس کے سائے
میں اپنا سب نور رو گئے ہیں

"رات" کسی درد کا شجر بھی ہوتی ہے!! یا للعجب! پھر ہزار مہتابوں کا "نور رونا" اس سے بھی عجیب تر! "نور ضائع کرنے" کو "نور رونا" کون بولتا ہے ؎

بات بس سے نکل چلی ہے
دل کی حالت سنبھل چلی ہے

مصرعۂ اولیٰ کا دوسرے مصرعہ سے کیا ربط ہے! بات قابو سے باہر ہو جائے اور اُس پر بس نہ چل سکے، تو کیا ایسا ہو جانے سے دل کی حالت سنبھل جاتی ہے، یہ کوئی کلیہ ہے یا شاعر کا ذاتی تجربہ! فیض صاحب آخر کہنا کیا چاہتے ہیں! ؎

سبزہ سبزہ سوکھ رہی ہے، پھیکی زرد دوپہر
دیواروں کو چاٹ رہا ہے تنہائی کا زہر
(اے روشنیوں کے شہر)

دوپہر پھیکی بھی ہوتی ہے۔ پھر اُس کا "سوکھنا"؟! تنہائی کا زہر کیا ہوتا ہے! اور وہ زہر دیواروں کو چاٹ بھی رہا ہے۔! "تنہائی کا زہر" شعر میں لا سکتے ہیں مگر کہنے کا انداز اور قرینہ چاہئے! ؎

جب گھُلی تیری راہوں میں شامِ ستم
ہم چلے آئے لائے جہاں تک قدم

کیا "شامِ ستم" "راہوں میں" "گھُلا" بھی کرتی ہے! ایسے ہی موقعوں پر خامہ انگشت بدنداں، اور ناطقہ سر بگریباں نظر آتا ہے ؎

سانس تھامے ہیں نگاہیں کہ نہ جانے کس دم
تم پلٹ آؤ، گذر جاؤ، یا مڑ کر دیکھو

"یا" کا "الف" کس بُری طرح دَب رہا ہے۔ اِسی قسم کے دَبتے ہوئے الف کے بارے میں غالب نے کہا تھا کہ سینہ میں نیزہ کی طرح لگتا ہے! "یا" کی جگہ "کہ" آسکتا تھا ؎

یوں بہار آئی ہے اس بار کہ جیسے قاصد
کوچۂ یار سے بے نیل و مرام آتا ہے

شعر اچھا ہے مگر "بے نیلِ مرام" کی بجائے "بے نیل و مرام" پڑھ کر ذوقِ ادب کو جھٹکا سا لگا۔ (اس میں "نیل" کا لفظ "چیل" نہیں "سَیل" اور "لیل" کی طرح کرنا چاہئے۔ پھر "نیل" اور "مرام" کے درمیان اضافت ہے واوٴ عطف نہیں ہے)

فیض صاحب کے کلام سے یہ چند اشعار پیش کئے گئے ہیں۔ اربابِ نقد و نظر کو اُن کی شاعری کے اس رُخ سے صرفِ نظر نہیں کرنی چاہئے ورنہ ان کی تقلید میں نئے کہنے اور لکھنے والے زبان و اظہار کے معاملے میں بے پروائی برتنے لگیں گے!

جناب فیض کا کلام پڑھنے کا موقع ملا تو ان کے یہاں ایسے اشعار بھی ملے، جن سے وجدان نے لطف حاصل کیا ؎

چل رہی ہے کچھ اس انداز سے نبضِ ہستی
دونوں عالم کا نشہ ٹوٹ رہا ہو جیسے

اک طرزِ تغافل ہے سو وہ ان کو مبارک
اک عرضِ تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے

رنگ پیراہن کا، خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسم گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام
پھر نظر میں پھول مہکے، دل میں پھر شمعیں جلیں
پھر تصور نے لیا اس بزم میں جانے کا نام

کر رہا تھا غمِ جہاں کا حساب
آج تم یاد بے حساب آئے

ذکرِ دوزخ، بیانِ حور و قصور
بات گویا یہیں کہیں کی ہے

ہے اپنی کشتِ ویراں سرسبز اس یقیں سے
آئیں گے اس طرف بھی اک روز ابرو باراں

ہو چکا عشق اب ہوس ہی سہی
کیا کریں فرض ہے ادائے نماز

ساغر تو کھنکتے ہیں شراب آئے نہ آئے
بادل تو گرجتے ہیں گھٹا برسے نہ برسے

دلِ عشاق کی خبر لینا
پھول کھلتے ہیں ان مہینوں میں

اگر شرر ہے تو بھڑکے، جو پھول ہے تو کھلے
طرح طرح کی طلب تیرے رنگِ لب سے ہے

چاند دیکھا تری آنکھوں میں نہ ہونٹوں پہ شفق
ملتی جلتی ہے شبِ غم سے تری دید اب کے

شمعِ نظر، خیال کے انجم، جگر کے داغ
جتنے چراغ ہیں تری محفل سے آئے ہیں

ان شعروں میں کتنا لطف و کیف ہے، اور بعض تو مضمون و خیال کے لحاظ سے اچھوتے ہیں۔ کاش! جنابِ فیض کی شاعری کا مسلسل یہی رنگ ہوتا:

ـــ کسی کلچر کی باطنی قدروں کی تعریف، اظہار اور تعین، اور اس کی ظاہری صورتوں کی تشکیل، بیان اور صورت گری سے شعر و ادب ہی کے ہاتھوں تکمیل پاتی ہے۔ ایسی ہی اہمیت ادب کو کلچر کے ارتقائی مسئلے میں بھی حاصل ہے۔ ـــ فیض

ڈاکٹر ظل حسنین

فیض کی شاعری

پس منظر و پیش منظر

اقبال نے اپنے فرزند جاوید کو مخاطب کر کے کہا تھا ؎

میں شاخِ تاک ہوں میری غزل ہے میرا ثمر
اسی ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر

فیض بھی اپنے ابنائے وطن بلکہ پوری دنیا کے یارانِ نکتہ داں کو مخاطب کرتے ہوئے نہایت وثوق کے ساتھ اپنے مخصوص اشاراتی و متغزلانہ انداز میں کہہ رہے ہیں ؎

پیو کہ مفت لگا دی ہے خونِ دل کی کشید
گراں ہے اب کے مئے لالہ فام کہتے ہیں

اقبال کو فیض نے ہمیشہ ایک خاص احترام و محبت کے ساتھ یاد کیا۔ ان پر نظم (مرثیہ) بھی کہی جس میں انہیں "خوش نوا فقیر" اور "شاہ گدا نما" جیسے القاب میں خراجِ تحسین و عقیدت پیش کیا اور ان کے گیت کے تمام محاسن کو لازوال قرار دیا۔

اقبال کو اس طرح یاد کرنا بھی فیض کی وسیع النظری کی ایک بہت بڑی دلیل ہے اور فن و ادب کے احترام کا ایک زندہ ثبوت بھی۔ فیض کی نظر سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ ماضی کے دھارے سے بہت ساری غیر جمہوری روایات بھی حال میں داخل ہو جاتی ہیں جن کی قطع و برید بھی ازبس ضروری ہے بلکہ غیر صحت مندانہ روایات کے وارث نہ بننے کا صریحی اعلان بھی مستحسن ہے لیکن جہاں تک مختلف مکاتیبِ خیال کے قیام و وجود کا تعلق ہے فیض اس سے نہیں گھبراتے بلکہ خوش ہوتے ہیں کہ ان کی جد و جہد سے برتر حقائق اور زندگی کے بہتر معیار پیدا ہوں گے۔ ایسے افراد کی کمی نہیں جو اپنے ملک و قوم کے ماضی کی بات تو بہت کرتے ہیں لیکن ماضی کو تاریخی طور سے نہیں سمجھتے جو ماضی کو صرف جذباتی عینک سے دیکھتے ہیں اور اسلئے حال کو بھی وہ ماضی کی ہی ایک پرچھائیں بنائے رکھنا چاہتے ہیں تغیر اور انقلاب ہی اصل میں زندگی کے ضامن ہیں اور فیض کا سارا کلام اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ وہ تغیر و انقلاب کے بہت بڑے حامی اور مؤید ہیں — تبدیلی کو محض جذباتی طریقے سے نہیں دیکھتے بلکہ اس کا وہ ایک تاریخی شعور بھی رکھتے ہیں — فیض کے کلام میں قدماء کا اثر بھی کارفرما نظر آتا ہے۔ قدیم فارسی شعرا میں سعدی، حافظ اور عرفی وغیرہ کے فن و فکر کی بازگشت آپکو جہاں تہاں ضرور دکھائی دے گی اسی طرح اردو شعراء میں صرف اقبال کا ہی نہیں بلکہ اوروں کا بھی اثر دکھائی دیتا ہے۔ خاص کر سودا اور غالب کا۔ جن کے

تاہم انہوں نے اپنی غزلیں بھی تخلیق کی ہیں۔

فکرِ معذوری تکرار کروں یا نہ کروں
ذکرِ مژگانِ گرفتار کروں یا نہ کروں　　　(نذرِ سودا)

کسی گمان پہ توقع زیادہ رکھتے ہیں
پھر آج کوئے بتاں کا ارادہ رکھتے ہیں　　　(نذرِ غالب)

انداز بیان اور فنی تراکیب میں قدماء سے استفادہ کی انہوں نے پوری کوشش کی ہے ان کو اندھی تقلید کہیں بھی نہیں کی۔ بے جا قسم کی اثر پذیری سے فیض نے ہمیشہ اپنا دامن بچایا ہے اور خواہ مخواہ کے لئے اساتذہ کے رنگ سے اپنا رنگ ملانے سے احتراز کیا ہے

جب ذہن میں فیض کی شاعری کے تاریخی پس منظر کا ہلکے سے ہلکا خاکہ بھی آتا ہے تو اس میں کچھ شخصیتیں خاص طور سے ابھرتی محسوس ہوتی ہیں اور ہمارے تصور کے سامنے منارۂ نور بن کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ ان سب کا بیان طوالت چاہتا ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں۔ خصوصیت سے اس بڑی ادبی تحریک کا ذکر بھی کرنا پڑے گا جس نے ایک طرف فیض ایسے شاعر اور سخنور کو پیدا کیا تو دوسری طرف عوام کو فکری طور پر اس قابل بنا دیا کہ وہ اچھے سخن فہم اور ادب شناس ہو سکیں۔ سنہ ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام اردو ادب کے لئے ایک نئی دنیا اور ایک نئی زندگی کا پیام لے کر آیا۔ اس انجمن کی تحریک نے ہماری شعری دنیا میں بھی ایک انقلاب پیدا کیا تھا، مواد اور تکنیک کے لحاظ سے اس نے اردو شاعری کو کافی متاثر کیا۔

زندہ دلان پنجاب میں سے جہاں راشد اور تاثیر نے فیض کو متاثر کیا وہیں سردار جعفری، احمد ندیم قاسمی اور مخدوم کی شاعری نے فیض کے شعری کردار میں ایک استقامت پیدا کی۔ فیض کی شاعری کی عقبی زمین کا جائزہ لیتے ہوئے جوش اعظم کی کوہ گراں اور قبلۂ رندانِ جہاں جیسی بے باک و بے ریا بھولی اور معصوم ادبی شخصیت بھی افقِ ذہن پر چھا جاتی ہے جس نے عشق و رندی اور شباب و انقلاب کی سبک سری میں پھر سے ایک نیا وزن و وقار پیدا کیا لیکن جو اس عہد جدید میں سماج کی بے رحم قوتوں کا شکار بھی ہو گئی ہے۔ جوش کی شاعری کی فرد جرم کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود دل نہ جانے کیوں یہ بار بار کہتا ہے کہ اس کی ناکردہ گناہی کبھی نہ کبھی اپنا اثر دکھا کر ہی رہے گی اور اس کا کردار کچھ ویسا ہی ہو گا جو اقبال کے اس شعر میں سمٹ آیا ہے ۔

اگر دست تو کار نادر آید
گناہے ہم اگر باشد ثواب است

جوش کی یہ نظم ذہن میں لائیے ۔

شکستِ زنداں کا خواب

کیا ہند کا زنداں جاگ رہا ہے گونج رہی ہیں تکبیریں
اکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں
آنکھوں میں گدا کی سرخی ہے بے نور ہے چہرہ سلطاں کا
تخریب نے پرچم کھولا ہے سجدے میں پڑی ہیں تعمیریں

حالانکہ جوش نے یہ ترانہ سنہ ۱۹۲۱ء میں لکھا تھا اور فیض نے اپنا ترانہ جو دست صبا میں ہے غالباً سنہ ۵۰ء کے ادھر ادھر لکھا ہے لیکن

جوش کی اس نظم "شکست زنداں کا خواب" کی گونج فصل زمانی کے باوجود فیض کے اس "ترانہ" میں صاف سنی جا سکتی ہے۔ مثلاً دو ایک شعر دیکھئے

اے خاک نشینو! اٹھ بیٹھو، وہ وقت قریب آپہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے جب تاج اچھالے جائیں گے
اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں، اب زندانوں کی خیر نہیں
جو دریا جھوم کے اٹھے ہیں تنکوں سے نہ ٹالے جائیں گے

فیض کی شاعری کے پس منظر میں جوش کے معنوی فرزند مجاز مرحوم بھی آجاتے ہیں جو صرف "شاعر شہر نگاراں" ہی نہ تھے بلکہ مرد انقلابی[1] ہونے کی حسرت بھی دل میں رکھتے تھے۔ بات یہ ہے کہ فیض اور مجاز میں طرز بیان کے تھوڑے بہت اختلاف کے باوجود ایک خاص مماثلت بھی ہے دونوں ہی غنائی شاعر ہیں اور دونوں ہی اپنے عہد کے صحیح ترجمان ہیں اور اپنے دور کی سچی کھری اور سب سے پرخلوص آواز ---- ہاں یہ فرق ضرور ہے کہ مجاز کی شخصیت، زمانہ اور اپنی بھی زندگی کی مار زیادہ عرصے تک برداشت نہ کر سکی۔ اس مجروح زندگی نے اپنے "مذاق طرب آگیں" میں پناہ ڈھونڈی۔ اور اس مکروہ دنیا سے جلد رخصت ہو گئی۔ لیکن پھر بھی اس کی انفرادیت امتداد زمانہ کے باوجود کبھی بھلائی نہیں جا سکتی ع

مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

یہ آواز آج بھی امر ہے ---- یہ آواز ہمیشہ امر رہے گی۔ مجاز نے جو "خواب سحر" دیکھا تھا وہ آج بھی فیض کے کلام میں زندہ ہے اور ان کی شاعری کی روح بنا ہوا ہے۔

عام معنوں میں تو یہ بات ٹھیک ہے کہ شاعر پیدا ہوتے ہیں، شاعر ڈھالے نہیں جاتے لیکن اس کا یہ مطلب نکالنا کہ شاعر کے لئے کسی محنت یا اکتساب کی ضرورت نہیں ٹھیک نہیں ۔ زندگی میں محنت و اکتساب کا بھی بڑا ہاتھ ہے ۔ کیونکہ بغیر اس کے کسی کام میں عظمت پیدا نہیں ہوتی ۔ اور فطری صلاحیت بھی پوری طرح نہیں ابھرتی ۔ مجاز میں فطری شاعرانہ صلاحیت "فراق" سے شاید زیادہ ہی تھی لیکن ان دونوں کے قد و سطح میں کتنا فرق نظر آتا ہے ۔ مجاز کے یہاں تغزل بہت ہے لیکن وہ فراق کے رچاؤ اور پختگی کو نہیں پہنچ پاتا جو واقعی ایک کمائی اور سخت ریاض کا ثمرہ ہے ۔

مجاز مرحوم اپنے مخصوص ڈھب کی زندگی کے ساتھ اگر دس بیس برس اور بھی زندہ رہتے جب بھی شاید نتیجہ کچھ ایسا ہی رہتا وہ دیانت داری کے ساتھ اس بات کا دعویٰ مشکل ہی سے کر سکتے جس کے فراق صاحب بجا طور پر مستحق ہیں۔

فراق احساس کی ایسی ریاضت
حقیقی شاعری بھی ہے بڑا کام

اس بات سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ خواہ کوئی بھی فن ہو جب تک اس میں مجاہدے کی حد تک جان توڑ محنت نہ کی جائے گی وہ اپنے کمال عروج تک نہیں پہنچ سکتا۔

نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر　　　(اقبال)

---

[1] یہاں کے شہر یاروں کو خبر دو
کہ مرد انقلابی آگیا ہے

فیض کا سب سے پہلا شعری مجموعہ "نقش فریادی" کے نام سے سنہ ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا۔ یہ مجموعہ بھی اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ فیض بنیادی طور پر ایک بہت ہی نرم مزاج، درد مند اور کم گو آدمی ہیں پے در پے مصائب سے سابقہ پڑتا ہے لیکن جدوجہد کی صفت دبتی نظر نہیں آتی بلکہ برابر بڑھتی ہی رہتی ہے۔ بے وجہ شعر کہنا انہیں کبھی پسند نہیں رہا البتہ جن باتوں کا دل پر اثر ہوا انہیں فیض نے شعر کی صورت میں زیادہ سے زیادہ خلوص کے ساتھ منتقل کیا۔ ن۔ م۔ راشد کے بقول فیض نے شاعری کا آغاز غزل سے کیا۔ یہ بات ان کے حسب حال بھی تھی اپنے دل کی چوٹ کا ذکر فیض نے خود بھی کیا ہے۔ جذبات کی اصلیت کی شمولیت میں ان کی فنکاری نے شعریت کے جوہر دکھائے چنانچہ ان کی ابتدائی عہد کی غزلیں بھی اپنے اندر ایک دلکشی رکھتی ہیں۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

نہ پوچھو عہد الفت کی، بس اک خواب پریشاں تھا
نہ دل کو راہ پہ لائے نہ دل کا مدعا سمجھے

فیض تکمیل آرزو معلوم
ہو سکے تو یونہی بسر کر دے

فیض نے غزل کی صنف میں۔ غزل مسلسل۔ یا غزل غیر مسلسل کی طرح کوئی تقسیم نہیں کی بلکہ شروع ہی سے ان کی غزلوں میں تسلسل کا احساس ملتا ہے باوجود اس کے کہ غزل کے آرٹ کے مطابق اشعار اپنی جگہ پر منفرد و مکمل مفہوم کے حامل ہیں۔ ہر چند جب غزل کے پیکر میں پوری طرح ڈھل نہ سکا تو فیض نے نظمیں کہنی بھی شروع کیں۔ لیکن ان کی نظمیں اور غزلیں دونوں روایتی طرز کی شاعری سے کچھ مختلف تھیں۔ ردیف قافیوں میں وہ لفظی صحت سے زیادہ صوتی محاسن کو پیش نظر رکھتے رہے اور انداز بیان میں قواعد اور زبان سے زیادہ خلوص اظہار کو اہم سمجھتے رہے۔

غم جاناں جلد ہی انہیں غم دوراں کی طرف لے آیا۔ محبت نے انفرادی اور سماجی غموں کا احساس دلایا۔ چنانچہ سماج اور وطن کی کشمکش ذاتی میلانات و محسوسات پر ترجیح پانے لگی۔ حسن محبوب اب بھی دلکش تھا اور اپنے اثرات میں شدید بھی لیکن غم زمانہ ان دونوں سے بھی شدید تر ثابت ہوا۔ چار و ناچار شاعر کو یہ اعتراف کرنا ہی پڑا کہ ؏

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

غرض یہ کہ ان سماجی تقاضوں کے تحت اور اپنے فنی اور ادبی شعور سے مجبور ہو کر بھی فیض دل کی داخلی دنیا سے سنگ و آہن کی بیرونی دنیا کی طرف بھی قدم اٹھانے لگے اور اپنے دل کی ٹیسوں کو دوسروں کے درد نظم کرنے کا پس منظر بنا لیا۔ اس رجحان کی ایک نمائندہ مثال۔ نقش فریادی کی نظم "سوچ" ہے اس احساس اور رجحان نے ان سے وہ نظمیں کہلائیں جس کے طرس دکرنست (؟) وا غنائی طرز اظہار اور چٹیلے انداز بیان نے تھوڑے ہی عرصے میں انہیں ممتاز شعراء کی صف میں جگہ دلادی فیض ترقی پسند تحریک سے بے حد متاثر ہوئے یہاں یہ عرض کر دینا مناسب ہوگا کہ وہ اب بھی نہ صرف تحریک کے بلکہ تنظیم کے بھی قائل ہیں اور اسے احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں کہ "تنظیم کی موجودگی سے اتنا ضرور ہے کہ مل بیٹھنے اور افہام و تفہیم کے لئے موقع ہاتھ آتا ہے اور اس طرح لکھنے والے کو تقویت ہوتی ہے .... اس میں شمولیت کے یہ معنی نہیں کہ تحریک سے (لازماً) وابستگی بھی ہو"

سنہ ۱۹۳۶ء سے پہلے بھی وہ اپنے خیالات و محسوسات کی ترجمانی کرتے رہے تھے لیکن ان کے اس زمانے کے تجربات میں کوئی خاص گہرائی نہیں پیدا ہوئی تھی۔ اس وقت تک ان کے یہاں صرف ایک عشق تھا ـــ عشق محبوب ـــ جس کی وہ جذباتی ترجمانی کر رہے تھے سنہ ۱۹۳۶ء کے بعد سے سیاست اور شاعری یہ دونوں چیزیں ان کے یہاں تیزی سے ہم آمیز ہونے لگیں

لیکن ان کے امتزاج میں ابھی پورا نکھار نہیں پیدا ہوا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں آزاد ہندوستان اور پاکستان کا قیام عمل میں آیا لیکن آزادی سے جو توقعات وابستہ کی جاچکی تھیں حالات کچھ ان کی مخالف سمت میں ہی جاتے ہوئے محسوس ہوئے۔ ان سے متاثر ہو کر فیض نے "صبح آزادی" کے عنوان سے وہ دلگداز و دلسوز نظم کہی جس کی مثال اردو کی سیاسی شاعری میں مشکل ہی سے ملے گی ؎

یہ داغ داغ اجالا۔ یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں

اور جس کا خاتمہ ان مصرعوں پر ہوتا ہے ؎

ابھی گرانیٔ شب میں کمی نہیں آئی
نجات دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

فیض کی تراکیب اور ان کی زبان پر بہت سارے اعتراضات کئے گئے ہیں حالانکہ ہمارا خیال یہ ہے کہ اس میدان میں بھی انہوں نے قابل قدر تخلیقی کام کیا ہے۔ "نقش فریادی" میں تو انہوں نے زیادہ تصرفات نہیں کئے ہیں لیکن "دست صبا" میں اور "زنداں نامہ" میں انہوں نے کچھ ایجادی تصرفات ضرور کئے ہیں۔

"حبیب عنبر دست" "عنبریں آنکھیں" اور "آبشار سکوت" ایسی حسین ترکیبیں وضع کی ہیں اور کچھ الفاظ بھی گھڑے ہیں جو ہمارے لفظیات کا سرمایہ ہیں، نئے اضافے کا حکم رکھتے ہیں ساتھ ہی کچھ الفاظ کو انہوں نے نیا رواج بھی بخشا ہے مثلاً شہپور، حیناؤں، مہوباؤں اقربت اور طبل (بمعنی طبل خانہ یا نوبت خانہ) وغیرہ — ان تصرفات کے بارے میں ہمارے علما کا جو نقطۂ نظر رہا ہے وہ ہمارے لئے تکلیف دہ ہے چنانچہ اس مسئلے کے بارے میں ہم اپنی بات بھی کہنا چاہتے ہیں۔

عام مثل ہے کہ رونا گانا کسے نہیں آتا۔ رونے کی بات تو خیر دوسری ہے لیکن گانا گا سکنا یا گانے سے حظ حاصل کرنا بھی ہر شخص کو نہیں آتا۔ یہی بات شاعری کے فن لطیف پر بھی صادق آتی ہے خواہ کوئی شخص شعر و شاعری کا کتنا ہی مطالعہ کیوں نہ کرتا ہو لیکن ضروری نہیں کہ اس کے اندر شعریت کا بالیدہ احساس بھی ہو۔ چارلس نے بھی ایک جگہ یہ بات زور دے کر اور صراحت کے ساتھ کہی ہے کہ ہر شخص غنائی کان (musical ears) نہیں رکھتا پکاسو نے بھی ایک جگہ بہت جھلاہٹ کا اظہار کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ "جسے دیکھو وہی فن کو سمجھنا چاہتا ہے یہ بات ایسی ہی ہے کہ ہر شخص پرندے کی چہکار سمجھنا چاہے۔"

ادھر کچھ عرصے سے شعر و شاعری پر تنقیدیں دیکھتے ہوئے میرا یہ احساس یقین میں بدل چلا ہے کہ یہ باتیں سچ ہیں ورنہ ہماری جدید شاعری اور خاص کر غنائی اور علامتی شاعری پر ایسی تنقیدیں نہ ہوتیں جن کے نمونے اکثر دیکھنے میں آتے ہیں اور جن میں ہمارے بعض اہل علم نے خاص مہارت حاصل کر لی ہے۔ فیض کی زبان اور تراکیب کو بھی میکانی طریقے سے پرکھا گیا ہے۔

ساغر ناب میں آنسو بھی ڈھلک جاتے ہیں
لغزش پا میں ہے پابندیٔ آداب ابھی
(فیض)

ناب۔ فارسی لفظ ہے جس کے معنی صاف خالص و بے آمیزش وغیرہ کے ہیں۔ مفہوم شعر کا یہ ہے کہ ہماری خوشیوں پر غم کے سائے لہرا رہے ہیں ہماری شرابِ ناب بھی واقعی شراب نہیں رہ پاتی اس میں آنسوؤں کی آمیزش ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے اس کا ذائقہ اور کیف و سرور بھی مکدر ہو جاتے ہیں غرض یہ کہ اپنے زمانے کے ناخوشگوار و زبوں حالات کی وجہ سے نہ تو ہم پینے کا لطف حاصل کر پاتے ہیں اور نہ ہی پی کر بہکنے کا۔)

بات صاف ہے لیکن میں نے متعدد کتاب خواں معلمین اور کتاب نویس مصنفین کو فیض کی اس ترکیب (ساغرِ ناب) پر قہر و غضب کی حد تک تیوراتے اور بل کھاتے ہوئے دیکھا ہے "یہ ترکیب" "سخت غلط ہے" "بالکل غیر شاعرانہ ہے" "زبان سے سراسر ناواقفیت کی دلیل ہے" وغیرہ وغیرہ کتنی جلدی فتوے صادر کر دئے جاتے ہیں ہمارے یہاں شعر و شاعری کے بارے میں!!

دل یہی کہتا ہے کہ شعر و شاعری کے بارے میں کاش ہم فنی تقاضوں کی حد تک فرق و تمیز کر سکتے فیض کی یہ ترکیب مجھے غلط اور غیر شاعرانہ نظر نہیں آتی۔ اسی طرح جیسے مولانا حالی کی ترکیب "پیرویٔ مغربی"[1] (بہ معنی پیرویٔ مغرب) ضرورت شعری کی وجہ سے غلط نہیں ہے (حالی کے یہاں ایک حرف بڑھا دیا گیا ہے فیض کے یہاں ایک لفظ گھٹا دیا گیا ہے لیکن اس طرح کہیں بھی اصل معنی میں فرق نہیں آتا) میر حسن کا ایک شعر بھی مثال کے طور پر پیش کرتا چلوں ؎

پلا ساقیا ساغرِ بے نظیر
پھنسی دامِ ہجراں میں بدرِ منیر (میر حسن)

فیض کی ترکیب "ساغرِ ناب" (بہ معنی ساغرِ شرابِ ناب) اور میر حسن کی ترکیب "ساغرِ بے نظیر" (بہ معنی ساغرِ شرابِ بے نظیر) میں مجھے کوئی ترکیبی فرق دکھائی نہیں دیتا۔ ہمارا نظام تلازمِ خیالات (The law of association of ideas) دونوں جگہ بھرپور طریقے سے کام کرتا ہوا نظر آتا ہے —

بہ قافیہ کہہ کر بھی جو بات کہی جاتی ہے شاعری میں اس کی بھی خاص اہمیت ہے اس لئے ہمارے خیال سے شعری دنیا میں "ساغرِ ناب"، "ساغرِ بے نظیر" ایسی ترکیبیں اپنے فنکارانہ حسن ترتیب کے پس منظر میں جائز سمجھی جانی چاہئیں۔

لطیف شاعری بین السطوری مطالعہ کے بغیر کبھی محسوس ہی نہیں کی جا سکتی۔ یہاں تک کہ غزل کے روایتی شعر بھی بغیر اس وصف کے ذہن کی گرفت میں نہیں آتے۔ مثال کے لئے مومن کا یہ شعر ہی لے لیجئے —

تیرے دل تفتہ کی تربت پہ عدو جھوٹا ہے
گل نہ ہوں گے شررِ آتشِ سوزاں ہوں گے

یہاں دو ایک چھوٹی موٹی کڑیوں کو جوڑنے اور ان پر زور دینے سے ہی شعر کی بات پوری طرح صاف ہوتی ہے۔ غالب تو عام طور سے اپنے اشعار میں الفاظ حذف کرتے رہتے ہیں۔ یہاں تو دو ایک معمولی مثالیں ہی جو اس وقت یاد آ رہی ہیں حاضر کرتا ہوں ؎

(حال) کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

---

[1] حالی اب آؤ پیرویٔ مغربی کریں
بس اقتدائے مصحفی و میر ہو چکی

ع جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آب جو (کو)

(معشوق) نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

(عاشق کا) رنگ شکستہ صبح بہار نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتن گل ہائے ناز کا

ظاہر ہے کہ محذوف الفاظ کو ذہن میں لائے بغیر ہم ان اشعار کا مطلب نہیں سمجھ سکتے۔

یہاں ہم ایک بات اور عرض کرنا چاہیں گے اردو والوں کے لئے جہاں عربی اور فارسی کا جاننا بہتر ہے وہیں ان کے لئے کم از کم ایک بڑی بین الاقوامی زبان سے خاصی اچھی واقفیت بھی اب لازمی ہے اول الذکر زبانوں سے ہم نے ضرورت سے کہیں زیادہ ہی اثر قبول کیا ہے اب ضرورت اس کی ہے کہ ہم دوسری عالمی زبانوں کے ادبیات سے بھی خاطر خواہ استفادہ کریں اور اپنی تنگ دنیا سے نکل کر ایک وسیع دنیا میں داخل ہوں مثال کے لئے ہمیں انگریزی شاعری کی یہ بات بھی رشک کی حد تک اچھی معلوم ہوتی ہے کہ وہاں قافیوں کی ایسی سخت گیری نہیں جس سے خیال کی طاقت مجروح یا کمزور ہو۔ انگریزی شاعری باوجود اس کے کہ اس کے لفظیات کا ذخیرہ بہت وسیع ہے اپنے شعرا کو پھر بھی کچھ نہ کچھ آزادی اور چھوٹ دیتی ہے۔ ہم بھی اگر مخصوص حالات میں تعین قافیہ میں سماعت کے ساتھ ساتھ بصارت کے حواس سے بھی کچھ مدد لیں تو اپنی شاعری کے حق میں ایک اچھی بات ہی کریں گے۔ کم از کم ہمیں اتنا تو کرنا ہی چاہئے کہ اپنے سماعت کے معیار اور اصول کو وسیع کریں اور انہیں لچکدار بنائیں۔ انگریزی شاعری سے ہم تمثیل نگاری، علامیہ نگاری، طرز اظہار کے نئے سانچے اور صنعت منقولہ (Transferred epithet) کے میدان میں بھی بہت کچھ سیکھ کر اپنے شعری تصور کو وسیع کر سکتے ہیں۔ یہاں یہ بھی واضح رہے کہ ہم نے یہ بات کسی طرح کی مرعوبیت یا ذہنی غلامی کے تحت نہیں کہی ہے بلکہ اپنی ذہنی آزادی پر ایک گہرے اعتماد کی وجہ سے کہی ہے جس کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ آئین نو سے نہ ڈر کر اور طرز کہن پہ نہ اڑ کر ہم سیکھنے سکھانے کا عمل برو قت جاری رکھیں۔

فیض نے انگریزی ادب سے بھی بہت ساری اچھی چیزیں لے کر اور انہیں ایک تخلیقی پیکر میں ڈھال کر اردو شاعری کے دامن کو خاطر خواہ پر مزین کیا ہے۔ فراق صاحب جلد کسی کی تعریف نہیں کرتے ان کی نظر میں مختلف زبانوں کے ادبیات ہیں جن سے وہ بہت اچھی واقفیت رکھتے ہیں اب دیکھئے موصوف نے بھی کیسے جی کھول کر فیض کی شاعری کو خراج تحسین ادا کیا ہے عالمی ادب کے پس منظر میں نظم "رقیب سے" کی تعریف وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔ "شیکسپیئر، گوئٹے، کالیداس اور سعدی بھی اس سے زیادہ رقیب سے کیا کہتے"۔

ہمارے قدما کی دنیا آج کے مقابلے میں محدود تھی لیکن انہوں نے شاعری کی پرکھ کے لئے جو معیار قائم کئے وہ بہت وسیع تھے شاعری کے معنی فرضی باتیں بنانے کے نہیں تھے۔ ان کی شاعری اپنے اور دنیا کے نہ جانے کتنے درد و غم سے عبارت تھی شعر ان کے لئے وہ تھا جو جذبہ و احساس اور فکر و خیال کی ایک سچی تصویر ہو سکے جو دل کو واقعی دھڑکا سکے اور حقائق کا اظہار بھی بے دھڑکے کر سکے چنانچہ وہ زبان و بیان کے معاملے میں بڑے فراخ دل تھے۔ سودا، میر اور میر حسن وغیرہ کے یہاں اس فراخ دلی کی مثالیں ہمیں بہت کثرت سے ملتی ہیں۔ مثلاً سودا کو کثرت سے ہندی الفاظ استعمال کرنے اور "بیڑویاں" و "پوشش چھینٹ قلم کار" وغیرہ جیسی تراکیب وضع کرنے میں کوئی عار نہ تھا۔ ایسا ہی طریقہ میر حسن کا بھی تھا اور

میر کا تو کہنا ہی کیا۔ حیرت ہوتی ہے کہ شرفا کے دور میں بھی شرفا کی زبان ان کے اسالیب بیان اور ان کا روزمرہ میر کے کلام کا معیار نہ بن سکے۔ ان کا رابطہ عوام سے رہا اور ان کی زبان انہیں کے بقول جامع مسجد کی سیڑھیوں پر چلنے والوں سے بنی۔ مسجد کو میر نے میت، اور خیال کو اس کی. ی. دبا کر بھی نظم کیا۔ تربت کا قافیہ میّت اور برہم کا قافیہ موسم بھی نظم کیا ہے۔

ایسے ہی میر حسن کی زبان و بیان کا انداز بھی دامن دل کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ الفاظ، تراکیب اور قوافی، سبھی کے برتنے میں ان کے یہاں جو ایک آزادی ملتی ہے وہ بڑی پرکشش ہے ؎

کروں اس کی پشواز کا کیا بیاں
فقط ایک پشواز آب رواں

لگی کہنے چل ری دوانی نہ ہو
کوئی چیز اپنی بگانی نہ ہو

یہ کہہ کر اس طرف وہ روانہ ہوا
دل اس طرف اس کا دوانہ ہوا

خط کشیدہ الفاظ قابل توجہ ہیں اور یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ایک ہی شعر میں ایک ہی لفظ کو وہ دو طرح سے استعمال کرتے ہیں ایک مصرع میں "طَرَف" اور دوسرے میں "طرْف"۔ ان باتوں کو دیکھ کر جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ان اساتذہ نے زبان کے افلاس کی وجہ سے ایسا کیا، ہمارا خیال ہے، کہ وہ پوری طرح ٹھیک بات نہیں کہتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان شعرا نے ارادی طور پر اور ایک بہتر فنی و ادبی شعور کے تحت اس طرح کی آزادیاں برتی ہیں ــــ

غالب کے زمانے میں شرفا کی نفاست اپنے کمال عروج کو پہونچی ہوئی تھی۔ ناسخ مرحوم زبان و بیان کی جی بھر کے اصلاح فرما چکے تھے خیالی تخلیق کو کافی رواج حاصل ہو چکا تھا۔ ٹھیٹ الفاظ اور عام محاوروں کا استعمال پست مذاقی پر محمول کیا جانے لگا تھا ظاہری آرائش کو خاص اہمیت حاصل ہو چکی تھی۔ مرزا غالب پر بھی ان باتوں کا اثر ہونے لگا تھا لیکن جلد ہی مرزا کے اندر جو شاعر تھا وہ جاگ پڑا اس نے معنی آفرینی کو ہی شاعری سمجھا نہ کہ قافیہ پیمائی کو۔ اثر آفرینی اظہار اصلیت کے باب میں اسے میر ہی کا معتقد ہونا پڑا اور کثرت کے ساتھ ایسے الفاظ استعمال کرنے پڑے جو مروجہ معیار کے خلاف تھے بہ طور نمونہ، مشتے از خروارے ملاحظہ ہو۔

"تھنیا"، "ٹک"، "سو"، "کو"، "پرے"، "چھٹیں"، "ناامیدواری"، "کبھو کبھو"، "تس پر"، "بیش نہیں"، "ساغر کھینچ"، "جگر"... "تسلی نہ ہوا"، "گلستان ہونا" (بہ معنی باغ باغ ہونا)، وغیرہ وغیرہ۔

اور یہ کچھ غالب ہی پر منحصر نہیں ہے ہر زمانہ میں، ہر زبان کے اہل کمال کو اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لئے ایسا کرنا پڑا ہے۔ مثلاً انگریزی میں ملٹن نے کم و بیش آٹھ ہزار نئے الفاظ کا استعمال کیا اور شیکسپیئر نے تقریباً پندرہ ہزار نئے الفاظ استعمال کئے اور جہاں تک اس کی زبان کا تعلق ہے اس کے بارے میں مجھے صرف اتنا ہی عرض کرنا ہے کہ اپنی تصنیف کے ابتدائی اور ثانوی زمانے کو چھوڑ کر باقی دونوں ادوار یعنی دور سوم اور دور چہارم میں اس نے مروجہ زبان و نحو کے سارے تانے بانے ادھیڑ ڈالے پھر بھی اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا اور آج بھی لوگ بڑی ہمدردی اور خلوص نیت کے ساتھ اس کی زبان و بیان کی ایجادات کے معنی و مفہوم سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ہمارے یہاں حال یہ ہے کہ بڑے سے بڑے شاعر کو بھی بند ے ٹکے محاوروں کی دنیا سے باہر جانے کی اجازت کم ہی دی جاتی ہے اور اس کے مفید ایجادی تصرفات پر بھی برابر اعتراضات کی بوچھاڑ ہوتی رہتی ہے ۔ زبان کے بارے میں اور خاص کر شاعری کی زبان کے بارے میں ہمارا زاویۂ نظر کتنا عجیب سا ہے ۔ اسے ہوا دینے میں ہمارے بعض "چوٹی" کے صحافیوں کا بھی بہت ہاتھ ہے ہمارے ادب میں ایسے صحافی کم نہیں ہیں جو شعریت سے تو بے بہرہ ہیں لیکن جو شعر پر اصلاح دینے کے معاملے میں اور بزعم خود شاعری کا مثالی نمونہ قائم کرنے میں بہت پیش پیش ہیں۔

ہماری آج کی دنیا تیزی سے سکڑتی اور تنگ ہوتی ہوئی اتنی وسیع ہوتی جا رہی ہے کہ ہم ایک مخصوص ملک کے شہری ہوتے ہوئے بھی ایک پوری دنیا کے باسی بھی ہیں لیکن افسوس ہے کہ اپنے معیار شاعری میں اب تک ہم بہت ساری رجعت پسندیوں کے مارے ہوئے ہیں اور فیض کی شاعری پر بھی بیشتر اسی قبیل کی تنقیدیں کی گئی ہیں ۔ جنہیں دیکھ کر ویسی ہی "ہائے" کرنی پڑتی ہے جیسی کہ مشہور فارسی شاعر نے ایک مرتبہ اپنے شعر کے مقدر پر کی تھی کہ ع

شعر مرا بہ مدرسہ کہ برد

ہمارے کچھ نحویوں نے فیض کی شاعری کو اپنے اعتراضات کا نشانہ بنایا ہے ان سب کا جواب اس چھوٹے سے مضمون میں تو نہیں دیا جا سکتا لیکن پھر بھی دو چار خاص خاص اعتراضات کا جواب دئے بغیر رہا بھی نہیں جاتا ۔ یہ اعتراضات کچھ اس قسم کے ہیں ۔

ع یہ بزم چراغاں رہتی ہے اک طاق اگر ویراں ہے تو کیا

اعتراض یہ ہے کہ یہاں "چراغاں" کا لفظ غلط طریقے سے استعمال ہوا ہے جواب میں مختصراً یہاں اتنا ہی عرض کرنا ہے کہ مرزا نوشہ کو تو ہم فارسی داں مانے گئے ہیں جس پر ان کو ہمیشہ اصرار رہا ۔ موصوف نے اس لفظ کو متعدد مواقع پر استعمال کیا ہے یہاں ان کا یہی شعر ذہن میں لائیے سے

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
جوش قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

موشگافیوں سے علیحدہ ہو کر غور فرمائیے اور دیکھئے کہ فیض کے یہاں "چراغاں" کا لفظ استعمال بہتر ہوا ہے یا نہیں ؟

طپش کی آتشِ جرار کہاں ہے لاؤ!

اعتراض یہ ہے کہ آگ کے لئے جرار کی صفت کا استعمال غلط ہے مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ "جرار" ایک عربی لفظ ہے جس کے معنی اپنی طرف کھینچنے والے کے ہیں ۔ اردو میں بھی یہ لفظ انہیں معنوں میں رائج ہے جیسے "لشکر جرار" یعنی وہ لشکر جو سبھی کچھ اپنی طرف کھینچتا چلا جاتا ہے فیض نے بھی جرار کا لفظ انہیں معنوں میں استعمال کیا ہے مفہوم یہ ہے کہ اپنے اندر جائز طپش کی وہ آگ "جذب" پیدا کرو جو ساری مخالف قوتوں کو اپنے اندر کھینچ لے ۔

آجاؤ میں نے چھیل دی آنکھوں سے غم کی چھال

اس پر اعتراض یہ ہے کہ آنکھ کیا کوئی درخت ہے کہ اس سے غم کی چھال چھیلیں گے ۔ یہاں ہمیں یہ عرض کرنا ہے کہ شاعری کی دنیا میں کیا ایسی ہی منطق سے کام لیا جاتا ہے ؟ اگر شعر و ادب کو ایسی ہی نظر سے پرکھا جائے تو گیتانجلی ، اور "بوڑھا آدمی اور سمندر" (The old men and sea) جیسے شاہکاروں کا کیا ہوگا ۔ کیا یہ نوبل پرائز یافتہ تصانیف پھاڑ کر پھینک دینے کے قابل ہیں ؟ ایک آدمی مچھلی سے بات چیت

کیسے کر سکتا ہے یہ بات دھیرج کے ساتھ سمجھنے کی ہے نہ کہ اعتراض کرنے کی۔ اگر ہم اتنی ہی واعظانہ منطق سے کام لیں تو شاید ہماری ساری شاعری ہی ملیامیٹ ہو جائے گی پھر سوال یہ پیدا ہوگا کہ نظریں تیر کیسے ہو سکتی ہیں معشوق اتنا تنگ دہن اور ایسا تنک کمر کہاں ہوتا ہے۔ ایک مردہ کسوٹری کوئی پیغام کیسے دے سکتی ہے۔ اور ع

کلی نے یہ سن کر تبسم کیا (حمیر؛)
تیزو و خارے جہاں گردش آفتاب ہے (اقبال)

یہ ساری باتیں درست کیسے ہو سکتی ہیں

ہاں تو غم کی چھال کے بارے میں یہ کہنا ہے کہ شاعر یہاں غم کو اپنے تصور کی دنیا میں مجسم دیکھتا ہے اور یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ اس کی آنکھوں پر غموں کی کتنی تہیں چھا گئی ہیں اپنے اس قدر سے وہ اپنے حبیب کو محروم کرنا نہیں چاہتا اس لئے اپنی آنکھوں سے اس غم کی کیفیت کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ یہ کہتا ہے کہ اے دوست اب تو تو آ ہی جا۔ دیکھ کے میں اب خوش ہو رہا ہوں میں نے اپنی آنکھوں سے غم کی چھال چھیل دی ہے غم کی تہیں اور غم کی کیفیتیں دور کر دی ہیں۔

دیارِ حسن کی بے صبر خوابگاہوں سے
پکارتی رہیں بانہیں بدن بلاتے رہے

اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئیگا

بے صبر خوابگاہوں، اور بے خواب کواڑوں، پر یہ اعتراض ہے کہ یہ ترکیبیں بھونڈی ہیں۔ علاوہ اس کے کہ ان تراکیب میں صفت منقولہ (Transferred Epithet) کا غیر معمولی حسن نکھر آیا ہے۔ میں یہ بھی کہنا ہے کہ تجریدی تخیل کی جیتی جاگتی اور مذکورہ بالا تخیلی تصاویر سے ملتی جلتی تصویریں ہمیں اپنی شاعری میں غالب جیسے فنکار کے یہاں بھی کثرت سے ملتی ہیں مثلاً۔ افسونِ انتظار تمنا۔ گوشِ بہار جنت نگاہ، فردوس گوش۔ وغیرہ۔ فیض تک آتے آتے اردو شاعری میں ایک حسن یہ بھی پیدا ہو گیا ہے کہ یہ تجریدی انداز فکر آسمانوں میں اڑنے کی بجائے ہمارے لمس و احساس اور ہماری آب و خاک و باد کی دنیا سے پیوستہ ہو گیا ہے فیض کے یہاں ہمارا یہ احساس یقین میں تبدیل ہو جاتا ہے کہ اگر ہمارے لئے کوئی بہشت ہے تو وہ صرف اس دھرتی اور اس مادی کائنات کی ہی بہشت ہے۔

ہم چلے آئے لائے جہاں تک قدم
لب پہ حرفِ غزل دل میں قندیلِ غم

یہاں یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ غزل سے پہلے حرف کا جو لفظ آیا ہے وہ حشو قبیح ہے ہمارا شعری احساس یہ کہتا ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہے اور زیر بحث مصرع بھی انتہائی درجہ حسین ہے۔ حرف کے معنی کلمہ، سخن، بات اور لفظ وغیرہ کے بھی ہوتے ہیں شاعر کا مفہوم یہ ہے کہ اپنے دل میں غم کی قندیل روشن کئے ہوئے اور اپنے لبوں پہ غزل کے بول لئے ہوئے یعنی اس کے کچھ نغمے یا مصرعے گنگناتے ہوئے تاریک

راستوں میں بھی ہم منازل طے کرتے رہے ۔

باقی ہے لہو دل میں تو ہر اشک سے پیدا
رنگِ لب و رخسارِ صنم کرتے رہیں گے

بڑا ہے درد کا رشتہ یہ دل غریب سہی
تمہارے نام پہ آئیں گے غمگسار چلے

ان اشعار پر اعتراض یہ ہے کہ یہ تعقید لفظی کی بدترین مثالیں ہیں ۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ عربی میں تو تعقید لفظی اور تعقید معنوی دونوں ہی عیب میں داخل ہیں لیکن فارسی میں اور اس کے اثر سے اردو میں بھی تعقید لفظی بشرطیکہ اس سے تعقید معنوی پیدا نہ ہو رہا ہے اور کوئی عیب نہیں ہے یہاں ان اشعار میں کہیں سے تعقید معنوی نہیں پیدا ہوتی اس لئے انہیں بھی ہم بہت خوبصورت شعروں میں شمار کرتے ہیں ۔

ان اشعار کے مقابلے میں مرزا غالب کا یہ شعر دیکھئے جس میں غضب کی تعقید لفظی ہے پھر بھی اسے بہت سراہا گیا ہے ؎

لیتا نہ اگر دل تمہیں دیتا کوئی دم چین
کرتا جو نہ مرتا کوئی دن آہ و فغاں اور

اس سے بڑی تعقید لفظی کی مثال شاید محال ہے پھر بھی اس شعر کو اگر حسین سمجھا جاتا ہے تو فیض کے مذکورہ بالا شعروں میں کیا عیب ہے؟

وہ دن کہ کوئی بھی جب وجہ انتظار نہ تھی
ہم ان میں تیرا سوا انتظار کرتے رہے

غزل کا یہ ایک بہت ہی اچھا شعر ہے لیکن اس پر اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ اس میں "سوا" کا لفظ جو "مزید" یا "اور زیادہ" کے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے غلط ہے ۔ فصیح الملک کا ایک شعر یاد آتا ہے جسے پیش کئے دیتا ہوں عجب نہیں کہ یہ تمہ فیصل ہو سکے :

صفت کا رتبہ یہاں ذات سے سوا دیکھا
دعا ہے تجھ سے زیادہ تری وفا کے لئے   (داغ)

بھیگی ہے رات فیض غزل ابتدا کرو
وقت سرود درد کا ہنگام ہی تو ہے

اس شعر میں عیب یہ بتایا گیا ہے کہ "ابتدا کرو" کے فقرے میں بڑی غرابت ہے ہو سکتا ہے کہ معترض کی یہ بات ان کے اپنے معیار زبان کے لحاظ سے درست ہو لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کوئی بھی زندہ زبان صرف ایک بندھے ٹکے معیار کی زنجیری ہو کر نہیں رہ سکتی ۔ اردو بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہے ۔ اقبال کی یہ سطریں آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں کہ "میں زبان کو کوئی بت نہیں

سمجھتا جس کی پرستش کی جائے بلکہ اسے اظہار مطلب کا ایک آسان ذریعہ سمجھتا ہوں ۔ اس روشنی میں بھی جب ہم فیض کے اس شعر کو دیکھتے ہیں تو یہ ہمیں نہایت درجہ دلکش نظر آتا ہے ۔ اس میں درد ہے اثر ہے سادگی ہے ۔ ایک والہانہ کیف ہے ۔ ایک حقیقی تجربہ ہے جو بے پایاں خلوص کے ساتھ شعر کے پیکر میں ڈھل گیا ہے ۔ غزل کی دنیا ایک سمٹی سمٹائی دنیا ہے تاہم "ابتکر" کے جواز میں "خدائے سخن" کے یہاں "ابتدائی" کا بھی فقرہ دیکھئے ۔

جس سے کھوئی تھی نیند میرؔ نے کل
ابتدا پھر وہی کہانی کی

تنگنائے غزل میں تو بجز ابھی بدیدا اساتذہ کے یہاں بھی ایسی زبان مل جائے گی جسی آپ دور جدید کے ۔ امام غزل کے ذیل کے شعر میں پاتے ہیں ۔

جان کیا چیز ہے رکھیں گے جسے تم سے عزیز
ہو نہ باور تو کسی دن ہمیں فرما دیکھو　　　　(حسرت)

نہ گل کھلے ہیں نہ ان سے ملے نہ مے پی ہے
عجیب رنگ میں اب کے بہار گزری ہے

اس شعر میں یہ خرابی بتائی گئی ہے کہ "مے پینا" کوئی زبان نہیں ہے اس لئے فیض کے یہاں "مے پی ہے" کا جو فقرہ آیا ہے وہ بہت بھونڈا ہے ۔ مختصراً ہمارا جواب یہ ہے کہ غالب کی ایک نہایت مرصع غزل کا یہ وجد آور شعر ذرا لفظ کر پڑھنے کی زحمت فرمائیے اور پھر یہ فیصلہ کیجئے کہ "مے پیئے" یا "مے پی ہے" اردو ہو سکتی ہے یا نہیں ۔

رات کے وقت مے پیئے ساتھ رقیب کو لئے
آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کرے یوں

آج تک شیخ کے اکرام میں جو شے تھی حرام
اب وہی دشمن دین راحت جاں ٹھہری ہے

اس شعر میں معترض کے لحاظ سے یہ نقص ہے کہ "اکرام" کو فیض نے زہد کے معنی میں استعمال کیا ہے جو غلط ہے بات یہ نہیں ۔ "اکرام" کے معنی "عزت، تعظیم، توقیر اور بزرگی" وغیرہ کے ہیں ۔ شاعر کا کہنا ہے کہ جس دشمن دیں (شراب) کو شیخ کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے اور اس کے اکرام یعنی تعظیم میں ہم نے چھوڑ رکھا تھا اب وہی شراب ہماری جان کے لئے باعث سکون و راحت ہے ۔ غرض "یہ" کا یہ ایک اچھا شعر ہے جس میں شیخ پر بھی ایک گہرا طنز ہے

نازو جسم قبا جس پہ سج کے ناز کرے
دراز قد جسے سرو سہی نماز کرے

"نماز کرے" کو غلط بتایا گیا ہے ٹھیک ہے "نماز پڑھنا" ہی محاورہ ہے لیکن اس موقع پر "نماز پڑھے" بلیغ نہیں ہے

یہاں آدمی کو نہیں بلکہ سرو سہی کو حق قامت حسن احساس بندگی سے جھکنا ہے۔ اس لئے اس موقع پر۔ نماز کرے، کا ہی فقرہ زیب دیتا ہے۔ میر و سودا وغیرہ کے یہاں۔ نماز کرے۔ کا محاورہ کئی مقامات پر آیا ہے۔ عجب نہیں کہ یہ احترام فیض کو ملحوظ خاطر رہا ہو

ہر شب وہ سیہ بوجھ کہ دل بیٹھ گیا ہے
ہر صبح کی لو تیر سی سینے میں لگی ہے

یہاں اعتراض یہ ہے کہ دوسرے مصرعے میں سی کا لفظ غلط طریقے سے نظم ہوا ہے لیکن ہمیں کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی: سی۔ کے معنی۔ مانند۔ کے ہیں اور یوں بات بالکل صاف ہے۔ میر حسن کے ذیل کے شعر میں۔ سی کا استعمال مشابہت ہی کے لئے ہوا ہے ؎

دوانی سی ہر سمت پھرنے لگی
درختوں میں جا جا کے گرنے لگی

۔تیر سی۔ کا بہت اچھا استعمال سودا نے بھی کیا ہے جو زبان و بیان دونوں کے لئے سند کا حکم رکھتا ہے ؎

بہار بے سپر جام و یار گزرے ہے
نسیم تیر سی سینے کے پار گزرے ہے

کہ دل پہ کس کس کا نقش باقی ہے کون سے نام بجھ گئے ہیں

اس پر اعتراض یہ ہے کہ نام بجھ گئے ہیں۔ کا فقرہ صحت زبان کے دائرے سے یکسر خارج ہے ہماری سمجھ میں یہ بات بالکل نہیں آتی ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ یہاں خیال کو زبان کی پوری صحت کے ساتھ ادا کیا گیا ہے۔

مجھ سے سرت، نام روشن شاعری کا ہو گیا

تھوڑی دیر کے لئے یہاں۔ نام روشن ہو گیا، کا بھی کہ طور مثال لیجئے اور یہ سوچئے کہ اس کے برعکس خیال کو ہم کیسے ادا کریں گے؟ اگر یہ کہیں کہ نام مٹ گیا۔ تو اس میں اشد درجہ کیفیت ہے اور یہ اس کا ٹھیک الٹ نہیں ہے اس کی صحیح اور مناسب ضد (Antonym) تو نام بجھ گیا ہی ہے زبان میں اتنی وسعت تو ہونی ہی چاہئے کہ وہ ہر طرح کے جذبے اور ہر درجے کے احساس کو ادا کر سکے اس لازمی ضرورت کے تحت اور خیال کی سچی ترجمانی کے زیر اثر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ فیض کا یہ فقرہ کہ۔ کون سے نام بجھ گئے ہیں" زبان میں نئی وسعت پیدا کرنے کی حد تک اہم اور صحیح ہے

۔آجاؤ افریقا۔

آجاؤ میں نے سن لی ترے ڈھول کی ترنگ

یہاں یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ۔ ڈھول کی ترنگ سننا۔ پریشاں گفتاری کی دلیل ہے لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ اس انداز بیان سے مصرعہ کی تاثیر میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا ہے حواس خمسہ بظاہر تو الگ الگ ہیں لیکن بنیادی طور پر یہ ایک ہیں چنانچہ حساس نابینا اشخاص (مثال کے لئے Hellen Kelle جیسی شخصیتیں) اکثر لمس سے وہ کام لیتے ہیں جو دوسرے نظر سے لیتے ہیں غرض یہ کہ ہمارے مختلف حواس متضاد نہیں ہیں بلکہ ایک دوسرے کے لئے امدادی اور تکمیلی حیثیت رکھتے ہیں۔ فیض نے یہ نظم اس وقت کہی ہے جب وہ منٹگمری جیل میں تھے۔ مادی

تبدیلیاں عمل میں آرہی ہیں۔ ان میں بہت ساری باتیں قابل قدر ہیں اور تاریخی اہمیت کی حامل ہیں اس لئے کوئی قدامت پسند یا جدت پسند ناقد انہیں صرف، پریشان گوئی، خرافات، یا بکواس کہہ کر ٹال نہیں سکتا۔ جب ہمارے یہاں کوئی شاعر معنویت، واقعیت، موضوعاتی حقیقت، شاعرانہ صداقت اور زندگی بخش جمالیاتی کیفیت کی طرف بڑھتا ہے۔ ان کا فنی اظہار کرتا ہے لیکن شعر میں انہیں برتتے ہوئے اگر روایتی قواعد میں وہ ذرا بھی تصرف سے کام لیتا ہے تو ہم اس کا احتساب انتہائی درجے کی سختی کے ساتھ کرتے ہیں۔ ہم تاثر کو نہیں دیکھتے بلکہ زیادہ تر الفاظ کے خول کو ہی دیکھتے ہیں مثلاً فیض کے ہی یہ چند شعر لیجئے ؎

شہر میں چاک گریباں ہوئے ناپید اب کے
کوئی کرتا ہی نہیں ضبط کی تاکید اب کے

چاند دیکھا تری آنکھوں میں، نہ ہونٹوں پہ شفق
ملتی جلتی ہے شب غم سے تری دید اب کے

پھر سے بجھ جائیں گی شمعیں جو ہوا تیز چلی
لا کے رکھو سر محفل کوئی خورشید اب کے

غزل کے اشاراتی فن اور اس کے مخصوص لب و لہجہ اور زبان میں لیکن کچھ نئے و دلکش استعاروں اور نئے و تازہ کار انداز بیان میں شاعر نے یہاں اگست ۱۹۵۵ء کے ملکی و سیاسی حالات کا تذکرہ بہت کامیابی کے ساتھ کیا ہے ان اشعار میں معنویت، شعریت و تاثیر ہے اور ایک آفاقی انداز بھی۔ لیکن ان باتوں کو نہ دیکھ کر ہم پہلے قافئے ہی کو دیکھتے ہیں۔ اثر صاحب نے بھی ان اشعار کی پرکھ اسی طور سے کی ہے چنانچہ کہتے ہیں کہ "ناپید، تاکید، وعید، وغیرہ کا قافیہ نہیں ہو سکتا۔" ہماری گزارش یہ ہے کہ قافئے کے ایسے صوتی رشتوں اور ایسی صوتی مناسبتوں کو بھی جائز سمجھنا چاہئے ورنہ اشعار میں زمانہ زندگی اور ذہنی و قلبی کیفیات کی موثر ترجمانی کا حق ادا نہ ہو سکے گا۔ ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ دو مصرعوں کے ساتھ اکثر ردیف کی قید ویسے ہی کیا کم ہے کہ قافئے کی عام و معمولی پابندی کم کی جائے۔ اس کی حد سے سوا سختی بھی اس پر مسلط کی جاتی رہے۔ اس سختی کے ساتھ قافئے اور ردیف کے بعد دو مصرعوں میں جو اسے گنے لفظ رہ جاتے ہیں انہیں کوئی شاعر اپنے دل کی بات پوری طرح کیوں کر ادا کر سکتا ہے؟ اس کی معنوی عظمت کو ایسی قیود میں رہ کر کیونکر برقرار رکھ سکتا ہے۔ ایسی صورت میں نتیجہ پھر یہی ہوگا کہ قافئے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ع "شہید ناز کی تربت کہاں ہے"۔ کے معیار کے شعر کہے جائیں گے۔ شاعر فنی رعیت سے گلو خلاصی حاصل نہ کر سکے گا اور اپنے دل کی بات پوری طرح نہ کہہ سکے گا۔

اب رہی یہ بات کہ قادر الکلامی پیدا کی جائے تو سختی، قافیہ اور مضمون میں ایسی رسہ کشی کا احساس نہ پیدا ہوگا تو اس کے بارے میں یہ کہنا ہے کہ یہ بات محض ایک ادھوری سچائی ہے پوری طرح سچ نہیں ہے۔ غالب ایک قادر الکلام شاعر تھے لیکن قوافی کی سخت گیری کا احساس اکثر انہیں بھی نہیں رہا اور جب یہ سختی برداشت نہ ہو سکی تو انہوں نے تو صدی کر دی کہ "تقویٰ" کو "تقوی" بنا کے چھوڑا غالباً یہ سمجھتے ہوئے کہ اس سے نہ تو معنویت مجروح ہوتی ہے اور نہ تغزل مجروح ہوتا ہے ؎

دل گزرگاہ خیال مے و ساغر ہی سہی
گر نفس جادۂ سر منزل تقوی نہ ہوا

دوسرے اساتذہ کے یہاں بھی ایسی مثالیں ملتی ہیں اور جہاں تک ترنم، غنائیت و موسیقیت کی بات ہے اس کے بارے میں

یہ عرض کرنا ہے کہ یہ خصوصیات میکانکی قافیہ بندی سے نہیں پیدا ہوتیں۔ ان کا تعلق لفظی سمت یا کم حقیقت قواعد و قافیہ سے زیادہ معنویت سے ہے ایک جذباتی فضا اور تاثرات صوڈ سے ہے خاص طرح کے تخلیقی طرز فکر، طرز بیان اور شعری لَے سے ہے۔ انہیں کے فیوض سے ہماری غزل اور ہماری پابند شاعری آج بھی تابندہ و معتبر ہے شاعری میں یہ شعری لَے ہی سب سے زیادہ اہم چیز ہے اور ہمارے پرانے قادرالکلام شعرا مثلاً سودا، مظہر جانجاناں، میر، میر حسن، آتش، انیس اور مرزا شوق وغیرہ نے شعری لَے اور صوتی محاسن کو لفظی ہیر پھیر سے زیادہ اہم سمجھا ہے غالب کے یہاں تقوی کا نمونہ آپ دیکھ ہی چکے ہیں۔ ایک دو مثالیں اور ملاحظہ فرما لیجئے ؎

قضا را کھلی آنکھ اس گل کی جو
نہ پائی وہاں شہر کی اپنے بو (میر حسن)

لئے ہاتھ میں بیلچے مالنیں
چمن کو لگیں دیکھنے بھالنے (میر حسن)

کوئی مرتا ہے کیوں بلا جانے
ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں (مرزا شوق)

اس قدر پیار سے اے جان جہاں رکھا ہے
دل کے رخسار پہ اس وقت تری یاد نے ہاتھ
یہ گماں ہوتا ہے گرچہ ہے ابھی شام فراق
ڈھل گیا ہجر کا دن آ بھی گئی وصل کی رات

ایسے پر تاثیر انداز بیان پر بھی یہ اعتراض ہے کہ "دل کے رخسار" مہمل و بے معنی فقرہ معلوم ہوتا ہے۔ بڑی آسانی سے "دل پہ" کہہ سکتے تھے۔ جدت پسندیدہ و معنی خیز ہونا چاہئے۔ جدت محض جدت کے لئے کسی منزل تک نہیں پہنچاتی۔

افسوس ہے کہ ہم اس تنقید سے ذرا بھی اتفاق نہیں کر پاتے۔ اب اسے کیا کیا جائے کہ جو فقرہ نظم کی جان تھا وہی معتوب ٹھہرا یہ مصرعے جس نظم سے لئے گئے ہیں اس کا عنوان یاد ہے۔ یاد یار آج دبے پاؤں دل میں آئی ہے اور اس ہجراں نصیب (دل) کو زیادہ سے زیادہ سکون بخش دینا چاہتی ہے۔ پیار کے امنڈتے ہوئے جذبہ سے وہ دل کے رخسار پر اپنا ہاتھ رکھ دیتی ہے اور عاشق کو گویا سب کچھ مل جاتا ہے وہ اس عنایت و پرسش کے لئے ہمہ شکر و ہمہ سپاس ہے۔ لطیف محبت کا پورا نقشہ آنکھوں میں کھنچ جاتا ہے دل کے رخسار کے بغیر یہ لطافت، یہ کیفیت اور احساس و خیال کی یہ پوری تصویر پیدا ہی نہیں ہو سکتی تھی۔

پھر یاد کا ہاتھ، آواز کے سائے، ہونٹوں کے سراب وغیرہ کی خیالی صورتیں اگر صاف اور دل کش اور قابل قدر ہیں تو دل کے رخسار کی تمثال بھی واضح ہے اور قابل ستائش بھی۔

بہر حال ان مثالوں سے یہ بات بھی بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ تخیلی اور تصوراتی انداز بیان میں فیض کو ایک خاص کمال حاصل ہے الفاظ کو جگا دینا۔ انہیں متحرک بنا دینا اور چند فقروں میں خیال کی جیتی جاگتی تصویر کھینچ دینا فیض کا خاص آرٹ ہے۔

ہر چارہ گر کو چارہ گری سے گریز تھا
ورنہ ہمیں جو دکھ تھے بہت لادوا نہ تھے

۔ دکھوں کا بہت یا کم لادوا ہونا کیا ۔ بہت کی جگہ کوئی بہتر ہوتا "
ورنہ ہمیں جو دکھ تھے کوئی لادوا نہ تھے

اثر صاحب نے ایسے ہی متعدد شعروں کی اصلاح فرمائی ہے لیکن تقریباً ہر جگہ یہی محسوس ہوتا ہے کہ اصلاح سے جاندار فقرے اور مصرعے کمزور ہو گئے ہیں ۔ ایک شاعر کا مخصوص طرز بیان اور اس کے تخیل و تجربے کا اظہار محض نحوی صحت سے بڑی چیز ہے۔ فیض کی مذکورہ بالا "بہت لادوا" کی ترکیب قواعد کی رو سے ہو سکتا ہے ٹھیک نہ ہو لیکن شعری زبان کے لحاظ سے درست ہے ۔ یہ ایک جذبے کا پرجوش تخلیقی اظہار ہے ۔ شیکسپیئر کی بس یہ دو مثالیں ہی دیکھ لیجئے ۔ اس سے کم پر دل نہیں مانتا کہ یہ مضمون ختم کیا جائے ۔

I loved Ophelia: forty thousand brothers
Could not, with all their quantity of love, Make
up my sum" (Hamlet, Act V Sc I)

forty thousand کی بجائے صرف forty بھی رکھا جا سکتا تھا لیکن ظاہر ہے کہ اس ترمیم سے جذبے اور احساس کا تصور بدل جاتا ہے کمزور ہو جاتا ہے اسی طرح "بہت لادوا" میں شدت احساس کی جو کیفیت ہے وہ "کوئی لادوا" میں نہیں پیدا ہو پاتی ۔ اب رہی گرامر کی بات تو شیکسپیئر کے اس فقرے پر ایک نظر ڈال لیجئے ۔

This was the most unkindest cut of all (Julius Caesar, Act III Sc II)

فن کی زبان میں جب ایسی ترکیب ٹھیک ہے تو شاعری کی زبان میں "بہت لادوا" کی ترکیب کیونکر غلط ہو جائے گی

میں نے اپنے قدما کے حوالے بھی کافی دئے ہیں ۔ ان سے میں اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ زبان اصل میں جذبات محسوسات و خیالات کا وسیلہ اظہار ہے جو سماجی اور شعوری تبدیلیوں کے ساتھ خود بھی تبدیل ہونے پر مجبور ہے سائنسی معلومات بھی اس پر اثر انداز ہو رہی ہیں مثلاً یہ کہ اضافیت کا نظریہ ہمارے دل و دماغ کو متاثر کرے ہمارے طریقۂ فکر اور زندگی پر پڑے مگر ہماری زبان و بیان پر نہ پڑے ۔ یہ ایک ناممکن بات ہے

ہماری ذہنی دنیا اور شعور تیزی کے ساتھ وسیع ہوتے جا رہے ہیں ساتھ ہی ہمارے مسائل بھی شدت کے ساتھ بڑھتے جا رہے ہیں ایک مادی دور آج ہر وقت ہم پر مسلط ہے بین الاقوامی حالات سے ہم شدید طور سے متاثر ہو رہے ہیں ۔ ان سے روزانہ ہماری تقدیریں پاٹکر رہی ہے ۔ نفسیاتی پیچ اور گتھیاں بھی آج ہماری زندگی میں اس کثرت کے ساتھ ہیں جن کی پہلے کوئی مثال نہیں ملتی ۔ ہماری زبان اس تیزی کے ساتھ نہیں بڑھی ہے جس تیزی کے ساتھ ہمارے مسائل بڑھے ہیں ۔ ہماری ساری ذہنی کیفیتوں کی ترجمانی کے لئے پیرایۂ اظہار کی ضرورت قدما کے زمانے سے بھی شدید تر ہے اس لئے ایجادی تصرفات اور اختراعات کے بغیر کام چل ہی نہیں سکتا ۔ ہاں اس امر میں مذاق سلیم اور سلیقہ شرط ہے ۔

زبان و بیان کے متعلق میں نے جو باتیں کہی ہیں ان کا یہ مطلب نہیں کہ میں پریشان گوئی یا انتشار کا قائل ہوں ایک قاری کی حیثیت سے میں بھی اپنے شعر و ادب کا رچاؤ دیکھنا چاہتا ہوں لیکن ان کا پھیلاؤ عزیز تر ہے

فیض کے متعلق میں نے اوپر جو باتیں لکھی ہیں وہ کسی شخصیت پرستی کے جذبے سے نہیں لکھی ہیں۔ فیض کی دنیا طنزل و تجزیاد اماد سکندر کی دنیا نہیں ہے اس کی دنیا تو عام آدمیوں کی دنیا ہے بلکہ سچ پوچھئے تو عوام کی دنیا ہے جہاں مزدور کا گوشت بکتا ہے جہاں قحبگی زندگی کا نام شدہ ہے جوانیاں مدقوق اور پیشانیاں تذلیل سے داغدار ہیں۔ جہاں لوگ یتیم بے آسرا مجبور و بے بس ہیں۔ ایک دوسرے کے جاسوس ہیں اور کاغذی آزادی کے لباس میں ذہنی غلامیوں میں جکڑے ہوئے ہیں

فیض کی شاعری ان لوگوں کے لئے جو سکتے ہیں اور انسان ہیں نشتر بھی ہے اور مرہم آزار بھی!

ان کی شاعری میں زندگی کے مجاہدے کا حسن ہمیں بہت نکھری ہوئی صورت میں ملتا ہے۔ وہ زندگی کی گندگیوں، دلدلوں اور تاریکیوں سے نبرد آزما ہیں لیکن ان کی نگاہیں محض انہیں تاریکیوں میں الجھ کر نہیں رہ جاتیں۔ زندگی کا سہانا پن، اس کی رنگا رنگی بہاریں اور اس کی بے پایاں خوبصورتی بھی ان کی نظر میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں ؎

آبشاروں کے بہاروں کے چمن زاروں کے گیت
آمد صبح کے مہتاب کے سیاروں کے گیت

کی لے اکثر سنائی دیتی ہے۔

اسی طرح ان کے چاند، اتم ہی آنکھیں، مرمریں بازو، آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹ وادی کا کل و عارض کے فسانے اور حسن، لآرا کی سیج دھیج کی نقاشیاں بھی رہ رہ کر جھلملاتی رہتی ہیں۔ زندگی کی خوبی اور اس کے جمال دلفروز کا وہ کبھی انکار نہیں کر سکا۔ قید و بند کی سختیاں بھی وہ اسی لئے جھیلتا رہا کہ زندگی اور بھی زیادہ رفاقت آمیز، سہانی و دلکش ہو۔

فیض کے کلام کی ایک اور اہم خصوصیت اس کی امید آفرینی کی وہ فضا بھی ہے جو کبھی سکون پذیر ہوتی ہے اور کبھی تند و تیز لیکن جو اس میں ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ مخصوص حالات کی پیدا کردہ خستگی، درماندگی اور غمگیں کیفیت کی بات دوسری ہے ان سب کا ذکر بھی فیض کے یہاں ہے لیکن اس طرح کہ اس سے غم دل سے ڈھل جاتا ہے اور زندگی اور انسانیت پر اور زیادہ گہرا یقین پیدا ہوتا ہے۔

فیض کے نغمے سکون بخش ہیں ——— امید آفریں ہیں۔ انسان دوستی کے جذبے سے معمور ہیں اور آفاقی ہیں۔ غم نصیبوں کے جو کام شاید دوا بھی وہ کام نہ کر سکے جو فیض کے نغمے کر جاتے ہیں۔ ان میں انسانیت کا دکھ درد بھی ہے اور رعنائی حیات کا سامان بھی۔ غرض یہ فیض کی شاعری ایک بہترین دوست اور ساتھی کی حیثیت رکھتی ہے۔ تنہائی کا ڈسا ہوا شاعر اپنے امرت برسانے والے نغموں کی موجودگی میں نہ صرف خود بھی تنہا نہیں رہ جاتا اور نہ کسی اور کو تنہا محسوس کرنے دیتا ہے اس کے لئے ملکی حد بندیوں کو پار کر کے ساری دنیا میں گونجتے ہیں اس کے اپنے شہر کی بات بھی دنیا کے ہر شہر کی بات ہو جاتی ہے۔ اور اس کا اپنا شہر ہم سب درد آشنا دگاں کا بھی شہر ہو جاتا ہے ؎

آج میرا دل فکر میں ہے
اے روشنیوں کے شہر
شب خوں سے منہ پھیر نہ جائے ارمانوں کی رَو
خیر ہو تیری لیلاؤں کی۔ ان سب سے کہہ دو
آج کی شب جب دیئے جلائیں اونچی رکھیں لَو۔

(فیض)

اطہر قادری

فیضؔ

غمِ جاناں سے غمِ دوراں تک

(کسی بڑے شاعر کی شعری تخلیقات کو مختلف خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا اس لئے کہ بڑے شاعر کے فکری ڈھانچے اور شعور کے بیچ میں کبھی تضاد نہیں ہوتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ مختلف دور میں زندگی کے گوناگوں اور سخت حقائق سے اپنی شاعری کے تانے بانے تیار کرتا ہے لیکن نظریئے کا اتحاد (Uniformity of outlook) اس میں فکری بے راہ روی پیدا نہیں ہونے دیتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ خیال کی رنگا رنگی اور بوقلمونی کے باوصف اس کے انداز نظر کی زیریں لہر۔ (Under current) ہمیشہ ایک رہتی ہے جو بالآخر اس کی تخلیقات کو تضاد کی بھول بھلیوں میں کھو جانے سے بچا لیتی ہے اور راہ کی کٹھنائیوں اور تیرگی میں چراغ بن کر منزلِ مقصود کی نشان دہی کرتی ہے۔ فیض احمد فیض کا شمار ایسے ہی شاعروں میں ہوتا ہے۔

فیض کی شاعرانہ زندگی کی ابتدا کب ہوئی، یہ کہنا دشوار ہے۔ مجھے اس وقت اس بحث میں الجھنا بھی نہیں ہے لیکن جب اُن کی رسیلی اور مدھر تانوں سے ہمارا ایوانِ شعر و ادب گونجنے لگا تو اس وقت اردو میں ترقی پسند تحریک کو شروع ہوئے بہت دن نہیں گذرے تھے۔ فیض ان لوگوں میں نہیں جو بعد میں اس تحریک سے وابستہ ہوئے۔ فیض کا شمار ترقی پسند تحریک کے بنیادی ممبروں میں ہوتا ہے۔)

اس میں کوئی شک نہیں کہ ترقی پسند تحریک نے جنم لینے کے بعد ادب سے متعلق اپنے نظریات اور اصول و ضوابط کا کھل کر اعلان کیا، لیکن اس کے باوجود اس امر کے اظہار میں مجھے کوئی ہچکچاہٹ نہیں کہ اس کے کچھ نقوش، اور لکیریں بڑی حد تک مبہم اور اس کے کچھ اشارے غیر واضح تھے جس نے بہت سادے ترقی پسندوں کو عقیدے اور ایمان کی پختگی اور صلابت کے باوجود غلط راہ پر ڈال دیا۔ جہاں نظموں اور غزلوں میں سستی قسم کی سیاسی نعرہ بازی اور بھونڈے انداز کے پروپیگنڈا نے فنی محاسن کو زیج چوراہے پر نہایت بے دردی سے پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا۔ اور جہاں اس قسم کی چیزیں کہی جانے لگیں کہ ہم

ریل کا پہیہ جام کریں گے

اور ـــــ

مری نگاہ میں ہے ارضِ ماسکو مجروح

وہاں "غمِ محبوب" کو استقلال کی تلقین کرکے "غمِ دوراں" سے نبرد آزما ہونے اور میدانِ جنگ سے لوٹ کر آنے کے بعد محبوب کو سینے سے لگانے کا موضوع بہت سارے ترقی پسندوں کی مشترکہ میراث ٹھیرا اور رومانیت کی راہ سے انقلاب کی منزل تک رسائی حاصل کرنے کی رسم بھی بڑی حد تک عام ہوگئی۔ قریب تھا کہ یہ رسم ایک دستور کا روپ دھار کر ترقی پسند ادب کے "مینی فسٹو" کی ایک اہم دفعہ بن جائے کہ کچھ باشعور، بالغ نظر اور اہل الرائے نقادوں نے بروقت اس رجحان کی سختی سے تردید کی اور ضربِ کاری لگا کر اس کا سدِّباب کیا۔ فیض کی ابتدائی شاعری کا بیشتر حصہ اس رجحان کی غمازی کرتا ہے، اور ان کے پہلے مجموعے ـــــ "نقشِ فریادی" میں کچھ نظمیں ضرور ایسی ہیں جہاں رومانیت اور انقلاب کا نظریہ خلط ملط اور گڈمڈ ہو کر رہ گیا ہے۔ مثال میں ان کی دو نظموں سے چند شعر پیش کئے جاتے ہیں ؎

ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخواب میں بُنوائے ہوئے
جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے

جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے
لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجئے
اب بھی دل کش ہے ترا حسن مگر کیا کیجئے

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ
(مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ)

تو کہ میری بھی ہو جائے
دنیا کے غم یوں ہی رہیں گے
پاپ کے پھندے ظلم کے بندھن
اپنے کہے سے کٹ نہ سکیں گے
(سوچ)

لیکن یہ اس وقت کی بات ہے جب ترقی پسند تحریک اپنی ابتدائی منزلوں میں تھی، اور اس کے بہت سارے بنیادی اصولوں کا ابھی طرح وضاحت نہیں ہو پائی تھی۔ اور یہ کوئی عیب کی بات نہیں۔ ہر تحریک چاہے وہ ادبی ہو یا سیاسی، اقتصادی ہو یا ثقافتی؛ اپنے ابتدائی دَور میں دھندلی ہی نظر آتی ہے۔ ترقی پسند تحریک کی عظمت اس بات میں پوشیدہ ہے کہ وہ بہت جلد اس حصارِ فریبِ نظر کو توڑ کر باہر کی صاف و شفاف اور کھلی فضا میں آکر تازہ دم ہوگئی اور ان بتوں کو توڑ کر رکھ دیا جن سے کچھ ترقی پسند ادیبوں نے خم خانۂ ادب کے مختلف طاقوں کو سجا رکھا تھا۔

جیسا کہ اوپر کی سطروں میں اشارہ کیا گیا ہے ابتدا میں فیض بھی کچھ ترقی پسندوں کی طرح رومانیت کو انقلاب کے لئے مہمیز سمجھ لئے تھے۔ اور دونوں کا الگ الگ تجزیہ کرنے کے بجائے رومان سے انقلاب کی منزل تک پہونچنے والے نظریئے کے فریب میں آگئے تھے، لیکن ان کے ترقی یافتہ سماجی شعور نے ان پر اس فریب کی گرفت کو مضبوط ہونے نہیں دیا، اور وہ بہت جلد اس طلسم کو توڑ کر باہر آگئے۔ یہاں یہ غلط فہمی پیدا نہیں ہونا چاہئے کہ رومانیت کے لئے ترقی پسند شاعری میں کوئی جگہ نہیں۔ رومان اور انقلاب دونوں ہماری زندگی کا بڑا اہم اور پہلو دار حصہ ہیں۔ جس طرح تغیر اور انقلاب انسان کی سماجی زندگی کی تہذیب و تربیت کے لئے ضروری ہے ٹھیک اسی طرح رومانیت بھی انسانی زندگی کا بڑا حسین گوشہ ہے۔ اس کے بغیر زندگی کا ایک نہایت اہم حصہ پھیکا اور بے رونق رہتا ہے۔ انسانی زندگی کا یہ ایک فطری تقاضا ہے۔ ہماری صحت مند روایتی شاعری اور خصوصًا اردو غزل اسی تقاضے کا نتیجہ ہے۔ جب جمالیات کی بنیاد صالح اور صحت مند عناصر پر ہوتی ہے تو ہمیں ولی، میر، درد، آتش، غالب، مومن، حالی، حسرت، وحشت، جگر، مجاز اور فراق جیسے فن کار نصیب ہوتے ہیں۔ لیکن جب رومانی اور جمالیاتی قدریں غیر صحت مند اور مریضانہ شکل اختیار کر لیتی ہیں اور ان کا مقصد صرف جنسی یا ذہنی تعیش ہوتا ہے تو شاعری ابتذال کے دھندلکے میں ٹھوکریں کھانے لگتی ہے اور جرأت و داغ جیسے شاعروں کی معاملہ بندی، چھیڑ چھاڑ اور لب و لہجہ کی شوخی تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔

فیض کی ابتدائی شاعری میں رومانیت کے جو عناصر ملتے ہیں اُن سے اُن کی صحت مند جمالیات اور شعورِ حسن کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ وہ حسن کو کوئی غیر مرئی چیستاں نہیں سمجھتے اور نہ اس کو انسان کے دسترس سے کوئی بالاتر شئے سمجھتے ہیں۔ وہ حسن کو انسانی گوشت پوست اور اسی زمین کی چیز سمجھتے ہیں۔ اور اس کو انسانی سماج کی ایک شئے لطیف گردانتے ہیں۔ وہ سماج کے دیرینہ اور فرسودہ رسم و رواج اور پابندیوں کے جال میں جکڑے ہوئے حسن کے قائل نہیں۔ وہ تو حسن کو قریب سے دیکھنے اور مس کرنے کے قائل ہیں۔ وہ جگر کا لہو پلا پلا کر غم جاناں کی پرورش و پرداخت کرتے ہیں اور خونِ تمنا سے حسن کی تصویروں میں رنگ بھرتے ہیں: "نقشِ فریادی" کی بیشتر نظمیں ایسی ہیں جو اگر ایک طرف ان کے عہدِ شباب کی پاکیزگی کی قسم کھاتی ہیں تو دوسری طرف اُن کی بے قراریوں کی وضعِ احتیاط کی نقاب کشائی بھی کرتی ہیں ؎

پھول لاکھوں برس نہیں رہتے
دو گھڑی اور ہے بہارِ شباب
آکہ کچھ دل کی سن سنا لیں ہم
آ محبت کے گیت گا لیں ہم　　(سرودِ شبانہ)

تغافل کے آغوش میں سو رہے ہیں
تمہارے ستم اور میری وفائیں
مگر پھر بھی اے میرے معصوم قاتل
تمہیں پیار کرتی ہیں میری دعائیں
(انجام)

؎ حسن کو پانے کی تمنا میں فراق کی پہاڑ جیسی راتوں کو آنکھوں میں کاٹ کر حسن کے آستاں تک رسائی حاصل کرنا اور پھر اس کو کھو دینا ایسی کیفیات ہیں جنہیں ایک دل گداختہ ہی محسوس کر سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں ان کی نظم "تین منظر" کا شمار اردو کی بڑی حسین نظموں میں ہوتا ہے۔ اس نظم میں تین بند (تصور، سامنا اور رخصت) ہیں جو حسن وعشق کی اوپر بیان کی ہوئی تین کیفیات کو ظاہر کرتی ہیں۔ "سامنا" اور "رخصت" دو بند ایسے ہیں جن پر ہمارا فن بجا طور پر ناز کر سکتا ہے ؎

سامنا

چھنتی ہوئی نظروں سے جذبات کی دنیائیں
بے خوابیاں، افسانے، مہتاب، تمنائیں
کچھ الجھی ہوئی باتیں، کچھ بہکے ہوئے نغمے
کچھ اشک جو آنکھوں سے بے وجہ چھلک جائیں

رخصت

فسردہ رخ، لبوں پر اک نیاز آمیز خاموشی
تبسم مضمحل تھا، مرمریں ہاتھوں میں لرزش تھی
وہ کیسی بے کسی تھی تیری پُر تمکیں نگاہوں میں
وہ کیا دکھ تھا تری سہمی ہوئی خاموش آہوں میں

؎ ایک رومانی شاعر جو حسن وعشق کو ان کے سماجی اور تاریخی پس منظر میں دیکھنے کا عادی نہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ جو اس کا صحیح شعور وادراک نہیں رکھتا عشق میں ناکامی کا علاج گوشہ نشینی، صحرا نوردی یا پھر زہر غم کے میٹھے گھونٹ میں سمجھتا ہے لیکن فیض کا شعور پہلے اس ناکامی کے اسباب وعلل سماجی عوامل میں تلاش کرتا ہے اور پھر حسن پر سماج کی بے جا پابندیوں کے خلاف بغاوت کی تلقین کرتا ہے۔ فیض کا یہی وہ جمالیاتی شعور ہے جو ان کی عشقیہ شاعری کو دوسروں سے ممیز کرتا ہے اور ان کے عزم جاناں کو توانائی اور حوصلہ مندی کا لبادہ عطا کرکے خودکشی کی جگہ جینے پر آمادہ کرتا ہے ؎

یہ ترے حسن سے لپٹی ہوئی آلام کی گرد
اپنی دو روزہ جوانی کی شکستوں کا شمار
چاندنی راتوں کا بے کار دہکتا ہوا درد
دل کی بے سود تڑپ، جسم کی مایوس پکار　　چند روز اور مری جان! فقط چند ہی روز

چاہنے اور چاہے جانے کی تمنا نے رفتہ رفتہ شعور و ادراک کی بالیدگی کے ساتھ ساتھ شخصی محبت سے آگے بڑھ کر آفاقی محبت اور بھائی چارگی کا احاطہ کر لیا۔ اور آج فیض کی شاعری کا اصل موضوع عوامی محبت اور انسان دوستی ہے۔ اس عوامی محبت اور انسان دوستی نے انہیں ظلم و استبداد اور استحصالی طاقتوں کے خلاف ابھارا اور طبقاتی کش مکش کے آئینے میں انہیں منزل انقلاب کی راہ دکھائی ہے۔ یہی وہ انسان دوستی ہے جس نے ان کے اندر جنگ سے نفرت پیدا کی اور ہزاروں سال ماضی کا اندوختہ سرمایۂ علم و فن اور انسانی تہذیب و تمدن کے تحفظ کے شدید جذبات نے امن کا پرچم ہاتھ میں لینے پر مجبور کیا، اور بالآخر انہیں شاعرِ امن کا خطاب دلوایا۔

فیض نے اردو کی کلاسیکی شاعری کا بڑا گہرا اور بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے وہ اردو شاعری کی صحت مند اور صالح روایات سے اچھی طرح واقف ہیں۔ انہوں نے میر، درد، آتش، غالب اور مومن کی جاندار روایات سے صرف کسبِ فیض ہی نہیں کیا ہے بلکہ انہیں اپنے اندر نہایت حسن و خوبی سے جذب بھی کر لیا ہے۔ جہاں انہوں نے کلاسیکیت اور روایت سے فن کا صحیح انداز اور لہجہ سیکھا ہے اور اس سے پورا پورا استفادہ کیا ہے، وہاں بدلتی ہوئی زندگی کی جدید اقدار سے فن اور اسلوب کی مانگ میں نئے انداز سے افشاں بھی چُنی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں بیک وقت قدیم کا تیکھا پن بھی ہے اور جدیدیت کے تیور بھی۔ قدیم و جدید کے اس خوش گوار اور متوازن فنی امتزاج نے ان کی شاعری میں بڑی لچک، رچاؤ اور بانکپن پیدا کر دیا ہے اور اس بانکپن کا اظہار جس طرح ان کی غزلوں میں ہوتا ہے اس کی مثال اور کہیں نہیں ملتی ہے۔

غزل گوئی فیض کی شاعری کا بڑا طرح دار پہلو ہے۔ جہاں اس میں غمِ جاناں کی کجلائی شام اور شبِ فراق کی تہ بہ تہ تیرگی ہے وہاں غمِ دوراں کی صبحِ نشاط بھی ہے۔ اس میں داستانِ جلوۂ جاناں کی دودھیا چاندنی بھی ہے اور حدیثِ دیگراں کے پو پھٹے کی چھوٹ بھی۔ اس میں خرامِ نازِ محبوب کی سحر انگیز چاپ بھی ہے اور رفتارِ وقت کی تیز روی بھی۔ اس میں کہیں زلفِ جاناں کا سایہ ہے تو کہیں غمِ دوراں کی جھلسا دینے والی کڑی دھوپ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ "نقشِ فریادی" میں "غمِ جاناں" اور "غمِ دوراں" کے یہ ملے جلے نقوش جتنے گہرے اور دبیز ہیں "دستِ صبا" اور خصوصاً "زنداں نامہ" میں اتنے ہی مدھم، ہلکے اور مٹے مٹے سے ہیں، لیکن فیض کی فنی مہارتوں نے غمِ دوراں میں غمِ جاناں کا رنگ کچھ اس طرح بھرا ہے کہ ایک طرف تغزل کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا تو دوسری طرف تغزل کے پردے میں "گفتہ آید در حدیثِ دیگراں" کے فرض سے عہدہ برآ بھی ہو گئے ہیں ؎

کبھی کبھی یاد میں ابھرتے ہیں نقشِ ماضی مٹے مٹے سے
وہ آزمائش دل و نظر کی، وہ قربتیں سی وہ فاصلے سے
کبھی کبھی آرزو کے صحرا میں آکے رکتے ہیں قافلے سے
وہ ساری باتیں لگاؤ کی سی وہ سارے عنواں وصال کے سے
نگاہ و دل کو قرار کیسا نشاط و غم میں کمی کہاں کی
وہ جب ملے ہیں تو ان سے ہر بار کی ہے الفت نئے سرے سے
بہت گراں ہے یہ عیشِ تنہا کہیں سُبک تر کہیں گوارا
وہ دردِ پنہاں کہ ساری دنیا رفیق تھی جس کے واسطے سے

تماہیاں نگاہوں میں لے کے اٹھا ہوں
نکھر گئی ہے فضا تیرے پیرہن کی سی
نسیم تیرے شبستاں سے ہو کے آئی ہے
مری سحر میں مہک ہے ترے بدن کی سی

صبح پھوٹی تو آسماں پہ ترے
رنگِ رخسار کی پھوار گری
رات چھائی تو روئے عالم پر
تیری زلفوں کی آبشار گری

دوقفِ حرماں و یاس رہتا ہے
دل ہے اکثر اُداس رہتا ہے
تم تو غم دے کے بھول جاتے ہو
مجھ کو احساں کا پاس رہتا ہے

صحت مند روایات سے مکمل آگاہی نے فیض کو فن اور اسلوب کا بڑا اچھا ادراک عطا کیا ہے جس سے کام لے کر انہوں نے اپنے خیال و فکر کی تہذیب و تربیت اور آرائش کی ہے۔ ان کی یہی وہ فنی مہارت و صلاحیت ہے جس نے اُن کی غزلوں اور نظموں کو خیال اور لہجے کی مکمل ہم آہنگی بخشی ہے۔ خاص کر غزل کے رُخِ زیبا پر فن اور اسلوب کا غازہ مل کر انہوں نے اس کو ایسا حسن و جمال عطا کیا ہے جس کی مثال کم شاعروں کے یہاں ملتی ہے۔ اسلوب و خیال کی یہی وہ ہم آہنگی اور سنبھلا ہوا امتزاج ہے جس پر اُن کی غزل گوئی کا بانکپن، لوچ، نزاکت اور البیلاپن قائم ہے۔ فنی محاسن نے نہ صرف اُن کی نظموں کو صریح پروپیگنڈا ہونے سے بچا لیا ہے بلکہ اُن کی غزلوں میں بھی بلا کی کشش اور ملائمت پیدا کر دی ہے ۔

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات اُن کو بہت ناگوار گذری ہے

ہر اجنبی ہمیں محرم دکھائی دیتا ہے
جو اب بھی تیری گلی سے گذرنے لگتے ہیں

صبحِ گل ہو کہ شامِ میخانہ
مدح اُس روئے نازنیں کی ہے

دوستو اس چشم و لب کی کچھ کہو جس کے بغیر
گلستاں کی بات رنگیں ہے نہ مے خانے کا نام
پھر نظر میں پھول مہکے، دل میں پھر شمعیں جلیں
پھر تصور نے لیا اس بزم میں جانے کا نام

ہے وہی عارضِ لیلیٰ وہی شیریں کا دہن
نگہِ شوق گھڑی بھر کو جہاں ٹھہری ہے
وصل کی شب تھی تو کس درجہ سبک گذری ہے
ہجر کی شب ہے تو کیا سخت گراں ٹھہری ہے

تیرے در تک پہونچ کے لوٹ آئے
عشق کی آبرو ڈبو بیٹھے
نہ گئی تیری بے رُخی نہ گئی
ہم تری آرزو بھی کھو بیٹھے

اپنی مشقِ ستم سے ہاتھ نہ کھینچ
میں نہیں یا وفا نہیں باقی
تیری چشمِ الم نواز کی خیر
دل میں کوئی گلا نہیں باقی

تجھ کو دیکھا تو سیر چشم ہوئے
تجھ کو چاہا تو اور چاہ نہ کی
تیرے دستِ ستم کا عجز نہیں
دل ہی کافر تھا جس نے آہ نہ کی

اُٹھ کر تو آ گئے ہیں تری بزم سے مگر
کچھ دل ہی جانتا ہے کہ کس دل سے آئے ہیں

جہاں فیض نے اساتذہ کی عطا کردہ تشبیہات و استعارات اور فنی محاسن سے کما حقہٗ استفادہ کیا ہے اور انہیں اپنی تخلیقات

میں جذب کررہا ہے وہاں خود بھی نئی تشبیہیں، نئے استعارے اور نئی ترکیبیں وضع کی ہیں اور یہ ایک لازمی امر ہے۔ تاریخ ادب عالم اس بات کی گواہ ہے کہ ہر بڑا شاعر ماضی کے جمع کردہ سرمائے سے فائدہ تو ضرور اٹھاتا ہے لیکن وہ اس پر اکتفا نہیں کرتا۔ وہ اس بات کو گوارا نہیں کرسکتا کہ پرانی چیزوں پر قناعت کرے وہ بنے بنائے حدود میں داخل تو ضرور ہوتا ہے لیکن ان میں مقید ہوکر رہ نہیں جاتا۔ اس کا جینیس (genius) تمام حدود کو توڑ کر باہر آجاتا ہے، اور اس کا یہی عمل بالآخر شعر و ادب کے گلستان میں نئے نئے پھول کھلاتا ہے جن کی خوشبو سے زندگی کی روشیں دور تک مہک جاتی ہیں۔ اس کے اس عمل کا اظہار خیال اور اسلوب دونوں میں ہوتا ہے۔ نیا خیال اپنے اظہار کے لئے نیا اسلوب ڈھونڈ لیتا ہے۔ جدت اپنے بیان کی لطافت آپ ترتیب دے لیتی ہے۔ یہ بات جس طرح فیض کی شاعری پر صادق آتی ہے اس کی مثال کم ملتی ہے۔ فیض نے اردو کو بڑی نادر تشبیہیں استعارے اور ترکیبیں دی ہیں۔ ان نئی تشبیہوں اور ترکیبوں کے شانے سے انہوں نے اردو غزل اور نظم دونوں کے گیسو سنوارے ہیں۔ اس کے ثبوت میں یہاں ان کی غزلوں سے کچھ اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔ ان شعروں میں خیال اور اسلوب اس طرح ہم آہنگ اور شیر و شکر ہیں کہ ایک دوسرے سے الگ کرکے دیکھنا دشوار ہے ؎

شمعِ نظر، خیال کے انجم، جگر کے داغ
جتنے چراغ ہیں تری محفل سے آئے ہیں

بزمِ خیال میں ترے حسن کی شمع جل گئی
درد کا چاند بجھ گیا، ہجر کی رات ڈھل گئی
جب تجھے یاد کرلیا، صبح مہک مہک اٹھی
جب ترا غم جگا لیا رات مچل مچل گئی

ضیائے بزمِ جہاں بار بار ماند ہوئی
حدیثِ شعلہ رخاں بار بار کرتے رہے
انہیں کے فیض سے بازارِ عقل روشن ہے
جو گاہ گاہ جنوں اختیار کرتے رہے

جاؤ اب سو رہو ستارو
درد کی رات ڈھل چکی ہے

گر فکرِ زخم کی تو خطاوار ہیں کہ ہم
کیوں محوِ مدحِ خوبیٔ تیغ ادا نہ تھے

شاخ پر خونِ گل رواں ہے وہی
شوخیٔ رنگِ گلستاں ہے وہی

کبھی تو صبح ترے کنجِ لب سے ہو آغاز
کبھی تو شب سرِ کاکل سے مشکبار چلے
حضورِ یار ہوئی دفترِ جنوں کی طلب
گرہ میں لے کے گریباں کا تار تار چلے

ہم اہلِ قفس تنہا بھی نہیں، ہر روز نسیمِ صبحِ وطن
یادوں سے معطر آتی ہے، اشکوں سے منور جاتی ہے

شام گلنار ہوئی جاتی ہے دیکھو تو سہی
یہ جو نکلا ہے لئے مشعلِ رخسار ہے کون

چاند دیکھا تری آنکھوں میں نہ ہونٹوں پہ شفق
ملتی جلتی ہے شبِ غم سے تری دید اب کے

فیض خیال و فکر اور نظریات کے بہاؤ اور رفتار سے اچھی طرح واقف ہیں اور فن کار کی ذمہ داریوں کا صحیح شعور رکھتے ہیں۔ 'نقشِ فریادی' کی اشاعت تک وہ غمِ تنہا اور غمِ زمانہ کو ساتھ لے کر چلتے رہے۔ اور قطرہ میں دجلہ کا نظارہ کرنے کو کافی سمجھتے رہے (یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ قطرے میں دجلہ دیکھنا بھی ہر شاعر کا حصہ نہیں۔ یہ بھی بڑی ریاضت چاہتا ہے) لیکن فیض کے طبقاتی شعور کی پختگی و بالیدگی نے رفتہ رفتہ غمِ تنہا کو غمِ زمانہ میں بدل دیا اور خود کو قطرے میں دجلہ دیکھنے تک محدود رکھنے کے بجائے اسے دوسروں کو دکھانے پر بھی اصرار کیا۔ فن کار کی عظمت اسی میں ہے کہ اس کو فن پر اتنی دسترس ہو کہ وہ جو کچھ دیکھتا اور محسوس کرتا ہے اسے نہایت ایمان داری اور دیانت سے دوسروں تک پہونچا دے اور صرف یہ کہہ کر نہ رہ جائے کہ ع

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں

لیکن فن کار کا کام صرف مشاہدہ ہی نہیں بلکہ مجاہدہ بھی ہے۔ اسے اپنے ذاتی غموں اور المناکیوں کی حدود سے نکل کر انسان کی اجتماعی جدوجہد میں شریک ہونا ہے۔ اس کے لئے دریا کی لہروں اور موجوں کو گننا اور طوفان کے زور کو محسوس کرنا ہی کافی نہیں بلکہ ان کا رُخ نئی اور صحیح سمتوں میں موڑنا بھی اُس کا فرض ہے۔ اس کا کام طبقاتی کش مکش کا صحیح شعور رکھنا اور انسان اور سماج کی اجتماعی کاوشوں کو بنانا سنوارنا اور آگے بڑھانا ہے۔ اسے تمام قومی تعصبات، فرقہ پرستی اور جماعتی رشتوں سے

بالاتر ہو کر انسان کا ناطہ انسان سے جوڑنا اور کائناتی بنیاد پر ظلم و ستم کے خلاف آواز اٹھانا اور عام انسانی مسرتوں کے لئے کوشاں ہونا ہے۔ قومی اور ملکی عصبیت کو بالائے طاق رکھ کر سامراجیت اور ظلم و تشدد کے خلاف ہر آواز کا ساتھ دینا ہے۔ فیض کے یہاں اس نظریہ کی مثالیں وافر ہیں، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ان کی تخلیقات کا غالب حصہ اس کی ترجمانی کرتا ہے۔ افریقی حریت پسندوں کا نعرہ "افریقہ کم بیک" (Afrika come back) اور "ایرانی طلبہ کے نام" وہ ایسی نظمیں ہیں جو فیض کے فن کا رشتہ حیات انسانی کی عالمی جد و جہد سے جوڑ دیتی ہیں، اور فیض کو کسی ایک طبقے کا نہیں بلکہ عام انسانی طبقے اور عالمی امن کا شاعر بنا دیتی ہیں۔ عام انسان دوستی کی لے فیض کی غزلوں میں جس قدر چٹیلی، دھیمی، نرم اور ملائم ہے وہ اُن کی نظموں میں نہیں ؎

ستم کی رسمیں بہت تھیں لیکن نہ تھیں تری انجمن سے پہلے
سزا خطائے نظر سے پہلے عتاب جرم سخن سے پہلے
نہیں رہی اب جنوں کی زنجیر پر وہ پہلی اجارہ داری
گرفت کرتے ہیں کرنے والے خرد پہ دیوانہ پن سے پہلے
غرور سرو و سمن سے کہہ دو کہ پھر وہی تاجدار ہوں گے
جو خار و خس والیٔ چمن تھے عروج سرو و سمن سے پہلے

رہِ خزاں میں تلاش بہار کرتے رہے
شب سیہ سے طلب حسن یار کرتے رہے
ہر چارہ گر کو چارہ گری سے گریز تھا
ورنہ ہمیں جو دکھ تھے بہت لادوا نہ تھے

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے اس جاں کی تو کوئی بات نہیں
میدانِ وفا دربار نہیں یاں نام و نسب کی پوچھ کہاں
عاشق تو کسی کا نام نہیں کچھ عشق کسی کی ذات نہیں

دل نا امید تو نہیں ناکام ہی تو ہے
لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے
دست فلک میں گردش تقدیر تو نہیں
دست فلک میں گردش ایام ہی تو ہے

بڑا ہے درد کا رشتہ یہ دل غریب سہی
تمہارے نام پہ آئیں گے غم گسار چلے

بیدادگروں کی بستی ہے یاں داد کہاں خیرات کہاں
سر پھوڑتی پھرتی ہے ناداں فریاد جو در در جاتی ہے

فیض کی نظر میں آرزو کی بڑی اہمیت اور قدر و قیمت ہے۔ شمع آرزو قلب و نگاہ کو روشنی عطا کرتی ہے۔ وہ دل جہاں آرزو کا گزر نہیں کچھ اور ہو سکتا ہے دل نہیں۔ لیکن صرف آرزو سے کام نہیں بنتا۔ تکمیل آرزو کو عمل درکار ہے صرف بہار کی آرزو سے بہار نہیں آتی۔ رہِ خزاں میں تلاش بہار کی کڑی شرط ہے۔ منزل کی راہ مقتل سے ہو کر جاتی ہے۔ آرزو اور عمل کے رشتے کی وضاحت اور توجیہہ فیض کی شاعری کا بڑا جاندار پہلو ہے۔ عمل کی تلقین دوسرے شاعروں کے یہاں بھی ملتی ہے لیکن اس کی نزاکت اور لطافت فیض سے مخصوص ہے ؎

نہ آج لطف کر اتنا کہ کل گزر نہ سکے
وہ رات جو کہ ترے گیسوؤں کی رات نہیں
یہ آرزو بھی بڑی چیز ہے مگر ہمدم
وصالِ یار فقط آرزو کی بات نہیں

ہاں جاں کے زیاں کی ہم کو بھی تشویش ہے لیکن کیا کیجئے
ہر رہ جو ادھر کو جاتی ہے مقتل سے گزر کر جاتی ہے

فیض کی مدت شاعری میں 'نقش فریادی' سے 'زنداں نامہ' تک کا فاصلہ بہت طویل نہیں، لیکن اس فاصلے کی ارتقائی جست اور منزل کو چھو لینے کی پرواز میں بڑی گیرائی اور توانائی ہے۔ 'نقش فریادی' میں فن کی تکمیل میں وہ گہرائی اور خیال کی پرواز میں وہ بلندی نہیں جو 'دست صبا' اور 'زنداں نامہ' میں ہے۔ خصوصاً 'زنداں نامہ' میں ان کی شاعری فن اور خیال کے لحاظ سے جس معراج پر ہے اس کی مثال اردو شاعری کم پیش کر سکتی ہے۔ اور یہ بات بالکل فطری اور اصولی ہے۔ ہر ادیب کی ابتدائی تخلیق میں بعد کی تخلیق کی بہ نسبت پختگی کم ہوتی ہے۔ فیض کی عظمت اس بات میں پوشیدہ ہے کہ انہوں نے بہت کم مدت میں شاعری کی وہ منزلیں طے کر لیں جہاں بہت سارے فن کاروں کا خیال بھی نہیں پہونچ سکتا۔ فیض کی ہموار شاعری میں ایک شکن کشتی ہے جس کی طرف سابق میجر محمد اسحٰق نے بھی بڑی چابکدستی سے اشارا کیا ہے۔ میجر محمد اسحٰق "زنداں نامہ" میں "روداد قفس" کے تحت لکھتے ہیں :-

"فیض کی شاعری میں ایک صاحب دل کا جوشش اور ولولہ ہے۔ اس میں قوم کی قوم کا دل دھڑک رہا ہے لیکن ...... اس کے قوام میں پاکستان کے محنت کشوں کا مبارک پسینہ اور خون کی حرارت ابھی تک پوری مقدار میں شامل

(باقی صفحہ ۵۴۲ پر)

جعفر علی خاں اثر لکھنوی ـ پروفیسر رشید احمد صدیقی ـ پروفیسر فراق گورکھپوری
کلیم الدین احمد ـ مجنوں گورکھپوری ـ ڈاکٹر سید اعجاز حسین ـ عزیز احمد
پروفیسر اختر انصاری ـ عابد علی عابد ـ ڈاکٹر عبادت بریلوی ،
سردار جعفری ـ عبدالرحمٰن چغتائی ـ احمد ندیم قاسمی

تذکرہ و تبصرہ

جعفر علی خاں اثر لکھنوی

فیض احمد فیض کی شاعری ترقی کے مدارج طے کر کے اب اُس نقطۂ عروج پر ہے جس تک شاید ہی کسی دوسرے ترقی پسند شاعر کی رسائی ہوئی ہو۔ تخیل نے صناعت کے جوہر دکھائے ہیں اور معصوم جذبات کو حسین پیکر بخشا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پریوں کا ایک غول ایک طلسمی فضا میں مست پرواز ہے۔ ایک پر ایک کی چھوٹ پڑ رہی ہے اور قوس قزح کے عکاس بادلوں سے ست رنگی بارش ہو رہی ہے۔ بالکل ایسا منظر جو میں نے ایک شام کوسری نگر سے نشاط باغ جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ پانی برس کر کھل گیا تھا اور سامنے پہاڑیوں پر ایک قوس قزح نہیں بلکہ قطار در قطار تا حد نظر ایک سلسلہ تھا، اور ان سب کا اپنے حلقے میں لئے ہوئے آسمان پر ایک بڑی قوس قزح!

پروفیسر رشید احمد صدیقی

میرے نزدیک ترقی پسند غزل گویوں میں صرف فراق اور فیض ایسے ہیں جنہوں نے غزل کو ایک نیا مزاج اور زاویہ دے کر اس کی خوبی اور خصوصیت میں اضافہ کیا ہے۔ گو میں کچھ اس طرح بھی محسوس کرتا ہوں کہ یہ اضافہ اتنا ترقی پسندانہ نہیں جتنا عارفانہ یا عاشقانہ شاعرانہ ہے۔ فیض نے غزلیں نسبتاً کم کہی ہیں۔ فیض کی بعض بعض نظمیں ایسی ہیں جو اردو کی بہترین نظموں کے ہم پہلو رکھی جا سکتی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ جب وہ غزل کی طرف مائل ہوتے ہیں تو ان کی نظم کی خوبیاں اور زیادہ نکھر اور سنور کر ان کی غزلوں میں ڈھل جاتی ہیں۔ یہی بات میں نے اقبال کے بارے میں کہی تھی۔

فیض جیسا کہ سب جانتے ہیں اول سے آخر تک اشتراکی ہیں۔ لیکن غزل کا مزاج و مقام جیسا فیض نے پہچانا ہے۔ ان کے دوسرے ساتھیوں نے نہیں پہچانا۔ فیض کی غزلوں کے مطالعہ سے اکثر یہ محسوس ہوا ہے جیسے شعر کہتے وقت وہ ترقی پسندی اور اشتراکیت کی آرائش خم کاکل میں اتنے منہمک نہیں جتنے اندیشہائے دور دراز میں غالب اور اقبال کا احترام پیش نظر رکھتے ہیں۔

غالب اور اقبال کا احترام پیش نظر رکھنے سے فیض کچھ کم اشتراکی یا ترقی پسند نہیں ہو گئے ہیں۔ کہنا یہ ہے کہ شاعری میں موضوع کو اس طرح سمو کر شاعری کا موضوع اور موضوع شاعری معلوم ہونے لگے۔ بڑے شاعر کی بڑی اچھی پہچان ہے۔ جب تک کوئی شاعر اپنا ہوتے ہوئے سب کا شاعر نہ ہوگا

بڑا یا اچھا شاعر نہ کہلائے گا۔ ترقی پسند شاعروں میں یہ امتیاز فیض کے سوا شاید ہی کسی اور کو میسر ہو۔

فیض کو میں نے غالب اور اقبال کے قریب بتایا ہے۔ لیکن ایک چیز مجھے کھٹکتی ہے وہ یہ کہ فیض کو زبان پر اتنی قدرت نہیں ہے جتنی اقبال اور غالب کو تھی۔ صحت زبان کو اردو شاعری میں جو اہمیت حاصل ہے فیض نے اس کی طرف اتنی توجہ نہیں کی جتنی ان کی شاعری کا تقاضا ہے۔

پروفیسر فراق گورکھپوری

میں یہ مضمون روا روی اور عین علالت میں لکھ رہا ہوں اس لئے ان سیکڑوں نظموں کا جائزہ لینا کچھ اپنی مجبوریوں سے کچھ وقت اور جگہ کی قلت سے ناممکن ہے جو بہت سے اور شاعروں سے ہم کو ملی ہیں۔ جن میں کچھ نہایت لطیف نظمیں عورتوں کی لکھی ہوئی ہیں۔ لیکن ان سب کا نام نہ لیتے ہوئے بھی پروفیسر فیض احمد کی نظم جس کا عنوان ہے "رقیب سے" اور جو ہمایوں کے فروری ۱۹۳۸ء کے نمبر میں نکل چکی ہے اس کا ذکر ضرور کروں گا۔
میں بہت کم اشعار یا غزلوں و نظموں کے متعلق یہ محسوس کرتا ہوں کہ میرے دل و دماغ کا چور نکلا لیکن یہ نظم ایسی ہی نظم تھی۔ اردو کی عشقیہ شاعری میں اب تک اتنی پاکیزہ اتنی جیلی اور اتنی دور رس اور مفکرانہ نظم وجود میں نہیں آئی نظم نہیں بلکہ جنت اور دوزخ کی وحدت کا راگ ہے۔ شیکسپیر، گوئٹے، کالی داس، اور سعدی بھی اس سے زیادہ رقیب سے کیا کہتے؟ رقیب کا موضوع اردو شاعری میں بہت بدنام موضوع ہے لیکن فیض نے اسے بے پناہ طور پر کو ثر جیلا اور پاکیزہ بنا دیا۔ عشق اور انسانیت کے لطیف اور اہم ربط کو سمجھنا ہو تو یہ نظم دیکھئے۔ یہ ملکی مذاق کی بدنصیبی ہے کہ اس نظم کی غالباً وہ قدر شناسی نہیں ہوئی جس کی وہ مستحق ہے۔ عشقیہ نظموں کا کوئی گلدستہ اس نظم کے بغیر بے جان و بے رنگ رہے گا۔

پروفیسر فیض کا مجموعہ جن کی ایک نظم "رقیب سے" کا ذکر آ چکا ہے "نقش فریادی" کے نام سے نکلا اور اگرچہ بہت مختصر تھا لیکن اس کا بہت زبردست اثر ہماری شاعری پر پڑا۔ فیض نے فکر و احساس کی ایک نئی تکنیک اس میں دی جو اس دور کی ترجمانی کے لئے نہایت موزوں ہے۔ ان کے مصرعوں کی لے میں جو کھٹک یا زمزمہ (Tilt) ہے اور ان کی فقرہ سازی Phrasing میں جو تازگی و موزونیت ہے وہ ان کے اسلوب میں ایک خلاقانہ انفرادی صورت پیدا کر دیتی ہے۔ فیض نے ایک نیا مدرسہ شاعری قائم کیا۔ انہوں نے جس بصیرت افروز اور حساس خلوص و فنکارانہ چابکدستی سے عشقیہ واردات کو دوسرے اہم سماجی مسائل سے متعلق کر کے پیش کیا یہ اردو کی عشقیہ شاعری میں ایک بالکل نئی چیز تھی انوکھی اور قابل قدر بھی۔ اس مجموعہ میں دس بارہ مصرعوں کی غیر مقفیٰ نظم "تنہائی" کے عنوان سے تو عشقیہ شاعری کا ایک ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔ اور یہ نظم ایک زندہ جاوید کلاسک ہے۔ فیض نے ان احساسات کو اور بھی چمکا دیا جو اختر انصاری کے قطعات میں تھر تھرا رہے تھے۔ فیض کی شاعری آج کل کے مہذب نوجوانوں کے احساس اور جذبات احساس کا بولتا ہوا ساز ہے۔ فیض کی تقلید کثرت سے ہوئی۔ اختر الایمان کا مجموعہ "گرداب" نمایاں طور پر "نقش فریادی" سے متاثر ہے۔ اختر الایمان کی لہولہان آواز میں وہ ٹھہراؤ اور نکھار کے وہ عناصر تو نہیں آ سکے ہیں جو فیض کے یہاں ملتے ہیں اور نہ یوسف ظفر کے "زہر خند" اور "زنداں" میں فیض کا متفکرانہ اعتدال ملتا ہے لیکن اختر الایمان اور کچھ دوسرے شعراء نے جس انداز سے ہمارے نوجوانوں کی شوریدگی اور اقتصادی و روحانی زندگی کے ٹکراؤ کو پیش کیا ہے وہ موجودہ بحرانی اور عبوری دور کی بہت حد تک سچی نمائندگی ہے۔

کلیم الدین احمد

فیض کے شعر میں قفس، چمن اور صبا —— روایتی قفس، چمن اور صبا نہیں ہیں۔ اور وعدہ وپیمانی نئے ہیں یعنی پرانے لفظوں کا نئے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ یہ گویا ایک پردہ ہیں اور پس پردہ نئی نئی سیاسی باتیں ہیں۔ غلامی اور آزادی کی باتیں

ہیں اس لئے پرانے نقوش کی ماہیت بدل گئی ہے۔ اب شعروں میں رنگ بہاراں، بزمِ حریفاں، خزاں، محفلِ یاراں، شمع، صحنِ چمن، نکہت دامنِ گل، بادِ صبا، اشک، ساون، باغباں، شاخِ گل، نشیمن، صبح، سحر، شام کی باتیں ہیں، لیکن یہ پرانی باتیں نہیں۔ یہاں باتیں نئی ہیں، ہونے والے واقعات کی طرف اشارے ہیں پس پردہ سیاسی گفتگو ہے۔ یہ سب سہی، لیکن ایک کمی محسوس ہوتی ہے۔ پہلے ان نقوش کے معنی واضح اور متعین تھے۔ لیکن اب وہ کچھ مبہم سے ہو گئے ہیں ان میں پہلی سی وضاحت نہیں۔ ان کے مفہوم غیر متعین سے ہیں فیض کے شعر میں اسی قسم کی کمی ہے۔ قفس ہندوستان ہے، اہلِ قفس ہندوستانی ہیں۔ چمن بھی ہندوستان ہے صبحِ چمن آزادی ہے، یا آزاد ہندوستان غلاموں کی آزادی میں آنکھ کھلے گی۔ بادِ صبا (ZEIT GEIST) (روحِ زمانہ) ہے آزادی کی تمنا ہے۔ وعدہ و پیماں اہلِ قفس اور بادِ صبا سے ہوئے ہیں یا کسی اور سے۔ (آنکھ کھلے گی آزاد ہوں گے) اس لئے آنکھ بند ہے۔ اور بند ہے تو پھر بادِ صبا سے وعدہ و پیماں کیسے ہوئے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ باتوں کا عام مفہوم تو سمجھ میں آجاتا ہے لیکن پہلی سی وضاحت اور تعین نہ ہونے کی وجہ سے باتیں مبہم سی ہو جاتی ہیں

مجنوں گورکھپوری

فیض ان لوگوں میں سے ہیں جو اردو غزل اور جدید اردو نظم دونوں میں ایک تاریخی اہمیت رکھتے ہیں انھوں نے ہماری شاعری میں نئے امکانات پیدا کئے ہیں احساس کے لیے بہت سی آزادیاں مہیا کی ہیں۔ نئی تحریک کو فروغ دینے میں ان کی شاعری کا بہت بڑا حصہ ہے لیکن بجائے خود وہ کسی شدید کیف یا کسی شدید قوت کے مالک نہیں فیض کی اہمیت بھی اسلوبی اجتہادات پر مبنی ہے۔

ڈاکٹر سید اعجاز حسین

پنجاب کیا پوری اردو شاعری میں کلام کی اتنی قلیل ضخامت پر کسی نے اتنا نام نہیں پیدا کیا جتنا فیض احمد فیض نے۔ ان کا مجموعہ کلام مختصر ہے مگر اپنی گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے جو کچھ ہے انتخاب معلوم ہوتا ہے۔ فن کاری اور ندرتِ تخیل کا اتنا حسین امتزاج دورِ جدید میں کسی شاعر کے یہاں دکھائی نہیں دیتا سیدھے سادے الفاظ کو تعبیر زیادہ و تشبیہ و استعارے کے شعری صورت میں پیش کرنا اور تاثیر و معنویت پیدا کر دینا فیض کا خاص کارنامہ ہے۔ اور یہی فیض کی شاعری کا امتیازی پہلو ہے جو ان کی نظموں میں قریب قریب ہر جگہ نظر آتا ہے

عزیز احمد

فیض کی شاعرانہ تشبیہوں اور تصویروں کا زندگی کی رفتار سے بہت گہرا تعلق ہے۔ یہ ان کی شاعری کی سب سے بڑی کامیابی اور خصوصیت ہے۔ "تنہائی" اور "موضوعِ سخن" میں جو غالباً ان کی بہترین نظمیں ہیں یہ خصوصیت اور نمایاں ہے۔ "تنہائی" میں استعارتاً گرد و پیش کا سارا ماحول شاعر کا ساتھ دیتا ہے۔

ڈھل چکی رات، بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گزار

اجنبی خاک نے دھندلا دیے قدموں کے سراغ

استعاروں کی سحر کاری، شاعر کے جذبے کا اتنا ساتھ دیتی ہے کہ خارجی اور داخلی احساس ایک ہو جاتے ہیں اور فطرت اور انسان میں ایک حقیقی ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے، اسی طرح موضوع سخن میں یہ تشبیہ ؎

ان کا آنچل ہے کہ رخسار کہ پیراہن
کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے چلمن رنگیں

اس ایک شعر میں رمزی تشبیہہ کی وجہ سے مشرقی شاعری کی حیات معاشقہ کی صدیاں آباد ہیں۔ کتنی پابندیاں، کتنے رشک، کیسا صدیوں کا مسخ شدہ جمالی معیار اس شعر کے باطن سے جھانکتا ہے۔ یہ غالباً فیض کا بہترین شعر ہے۔

پروفیسر اختر انصاری

فیض احمد فیض اور ن م راشد کی نظموں کے مجموعے "نقش فریادی" اور "ماورا" حال میں شائع ہونے والی کتابوں میں بہت اہمیت رکھتے ہیں کیوں کہ یہ دونوں شاعر اردو شاعری کے جدید ترین رجحانات کے اہم نمائندے ہیں۔

فیض اور راشد دونوں اس معنی میں پرانے شاعر ہیں کہ یہ اپنا موجودہ رنگ اختیار کرنے سے پہلے بہت کچھ اسی پرانے رنگ میں لکھ چکے ہیں جو آج سے دس سال پہلے اردو کی نظمیہ شاعری کا عام رنگ تھا۔ یہ بات راشد پر زیادہ صادق آتی ہے کہ ان کی نظمیں اس زمانے میں بھی اردو رسائل کے لیے باعث زینت ہوتی تھیں جس زمانے میں جوش حفیظ اور اختر شیرانی اردو نظم کے جدید ترین رجحانات کے علمبردار تھے۔ فیض نے غالباً بعد میں لکھنا شروع کیا ہے اور یقیناً راشد کے بہت بعد مشہور ہوئے "نقش فریادی" میں اور "ماورا" میں دونوں شاعروں کی پرانی تخلیقات کے نمونے موجود ہیں۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ نقش فریادی میں فیض کے پرانے رنگ کی چیزیں زیادہ ہیں نئے رنگ کی چیزیں کم ہیں اور ماورا میں راشد کے نئے رنگ کی چیزیں زیادہ ہیں پرانے رنگ کی چیزیں کم ہیں۔ اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر راشد کی شاعری نے اپنے ارتقا کی منزلیں آہستہ آہستہ طے کیں تو فیض کی شاعری نے ایک طویل مدت تک ایک خاص روش پہ قائم رہنے کے بعد یک لخت ایک بہت بڑا قدم آگے بڑھایا اور دفعتاً ایک نیا اور چونکا دینے والا انداز اختیار کر لیا۔

فیض کی شاعری میں یہ اچانک تبدیلی جو ۱۹۳۶ء یا اس سے کچھ پہلے واقع ہوئی نتیجہ تھی ترقی پسند تحریک کے اثرات کا۔ تقریباً اسی زمانے میں راشد نے بھی اس تحریک کا کچھ اثر قبول کیا پھر یہ کہنا کچھ غلط نہ ہوگا کہ ترقی پسند تحریک نے راشد کو صرف ترقی پسند بنایا۔ (وہ ایک بڑا شاعر پہلے ہی تھا) مگر فیض کو اس تحریک نے ترقی پسند بھی بنایا اور بڑا شاعر بھی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی صحیح ہے کہ اگر راشد ترقی پسندی کے اثرات قبول کرنے کے بعد بھی اپنے ابتدائی دور کے رومانی و فراری رجحانات سے پورے طور پر آزاد نہیں ہو سکا ہے تو فیض (اپنی نئی نظموں میں) ترقی پسندانہ نظری شعور کا پورا ثبوت دیتا ہے۔

عابد علی عابد

فیض کی شعر گوئی کی خصوصیات کا پورا علم تبھی ہو سکتا ہے کہ آپ فیض سے ملیں اور اس کی ان فلسفیانہ باتوں سے لطف اندوز ہوں جو انہ

کی طرح نرم اور خنک محسوس ہوتی ہیں۔ فیض کے اشعار میں بھی جذبہ کتنا ہی شدید کیوں نہ ہو کیفیت کتنی ہی نازک کیوں نہ ہو جب وہ ان تمام مرحلوں سے گزر چکتی ہے جنھیں مجموعی طور پر فیض کا تخلیقی شعور کہتے ہیں تو وہ ٹھنڈی ٹھنڈی دھیمی دھیمی آنچ میں تبدیل ہو جاتی ہے اس کے مزاج کا توازن لفظوں کے توازن میں اور تراکیب کی شائستگی میں جھلکتا رہتا ہے، جو بات فیض کو دورِ عصر کے اکثر شعراء سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ درحقیقت جامع صفات انشا پرداز ہے، انگریزی شعری روایات پر مطلع فارسی غزل کے مزاج سے آگاہ، عربی ادب کی باریکیوں کا راز دار۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے ہاں کبھی کبھی چونکا دینے والی ترکیب سامنے آجاتی ہے جس میں ایک جہانِ معانی پوشیدہ ہوتا ہے۔ اس کے اشعار میں تشبیہہ، استعارہ، تلمیح اور ترکیب اجزائے تحسینِ کلام نہیں ہوتے بلکہ اظہارِ مطالب کے خوبصورت وسیلے ہوتے ہیں کہ پڑھنے والا جتنی جلدی ممکن ہو اس تخلیقی نقطہ ہستی کے آس پاس پہنچے۔ جہاں سے فیض کی غزل یا فیض کے اشعار کی کرنیں پھوٹتی ہیں۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی

فیض پر روایت کے گہرے اثرات ہیں۔ اس لئے غزل میں پیچیدہ سے پیچیدہ تجربات کو پیش کرتے ہوئے بھی وہ اس روایت کے اثر سے کام لیتے ہیں۔ غزل کی روایت کو انہوں نے ایک نئی زندگی دی ہے۔ لیکن نئی زندگی دے کر اسے نئے راستوں پر گامزن بھی کیا ہے۔ فیض کی غزلوں میں حقیقت کے اس امتزاج نے آہستہ روی کو تیزی و تندی سے ہم آہنگ کیا ہے۔ اس لئے اُن کے یہاں ایک ہی لَے سُنائی دیتی ہے۔

سردار جعفری

فیض سے اردو میں ایک نئے دبستان شاعری کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ جدید مغربیت اور قدیم مشرقیت کا حسین امتزاج ہے جس نے اردو شاعری کو دو آتشہ بنا دیا ہے۔

عبدالرحمن چغتائی

فیض کی نظموں کی فضا اس عالمگیر فضا سے متاثر ہے جہاں انسان کو فنا اور اس عظمت سے دوچار ہونے کا موقع ملتا ہے، جو شاعر کو اور ایک آرٹسٹ کو اپنے فن سے حاصل ہوتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی

فیض کو ماضی کی ادبی روایات پر بڑا عبور حاصل ہے۔ وہ تلمیحیں اور رمزیں اور کیفیتیں جن سے ہماری کلاسیکی شاعری بھری پڑی ہے۔ فیض کے ہاں زمانہ زیادہ بھرپور معنویت کے ساتھ اس لیے نظر آتی ہیں کہ وہ میرؔ، سوداؔ، غالبؔ، مومنؔ، حالیؔ اور اقبالؔ کی قائم کی ہوئی بڑھتی ہوئی روایات کا احترام کرتا ہے اور اسے معلوم ہے کہ تراکیب و الفاظ کی بھی ایک تاریخ اور ایک روایت ہوتی ہے اور ہر لفظ کتنے ہی ادوار کی نازک جزئیات کو سمیٹے ہوئے ہم تک پہنچا ہے۔ فیض کو الفاظ کی تاریخ کے شعور کے ساتھ ہی مسکراہٹوں، آنسوؤں اور امنگوں کی تاریخ کا بھی شعور ہے اور یہی وجہ ہے کہ فیض کی شاعری حسن معنیٰ کا بڑا حسین امتزاج ہے

فیض اور نئی نسل

نئی نسل کی نمائندگی کو ضروری سمجھتے ہوئے ہم نے پاک و ہند کے تمام کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلباء کو فیض احمد فیض کی زندگی، شخصیت اور فن پر مضامین نظم نظم و نثر لکھنے کی دعوت دی تھی۔ چنانچہ بحیثیت مجموعی ہمیں ۴۳ مضامین اور ۳۶ نظمیں موصول ہوئیں۔

بہترین مضامین آئندہ صفحات میں پیش کئے جا رہے ہیں۔ ان کا انتخاب چار افراد کے ایک بورڈ نے کیا ہے۔ یہ بورڈ سید ابوالخیر کشفی، جمیل اختر اساتذہ شعبۂ اردو کراچی یونیورسٹی، انجم اعظمی لیکچرر گورنمنٹ کالج کراچی اور کشش صدیقی (رکن ادارۂ افکار) پر مشتمل تھا۔

بہترین مضامین نظم و نثر پر جن طلباء کو مکتبۂ افکار کی جانب سے دو سو روپے سے زائد کی کتابیں بطور انعام پیش کی گئیں ان کی تفصیل یہ ہے:-

- احفاظ الرحمٰن (متعلم قانون، سال اول) اردو کالج کراچی ——— پہلا انعام
- امید گھندیانی (متعلم ایم اے) گورنمنٹ کالج۔ ملتان ——— دوسرا انعام
- ساحر الہ آبادی (متعلم ایم اے) کراچی یونیورسٹی، کراچی ——— تیسرا انعام
- نجمہ تقی (متعلم بی اے آنرز) کراچی یونیورسٹی، کراچی ——— خصوصی انعام
- سلیم خواجہ (متعلم انٹرمیڈیٹ، عبداللہ ہارون کالج، کراچی (نظم) ——— پہلا انعام (یہ نظم منظومات کے حصے میں شامل ہے)

— ادارہ

روشن کہیں بہار کے امکاں ہوئے تو ہیں

احفاظ الرحمٰن

گندم کے کھیت، بچوں کے ہاتھ اور شاعر

گندم کے کھیتوں اور بچوں کے ہنستے ہوئے ہاتھوں سے سبھی محبت کرتے ہیں لیکن جب ایک فن کار ان سے اپنی محبت کا اظہار کرتا ہے تو ہم اس سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ اس نے ان اشیاء کے تحفظ کے لئے اپنے فن کو وقف کر دیا ہوگا۔

فیض کی شاعری کا جائزہ بھی ہم اسی نقطہ نظر سے لیں گے کہ وہ اپنی شاعری کو ایک عمل، ایک ذریعہ، ایک ہتھیار بناتا ہے یا نہیں۔؟
— گندم کے لہلہاتے کھیتوں کی شادابی اور بچوں کے ہنستے ہوئے ہاتھوں کی معصومیت کو دائمی بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ یا نہیں؟

یہ آرزو بھی بڑی چیز ہے مگر ہمدم
وصال یار فقط آرزو کی بات نہیں

فیض نے یہ سمجھتے ہوئے شاعری کی ہے کہ صحافت اور خطابت کا اثر ہنگامی اور وقتی ہوتا ہے اور ٹھوس فنی بنیادوں پر استوار ادب ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ اگر ادب پر صحافت اور خطابت کی طرح محض مواد پر زور دیا جائے گا تو ادب بے جان اور کھوکھلا ہو کر رہ جائے گا۔ اس نے اپنے مواد کو بیان کی خوبصورتی، زبان کی چاشنی اور احساسات کی بلندی سے اسی طرح پُر اثر بنایا ہے جس طرح ایک کمہار مٹی کے برتنوں پر خوبصورت نقش و نگار بنانے کے عمل میں بتدریج آگے بڑھتا رہتا ہے۔ ایک عمل کے بعد دوسرا عمل، خاص ترتیب سے کرتا ہے۔ اور اس عمل میں اپنی روح سمو دیتا ہے بالکل اسی طرح فیض نے بھی اپنے اشعار میں اپنی روح سمو دی ہے۔ الفاظ کے خوبصورت اور ملے جلے رنگوں سے وہ اشعار پر نقش و نگار بناتا ہے۔ اور یہ نقش و نگار نہ تو بھڑک دار رنگوں سے بنے ہیں۔ اور نہ ان میں کچے فن کا بھونڈا پن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے فن کی ترکیبیں مضبوط اور سایہ خنک اور خوابناک ہے۔

اگر مجھ سے چند لفظوں میں فیض کی شاعری پر تنقید کرنے کو کہا جائے تو میں یہ کہوں گا کہ اس کی شاعری اعلیٰ مقصد، بلند تخیل، گہرے مشاہدے اور معنی خیز اشارات کا ایک حسین امتزاج ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس کی مقبولیت اور عظمت کا راز ہی ان معنی خیز اشارات میں پوشیدہ ہے جو اس کی شاعری کے بلند مقصد کو واضح کرتے ہیں۔

تیرے ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت میں ہم
دار کی خشک ٹہنی پہ وارے گئے
تیرے ہاتھوں کی شمعوں کی حسرت میں ہم
نیم تاریک راہوں میں مارے گئے

فیض نے اردو کلاسیکی شاعری کو دورِ جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کا نہایت کامیاب تجربہ کیا ہے۔ وہ جس انداز سے غم دوراں کا ذکر کرتا ہے ہماری کلاسیکی شاعری میں وہ غم جاناں کے اظہار کا ذریعہ ہے گویا اس نے اپنے نئے خیالات کو پرانے ڈھنگ سے بیان کیا ہے۔

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا　　(غالبؔ)

شمعِ نظر، خیال کے انجم، جگر کے داغ
جتنے چراغ ہیں تری محفل سے آئے ہیں　　(فیضؔ)

یہاں بزم کے معنوں میں فرق ہے۔ غالبؔ کی بزم محدود ہے۔ اور اس میں داخلیت جھلک رہی ہے اس کے برخلاف فیضؔ کی بزم لامحدود ہے۔ اور خارجیت کا پہلو لئے ہوئے ہے۔

ہم نشیں ذکرِ یار کچھ کر آج
اس حکایت سے جی بہلتا ہے　　(میرؔ)

قفس اداس ہے یارو صبا سے کچھ تو کہو
کہیں تو بہرِ خدا آج ذکرِ یار چلے　　(فیضؔ)

رہے نہ جان تو قاتل کو خون بہا دیجئے
کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہیے　　(غالبؔ)

گر فکرِ زخم کی تو خطاوار ہیں کہ ہم
کیوں محوِ مدحِ خوبیٔ تیغِ ادا نہ تھے　　(فیضؔ)

میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا　　(غالبؔ)

محتسب کی خیر اونچا ہے اسی کے نام سے
رند کا، ساقی کا، مے کا، خم کا، پیمانے کا نام　　(فیضؔ)

الفاظ وہی ہیں، رند اور اس کی مناسبت سے ساقی، مے، میخانہ، محتسب؛ اسی طرح محفل اور اس کی مناسبت سے شمع پروانہ، یار، رقیب اور قفس کی مناسبت سے چمن، پھول، کانٹے، آشیاں، گلچیں، بت خانہ، صنم، شیخ، کعبہ — لیکن فیضؔ نے ان الفاظ کو وسیع علامات کے طور پر استعمال کیا ہے۔

صرف وہی شخص فیضؔ کے اشعار کی گہرائیوں میں پہنچ سکتا ہے جسے یہ بھی علم ہو کہ اس کی شاعری کا محرک کون سا نظریہ ہے؟

لیکن اب اس کی ایجاد کردہ طرزِ فغاں عام ہوتی جا رہی ہے۔ اس نے جو علامات استعمال کی ہیں اب ان کے متعلق علم دوست طبقے کو یہ علم ہے کہ وہ کن عظیم مقاصد کی نمائندگی کرتی ہیں۔ جب وہ کہتا ہے۔ ع

ناموسِ جان و دل کی بازی لگی تھی ورنہ
آساں نہ تھی کچھ ایسی راہِ وفا شعاراں

تو اس کا پڑھنے والا یہ بات بخوبی جانتا ہے کہ یہ کون سی راہ ہے، کون سا نصب العین ہے جس پر اسے فخر ہے اور جس کے لئے وہ جان و دل کی قربانی بھی پیش کرنے سے گریز نہیں کرتا۔ فیض کی شاعری زیادہ عظیم اور مقدس ہے اس لئے کہ اس کی شاعری ان کے دلوں میں عزم، امید اور لگن کی روح پھونکتی ہے۔ اور جب ان پر یاس و قنوطی کے اندھیرے چھاتے ہیں تو فیض کے اشعار روشن ستارے بن کر ان کے دلوں میں جگمگانے لگتے ہیں ـــــ اور یہی فیض کی انفرادیت اور کمال ہے کہ اس نے غمِ جاناں کے روپ میں غمِ دوراں کو پیش کیا ہے۔

فیض نے پرانی علامات ہی سے جدید تقاضوں کو پورا کیا ہے۔ اس کی شاعری میں جدید و قدیم روایات کا ایک حسین امتزاج ملتا ہے۔ اردو شاعری پر اس کا ایک بڑا احسان یہ بھی ہے کہ اس وقت جب شاعری کی روایات کو نظر انداز کیا جا رہا تھا اور ہر پرانی چیز کو بے کار سمجھا جا رہا تھا اس نے کلاسیکی شاعری کی خصوصیات کو زندہ رکھا اور پرانی تراکیب، تشبیہات و استعارات کو نئے معنی پہنائے۔ قفس، زنداں، گل، چمن، صبح، وفا، جفا، ستم، شیخ، یار، منزل، چراغ، خزاں، بہار، زلف، دار و رسن، جنون، زنجیر، خرد، دیوانہ، تیغ، اسیر، چاند، راہ، گبیر، وصال، فراق، عشق، مدعی، طلب، قاتل، محتسب، رند، مے خانہ، فیض کی شاعری میں یہ الفاظ آ کے ہیں تو جدید تقاضوں اور نئی قدروں کی علامت بن جاتے ہیں۔ فیض کی یہ علامات و اشارات پھر واضح اور مبہم نہیں رہے۔ بلکہ اب تو یہ بجائے خود ایک تحریک، ایک عمل اور ایک پیغام ہیں اور یہ پیغام چونکہ ایک درد مند اور حساس شاعر کا پیغام ہے اس لئے یہ امن اور انصاف، خوشحالی اور ترقی، آزادی اور مساوات، امید اور حرکت کا پیغام ہے۔ یہ پیغام کسی خاص فرد یا قوم کے لئے نہیں بلکہ پوری انسانیت کے لئے ہے۔

فیض جدید اردو شاعری کا سنگِ میل ہے۔ اس نے اردو شاعری میں جو تجربے کئے ہیں وہ یقیناً مستقبل کی شاعری کی بنیاد ثابت ہوں گے وہ اپنی شاعری سے سماجی شعور کو وسعت دے رہا ہے۔ اس نے نئے لکھنے والوں کی پوری نسل کو متاثر کیا ہے۔ بلکہ یہ کہنا درست ہو گا کہ انھیں اپنے رنگ میں رنگ دیا ہے اس کو جو چیز دوسروں سے ممتاز کرتی ہے وہ اس کا مخصوص طرزِ بیان ہے جو خالصتاً اس کا اپنا انداز ہے اور یہ نیا انداز شعرا میں بے حد مقبول ہوا ہے۔ اس کی پیروی کرنے والوں میں کچھ تو سماجی شعور کے ساتھ اس انداز کو اپنا رہے ہیں۔ ع

شاعرِ ادب کے محتسبوں کو خبر نہیں
کیا کام لے رہے ہیں تغزل کے فن سے ہم　　(حمایت علی شاعرؔ)

اور کچھ بغیر سمجھے بوجھے، کسی فکری مقصد کے بغیر اس رنگ میں رنگے جا رہے ہیں۔ فیض نے اردو کے دامن کو وسیع کرنے کی کوشش کی ہے۔ فرسودہ روایات اور پابندیوں کی پروا کئے بغیر اپنے ترقی پسندانہ رجحانات کو عام کیا ہے۔ اور اچھی روایات کو آگے بڑھایا ہے۔ فیض نے ادبی روایات کے احترام کے باوجود اندھی تقلید کبھی نہیں کی۔ اس کی نظمیں، غزلیں اور قطعات زیادہ دلکش اور اثر آفریں بھی ہیں اور ان میں ادبیت کا پہلو نظر انداز بھی نہیں کیا گیا ہے۔ روانی اور تاثر کے لحاظ سے وہ قاری کے دل پر گہرا اثر ڈالتے ہیں اس نے آزاد نظمیں بھی لکھی ہیں اور پابند بھی۔ نئی تراکیب اور بحریں بھی استعمال کی ہیں اور پرانی بھی۔ لیکن کہیں بھی اس حسن اور تاثر

نہیں ہوتی جو اس کی شاعری کی بہت بڑی خوبی ہے۔ وہ الفاظ کا بہت بڑا جوہری ہے۔ اس کے پاس بے ترتیب اور بے اثر الفاظ کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ لیکن اس کے ذہن میں ڈھل کر یہ الفاظ دلکش اور اثر آفریں بن جاتے ہیں۔ پھر یہ ترشے ترشائے لفظوں کے موتی نظموں اور غزلوں کے زیورات میں اپنی موزوں جگہ پر جگمگاتے نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر فیض کی نظم "ایرانی طلبا کے نام" پیش کی جا سکتی ہے یا ان چند مصرعوں کو دیکھئے۔ ع

بکھر گیا جو کبھی پیرہن سر بام
نکھر گئی ہے کبھی صبح، دوپہر، کبھی شام
کبھی جو قامت زیبا پہ سج گئی ہے قبا
چمن میں سرو و صنوبر سنور گئے ہیں تمام
بنی بساط غزل جب ڈبو لئے دل نے
تمہارے سایۂ رخسار و لب میں ساغر و جام
سلام لکھتا ہے شاعر تمہارے حسن کے نام

یہ دلکش اور اثر آفریں طرز بیان اور الفاظ کی خوبصورت ہم آہنگی فیض ہی کا حصہ ہے

فیض حقیقت جدید اقدار کا پرچار کرتا ہے۔ اس کے سامنے ایک عظیم آدرش ہے۔ زندگی کی تلخ حقیقتوں سے وہ گریز نہیں کرتا بلکہ ان کی اصلیت دنیا کو دکھاتا ہے۔ وہ نہ صرف ان پر تنقید کرتا ہے بلکہ ان کے خلاف آواز اٹھانا اپنا فنکارانہ فرض سمجھتا ہے۔ اس نے "دست صبا" کے دیباچے میں لکھا ہے۔

..... "شاعر کا کام مشاہدہ ہی نہیں مجاہدہ بھی اس پر فرض ہے ....." اور وہ اپنے اس فرض کو بڑی خوبی اور جرأت سے پورا کرتا چلا آ رہا ہے۔

فیض کی شاعری قاری پر محض سطحی تاثر نہیں چھوڑتی بلکہ جوں جوں وہ آگے بڑھتا چلا جاتا ہے اشعار کی روح اس کے دل کی گہرائیوں میں اترتی چلی جاتی ہے۔ اس کے ضمیر کو جھنجھوڑتی ہے اور اس کی قوت عمل کو بیدار کرتی ہے۔ اس کا کوئی بھی پڑھنے والا اس کے اشعار محض زبانی چٹخارے اور لطف اندوزی کے لئے نہیں گنگناتا بلکہ وہ خود کو ان اشعار کے ماحول سے منسلک کر لیتا ہے۔ اسے ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے وہ فیض کے اشعار کا مرکزی کردار ہے اور واقعی اس پر وہی کچھ بیت رہی ہے۔ اس کے جذبات بھی وہی ہیں جو شاعر کے گہرے مشاہدے نے اشعار کے روپ میں پیش کئے ہیں۔ فیض کو یہ مشاہدہ زندگی کے دو مختلف پہلوؤں کے مطالعے سے حاصل ہوا ہے۔ ایک وہ پہلو جہاں زندگی اپنی تمام تر تابانیوں سمیت جگمگا رہی ہے۔ اور دوسرا وہ، جہاں وہ موت کا ندھا ملائے سسک رہی ہے۔ یہ دونوں پہلو تاریخ کے آغاز سے لے کر اب تک کسی نہ کسی صورت میں موجود رہے ہیں، ہم انہیں ایک نام دے سکتے ہیں۔ ظالم و مظلوم۔ یہ ہمیشہ سے موجود رہے ہیں اور ان کے درمیان ہمیشہ کشمکش ہوتی رہی ہے۔ ع

کچھ لوگ ہیں جو اس دولت پر
پردے لٹکاتے پھرتے ہیں
ہر پیکر کو ہر ساگر کو

نیلام چڑھاتے پھرتے ہیں
کچھ وہ بھی ہیں جو لڑ بھڑ کر
یہ پردے نوچ گراتے ہیں
ہستی کے اٹھائی گیروں کے
ہر چال الجھائے پھرتے ہیں
ان دونوں میں رن پڑتا ہے
نت، بستی بستی، نگر نگر
ہر بستے گھر کے سینے میں
ہر چلتی راہ کے ماتھے پر
یہ کالک بھرتے پھرتے ہیں
وہ جوت جگاتے رہتے ہیں
یہ آگ لگاتے پھرتے ہیں
وہ آگ بجھاتے رہتے ہیں

(ششیوں کا مسیحا)

کبھی انھیں آقا اور غلام کا نام دیا گیا، کبھی ان کا نام جاگیردار یا کسان رہا ہے۔ اور آج کے نام ہیں سرمایہ دار اور مزدور — اور آج یہ دونوں ایک دوسرے کے خلاف میدان میں آچکے ہیں زمانہ ان کی اس عظیم جنگ کی تاریخ مرتب کر رہا ہے ایسی تاریخ جو خالصتاً عوام کی تاریخ ہوگی جابر ظالم شہنشاہوں، غارت گر جاگیرداروں اور چند گنے چنے سرمایہ داروں کی تاریخ نہیں ہوگی۔ بلکہ محنت کش انسانوں کی تاریخ ہوگی، امن و انصاف اور آزادی کی تاریخ ہوگی۔ فیض اس جدوجہد میں ایک اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ کیونکہ اسے آگ لگانے والوں اور کالک بھرنے والوں سے نفرت ہے، اسے ان لوگوں سے محبت ہے جو آگ بجھاتے پھرتے ہیں اور وہ انھیں کا حامی و مددگار ہے۔

اچھے فن کار کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے دل میں خلوص اور انمٹ محبت کا جذبہ ہو اور عوام کے مسائل سے ہمدردی ہو۔ فیض کے دل میں دنیا کے عوام کے لئے بے پناہ محبت کا جذبہ موجود ہے۔ انسانیت دوست فیض کو اس بات کا احساس ہے کہ دنیا کے تمام عوام کی زندگی ایک سی نہیں ہے۔ ان میں غم اور خوشیاں مشترک نہیں ہے، خوشیاں محدود ہیں اور انھیں عام کرنے کی ضرورت ہے۔ ؎

بے فکرے دھن دولت والے
یہ آخر کیوں خوش رہتے ہیں
ان کا سکھ آپس میں بانٹیں　　(سوچ)
یہ بھی آخر ہم جیسے ہیں

فیض کے نزدیک تمام انسانوں کو خوشیاں حاصل کرنے کا حق ہے۔ اس کی شاعری ان عناصر کے خلاف جہاد ہے جو آج پورے معاشرے کو اپنی گرفت میں لے کر کھوکھلا کر رہے ہیں۔ یہ چیونٹی بھر لوگ، صنعت و حرفت، تجارت، سیاست، مذہب، طرز معاشرت

اور خوف تھیں۔ غرضیکہ زندگی کے ہر شعبے میں اپنی مرضی اور پسند کے حالات پیدا کرنے پر قادر ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے سماج میں اکثریت مجبور، افلاس زدہ اور ستم نصیب ہوگی۔

فیض ان دانشوروں میں سے ایک ہے جن کی زندگی کا مقصد اس جابرانہ نظام کی لعنتوں کو ختم کر کے ایک نئے اور ہمہ دار معاشرے کی تشکیل کرنا ہے۔ ایسا معاشرہ جس کے دامن میں دنیا کے انسانوں کے لئے امن و انصاف خوشحالی اور ترقی کے خوش رنگ پھول ہونگے۔

لیکن کیا یہ عجیب بات نہیں ہے کہ فیض نے بہت کم عوامی نغمے لکھے ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اسے اس بات کا احساس ہے کہ وہ جن عوام کی عظمت و صداقت کے گیت گاتا ہے ان کی آنکھوں پر صدیوں کی قدامت پرستی اور اوہام اور عقائد کا پردہ پڑا ہے اس لئے انھیں بالواسطہ کسی نئے فکری نظریئے سے روشناس کرانا بہت مشکل کام ہے۔ ان کی عقلیں کسی نظریئے کی گہرائی میں جا کر اسے پرکھنے کے قابل نہیں ہوتیں۔ کسی ایک ڈگر کو اپنا لینے کے بعد وہ اسے آسانی سے نہیں چھوڑتے بقول حیدر دہلوی ؎

ابھی ماحول عرفانِ ہنر میں پست ہے حیدرؔ
یکایک ہر بلند آواز پہچانی نہیں جاتی

فیض کو بھی اس بات کا احساس ہے کہ کوئی نئی آواز عوام کی سمجھ میں آسانی سے نہیں آتی۔ مادی مسائل کو حل کرنے ہی سے انھیں کب فرصت ملتی ہے۔ جو وہ کسی اور طرف متوجہ ہو سکیں۔ پرانی نسل روایات اور قدامت پرستی کو چھوڑنا گوارا نہیں کرے گی البتہ نئے آنے والوں کی قوت فکر کو تازگی اور احساس کو بیداری ضرور دی جا سکتی ہے۔ فیض کی شاعری ان افراد کے لئے ہے جن میں اس بات کو سمجھنے کی صلاحیت اور امنگ ہے۔ اور جن کی عقلوں میں روایات اور قدامت پرستی سے ہٹ کر سمجھنے کی گنجائش ہے۔ فیض نے اسی طبقے کی بیداری اور رہنمائی کا کام اپنے ذمہ لیا ہے۔ اور فیض اس طبقہ کی فکری رہنمائی کرتا ہے اور وہ طبقہ اپنے طریقوں سے عوام کی رہنمائی کرتے ہیں۔ یہاں ہمارے سامنے ساحر لدھیانوی کی مثال ہے۔ اس نے اکثر اپنے موضوع کا اکتساب فیض کی شاعری سے کیا ہے۔ فیض جس موضوع کو علامات کے ذریعہ بیان کرتا ہے۔ وہ اسی موضوع کو زیادہ عام فہم، واضح اور شدید پُر اثر الفاظ میں عوام کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ اسی لئے اگر فیض کے نغمے عوامی نہیں تو اس کو اس بات کا الزام نہیں دیا جا سکتا کہ اس کی شاعری اس کے مقصد کا ساتھ نہیں دیتی۔ اگر عوام اس کی علامات میں اپنے دکھ درد کا عکس نہیں دیکھ سکتے تو اس کے عظیم مقصد اور اس کی مسلسل جدوجہد کو تو فراموش نہیں کیا جا سکتا اس نے تو اپنے آپ کو اس طبقے کے لئے مخصوص کر لیا ہے۔ جو نئی نسل کے حقوق اور آزادی کا علمبردار ہے۔ اور جو عوام میں عملی طور پر اس کے لئے راہیں ہموار کر رہا ہے۔

فیض کا طنزیہ لہجہ بڑا لطیف اور پُر اثر ہے۔ طنز جتنا ڈھکا چھپا ہوتا ہے اتنا ہی زیادہ کارگر ہوتا ہے۔ گہرا طنز تو ایک ایسا نشتر ہوتا ہے جو دل میں ہمیشہ چبھتا رہتا ہے۔ ؎

ہے اب بھی وقت زاہد ترمیم زہد کر لے
سوئے حرم چلے ہے انبوہ بادہ خواراں
گر فکر زخم کی تو خطا وار ہیں کہ ہم
کیوں محوِ مدح خوبیٔ تیغ ادا نہ تھے

دوسرے شعر میں فکر اور زخم اور تیغ، یہ تینوں الفاظ بڑی علامت سے اہم تر ہیں۔ گویا فکر سے مراد سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہے اور زخم انسانی حالت کو ظاہر کرتا ہے، تیغ ستم کی علامت ہے۔ سوچنا سمجھنا جرم ہے۔ حق کی آواز کو ہمیشہ دبانے کی کوشش کی جاتی ہے اور ساتھ ساتھ یہ امید بھی کی جاتی ہے کہ ستم نصیب اپنی حالت پر غور نہ کرے۔ ستم نصیبوں کی خطا واقعی بہت بڑی ہے کہ انہوں نے ستم کو غیر معمولی اہمیت دی۔

فیض کا ایک اور شعر ہے۔ ع

ایسے ناداں بھی نہ تھے جاں سے گذرنے والے
ناصحو، پندگرو، راہ گذر، تو ـــــــ دیکھو

آخر وہ کون سی منزل تھی۔ جس کے لئے حق پرستوں نے اپنی جانوں کو قربان کرنے سے گریز نہیں کیا۔ یقیناً وہ منزل ایک عظیم منزل ہوگی اور وہ مقصد اعلیٰ مقصد ہوگا۔ لیکن غیروں کو اس منزل کا کیا علم، اس منزل کو دیکھنے کے لئے وہ ہماری نظریں کہاں سے لائیں۔ آنکھوں پر روایات کی پٹی بندھی ہو اور قوت فکر پر توہمات کا زنگ لگا ہو۔ تو اس کی پہونچ سطح تک تو ہو سکتی ہے لیکن گہرائی تک نہیں یہ سب انداز نظر کا فرق ہے احساسات اور درد کے معیاروں کا فرق ہے۔

فیض کی انفرادیت اور نمایاں طرز بیان ہمیشہ سے قائم رہا ہے۔ لیکن اس کی عالیہ نظموں، غزلوں اور تینوں کتابوں[1] کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اس کے فن میں ارتقا ہوا ہے اس کے لب و لہجہ اور طرز بیان میں نمایاں تبدیلی ہوتی رہی ہے اور اس کا احساس اور مشاہدہ برابر اس کے فن کو صیقل کرتا رہا ہے۔ سجاد ظہیر کے الفاظ میں

"سب سے زیادہ قابل قدر اور لائق احترام وہ انفرادیت ہے۔ اور
وہ شخصیت ہے جو ماضی کو حال اور حال کو مستقبل کے امکانات سے
یوں پیوست کرے کہ اس کے ارتقا کی رفتار اور تیز ہو جائے
جس کے لئے معاشرے کے حالات سازگار رہ چکے ہیں لیکن جسے ذہنوں
کا انجماد، شعور کی کم بینی مذموم عادتوں اور رجحانوں کی موجودگی اور
محدود مفادات کی مقاومت اپنی پوری قوت اور سارے پھیلاؤ
اور جوش کے ساتھ کارفرما نہیں ہونے دیتی۔"

بڑے فن کار کا ہر دور اپنے پہلے دور سے زیادہ واضح، جاندار اور خوب صورت ہوتا ہے۔ خطوط پہلے سے زیادہ دلکش اور اثر آفریں بن جاتے ہیں۔ پچھلی خامیاں اور کمزوریاں دور ہو جاتی ہیں۔

ارتقا بتدریج ہوتا ہے اس کے تمام مراحل ایک دم طے نہیں کئے جا سکتے۔ ایک سیڑھی کے بعد دوسری سیڑھی . . . . . یہی اوپر چڑھنے کا صحیح طریقہ ہے۔ فن میں پختگی لانے اور اس کو جلا بخشنے کے لئے گہرے مشاہدے اور حساس دل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے بعد ایک پُراثر طرز بیان حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور یہ حاصل کرنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ بقول غالب۔ ط

قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

قطرے میں دجلہ دکھانے کے لئے خون دل صرف کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ فیض نے الفاظ کی ہم آہنگی پر جو عبور حاصل کیا ہے۔ وہ ایک دم حاصل نہیں کر لیا ہے۔ اس نے اپنے جذبات اور احساسات کے درمیان ایک حد خاص تک رکاوٹ قائم کر کے یہ مقام حاصل کیا ہے۔ اس کی شاعری بتدریج مشاہدے اور شعور کی دھیمی دھیمی آنچ میں تپ کر کندن بنی ہے۔

---

[1] اب فیض صاحب کا چوتھا مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ ادارہ

میں نے فیض کی شاعری کو چار ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے دور میں اس پر بے عملی اور مایوسی کی فضا طاری ہے۔ اس کے کلام میں معاشرت اور زمانے کے تقاضے سے گریز پایا جاتا ہے ؎

عمر بے سود کٹ رہی ہے فیض
کاش افشائے راز ہو جائے

یہ دور فیض کی شاعری کا رد دور تھا۔ جب اس کی حسن پرستی محدود تھی۔ وہ اپنے غم میں محو تھا۔ خوبصورت تشبیہات اور استعارات کا استعمال بہت زیادہ تھا۔ اشعار میں آہنگ تھا۔ لیکن اس کا اپنا رنگ اتنا نمایاں نہیں تھا۔ اور اس کی شاعری محض اپنی خیالی محبوب کے لئے وقف تھی۔

"۔۔۔ اپنی ابتدائی نظموں میں فیض ایک حسن پرست اور
الفاظ کا دلدادہ شاعر نظر آتا ہے۔۔۔۔ فیض کی اس
زمانے کی نظمیں حریری، گلابی ملبوسوں میں لپٹی ہوئی، خواب
سے چور اور لذت سے سرشار تصویروں سے بھری پڑی
ہیں۔ زندگی کا ان سے براہ راست کوئی تعلق نہیں۔۔۔"

(ن۔م۔ راشد)

فیض کی شاعری کا یہ ابتدائی دور "رات یوں دل میں تیری کھوئی ہوئی یاد آئی" سے شروع ہو کر "میرے ندیم" پر ختم ہوتا ہے۔ اس دور کی غزلیں، نظمیں، قطعات موضوع کی یکسانیت کے حامل تھے۔ اور فرد کے انفرادی غموں سے تعلق رکھتی تھیں۔

اگر ہم اس دور کے سیاسی اور سماجی حالات کا مطالعہ کریں تو ہمیں یہ معلوم ہوگا کہ اس وقت ہندوستانی عوام کے اذہان پر جمود طاری تھا مایوسی اور بے عملی کا غلبہ تھا۔ جرأت وہمت کا فقدان تھا۔ تعلیم کی کمی تھی اور ملک کی اکثریت ان پڑھ اور بے شعور تھی۔ ان مایوس کن حالات نے عوام کی طبیعت میں گریز اور فرار کا جذبہ پیدا کر دیا تھا اور ان کی تر دلچسپی محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ ان حالات کا اثر فوراً بھڑکنے والے ذہنوں پر پڑنا ناگزیر تھا۔ جس کی جھلک ہم فیض کی ابتدائی شاعری میں دیکھتے ہیں۔ "نقش فریادی" کی اکثر نظمیں، غزلیں اور قطعات اس کی طبیعت میں فرار اور گریز کے رجحان کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اس کے پہلے دور کی شاعری اس کے ذاتی غم کی آئینہ دار ہے اور اس کے فن کو محدود کئے ہوئے ہے ؎

وقف حرمان و یاس رہتا ہے
دل ہے اکثر اداس رہتا ہے
تم تو غم دے کے بھول جاتے ہو
ہم کو احسان کا پاس رہتا ہے

خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو
سکوں کی نیند تجھے بھی حرام ہو جائے
تری مسرت پیہم تمام ہو جائے
تری حیات تجھے تلخ جام ہو جائے
غموں سے آئینہ دل گداز ہو تیرا

(خدا وہ وقت نہ لائے)

یہ وہ زمانہ تھا۔ جب وہ سمجھتا تھا کہ اس کی محبوبہ کے دامن میں جنت کی رنگینیاں ہیں اور وہ اس کے راستے میں نگاہیں بچھاتا پھرتا تھا۔ فیض کی شاعری کے دوسرے دور میں اس کے مشاہدات اور احساسات نے رومانی دھند کے اس جال کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جس میں وہ گرفتار تھا۔ اس نے اپنے غم کو نظر انداز کر کے دنیا کے غم سے دلچسپی لینا شروع کی اور یہیں سے اس کا مخصوص رنگ ابھرتا ہے۔

اس کے فن میں یہ تبدیلی اس دور کے سیاسی اور ادبی شعور کے ردِ عمل کے طور پر پیدا ہوئی تھی۔ اس زمانے میں ہندوستان کی تاریخ ایک اہم مرحلے میں داخل ہو رہی تھی۔ انگریزی سامراج ہندوستان پر ہمیشہ کے لئے قابض رہنا چاہتا تھا لیکن چند عملی، ادبی اور سیاسی تحریکیں پورے زور شور اور جذبۂ عمل سے ابھر رہی تھیں کانگریس اور مسلم لیگ، دونوں بڑی جماعتوں کا موقف آزادیٔ کامل ٹھہرا، سیاسی اور ذہنی فضا برطانوی سامراج کے خلاف ہموار ہو گئی تھی۔ اسی زمانے میں چند طالب علموں نے جو انگلستان سے جدید علوم و فنون کی تعلیم اور نئے نظریات لے کر آئے تھے بعض قابلِ احترام بزرگوں کی رہنمائی میں ترقی پسند ادب کی تحریک شروع کی اس تحریک نے ادب کا مقصد واضح کیا۔ اس تحریک کا نعرہ تھا۔ کہ ادیب کو اپنے معاشرے کے مقاصد سے ہم آہنگ ہونا چاہیئے۔ اور بدلتی ہوئی اقدار کا ساتھ دینا چاہیئے۔

ان تیزی سے بدلتے ہوئے حالات سے گورنمنٹ کالج امرتسر کا ایک نوجوان اور رشیلا انگریزی کا لکچرار فیض احمد فیض بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اور ڈاکٹر رشید جہاں اور محمود الظفر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر خوابناک نظمیں سنانے والے شاعر کی تخلیقات میں دوسرے دلوں کی دھڑکنیں بھی شامل ہو گئیں۔ وہ خوابوں کی دنیا سے نکل آیا اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس نے دیکھا کہ اس کے اردگرد خوابوں کی پریاں نہیں ہیں، عارض و لب و گیسو کی جنت نہیں ہے بلکہ وہ بچے ہیں جنھیں بچپن کے معصوم زمانے میں ہی محرومی کا احساس ہے وہ ننگی بہنیں ہیں جنھیں سرمایہ کے قحبہ خانے میں نیلام کیا جاتا ہے۔ اور وہ بوڑھے ماں باپ ہیں جن کے جوان بیٹے آزادی مانگنے کے جرم میں جیلوں میں ٹھونس دیئے گئے ہیں۔ وہ چونک پڑا۔ اپنے عوام کی زبوں حالی دیکھ کر اس کا حساس دل تڑپ اٹھا۔

شاعر کے فن کو اس کے خیالات ہی سے قوت حاصل ہوتی ہے۔ فیض کے حقیقت پسند خیالات نے بھی اس کے فن کو با مقصد اور جاندار بنا دیا ہے "نقشِ فریادی" کے دیباچے میں اس نے لکھا ہے۔

"..... شعر لکھنا جرم نہ سہی لیکن بے وجہ شعر لکھنے
ایسی دانشمندی بھی نہیں ....."

یہیں سے فیض کی شاعری ایک نئے موڑ کی طرف مڑ گئی۔ اب وہ اپنی رومانی محدود فضا سے ایک لا محدود اور روشن فضا میں نکل آیا اس نے ایک نظم لکھی — ع "مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ" اور ایک شعر کہا — ع

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

اور یہ ایک نظم اور ایک شعر اس کی شاعری کا مرکز و محور بن گئے۔ اس نے لوگوں کے دلوں میں جہد و عمل کے دیئے روشن کئے اس کے اس دور کے شعروں کے مطالعے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت چونکہ اس کے احساسات پر تازہ تازہ چوٹ پڑی تھی اس لئے ان میں اس کا لہجہ قدرے تلخ اور شدید تھا ان میں جذباتیت کا اثر بہت زیادہ تھا۔ ع

جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت
شاہراہوں پہ غریبوں کا لہو بہتا ہے

یا کوئی تندکا بڑھتا ہوا سیلاب لئے
فاقہ مستوں کو ڈبونے کے لئے آتا ہے
آگ سی سینے میں رہ رہ کے ابلتی ہے نہ پوچھ
اپنے دل پہ مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے (رقیب)

چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز
ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پہ مجبور ہیں ہم
اور کچھ دیر ستم سہہ لیں، تڑپ لیں، رو لیں
اپنے اجداد کی میراث ہے معذور ہیں ہم
جسم پہ قید ہے جذبات پہ زنجیریں ہیں
فکر محبوس ہے گفتار پہ تعزیریں ہیں (چند روز اور)

ان نظموں میں نغمگی اور آہنگ کا عنصر دبا ہوا ہے۔ اسی طرح علامات اور تشبیہات و استعارات کا استعمال بہت کم ہے انداز بیان صاف اور سطحی ہے۔ البتہ یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ شاعر کی قوت بیان بہت بلند ہے دوسرے دور میں پہلے دور کی دو چیزوں یعنی آہنگ اور تشبیہات کی کمی پائی جاتی ہے۔ یہ دونوں چیزیں اس کے تیسرے دور میں پھر شدت سے ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ محرومی کا احساس جو پہلے دور کی رومانی شاعری میں تھا ختم ہو گیا۔ چونکہ وہ دور ایک ہنگامی دور تھا اس لئے فیض کے لب و لہجہ میں تلخی شدت سے پیدا ہو گئی تھی یا اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ چونکہ نیا نیا داخلیت سے خارجیت کی طرف مائل ہوا تھا۔ اس لئے اس میں جذباتیت آ گئی تھی دوسرے دور کی چند اور نظموں سے مری اس بات کی تائید ہوتی ہے۔ ع

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول زباں اب تک تیری ہے
تیرا ستواں جسم ہے تیرا
بول کہ جاں اب تک تیری ہے
دیکھ کہ آہنگر کی دکان میں
تند ہیں شعلے، سرخ ہے آہن (بول)

تیسرے دور میں فیض کا لہجہ گمبھیر اور پروقار ہے۔ اس کا مزاج معتدل نظر آتا ہے۔ اور جذبات سے بہت دور ہے۔ تشبیہات اور استعارات کا استعمال زیادہ ہے نغمگی کا عنصر شدید طور پر شامل ہو گیا ہے اور اب وہ صرف علامات سے ہی اپنی تمام بات سمجھانا چاہتا ہے۔ علامات اس کی شاعری کی خوبصورتی اور جان بن گئی ہیں۔ اس دور کی شاعری کا تمام تر انحصار علامات ہی پر ہے۔

ان میں لہو جلا ہو ہمارا کہ جان و دل
محفل میں کچھ چراغ فروزاں ہوئے تو ہیں

بہت سیہ ہے یہ رات لیکن
اسی سیاہی میں رونما ہے
وہ نہرِ خوں جو مری صدا ہے
اسی کے سائے میں نور گر ہے
وہ موجِ زر جو تیری نظر ہے
وہ غم جو اس وقت تیری باہوں
کے گلستاں میں سلگ رہا ہے
(وہ غم جو اس رات کا ثمر ہے)
کچھ اور تپ جائے اپنی آہوں کی
آنچ میں تو یہی شرر ہے۔

("ملاقات")

پہلے دور کی وہ چیزیں جو دوسرے دور میں دھندلی تھیں تیسرے میں ابھر کر سامنے آتی ہیں اور یہ چیزیں آہنگ اور محرومی کا احساس ہے۔ لیکن اب ان کی معنویت میں فرق آگیا ہے پہلے یہ احساس فرد کے انفرادی غم سے متعلق تھا۔ اب اس میں اجتماعی شعور بھی آگیا ہے اس دور میں فیض کا عشق پوری انسانیت سے متعلق ہے۔ "آجاؤ ایفریقا" ایرانی طلبا کے نام" "نثار میں" "ہم جو تاریک راہوں میں" "ایرانی طلبا اور صبح آزادی" میں اس نے دنیا کے مختلف ممالک کے مسائل کو رقم کیا ہے۔ اس دور کی نظموں اور غزلوں کے مطالعے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس کی شاعری وقت اور مقام کی حدود سے نکل کر ساری دنیا کے لئے وقف ہوگئی ہے۔

اس دور میں علامات کے خلاقانہ استعمال کی وجہ سے اس کی شاعری میں تنوع پیدا ہو گیا ہے۔ جو اس کی شاعری کی ایک بہت بڑی خصوصیت ہے آپ اسے غمِ جاناں کے معنی پہنا سکتے ہیں اور غمِ دوراں پر بھی منطبق کر سکتے ہیں۔ فیض محض اپنے اسلوب کی اسی خوبی کی وجہ سے اب تک کچھ نہ کچھ کہتا آیا ہے۔ حالانکہ پاکستان کے کتنے ہی شاعر منقار زیرِ پر بن گئے احتساب کی سخت پابندیوں کے باوجود وہ بڑی خوبی سے اپنا فرض ادا کرتا چلا آرہا ہے۔ ع

نہ سوالِ وصل نہ عرضِ غم نہ حکایتیں نہ شکایتیں
ترے عہد میں دلِ زار کے سبھی اختیار چلے گئے

اور وہ اب بھی کہہ رہا ہے۔ زندگی کو مسلسل حرکت دے رہا ہے اور محروم دلوں میں آس امید کے دیئے روشن کر رہا ہے۔

فیض کی شاعری کا چوتھا دور تین سال قبل شروع ہوا۔ یہ تمام عرصہ اس نے اپنے ملک سے باہر گذارا اس عرصے میں اس کی جتنی نظمیں ہمارے مطالعے میں آئی ہیں۔ ابہام کا شکار نظر آتی ہیں۔ علامات و استعارات حسین ہیں لیکن ان کی معنویت کا یقین کرنے میں دشواری پیش آتی ہے کہ ان کا موضوع داخلی ہے یا خارجی۔

ایسی نظموں کی ابتدا "چاند نے جھک کے کہا" سے شروع ہوتی ہے اس کے بعد "تیری سمندر آنکھیں" "پاس رہو" ——— "رنگ ہے دل کا میرے" اور دیگر کئی آزاد نظمیں یہ سب کی سب ایک ہی سلسلے میں لکھی ہیں اور یہ ایک ہی رنگ اور آہنگ میں ڈوبی نظر آتی ہیں۔ وہ خوابناک ماحول جو فیض کی ابتدائی شاعری میں نظر آتا ہے۔ ان نظموں میں عود کر آیا ہے جو

کو فرفرزی اور خوب صورت تشبیہات میں الجھا دیا گیا ہے۔ معلوم نہیں اس ذارکی کیا وجہ ہے۔ بہت ممکن ہے کہ فیض صاحب کوئی نیا تجربہ کر رہے ہوں یا پھر وہ سمجھتے ہوں اب نہ ایسا ادب تخلیق نہیں کر سکتے۔ جیسا کہ پہلے کرتے رہے ہیں اسی طرح کی ایک اور نظم ہے "رنگ ہے دل کا مرے" ملاحظہ کیجئے۔ ع

تم نہ آئے تھے تو ہر چیز وہی تھی کہ جو ہے
آسماں حدِ نظر، راہگزر، راہگزر شیشۂ مے شیشۂ مے
اور اب شیشۂ مے، راہگزر، رنگِ فلک
رنگ ہے دل کا مرے خونِ جگر ہونے تک
چمپئی رنگ کبھی، راحتِ دیدار کا رنگ
سرمئی رنگ کہ ہے ساعتِ بیزار کا رنگ
زرد پتوں کا، خس و خار کا رنگ
سرخ پھولوں کا دہکتے ہوئے گلزار کا رنگ
زہر کا رنگ، لہو رنگ، شبِ تار کا رنگ
آسماں، راہگزر، شیشۂ مے
کوئی بھیگا ہوا دامن، کوئی دکھتی ہوئی رگ
کوئی ہر لحظہ بدلتا ہوا آئینہ ہے
اب جو آئے ہو تو ٹھہرو کہ کوئی رنگ کوئی رت کوئی شے
ایک جگہ پر ٹھہرے۔۔۔

پھر سے اک بار ہر اک چیز وہی ہو کہ جو ہے
آسماں حدِ نظر، راہگزر، راہگزر شیشۂ مے شیشۂ مے

اس نظم کا مرکزی خیال یہ ہے کہ اب جو آئے ہو تو ٹھہرو کہ کوئی رنگ، کوئی شے، کوئی رت ایک جگہ پر ٹھہرے اور پھر سے ایک بار ہر چیز وہی ہو کہ جو ہے۔ لیکن مختلف کیفیات کو بار بار رنگوں سے تشبیہات دے کر خیال کو الجھا دیا گیا ہے۔ اسی قسم کی ایک اور نظم ہے "پاس رہو"

ان نظموں میں مٹھاس اور آہنگ تو بہت ہے لیکن یہ بات واضح نہیں کہ ان کا اطلاق داخلیت پر کیا جائے یا خارجیت پر۔
ان نظموں میں اس رنگ کے قائم ہونے کی وجہ شاید یہ ہے کہ اس نے یہ تین طویل سال وطن سے دور ایک ایسے اجنبی معاشرے میں گزارے ہیں جو ہم سے نسبتاً زیادہ خوشحال اور ترقی یافتہ ہے۔ وہاں اسے بالکل نئے ماحول، اجنبی لوگوں اور اجنبی روایات سے سابقہ پڑا اور اس کے وقت کا بیشتر حصہ یورپی دانشوروں اور اہلِ قلم کے ساتھ گزرا۔ جس کا اثر اس کی تحریروں پر بھی پڑا۔
بہرحال چوتھے دور کا تعین کرنے سے پہلے ہم خود فیض صاحب سے سوال کریں گے کہ کہیں ان کا یہ رنگ مستقل صورت تو اختیار نہیں کرتا جا رہا ہے۔ علامات و استعارات شاعری میں حسن پیدا کرتے ہیں لیکن جو علامتیں اور استعارے زندگی کی رفتار سے مطابقت پیدا

نہ کر سکیں ان کا حسن کس کام کا۔

فیض نے علامات کا استعمال اس کثرت سے کیا ہے کہ اس کا مقصد ان کے پیچھے پوشیدہ ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کے اشعار کی معنویت سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہمیں یہ بھی معلوم ہو کہ وہ کس نظریئے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے اگر کبھی کبھی فیض علامات کی راکھ کو کریدتا نہیں رہے گا تو اس بات کا امکان ہے کہ مقصد کے انگارے علامات کی راکھ تلے دبے دبے بجھ جائیں گے۔ لوگوں کے اذہان میں بار بار یہ بات آتی رہنی چاہیئے کہ فیض کی شاعری داخلی نہیں بلکہ خارجی مسائل کی مظہر ہے اور یہ صرف اس صورت میں ہو سکتا ہے جب فیض وقتاً فوقتاً ایسی نظمیں بھی کہتا رہے جس میں اس کا لہجہ واضح اور شدید ہو۔ بجائے اس کے کہ ناقابلِ فہم نظمیں کہی جائیں اور نئے لکھنے والوں کی پوری نسل کو مصلحت پسند بنا دیا جائے۔

فیض کو جنگ سے نفرت ہے اسے موجودہ ایٹمی دور کی ممکنہ تباہیوں کا علم ہے جس میں انسانی تہذیب کا تمام اثاثہ ختم ہو سکتا ہے اس نے امن کے لئے کام کیا ہے۔ اسے گندم کے کھیتوں، سفید درختوں، دلہنوں کے آنچلوں اور بچوں کے ہاتھوں سے محبت ہے وہ انھیں برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ جنگ کے دامن میں آگ، خون، تباہی، بربادی، اور آنسوؤں کے علاوہ اور کیا ہے۔؟ آج کا ہر با شعور شخص اس بات کو سمجھتا اور محسوس کرتا ہے۔ پچھلی جنگوں نے انسانیت کو بہت بڑا سبق دیا ہے۔ آج ناگاساکی اور ہیروشیما کی ایٹم زدہ خاک مفلوج اور بھیانک شکلوں والے بچوں کو جنم دے رہی ہے۔ یہ ہولناک تصور دنیا کے باسیوں کی قوتِ فکر کو ایک نئے موڑ پہ پہونچا سکتا ہے۔ جہاں امن، خوشحالی، خوشی، میل ملاپ اور تابندگی ہے اور جہاں مکر و فریب، دغا، خونخواری، دکھ، حسد اور تباہی و غارتگری کا کوئی مقام نہیں ہے۔ اس ہولناک تصور کو ادیب اور شاعر بہتر طور پر پیش کر سکتے ہیں اور عوام کو امن و آشتی کی راہ پر گامزن کر سکتے ہیں۔

جس طرح امریکہ کے ہمینگوے، برطانیہ کے برٹرینڈ رسل اور ہندوستان کے کرشن چندر نے اس سلسلے میں اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کیا ہے۔ فیض پاکستان سے اس صف میں نمائندگی کر رہا ہے یہ اور ان کے دیگر ساتھی ان قوتوں کی شدید مذمت کرتے ہیں جو صرف اپنی ہی بقا کی خاطر دنیا کو جنگ کی بھٹی میں جھونکنا چاہتے ہیں۔ یہاں اس بات کی وضاحت کر دی جائے کہ جنگ، غارتگری اور خون خرابے کا ہی نام نہیں ہے اور امن کے معنی اس سے بچاؤ نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کے عوام خوش رہیں اور ان کے مادی مسائل حل ہو جائیں اور دکھ درد اور تکالیف کا خاتمہ ہو جائے۔ جیسا کہ فیض نے لینن پیس پرائز حاصل کرتے وقت کہا تھا

"...... جس تمنا اور آدرش کے ساتھ مجھے اور میرے ساتھیوں کو وابستگی رہی ہے یعنی امن و آزادی کی تمنا وہ بجائے خود اتنی عظیم ہے کہ اس کے واسطے سے ادنیٰ اور حقیر کارکن بھی عزت و اکرام کے مستحق ٹھہرتے ہیں...... یوں تو ذہنی طور پر جنونیوں اور جرائم پیشہ لوگوں کے علاوہ سبھی مانتے ہیں کہ امن اور آزادی بہت تابناک ہیں اور یہ بھی تصور کر سکتے ہیں کہ امن گندم کے کھیت ہیں۔ سفیدے کے درخت دلہن کا آنچل اور بچوں کے ہنستے ہوئے ہاتھ۔ شاعر کا قلم اور مصور کا موئے قلم!!" ....

یہ تمام باتیں اس لئے لکھی گئی ہیں کہ یہ غلط فہمی پیدا نہ ہو کہ فیض نے تو آج تک جنگ کے موضوع پر کوئی چیز نہیں لکھی۔ اس کی

پوری شاعری کا موضوع امن، محبت اور آزادی ہے۔ اور امن کے معنی دنیا کے عوام میں خوشحالی پھیلانا ـــــ قدرت کے بے بہا ذخائر پر سے بعض طبقوں کی اجارہ داری کا خاتمہ کرنا ہے۔ خوشیوں میل ملاپ اور محبت کو پھیلانا ہے۔ اور امن محبت اور آزادی اس وقت تک عام نہیں ہو سکتے جب تک کہ ان تخریب پسند قوتوں کو شکست نہ دی جائے جو زمین کے ٹکڑوں کو بانٹنے کی کوشش کرتی ہیں اور انسانوں کی ٹولیوں پر اپنا سکہ چلانے کی کوشش کرتی ہیں۔

ہم یہ بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ فیض کی پوری شاعری اس خواہش کی آئینہ دار ہے کہ دنیا میں امن قائم ہو، انسانی تہذیب ختم نہ ہونے پائے اور زندگی کی بنیاد وہی ٹھہرے جس کی تلقین حافظ شیرازی نے کی تھی۔ ظلم و ناانصافی اور غلامی کے محرکوں کو نہ روکا گیا تو زندگی اپنی تمام ویرانیوں سمیت موجود رہے گی۔ اور جذبہ اور عمل کے بغیر حافظ کا مذکورہ بالا شعر تشنہ رہے گا۔ منزل شوق تک پہونچنے کے لئے ہر ہر قدم پر مخالف قوتوں کے سامنے سینہ سپر ہونا پڑے گا۔ ؎

اٹھو سب خالی ہاتھوں کو
اس رن سے بلاوے آتے ہیں

فیض کا دل ایک دردمند دل ہے۔ جو ہر ظلم پر چیخ اٹھتا ہے۔ خواہ وہ دنیا کے کسی کونے میں ہوا ہو وہ آزادیٔ انسان کا علمبردار ہے۔ زمانے کی تاریخ پر اس کی کڑی نظر ہے۔ ایران میں حق پرست طالب علموں پر مظالم ڈھائے جاتے ہیں تو اس کا قلم ان قدامت پرستوں کے خلاف حرکت میں آجاتا ہے۔ جو ان شوخ سجیلے جوانوں پر مظالم روا رکھتے ہیں۔ افریقہ میں سیاہ فام باشندوں کی تحریک آزادی کو کچلنے کی کوشش کی جاتی ہے تو حریت پسند فیض اس کے خلاف اپنی آواز بلند کرتا ہے۔

فیض کو یقین ہے کہ وہ تحریکیں جن کی بنیادیں سچائی پر استوار ہوں کبھی نہیں دب سکتیں تاریخ کے بڑھتے ہوئے دھارے کو کوئی نہیں روک سکتا۔ ایک آواز جب چاروں طرف پھیل کر لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیتی ہے تو وہ پھر کبھی نہیں دب سکتی۔ ایک چراغ بجھے گا تو سینکڑوں چراغ جل اٹھیں گے، ایک آواز دبے گی تو سینکڑوں آوازیں ابھریں گی ؎

قتل گاہوں سے چن کر ہمارے علم
اور نکلیں گے عشاق کے قافلے

فیض کی پوری شاعری جنگ کے خلاف احتجاج ہے۔ اس لئے اگر اس نے اس موضوع پر براہ راست کوئی نظم نہیں لکھی تو اس کے معنی یہ نہیں کہ امن کے قیام کے سلسلے میں اس نے کچھ نہیں کیا۔ ہو سکتا ہے کہ اس موضوع پر کوئی بڑی نظم کسی نئی تکنیک کے ساتھ فیض کے ذہن میں کسی خانے میں محفوظ ہو اور نہ جانے کس دن وہاں سے نکل کر کاغذ پر منتقل ہو جائے۔

تمام ترک اسلحہ اور امن کی عالمی کانفرنس کے دوران جو ۱۹۶۲ کی گرمیوں میں ماسکو میں ہوئی تھی ماسکو کے مشرقی ادب کے شعبے کی طرف سے ایک کتاب شائع کی گئی تھی ـــ "شاہراہ امن پر" اس کتاب میں ایک باب "فیض احمد فیض" پر بھی تھا۔ ذیل کا اقتباس اسی کتاب سے لیا گیا ہے۔

..... فیض کی نظموں کا ایک ایک حصہ جگمگاتی ہوئی مشعل
ہے جس کی روشنی میں انسانوں کی بے انصافیاں اور ستم کاریاں
صاف نظر آتی ہیں۔ ہر مصرع ایک ستارہ جو روشنی اور ترقی کی
راہ دکھاتا ہے۔ فیض کے دل میں نہ خوف ہے اور نہ تذبذب وہ

شاعرانہ صلاحیتوں سے مالا مال شاعر ہی نہیں بلکہ اپنے عوام
کی آزادی کا ایک بہادر اور دلیر سپاہی بھی ہے۔ ظلم و ستم
کا انتھک دشمن ان تمام لوگوں کا ہمدم ہے جو اس دھرتی پر
امن کے خواہاں ہیں۔ جو بنی نوع انسان کے لئے امن
چاہتے ہیں ....''

فیض اُردو کے ان خوش قسمت اہل قلم میں سے ایک ہے ۔ جسے اپنی زندگی ہی میں عالمگیر شہرت حاصل ہوئی ہے۔ دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کے کلام کا ترجمہ ہو رہا ہے۔ روس اور چیکوسلاکیہ میں وہ پہلے ہی مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ روس کی لوممبا یونیورسٹی میں اس کی شاعری پر ریسرچ کا کام ہو رہا ہے۔ ایک روسی ادیب گالیوف نے فیض کی شاعری کو ان الفاظ میں سراہا ہے۔

''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فیض کی نظمیں ہمالہ کے اوپر سے
پرواز کرتی ہوئی آئیں اور ان کے ملک سے دور کے لوگوں
کے دلوں میں اتر گئیں ...''

روس کے ایک اور ممتاز شاعر اور سوویت امن کمیٹی کے صدر تخونوف نے فیض کے کلام کو اس طرح بیان کیا ہے؛

''فیض کے ہاتھ میں دلوں اور امنگوں کی مشعل ہے جو ایک
ایسی راہ روشن کرتی ہے جس پر آگے بڑھنا ہے۔ جس پر
چلتے ہوئے جد و جہد کرنی ہے اور اس راہ پر چلنے والوں
میں نہ ظلم و ستم کا ڈر ہے اور نہ موت کی پروا .....''

اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے سو گزری
تنہا پسِ زنداں کبھی رسوا سرِ بازار (زرد مشق)

فیض کی فنی صلاحیتوں سے یقیناً کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ آج مخالفین کو بھی یہ بات تسلیم کرنا پڑتی ہے کہ ندرت بیان اور الفاظ کی ہم آہنگی پر عبور رکھنے والا اس جیسا کوئی شاعر موجود نہیں ہے۔ اس کے انداز کی خوب صورتی اور بلند تخیل کے سبھی قائل ہیں جنھیں اس سے نظریاتی اختلاف ہے وہ بھی اس کے اشعار کی بڑائی کو مانتے ہیں۔ فیض کا گمبھیر، سنجیدہ، متین اور پروقار لہجہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کی شاعری کو ''توڑ پھوڑ کی شاعری'' کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں فنی صلاحیتیں کوٹ کوٹ کر بھری ہیں۔ اس نے اپنا موجودہ مقام زبردست علمی اور ادبی محنت کے بعد حاصل کیا ہے۔ اس کی شاعری اپنے اندر گہری معنویت لئے ہوئے ہے۔ اس کے پاس الفاظ کا بے پناہ ذخیرہ ہے۔ اور موزوں لفظ منتخب کرنے کی صلاحیت بھی ہے۔ ماحول کا گہرا مشاہدہ اور اس کے ساتھ ساتھ بلند شاعرانہ تخیل بھی ہے اس کا انداز بیان سطحی نہیں ہے بلکہ وہ اپنے قاری پر اپنے تمام احساسات نقش کر دینا چاہتا ہے یا دوسرے الفاظ میں اس کا مقصد ذہنی بیداری ہے اور وہ اپنے مقصد میں کہاں تک کامیاب ہوا ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے۔ کہ اس کا مندرجہ ذیل مصرعہ حق پرست نوجوانوں کی زبان پر ضرب المثل کی حیثیت سے چڑھ گیا ہے۔ ع

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا

فیض آج اردو کا سب سے بڑا شاعر ہے نہ صرف اپنی ادبی اور علمی عظمت کی وجہ سے بلکہ اس لئے بھی کہ وہ موجودہ زمانے کے ایک عظیم

نظریئے کی تبلیغ میں ایک اہم کردار انجام دے رہا ہے، دنیا کی خوشحالی، امن اور آزادی کا کام کر رہا ہے۔

اور جس دن فیض کے یہ حسین خواب حقیقت کا روپ دھار لیں گے۔ اس دن اس کی شاعری عوام کی زندگی کے دلکش پہلوؤں کی ترجمان بن جائے گی۔ آج اس کی زبان پر زمانے کی بے انصافیوں کے ردِ عمل میں تلخی ہے لیکن جب یہ بے انصافیوں کا دور ختم ہو جائے گا تو اس کے ہونٹوں پر محبت کے گیت لہراتے لگیں گے۔ آج فیض محبت کے ان ہی گیتوں کو گانے کے لئے بے چین ہے۔ وہ اس دن کا منتظر ہے جب اسے زمانے کی تلخ حقیقتوں کو بے نقاب کرنے کا ناخوشگوار فرض انجام نہیں دینا پڑے گا۔ اور اسے اپنی محبوبہ سے یہ کہہ کر بے التفاتی نہیں برتنا پڑے گی کہ

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

اس حسین اور جواں دور کے لئے جب دنیا کے دکھ درد اس کے پیروں میں زنجیریں نہیں ڈال سکیں گے وہ ہر قسم کی قربانی دینے کے لئے تیار ہے اور اسے احساس ہے کہ اس کی محبوبہ خوابوں کے جھروکوں میں اپنے رسیلے ہونٹوں اور گلابی عارضوں کی جنت لیے اس کا انتظار کر رہی ہے۔ لیکن اس کا فن وقت کا ساتھی ہے۔ اگر گندم کی سنہری بالیاں لہو میں ڈوبی رہیں اور بچوں کے کومل ہاتھ قلم کئے جاتے رہے تو وہ بھی اپنی شاعری کا موجودہ موضوع برقرار رکھنے پر مجبور رہے گا۔

لب پہ ہے تلخیٔ مئے ایام ورنہ فیض
ہم تلخیٔ کلام پہ مائل ذرا نہ تھے

فیض۔ غمِ جاناں سے غمِ دوراں تک

(صفو ۲۰ سے آگے)

نہیں میں۔ سمن و گلاب کو جس چاہت سے یاد کیا اسی چاہت اور تفصیل سے اس بدحال، بدنصیب کا ذکر نہیں ہے جس نے سمن و گلاب کو اپنے خونِ جگر سے سینچ کر شاداب کیا ہے اور جس کو حق پہونچتا ہے کہ وہ بھی ان سمن و گلاب کی نزاکتوں، رنگ روپ اور عطر بیزیوں سے مستفید ہو سکے۔ ان کا دل تو ادھر کھنچا جا رہا ہے لیکن

لغزشِ پا میں ہے پابندیٔ آداب ابھی

اُن کی شاعری کو ڈرائنگ روموں، اسکولوں، کالجوں سے نکل کر سڑکوں، بازاروں، کھیتوں اور کارخانوں میں ابھی پھیلنا ہے:

فیض کی شاعری کے اس پہلو پر میجر اسحٰق کا یہ تبصرہ چونکا دینے والا ضرور ہے لیکن بڑا بھرپور ہے۔ اور پوری تنقیدی دیانت داری پر مبنی ہے۔ اس حقیقت سے فیض بھی انکار نہیں کر سکتے کہ ان کی شاعری انٹلیکچوئل (Intellectual) طبقے تک محدود ہو گئی ہے۔ اس میں کسان اور محنت کش عوام کے لئے کچھ نہیں۔ فیض سے کسان اور محنت کش عوام کے کچھ مطالبے ہیں دیکھنا یہ ہے کہ فیض انہیں کیا دیتے ہیں۔

امجد کندیانی

فیض

فکر و فن کے آئینے میں

فیض بنیادی طور پر تاثرات و احساسات کے شاعر ہیں۔ اُن کی شاعری میں مقصدیت ہے۔ لیکن وہ اپنی شاعری کو مقصد کی تشریح و تفسیر کا ذریعہ نہیں بناتے۔ بلکہ مقصد سے متعلق حالات و واقعات کو اپنے تاثر کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ موجودہ نظامِ معاشرت میں روا رکھی جانے والی ناانصافیوں کا ذکر کر کے وہ اپنا تاثر بیان کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے فیض اردو کی مقصدی شاعری کی ساری تاریخ میں منفرد حیثیت رکھتے ہیں کہ اُن کا فن اُن کے پروگرام کی تشریح نہیں ہے۔ بلکہ اُن کے داخلی احساسات، اُن کے جذبات، اُن کی آرزوؤں اور تمناؤں کا آئینہ دار ہے۔ ایک ایسے حسین مستقبل کا آرزومند ہے جس میں آرام ہوگا، سکون ہوگا۔ محبت اور مسرت کی فراوانی ہوگی اور انصاف اور شرافت پروان چڑھیں گے جہاں ظالم اور مظلوم کے طبقے نہیں ہوں گے ـــــ!

احساسات کا شاعر ہونے کی حیثیت سے فیض کے ہاں سب سے نمایاں چیز حق پر باطل کے ظلم و ستم کا [illegible] احساس ہے۔ اس احساس کی وجہ سے اُن کے اسلوبِ بیان میں بھی ایک طرح کی افسردگی، دل گرفتگی اور دردمندی کی شان پیدا ہو گئی ہے۔ دردمند شاعر ہونے کے باوجود اُن کی [illegible] مغموم سی ہے۔ وہ جب بھی دستِ ستم کی خوں فشانی دیکھتے ہیں تو درد کی لہروں میں بہہ جاتے ہیں اور اُن کی زبان سے ایک احتجاج کی صدا نکلتی ہے، جس کا آہنگ زیادہ [illegible] ہے مگر اُن کو حق کی کامیابی کا پورا یقین ہے اور اُن کی شاعری کی روح اُن کے مستقبل سے وابستہ ہے۔ [illegible] اگر مستقبل کا خواب اور اس کا سہانا منظر چھین لیا جائے تو اُن کے پاس کچھ بھی نہیں رہ جائے گا۔ [illegible] وہ جہاں موجودہ حالات پر تبصرہ بھی کرتے ہیں تو مستقبل کی اُمید اُن سطور میں جھلکتی رہتی ہے۔ یہی وہ ہے جسے میں فیض کی انفرادیت کہنا چاہتا ہوں۔ زیادہ واضح الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ وہ "آج" کی حالت کو اپنے ذہنی اور جذباتی ردِ عمل کی روشنی میں بیان کرتے ہیں اور "کل" کی دل فریبیوں کی تمنا کرتے ہیں۔ انسانی درد اور اُمید ـــــ یہ اُن کی شاعری کی روحِ رواں ہے۔ وہ انقلاب کے خواہاں ہیں مگر انقلاب کا نعرہ نہیں لگاتے بلکہ انقلاب کا گیت گاتے ہیں۔ وہ ہیجان کی راہ اختیار نہیں کرتے، متانت اور سکون کا دامن پکڑتے ہیں۔ وہ نغمہ و شعر کو رزم و پیکار سے الگ کرنے کے قائل نہیں ہیں۔ [illegible] "آہنگ" کا دیباچہ لکھتے ہوئے کہتے ہیں۔

"ہمارے بیشتر شعراء نے اِن عناصر (ساز، جام، شمشیر) میں ایک فرضی تضاد کی دیواریں کھڑی کر رکھی ہیں۔ کوئی محض ساز و جام کا دلدادہ ہے تو کوئی فقط شمشیر کا دھنی۔ لیکن کامیاب شعراء کے لئے (آج کل کے زمانے میں) شمشیر کی صلابت اور ساز و جام کا گداز دونوں ضروری ہیں ع. ملِ بری با قاہری جادوگری است :

آخر میں کہتے ہیں یہ عام انقلابی شاعر انقلاب کے متعلق گرجتے ہیں، للکارتے ہیں، سینہ کوٹتے ہیں، انقلاب کے متعلق گا نہیں سکتے "

فیض صاحب انقلاب کا گیت گاتے ہیں۔ اُن کا تصور انقلاب نغمۂ ہزار اور رنگینیٔ بہار سے عبارت ہے۔ طوفان برق و رعد سے نہیں اس کا سبب اُن کی طبعی رومان پسندی ہے۔ اُن کی افتاد طبع ہی ایسی ہے کہ وہ ہیجان انگیز حالات کی تمنا نہیں کر سکتے۔ خواہ یہ ہیجان کتنے ہی پُرسکون مستقبل کا نقیب کیوں نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری میں مقصد کا ذکر صراحت سے کبھی نہیں کیا ہمیشہ اسے رمزیت اور اشاریت کے پردوں میں چھپا دیا ہے۔ اور زندگی کے تلخ حقائق کو بیان کرنے کے لئے رومان کے دلفریب استعارے استعمال کرتے ہیں۔ وہ سختیاں جھیلتے ہیں۔ حق کی راہ میں مصائب سہتے ہیں مگر اُن کا لہجہ کبھی درشت نہیں ہونے پاتا۔ طنز کا نشتر فیض کے ہاں مشکل ہی سے ملے گا۔ وہ دعا دے سکتے ہیں ؂

دیارِ یار تیری جوششِ جنوں پہ سلام
جلال فرقِ سر دار کو نظر نہ لگے

اُن کا ترنم سے بیان رفاقت تہ سنگ آمد کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ طنز کا صرف ہے ع
ملا خدا کو بھول جا بارگہِ ناز میں

فیض اپنے مقصد کی محبت میں اس قدر کھو جاتے ہیں کہ انھیں خود اس مقصد کا احساس نہیں ہوتا۔ اور یہی ان کی پیمبری "معراج" ہوتی ہے۔ ان سب حقائق کے باوجود فیض کی شاعری میں ایک کمی کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ انہوں نے ابہامیت اور اشاریت کا اتنا زیادہ استعمال کیا اور ہر لمحاتی واقعہ کو ابدیت دینے کی اتنی زیادہ کوشش کی ہے کہ ان کے یہاں اپنے نظریۂ حیات کے اصول واضح اور نمایاں طور پر نظر نہیں آتے۔ اقبال کی طرح وہ ہمیں اپنے نظام سے آگاہ نہیں کرتے۔ اگر یہ کہا جائے کہ فیض صاحب ایک خاص قسم کی ادبی تحریک سے وابستہ ہیں اور اس تحریک کا مشترک نصب العین ان کے بھی پیش نظر ہے۔ تو اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ فیض صاحب کی شاعری اس تحریک کا ضمیمہ ہو کر رہ گئی ہے یا محض ایک تتمہ حالانکہ ایک بڑا شاعر خواہ کیسے حالات میں کیوں نہ ہو۔ اس کی بلند و بالا شخصیت اپنی انفرادیت قائم رکھتی ہے۔ اور اس کے کلام میں ہمیں اس کے نظریۂ حیات کی وضاحت شعر کی زبان میں ملتی ہے۔ اس کے یہاں فکر و جذبہ ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ وہ محض تاثرات کو کافی نہیں سمجھتا۔ مثال کے طور پر اقبال اسلامی نظریۂ حیات کے شاعر ہیں مگر اُن کی شاعری اسلام کے اصولوں کا بیان یا ضمیمہ نہیں۔ بلکہ بجائے خود اسلام کی شاعرانہ اور تخلیقی تفسیر و تشریح ہے۔ پھر یہ بھی نہیں کہ اقبال محض مفکر ہوں وہ جذبے کے شاعر بھی ہیں۔ اُن کے خطبات اور بالِ جبریل کی زبان میں دو دنیاؤں کا فرق ہے۔ نصب العین اور نظریے کے اعتبار سے وہ کافی حد تک روحانی یعنی مثالیت پسند واقع ہوئے ہیں اور فیض بھی رومانی ہیں۔ لیکن اقبال نے اپنے تصورات کو شاعری میں بھی ایک فکری نظام کی طرح پیش کیا ہے (جس میں کہیں کہیں تضاد بھی) مگر [illegible] ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک مقصد شاعر ہونے کی حیثیت سے نہ صرف اقبال کے مقابلے میں بلکہ خود فیض کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے اُن کا CANVAS محدود ہے۔ ابھی اسے اور وسیع ہونا ہے۔ ابھی تنوع کی ضرورت ہے۔ ابھی فیض صاحب کے فن میں اقبال کی سی گہرائی بھی نہیں آئی ہے۔ "کتے" غالباً اقبال کی نظم "طارق کی دعا" سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ اقبال کہتے ہیں ؂

یہ غازی یہ تیرے پُراسرار بندے — جنھیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی

دونیم ان کی ٹھوکر سے دریا و صحرا　　　سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

اور فیض کی نظم یوں شروع ہوتی ہے۔ ؏

یہ گلیوں کے آوارہ بے کار کتے　　　کہ بخشا گیا جن کو ذوقِ گدائی

زمانے کی پھٹکار سرمایہ ان کا　　　جہاں بھر کی دھتکار ان کی کمائی

دونوں فن کاروں نے جس طبقے کا ذکر کیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک ہی طبقہ ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایک مفلسی کی حالت میں ہے اور دوسرے نے خود آگہی کی بدولت درد سے اندوختہ پڑا ماتا ہے۔

فیض جذبے کی شدت اور بے پناہ خلوص کی وجہ سے اکثر تقدیر جاتے ہیں کہ فکر کا پہلو بہت دھندلا اور مبہم ہو جاتا ہے اس لحاظ سے وہ اقبال کی نسبت میر سے زیادہ قریب ہیں۔ میر کے ہاں جو دردمندی کا فلسفہ (اگر سے فلسفہ کہہ سکتے ہیں) ملتا ہے اس کی جھلک فیض کے ہاں بھی ہے۔ میر صلح کل طبیعت رکھتے تھے اور عمارت دل و درویش کی بنیاد رکھنے کے قائل۔ ان کا نظریہ تھا کہ کوئی شخص خواہ درجہ پو حلقۂ زنان ہو یا زنار میں تیرا رہے ایک بات کا ہمیشہ خیال رکھے کہ کسی کے درپے آزار نہ ہو۔ جبھی میر ظلم سہہ جانے کی دعوت بھی دیتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی ہر ایسے عمل سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں جس سے ان کی شخصیت پر دوسروں کی کا الزام آئے وہ مصائب کو مردانہ وار جھیلتے ہیں ؎

جب تک کڑی اٹھائی گئی ہم کڑے رہے　؏　ایک ایک سخت بات پہ برسوں اڑے رہے

فیض کا مزاج بھی اس دردمندی سے زیادہ مختلف نہیں، فیض بھی ظلم و ستم سہہ جانے ہی کو پسند کرتے ہیں غم کو جی میں مار رکھنے کا انداز ہے۔ (انہیں شکایتِ ہجراں ....) دلدہی تسلی اور دلاسے کا مشفقانہ اسلوب ہے۔ لیکن موجودہ زمانے کے معاشرتی تقاضوں کے پیشِ نظر وہ میر کی طرح تہہ درویش برجان درویش کے قائل نہیں۔ بلکہ ظالم کو ظلم کی سزا بھی دینا چاہتے ہیں۔ سامراج کا تخت گرانے اور تاج اچھالنے کی ہمت رکھتے ہیں اور اس ہمت کی آمیزش سے وہ میر کی دردمندی کو زیادہ صحت مند بنا دیتے ہیں۔

اسلوب کے لحاظ سے بھی فیض میر سے زیادہ قریب ہیں۔ دونوں کی لے حزنیہ ہے۔ دونوں میں بے پناہ سپردگی، والہانہ ربودگی اور خود کو مطلوب کی لگن میں کھو دینے کا انداز ہے۔ اور ہمیشہ اسے پالینے کی امید دل میں درخشاں رہتی ہے۔ گو کبھی کبھی رقت کی مزید اضطراری حالت میں اس کی لو مدھم کر دیتی ہے۔ اور ؏　بہت سعی کیجے تو مر رہیے میر

یا آخری خط، یاس، تنہائی، مرگِ سوزِ محبت کے نغمے لبوں سے پھوٹ بہتے ہیں لیکن یہ اضطراری جذبہ نہ میر کے ہاں اور نہ فیض کے ہاں مستقل رجحانِ طبع کی صورت اختیار کر سکتا ہے۔ رجحانِ طبع تو وہی سپردگی ہے کہ ؏

وہ جو خنجر بکف نظر آیا　　　میر سو جان سے نثار ہوا

یا ؎ نثار میں تیری گلیوں پہ اے وطن　　　یا سرک خانۂ ویراں کی تیرگی پہ سلام

یا پھر پاسِ عزت داراں کا جذبہ ؎

کوہکن و مجنوں کی خاطر دشت و کوہ میں ہم نہ گئے　　　عشق میں ہم کو میر نہایت پاسِ عزت داراں ہے

اور رقیب سے ؎　　　آ کے وابستہ ہیں اس حسن کی یادیں تجھ سے

البتہ عشق کے سلسلے میں دونوں میں بڑا فرق ہے۔ میر کا دل سمندر ایسا گہرا تو ہے مگر پہاڑوں کی طرح وسیع نہیں۔ وہ تو اتنا چھوٹا سا مندر ہے کہ اس میں فقط ایک بت سما سکتا ہے، ایک پری تمثال کا کہ از عزیزانش بود! فیض کے ہاں عشق دو ہیں ایک ملکی کا اور دوسرا

لیلائے وطن کا فیض نے وطن سے بالکل اسی انداز میں عشق کیا ہے جیسے کسی حسینہ سے کیا جاتا ہے۔ وطن کو ایک عورت فرض کر کے اس سے نسائی حسن کی تمام صفات وابستہ کر دی ہیں۔ وہ ایک الہڑ سی صورت میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ اس کی مانگ ستاروں سے بھری ہے اور اس کے ماتھے پہ افشانِ خاکِ مدفن ہے اور اس کے گنگھریالے اور جھومر ہے اور اس کا شہپر ہے اور اس کے بے شمار نام ہیں لا زوال نام، گشت، روپ کبھی وہ وطن ہے، کبھی بیتیں، کبھی غم جاناں، کبھی خود زندگی اور کبھی وہ آزادی کی "سانولی" جس نے ابھی گھونگھٹ نہیں کھولا ہے۔

اردو شاعری کی روایت میں وطن کو حسینہ تصور کر کے اس سے عشق کرنے کی یہ پہلی مثال ہے۔ حتیٰ کہ مجاز جیسا رومانی شاعر بھی ساز، جام اور شمشیر کو یکجا کرنے کے باوجود یہ اچھوتا خیال پیش نہ کر سکا۔ ہمارے متقدمین نے لکھنوی مرثیے کے دور میں گھوڑے اور تلوار میں تو انسانی عشق کی سی محبوبانہ صفات پیدا کر دی تھیں مگر وطن کو اس رنگ میں دیکھنے کی صلاحیت ان میں ابھی نہیں تھی یہاں مجھے روسی زبان کا شاعر یاد آتا ہے۔ وہ انقلابی دور کا پہلا نے طرز کا شاعر ہے اس کا عشق بھی کچھ اسی قسم کا ہے۔ اس نے "خوب صورت عورت" اور "اجنبی عورت" سے بے نیاز ہو کر روس کو لیلیٰ بنا لیا۔ مگر اس نے روس کو دنیا دار اور ظالم عورت کی شکل میں پیش کیا ہے۔ ایک نظم میں وہ اسے ساری اخلاقی پستیوں کا الزام دیتا ہے۔ اس کے دل کو کمینگی سے آلودہ بتاتا ہے۔ اور پھر کہتا ہے

مگر اس صورت میں بھی اے روس　　تو مجھے دنیا کے ہر ملک سے زیادہ عزیز ہے

لیکن بلوک بھی ذہنی سطح کے اس معیار تک نہیں پہنچتا ہے جہاں فیض ہیں۔ بلوک انسانی عشق کو ترک کر کے دوسرا عشق اختیار کرتا ہے۔ جب کہ فیض کے ہاں دونوں عشق شانہ بشانہ ہیں پھر بلوک کی لیلائے وطن ظالم و جابر اور بد اخلاق ہے اور بقول اس کے کمینہ صفت ہے۔ جب کہ فیض اپنی محبوبہ کو ایسی گالیاں نہیں دیتے۔ یہ تو مظلوم ہے۔ ستم رسیدہ ہے۔ یہ تو پریشان حال ہے — یہ تو دستِ عاشق کی منتظر لگ جاتی ہے۔ اور دلدہی کی طلبگار۔ یہ اعتدال فیض کی متوازن طبیعت کا کمال ہے۔ اور ان کی طبعی رومان پسندی کا نتیجہ — !

فیض کی رومانیت بڑی باوقار، متین اور بڑی رفیع SUBLIME ہے۔ ایک رومانی کی حیثیت سے ان کے کلام میں خود مرکزیت شروع سے آخر تک ہے۔ گلشن انا میں نرگس خرامی وہ سدا کرتے ہیں۔ اور کسی کو چاہتے بھی ہیں تو اپنے لئے۔ ع

اپنی تکمیل کر رہا ہوں میں　　ورنہ تجھ سے تو مجھ کو پیار نہیں

محبوب سے محبت یا وطن سے الفت یا اپنے نظریۂ حیات سے دل بستگی، ان سب کے بیان میں ان کی خود مرکزیت کا طلسم جگمگاتا رہتا ہے اور چراغِ تہِ دامن لو دیتا رہتا ہے انھیں ایک سچے رومانی کی طرح زندگی کی محرومیوں کا بہت احساس ہے۔ اسی لئے تو وہ پیار کر کے اپنی تکمیل کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن جب ایک خواہش کی تسکین ہو جاتی ہے۔ تو وہ دوسرے پہلو سے اپنے حرماں کے غم کو جگا لیتے ہیں اور وہ اس غم سے پریشان نہیں، اس سے گریزاں بھی نہیں۔ یہی غم ان کے یہاں تخلیق کا باعث بنتا ہے۔ اور وہ اس غم کو آخر تک سینے سے لگائے رکھنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ اسی سے تو وہ پرورشِ لوح و قلم کرتے ہیں۔ وہ اس غم سے نفرت نہیں کرتے لیکن ان کا رومان ایک ایسے حسین مستقبل کا تمنائی ضرور ہے جو غم سے پاک ہو۔ ایک ایسا مستقبل جہاں آرام و سکون ہو، اور جہاں مسرتوں کے پھول کھلیں اور جہاں انوارِ محبت کی ضیا پاشی ہو۔ اور گلہائے انبساط کی تمازت ہو۔ وہ مقصدی شاعر ہیں لیکن ان کے یہاں مستقبل کا تصور خالصتاً رومانی ہے۔ اور پھر انہوں نے اپنی شاعری کو مستقبل سے اتنا زیادہ وابستہ کر دیا ہے کہ رومان حقیقت پر غالب آ جاتا ہے۔

فیض کی مقصدیت، رومانیت اور عشق کا جائزہ لینے کے بعد اور اقبال و میر سے موازنہ کرنے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے فکری ارتقاء پر روشنی ڈالی جائے۔ فیض نے اپنے فکری ارتقاء کو خود یوں بیان کیا ہے ؎

مقامِ فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں　　　جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ رومان سے حقیقت کی طرف آتے ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ نظیر صدیقی نے کہا ہے کہ وہ رومان سے رومان اور حقیقت کے سنگم کی طرف آئے۔ یہ بات اگرچہ صحیح ہے لیکن زیادہ واضح نہیں ہے۔ اس سے تو آغاز و انتہا کی طرف ہلکا سا اشارہ ہو جاتا ہے۔ فکری ارتقاء پر کوئی روشنی نہیں پڑتی ہے۔ کسی شخص کی "فکر" صرف رومان اور حقیقت ہی پر مشتمل نہیں ہوتی اس کے اور بھی کئی پہلو ہوتے ہیں چنانچہ فیض کے یہاں بھی ایسے کئی پہلو ہیں۔

"نقشِ فریادی" کے حصہ اول میں فیض خالص رومانی شاعر ہے۔ جذبات کی رو میں بہہ جانے والے۔ اضطراری کیفیات پر شعر کہنے والے اس کتاب کے دوسرے حصے کی پہلی نظم "مجھ سے پہلی سی محبت میری محبوب نہ مانگ" میں محبت کو ترک کر کے غمِ دوراں کی طرف التفات کرتے ہیں لیکن ان کا لب و لہجہ ایسا ہے جس سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ ترکِ الفت کو مجبوری سمجھتے ہیں چنانچہ جب ان کے ذہن پر رومان کی پرچھائیں ہیں رہتیں تو وہ "سوچ" جیسی بے لطف نظم لکھتے ہیں اس نظم کے تفکر کو چاہے کتنی اہمیت کیوں نہ دی جائے اس کی فنی حیثیت معمولی ہے لیکن فیض نے زمانے کے حقائق کا مشاہدہ و مطالعہ کرنے کے بعد سمجھ لیا کہ ایسی بے رنگ مقصدیت بالکل غیر فطری چیز ہے۔ چنانچہ انہوں نے "موضوعِ سخن" کہی اور پھر انہوں نے دستِ صبا اور زنداں نامہ میں دونوں عشقوں کو یکجا کر لیا ہے جس کا سلسلہ آج بھی جاری ہے اس سلسلہ کی بہترین نظمیں "تمہارے حسن کے نام" اور "تم مرے پاس رہو" ہیں۔

دوسرا پہلو ان کی فکر کا یہ ہے کہ جب تک وہ خالص رومان پرست رہے ان کے دل و دماغ پر یاس پسندی اور قنوطیت چھائی رہی اور ان کے جذبات میں بھی شدت زیادہ رہی مثلاً نقشِ فریادی کی نظمیں: آخری خط۔ یاس۔ تنہائی۔ مرگِ سوز محبت وغیرہ لیکن جب انہوں نے آزادیٔ عشق کی تنگنائے سے نکل کر وطن اور انسانیت کو محبوب بنایا تو ان کی تجربہ یاس کم ہو گیا۔ اور آس کی روح پرور جھلک در آئی۔ دستِ صبا میں "اے دل بیتاب ٹھہر"، سپاہی کا مرثیہ، مرے ہمدم مرے دوست[1] شورش بربط و نے۔ لوح و قلم۔ طوق و دار کا موسم۔ ترانہ… تاریں تیری گلیوں پہ… ۔ اگست ۵۲ء وغیرہ — ان تمام نظموں اور غزلوں وغیرہ میں وہ مکمل طور پر رجائی نظر آتے ہیں۔ اب چونکہ ان کے احساسات و جذبات انفرادیت کی گھٹن میں محبوس نہیں رہے بلکہ اجتماعیت کی وسعتوں میں پھیل گئے ہیں اس لئے ان کے زاویۂ نظر میں بھی خوش گوار تبدیلی آ گئی ہے۔ اور زنداں نامہ میں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ آس لگائے بیٹھے رہنے کو بھی صحیح نہیں سمجھتے بلکہ فوری عمل کے خواہاں ہیں "نہ دستِ تہِ سنگ آمدہ" میں کہتے ہیں کہ

لاؤ سلگاؤ کوئی جوشِ غضب کا انگار
طیش کی آتشِ جرار کہاں ہے لاؤ　　وہ دہکتا ہوا گلزار کہاں ہے لاؤ

اور کہتے ہیں کہ

یوں عرضِ طلبِ کب سے دل، تیجر دل بانی مٹتی ہیں　　تم ناصر صحانی خود آؤ کہ بنت تنگ جاتی ہے

اور نظم "بچو تو ہو، کی قوی دفع بیرہ" اسی مجاہدانہ انداز فکر کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے AFRICA COME BACK جیسا کامیاب اور پر جوش رجز لکھا لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ بیرونی تحریک کا متوقع نتیجہ ہے۔ ان نظموں میں جو جوش و خروش ملتا ہے وہ فیض کے ہاں مستقل حیثیت اختیار نہیں کر سکا کیونکہ زنداں نامہ کے بعد وہ پھر اپنے مخصوص دھیمے دھیمے ٹھہرے ہوئے اسلوب میں نظمیں کہنے لگے ہیں "دیار یار"۔ "تم مرے

---

[1] یہ دونوں نظمیں نقشِ فریادی کے بعد کے ایڈیشنوں میں شامل کر دی گئی ہیں اور دستِ صبا میں نقشِ فریادی ہی سے نقل کی گئی ہیں۔

پاس رہو۔ منظر۔ دست تہہ سنگ آمدہ۔ شام۔ جدائی۔ تحدو غیرہ۔

فیض صاحب مختلف ذہنی مرحلوں سے گزر کر اب اس منزل پر پہونچ چکے ہیں جہاں کوئی فنکار عظیم تخلیق پیش کرتا ہے۔ اب انہوں نے ہنگامی حالات سے متاثر ہو کر فوراً نظم لکھ دینے کی عادت ترک کر دی ہے۔ اب ان کا سماجی شعور بھی تکمیل کے مراحل طے کر چکا ہے۔ اب اُن کے مشاہدے میں کمال بصیرت آ گئی ہے۔ (ملاحظہ ہو "شام") اور وہ اپنی ادبی حیثیت کو بھی پوری طرح سمجھ گئے ہیں (دست تہہ سنگ آمدہ) اور ان کا فکری ارتقا اب ایک متوازن صورت اختیار کر چکا ہے۔

آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ فیض صاحب کے اسلوب کے متعلق چند باتیں کہہ دی جائیں۔ فیض صاحب اگرچہ بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں لیکن اُن کی نظموں میں بھی تغزّل کی جھلک ہوتی ہے۔ وہی رمزیت، وہی اشاریت، وہی لا انتہائیت اور ویسا ہی ایجاز و اختصار۔ غزل کا شعر صرف ایک مطلب رکھتا ہے لیکن اس کے پہلو تو کتنے ہی ہوتے ہیں اور وہ مختلف موقعوں پر پڑھا جا سکتا ہے۔ یہ اُن کی لا انتہائیت ہوتی ہے۔ جیسے اس میں خواب کی سی دھندلی فضا ہوتی ہے، عمومیت ہوتی ہے۔ اور زمان اور مکان کے حدود کو ملیا میٹ کرنے والی آفاقیت۔ فیض کی نظموں کا بھی یہی حال ہے۔ وہ بعض اوقات کسی ایک واقعہ سے متاثر ہو کر نظم کہتے ہیں لیکن زمانی و مکانی آفاقیت کے علاوہ وہ غزل کے شعر کی طرح واقعاتی آفاقیت یا لا انتہائیت بھی رکھتی ہے یعنی مختلف النوع واقعات پیش آنے پر وہ نظم پڑھی جا سکتی ہے۔ "ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے" اس کی بہترین مثال ہے۔ تغزّل فیض کے مزاج میں رچا ہوا ہے۔ سوز و گداز اس کے اسلوب کی نمایاں ترین صفت ہے۔ گداز (PATHOS) ایک صفت اسلوبی ہے جو صرف غم کے جذبے ہی میں نہیں بلکہ دوسرے جذبات مثلاً ایثار، محبت، دنا، نشاط، قربانی وغیرہ کے اظہار و بیان میں بھی پائی جاتی ہے۔ گداز ہمارے جذبات میں ترفع پیدا کرتا ہے اور ہمارے احساسات کی تہذیب کرتا ہے۔ فیض صاحب کے اسلوب میں گداز اتنا فراواں ہے کہ اکثر میر کی یاد آتی ہے۔

اس گداز اور تغزّل — کی خاطر فیض صاحب نے ہیئتی تجربات اور دیگر ایسی فروعات سے صرف نظر فرما لیا۔ اور کافی حد تک ادبی روایات کے سہارے نئے میدانوں میں قدم آگے بڑھائے ہیں۔ انہوں نے تغزّل کی پرورش کی خاطر ہمیشہ زندگی کے لئے حسن کے استعارے استعمال کئے اور صراحت سے دامن بچا کر شعر کو علامات کے ذریعہ تہہ در تہہ معانی کا خزینہ دار بنایا ہے۔ اُن کے یہاں مشکل سے کسی نظم کی ایک ہی سطح ملے گی جبکہ بعض دوسرے بڑے بڑے شعراء کے یہاں ایسا ہے۔ مثلاً — احمد ندیم قاسمی جن کے کلام میں زندگی کی سی گہرائی ہے اور کائنات کی سی وسعت لیکن اسلوب کے اعتبار سے اُن کا کلام بھی صرف ایک سطح رکھتا ہے۔ فیض صاحب نے تغزل کی ایک روایت کو تھوڑا سا بدل دیا ہے۔ ہماری قدیم شاعری میں یوں ہوتا تھا کہ خارج کو داخل میں سمو کر یا معروض کو موضوع کا حصہ بنا کر بیان کرتے تھے فیض صاحب کے یہاں ایسا ہے کہ وہ موضوع کو معروض پر مسلّط کر کے یا جذبہ کو خارج پر محیط کر کے شعر کہتے ہیں گویا انہوں نے جذبات کو خارج کا بنا دیا ہے اور اس پر جذبے یا داخل کا رنگ چڑھا دیا ہے کیونکہ وہ مادّی نقطۂ نظر رکھتے ہیں اور اصلاً احساسات و تاثرات کے شاعر ہیں ؎

تیرے ہونٹوں کی پھولوں کی چاہت میں ہم ÷ دار کی خشک ٹہنی پہ وارے گئے
تیرے ہاتھوں کی شمعوں کی حسرت میں ہم ÷ نیم تاریک راہوں میں مارے گئے

فیض صاحب فضا کی تعمیر میں بھی منفرد ہیں۔ اُن کی فضا میں الفاظ کی صوتی اہمیت کی طرف کم توجہ کی جاتی ہے اور معنویت کی طرف زیادہ۔ رات، چاندنی، اداسی، محبت، درد، سوز و گداز، انتظار، تھکن، افسردگی، گزری ہوئی انبساط کی یادیں، مدھم نالے اور احساس حسن وغیرہ کے عناصر اُن کے یہاں فضا پیدا کرتے ہیں۔ فضا کے لحاظ سے ان کی شاہکار نظمیں تین ہیں "تنہائی"

"تم میرے پاس رہو" اور "منظر" جس کی ابتدا یوں ہے۔

رہ گزر سائے شجر منزل و در حلقۂ بام　　　　بام پر سینۂ مہتاب کھلا آہستہ

اس منظر میں موسیقیت کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے۔

فیض صاحب کی شاعرانہ لغت (DICTION) اردو میں خاص اہمیت رکھتی ہے انہوں نے اکثر و بیشتر تراکیب فارسی طرز کی لی ہیں۔ جن میں کچھ تو قدیم مشرقی ادب سے لی گئی ہیں اور کچھ جدید مغربی ادب کی روشنی میں انہوں نے خود وضع کی ہیں صفت مقلوب (TRANSFERRED EPITHET) کا استعمال ان کے یہاں بہت زیادہ ہوا ہے۔

الفاظ کے انتخاب کے سلسلے میں ایک خاص بات یہ ہے کہ انہوں نے اسلامی تلمیحات و استعارات بہت برتے ہیں۔ لوح و قلم، بام حرم، حشر کے سامان ہوئے، ایوان ہوس ہیں، دامن یوسف، مسجد، سنت منصور، یوں ہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول (حضرت ابراہیم) اور نظم "حسن اور موت" میں حسن کے متعلق کہتے ہیں۔ ؎

کنار رحمت حق میں اسے سلاتی ہے　　　　سکوت شب میں فرشتوں کی مرثیہ خوانی

صبا جو طمانے کو جنت کے پھول لاتی ہے

مزاج کے اعتبار سے بھی فیض میں اسلامی رنگ پایا جاتا ہے۔ مثلاً وہ شروع سے آج تک دعائیں دیتے آئے ہیں۔ "خدا وہ وقت نہ لائے" سے لیکر "سکوں ملے نہ کہیں میرے پالنے والوں کو" تک ان کی اکثر نظموں کا یہی انداز ہے۔ بلکہ اب تو انہوں نے ایک نظم ایسی کہی ہے جس کا عنوان "حمد" ہے۔ ؎　　ملکۂ شہر زندگی تیرا　؎　شکر کس طور سے ادا کیجئے

اگرچہ اس میں خدا کی حمد نہیں لیکن اس میں ایک مذہبی شخص کی طرح رجحان طبع اور مزاج کی عقیدت کیشی اور نیاز مندی کے عناصر موجود ہیں فیض صاحب کی علامات بھی زیادہ تر اسلامی ہیں اس افتاد طبع میں ان کی عربی مہارت بھی شامل ہے، ادبی ماضی سے ان کا لگاؤ بھی، اور یہ احساس بھی کہ ان کی مقصدی شاعری کا خطاب کس معاشرہ سے ہے۔

امیجری کی تخلیق کرتے وقت وہ نسائی حسن کے لوازمات کا ذکر کرتے ہیں اور ان سب لوازمات کا ذکر مطلوب کی نارسائی کو ظاہر کرنے کے لئے آتا ہے، احساس حرماں اور پرسوز موسیقی پیدا کرنے کیلئے۔

فیض صاحب کی موسیقی دھیمی، افسردہ اور سوگوار سی ہے۔ اس کا اثر ایسا ہے کہ انسان زہر کا جام گوارا کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے ان کی موسیقی خیال اور الفاظ کی ہم آہنگی سے پیدا ہوتی ہے۔ اور تحت النغمہ (SUBLYRIC) کی حیثیت رکھتی ہے۔ جیسے پس پردہ کے پیچھے دھیمے سروں میں ساز بجتے ہیں۔ ٹھہرے ٹھہرے پرسکون اور سکون نواز جیسے میر کی موسیقی۔ کبھی کبھی فیض خیال کے تقاضے کے مطابق ایک ہی نظم میں موسیقی کا پیٹرن (PATTERN) تبدیل کر دیتے ہیں۔ مثلاً "نثار میں تیری گلیوں پہ" دیکھئے پہلے بند میں پہلا اور تیسرا مصرع ہم قافیہ ہے۔ اور دوسرا اور چوتھا دوسرے بند میں پہلا مصرع منفرد ہے، باقی تین ہم قافیہ تیسرا بند چھ مصرعوں کا ہے۔ اور اس میں پہلے تین اور پانچواں مصرع آپس میں ہم قافیہ ہیں۔ باقی دو مصرعے منفرد۔ چوتھا بند دو مطلعوں پر مشتمل ہے۔ پانچواں اور آخری بند سات مصرعوں کا ہے۔ اس میں پہلا تیسرا، پانچواں، اور چھٹا مصرعہ ہم قافیہ ہے دوسرا اور چوتھا آپس میں ہم قافیہ اور آخری مصرعہ نظم کا عنوان ہے۔ اور منفرد ———— مختصر یہ کہ وہ اپنی موسیقیت کا استعمال خیال اور معانی کی ضرورت کے مطابق کرتے ہیں اور اسی لئے ان کی موسیقی متنوع ہے ناآشنا نہیں ہے لیکن ان

(بقیہ صفحہ ۵۵۴ پر)

ساحر الہ آبادی

فیض احمد فیض

اور ان کی شاعری

ہر چند کہ [illegible] لوگ زمان و مکان کی قیود سے بالاتر ہوتے ہیں اور ان کی فطری صلاحیتوں اور ذہنوں کو کسی خاص ملک یا جغرافیائی تقسیم سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ پھر بھی یہ سب چیزیں انھیں مبداء فیاض سے ملتی ہیں وہ اپنے ساتھ ایک مکمل ورثہ لے کر آتے ہیں لیکن یہ فرد [illegible] کی وجہ سے وہ خطۂ ارض قابل رشک بن جاتا ہے جہاں ان کا تعلق ہوتا ہے۔ جب ہم الہ آباد کا تصور کرتے ہیں تو اکبر کا نام ہم کو یقیناً آتا ہے۔ اس طرح جب مرادآباد کا ذکر کرتے ہو تو جگر صاحب یاد آتے ہیں۔ اور اگر سیالکوٹ کا نام آجائے تو پہلے اقبال کا اور پھر فیض کا نام ذہن میں آتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح شیراز کے ساتھ سعدی۔ حافظ اور عرفی کا تصور وابستہ ہے۔

فیض کے ذہنی ارتقاء اور تربیت میں اگر ایک طرف صاحبزادہ محمود الظفر، ڈاکٹر رشید جہاں بخاری اور تاثیر مرحوم جیسے افراد کا حصہ ہے تو دوسری طرف مغربی اور مشرقی ادب کے مطالعہ سے ان کے ذہن کو اور بھی جلا ملی ہے۔ خصوصاً انگریزی ادب کے مطالعہ کی وجہ سے وہ ادب کے جدید رجحانات سے بلا واسطہ آگاہ ہوئے عربی زبان کا مطالعہ فیض کی شخصیت کے لئے ایک نیا افق بن گیا۔ اور فیض عشق و زندگی کی روایات کے اس زندہ سلسلہ کے رمز آشنا بن گئے جو عربی سے شروع ہو کر فارسی کے وسیلے سے اردو کی دنیا تک پہنچا۔ ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعہ میزان میں ہمیں یہ عبارت جلی حروف میں ملتی ہے: "بخاری، تاثیر، حسرت، محمود، اور رشید جہاں کی یاد میں"۔ یہ انھیں بزرگوں کی رفاقت کا اثر تھا کہ جب ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد پڑی تو فیض اس سے وابستہ ہو گئے اور اسی تحریک کے ساتھ ساتھ ان کا آفتاب شاعری بھی ادب کے نصف النہار تک پہنچا۔ ترقی پسند ادب کی تحریک نے وقت کی کوکھ سے جنم لیا تھا اس لئے نوجوان طبقے نے اس کا خیر مقدم کیا۔ اور یہ تحریک دیکھتے دیکھتے زندہ حقیقت بن گئی۔ معاشرہ کی مثال ایک دریائے موج خیز کی ہے جس میں لحظہ بہ لحظہ نئی نئی لہریں اٹھتی رہتی ہیں۔ اور وہ چیزیں جو اس کے مزاج سے ہم آہنگ ہوتی ہیں وہ ان موجوں میں تحلیل ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اور جو کثیف اور بے ڈول ہوتی ہیں وہ کنارے آلگتی ہیں۔ حالی اور ان کے ہم عصروں کی آوازیں ہمارے ماحول سے ٹکراتی رہیں اور آخر کار اس فضا میں تحلیل ہو گئیں۔ اسی طرح ترقی پسند رجحانات بھی زمانے کی ہم آہنگی کی وجہ سے ہمار

اندر تیزی سے ملازمت کر گئے۔ اور ہنوز اثر پذیری کا سلسلہ جاری ہے۔ ترقی پسند ادب فیض صاحب کے الفاظ میں "ان تحریروں سے عبارت ہے جن سے سماج کے سیاسی اور اقتصادی ماحول میں ایسی ترغیبات پیدا ہوں جن سے کلچر ترقی کرے۔"

فیض صاحب نے انھیں نظریات کو پیشِ نظر رکھ کر پرورشِ لوح و قلم کی۔ ہندوستانی معاشرے پر ایک مدت تک جمود اور تنزل کا دور دورہ رہا۔ ہمارا ادب بھی اپنی روایتی انداز کی وجہ سے ایک ہی ڈگر پر چل رہا ہے۔ لوگ پرانے اور فرسودہ خیالات سے تنگ آ چکے تھے۔ جس کے ردِ عمل میں ہم حالی اور ان کے ہم عصروں کو پیش کر سکتے ہیں۔ یہاں کا اہلِ علم طبقہ ہر اس آواز پر لبیک کہنے کے لئے تیار تھا جس میں کچھ جدت ہوتی ایسے وقت میں فیض نے اپنی شاعری کی ابتدا کی نقشِ فریادی ہی میں وہ رومان کی فضا سے نکل کر حقیقت کے تپتے ہوئے میدانوں میں پہونچ گئے۔ ان کا رنگ دوسرے نوجوان شعرا کے کلام میں جھلکنے لگا "دستِ صبا" اور "زنداں نامہ" میں تو وہ اس مقام پر پہونچ گئے، جہاں انھیں یہ کہنے کا حق حاصل ہے۔ ع

ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد　　فیض گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے

فیض صاحب معاشرے کی طبقاتی کشمکش اور معاشی ناہمواری سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ وہ مارکسی نظریات کی طرف زیادہ مائل نظر آتے ہیں وہ اس جنگ سرمایہ و محنت میں خود کو ایک سپاہی سمجھتے ہیں ان کا کہنا ہے۔ "مزدور اور سرمایہ داری کی جنگ صرف مزدور کی جنگ نہیں ہم سب کی جنگ ہے ہمارے دوست اور دشمن بھی مشترک ہیں۔ مزدور اور کسان کی بہبودی سماج کی اجتماعی بہبودی کے مترادف ہے۔"

وہ ادب کو سماج کی ترقی اور عوام کی بہبودی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ ن۔ م راشد کے الفاظ میں: "عہدِ حاضر کے نوجوانوں میں فیض ہی وہ تنہا شاعر ہے جس کے ہاں جنسی الجھنوں کے آثار بہت کم ملتے ہیں۔" اس کی دراصل وجہ یہ ہے کہ فیض کا محبوب اس کا مقصد اور اس کا نظریہ ہے۔ اور یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ جس قدر نظریۂ عشق میں عفت اور پاکیزگی کا عنصر ہوگا۔ شاعر کا کلام بھی شہوانیت، سوقیت اور جنسیت سے اسی قدر ارفع ہوگا۔ اور اس راہ میں جتنی بھی مصیبتیں آتی ہیں وہ جذبۂ عشق کی لے کو اور بھی فزوں کر دیتی ہیں۔ کسی کا مشہور شعر ہے — ع

رہرواں را خستگی راہ نیست　　عشق ہم راہ است و ہم خود منزل است

اس راستے پر چلنے کے بعد انھیں بہت سی مخالفتوں سے واسطہ بھی پڑا۔ لیکن جب عشق صادق ہو تو راستے کی رکاوٹیں رکاوٹیں نہیں معلوم ہوتیں — زمانے کی طعن و تشنیع سے داغِ غم تو ابھر سکتا ہے لیکن داغِ ندامت کبھی نہیں پیدا ہوتا ہے — ع

اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے وہ گزری　　تنہا پسِ زنداں کبھی رسوا سرِ بازار
گرجے ہیں بہت شیخ سرِ گوشۂ منبر　　کڑکے ہیں بہت اہلِ حکم برسرِ دربار
چھوڑا نہیں غیروں نے کوئی ناوکِ دشنام　　چھوٹی نہیں اپنوں سے کوئی طرزِ ملامت
اس عشق نہ اس عشق پہ نادم ہے مگر دل　　ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغِ ندامت

اس تشنیع و ملامت کے باوجود وہ پرورشِ لوح و قلم کے لئے تیار ہیں — ع

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے　　جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

وہ معاشرے کی ناہمواریاں کو دیکھتے ہیں۔ یہاں کی منڈیوں میں چاندی جیسے بدن چند ٹکوں میں بکتے ہیں۔ سرمایہ دار

مزدور کے جسم کا لہو خریدتا ہے۔ اور فروخت کرتا ہے۔ کسان کو اپنی قوت اور محنت کے ثمر سے پر بھی کوئی اختیار نہیں ہے۔ ان ناتوانوں کے نوالوں پر سرمایہ دار کی نگاہ چیل اور کوؤں کی طرح جمی رہتی ہے۔ ہم شاید اس کا گہرا احساس اس لئے نہیں کرتے کہ ماحول نے ہم کو اس کا عادی بنا دیا ہے۔ لیکن شاعر حساس ہوتا ہے۔ فیض نے اس کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کیا۔

وہ ان سب حالات پر غور کرتے ہیں۔ ان سے متاثر ہوتے ہیں لیکن ضبط محبت، شرط اولین محبت ہے۔ وہ جھنجھلاہٹ اور چیخ پکار میں یکسر مصروف نہیں ہوتے۔ بلکہ اسے ایک سنجیدہ اور ملائم انداز میں ادا کرتے ہیں۔ ان کے اسلوب میں ٹھہراؤ کے ساتھ ساتھ متانت بھی ہوتی ہے اور سلاست و روانی بھی۔ ان کے کلام کا ایک خاص وصف یہ بھی ہے کہ وہ دل میں رہ رہ کے ایک کسک سی پیدا کرتا ہے۔ تیر کی طرح دلوں کو چھیدتا نہیں بلکہ پھانس بن کر دیر تک دل میں چبھتا رہتا ہے۔ میر صاحب کا یہ شعر ہر شخص کو یاد ہوگا

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

اس شعر میں جو افسردگی اور درد انگیز کیفیت ہے بالکل اسی قسم کا تاثر اور کیفیت فیض کے بیشتر اشعار میں موجود ہے۔

آج تک سرخ و سیہ صدیوں کے سائے کے تلے
آدم و حوا کی اولاد پہ کیا گزری ہے

موت اور زیست کی روزانہ صف آرائی میں
ہم پہ کیا گزرے گی اجداد پہ کیا گزری ہے

پھر کوئی آیا دل زار نہیں کوئی نہیں
راہرو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا

ڈھل چکی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ

گل کرو شمعیں بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو

اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا

ان اشعار میں نہ صرف میر کی طرح ہلکی ہلکی افسردگی کی آنچ ہے بلکہ صوتی اعتبار سے بڑی مناسبت اور روانی ہے۔ فیض کے یہاں روایت سے بغاوت نہیں ملتی۔ وہ روایتی اصطلاحات بھی استعمال کرتے ہیں۔ اور یوں کہ زندگی کے نئے تقاضے ان اصطلاحوں کے آئینوں میں جگمگا اٹھتے ہیں۔ ہم روایات سے یکسر بغاوت نہیں کر سکتے کیونکہ یہ ہمارے ادب کا مزاج بن چکی ہیں۔ اور ہمارا وجدان اور مذاق ان سے بالکل ہم آہنگ ہو چکا ہے۔ ان روایتی اصطلاحات میں سب ہی بے کار اور بے وجہ نہیں ہیں۔ بلکہ اگر ان سے کام لینے والے میں اتنی صلاحیت ہو کہ وہ مناسب جگہ اور مناسب الفاظ کی ترتیب کے ساتھ ان سے کام لے تو کلام میں تاثر حسن ادا پیدا ہو جاتا ہے اور ہم پیچیدہ سے پیچیدہ خیال اور بلند سے بلند مضمون کو ان شعری اصطلاحات کی مدد سے ادا کر سکتے ہیں۔ فیض نے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھا ہے۔ انھوں نے روایات کو ترک کرنے کے بجائے اس میں ایسی جدت آمیزی کی ہے کہ شعروں میں مٹھاس پیدا ہو گئی ہے۔ جیسے صرف دو مصرعوں کے سہارے انھوں نے ایک طویل داستان کو ایک شعر میں بیان کر دیا ہے۔

ہے دشت اب بھی دشت مگر خون پائے فیض
سیراب چند خار مغیلاں ہوئے تو ہیں

یا

نہ گل کھلے ہیں نہ ان سے ملے نہ مے پی ہے
عجیب رنگ میں اب کے بہار گزری ہے

سادگی اور روانی کے ساتھ ان کا لب و لہجہ، ان کا انداز بے حد دلکش اور قابل داد ہے۔ یہ انداز صرف غزلوں ہی میں موجود نہیں ہے بلکہ نظموں میں بھی ملتا ہے۔ اور لب و لہجہ اور متانت ہی کے اعتبار سے انھیں تمام جدید شعرا میں ممتاز بنا دیتی ہے۔

ہر چند کہ ان کے بہت سے اشعار اور نظمیں ایسی بھی ہیں جن میں رمز و ایمائیت کا پردہ اتنا دبیز ہو گیا ہے کہ اس کی وجہ سے ذہن شاعر کا فی الضمیر تک نہیں پہنچ پاتا ہے لیکن انداز اور الفاظ کی صوتی ترکیب ایسا اثر پیدا کرتی ہے کہ پڑھنے والا اس کے باوجود متاثر ہوتا ہے اس سے مسٹر ہارٹ برج کے اس عجیب و غریب مقولے کی واقعی تائید ہو جاتی ہے کہ۔

فیض ملائم اور سبک الفاظ کی ترکیب کے ساتھ جب دلکش اور اچھوتی تشبیہات اور استعارات بھی استعمال کرتے ہیں تو اشعار میں بے حد اثر پیدا ہو جاتا ہے — لیکن تشبیہ و استعارہ کے متعلق فیض صاحب کے نظریات حقیقت سے زیادہ قریب نہیں ہیں ان کا کہنا ہے۔ "تشبیہ یا استعارہ خود یا ادبی تحریک کوئی مقصود نہیں فقط ایک راستہ یا ایک آلہ ہے اور ہر ماحصل آلے کی طرح اس کا حق بھی اضافی ہے۔ ہم کسی شاعر کو تشبیہوں اور استعاروں کی وجہ سے مستحسن یا مذموم قرار نہیں دے سکتے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ قدرت کلام کا مظاہرہ نہیں عجز کا اظہار ہے"

لیکن اگر ہم حقیقت کی نظر سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ عمدہ تشبیہات اور استعارات وہی شاعر استعمال کر سکتا ہے جس کا احساس جاگتا ہوا ہو۔ جس کی نظر عمیق ہو، اور مشاہدہ وسیع ہو۔ ورنہ عام طور پر شعراء مروجہ تشبیہوں اور استعاروں سے اپنا کام چلاتے ہیں۔ اس لئے عمدہ اچھوتی اور حقیقی تشبیہوں اور استعاروں کے برمحل استعمال سے یقیناً شاعر کی عظمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فیض صاحب کے کلام میں جہاں جہاں ہم کو "تشبیہاتی" اور "استعاراتی" رنگ نظر آتا ہے۔ وہ یقیناً ان کے بہترین منتخبات میں سے ہیں ان کی نظم "زنداں کی ایک صبح" "زنداں کی ایک شام" یا "یاد" کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ ع

جیل کی زہر بھری چور صدا بن جائیں ÷ دور دروازہ کھلا کوئی، کوئی بند ہوا
دور مچلی کوئی زنجیر مچل کے روئی ÷ دور اترا کسی تالے کے جگر میں خنجر

یا

اس قدر پیار سے اے جان جہاں رکھا ہے ÷ دل کے رخسار پہ اس وقت تری یاد نے ہاتھ

فیض صاحب کے چار شعری مجموعے "نقش فریادی"، "دست صبا"، "زنداں نامہ" اور "دست تہ سنگ" ہیں "میزان" کے نام سے ان کے تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ ان کے شعری مجموعوں کو اگر یکجا کیا جائے تو دوسرے بہت سے شعراء کے کسی ایک ضخیم دیوان سے بھی صفحات میں کم ہوں گے۔ لیکن جیسا کہ میر حسن نے اپنے تذکرے میں میر درد کے متعلق لکھا ہے۔ کہ "دیوانش مختصر است لیکن چوں کلام حافظ سراپا انتخاب" یہی بات فیض صاحب کے متعلق کہی جا سکتی ہے۔ ان کا کلام جو کچھ بھی ہے اور جس قدر بھی ہے اپنی افادیت کے لحاظ سے گراں قدر ہے۔

ان کے افکار و انکار نے نوجوان شعراء پر اپنا اثر بہت ہی گہرا چھوڑا ہے۔ آج کل کے بیشتر نوجوان شعراء کے کلام میں اس کی بازگشت ہم کو صاف سنائی دیتی ہے۔ فیض نے جو طرز فغاں ایجاد کی ہے اس کا عمل اور رد عمل دونوں جاری ہے۔

آج کا دور جمہوری دور ہے۔ جدید وسائل اور ذرائع نے انسان کو جغرافیائی اعتبار سے دور ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے بہت قریب کر دیا ہے۔ ہر ملک دوسرے ملک کے رجحانات اور معاملات سے بخوبی واقفیت رکھتا ہے۔ پوری دنیا ایک مکان ہے اور تمام انسان اس کے مکین۔

اس لئے آج کے علم و فن میں یہ خصوصیت ہونی چاہیئے کہ اس میں تمام اولادِ آدم کے لئے پیغامِ فلاح و بہبود کا سامان ہو ہمیں فن کو آفاقی نقطۂ نظر سے پرکھنا چاہیئے اور ہر اس فنی شہ پارے کو سراہنا چاہیئے جس میں تمام انسانوں کے دل کی دھڑکنیں صاف سنائی دیتی ہوں۔ فن کار کا فن کسی مخصوص ملک یا خطۂ ارض کے لئے نہیں بلکہ پوری نوعِ انسانیت کے لئے ہو۔ جس سے انسانیت بہ حیثیت مجموعی ترقی کی بلند منزلوں کی طرف اپنے قدم بڑھا سکے۔ اگر ہم اس نقطۂ نظر سے فیض کے کلام اور ان کے سارے کام کا جائزہ لیں تو ہمیں وہ یقیناً ایک گنجِ گراں مایہ معلوم ہوگا۔ اس میں زمانے کے تقاضوں سے مطابقت بھی ہے اور گھٹی ہوئی انسانیت کی چیخ پکار بھی اور اس کا کرب و درد بھی۔ فیض کا وطن سارا جہاں ہے۔ ان کا درد انسانیت کا درد ہے اور ان کی آواز زمانے کی آواز ہے۔ اس سلسلے میں حالی کے اس پند خوش گوار پر گوش بر آواز ہونا چاہیئے

> "گری ہوئی قوموں میں خصوصاً ایسے عالی فطرت انسان شاذ و نادر پیدا ہوتے ہیں۔ جن کی ذات سے اگر قوم کو براہِ راست کوئی معتد بہ فائدہ نہ پہونچا ہو۔ لیکن کسی علم یا صناعت یا لٹریچر میں کوئی حقیقی اضافہ کر کے منصۂ ظہور میں آیا ہو۔ اور سلف کے ذخیرہ میں کچھ نیا سرمایہ شامل ہوا ہو ایسے لوگوں کی لائف پر غور کرنا [illegible] اور ان کے نوادرِ افکار سے مستفید ہونا قوم کے ان فرائض میں سے ہے جن سے غافل رہنا قوم کے لئے نہایت افسوس کی بات ہے۔"

فیض
فکر و فن کے آئینے میں

(صفحہ ۵۴۹ سے آگے)

کا اندرونی آہنگ ہر جگہ ایک سا ہی ہے۔

ٹی ایس ایلیٹ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ جب کوئی شاعر پختگی کی منزل پر پہونچ جائے اور فن پر کما حقہ قدرت حاصل کر لے تو اُسے چاہیئے کہ وہ ایک منظوم ڈرامہ لکھے جس میں زندگی بسر کی بصیرتیں سمو دے اور اسے اپنا عظیم کارنامہ بنا دے۔ وہ کہتا ہے۔

The first thing of any importance that I discovered was that a writer who has worked for years, and achieved some success in writing other kinds of verse, has to approach the writing of a verse play in a different frame of mind that to which he has been accustomed in his previous work.

فیض صاحب اپنی حدود میں ممکنہ کامیابی حاصل کر چکے ہیں اور اب ہم اُن سے کسی ایسی ہی تخلیق کی توقع رکھتے ہیں جس میں وہ اپنے لہجے کو بلند تر بات کریں اور کوئی عظیم کارنامہ پیش کریں۔ کیونکہ ابھی تک اُن کے پاس ایسی کوئی نظم نہیں جس پر فکری اور فنی طور پر "عظیم" کا اطلاق ہو سکے۔ اور جسے بین الاقوامی عظیم ادب میں پیش کیا جا سکے۔

نجمہ تقوی

فیض کی شخصیت

شاعری کے پس منظر میں

فیض صاحب ایک ایسی شخصیت کے حامل ہیں جس نے مرمریں جسموں اور سیمیں کلائیوں کے بدلے خون میں لتھڑے ہوئے جسموں سے محبت کی ہے۔ ان کے درد کو اپنا درد سمجھا ہے۔ یہ شخصیت کی گہرائی نہیں تو اور کیا ہے؟ ان کی شاعری میں قدم قدم پر اخلاقی اقدار ملتی ہیں۔ یہی شخصیت کی استواری ہے۔ جس نے فیض صاحب کو مرمریں باہوں والی محبوبہ کے ساتھ ساتھ "لیلیٰ وطن" کا عشق بھی عطا کیا ہے۔ ان کی شاعری کے موجودہ مدارج میں تو لیلائے وطن کا عشق زیادہ تند و تیز ہے۔ ان کی آنکھیں اشکبار ہیں ان کے دل سے دھوئیں اٹھ رہے ہیں۔ لیکن یہ آنسو یہ آہیں اور یہ نالے کسی پیکر انسانی کی جدائی پر نہیں بلکہ لیلیٰ وطن کے غم میں ہیں۔

چاہا ہے اسی رنگ میں لیلائے وطن کو　　تڑپا ہے اسی طور پہ دل اس کی لگن میں

مستقل مزاجی اور جفاکشی ان کی شخصیت کا وہ عنصر ہے جو ان کے قول و فعل دونوں سے نمایاں ہو جاتا ہے۔ انہوں نے ایک تقریب کے افتتاح پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہمیں تمام فنون لطیفہ موسیقی، مصوری اور شاعری وغیرہ کی ترقی کے لئے سرگرم عمل رہنا چاہئے۔ تاکہ ہم اپنی آئندہ نسلوں کے لئے کچھ ورثہ چھوڑ سکیں جیسا کہ ہمارے بزرگ ہمارے لئے چھوڑ گئے ہیں۔

ہستی وہی عظیم ہوتی ہے جو ماحول کو اپنے مطابق ڈھال لے۔ فیض صاحب نے بھی دگرگوں حالات میں اپنے عزائم کے سہارے ماحول کو اپنا مطیع بنانے کی کوشش کی ہے۔ اور خود بھی وقت کا ساتھ دیا ہے۔

اگر جذبات میں صداقت ہو خیالات میں پائیداری ہو اور قومی و ملکی مفاد پیش نظر ہوں تو بڑی سے بڑی رکاوٹ منزل تک پہنچنے میں حائل نہیں ہو سکتی۔ فیض صاحب کو ہمیشہ اپنے عزائم پر بھروسہ رہا ہے اور اسی امید نے جیل کی تاریک فضاؤں کو بھی منور کر دیا کہ کبھی تو ان کے افکار کی روشنی ان کے ملک و قوم کے لئے چراغ راہ ثابت ہوگی۔۔۔ اپنی اسی تحریک کی تکمیل میں فیض صاحب پر جو گزری وہ گزر گئی لیکن نفس مطمئنہ تو دیکھئے کہتے ہیں۔ ع

جو ہم پہ گزری سو گزری مگر شب ہجراں　　ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے

قصیدہ ہماری شاعری کی وہ صنف ہے جس پر تمام گزشتہ اساتذہ نے طبع آزمائی کی ہے۔ قصیدہ سے بعض روایات منسوب کی گئی ہیں یعنی قصیدہ میں ممدوح کی تعریف کرکے شاعر اپنی جھولی بھر سکتا ہے لیکن فیض صاحب کی وضع داری نے کسی وقت بھی اپنے دامن کو دوسروں کے صلہ میں ملے جاہ اور کی ہوئی دولت سے نہیں بھرا۔ ان کے قصائد کسی کی ذات تک محدود نہیں۔ بلکہ انسانیت کی معراج اور وطن کی عظمت کے لئے وقف ہیں۔

اقبال کی طرح فیض صاحب بھی امید کی خوشیوں سے لبریز نظر آتے ہیں۔ ان کے مذہب میں مایوسی کفر ہے۔ جانثار پر مکمل بھروسہ ہے۔ ان کی زندگی میں ایسے لمحات بھی آئے ہیں کہ لائل پور جیل میں قید تنہائی کے ساتھ ساتھ قلم کاغذ کتب رسالے وغیرہ کی جدائی بھی برداشت کرنی پڑی ہے۔ لیکن اس وقت بھی فیض ناامید نظر نہیں آتے۔ بڑے فخر و استقلال سے کہتے ہیں۔

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے ❊ کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

زباں بندی کو بھی فیض صاحب کی شخصیت پر سکون نے یہ کہہ کر اپنے لئے باعث تسکین بنا لیا ہے۔

زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے ❊ ہر اک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

اور شاعروں کی طرح وہ فلک سے اپنے غم کا گلہ نہیں کرتے یا فلک کو اس کا ذمہ دار نہیں ٹھہراتے بلکہ اپنی قوت ارادی پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ گریہ و زاری کریں یا فلک سے شکایت کریں۔ وہ امید و قوت ارادی سے کام لیتے ہوئے کہتے ہیں۔ ؎

یونہی ہمیشہ الجھتی رہی ہے ظلم سے خلق ❊ نہ ان کی رسم نئی ہے نہ اپنی ریت نئی

یونہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول ❊ نہ ان کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی

اسی سبب سے فلک کا گلہ نہیں کرتے ❊ ترے فراق میں ہم دل برا نہیں کرتے

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ شاعر یا ادیب یا بڑا فنکار تنہائی پسند ہوتا ہے۔ فیض صاحب ایک بڑے شاعر بھی ہیں اور فنکار بھی۔ لیکن ان کا معاملہ بالکل برعکس ہے۔ جس کی مثال ہمیں حیدرآباد جیل کے واقعہ سے ملتی ہے۔ جہاں ہر قیدی کو الگ الگ کوٹھری کے علاوہ ایک بڑا ہال بھی ملا ہوا تھا فیض صاحب نے کوٹھری کے بجائے اپنا بستر ہال میں لگا لیا اور دوسرے ساتھیوں کو بھی وہیں رہنے کے لئے مجبور کرنے لگے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر تم لوگوں کو بھی میری طرح تنہا رہنا پڑتا تب دوستوں کی صحبت کی قدر ہوتی۔

تنہائی کے علاوہ ایک فنکار کو اہل و عیال کی فکر سے بھی مبرا تصور کیا جاتا ہے لیکن ان کی طبیعت ذمہ داریوں سے فرار کو پسند نہیں کرتی انہیں بچوں سے خاص لگاؤ ہے بچوں کے بے انتہا عزیز رکھتے ہیں۔ ایام قید میں جب ان سے پوچھا گیا کہ یہاں پر آپ کو سب سے زیادہ کس چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ جواب ملا "بچے"۔

فیض صاحب نہایت نازک طبیعت کے مالک ہیں۔ ہمسایوں کی تکرار دوستوں کی تلخ کلامی یا جھگڑے طبیعت پر گراں گزرتے ہیں اور شاعری کا موڈ بھی کافور ہو جاتا ہے۔ پھولوں سے پیار ہے۔ ایام قید میں باہر سے پھولوں کے بیج منگا کر ایک خوبصورت باغ لگایا۔ تاکہ جیل کی مکروہ اور کرخت ماحول میں کچھ زندگی پیدا ہو۔ اور طبیعت کو سکون ملے۔

فیض کی شاعری ان کی شخصیت کی آئینہ دار ہے۔ بقول میرزا اسحاق ان کی شاعری میں ایک صاحب دل کا جوش اور ولولہ ہے اس میں پوری قوم کا دل دھڑک رہا ہے ان کی شاعری میں وطن کی محبت بھی ہے اور قوم کے لئے تڑپ بھی۔

(اقتباس)

"IF SHE ASKS
FOR THE
MOON ...
.. GIVE HER A
SHEHERAZADE
SARI !"
A PRODUCT OF HM SILK MILLS LTD. KARACHI

گرمی سے
نجات کے لئے
HOFFMAN
BEVERAGES
NATURAL FLAVORS
ہوفمین
فرحت بخش مشروبات
وٹامن
"سی"
تازہ پھلوں کے رس
سے تیار کردہ
ہوفمین بہترین مشروب!
فرنچائز ہولڈرز:- حیدری بیوریجز لمیٹڈ
INKON
H/103/U

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے

نقشِ فریادی

(۱۹۴۱ء)

دستِ صبا

(۱۹۵۳ء)

زنداں نامہ

(۱۹۵۶ء)

دستِ تہِ سنگ

(۱۹۶۵ء)

پہلا مجموعۂ کلام

نقشِ فریادی

قطعات

(۱)

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آجائے

(۲)

وقفِ حرمان و یاس رہتا ہے
دل ہے، اکثر اُداس رہتا ہے
تم تو غم دے کے بھول جاتے ہو
مجھ کو احساں کا پاس رہتا ہے

٥

سرودِ شبانہ

گم ہے اک کیف میں فضائے حیات
خامشی سجدۂ نیاز میں ہے
حُسنِ معصوم خوابِ ناز میں ہے

اے کہ تُو رنگ و بو کا طوفاں ہے
اے کہ تُو جلوہ گر بہار میں ہے
زندگی تیرے اختیار میں ہے
پھُول لاکھوں برس نہیں رہتے
دو گھڑی اور ہے بہارِ شباب
آ، کہ کچھ دیر مُسن سنا لیں ہم
آ، محبت کے گیت گا لیں ہم

میری تنہائیوں پہ شام رہے؟
حسرتِ دید ناتمام رہے؟
دل میں بے تاب ہے صدائے حیات
آنکھ گوہر نثار کرتی ہے

آسماں پر اُداس ہیں تارے
چاندنی انتظار کرتی ہے
آ، کہ تھوڑا سا پیار کر لیں ہم
زندگی زرنگار کر لیں ہم

سرودِ شبانہ

نیم شب، چاند، خود فراموشی
محفلِ ہست و بود ویراں ہے
پیکرِ التجا ہے خاموشی
بزمِ انجم فسردہ ساماں ہے
آبشارِ سکوت جاری ہے
چار سو بے خودی سی طاری ہے
زندگی جزوِ خواب ہے گویا
ساری دُنیا سراب ہے گویا

سو رہی ہے گھنے درختوں پر
چاندنی کی تھکی ہوئی آواز
کہکشاں نیم وا نگاہوں سے

کہہ رہی ہے حدیثِ شوقِ نیاز
ساز دل کے خموش تاروں سے
چھن رہا ہے خمارِ کیف آگیں
آرزو، خواب، ترا روئے حسیں!

انتظار

گذر رہے ہیں شب و روز تم نہیں آتیں
ریاضِ زیست ہے آزردۂ بہار ابھی
مرے خیال کی دنیا ہے سوگوار ابھی
جو حسرتیں ترے غم کی کفیل ہیں پیاری
ابھی تلک مری تنہائیوں میں بستی ہیں
طویل راتیں ابھی تک طویل ہیں پیاری
اداس آنکھیں ابھی انتظار کرتی ہیں
بہارِ حسن، یہ پابندئ جفا کب تک؟
یہ آزمائشِ صبرِ گریز پا کب تک؟
قسم تمہاری بہت غم اٹھا چکا ہوں میں
غلط تھا دعوائے صبر و شکیب، آجاؤ
قرارِ خاطرِ بے تاب تھک گیا ہوں میں

تہہِ نجوم

تہہِ نجوم، کہیں چاندنی کے دامن میں
ہجومِ شوق سے اک دل ہے بے قرار ابھی
خمارِ خواب سے لبریز احمریں آنکھیں
سفید رُخ پہ پریشان عنبریں آنکھیں
چھلک رہی ہے جوانی ہر اک بُنِ مُو سے
رواں ہو برگِ گُل تر سے جیسے سیلِ شمیم
ضیائے مہ میں دمکتا ہے رنگِ پیراہن
ادائے عجز سے آنچل اُڑا رہی ہے نسیم
دراز قد کی لچک سے گداز پیدا ہے
ادائے ناز سے رنگِ نیاز پیدا ہے
اُداس آنکھوں میں خاموش التجائیں ہیں
دلِ حزیں میں کئی جاں بلب دعائیں ہیں
تہہِ نجوم کہیں چاندنی کے دامن میں
کسی کا حُسن ہے مصروفِ انتظار ابھی
کہیں خیال کے آباد کردہ گلشن میں
ہے ایک گُل کہ ہے ناواقفِ بہار ابھی

آج کی رات

آج کی رات سازِ درد نہ چھیڑ
دکھ سے بھرپور دن تمام ہوئے
اور کل کی خبر کسے معلوم!
دوش و فردا کی مٹ چکی ہیں حدود
ہو نہ ہو اب سحر کسے معلوم؟
زندگی ہیچ! لیکن آج کی رات
ایزدیت ہے ممکن آج کی رات؟
آج کی رات سازِ درد نہ چھیڑ

اب نہ دہرا فسانہائے الم
اپنی قسمت پہ سوگوار نہ ہو
فکرِ فردا اتار دے دل سے
عمرِ رفتہ پہ اشکبار نہ ہو
عہدِ غم کی حکایتیں مت پوچھ
ہو چکیں سب شکایتیں مت پوچھ
آج کی رات سازِ درد نہ چھیڑ

ایک منظر

بام و دَر خامشی کے بوجھ سے چُور
آسمانوں سے جُوئے دَرد رَواں
چاند کا دُکھ بھرا فسانۂ نور
شاہراہوں کی خاک میں غلطاں
خواب گاہوں میں نیم تاریکی
مضمحل لَے رباب ہستی کی
ہلکے ہلکے سُروں میں نوحہ کناں!

میرے ندیم.....

خیال و شعر کی دنیا میں جان تھی جن سے
فضائے فکر و عمل ارغوان تھی جن سے
وہ جن کے نور سے شاداب تھے مہ و انجم
جنونِ عشق کی ہمت جوان تھی جن سے
وہ آرزوئیں کہاں سو گئی ہیں میرے ندیم؟

وہ ناصبور نگاہیں، وہ منتظر راہیں
وہ پاسِ ضبط سے دل میں دبی ہوئی آہیں

وہ انتظار کی راتیں، طویل، تیرہ و تار
وہ نیم خوابِ شبستاں، وہ مخملیں باہیں
کہانیاں تھیں کہیں کھو گئی ہیں، میرے ندیم!

مچل رہا ہے رگِ زندگی میں خونِ بہار
الجھ رہے ہیں پرانے غموں سے روح کے تار
چلو کہ چل کے چراغاں کریں دیارِ حبیب
ہیں انتظار میں اگلی محبتوں کے مزار
محبتیں جو فنا ہو گئی ہیں، میرے ندیم!

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ!

میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات
تیرا غم ہے تو غمِ دہر کا جھگڑا کیا ہے؟
تری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے؟
تو جو مل جائے تو تقدیر نگوں ہو جائے
یوں نہ تھا، میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

اَن گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخواب میں بُنوائے ہوئے
جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے

جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوّروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے

لوٹ جاتی ہے اُدھر کو بھی نظر کیا کیجے
اب بھی دلکش ہے ترا حُسن مگر کیا کیجے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ!

رقیب سے

آ کہ وابستہ ہیں اُس حُسن کی یادیں تجھ سے
جس نے اس دل کو پری خانہ بنا رکھا تھا

جس کی الفت میں بھلا رکھی تھی دنیا ہم نے
دہر کو دہر کا افسانہ بنا رکھا تھا

آشنا ہیں ترے قدموں سے وہ راہیں جن پر
اُس کی مدہوش جوانی نے عنایت کی ہے
کارواں گزرے ہیں جن سے اُسی رعنائی کے
جس کی ان آنکھوں نے بے سود عبادت کی ہے

تجھ سے کھیلی ہیں وہ محبوب ہوائیں جن میں
اُس کے ملبوس کی افسردہ مہک باقی ہے
تجھ پہ بھی برسا ہے اُس بام سے مہتاب کا نور
جس میں بیتی ہوئی راتوں کی کسک باقی ہے

تو نے دیکھی ہے وہ پیشانی، وہ رخسار، وہ ہونٹ
زندگی جن کے تصور میں لٹا دی ہم نے
تجھ پہ اٹھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں
تجھ کو معلوم ہے کیوں عمر گنوا دی ہم نے

ہم پہ مشترکہ ہیں احسان غم الفت کے

اتنے احسان کہ گنواؤں تو گنوا نہ سکوں
ہم نے اِس عشق میں کیا کھویا ہے کیا سیکھا ہے؟
جُز ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں!

عاجزی سیکھی، غریبوں کی حمایت سیکھی
یاس و حرمان کے، دکھ درد کے معنی سیکھے
زیردستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھا
سرد آہوں کے، رُخِ زرد کے معنی سیکھے

جب کہیں بیٹھ کے روتے ہیں وہ بے کس جن کے
اشک آنکھوں میں بلکتے ہوئے سو جاتے ہیں
ناتوانوں کے نوالوں پہ جھپٹتے ہیں عقاب
بازو تولے ہوئے، منڈلاتے ہوئے آتے ہیں

جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت
شاہراہوں پہ غریبوں کا لہو بہتا ہے
یا کوئی توند کا بڑھتا ہوا سیلاب لئے
فاقہ مستوں کو ڈبونے کے لئے کہتا ہے

آگ سی سینے میں رہ رہ کے اُبلتی ہے نہ پوچھ　　اپنے دل پر مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے

تنہائی

پھر کوئی آیا دلِ زار! نہیں کوئی نہیں!
راہرو ہوگا، کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات، بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہگذار
اجنبی خاک نے دھندلا دیئے قدموں کے سُراغ
گل کرو شمعیں، بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کرلو
اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا

چند روز اور مری جان!

چند روز اور مری جان! فقط چند ہی روز
ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پہ مجبور ہیں ہم
اور کچھ دیر ستم سہہ لیں، تڑپ لیں، رولیں
اپنے اجداد کی میراث ہے معذور ہیں ہم

جسم پر قید ہے، جذبات پہ زنجیریں ہیں
فکر محبوس ہے، گفتار پہ تعزیریں ہیں
اپنی ہمت ہے کہ ہم پھر بھی جئے جاتے ہیں
زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں
لیکن اب ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں
اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں

عرصۂ دہر کی جھلسی ہوئی ویرانی میں
ہم کو رہنا ہے پہ یونہی تو نہیں رہنا ہے
اجنبی ہاتھوں کا بے نام گراں بار ستم
آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے

یہ ترے حسن سے لپٹی ہوئی آلام کی گرد
اپنی دو روزہ جوانی کی شکستوں کا شمار
چاندنی راتوں کا بے کار دہکتا ہوا درد
دل کی بے سود تڑپ، جسم کی مایوس پکار
چند روز اور مری جان! فقط چند ہی روز

کُتے

یہ گلیوں کے آوارہ، بے کار کتے
کہ بخشا گیا جن کو ذوقِ گدائی
زمانہ کی پھٹکار سرمایہ اُن کا
جہاں بھر کی دھتکار اُن کی کمائی

نہ آرام شب کو، نہ راحت سویرے
غلاظت میں گھر نالیوں میں بسیرے

جو بگڑیں تو اک دوسرے سے لڑا دو
ذرا ایک روٹی کا ٹکڑا دکھا دو

یہ ہر ایک کی ٹھوکریں کھانے والے
یہ فاقوں سے اُکتا کے مر جانے والے

یہ مظلوم مخلوق گر سر اُٹھائے
تو انسان سب سرکشی بھول جائے

یہ چاہیں تو دنیا کو اپنا بنا لیں
یہ آقاؤں کی ہڈیاں تک چبا لیں

کوئی اِن کو احساسِ ذلت دلا دے
کوئی اِن کی سوئی ہوئی دُم ہلا دے

بول....

بول، کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول، زباں اب تک تیری ہے
تیرا ستواں جسم ہے تیرا
بول، کہ جاں اب تک تیری ہے
دیکھ کہ آہن گر کی دکاں میں
تند ہیں شعلے، سرخ ہے آہن
کھلنے لگے قفلوں کے دہانے
پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن
بول، یہ تھوڑا وقت بہت ہے
جسم و زباں کی موت سے پہلے
بول، کہ سچ زندہ ہے اب تک
بول، جو کچھ کہنا ہے کہہ لے

اقبال

آیا ہمارے دیس میں اک خوش نوا فقیر
آیا اور اپنی دھن میں غزل خواں گذر گیا

سنسان راہیں خلق سے آباد ہو گئیں
ویران مے کدوں کا نصیبہ سنور گیا
تھیں چند ہی نگاہیں جو اُس تک پہنچ سکیں
پر اُس کا گیت سب کے دلوں میں اُتر گیا

اب دُور جا چکا ہے وہ شاہِ گدا نُما
اور پھر سے اپنے دیس کی راہیں اُداس ہیں
چند اک کو یاد ہے کوئی اُس کی ادائے خاص
دو اک نگاہیں چند عزیزوں کے پاس ہیں
پر اُس کا گیت سب کے دلوں میں مقیم ہے
اور اُس کی لے سے سیکڑوں لذّت شناس ہیں

اس گیت کے تمام محاسن ہیں لازوال
اس کا وفور، اس کا خروش، اس کا سوز و ساز
یہ گیت مثلِ شعلۂ جوالہ تند و تیز
اس کی لپک سے بادِ فنا کا جگر گداز
جیسے چراغ وحشتِ صَرصَر سے بے خطر
یا شمعِ بزم صبح کی آمد سے بے نیاز

موضوعِ سخن

گُل ہوئی جاتی ہے افسردہ سُلگتی ہوئی شام
دُھل کے نکلے گی ابھی چشمۂ مہتاب سے رات
اور مشتاق نگاہوں کی سُنی جائے گی
اور اُن ہاتھوں سے مَس ہوں گے یہ ترسے ہوئے ہاتھ

اُن کا آنچل ہے کہ رخسار، کہ پیراہن ہے!
کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے چلمن رنگیں
جانے اُس زلف کی موہوم گھنی چھاؤں میں
ٹمٹماتا ہے وہ آویزہ ابھی تک کہ نہیں!

آج پھر حُسن دل آرا کی وہی دھج ہوگی
وہی خوابیدہ سی آنکھیں، وہی کاجل کی لکیر
رنگِ رخسار پہ ہلکا سا وہ غازے کا غبار
صندلی ہاتھ پہ دھندلی سی حنا کی تحریر

اپنے افکار کی، اشعار کی دنیا ہے یہی
جانِ مضموں ہے یہی شاہدِ معنیٰ ہے یہی

آج تک سُرخ و سیہ صدیوں کے سائے کے تلے
آدم و حوّا کی اولاد پہ کیا گذری ہے!
موت اور زیست کی روزانہ صف آرائی میں
ہم پہ کیا گذرے گی، اجداد پہ کیا گذری ہے!

ان دمکتے ہوئے شہروں کی فراواں مخلوق
کیوں فقط مَرنے کی حسرت میں جیا کرتی ہے؟
یہ حسیں کھیت پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا
کس لئے اِن میں فقط بھوک اُگا کرتی ہے؟

یہ ھراک سمت پُراسرار کڑی دیواریں
جل بجھے جن میں ہزاروں کی جوانی کے چراغ
یہ ھراک گام پہ اُن خوابوں کی مقتل گاہیں
جن کے پَرتو سے چراغاں ہیں ہزاروں کے دماغ

یہ بھی ہیں، ایسے کئی اور بھی مضموں ہوں گے
لیکن اُس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹ
ہائے اس جسم کے کم بخت، دل آویز خطوط!
آپ ہی کہئے کہیں ایسے بھی افسوں ہوں گے

اپنا موضوعِ سخن ان کے سوا اور نہیں !
طبعِ شاعر کا وطن ان کے سوا اور نہیں!

ہم لوگ

دل کے ایواں میں لئے گل شدہ شمعوں کی قطار
نورِ خورشید سے سہمے ہوئے، اُکتائے ہوئے
حُسنِ محبوب کے سیّال تصور کی طرح
اپنی تاریکی کو بھینچے ہوئے، لپٹائے ہوئے
غایتِ سُود و زیاں، صورتِ آغاز و مآل
وہی بے سُود تجسس، وہی بے کار سوال
مضمحل ساعتِ امروز کی بے رنگی سے
یادِ ماضی سے غمیں، دہشتِ فردا سے نڈھال!
تشنہ افکار جو تسکین نہیں پاتے ہیں
سوختہ اشک جو آنکھوں میں نہیں آتے ہیں
اک کڑا درد کہ جو گیت میں ڈھلتا ہی نہیں
دل کے تاریک شگافوں سے نکلتا ہی نہیں
اور اک اُلجھی ہوئی موہوم سی درماں کی تلاش
دشت و زنداں کی ہوس، چاکِ گریباں کی تلاش

سیاسی لیڈر کے نام

سالہا سال یہ بے آسرا جکڑے ہوئے ہاتھ
رات کے سخت و سیہ سینے میں پیوست رہے
جس طرح تنکا سمندر سے ہو سرگرمِ ستیز
جس طرح تیتری کہسار پہ یلغار کرے!

اور اب رات کے سنگین و سیہ سینے میں
اتنے گھاؤ ہیں کہ جس سمت نظر جاتی ہے
جابجا نُور نے اک جال سا بُن رکھا ہے
دُور سے صبح کی دھڑکن کی صدا آتی ہے

تیرا سرمایہ، تری آس یہی ہاتھ تو ہیں
اور کچھ ہے بھی ترے پاس؟ یہی ہاتھ تو ہیں!
تجھ کو منظور نہیں غلبۂ ظلمت لیکن
تجھ کو منظور ہے یہ ہاتھ قلم ہو جائیں
اور مشرق کی کمیں گہ میں دھڑکتا ہوا دن
رات کی آہنی میّت کے تلے دب جائے!

اے دلِ بیتاب ٹھہر

تیرگی ہے کہ اُمنڈتی ہی چلی آتی ہے
شب کی رگ رگ سے لہو پھوٹ رہا ہو جیسے
چل رہی ہے کچھ اس انداز سے نبضِ ہستی
دونوں عالم کا نشہ ٹوٹ رہا ہو جیسے

رات کا گرم لہو اور بھی بہہ جانے دو
یہی تاریکی تو ہے غازۂ رخسارِ سحر
صبح ہونے ہی کو ہے اے دلِ بے تاب ٹھہر

ابھی زنجیر چھنکتی ہے پسِ پردۂ ساز
مطلق الحکم ہے شیرازۂ اسباب ابھی
ساغرِ ناب میں آنسو بھی ڈھلک جاتے ہیں
لغزشِ پا میں ہے پابندیٔ آداب ابھی

اپنے دیوانوں کو دیوانہ تو بن لینے دو
اپنے مے خانوں کو مے خانہ تو بن لینے دو
جلد یہ سطوتِ اسباب بھی اُٹھ جائے گی
یہ گرانباریٔ آداب بھی اُٹھ جائے گی

خواہ زنجیر چھنکتی ہی چھنکتی ہی رہے

مرے ہمدم مرے دوست!

گر مجھے اس کا یقیں ہو مرے ہمدم مرے دوست!
گر مجھے اس کا یقیں ہو کہ ترے دل کی تھکن
تیری آنکھوں کی اداسی، ترے سینے کی جلن
میری دل جوئی، مرے پیار سے مٹ جائے گی

گر مرا حرفِ تسلی وہ دوا ہو جس سے
جی اٹھے پھر ترا اجڑا ہوا بے نور دماغ
تیری پیشانی سے دھل جائیں یہ تذلیل کے داغ
تیری مدقوق جوانی کو شفا ہو جائے

گر مجھے اس کا یقیں ہو مرے بھائی، مرے دوست
میں تجھے بھینچ لوں، سینے سے لگا لوں تجھ کو
روز و شب، شام و سحر میں تجھے بہلاتا رہوں
میں تجھے گیت سناتا رہوں، ہلکے شیریں
آبشاروں کے، بہاروں کے، چمن زاروں کے گیت
آمدِ صبح کے، مہتاب کے، سیاروں کے گیت
تجھ سے میں حسن و محبت کی حکایات کہوں

کیسے مغرور حسیناؤں کے برفاب سے جسم
گرم ہاتھوں کی حرارت میں پگھل جاتے ہیں
کیسے اک چہرے کے ٹھہرے ہوئے مانوس نقوش!
دیکھتے دیکھتے یک لخت بدل جاتے ہیں
کس طرح عارضِ محبوب کا شفاف بلور
یک بیک بادۂ احمر سے دہک جاتا ہے
کیسے جھکتی ہے سرِ شاخ سے خود برگِ گلاب
کس طرح رات کا ایوان مہک جاتا ہے
یوں ہی گاتا رہوں، گاتا رہوں، تیری خاطر
گیت بُنتا رہوں، بیٹھا رہوں، تیری خاطر

پر مرے گیت ترے دکھ کا مداوا ہی نہیں
نغمہ جرّاح نہیں، مونس و غم خوار سہی
گیت نشتر تو نہیں، مرہمِ آزار سہی
تیرے آزار کا چارہ نہیں نشتر کے سوا
اور یہ سفاک مسیحا مرے قبضے میں نہیں
اس جہاں کے کسی ذی رُوح کے قبضے میں نہیں
ہاں مگر تیرے سوا، تیرے سوا، تیرے سوا

غزلیں

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گذار کے

ویراں ہے مے کدہ، خم و ساغر اُداس ہیں
تم کیا گئے کہ رُوٹھ گئے دن بہار کے

اک فرصتِ گناہ ملی، وہ بھی چار دِن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے، پروردگار کے

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

بھُولے سے مُسکرا تو دیئے تھے وہ آج فیضؔ
مت پُوچھ ولولے دلِ ناکردہ کار کے

فریبِ آرزو کی سہل انگاری نہیں جاتی
ہم اپنے دل کی دھڑکن کو تری آوازِ پا سمجھے

اک تری دید چھن گئی مجھ سے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں باقی

تیز ہے آج دردِ دل ساقی
تلخیٔ مے کو بے اثر کر دے
فیضؔ تکمیلِ آرزو معلوم!
ہو سکے تو یونہی بسر کر دے

وفائے وعدہ نہیں، وعدۂ دگر بھی نہیں
وہ مجھ سے رُوٹھے تو تھے لیکن اس قدر بھی نہیں
نہ جانے کس لئے اُمید وار بیٹھا ہوں
اک ایسی راہ پہ جو تیری رہگذر بھی نہیں

کچھ دن سے انتظارِ سوالِ دگر میں ہے
وہ مضمحل حیا جو کسی کی نظر میں ہے
سیکھی یہیں مرے دلِ کافر نے بندگی
ربِّ کریم ہے تو تری رہگذر میں ہے

پھر آگ بھڑکنے لگی ہر سازِ طرب میں
پھر شعلے لپکنے لگے ہر دیدۂ تر سے
وہ رنگ ہے امسال گلستاں کی فضا کا
اوجھل ہوئی دیوارِ قفس حدِّ نظر سے

دوسرا مجموعۂ کلام

دستِ صبا

قطعات

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مُہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

نہ پوچھ جب سے ترا انتظار کتنا ہے
کہ جن دنوں سے مجھے تیرا انتظار نہیں
ترا ہی عکس ہے ان اجنبی بہاروں میں
جو تیرے لب، ترے بازو، ترا کنار نہیں

صبا کے ہات میں نرمی ہے ان کے ہاتوں کی
ٹھہر ٹھہر کے یہ ہوتا ہے آج دل کو گماں

وہ بات ڈھونڈ رہے ہیں بساطِ محفل میں
کہ دل کے داغ کہاں ہیں نشستِ درد کہاں

جاں بیچنے کو آئے تو بے دام بیچ دی
اے اہلِ مصر وضعِ تکلف تو دیکھئے
انصاف ہے کہ حکمِ عقوبت سے پیشتر
اک بار سوئے دامنِ یوسف تو دیکھئے

ہمارے دم سے ہے کوئے جنوں میں اب بھی خجل
عبائے شیخ و قبائے امیر و تاجِ شہی
ہمیں سے سنتِ منصور و قیس زندہ ہے
ہمیں سے باقی ہے گُل دامنی و کج کُلہی

صبحِ آزادی

(اگست سنہ ۴۷ء)

یہ داغ داغ اُجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں

فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل
کہیں تو ہوگا شبِ سست موج کا ساحل
کہیں تو جا کے رُکے گا سفینۂ غمِ دل
جواں لہو کی پُر اسرار شاہراہوں سے
چلے جو یار تو دامن پہ کتنے ہاتھ پڑے
دیارِ حسن کی بے صبر خواب گاہوں سے
پکارتی رہیں باہیں بدن بلاتے رہے
بہت عزیز تھی لیکن رُخِ سحر کی لگن
بہت قریں تھا حسینانِ نور کا دامن
سبک سبک تھی تمنا، دبی دبی تھی تھکن

سنا ہے ہو بھی چکا ہے فراقِ ظلمت و نور
سنا ہے ہو بھی چکا ہے وصالِ منزل و گام
بدل چکا ہے بہت اہلِ درد کا دستور
نشاطِ وصل حلال و عذابِ ہجر حرام

جگر کی آگ، نظر کی اُمنگ، دل کی جلن
کسی پہ چارۂ ہجراں کا کچھ اثر ہی نہیں

کہاں سے آئی نگارِ صبا، کدھر کو گئی
ابھی چراغِ سرِ رہ کو کچھ خبر ہی نہیں
ابھی گرانیٔ شب میں کمی نہیں آئی!
نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

دو آوازیں

(پہلی آواز)

اب سعی کا امکاں اور نہیں، پرواز کا مضموں ہو بھی چکا
تاروں پہ کمندیں پھینک چکے، مہتاب پہ شبخوں ہو بھی چکا
اب اور کسی فردا کے لئے ان آنکھوں سے کیا پیماں کیجے
کس خواب کے جھوٹے افسوں سے تسکینِ دلِ ناداں کیجے!
جینے کے فسانے رہنے دو، اب ان میں الجھ کر کیا ہوگا
اک موت کا دھندا باقی ہے جب چاہیں گے نپٹا لیں گے
یہ تیرا کفن، وہ میرا کفن، یہ میری لحد، وہ تیری ہے

(دوسری آواز)

ہستی کی متاعِ بے پایاں جاگیر تری نہ میری ہے
اس بزم میں اپنی مشعلِ دل بسمل ہے تو کیا رخشاں ہے تو کیا

یہ بزم چراغاں رہتی ہے، اک طاق اگر ویراں ہے تو کیا
افسردہ ہیں گر ایام ترے، بدلا نہیں مسلکِ شام و سحر
ٹھہرے نہیں موسمِ گل کے قدم، قائم ہے جمالِ شمس و قمر
آباد ہے وادیٔ کاکل و لب شاداب و حسیں گلگشتِ نظر
مقسوم ہے لذتِ دردِ جگر، موجود ہے نعمتِ دیدۂ تر
اس دیدۂ تر کا شکر کرو، اس ذوقِ نظر کا شکر کرو
اس شام و سحر کا شکر کرو، اس شمس و قمر کا شکر کرو

(پہلی آواز)

گر ہے یہی مسلکِ شمس و قمر ان شمس و قمر کا کیا ہوگا
رعنائیٔ شب کا کیا ہوگا، اندازِ سحر کا کیا ہوگا
جب خونِ جگر برفاب بنا، جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں
اس دیدۂ تر کا کیا ہوگا، اس ذوقِ نظر کا کیا ہوگا
جب شعر کے خیمے راکھ ہوئے نغموں کی طنابیں ٹوٹ گئیں
یہ ساز کہاں سر پھوڑیں گے، اس کلکِ گہر کا کیا ہوگا
جب کنجِ قفس مسکن ٹھہرا، اور جیب و گریباں طوق و رسن
آئے کہ نہ آئے موسمِ گل اس دردِ جگر کا کیا ہوگا

(دوسری آواز)

یہ ہاتھ سلامت ہیں جب تک، اس خوں میں حرارت ہے جب تک

اس دل میں صداقت ہے جب تک، اس نطق میں طاقت ہے جب تک
ان طوق و سلاسل کو ہم تم سکھلائیں گے شورشِ بربط و نے
وہ شورش جس کے آگے زبوں ہنگامۂ طبلِ قیصر و کے
آزاد ہیں اپنے فکر و عمل بھرپور خزینہ ہمت کا
اک عمر ہے اپنی ہر ساعت، امروز ہے اپنا ہر فردا
یہ شام و سحر، یہ شمس و قمر، یہ اختر و کوکب اپنے ہیں
یہ لوح و قلم، یہ طبل و علم، یہ مال و حشم سب اپنے ہیں

سرِ مقتل

(قوالی)

کہاں ہے منزلِ راہِ تمنا ہم بھی دیکھیں گے
یہ شب ہم پر بھی گزرے گی یہ فردا ہم بھی دیکھیں گے
ٹھہر اے دل! جمالِ روئے زیبا ہم بھی دیکھیں گے

ذرا صیقل تو ہو لے تشنگی بادہ گساروں کی
دبا رکھیں گے کب تک جوشِ صہبا ہم بھی دیکھیں گے
اٹھا رکھیں گے کب تک جام و مینا ہم بھی دیکھیں گے

صلا آ تو چکے محفل میں اس کوئے ملامت سے

کسے روکے گا شورِ پند بے جا ہم بھی دیکھیں گے
کسے ہے جا کے لوٹ آنے کا یارا ہم بھی دیکھیں گے

چلے ہیں جان و ایماں آزمانے آج دل والے
وہ لائیں لشکرِ اغیار و اعدا ہم بھی دیکھیں گے
وہ آئیں تو سرِ مقتل تماشا ہم بھی دیکھیں گے

یہ شب کی آخری ساعت گراں کیسی بھی ہو ہمدم
جو اس ساعت میں پنہاں ہے اجالا ہم بھی دیکھیں گے
جو فرقِ صبح پر چمکے گا تارا ہم بھی دیکھیں گے

.... تمہارے حسن کے نام

سلام لکھتا ہے شاعر تمہارے حسن کے نام
بکھر گیا جو کبھی رنگِ پیرہن سرِ بام
نکھر گئی ہے کبھی صبح، دوپہر، کبھی شام
کہیں جو قامتِ زیبا پہ سج گئی ہے قبا
چمن میں سرو و صنوبر سنور گئے ہیں تمام
بنی بساطِ غزل جب ڈبو لیے دل نے
تمہارے سایۂ رخسار و لب میں ساغر و جام

سلام لکھتا ہے شاعر تمہارے حسن کے نام

تمہارے ہات پہ ہے تابشِ حنا جب تک
جہاں میں باقی ہے دل داریٔ عروسِ سخن
تمہارا حسن جواں ہے تو مہرباں ہے فلک
تمہارا دم ہے تو دمساز ہے ہوائے وطن
اگرچہ تنگ ہیں اوقات، سخت ہیں آلام
تمہاری یاد سے شیریں ہے تلخیٔ ایام
سلام لکھتا ہے شاعر تمہارے حُسن کے نام

دو عشق!

(۱)

تازہ ہیں ابھی یاد میں اے ساقیٔ گلفام
وہ عکسِ رُخِ یار سے لہکے ہوئے ایّام
وہ پھول سی کھلتی ہوئی دیدار کی ساعت
وہ دل سا دھڑکتا ہوا امید کا ہنگام

امید کہ لو جاگا غمِ دل کا نصیبہ
لو شوق کی ترسی ہوئی شب ہو گئی آخر

لو ڈوب گئے درد کے بے خواب ستارے
اب چمکے گا بے صبر نگاہوں کا مقدر

اس بام سے نکلے گا ترے حسن کا خورشید
اس کنج سے پھوٹے گی کرن رنگِ حنا کی
اس در سے بہے گا تری رفتار کا سیماب
اس راہ پہ پھولے گی شفق تیری قبا کی

پھر دیکھے ہیں وہ ہجر کے تپتے ہوئے دن بھی
جب فکرِ دل و جاں میں فغاں بھول گئی ہے
ہر شب وہ سیہ بوجھ کہ دل بیٹھ گیا ہے
ہر صبح کی لو تیر سی سینے میں لگی ہے

تنہائی میں کیا کیا نہ تجھے یاد کیا ہے
کیا کیا نہ دلِ زار نے ڈھونڈی ہیں پناہیں
آنکھوں سے لگایا ہے کبھی دستِ صبا کو
ڈالی ہیں کبھی گردنِ مہتاب میں باہیں

(۲)

چاہا ہے اسی رنگ میں لیلائے وطن کو

تڑپا ہے اسی طور سے دل اس کی لگن میں
ڈھونڈی ہے یوں ہی شوق نے آسائشِ منزل
رخسار کے خم میں کبھی کاکل کی شکن میں

اس جانِ جہاں کو بھی یوں ہی قلب و نظر نے
ہنس ہنس کے صدا دی کبھی رو رو کے پکارا
پورے کئے سب حرفِ تمنّا کے تقاضے
ہر درد کو اُجیالا ، ہر اک غم کو سنوارا

واپس نہیں پھیرا کوئی فرمان جنوں کا
تنہا نہیں لوٹی کبھی آواز جرس کی
خیریتِ جاں ، راحتِ تن ، صحتِ داماں
سب بھول گئیں مصلحتیں اہلِ ہوس کی

اس راہ میں جو سب پہ گذرتی ہے وہ گذری
تنہا پسِ زنداں ، کبھی رُسوا سرِ بازار
گرجے ہیں بہت شیخ سرِ گوشۂ منبر
کڑکے ہیں بہت اہلِ حکم برسرِ دربار

چھوڑا نہیں غیروں نے کوئی ناوکِ دشنام
چھوٹی نہیں اپنوں سے کوئی طرزِ ملامت
اِس عشق نہ اُس عشق پہ نادم ہے مگر دِل
ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغِ ندامت

نوحہ

مجھ کو شکوہ ہے مرے بھائی کہ تم جاتے ہوئے
لے گئے ساتھ مری عمرِ گذشتہ کی کتاب
اس میں تو میری بہت قیمتی تصویریں تھیں
اس میں بچپن تھا مرا اور مرا عہدِ شباب
اس کے بدلے مجھے تم دے گئے جاتے جاتے
اپنے غم کا یہ دمکتا ہوا خوں رنگ گلاب
کیا کروں بھائی، یہ اعزاز میں کیونکر پہنوں؟
مجھ سے لے لو مری سب چاک قمیصوں کا حساب
آخری بار ہے، لو مان لو اک یہ بھی سوال!
آج تک تم سے میں لوٹا نہیں مایوسِ جواب
آکے لے جاؤ تم اپنا یہ دمکتا ہُوا پھول
مجھ کو لوٹا دو مری عمرِ گذشتہ کی کتاب

(۱۸ جولائی ۵۲ء)

اگست ۱۹۵۲ء

روشن کہیں بہار کے امکاں ہوئے تو ہیں
گلشن میں چاک چند گریباں ہوئے تو ہیں

اب بھی خزاں کا راج ہے لیکن کہیں کہیں
گوشے چمن چمن میں غزل خواں ہوئے تو ہیں

ٹھہری ہوئی ہے شب کی سیاہی وہیں، مگر
کچھ کچھ سحر کے رنگ پَرافشاں ہوئے تو ہیں

ان میں لہو جلا ہو ہمارا کہ جان و دل
محفل میں کچھ چراغ فروزاں ہوئے تو ہیں

ہاں کج کرو کلاہ کہ سب کچھ لُٹا کے ہم
اب بے نیازِ گردشِ دوراں ہوئے تو ہیں

اہلِ قفس کی صبح چمن میں کھُلے گی آنکھ
بادِ صبا سے وعدہ و پیماں ہوئے تو ہیں

ہے دشت اب بھی دشت مگر خونِ پا سے فیضؔ
سیراب چند خارِ مغیلاں ہوئے تو ہیں

نثار میں تیری گلیوں پہ.....

نثار میں تری گلیوں پہ اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چرا کے چلے، جسم وجاں بچا کے چلے
ہے اہلِ دل کے لئے اب یہ نظمِ بست وکشاد
کہ سنگ[1] وخشت مقید ہیں اور سگ آزاد

بہت ہے ظلم کے دستِ بہانہ جو کے لئے
جو چند اہلِ جنوں تیرے نام لیوا ہیں
بنے ہیں اہلِ ہوس، مدعی بھی منصف بھی
کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں
مگر گذارنے والوں کے دن گذرتے ہیں
ترے فراق میں یوں صبح وشام کرتے ہیں

بجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی

---

[1] سنگ را بستند وسگاں کشادند (شیخ سعدی)

چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رُخ پر بکھر گئی ہو گی
غرض تصورِ شام و سحر میں جیتے ہیں
گرفتِ سایۂ دیوار و دَر میں جیتے ہیں

یونہی ہمیشہ اُلجھتی رہی ہے ظلم سے خلق
نہ اُن کی رسم نئی ہے، نہ اپنی ریت نئی
یونہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ اُن کی ہار نئی ہے، نہ اپنی جیت نئی
اسی سبب سے فلک کا گلہ نہیں کرتے
ترے فراق میں ہم دل بُرا نہیں کرتے

گر آج تجھ سے جُدا ہیں تو کل بہم ہوں گے
یہ رات بھر کی جدائی تو کوئی بات نہیں
گر آج اَوج پہ ہے طالعِ رقیب تو کیا
یہ چار دن کی خدائی تو کوئی بات نہیں
جو تجھ سے عہدِ وفا استوار رکھتے ہیں
علاجِ گردشِ لیل و نہار رکھتے ہیں

شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں

موتی ہو کہ شیشہ، جام کہ دُر　　　جو ٹوٹ گیا، سو ٹوٹ گیا
کب اشکوں سے جُڑ سکتا ہے　　　جو ٹوٹ گیا، سو چھوٹ گیا

تم ناحق ٹکڑے چن چن کر
دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
کیا آس لگائے بیٹھے ہو

شاید کہ انہیں ٹکڑوں میں کہیں　　　وہ ساغرِ دل ہے جس میں کبھی
صد ناز سے اُترا کرتی تھی　　　صہبائے غمِ جاناں کی پری

پھر دنیا والوں نے تم سے
یہ ساغر لے کر پھوڑ دیا
جو مے تھی بہا دی مٹی میں
مہمان کا شہپر توڑ دیا

یہ رنگیں ریزے ہیں شاید　　　اُن شوخ بلوریں سپنوں کے
تم مست جوانی میں جن سے　　　خلوت کو سجایا کرتے تھے

ناداری، دفتر، بھوک اور غم

ان سپنوں سے ٹکراتے رہے

بے رحم کھتا پچو مکھ پتھراؤ

یہ کانچ کے ڈھانچے کیا کرتے

یا شاید ان ذرّوں میں کہیں   موتی ہے تمہاری عزت کا

وہ جس سے تمہارے عجز پہ بھی   شمشادقدوں نے رشک کیا

اس مال کی دھن میں پھرتے تھے

تاجر بھی بہت، رہزن بھی کئی

ہے چور نگر، یاں مفلس کی

گر جان بچی تو آن گئی

یہ ساغر، شیشے، لعل و گہر   سالم ہوں تو قیمت پاتے ہیں

یوں ٹکڑے ٹکڑے ہوں تو فقط   چبھتے ہیں، لہو رلواتے ہیں

تم ناحق شیشے چن چن کر

دامن میں چھپائے بیٹھے ہو

شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں

کیا آس لگائے بیٹھے ہو

یادوں کے گریبانوں کے رفو   پر دل کی گذر کب ہوتی ہے

اک بخیہ ادھیڑا، ایک سیا   یوں عمر بسر کب ہوتی ہے

اس کارگہِ ہستی میں جہاں
یہ ساغر، شیشے ڈھلتے ہیں
ہر شے کا بدل مل سکتا ہے
سب دامن پُر ہو سکتے ہیں

جو ہاتھ بڑھے یاور ہے یہاں　　جو آنکھ اٹھے وہ بختاور
یاں دھن دولت کا انت نہیں　　ہوں گھات میں ڈاکو لاکھ مگر
کب لوٹ جھپٹ سے ہستی کی
دوکانیں خالی ہوتی ہیں
یاں پربت پربت ہیرے ہیں
یاں ساگر ساگر موتی ہیں

کچھ لوگ ہیں جو اس دولت پر　　پردے لٹکاتے پھرتے ہیں
ہر پربت کو، ہر ساگر کو　　نیلام چڑھاتے پھرتے ہیں
کچھ وہ بھی ہیں جو لڑ بھڑ کر
یہ پردے نوچ گراتے ہیں
ہستی کے اُٹھائی گیروں کی
ہر چال اُلجھائے پھرتے ہیں

اِن دونوں میں رن پڑتا ہے　　نت بستی بستی، نگر نگر

ہر رستے گھر کے سینے میں　　ہر چلتی راہ کے ماتھے پر

یہ کالک بھرتے پھرتے ہیں

وہ جوت جگاتے رہتے ہیں

یہ آگ لگاتے پھرتے ہیں

وہ آگ بجھاتے رہتے ہیں

سب ساغر، شیشے، لعل و گہر　　اس بازی میں بد جاتے ہیں

اٹھو سب خالی ہاتھوں کو　　اس رن سے بلاوے آتے ہیں

زنداں کی ایک شام

شام کے پیچ و خم ستاروں سے

زینہ زینہ اُتر رہی ہے رات

یُوں صبا پاس سے گذرتی ہے

جیسے کہہ دی کسی نے پیار کی بات

صحنِ زنداں کے بے وطن اشجار

سرنگوں، محو ہیں بنانے میں

دامنِ آسماں پہ نقش و نگار

شانۂ بام پر دمکتا ہے

مہرباں چاندنی کا دستِ جمیل
خاک میں گھل گئی ہے آبِ نجوم
نور میں گھل گیا ہے عرش کا نیل
سبز گوشوں میں نیلگوں سائے
لہلہاتے ہیں جس طرح دل میں
موجِ دردِ فراقِ یار آئے

دل سے پیہم خیال کہتا ہے
اتنی شیریں ہے زندگی اس پل
ظلم کا زہر گھولنے والے
کامراں ہو سکیں گے آج نہ کل
جلوہ گاہِ وصال کی شمعیں
وہ بجھا بھی چکے اگر تو کیا
چاند کو گل کریں تو ہم جانیں

زنداں کی ایک صبح

رات باقی تھی ابھی جب سرِ بالیں آکر
چاند نے مجھ سے کہا، جاگ سحر آئی ہے

جاگ اس شب جو مئے ناب ترا حصہ تھی
جام کے لب سے تہہِ جام اُتر آئی ہے"
عکسِ جاناں کو وداع کرکے اُٹھی میری نظر
شب کے ٹھہرے ہوئے پانی کی سیہ چادر پر
جا بجا رقص میں آنے لگے چاندی کے بھنور
چاند کے ہاتھ سے تاروں کے کنول گر گر کر
ڈوبتے، تیرتے، مرجھاتے رہے کھلتے رہے
رات اور صبح بہت دیر گلے ملتے رہے

صحنِ زنداں میں رفیقوں کے سنہرے چہرے
سطحِ ظلمت سے دمکتے ہوئے اُبھرے کم کم
نیند کی اوس نے ان چہروں سے دھو ڈالا تھا
دیس کا دردِ فراقِ رخِ محبوب کا غم

دور نوبت ہوئی، پھرنے لگے بیزار قدم
زرد فاقوں کے ستائے ہوئے پہرے والے
اہلِ زنداں کے غضب ناک خروشاں نالے
جن کی باہوں میں پھرا کرتے ہیں باہیں ڈالے

لذّتِ خواب سے مخمور ہوائیں جاگیں
جیل کی زہر بھری چُور صدائیں جاگیں
دُور دروازہ کھُلا کوئی، کوئی بند ہوا
دُور مچلی کوئی زنجیر، مچل کے روئی
دُور اُترا کسی تالے کے جگر میں خنجر
سر پٹکنے لگا رہ رہ کے دریچہ کوئی
گویا پھر خواب سے بیدار ہوئے دشمنِ جاں
سنگ و فولاد سے ڈھالے ہوئے جنّاتِ گراں
جن کے چنگل میں شب و روز ہیں فریاد کناں
میرے بے کار شب و روز کی نازک پریاں
اپنے شہپور کی رہ دیکھ رہی ہیں یہ اسیر
جس کے ترکش میں ہیں امید کے جلتے ہوئے تیر

(ناتمام)

یاد

دشتِ تنہائی میں اے جانِ جہاں لرزاں ہیں
تیری آواز کے سائے، ترے ہونٹوں کے سراب
دشتِ تنہائی میں دُوری کے خس و خاک تلے

کھل رہے ہیں ترے پہلو کے سمن اور گلاب

اُٹھ رہی ہے کہیں قربت سے تری سانس کی آنچ
اپنی خوشبو میں سلگتی ہوئی مدھم مدھم
دُور افق پار، چمکتی ہوئی قطرہ قطرہ
گر رہی ہے تری دلدار نظر کی شبنم

اس قدر پیار سے اے جانِ جہاں رکھا ہے
دل کے رخسار پہ اس وقت تری یاد نے ہات
یُوں گماں ہوتا ہے، گرچہ ہے ابھی صبحِ فراق
ڈھل گیا ہجر کا دن، آ بھی گئی وصل کی رات

غزلیں

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گذرتی ہے رقم کرتے رہیں گے
اسبابِ غمِ عشق بہم کرتے رہیں گے
ویرانیٔ دوراں پہ کرم کرتے رہیں گے
ہاں تلخیٔ ایام ابھی اور بڑھے گی
ہاں اہلِ ستم، مشقِ ستم کرتے رہیں گے

منظور یہ تلخی، یہ ستم ہم کو گوارا
دم ہے تو مداوائے الم کرتے رہیں گے
مے خانہ سلامت ہے تو ہم سرخیٔ مے سے
تزئینِ در و بامِ حرم کرتے رہیں گے
باقی ہے لہو دل میں تو ہر اشک سے پیدا
رنگِ لب و رخسارِ صنم کرتے رہیں گے
اک طرزِ تغافل ہے سو وہ ان کو مبارک
اک عرضِ تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے

(۲)

روش روش ہے وہی انتظار کا موسم
نہیں ہے کوئی بھی موسم، بہار کا موسم
گراں ہے دل پہ غمِ روزگار کا موسم
ہے آزمائشِ حسنِ نگار کا موسم
خوشا نظارۂ رخسارِ یار کی ساعت
خوشا قرارِ دلِ بے قرار کا موسم
حدیثِ بادہ و ساقی نہیں تو کس مصرف
خرامِ ابرِ سرِ کوہسار کا موسم

نصیب صحبتِ یاراں نہیں تو کیا کیجے
یہ رقصِ سایۂ سرو و چنار کا موسم

یہ دل کے داغ تو دکھتے تھے یوں بھی پر کم کم
کچھ اب کے اور ہے ہجرانِ یار کا موسم

یہی جنوں کا، یہی طوق و دار کا موسم
یہی ہے جبر، یہی اختیار کا موسم

قفس ہے بس میں تمہارے، تمہارے بس میں نہیں
چمن میں آتشِ گل کے نکھار کا موسم

صبا کی مست خرامی تہِ کمند نہیں
اسیرِ دام نہیں ہے بہار کا موسم

بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
فروغِ گلشن و صوتِ ہزار کا موسم

(۳)

نہ تم آئے ہو، نہ شبِ انتظار گذری ہے
تلاش میں ہے سحر، بار بار گذری ہے

جنوں میں جتنی بھی گذری بکار گذری ہے
اگرچہ دل پہ خرابی ہزار گذری ہے

ہوئی ہے حضرت ناصح سے گفتگو جس شب

وہ شب ضرور سر کوئے یار گذری ہے

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا

وہ بات اُن کو بہت ناگوار گذری ہے

نہ گُل کھلے ہیں، نہ ان سے ملے، نہ مے پی ہے

عجیب رنگ میں اب کے بہار گذری ہے

چمن پہ غارتِ گلچیں سے جانے کیا گذری

قفس سے آج صبا بے قرار گذری ہے

(۴)

تمہاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں

کسی بہانے تمہیں یاد کرنے لگتے ہیں

حدیثِ یار کے عنواں نکھرنے لگتے ہیں

تو ہر حریم میں گیسو سنورنے لگتے ہیں

ہر اجنبی ہمیں محرم دکھائی دیتا ہے

جو اب بھی تیری گلی سے گذرنے لگتے ہیں

صبا سے کرتے ہیں غربت نصیب ذکرِ وطن

تو چشمِ صبح میں آنسو ابھرنے لگتے ہیں

وہ جب بھی کرتے ہیں اس نطق ولب کی بخیہ گری
فضا میں اور بھی نغمے بکھرنے لگتے ہیں
درِ قفس پہ اندھیرے کی مُہر لگتی ہے
تو فیض دل میں ستارے اُترنے لگتے ہیں

(۵)

رنگ پیراہن کا، خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسم گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام
دوستو، اس چشم ولب کی کچھ کہو جس کے بغیر
گلستاں کی بات رنگیں ہے، نہ مے خانے کا نام
پھر نظر میں پھول مہکے، دل میں پھر شمعیں جلیں
پھر تصور نے لیا اس بزم میں جانے کا نام

(ق)

دلبری ٹھہرا زبانِ خلق کھلوانے کا نام
اب نہیں لیتے پری رُو زلف بکھرانے کا نام
اب کسی لیلیٰ کو بھی اقرارِ محبوبی نہیں
ان دنوں بدنام ہے ہر ایک دیوانے کا نام
محتسب کی خیر، اُونچا ہے اسی کے فیض سے
رند کا، ساقی کا، مے کا، خم کا، پیمانے کا نام

ہم سے کہتے ہیں چمن والے، غریبانِ چمن

تم کوئی اچھا سا رکھ لو اپنے ویرانے کا نام

فیضؔ ان کو ہے تقاضائے وفا ہم سے جنہیں

آشنا کے نام سے پیارا ہے بیگانے کا نام

(۶)

شفق کی راکھ میں جل بجھ گیا ستارۂ شام

شبِ فراق کے گیسو فضا میں لہرائے

کوئی پکارو کہ اک عمر ہونے آئی ہے

فلک کو قافلۂ روز و شام ٹھہرائے

یہ ضد ہے یادِ حریفانِ بادہ پیما کی

کہ شب کو چاند نہ نکلے نہ دن کو ابر آئے

صبا نے پھر درِ زنداں پہ آکے دی دستک

سحر قریب ہے دل سے کہو نہ گھبرائے

جانے کیا وضع ہے اب رسمِ وفا کی اے دل

وضعِ دیرینہ پہ اصرار کروں یا نہ کروں

جانے کس رنگ میں تفسیر کریں اہلِ ہوس

مدحِ زلف و لب و رخسار کروں یا نہ کروں۔

گرانیٔ شبِ ہجراں دوچند کیا کرتے
علاجِ درد ترے دردمند کیا کرتے

جنہیں خبر تھی کہ شرطِ نواگری کیا ہے
وہ خوش نوا گلۂ قید و بند کیا کرتے

گلوئے عشق کو دار و رسن پہونچ نہ سکے
تو لوٹ آئے ترے سربلند، کیا کرتے

وہیں ہے دل کے قرائن تمام کہتے ہیں
وہ اک خلش کہ جسے تیرا نام کہتے ہیں

یہی کنارِ فلک کا سیہ تریں گوشہ
یہی ہے مطلعِ ماہِ تمام کہتے ہیں

پیئو کہ مفت لگا دی ہے خونِ دل کی کشید
گراں ہے اب کے مئے لالہ فام کہتے ہیں

فقیہہِ شہر سے مے کا جواز کیا پوچھیں
کہ چاندنی کو بھی حضرات حرام کہتے ہیں

دل میں اب یوں ترے بھولے ہوئے غم آتے ہیں
جیسے بچھڑے ہوئے کعبے میں صنم آتے ہیں

رقص مے تیز کرو، ساز کی لے تیز کرو
سُوئے مے خانہ سفیرانِ حرم آتے ہیں

آج تک شیخ کے اکرام میں جو شے تھی حرام
اب وہی دشمنِ دیں، راحتِ جاں ٹھہری ہے
ہے وہی عارضِ لیلیٰ وہی شیریں کا دہن
نگہِ شوق گھڑی بھر کو جہاں ٹھہری ہے
اک دفعہ بکھری تو ہاتھ آئی ہے کب موجِ شمیم
دل سے نکلی ہے تو کیا لب پہ فغاں ٹھہری ہے
دستِ صیّاد بھی عاجز ہے کفِ گلچیں بھی
بُوئے گل ٹھہری، نہ بلبل کی زباں ٹھہری ہے
ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیضؔ گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے

کسی گماں پہ توقع زیادہ رکھتے ہیں
پھر آج کوئے بتاں کا ارادہ رکھتے ہیں
بہار آئی تو کھل جائیں گے کہ ہم
بہیں شراب سے رنگیں تو غرقِ خوں ہیں کہ ہم
خیالِ وضعِ قمیص و لبادہ رکھتے ہیں

غمِ جہاں ہو غمِ یار ہو کہ تیرِ ستم
جو آئے آئے کہ ہم دل کشادہ رکھتے ہیں

یادِ غزال چشماں ذکرِ سمن عذاراں
جب چاہا کر لیا ہے کنجِ قفس بہاراں
آنکھوں میں درد مندی ہونٹوں پہ عذر خواہی
جانانہ وار آئی شامِ فراقِ یاراں
شاید قریب پہونچی صبحِ وصال ہمدم
موجِ صبا لئے ہے خوشبوئے خوش کناراں

اب احتیاط کی کوئی صورت نہیں رہی
قاتل سے رسم و راہ سوا کر چکے ہیں ہم
ان کی نظر میں کیا کریں پھیکا ہے اب بھی رنگ
جتنا لہو تھا صرفِ قبا کر چکے ہیں ہم

تیسرا مجموعۂ کلام

زنداں نامہ

اے حبیبِ عنبر دست

ایک اجنبی خاتون کے نام
خوشبو کا تحفہ وصول ہونے پر

کسی کے دستِ عنایت نے کنجِ زنداں میں
کیا ہے آج عجب دل نواز بندوبست
مہک رہی ہے فضا زلفِ یار کی صورت
ہوا ہے گرمیٔ خوشبو سے اس طرح سرمست
ابھی ابھی کوئی گزرا ہے گل بدن گویا
کہیں قریب سے، گیسو بدوش، غنچہ بدست
لئے ہے بوئے رفاقت اگر ہوائے چمن
تو لاکھ پہرے بٹھائیں قفس پہ ظلم پرست
ہمیشہ سبز رہے گی وہ شاخِ مہر و وفا
کہ جس کے ساتھ بندھی ہے دلوں کی فتح و شکست

یہ شعر حافظ شیراز، اے صبا! کہنا

ملے جو تجھ سے کہیں وہ حبیب عنبر دست

"خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی

بجز بنائے محبت کہ خالی از خلل است"

(سنٹرل جیل، حیدرآباد، ۲۸/۲۹ ر اپریل ۱۹۵۴ء)

مُلاقات

یہ رات اس درد کا شجر ہے

جو مجھ سے، تجھ سے عظیم تر ہے

عظیم تر ہے، کہ اس کی شاخوں

میں لاکھ مشعل بکف ستاروں

کے کارواں گھر کے کھو گئے ہیں

ہزار مہتاب، اس کے سائے

میں اپنا سب نور، رو گئے ہیں

یہ رات اس درد کا شجر ہے

جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے

مگر اسی رات کے شجر سے

یہ چند لمحوں کے زرد پتے

گرے ہیں، اور تیرے گیسوؤں میں
الجھ کے گلنار ہو گئے ہیں
اسی کی شبنم سے خامشی کے
یہ چند قطرے، تری جبیں پر
برس کے، ہیرے، پرو گئے ہیں

بہت سیہ ہے یہ رات، لیکن
اسی سیاہی میں رونما ہے
وہ نہرِ خوں جو مری صدا ہے
اسی کے سائے میں نور گر ہے
وہ موجِ زر جو تری نظر ہے

وہ غم جو اس وقت تیری باہوں
کے گلستاں میں سلگ رہا ہے
(وہ غم، جو اس رات کا ثمر ہے)
کچھ اور تپ جائے اپنی آہوں
کی آنچ میں تو یہی شرر ہے
ہر اک سیہ شاخ کی کماں سے

جگر میں ٹوٹے ہیں تیر جتنے
جگر سے نوچے ہیں اور ہر اک
کا ہم نے تیشہ بنا لیا ہے

الم نصیبوں، جگر فگاروں
کی صبح افلاک پر نہیں ہے
جہاں پہ ہم تم کھڑے ہیں دونوں
سحر کا روشن اُفق یہیں ہے
یہیں پہ غم کے شرار کھل کر
شفق کا گلزار بن گئے ہیں
یہیں پہ قاتل دکھوں کے تیشے
قطار اندر قطار کرنوں
کے آتشیں ہار بن گئے ہیں

یہ غم جو اس رات نے دیا ہے
یہ غم سحر کا یقیں بنا ہے
یقیں جو غم سے کریم تر ہے
سحر جو شب سے عظیم تر ہے

(منٹگمری جیل، ۱۲ اکتوبر-۳ نومبر ۱۹۵۴ء)

اے روشنیوں کے شہر

سبزہ سبزہ سوکھ رہی ہے پھیکی، زرد دوپہر
دیواروں کو چاٹ رہا ہے تنہائی کا زہر
دور اُفق تک گھٹتی، بڑھتی، اٹھتی، گرتی رہتی ہے
کہر کی صورت بے رونق دردوں کی گدلی لہر

بستا ہے اس کہر کے پیچھے روشنیوں کا شہر
اے روشنیوں کے شہر
اے روشنیوں کے شہر
کون کہے کس سمت ہے تیری روشنیوں کی راہ
ہر جانب بے نور کھڑی ہے ہجر کی شہر پناہ
تھک کر ہر سو بیٹھ رہی ہے شوق کی ماند سپاہ
آج مرا دل فکر میں ہے
اے روشنیوں کے شہر
شب خوں سے منہ پھیر نہ جائے ارمانوں کی رو
خیر ہو تیری لیلاؤں کی، ان سب سے کہہ دو
آج کی شب جب دیئے جلائیں، اونچی رکھیں لَو

لاہور جیل، منٹگمری جیل
۲۸ مارچ، ۱۵ اپریل ۵۴ء

ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

(ایتھل اور جولیس روزنبرگ کے خطوط سے متاثر ہو کر لکھی گئی)

تیرے ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت میں ہم
دار کی خشک ٹہنی پہ وارے گئے
تیرے ہاتھوں کی شمعوں کی حسرت میں ہم
نیم تاریک راہوں میں مارے گئے

سولیوں پر ہمارے لبوں سے پرے
تیرے ہونٹوں کی لالی لپکتی رہی
تیری زلفوں کی مستی برستی رہی
تیرے ہاتھوں کی چاندی دمکتی رہی

جب گھلی تیری راہوں میں شامِ ستم
ہم چلے آئے، لائے جہاں تک قدم
لب پہ حرفِ غزل، دل میں قندیلِ غم

اپنا غم تھا گواہی ترے حسن کی
دیکھ قائم رہے اس گواہی پہ ہم
ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

نارسائی اگر اپنی تقدیر تھی
تیری اُلفت تو اپنی ہی تدبیر تھی
کس کو شکوہ ہے گر شوق کے سلسلے
ہجر کی قتل گاہوں سے سب جا ملے

قتل گاہوں سے چُن کر ہمارے علَم
اور نکلیں گے عشاق کے قافلے
جن کی راہِ طلب سے ہمارے قدم
مختصر کر چلے درد کے فاصلے
کر چلے جن کی خاطر جہاں گیر ہم
جاں گنوا کر تری دلبری کا بھرم
ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

(منٹگمری جیل، ۱۵ مئی ۵۴ء)

دریچہ

گڑی ہیں کتنی صلیبیں مرے دریچے میں
ہر ایک اپنے مسیحا کے خوں کا رنگ لئے
ہر ایک وصلِ خداوند کی اُمنگ لئے

کسی پہ کرتے ہیں ابرِ بہار کو قرباں
کسی پہ قتل مہِ تابناک کرتے ہیں
کسی پہ ہوتی ہے سرمست شاخسار دونیم
کسی پہ بادِ صبا کو ہلاک کرتے ہیں

ہر آئے دن یہ خداوندگانِ مہر و جمال
لہو میں غرق مرے غم کدے میں آتے ہیں
اور آئے دن مری نظروں کے سامنے ان کے
شہید جسم سلامت اُٹھائے جاتے ہیں

(منٹگمری جیل، دسمبر ۱۹۵۴ء)

درد آئے گا دبے پاؤں ....

اور کچھ دیر میں، جب پھر مرے تنہا دل کو
فکر آ لے گی کہ تنہائی کا کیا چارہ کرے
درد آئے گا دبے پاؤں، لئے سُرخ چراغ
وہ جو اک درد دھڑکتا ہے کہیں دل سے پرے
شعلۂ درد جو پہلو میں لپک اُٹھے گا
دل کی دیوار پہ ہر نقش دمک اُٹھے گا

حلقۂ زلف کہیں، گوشۂ رخسار کہیں
ہجر کا دشت کہیں، گلشن دیدار کہیں
لطف کی بات کہیں، پیار کا اقرار کہیں

دل سے پھر ہوگی مری بات کہ اے دل اے دل
یہ جو محبوب بنا ہے، تری تنہائی کا
یہ تو مہماں ہے گھڑی بھر کا، چلا جائے گا
اس سے کب تیری مصیبت کا مداوا ہوگا

مشتعل ہو کے ابھی اٹھیں گے وحشی سائے
یہ چلا جائے گا، رہ جائیں گے باقی سائے
رات بھر جن سے ترا خون خرابا ہوگا

جنگ ٹھہری ہے کوئی کھیل نہیں ہے اے دل
دشمن جاں ہیں سبھی، سارے کے سارے قاتل
یہ کڑی رات بھی، یہ سائے بھی، تنہائی بھی
درد اور جنگ میں کچھ میل نہیں ہے اے دل

لاؤ، سلگاؤ کوئی جوشِ غضب کا انگار

طیش کی آتشِ جرّار کہاں ہے، لاؤ
وہ دہکتا ہوا گلزار کہاں ہے، لاؤ
جس میں گرمی بھی ہے، حرکت بھی، توانائی بھی

ہو نہ ہو اپنے قبیلے کا بھی کوئی لشکر
منتظر ہوگا اندھیرے کی فصیلوں کے اُدھر
ان کو شعلوں کے رجز اپنا پتا تو دیں گے
خیر، ہم تک وہ نہ پہونچیں بھی، صدا تو دیں گے
دُور کتنی ہے ابھی صبح، بتا تو دیں گے

(منٹگمری جیل، یکم دسمبر سنہ ۶۵ء)

AFRICA COME BACK

(ایک رجز)

آجاؤ، میں نے سُن لی ترے ڈھول کی ترنگ
آجاؤ، مَست ہوگئی میرے لہو کی تال
"آجاؤ ایفریقا"*
آجاؤ، میں نے دھول سے ماتھا اُٹھا لیا
آجاؤ، میں نے چھیل دی آنکھوں سے غم کی چھال

---

* افریقی حریت پسندوں کا نعرہ

آجاؤ، میں نے درد سے بازو چھڑا لیا
آجاؤ، میں نے نوچ دیا بے کسی کا جال
"آجاؤ ایفریقا"
پنجے میں ہتھکڑی کی کڑی بن گئی ہے گرز
گردن کا طوق توڑ کے ڈھالی ہے میں نے ڈھال
"آجاؤ ایفریقا"
جلتے ہیں ہر کچھار میں بھالوں کے مرگ نین
دشمن لہو سے رات کی کالک ہوئی ہے لال
"آجاؤ ایفریقا"
دھرتی دھڑک رہی ہے مرے ساتھ ایفریقا
دریا تھرک رہا ہے تو بن دے رہا ہے تال
میں ایفریقا ہوں، دھار لیا میں نے تیرا روپ
میں تو ہوں، میری چال ہے تیری ببر کی چال
"آجاؤ ایفریقا"
آؤ ببر کی چال
آجاؤ ایفریقا

(منٹگمری جیل، ۱۴ر جنوری سنہ ۱۹۵۵ء)

بنیاد کچھ تو ہو

(قوالی)

کوئے ستم کی خامشی آباد کچھ تو ہو
کچھ تو کہو ستم کشو، فریاد کچھ تو ہو
بیداد گر سے شکوۂ بیداد کچھ تو ہو
بولو، کہ شورِ حشر کی ایجاد کچھ تو ہو

مرنے چلے تو سطوتِ قاتل کا خوف کیا
اتنا تو ہو کہ باندھنے پائے نہ دست و پا
مقتل میں کچھ تو رنگ جمے جشنِ رقص کا
رنگیں لہو سے پنجۂ صیاد کچھ تو ہو
خوں پر گواہ دامنِ جلاد کچھ تو ہو
جب خوں بہا طلب کریں بنیاد کچھ تو ہو

گر تن نہیں، زباں سہی، آزاد کچھ تو ہو
دشنام، نالہ، ہاؤ ہو، فریاد کچھ تو ہو
چیخے ہے درد، اے دلِ برباد کچھ تو ہو
بولو کہ شورِ حشر کی ایجاد کچھ تو ہو
بولو کہ روزِ عدل کی بنیاد کچھ تو ہو

(منٹگمری جیل، ۱۳ اپریل سنہ ۵۵ء)

کوئی عاشق کسی محبوبہ سے

یاد کی راہ گذر جس پہ اسی صورت سے
مدتیں بیت گئی ہیں تمہیں چلتے چلتے
ختم ہو جائے جو دو چار قدم اور چلو
موڑ پڑتا ہے جہاں دشتِ فراموشی کا
جس سے آگے نہ کوئی میں ہوں نہ کوئی تم ہو
سانس تھامے ہیں نگاہیں کہ نہ جانے کس دم
تم پلٹ آؤ، گذر جاؤ، کہ مڑ کر دیکھو

گرچہ واقف ہیں نگاہیں کہ یہ سب دھوکا ہے
گر کہیں تم سے ہم آغوش ہوئی پھر سے نظر
پھوٹ نکلے گی وہاں اور کوئی راھگذر
پھر اسی طرح جہاں ہوگا مقابل پیہم
سایۂ زلف کا اور جنبشِ بازو کا سفر

دوسری بات بھی جھوٹی ہے کہ دل جانتا ہے
یاں کوئی موڑ کوئی دشت کوئی گھات نہیں
جس کے پردے میں مرا ماہِ رواں ڈوب سکے

تم سے چلتی رہے یہ راہ، یونہی اچھا ہے
تم نے مڑ کر بھی نہ دیکھا تو کوئی بات نہیں

(منٹگمری جیل ۳۰ مارچ سنہ ۱۹۵۵ء)

غزلیں

(۱)

شامِ فراق اب نہ پوچھ، آئی اور آ کے ٹل گئی
دل تھا کہ پھر بہل گیا، جاں تھی کہ پھر سنبھل گئی

بزمِ خیال میں ترے حسن کی شمع جل گئی
درد کا چاند بجھ گیا، ہجر کی رات ڈھل گئی

جب تجھے یاد کر لیا، صبح مہک مہک اٹھی
جب ترا غم جگا لیا، رات مچل مچل گئی

دل سے تو ہر معاملہ کر کے چلے تھے صاف ہم
کہنے میں اُن کے سامنے بات بدل بدل گئی

آخرِ شب کے ہم سفر فیضؔ نہ جانے کیا ہوئے
رہ گئی کس جگہ صبا، صبح کدھر نکل گئی!

جناح اسپتال کراچی
جولائی سنہ ۱۹۵۳ء

(۲)

کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں، کب ہات میں تیرا ہات نہیں
صد شکر کہ اپنی راتوں میں اب ہجر کی کوئی رات نہیں

مشکل ہیں اگر حالات وہاں، دل بیچ آئیں جاں دے آئیں
دل والو کوچۂ جاناں میں کیا ایسے ابھی حالات نہیں

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا، وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے، اس جاں کی تو کوئی بات نہیں

میدانِ وفا دربار نہیں، یاں نام و نسب کی پوچھ کہاں
عاشق تو کسی کا نام نہیں، کچھ عشق کسی کی ذات نہیں

گر بازی عشق کی بازی ہے جو چاہو لگا دو ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنا، ہارے بھی تو بازی مات نہیں

(منٹگمری جیل)

(۳)

ہم پر تمہاری چاہ کا الزام ہی تو ہے
دشنام تو نہیں ہے، یہ اکرام ہی تو ہے

کرتے ہیں جس پہ طعن کوئی جُرم تو نہیں
شوقِ فضول و الفتِ ناکام ہی تو ہے

دل مدعی کے حرفِ ملامت سے شاد ہے
اے جانِ جاں یہ حرف ترا نام ہی تو ہے

دل نا امید تو نہیں، ناکام ہی تو ہے
لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے

دستِ فلک میں گردشِ تقدیر تو نہیں
دستِ فلک میں گردشِ ایام ہی تو ہے

آخر تو ایک روز کرے گی نظر وفا
وہ یارِ خوش خصال سرِ بام ہی تو ہے

بھیگی ہے رات فیض غزل ابتدا کرو
وقتِ سرود، درد کا ہنگام ہی تو ہے

(منٹگمری جیل، ۹ مارچ سنہ ۵۴ء)

(۴)

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

قفس اُداس ہے یارو صبا سے کچھ تو کہو
کہیں تو بہرِ خدا آج ذکرِ یار چلے

کبھی تو صبح ترے کنجِ لب سے ہو آغاز
کبھی تو شب سرِ کاکل سے مشکبار چلے

بڑا ہے درد کا رشتہ یہ دل غریب سہی
تمہارے نام پہ آئیں گے غمگسار چلے

جو ہم پہ گذری سو گذری مگر شبِ ہجراں
ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے

حضورِ یار ہوئی دفترِ جنوں کی طلب
گرہ میں لے کے گریباں کا تار تار چلے

مقام، فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

(منٹگمری جیل، ۲۹ جنوری سنہ ۵۴ء)

(۵)

سب قتل ہو کے تیرے مقابل سے آئے ہیں
ہم لوگ سُرخ رو ہیں کہ منزل سے آئے ہیں

شمعِ نظر، خیال کے انجم، جگر کے داغ
جتنے چراغ ہیں تری محفل سے آئے ہیں

اُٹھ کر تو آ گئے ہیں تری بزم سے مگر
کچھ دل ہی جانتا ہے کہ کس دل سے آئے ہیں

ہر اک قدم اجل تھا، ہر اک گام زندگی
ہم گھوم پھر کے کوچۂ قاتل سے آئے ہیں
بادِ خزاں کا شکر کرو فیضؔ جس کے ہاتھ
نامے کسی بہار شمائل سے آئے ہیں

متفرق اشعار

ستم کی رسمیں بہت تھیں، لیکن نہ تھیں تری انجمن سے پہلے
سزا خطائے نظر سے پہلے، عتاب جرمِ سخن سے پہلے

جو چل سکو تو چلو کہ راہِ وفا بہت مختصر ہوئی ہے
مقام ہے اب کوئی نہ منزل، فرازِ دار و رسن سے پہلے

غرورِ سرو و سمن سے کہہ دو کہ پھر وہی تاجدار ہوں گے
جو خار و خس والیٔ چمن تھے عروجِ سرو و سمن سے پہلے

اُدھر تقاضے ہیں مصلحت کے، اِدھر تقاضائے دردِ دل ہے
زباں سنبھالیں کہ دل سنبھالیں، اسیر ذکرِ وطن سے پہلے

خیالِ یار، کبھی ذکرِ یار کرتے رہے
اسی متاع پہ ہم روزگار کرتے رہے

وہ دن کہ کوئی بھی جب وجہِ انتظار نہ تھی
ہم ان میں تیرا سوا انتظار کرتے رہے
ضیائے بزم جہاں بار بار ماند ہوئی
حدیثِ شعلہ رُخاں بار بار کرتے رہے
انہیں کے فیض سے بازارِ عقل روشن ہے
جو گاہ گاہ جنوں اختیار کرتے رہے

شاخ پر خونِ گل رواں ہے وہی
شوخیٔ رنگِ گلستاں ہے وہی
چاند تارے ادھر نہیں آتے
ورنہ زنداں میں آسماں ہے وہی

کچھ محتسبوں کی خلوت میں، کچھ واعظ کے گھر جاتی ہے
ہم بادہ کشوں کے حصے کی، اب جام میں کم تر جاتی ہے
بیدادگروں کی بستی ہے یاں داد کہاں خیرات کہاں
سر پھوڑتی پھرتی ہے ناداں فریاد جو در در جاتی ہے
ہم اہلِ قفس تنہا بھی نہیں، ہر روز نسیمِ صبحِ وطن
یادوں سے معطر آتی ہے، اشکوں سے منور جاتی ہے

گرمیٔ شوق نظارہ کا اثر تو دیکھو
گل کھلے جاتے ہیں وہ سایۂ در تو دیکھو
وہ تو وہ ہے تمہیں ہو جائے گی الفت مجھ سے
اک نظر تم مرا محبوبِ نظر تو دیکھو
صبح کی طرح جھمکتا ہے شبِ غم کا افق
فیضؔ تابندگیٔ دیدۂ تر تو دیکھو

پھر سے بجھ جائیں گی شمعیں جو ہوا تیز چلی
لا کے رکھو سرِ محفل کوئی خورشید اب کے

یوں بہار آئی ہے اس بار کہ جیسے قاصد
کوچۂ یار سے بے نیل و مرام آتا ہے
شوق والوں کی حزیں محفلِ شب میں اب بھی
آمدِ صبح کی صورت ترا نام آتا ہے

شام گلنار ہوئی جاتی ہے دیکھو تو سہی
یہ جو نکلا ہے لئے مشعلِ رخسار ہے کون

چوتھا مجموعۂ کلام

دستِ تہِ سنگ

قطعات

یہ خوں کی مہک ہے کہ لبِ یار کی خوشبو
کس راہ کی جانب سے صبا آتی ہے دیکھو
گلشن میں بہار آئی کہ زنداں ہوا آباد
کس سمت سے نغموں کی صدا آتی ہے دیکھو

آ گئی فصلِ سکوں چاک گریباں والو
سل گئے ہونٹ، کوئی زخم سلے یا نہ سلے
دوستو! بزم سجاؤ کہ بہار آئی ہے
کھل گئے زخم، کوئی پھول کھلے یا نہ کھلے

ان دنوں رسم و رہِ شہرِ نگاراں کیا ہے
قاصدا، قیمتِ گلگشتِ بہاراں کیا ہے

کوئے جاناں ہے کہ مقتل ہے کہ میخانہ ہے
آج کل صورتِ بربادیٔ یاراں کیا ہے

دستِ تہِ سنگ آمدہ

بیزار فضا، درپئے آزارِ صبا ہے
یوں ہے کہ ہر اک ہمدمِ دیرینہ خفا ہے

ہاں بادہ کشو! آیا ہے اب رنگ پہ موسم
اب سیر کے قابل روشِ آب و ہوا ہے

اُمڈی ہے ہر اک سمت سے الزام کی برسات
چھائی ہوئی ہر دانگ ملامت کی گھٹا ہے

وہ چیز بھری ہے کہ سلگتی ہے صراحی
ہر کاسۂ مے زہرِ ہلاہل سے سوا ہے

ہاں جام اُٹھاؤ کہ بیادِ لبِ شیریں
یہ زہر تو یاروں نے کئی بار پیا ہے

اس جذبۂ دل کی نہ سزا ہے نہ جزا ہے
مقصودِ رہِ شوق وفا ہے نہ جفا ہے

احساسِ غمِ دل جو غمِ دل کا صلا ہے
اُس حُسن کا احساس ہے جو تیری عطا ہے

ہر صبحِ گلستاں ہے ترا روئے بہاریں
ہر پھول تری یاد کا نقشِ کفِ پا ہے
ہر بھیگی ہوئی رات تری زلف کی شبنم
ڈھلتا ہوا سورج ترے ہونٹوں کی فضا ہے
ہر راہ پہنچتی ہے تری چاہ کے در تک
ہر حرفِ تمنّا ترے قدموں کی صدا ہے
تعزیرِ سیاست ہے، نہ غیروں کی خطا ہے
وہ ظلم جو ہم نے دلِ وحشی پہ کیا ہے
زندانِ رہِ یار میں پابند ہوئے ہم
زنجیر بکف ہے، نہ کوئی بند بپا ہے
"مجبوری و دعوائے گرفتاریِ اُلفت
دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے"

سفرنامہ

(۱) پیکنگ

یُوں گماں ہوتا ہے بازو ہیں مرے ساٹھ کروڑ
اور آفاق کی حد تک مرے تن کی حد ہے

دل مرا کوہ و دمن دشت و چمن کی حد ہے

میرے کیسے میں ہے راتوں کا سیہ فام جلال
میرے ہاتھوں میں ہے صبحوں کی عنانِ گلگوں
میری آغوش میں پلتی ہے خدائی ساری
میرے مقدور میں ہے معجزۂ کُن فیکوں

(۲) سنکیانگ

اب کوئی طبل بجے گا، نہ کوئی شاہسوار
صبح دم موت کی وادی کو روانہ ہوگا!
اب کوئی جنگ نہ ہوگی، نہ کبھی رات گئے
خُون کی آگ کو اشکوں سے بجھانا ہوگا

کوئی دل دھڑکے گا شب بھر نہ کسی آنگن میں
وہمِ منحوس پرندے کی طرح آئے گا
سہم، خوں خوار درندے کی طرح آئے گا!

اب کوئی جنگ نہ ہوگی مے و ساغر لاؤ
خوں لٹانا نہ کبھی اشک بہانا ہوگا
ساقیا! رقص کوئی رقصِ صبا کی صورت

مطربا! کوئی غزل رنگِ حنا کی صورت

غزل

بساطِ رقص پہ صد شرق و غرب سے سرِ شام
دمک رہا ہے تری دوستی کا ماہِ تمام
چھلک رہی ہے ترے حسنِ مہرباں کی شراب
بھرا ہوا ہے لبالب ہر اک نگاہ کا جام
گلے میں تنگ ترے حرفِ لطف کی باہیں
پسِ خیال کہیں ساعتِ سفر کا پیام

ابھی سے یاد میں ڈھلنے لگی ہے صحبتِ شب
ہر ایک روئے حسیں ہو چلا ہے بیش حسیں
ملے کچھ ایسے جُدا یوں ہوئے کہ فیض اب کے
جو دل پہ نقش بنے گا وہ گل ہے داغ نہیں

ہانگ چاؤ (چین)، جولائی ۱۹۵۶ء

آج بازار میں پابجولاں چلو

چشمِ نم، جانِ شوریدہ کافی نہیں
تہمتِ عشق پوشیدہ کافی نہیں

آج بازار میں پابجولاں چلو

دست افشاں چلو مست و رقصاں چلو
خاک برسر چلو، خوں بداماں چلو
راہ تکتا ہے سب شہر جاناں چلو

حاکم شہر بھی، مجمعِ عام بھی
تیرِ الزام بھی، سنگِ دشنام بھی
صبحِ ناشاد بھی، روزِ ناکام بھی

ان کا دم ساز اپنے سوا کون ہے
شہرِ جاناں میں اب باصفا کون ہے
دستِ قاتل کے شایاں رہا کون ہے

رختِ دل باندھ لو دل فگارو چلو
پھر ہمیں قتل ہو آئیں یارو چلو

لاہور جیل ۱۱ر فروری ۵۹ء

حمد

ملکۂ شہرِ زندگی تیرا
شُکر کس طور سے ادا کیجے
دولتِ دل کا کچھ شمار نہیں

تنگ دستی کا کیا گلہ کیجے

جو ترے حسن کے فقیر ہوئے　　ان کو تشویش روزگار کہاں؟
درد بیچیں گے گیت گائیں گے　　اس سے خوش وقت کاروبار کہاں؟

جام چھلکا تو جم گئی محفل
منت لطف غم گسار کسے؟
اشک ٹپکا تو کھل گیا گلشن
رنج کم ظرفی بہار کسے؟

خوش نشیں ہیں کہ چشم و دل کی مراد　　دیر میں ہے نہ خانقاہ میں ہے
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں　　ہر صنم اپنی بارگاہ میں ہے

کون ایسا غنی ہے جس سے کوئی
نقد شمس و قمر کی بات کرے
جس کو شوق نبرد ہو ہم سے
جائے تسخیر کائنات کرے

(جولائی ۱۹۵۹ء)

دو مرثیے

(۱) ملاقات مری

ساری دیوار سیہ ہو گئی تا حلقۂ بام
راستے بجھ گئے رخصت ہوئے رہ گیر تمام

اپنی تنہائی سے گویا ہوئی پھر رات مری
ہو نہ ہو آج پھر آئی ہے ملاقات مری
اک ہتھیلی پہ حنا، ایک ہتھیلی پہ لہو
اک نظر زہر لیے، ایک نظر میں دارو

دیر سے منزلِ دل میں کوئی آیا نہ گیا
فرقتِ درد میں بے آب ہوا تختۂ داغ
کس سے کہیے کہ بھرے رنگ سے زخموں کے ایاغ
اور پھر خود ہی چلی آئی ملاقات مری
آشنا موت جو دشمن بھی ہے غم خوار بھی ہے
وہ جو ہم لوگوں کی قاتل بھی ہے دلدار بھی ہے

(۲)

ختم ہوئی بارشِ سنگ

ناگہاں آج مرے تارِ نظر سے کٹ کر
ٹکڑے ٹکڑے ہوئے آفاق پہ خورشید و قمر
اب کسی سمت اندھیرا نہ اُجالا ہوگا
بجھ گئی دل کی طرح راہِ وفا میرے بعد
دوستو! قافلۂ درد کا اب کیا ہوگا

اب کوئی اور کرے پرورشِ گلشنِ غم
دوستو! ختم ہوئی دیدۂ تر کی شبنم
تھم گیا شورِ جنوں ختم ہوئی بارشِ سنگ
خاکِ رہ آج لیے ہے لبِ دلدار کا رنگ
کوئے جاناں میں کھلا میرے لہو کا پرچم
دیکھیے دیتے ہیں کس کس کو صدا میرے بعد
کون ہوتا ہے حریفِ مئے مردافگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد۔

(نومبر ۱۹۶۰ء)

کہاں جاؤ گے؟

اور کچھ دیر میں لٹ جائے گا ہر بام پہ چاند
عکس کھو جائیں گے آئینے ترس جائیں گے
عرش کے دیدۂ نمناک سے باری باری
سب ستارے سرِ خاشاک برس جائیں گے
آس کے مارے تھکے ہارے شبستانوں میں
اپنی تنہائی سمیٹے گا، بچھائے گا کوئی
بے وفائی کی گھڑی، ترکِ مدارات کا وقت

اس گھڑی اپنے سوا یاد نہ آئے گا کوئی
ترکِ دنیا کا سماں، ختمِ ملاقات کا وقت
اس گھڑی اے دلِ آوارہ کہاں جاؤ گے
اس گھڑی کوئی کسی کا بھی نہیں، رہنے دو
کوئی اس وقت ملے گا ہی نہیں، رہنے دو
اور ملے گا بھی تو اس طور کہ پچھتاؤ گے
اس گھڑی اے دلِ آوارہ کہاں جاؤ گے

اور کچھ دیر ٹھہر جاؤ کہ پھر نشترِ صبح
زخم کی طرح ہر اک آنکھ کو بیدار کرے
اور ہر کشتۂ واماندگیٔ آخرِ شب
بھول کر ساعتِ درماندگیٔ آخرِ شب
جان پہچان ملاقات پہ اصرار کرے

(دسمبر ۱۹۶۱ء)

خوشا ضمانتِ غم

دیارِ یار تری جوششِ جنوں پہ سلام
مرے وطن، ترے دامانِ تار تار کی خیر

رہِ یقیں، تری افشانِ خاک و خوں پہ سلام
مرے چمن، ترے زخموں کے لالہ زار کی خیر

ہر ایک خانۂ ویراں کی تیرگی پہ سلام
ہر ایک خاک بسر، خانماں خراب کی خیر
ہر ایک کشتۂ ناحق کی خامشی پہ سلام
ہر ایک دیدۂ پُرنم کی آب و تاب کی خیر

رواں رہے یہ روایت، خوشا ضمانتِ غم
نشاطِ ختمِ غمِ کائنات سے پہلے
ہر اک کے ساتھ رہے دولتِ امانتِ غم
کوئی نجات نہ پائے نجات سے پہلے

سکوں ملے نہ کبھی تیرے پا فگاروں کو
جمالِ خونِ سرِ خار کو نظر نہ لگے
اماں ملے نہ کہیں تیرے جاں نثاروں کو
جلالِ فرقِ سرِ دار کو نظر نہ لگے

لندن
۱۹۶۲ء

جب تیری سمندر آنکھوں میں

(گیت)

یہ دھوپ کنارا، شام ڈھلے
ملتے ہیں دونوں وقت جہاں
جو رات نہ دن، جو آج نہ کل
پل بھر کو امر، پل بھر میں دھواں
اس دھوپ کنارے، پل دو پل
ہونٹوں کی لپک
باہوں کی چھنک
یہ میل ہمارا، جھوٹ نہ سچ
کیوں راز کرو، کیوں دوش دھرو
کس کارن جھوٹی بات کرو
جب تیری سمندر آنکھوں میں
اس شام کا سورج ڈوبے گا
سکھ سوئیں گے گھر در والے
اور راہی اپنی راہ لے گا

(لندن ۱۹۶۳ء)

رنگ ہے دل کا مرے

تم نہ آئے تھے تو ہر چیز وہی تھی کہ جو ہے،

آسماں حدِ نظر، راہگزر؟ راہگزر، شیشۂ مے شیشۂ مے

اور اب شیشۂ مے، راہگزر، رنگِ فلک

رنگ ہے دل کا مرے، "خونِ جگر ہونے تک"

چمپئی رنگ کبھی راحتِ دیدار کا رنگ

سُرمئی رنگ کہ ہے ساعتِ بیزار کا رنگ

زرد پتوں کا، خس و خار کا رنگ

سُرخ پھولوں کا دہکتے ہوئے گلزار کا رنگ

زہر کا رنگ، لہو رنگ، شبِ تار کا رنگ

آسماں، راہگزر، شیشۂ مے

کوئی بھیگا ہوا دامن، کوئی دکھتی ہوئی رگ

کوئی ہر لحظہ بدلتا ہوا آئینہ ہے

اب جو آئے ہو تو ٹھہرو کہ کوئی رنگ، کوئی رُت، کوئی شے

ایک جگہ پر ٹھہرے

پھر سے اک بار ہر اک چیز وہی ہو کہ جو ہے

آسماں حدِ نظر، راہگزر راہگزر، شیشۂ مے شیشۂ مے

(ماسکو، اگست ۱۹۶۳ء)

غزلیں

(۱)

جنوں کی یاد مناؤ کہ جشن کا دن ہے
صلیب و دار سجاؤ کہ جشن کا دن ہے

طرب کی بزم ہے بدلو دلوں کے پیراہن
جگر کے چاک سلاؤ کہ جشن کا دن ہے

تنک مزاج ہے ساقی نہ رنگِ مے دیکھو
بھرے جو شیشہ چڑھاؤ کہ جشن کا دن ہے

تمیزِ رہبر و رہزن کرو نہ آج کے دن
ہر اک سے ہاتھ ملاؤ کہ جشن کا دن ہے

ہے انتظارِ ملامت میں ناصحوں کا ہجوم
نظر سنبھال کے جاؤ کہ جشن کا دن ہے

بہت عزیز ہو لیکن شکستہ دل یارو
تم آج یاد نہ آؤ کہ جشن کا دن ہے

وہ شورشِ غمِ دل جس کی لے نہیں کوئی
غزل کی دھن میں سناؤ کہ جشن کا دن ہے

(مارچ ۱۹۵۷ء)

(۲)

جمے گی کیسے بساطِ یاراں کہ شیشہ و جام بجھ گئے ہیں
سجے گی کیسے شبِ نگاراں کہ دل سرِ شام بجھ گئے ہیں

وہ تیرگی ہے رہِ بتاں میں چراغِ رُخ ہے نہ شمعِ وعدہ
کرن کوئی آرزو کی لاؤ کہ سب در و بام بجھ گئے ہیں

بہت سنبھالا وفا کا پیماں مگر وہ برسی ہے اب کے برکھا
ہر ایک اقرار مٹ گیا ہے تمام پیغام بجھ گئے ہیں

قریب آ اے مہِ شبِ غم، نظر پہ کھلتا نہیں کچھ اس دم
کہ دل پہ کس کس کا نقش باقی ہے کون سے نام بجھ گئے ہیں

بہار اب آکے کیا کرے گی کہ جن سے تھا جشنِ رنگ و نغمہ
وہ گل سرِ شاخ جل گئے ہیں، وہ دل تہِ دام بجھ گئے ہیں

(۳)

بے دم ہوئے بیمار، دوا کیوں نہیں دیتے
تم اچھے مسیحا ہو شفا کیوں نہیں دیتے

دردِ شبِ ہجراں کی جزا کیوں نہیں دیتے
خونِ دلِ وحشی کا صلا کیوں نہیں دیتے

مٹ جائے گی مخلوق تو انصاف کرو گے
منصف ہو تو اب حشر اٹھا کیوں نہیں دیتے

ہاں نکتہ وروِ لاؤ لب و دل کی گواہی
ہاں نغمہ گرو ساز صدا کیوں نہیں دیتے

پیمانِ جنوں ہاتھوں کو شرمائے گا کب تک
دل والو، گریباں کا پتا کیوں نہیں دیتے

بربادیٔ دل جبر نہیں فیض کسی کا
وہ دشمنِ جاں ہے تو بھلا کیوں نہیں دیتے

(لاہور جیل - ۳۱ دسمبر ۱۹۵۰ء)

(۴)

ترے غم کو جاں کی تلاش تھی ترے جاں نثار چلے گئے
تری رہ میں کرتے تھے سر طلب، سرِ رہگزار چلے گئے

تری کج ادائی سے ہار کے شبِ انتظار چلی گئی
مرے ضبطِ حال سے رُوٹھ کر مرے غم گسار چلے گئے

نہ سوالِ وصل، نہ عرضِ غم، نہ حکایتیں نہ شکایتیں
ترے عہد میں دلِ زار کے سبھی اختیار چلے گئے

نہ رہا جنونِ رُخِ وفا، یہ رسن، یہ دار کرو گے کیا
جنہیں جرمِ عشق پہ ناز تھا وہ گناہ گار چلے گئے

(جولائی ۱۹۵۹ء)

(۳)

بچھے گی کبھی بساطِ [illegible]

[illegible]

کب جان لہو ہوگی، کب اشک گہر ہوگا

کس دن تری شنوائی اے دیدۂ تر ہوگی

کب مہکے گی فصلِ گل، کب بہکے گا مے خانہ

کب صبحِ سخن ہوگی، کب شامِ نظر ہوگی

واعظ ہے نہ زاہد ہے، ناصح ہے نہ قاتل ہے

اب شہر میں یاروں کی کس طرح بسر ہوگی

کب تک ابھی رہ دیکھیں اے قامتِ جانانہ

کب حشر معین ہے تجھ کو تو خبر ہوگی

(دسمبر ۱۹۵۹ء)

(۴)

آج یوں موج در موج غم تھم گیا، اس طرح غمزدوں کو قرار آ گیا

جیسے خوشبوئے زلفِ بہار آ گئی، جیسے پیغامِ دیدارِ یار آ گیا

جس کی دید و طلب وہم سمجھے تھے ہم رو برو پھر سرِ رہ گزار آ گیا

صبحِ فردا کو پھر دل ترسنے لگا، عمرِ رفتہ ترا اعتبار آ گیا

رُت بدلنے لگی رنگِ دل دیکھنا، رنگِ گلشن سے اب حال کھلتا نہیں

کہیں چھلکا کوئی یا کوئی گل کھلا، اشک اُمڈے کہ ابرِ بہار آگیا

خونِ عشاق سے جام بھرنے لگے، دل سلگنے لگے داغ جلنے لگے

محفلِ دَرد پھر رنگ پر آگئی، پھر شبِ آرزو پر نکھار آگیا

سرفروشی کے انداز بدلے گئے، دعوتِ قتل پر مقتلِ شہر میں

ڈال کر کوئی گردن میں طوق آگیا لاد کر کوئی کاندھے پہ دار آگیا

فیض کیا جانئے یار کس آس پر، منتظر ہیں کہ لائے گا کوئی خبر

مے کشوں پر ہوا محتسب مہرباں، دل فگاروں پہ قاتل کو پیار آگیا

(۷)

نہ گنواؤ ناوکِ نیم کش، دلِ ریزہ ریزہ گنوا دیا

جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو، تنِ داغ داغ لٹا دیا

مرے چارہ گر کو نوید ہو، صفِ دشمناں کو خبر کرو

جو وہ قرض رکھتے تھے جان پر وہ حساب آج چکا دیا

کرو کج جبیں پہ سرِ کفن، مرے قاتلوں کو گماں نہ ہو

کہ غرورِ عشق کا بانکپن پسِ مرگ ہم نے بھلا دیا

اُدھر ایک حرف کہ کشتنی، یہاں لاکھ عذر تھا گفتنی

جو کہا تو سُن کے اُڑا دیا، جو لکھا تو پڑھ کے مٹا دیا

جو رُکے تو کوہِ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے

رہِ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا

(۵)

کب ٹھہرے گا درد اے دل کب رات بسر ہوگی
سنتے تھے وہ آئیں گے، سنتے تھے سحر ہوگی

کب جان لہو ہوگی، کب اشک گہر ہوگا
کس دن تری شنوائی اے دیدۂ تر ہوگی

کب مہکے گی فصلِ گل، کب بہکے گا مے خانہ
کب صبحِ سخن ہوگی، کب شامِ نظر ہوگی

واعظ ہے نہ زاہد ہے، ناصح ہے نہ قاتل ہے
اب شہر میں یاروں کی کس طرح بسر ہوگی

کب تک ابھی رہ دیکھیں اے قامتِ جانانہ
کب حشر معین ہے تجھ کو تو خبر ہوگی

(دسمبر ۱۹۵۹ء)

(۶)

آج یوں موج در موج غم تھم گیا، اس طرح غم زدوں کو قرار آ گیا
جیسے خوشبوئے زلفِ بہار آ گئی، جیسے پیغامِ دیدارِ یار آ گیا

جس کی دید و طلب وہم سمجھے تھے ہم رو برو پھر سرِ رہ گذار آ گیا
صبحِ فردا کو پھر دل ترسنے لگا، عمرِ رفتہ ترا اعتبار آ گیا

رُت بدلنے لگی رنگِ دل دیکھنا، رنگِ گلشن سے اب حال کھلتا نہیں

زخم چھلکا کوئی یا کوئی گل کھلا، اشک اُمڈے کہ ابرِ بہار آ گیا
خونِ عشاق سے جام بھرنے لگے، دل سلگنے لگے داغ جلنے لگے
محفلِ درد پھر رنگ پر آ گئی، پھر شبِ آرزو پر نکھار آ گیا
سرفروشی کے انداز بدلے گئے، دعوتِ قتل پر مقتلِ شہر میں
ڈال کر کوئی گردن میں طوق آ گیا، لاد کر کوئی کاندھے پہ دار آ گیا
فیض کیا جانیے یار کس آس پر، منتظر ہیں کہ لائے گا کوئی خبر
مے کشوں پر ہوا محتسب مہرباں، دل فگاروں پہ قاتل کو پیار آ گیا

(۷)

نہ گنواؤ ناوکِ نیم کش دلِ ریزہ ریزہ گنوا دیا
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو تنِ داغ داغ لٹا دیا
مرے چارہ گر کو نوید ہو صفِ دشمناں کو خبر کرو
جو وہ قرض رکھتے تھے جان پر وہ حساب آج چکا دیا
کرو کج جبیں پہ سرِ کفن مرے قاتلوں کو گماں نہ ہو
کہ غرورِ عشق کا بانکپن پسِ مرگ ہم نے بھلا دیا
اُدھر ایک حرف کہ کشتنی یہاں لاکھ عذر تھا گفتنی
جو کہا تو سُن کے اُڑا دیا جو لکھا تو پڑھ کے مٹا دیا
جو رُکے تو کوہِ گراں تھے ہم جو چلے تو جاں سے گزر گئے
رہِ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا

(متفرق اشعار)

یہ جفائے غم کا چارہ، وہ نجاتِ دل کا عالم
ترا حسن دستِ عیسیٰ تری یاد روئے مریم
دل و جاں فدائے راہے کبھی آکے دیکھ ہمدم
سرِ کوئے دل فگاراں، شبِ آرزو کا عالم
لوٹنی گئی ہماری یوں پھرے ہیں دن کہ پھر سے
وہی گوشۂ قفس ہے، وہی فصلِ گل کا ماتم

(لاہور جیل، فروری ۱۹۵۹ء)

ہر سمت پریشاں تری آمد کے قرینے
دھوکے دیئے کیا کیا ہمیں بادِ سحری نے
ہر منزلِ غربت پہ گماں ہوتا ہے گھر کا
بہلایا ہے ہر گام بہت در بدری نے
تھے بزم میں سب دودِ سرِ بزم سے شاداں
بے کار جلایا ہمیں روشن نظری نے
یہ جامۂ صد چاک بدل لینے میں کیا تھا
مہلت ہی نہ دی فیض، کبھی بخیہ گری نے

(لندن، ۱۹۶۳ء)

قدیم روایات
اور
جدید وضع کی
آئینہ دار
ڈبلیو-پی-آئی-ڈی-سی-کی
گھریلو مصنوعات
خریدیئے
ڈبلیو-پی-آئی-ڈی-سی کی گھریلو مصنوعات مثلاً خوبصورت ملبوسات کھلونے-آرائشی پارچہ جات-تحائف یا دوسری زیب و زینت کی چیزیں آپ کے گھر کی رونق کو دوبالا کرتی ہیں-یہ مصنوعات اندرون اور بیرون ملک میں یکساں طور پر مقبول ہیں-
آپ بھی اپنے گھر کی آرائش کے لئے ان مصنوعات کا انتخاب کیجئے-
مغربی پاکستان
صنعتی ترقیاتی کارپوریشن
مرکز:-
پاکستانی
گھریلو مصنوعات
پریڈی اسٹریٹ اور کچہری روڈ-کراچی-دی مال لاہور-دی مال راولپنڈی-حسن پروانہ روڈ-ملتان
دی مال پشاور-تلک چاڑی حیدرآباد-جناح ایونیو-کوئٹہ

عباسی
پلنگ کی چادریں
اور تکیہ کے غلاف
ATM
سکون بخش
طرح بہ طرح رنگ بہ رنگ
پلنگ کی چادریں اور ہم رنگ
تکیہ کے غلاف

پاکستان کی معاشی ترقی میں
ایک متحرک قوت

پاکستان معاشی ترقی اور خوشحالی کی راہ پر گامزن ہے۔ یہ سب پاکستانی عوام کی محنت، پختہ عزائم، ایک روشن خیال حکومت اور ...... غیر سرکاری سرمایہ کاری کی انتھک کوششوں کا نتیجہ ہے۔

پاکستان غیر ملکی سرمایہ کاری کی مکمل حمایت کرتا ہے۔ تیز رفتار ترقی اور منصوبوں کی کامیاب تکمیل کے لئے پاکستان کو ملکی و غیر ملکی سرمایہ کی اہم ضرورت ہے۔ غیر ملکی سرمایہ سے زر مبادلہ اور فنی و تکنیکی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ روزگار کے بہترین ذرائع پیدا ہوتے ہیں۔ سرمایہ کو فروغ ہوتا ہے اور اس سے صنعتوں و دیگر تجارتوں کی ترقی میں مدد ملتی ہے۔ غیر ملکی سرمایہ کی یہ خدمات ملک کی معاشی و صنعتی ترقی کے لئے بہت اہم ہیں۔
ایسو کو بجا طور پر خوشی اور فخر ہے کہ اس نے پاکستان کی معاشی ترقی اور خوشحالی میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

ایسو اسٹینڈرڈ ایسٹرن انکارپوریٹڈ (محدود ذمہ داری کے ساتھ یو۔ ایس۔ اے میں قائم شدہ)

اب
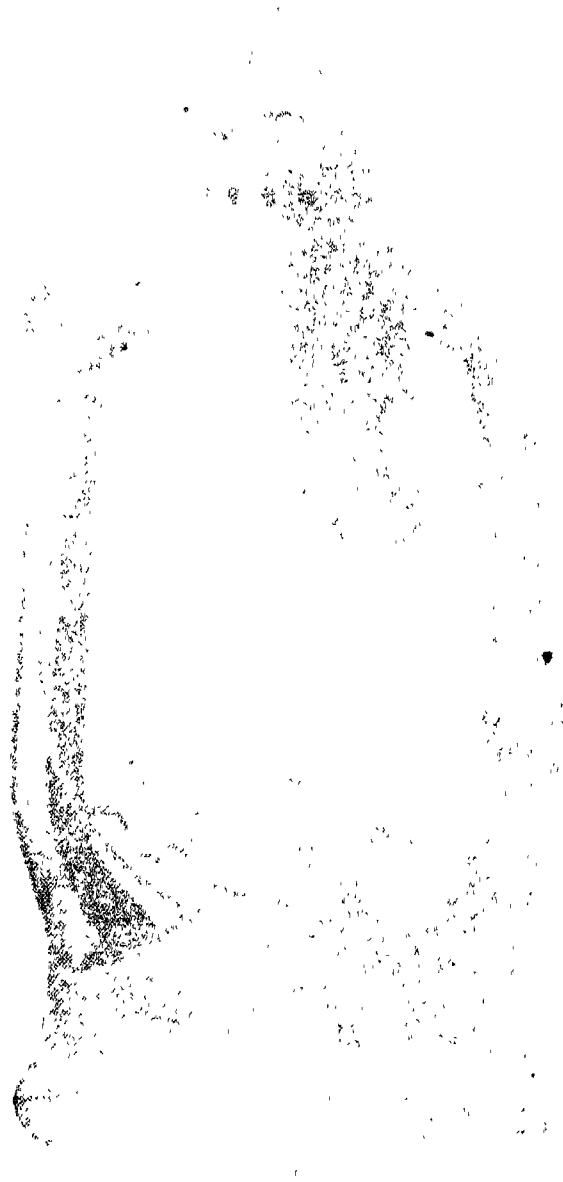
تیار کنندگان

بی - ۳۳ - ایس - آئی - ٹی - ای - کراچی - ۱۶

پاکستان کی
ترقی میں
قابل فخر کردار
اِناملِ - روپے کی بچت، حفاظت اور زیادہ عرصے تک
چمک قائم رکھنے کیلئے متعدد رنگوں میں لکڑی اور
دھاتوں پر رنگ کرنے اور ہر قسم کی اندرونی و بیرونی
زیبائش کیلئے استعمال ہونے والے اِناملِ (۴۱۳)
نیولک پلاسٹک اِملشن - سیمنٹ، پلاسٹر،
اینٹوں کی عمارتوں، دیواروں، چوبی اشیاء اور
دھات کی چیزوں پر استعمال کیلئے فوری طور پر ری کوٹنگ،
بہترین یکی کاری پائیداری اور موزوں صفائی کے لئے
متعدد رنگوں میں دستیاب ہیں
آئل باؤنڈ واشیبل ڈسٹمپر - اندرونی استعمال کے لئے
دھوئے جانے کے قابل ہر رنگ کے ڈسٹمپر
ریڈی مکسڈ پینٹ - عام استعمال کیلئے متعدد رنگوں میں
تیار کئے ہوئے پینٹ جو ساخت میں بے نظیر ہیں۔
وارنش - اندرونی اور بیرونی طور پر گھریلو اور
عام استعمال کیلئے شفاف اور ہلکے زرد رنگ کی وارنش
جہاں بھی پینٹ ہے
وہاں بکلے ہے
بکلے پینٹس لمیٹڈ
کراچی — چٹاگانگ — بیروت
BUXLY'S
CHINESE LACQUER
BUXLY'S
NEWLOOK
PLASTIC EMULSION
PAINT
BUXLY'S
413
SYNTHETIC ENAMEL
BRUSHING
BUXLY'S
217
BUXLY'S
BUXLY'S
Behzad
SYNTHETIC ENAMEL
BUXLY

حرفِ سادہ
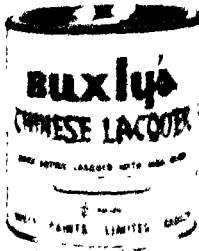
یہی بہت ہیں جو دو حرفِ سادہ رکھتے ہیں

- ★ لندن میں ایک ملاقات
- ○ فن کار اور ترقی پذیر معاشرہ
- ★ حدیثِ رفتگاں
- ○ پاکستان کہاں ہے؟
- ★ داغستان میں چند روز
- ○ ایک یادگار تقریر
- ★ شعر میں اظہار و ترجمانی
- ○ آہنگ
- ★ کچھ ڈراموں کے بارے میں
- ○ چند عذر اور
- ★ کچھ راگ رنگ کے بارے میں

فیض ٥ عبادت

لندن میں ایک ملاقات

اسکول آف اورینٹیل اینڈ افریقن اسٹڈیز کے شعبۂ اردو کے لئے گزشتہ سال میں نے اور میرے دوست اور رفیق کار رالف رسل نے اردو کے ادیبوں اور شاعروں کی آوازوں کو ریکارڈ کرنے کا پروگرام بنایا۔ اس سلسلہ میں ایک روز ہم نے فیض صاحب کو بھی مدعو کیا۔ ان دنوں وہ لندن ہی میں مقیم تھے۔ انہوں نے ہماری دعوت کو قبول کیا۔ اسکول آئے اور کئی گھنٹے ہمارے ساتھ گزارے۔ میں نے فیض صاحب سے اُن کی شخصیت اور شاعری پر چند سوال کئے اور انہوں نے ان کے مفصل جواب دیئے۔ ان سے فیض کی شخصیت اور شاعری پر خاصی روشنی پڑتی ہے اور یہ ایک دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں۔

اسی خیال سے میں نے اس کا مسودہ اشاعت کے لئے تیار کیا۔ یہ کام بہت دشوار تھا، لیکن میرے عزیز دوست اور رفیق کار رالف رسل کی مدد نے اس کو آسان کر دیا۔ کئی گھنٹے ہم لوگوں نے ٹیپ ریکارڈ کو بجا کر آواز سنی اور اس کا مسودہ تیار کیا۔ ظاہر ہے کہ یہ کام آسان نہیں ہوتا۔ کیونکہ ٹیپ ریکارڈ قلم کے مقابلے میں تیز چلتا ہے۔ جن لوگوں کو ٹیپ ریکارڈ سے مسودے تیار کرنے کا تجربہ ہے وہ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس کام میں کتنی محنت کرنی پڑتی ہے۔ اور کس طرح لہو جلانا پڑتا ہے۔ رالف اس کام میں ہاتھ نہ بٹاتے تو اس کا تکمیل سے ہمکنار ہونا مشکل تھا۔

مجھے یقین ہے کہ فیض کی شخصیت اور شاعری سے دلچسپی
لینے والوں کے لئے لندن کی اس ملاقات کی تفصیل دلچسپی کا
باعث ہوگی۔ (عبادت)

عبادت: فیض صاحب! آج میں آپ سے چند باتیں پوچھنا چاہتا ہوں۔۔۔ آپ کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں۔ سب سے پہلے تو آپ یہ فرمائیے کہ آپ کی ولادت کب اور کہاں ہوئی، اور وہ ماحول کیسا تھا جس میں آپ نے اپنی زندگی کے ابتدائی دن گذارے؟

فیض: ولادت تو میری سیال کوٹ کی ہے۔ تاریخ ولادت مجھے خود نہیں معلوم۔ ایک ہم نے فرضی بنا رکھی ہے۔ لیکن ۔۔۔

عبادت: اچھا وہی بتا دیجئے۔

فیض: ۷ جنوری ۱۹۱۱ء ہے۔ لیکن یہ محض اسکول کے سرٹیفکیٹ سے نقل کی گئی ہے۔ اور میں نے سنا ہے کہ اس زمانے میں اسکول میں جو تاریخیں لکھی جاتی تھیں وہ سب جعلی ہوتی تھیں۔ (قہقہہ)۔ اس لئے کہ وہ اس حساب سے لکھی جاتی تھیں کہ فلاں عمر میں آدمی میٹرک پاس کرے گا۔ اس کے بعد انگریزی یا سرکاری نوکری کے لئے عمر کم ہونی چاہیئے۔۔۔ تو بچپن میرا سیال کوٹ ہی میں گذرا۔۔۔ اسکول میرا اسکاچ مشن اسکول تھا وہاں ۔۔۔ اس کے ساتھ اصل میرے استاد جو تھے شمس العلما مولوی میر حسن تھے۔ جن سے میں نے چھٹی یا ساتویں جماعت میں عربی کی صرف و نحو پڑھی۔ اور اُس سے زیادہ میرے استاد، یعنی زیادہ قریبی اُستاد تھے مولوی ابراہیم میر سیالکوٹی۔ بہت بڑے فاضل تھے۔ ابجد میں نے اُن سے پڑھی۔ ابتدائی کتابیں ان سے پڑھیں۔ اس کے بعد قرآن اور حدیث کا درس اُن سے لیا برسوں ۔۔۔ تو بچپن تو وہیں گذرا۔ اس کے بعد ایف اے تک میں نے سیال کوٹ میں تعلیم پائی۔ اس کے بعد میں لاہور چلا گیا۔

عبادت: اچھا لاہور میں کون استاد ایسے تھے جن سے آپ نے استفادہ کیا؟

فیض: لاہور میں میں گورنمنٹ کالج کا طالب علم تھا۔ وہاں پر ہمارے انگریزی کے اُستاد تھے ۔۔۔ دو استاد تھے ۔۔۔ اپنے زمانے میں مستند سمجھے جاتے تھے۔ ایک پروفیسر لینگ ہارن (Langhorn)۔ ایک پروفیسر فرتھ جو آج کل یہاں پر ہیں[1]۔ اور تیسرے ہمارے بخاری صاحب تھے۔ پطرس ۔۔۔ اس کے علاوہ فلسفے میں پروفیسر چٹرجی تھے۔ عربی میں ڈاکٹر صمد الدین مرحوم تھے۔ اور اگرچہ میں فارسی کا طالب علم نہیں تھا لیکن قاضی فضل حق صاحب سے مراسم تھے۔ اس لئے کہ وہ ہماری بزم سخن کے صدر بھی تھے۔ ان حضرات کے علاوہ اُن دنوں جو زیادہ معتبر اور بزرگ ادیب اور لکھنے والے تھے وہ بیشتر یک جا ہوا کرتے تھے ۔۔۔ یا تاثیر مرحوم کے گھر پر یا صوفی تبسم صاحب کے یہاں ۔۔۔ یا بخاری صاحب کے یہاں ۔۔۔ تو زیادہ تعلیم تو میں سمجھتا ہوں کہ کالج کے اندر نہیں ہوئی۔ کالج کے باہر ہوئی۔

---

[1] پروفیسر فرتھ اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز میں لسانیات کے پروفیسر تھے۔ لیکن چند سال ہوئے اُن کا انتقال ہو گیا۔ (عبادت)

عبادت : بے شک — ان صحبتوں میں —

فیض : جی، ان لوگوں کی صحبتوں میں — خاص طور پر پروفیسر بخاری صاحب کے یہاں تو باقاعدگی سے ہر مہینے ایک محفل ہوا کرتی تھی جس کا نام انہوں نے "بزم اردو" رکھا تھا۔ جو آج کل "بزم احباب" کے نام سے چل رہی ہے — اور صوفی صاحب کا دیوان خانہ تھا۔ وہاں پر تو ہمیشہ لوگ جمع رہتے تھے۔ — اور تیسرے تاثیر صاحب کا گھر تھا — تو اس زمانے کے بیشتر بزرگوں سے انہیں لوگوں کے دولت کدوں پر ملاقات ہوئی۔

عبادت : اچھا فیض صاحب! یہ بتایئے کہ آپ نے شاعری کب شروع کی؟

فیض : یہ تو مجھے یاد ہے کہ تُک بندی کیسے شروع ہوئی۔ شاعری اس کے بعد کب سے شروع ہوئی وہ ذرا کہنا مشکل ہے۔ تُک بندی کا تو مجھے معلوم ہے کہ جب ہم اسکول میں پڑھتے تھے تو ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب کو خیال آیا کہ لڑکوں کا ایک مقابلہ کرنا چاہئے۔ شاعری نہیں کہنا چاہئے — شعر سازی کا — کہا گیا کہ مصرعِ طرح پر آپ سب لوگ طبع آزمائی کریں، تو انعام دیا جائے گا — تو اس قسم کا پہلا جو مقابلہ ہوا اس کے منصف اور جج تھے شمس العلما مولوی میر حسن صاحب — پہلا جب اس قسم کا مقابلہ ہوا تو اتفاق سے ہمیں انعام مل گیا — تو گویا کہ انعام سے زیادہ وہ تمغہ تھا کہ انہوں نے پسند کیا — اور انعام مجھے یاد ہے ایک روپیہ ملا تھا۔

عبادت : بہت خوب!

فیض : اس سے کچھ تھوڑا سا ہمیں مغالطہ ہو گیا کہ شاید ہم کچھ کہہ سکتے ہیں۔ اس کے بعد میرے گھر کے ساتھ ایک بہت بڑا مکان تھا۔ حویلی تھی اس پرانے زمانے کی — وہاں پر باقاعدگی سے مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ ہمارے شہر میں منشی راج نرائن ارمان دہلوی صاحب تھے۔ شاید آپ نے نام سُنا ہو۔ اس لئے کہ جب وہ لاہور اٹھ آئے تھے۔

عبادت : جی ہاں!

فیض : تو انہوں نے ایک محفلِ مشاعرہ قائم کر رکھی تھی — ہمارے گھر کے بالکل ساتھ — اس کے باقاعدگی سے مشاعرے ہوتے تھے — اور ایک بزرگ ہوا کرتے تھے منشی سراج دین مرحوم۔ جو کہ علامہ اقبال کے دوستوں میں سے تھے۔ اور ان کا ذکر بھی ہے علامہ کی تحریروں میں — تو وہ ہمیشہ صدارت کیا کرتے تھے — وہ کشمیر میں میر منشی تھے — تو مشاعرے اس طریقے سے ہوا کرتے تھے جب اُن کی ریذیڈنسی سیالکوٹ میں آجاتی تھی تو وہ بھی سیالکوٹ میں آجاتے تھے، اور ان کے ساتھ مشاعرہ بھی آجاتا تھا — تو پانچ چھ مہینے اس کا بازار گرم رہتا تھا — وہاں پر ہم بھی جایا کرتے تھے — مصرعِ طرح پر غزلیں پڑھی جاتی تھیں — بہت دنوں تک تو خیر ہمیں ہمت نہیں ہوئی اس لئے کہ منشی سراج دین صاحب بڑے فقرے باز آدمی تھے۔

عبادت : خوب!　　(قہقہہ)

فیض : اور جب کوئی شعر سُنانے کے لئے آتا تو ایک شعر اس نے پڑھا اور انہوں نے دس شعرا اساتذہ کے اسی مضمون پر سُنا دیئے۔

عبادت : واقعی مشکل چیز تھی۔

فیض : تو بہت دنوں کے بعد ہمیں ہمت ہوئی، تو ہم نے ایک غزل پڑھ دی، اور خلافِ توقع منشی صاحب نے داد دی۔ کہا: برخوردار

یہ تو اچھا ہے، لیکن یہ سب تُک بندی کا زمانہ تھا۔ اس کے بعد جب میں گورنمنٹ کالج میں گیا ہوں تو فورتھ ایر میں ــــ تو جب سے تھوڑی بہت شعر کا، یعنی محض مشقِ سخن کے لئے نہیں ــــ بلکہ ــــ

عبادت : یعنی جی چاہتا تھا شعر کہنے کو۔

فیض : کچھ احوالِ دل بیان کرنے کے لئے ــــ ضرورت پڑی ــــ

عبادت : وہ تو آپ کی نظموں سے پتہ چلتا ہے۔

فیض : تو بس جب سے شاعری شروع ہوئی۔

عبادت : اچھا، اس زمانے کی وہی نظمیں ہیں جن میں رومانی رنگ و آہنگ ہے اور جو نقشِ فریادی کے پہلے حصے میں شامل ہیں۔

فیض : جی ہاں! 'نقشِ فریادی' کی نظموں کا پہلا حصہ تو گورنمنٹ کالج ہی کے زمانے کا ہے۔

عبادت : یہ نظمیں آپ نے کب لکھیں؟

فیض : آپ یہ سمجھئے کہ سنہ ۲۹ء سنہ ۳۰ء کا زمانہ ہے۔

عبادت : اُس زمانے میں ترقی پسند تحریک اگرچہ باقاعدہ تو نہیں شروع ہوئی تھی، لیکن اُس کے شروع ہونے کے آثار موجود تھے، تو آپ کو ــــ

فیض : ہاں، ترقی پسند تحریک اصل میں کوئی تین چار برس بعد شروع ہوئی۔ اگرچہ اس زمانے میں کچھ کچھ قصّہ شروع ہو گیا تھا۔ لیکن باقاعدگی سے سنہ ۳۳ء میں شروع ہوئی تھی ــــ

عبادت : ۳۵ء میں شروع ہوئی تھی۔

فیض : لیکن فضا میں آثار اس کے پیدا ہو گئے تھے۔ سنہ ۳۵ء میں جب میں نے کالج سے تعلیم ختم کر کے امرتسر میں پڑھانا شروع کر دیا تھا۔ ایم۔ اے۔ او کالج میں ــــ تو انہیں دنوں یہ تحریک شروع ہوئی ــــ تو پھر اُس کے ساتھ ــــ

عبادت : آپ کو کچھ رابطہ پیدا ہوا۔

فیض : جی ہاں، رابطہ پیدا ہوا۔

عبادت : اچھا، آپ نے جو یہ نظمیں لکھی ہیں 'رقیب سے'، 'چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز' ــــ یہ اس اثر کے بعد کی ہیں؟

فیض : اس کے بعد کی ــــ دراصل یہ اُس وقت لکھی گئیں جب تھوڑا بہت سیاسی اور سماجی شعور پیدا ہوا ــــ پہلی نظم تھی 'مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ' ــــ اور یہ ساری نظمیں اُس کے بعد کی ہیں ــــ یہ ۳۵ء اور سنہ ۴۰ء کے درمیان کی ہیں۔

عبادت : اچھا فیض صاحب! یہ فرمایئے کہ کبھی علامہ اقبالؒ سے بھی آپ کی ملاقات ہوئی؟

فیض : جی ہاں اُن سے کئی دفعہ شرفِ نیاز حاصل ہوا۔ ایک تو وہ ہم وطن تھے، دوسرے وہ میرے والد کے دوست بھی تھے۔ اس لئے کہ دونوں ہم عصر تھے ــــ اور یہاں انگلستان میں بھی وہ ایک ساتھ رہے تھے۔

عبادت : خوب!

فیض : چنانچہ اُن سے پہلی ملاقات تو مجھے یاد ہے۔ بہت بچپن میں ہوئی جب کہ میری عمر کوئی چھ سات برس کی ہوگی۔ مجھے اچھی

طرح یاد ہے کہ وہاں پر ہمارے یہاں ایک انجمن اسلامیہ تھی۔ اُس کا ہر سال ہوا کرتا تھا جلسہ ــــ وہ اسکول بھی تھا، دو تین اسکول تھے ــــ تو وہاں پر کبھی کبھی علامہ اقبال اُن کے سالانہ جلسوں میں شرکت کے لئے آیا کرتے تھے ــــ تو پہلی دفعہ تو میں نے انہیں انجمن اسلامیہ کے جلسے میں دیکھا ــــ اور مجھ کو اس جلسے میں شرکت کا موقع اس لئے دیا گیا کہ میں اسکول میں پڑھتا تھا ــــ اسلامیہ اسکول میں ــــ قرأت کے لئے۔

عبادت : بہت خوب!

فیض : مجھے یاد ہے کہ کسی نے اٹھا کر میز کے سامنے کھڑا کر دیا تھا کہ پڑھئے۔

عبادت : چنانچہ آپ نے کلام پاک کی تلاوت کی؟

فیض : جی ہاں! اس کے بعد جب میں گورنمنٹ کالج میں داخلے کے لئے گیا تو علامہ ہی سے خط لے کے گیا تھا۔ قاضی فضل حق صاحب کے لئے۔

عبادت : اچھا خوب!

فیض : اور اس کا مجھے افسوس ہے کہ وہ خط قاضی صاحب نے ہتھیا لیا۔ جب انٹرویو ختم ہو گیا تو میں نے کہا "وہ خط مجھے دیدیجئے" انہوں نے کہا "نہیں یہ تو میرے پاس رہے گا"۔

عبادت : اہم چیز تھی۔ کاش آپ کو وہ خط واپس مل جاتا! خدا جانے کہاں ضائع ہو گیا ہوگا۔

فیض : جی ہاں ــــ اور پھر کالج سے نکلنے کے بعد ہی بات ہے کیونکہ وہ ایک اتنے بڑے بزرگ شاعر تھے۔ اور دوسرے چونکہ ہمارے والد کے دوست تھے اس لئے ہمیں تو جانے میں کچھ جھجک ہوتی تھی۔ لیکن کالج سے نکلنے کے بعد ایک دفعہ تو مجھے یاد ہے، جب وہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کر کے آئے تھے۔ لندن سے واپس لوٹے تھے تو ہم نے گورنمنٹ کالج کی طرف سے اور بہت سی انجمنوں کی طرف سے ایک مشترکہ استقبالیہ دیا تھا ــــ

عبادت : علامہ کے اعزاز میں۔

فیض : جی ہاں! ــــ تو اسی زمانے میں ــــ یہ ہماری طالب علمی کے آخری دن تھے ــــ گورنمنٹ کالج کے سالانہ مشاعرے میں پھر ایک مقابلہ ہوا تھا ــــ شعراء اس کا موضوع تھا اقبالؒ!

عبادت : بہت خوب!

فیض : اُس پر ہمیں بھی انعام ملا تھا ــــ تو اُس پر صوفی صاحب[1] نے کہا تھا "نظم سُنا دو" ــــ تو ہم نے کہا کہ "بھئی علامہ کے سامنے تو ہم نظم نہیں سُناتے" ــــ انہوں نے کہا "نہیں نہیں۔ ٹھیک ہے۔ بہت اچھی ہے۔ پڑھ دو" ــــ خیر وہ ہم نے پڑھ دی۔

عبادت : اچھا۔

فیض : اس کے بعد پھر تاثیر صاحب، صوفی صاحب، سالک صاحب کے ساتھ دو تین دفعہ حاضری کا موقع ملا۔

---

[1] پروفیسر صوفی غلام مصطفےٰ صاحب تبسم

عبادت : اچھا فیض صاحب! ایک بات میں آپ سے اور پوچھنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ اردو شاعروں میں سے آپ نے کون کون سے شاعروں کا مطالعہ کیا ہے اور کون کون سے آپ کو زیادہ پسند ہیں؟

فیض : صاحب! اصل میں اگر مطالعہ آپ سمجھیں تو میں نے ایک ہی شاعر کا کیا ہے۔ یعنی غالب کا ۔۔۔ اس کے بعد جیل خانے میں سودا کے ساتھ کچھ وقت گزارا ۔۔۔ اور کچھ نظیر کا کلام بھی پڑھا۔

عبادت : ظاہر ہے کہ یہ تو اہم شاعر ہیں۔

فیض : یوں تو اپنی مدرسی کے زمانے میں ۔۔۔ اور پھر ریڈیو وغیرہ کے سلسلے میں تو تھوڑا سب ہی کو پڑھنا پڑا لیکن اپنے شوق سے جن کو پڑھا ہے اُن میں یہی ہیں۔ میر، غالب، سودا، نظیر، انیس ۔۔۔

عبادت : اچھا فیض صاحب! جدید شاعروں میں سے آپ کس کو پسند کرتے ہیں؟ جدید شاعروں سے میرا مطلب ہے وہ شاعر جو علامہ اقبال کے بعد آئے اور آپ کے ہم عصر ہیں۔

فیض : صاحب! اپنے ہم عصروں میں اگر میں کہوں کہ مجھے فلاں پسند ہے تو اس سے یہ نتیجہ نکالا جائے گا کہ باقی پسند نہیں ہیں۔

عبادت : جی، نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کو کون سے ہم عصروں سے نسبتاً زیادہ مناسبت ہے۔

فیض : مجھے تو سب لوگ پسند ہیں۔ لیکن زیادہ میں سمجھتا ہوں کہ ایک تو راشد۔

عبادت : ن۔م۔راشد۔

فیض : بالکل ۔۔۔ دوسرے ایک مجاز مرحوم تھے۔ اور مخدوم ہیں۔ علی سردار ہیں۔ تو ہمارے ساتھ کے جو لوگ ہیں ان میں یہ ذرا زیادہ پسند ہیں۔ یوں بہت سے اور بھی ہیں جن کی بہت سی چیزیں مجھے پسند ہیں۔

عبادت : جوش صاحب کی چیزیں آپ نے پڑھی ہیں؟

فیض : جی ہاں!

عبادت : جوش صاحب کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

فیض : جوش صاحب بزرگ ہیں ہمارے ۔۔۔ بہت دنوں سے نیاز ہے اُن سے ۔۔۔ اور اُن میں خاص قسم کا ایک دفور اور ایک خاص قسم کی قدرتِ کلام ہے ۔۔۔ تو اس سے تو مرعوب ہوئے بغیر چارہ نہیں ۔۔۔ لیکن وہ بہت پُرگو ہیں۔ غالباً قدرتِ کلام کی وجہ سے زیادہ لکھتے ہیں ۔۔۔ میں سمجھتا ہوں کہ سب بڑے شاعروں پر ایک حد تک یہ ہے کہ وہ اپنے اچھے اور بُرے اور بالکل خالص یا کہئے کم خالص تجربات میں کچھ زیادہ تمیز نہیں کرتے ۔۔۔ اور احتیاط نہیں کرتے ۔۔۔ تو جوش صاحب کا بھی یہ ہے کہ بہت اچھی چیزیں بھی ہیں اور بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ سطح تو ان کی ہمیشہ قائم رہتی ہے لیکن اس سطح میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو کہ خالص تجربے کی چیزیں ہیں لیکن بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو محض زورِ کلام میں کہی ہیں۔

عبادت : فیض صاحب! نظریے کے بغیر شاعری یا اعلیٰ شاعری یا بڑی شاعری ناممکن ہے۔ یعنی کوئی نہ کوئی نقطۂ نظر کوئی نہ کوئی نقطۂ خیال کسی شاعر کے پاس ضرور ہونا چاہئے۔ کیونکہ اس کے بغیر اعلیٰ درجے کی شاعری کی تخلیق ناممکن ہے۔ اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

فیض : نظریے کی جو اصطلاح ہے اس کے بارے میں بہت سے مغالطے ہیں۔ نظریے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ شاعر ہمیشہ بہت باقاعدگی سے کوئی فلسفے کا سائنس یا سیاست کا یا کسی اور چیز کا کوئی منظم اور مربوط نظام ہمیشہ پیش کرے بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ شعر کا تجربہ جو ہے، یا کوئی بھی تجربہ، وہ کسی نہ کسی نظریے کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ یعنی اگر آپ ایک ہی چیز کو دیکھیں تو اس کو آپ کئی نقطۂ نظر سے دیکھ سکتے ہیں —— تو مجھے کوئی ایسا بڑا شاعر —— بڑا شاعر یا بڑا فن کار، ادیب، مصور، موسیقار ایسا یاد نہیں ہے جس کے ذہن میں اپنے گرد و پیش کے متعلق کچھ تاثر، کچھ نہ کچھ احساس، کچھ نہ کچھ نظریہ کہہ لیجئے، جو کسی احساس اور تجربے پر منحصر ہو —— ایسا شخص جس کا کوئی نظریہ نہ ہو کہ یہ دنیا اچھی ہے یا بری ہے۔ لوگ اچھی طرح رہتے ہیں یا بری طرح رہتے ہیں۔ یا ان کے لئے کچھ کرنا چاہیئے یا نہیں کرنا چاہیئے۔ یا انسانیت کس طرف جا رہی ہے یا کس طرف نہیں جا رہی ہے۔ جس شخص کے ذہن میں اس قسم کا کوئی نظریہ نہ ہو وہ کوئی زیادہ حساس اور ذی شعور آدمی نہیں ہو سکتا۔ اور ہر فن کار اور ادیب کے لئے شعور تو لازمی ہے۔

عبادت : بالکل صحیح بات ہے —— اچھا فیض صاحب! خاصی باتیں ہوئیں۔ بہت بہت شکریہ آپ کا کہ آپ نے ان تمام باتوں پر روشنی ڈالی —— بہت ممنون ہوں گا اگر آپ اپنی ایک نظم اور ایک غزل بھی ارشاد فرمائیں گے۔

فیض : ضرور —— حال ہی کے زمانے کی ایک نظم ہے۔

عبادت : ارشاد۔

فیض : عرض کرتا ہوں —— "تم مرے پاس رہو" —— اس کا عنوان بھی یہی ہے ؎

تم مرے پاس رہو
مرے قاتل مرے دلدار مرے پاس رہو

....

....

عبادت : اب غزل بھی ارشاد فرمایئے۔

فیض : اچھا صاحب! تو غزل بھی اسی زمانے کی ہے۔ بلکہ آپ ہی کے شہر میں لکھی گئی ہے ؎

ہر سمت پریشاں تری آمد کے قرینے
دھوکے دیئے کیا کیا ہمیں بادِ سحری نے

ہر منزلِ غربت پہ گماں ہوتا ہے گھر کا
بہلایا ہے ہر گام بہت دربدری نے

تھے بزم میں سب دودِ سرِ بزم سے شاداں
بے کار جلایا ہمیں روشن نظری نے

مے خانے میں عاجز ہوئے آزردہ دلی سے
مسجد کا نہ رکھا ہمیں آشفتہ سری نے

یہ جامۂ صد چاک بدل لینے میں کیا تھا
مہلت ہی نہ دی فیض کبھی بخیہ گری نے

عبادت : فیض صاحب! ایک اور تازہ غزل آپ نے چند روز ہوئے مجھے سنائی تھی۔ وہ بھی عنایت فرمائیے۔
فیض : عرض کرتا ہوں ؎

شرحِ فراق مدحِ لبِ خشک بو کریں
غربت کدے میں کس سے تری گفتگو کریں

یار آشنا نہیں کوئی ٹکرائیں کس سے جام
کس دل رُبا کے نام پہ خالی سبو کریں

سینے پہ ہاتھ ہے نہ نظر کو تلاشِ بام
دل ساتھ دے تو آج غمِ آرزو کریں

کب تک سنے گی رات کہاں تک سنائیں ہم
شکوے گلے سب آج ترے رُو برُو کریں

ہمدم حدیثِ کوئے ملامت سنائیو
دل کو لہو کریں کہ گریباں رفو کریں

آشفتہ سر ہیں محتسبو! منہ نہ آئیو!
سر بیچ دیں تو فکرِ دل و جانِ عدو کریں

"تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں"

عبادت: بہت بہت شکریہ!

(لندن سے)

کچھ عجیب سی بات ہے کہ ہمارے ہاں ہر فن کو فن کہتے ہیں لیکن فلم کو انڈسٹری کہتے ہیں، صنعت بھی نہیں انڈسٹری۔ گویا جوتے بنانا اور فلمیں بنانا کچھ ایک ہی سا کاروبار ہے۔ مگر اس میں مالی ہے تو آپ کی پسند پہ ہے جوتا بنائیے یا فلمیں۔ بلکہ جوتا بنانے کے لئے تو شاید کچھ سمجھ بوجھ درکار ہو، فلم بنانے کے لئے یہ بھی شرط نہیں۔

— فیض

فیض احمد فیض

ترجمہ

آغا افتخار حسین

فنکار اور ترقی پسند تحریک معاشرہ

فیض صاحب کا یہ تازہ ترین مضمون ہے جو انہوں نے
پچھلے دنوں افروایشیائی کانفرنس منعقدہ لاہور میں
پڑھا تھا۔ (ادارہ)

سب سے پہلے ہمیں یہ مان لینا چاہئے کہ ایک تخلیقی فنکار رہا ہے اور جو کچھ بھی ہو وہ ایک تاریک میں کھو گیا۔ ریاکار اور بزدل نہیں ہے۔ ہمیں یہ بھی تسلیم کر لینا چاہئے کہ اس پر جس حقیقت کا انکشاف ہوگا نہ تو وہ اسے سستے داموں بیچے گا اور نہ ہی کسی کے خوف سے اسے چھپائے گا۔ یہ حقیقت ہی اس کی زندگی کا ماحصل ہے۔ اور اس کے فن کا آئینہ ہے۔ ہم اس وقت فنکار کی ذاتی اخلاقیات کا ذکر نہیں کر رہے ہیں (حالانکہ اس کی بھی اہمیت ہے) بلکہ اس اخلاقیات کا جو اس کے فن پر حاوی ہے۔ اس اخلاقیات کا جو اس کے جمالیاتی اقدار کی اساس بنتی ہے۔

یہ حقیقت کیا ہے اور اس کی صحت کو ناپنے کا پیمانہ کیا ہے؟ ایک فنکار حیات کے تین ہم مرکز دائروں میں گھومتا ہے۔ پہلا دائرہ اس کی اپنی مادی اور موضوعی شخصیت کا ہے۔ دوسرا دائرہ اس کی برادری اور اس کی قوم کا ہے اور تیسرا دائرہ انسانیت کے اس دور کا ہے جس میں وہ رہتا ہے۔ وقت کے یہ تین ابعاد (DIMENSIONS) ماضی۔ حال اور مستقبل میں اور حیات کے یہ تین دائرے ہی وہ حقیقت ہے جس کا وجود فنکار کے لئے اہمیت رکھتا ہے۔ اور یہی اس کے لئے صداقت کا ماحصل ہے۔ یہ حقیقت اور صداقت فنکار اور اس کے ناظرین، قارئین اور سامعین سب کے سامنے جلوہ گر ہے۔ لیکن فنکار اس حقیقت سے کس حد تک متاثر ہوا؟ اس کا پیمانہ یہی ہے کہ اس نے اس حقیقت اور صداقت کی عکاسی اپنے فن میں کس حد تک کی۔ حقیقت اور صداقت کا یہ ادراک اور احساس فنکار کے لئے کئی صورتیں اختیار کرتا ہے۔ یہ کبھی اشیاء اور ان کے باہمی تعلق کی صورت میں داخل ہوتا ہے۔ کبھی تاریخ کے علت و معلول کی شکل میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ کبھی عروج و زوال کی تفسیر بن کر نمودار ہوتا ہے۔ کبھی تصادم کی تصویر دکھاتا ہے۔ کبھی ترکیب کی۔ کبھی خوش آہنگ کبھی بے آہنگ اور اسی طرح حقیقت کے اس فنکارانہ ادراک سے اشیاء اور ان کے باہمی تعلق کی قدر و قیمت بھی متعین ہو جاتی ہے۔

فن کار خود بھی اپنے گرد و پیش کے حقائق پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس اثر کا اندازہ اس سے لگایا جاتا ہے کہ فنکار نے اپنے فن کے ذریعہ اپنے احساس حقیقت کو کس حد تک اپنے سامعین وغیرہ تک پہنچایا۔ اس احساس کو فن کے ذریعے سامعین تک پہنچانے سے سامعین

اثر قبول کرتے ہیں۔ اور ان میں ذہنی تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں اور جب سامعین (قارئین یا عوام) میں ذہنی تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں تو اپنے
معاشرہ اور سماج کے حقائق کے بارے میں ان کے نقطۂ نظر اور رجحانات بھی بدل جاتے ہیں۔ اور اس کے نتیجے میں ان کے گرد و پیش کے سماجی
حقائق سے ان کے رشتے میں بھی تبدیلیاں آ جاتی ہیں۔ اور معاشرتی حقائق اور انسان کے باہمی رشتوں میں تبدیلی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ
کافی حد تک خود وہ حقیقت بھی بدل جاتی ہے جس کے احساس اور ادراک کو فنکار فن کے ذریعے دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ چنانچہ جب
بھی فن کا ایک شہ پارہ تخلیق ہوتا ہے۔ تو اس کے ساتھ ساتھ ایک نئی دنیا۔ ایک نئی حقیقت بھی وجود میں آ جاتی ہے۔ ایک عظیم
فنکار کی تخلیق کا انداز یہی ہے۔

صحیح معنوں میں ایک تخلیقی فن کار کا فرض ہے کہ وہ اپنے فن کی حدود میں اپنی ذات، اپنی قوم، اپنے عہد کے ماضی، حال
اور مستقبل کو معلوم و محسوس کرے اور اس کے بعد اپنے علم اور احساس کی قدر و قیمت معین کرے اور اس کی تفسیر و تشہیر کرے
اس پس منظر میں ایشیا اور افریقہ کے تخلیقی فن کار کے علم اور اس کی قدر و قیمت معین کرنے کی کیا نوعیت ہونی چاہیئے؟
سب سے پہلے یہ کہ اسے ماضی سے باخبر ہونا چاہیئے۔ ماضی کے لئے صرف یہی کافی نہیں کہ وہ محض اس قریبی ماضی سے باخبر ہو جس میں
اس کا ملک سامراجیت اور نوآبادیت کی غلامی اور ذلت کا شکار رہا ہے۔ یہ دور قریب تر ہونے کی وجہ سے تحلیل کے لئے اہم ہے۔ لیکن محض
اس ماضی قریب ہی سے باخبر ہونا کافی نہیں۔ فنکار کو اس بہت پرانے ماضی سے بھی باخبر ہونا چاہیئے جس میں خون، دولت، سیاسی
شان و شوکت سب ہی کچھ تھا۔ اور پھر وہ بانسری اور رباب کا ماضی اور وہ مٹی اور پتھر کا ماضی بھی اور پھر حیات کے ابتدائی دور کا
وہ عہد عتیق جب زمین کے دوشیزہ جسم کو پہلی بار برہنہ کیا گیا تھا۔

اور پھر حال جس میں امیدیں بھی ہیں مایوسیاں بھی جس میں کامرانیاں بھی ہیں ناکامیاں بھی۔ توقعات بھی ہیں اور تلخ
حقیقتوں کا سامنا بھی۔ جس میں نئی آرزوئیں بھی ہیں اور نئے مظالم بھی۔

اور آخر میں مستقبل۔ ایک مستقبل جس کا احاطہ خود فنکار کے تصور نے کیا ہے۔ اگر فنکار کا تصور محدود ہے۔ تو یہ زمین
ایک چھوٹی کم حقیقت سی شے ہو کر رہ جائے گی۔ لیکن اگر تصور میں وسعت ہے تو یہی زمین پہنائے فطرت کے افقوں میں بھی نہ سما
سکے گی۔ یہی کیفیت فنکار کی شخصیت سے بھی وابستہ کی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فنکار اپنے حیاتی شعور کی حدود میں قید ہو
اور اپنی مریضانہ باطنی شخصیت کے درد کو بھلانے کی کوشش کرے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے محدود ماحول کے فوری
تجربات کے حدود سے بلند ہو جائے۔

لیکن فنکار کا یہ تصور بھی اس وقت تک غیر حقیقی اور بے مایہ رہے گا جب تک فنکار اس کا مطالعہ اس کے اصلی اسباب
و علل، عالمگیر معاشرتی محرکات۔ سامراجیت۔ نوآبادیت اور استحصال پسندی کے پس منظر میں نہ کرے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ
اس کا دل میں فنکاری کی آخری منازل میں پہنچ جائے۔ اور گرد و پیش کے حقائق اور تضاد کو ایک آفاقی نقطۂ نظر سے دیکھے اور
اپنی ذاتی تکلیف کو اپنی قوم کے مصائب میں ضم کر دے۔ اور قوم کے مصائب کو اس عہد کے مجموعی آلام و مصائب کے
اس آفاقی تصور میں ضم کر دے جس میں مظالم بھی ہیں اور بغاوتیں بھی۔ طرح طرح کا جبر و استبداد بھی ہے اور انصاف کا
خون بھی اور اس کے ساتھ ساتھ ان جبر و تشدد کو ختم کرنے کے لئے جد و جہد بھی جس میں کامرانیاں بھی ہیں اور
ناکامیاں بھی۔

یہ آفاقی تصور ہی فنکار کو اپنے موجودہ عہد کی سطح سے ماورا لے جاتا ہے۔ اور آخر کار ہماری کائنات کی مجموعی حقیقت اور ہمارے عہد کی مکمل صداقت سے روشناس کرا دیتا ہے۔

مغربی سرمایہ دار معاشروں میں برسر اقتدار جماعت نے کامیابی کے ساتھ فنکار کو اس کر دار سے برگشتہ کر دیا ہے۔ ان ملکوں میں فنکار ایک تنہا فرد ہے اس کی کوئی جماعت نہیں اس کا کوئی ماضی نہیں اس کا کوئی مستقبل نہیں وہ کسی کے سامنے جوابدہ نہیں سوائے اپنی ذات یا ان لوگوں کے جو اس کا مال خریدتے ہیں۔ ترقی پذیر معاشروں میں گذشتہ سامراجیت اور نو آبادیت کے اثر کی وجہ سے فنکار خود اپنی ذات اور اپنے ساتھیوں سے بہت دور رہ گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان معاشروں کا فنکار ایسی زبان۔ ایسے الفاظ۔ ایسے محاوروں کی حیثیت رکھتا تھا جنہیں اس کے بیشتر عوام نہیں سمجھتے تھے۔ اس نے تصورات کی ایک ایسی دنیا بنائی تھی جس کے لئے عام لوگ اجنبی تھے۔ یہ فنکار خود اپنے سے بیگانہ اس لئے ہو گیا تھا کہ اس نے اپنے آپ کو تنہا پایا۔ اور اسے اس تلخی کا احساس ہوا کہ اس کے نالہ و فغاں کی آواز خود اس کی ذات کے ویرانے سے گونجتی ہے۔ اس لئے وہ بامعنی اور بامقصد فنی تخلیق کے راستے سے بھٹک گیا۔ اس نے اپنے اور اپنے ساتھیوں کے شعور کو گہرا اور وسیع کرنے کی کاوش چھوڑ دی اور اس کی توجہ دوسری نسبتاً کم اہم چیزوں کی طرف ہٹ گئی۔ اصل شے کو سنوارنے کی بجائے اس کے سانچوں کی طرف توجہ دینے لگا۔ اعلیٰ خیالات کی تخلیق کی بجائے الفاظ اور آواز وغیرہ کو دلکش بنانے کی کوششوں اور مشقوں میں اپنی تخلیقی خواہش کی تسکین تلاش کرنے لگا۔ نیک اور بد۔ خیر و شر، انصاف اور استبداد۔ خوبصورتی اور بدصورتی کے فرق کو بیان کرنا تو در کنار اسے اُن تصورات کے احساس سے بھی شرم آنے لگی۔

ترقی پذیر معاشروں کے اس دور میں تخلیقی فنکار کا یہ کردار نہیں ہو سکتا۔ عوام کو حق حاصل ہے کہ وہ مطالبہ کریں کہ ان کا فنکار ان سے اس زبان میں باتیں کرے جسے وہ سمجھتے ہیں کم از کم فن کے حدود میں وہ عوام کی جدوجہد۔ آلام و مصائب۔ غم و انبساط میں ان کا شریک رہے ان میں سے بہت سے معاشرے بیسویں صدی میں پیدا ہوئے اور ابھی ابتدائی منازل طے کر رہے ہیں۔ یہ معاشرے جس نئے دور میں پیدا ہوئے ہیں وہ سائنس اور صنعت کا دور ہے۔ اس دور میں نئے تصورات اور معاشرتی تعلقات میں مساوات کے نظریات نے جنم لیا ہے۔ یہ نئے معاشرے فنکار سے توقع کرتے ہیں کہ وہ اس نئے دور میں ابتدائی منازل طے کرنے میں اپنے اپنے فن کے ذریعہ اپنے معاشرے کی مدد کرے یہ معاشرے توقع کرتے ہیں۔ کہ فنکار نئی اور پرانی بے انصافیوں نئے اور پرانے مظالم اور استبداد اور ان تمام رجحانات کے خلاف جدوجہد میں معاشرے کی مدد کرے جو زندگی، عزت نفس اور آزادی کی نفی کرتے ہیں۔ اور یہ بھی توقع کرتے ہیں کہ فنکار اس خوشنما آئندہ صبح کے تصور پر یقین رکھنے میں معاشرے کی مدد کرے جو جلد نمودار ہوگی۔

وہ چاہتے ہیں کہ ان کے جدید فن کار کی روح بقول روسی شاعر نکراسوف کبھی غم اور انتقام کی آگ بھڑکائے اور کبھی امید اور کامرانی کا پیغام دے۔

اقبال کو کسی تحریک کی چار دیواری میں بند نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا ایک قدم پرانے وطن پرستوں میں ہے اور دوسرا موجودہ ترقی پسندوں میں
قوم اور وطن کے بعد انقلاب اور مزدور و سرمایہ کا جو دور آیا اس کی بھی جھلک بھی اُن کے ہاں دکھائی دیتی ہے۔　　— فیض

فیض احمد فیض

حدیثِ رفتگاں

پروفیسر مولوی محمد شفیع، راجہ غضنفر علی اور شوکت تھانوی کی یادیں،

۱

ایک صبح لندن کی برفانی فضا اور برفانی موسم سے یکایک ایسی وحشت ہوئی کہ ہم نے رختِ سفر باندھا اور احتجاجاً واک آؤٹ کر گئے یورپ میں رختِ سفر باندھنا محض محاورے کی رعایت ہے ورنہ یہاں بستر لیے رہنے کی حاجت کہاں، سفر تیز طے اور شجر سایہ دار راہ میں نہ سہی مسافر نواز بہتیرے، شاید پہلے وقتوں میں ہمارے ہاں بھی یہی صورت ہوگی ورنہ شیخ سعدی اور ابنِ بطوطہ جیسے آشفتہ سر لوگ ہفت اقلیم کی سیر کیوں فرماتے، سرائے، مہمان خانے، مساجد، دھرم شالے، مخیر لوگوں کے گھر ابن السبیل کے لئے ہزار بسیرے تھے۔ ہمارے ہاں یہ مسافر نوازی خیرات تھی یورپ میں تجارت ہے لیکن یہ تجارت بہت انتظام اور ٹھکانے کی ہے ہم جیسی صورت نہیں کہ خیرات سے ہاتھ کھینچ لیا اور تجارت کا سلیقہ نہ آیا دو چار بڑے شہروں میں تو خیر گرہ میں مال ہو تو کچھ ایسی گھبراہٹ کی بات نہیں لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ یکایک جدھر کو جی چاہا منہ اٹھا کر چل دیئے۔ شجر سایہ دار کے بھروسے پر رہے تو یا پولیس والے ایک سوتے میں چالان کر دیں گے یا کسی چور ڈاکو کے ہاتھوں جان پہ آ بنے گی اور پھر ہمیں شکایت ہے کہ ہمارے ہاں سیاحت ترقی کیوں نہیں کرتی۔

خیر یہ تو معترضہ جملہ تھا اس وقت میں لائیڈن یونیورسٹی کے کیرن انسٹی ٹیوٹ کے بالمقابل ایک چھوٹے سے ریستوران میں بیٹھا ہوں، یہ ادارہ مشرقی زبانوں کی تحقیق و تدریس کے سلسلے میں ایک زمانے سے شہرۂ آفاق ہے۔ میرے میزبان شعبۂ عربی کے استاد پروفیسر بروخین ابھی ابھی رخصت ہو کر گئے ہیں، باہر پرانے سہ پہلو چھتوں والے مکانوں کے نیچے اور دو پتلی سی نہروں کے درمیان شہر کی آب جو کا سبزی مائل پانی چپ چاپ بہہ رہا ہے دھوپ چھٹکی ہوئی ہے اور ریستوران میں بہت سے پھول کھل رہے ہیں یہ سب وجہ انبساط ہونا چاہیے تھا لیکن آج گھر سے اخبار پہنچا تو راجہ غضنفر علی خاں مرحوم کی رحلت کی خبر پڑھی، اس سے پہلے یہاں کے کتب خانے میں ایک کارکن کی زبانی معلوم ہوا کہ چند دن پہلے اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مؤلف پروفیسر

مولوی محمد شفیع مرحوم وفات پا گئے ہیں۔ ان دونوں بزرگوں سے میری بچپن سے نیازمندی تھی۔ ایک میرے استاد تھے ایک دوست، اور کرم فرما۔ ایک علم و فضل میں بے مثال، ایک سیاسی تدبر اور محفل آرائی میں لاجواب۔ اب جو انہیں یاد کرنے بیٹھا ہوں تو دو قطعی متضاد مگر یکساں ممتاز شخصیتیں آنکھوں کے سامنے ہیں۔ مولوی صاحب کم گو کم آمیز تنک مزاج اور سخت گیر۔ کتب اور مخطوطات کے علاوہ کوئی رفیق تھا نہ مصاحب تحقیق و تدریس کے علاوہ نہ کوئی تفریح نہ مشغلہ جملہ تکلفات سے بے نیاز لباس و آرائش سے بے پروا، دفتر نشینی اور خانہ نشینی کے علاوہ کسی محفل سے سروکار نہ تھا۔ عمر بھر درویشوں کی طرح گوشہ گیر رہے۔ اس کے خلاف راجہ صاحب خوش باش، ہنسوڑ، چھبیلے۔ پل بھر میں ہر کسی سے شیر و شکر۔ دہلی کے خالصہ سے لے کر خوبانِ عجم تک ہر کسی کے منظورِ نظر جس محفل میں دیکھو دولہا بنے بیٹھے ہیں خوش لباس خوش گفتار۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایک زمانے میں بیگانے لوگ پاکستان کو قومی نشانوں سے کم پہچانتے تھے۔ راجہ صاحب کے شملہ و دستار سے زیادہ۔

اب سے قریب قریب تیس برس پہلے میں اور میرے ایک دوست ڈاکٹر حمید الدین جناب گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفے کے استاد ہیں۔ اورینٹل کالج لاہور میں ایم۔ اے عربی کا داخلہ لینے پہنچے۔ ہم دونوں دوسرے مضامین میں گورنمنٹ کالج سے ایم اے کی سند حاصل کر چکے تھے۔ حمید الدین فلسفہ اور نفسیات میں۔ میں انگریزی میں۔ اس لئے ہمیں دو سال کے بجائے ایک سال میں نصاب مکمل کرنے کی رعایت تھی۔ بشرطیکہ متعلقہ شعبہ کے استاد کی منظوری حاصل ہو۔ مولوی شفیع مرحوم ان دنوں اورینٹل کالج کے پرنسپل بھی تھے اور شعبۂ عربی کے صدر معلم بھی۔ چنانچہ ہم دونوں کی پیشی ہوئی۔ حمید صاحب کے والد ڈاکٹر صدر الدین مرحوم گورنمنٹ کالج میں عربی کے استاد اور مولوی صاحب کے رفیقِ کار تھے اس لئے ان سے تو کچھ تعرض نہ ہوا البتہ مجھ سے کافی دیر جرح کرتے رہے مولوی صاحب کو شکایت تھی کہ نوجوان زبانِ عربی کو سیر و تفریح کے بجائے گھر کی مرغی سمجھنے لگے ہیں اور کافی ریاضت اور سمجھ بوجھ کے بغیر اعلیٰ اسناد کے درپے ہونے لگتے ہیں، میں نے شمس العلماء سید میر حسن مرحوم اور مولوی محمد ابراہیم میر سیالکوٹی سے شرفِ تلمذ و عربی اے بی اے آنرز کا حوالہ دیا تو مولوی صاحب بمشکل راضی ہو گئے۔ اگلے دن ہم مولوی صاحب کی کلاس میں پہنچے تو پتہ چلا کہ داخلہ کا مرحلہ تو محض ابتدائے عشق کی منزل تھی آگے آگے کئی سخت مقام آنے والے ہیں۔ ان دنوں گورنمنٹ کالج میں ہم ایم۔ اے کے طلباء کا رتبہ اساتذہ سے کچھ ہی کم ہوا کرتا تھا۔ کسی پروفیسر سے شغف ہے تو ان کی کلاس میں باقاعدگی سے گئے، کسی اور صاحب کی صورت یا آواز پسند نہیں تو نہ گئے۔ پابندیٔ اوقات پہ کسی کو کچھ اصرار نہ تھا۔ بہت سے اساتذہ سے دوستانہ اور بے تکلف مراسم تھے۔ یہاں اورینٹل کالج میں جو پہنچے تو مولوی صاحب کی کلاس میں پرانے، روایتی مکاتب کا ماحول پایا، کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ مولوی صاحب کے دبدبے سے اچھے خاصے بقراط لوگوں کے اوسان خطا رہتے تھے اور وقت، قاعدے قانون کی وہ پابندی کہ اللہ کی پناہ، ہم دونوں گورنمنٹ کالج کے لک چڑھے پہلے ہی دن حسب معمول دس پانچ منٹ دیر سے پہنچے تو مولوی صاحب نے واسکٹ کی جیب سے طلائی گھڑی نکالی اور دیر تک کبھی ہم کو کبھی گھڑی کو دیکھا اور پھر بغیر کچھ کہے گھڑی جیب میں ڈال لی۔ پڑھائی کا دستور یہ تھا کہ ایم۔ اے کے طالب علم بالکل ابتدائی مدارس کے بچوں کی طرح نصاب کی کتاب یعنی مبرد کی الکامل، ابن قتیبہ کی الشعر والشعراء اور موطا امام مالک سے کچھ پڑھتے اور مولوی صاحب ہر اقتباس کے بعد انگریزی میں متن کی تشریح اور تفسیر کرتے جاتے، پڑھنے میں کسی کو اعراب پہ ڈانٹ پڑتی، کسی کے تلفظ پہ کان اینٹھے جاتے (بہ اعتبار محاورے میں)، لیکن اس ناگوار تمہید کے بعد ان کے حسنِ بیان اور خوبیٔ تقریر سے کافی سے زیادہ تلافی ہو جاتی مولوی صاحب کے

اوقات اور طریقِ تدریس کی طرح ان کا لباس بھی ہمیشہ سے اٹل تھا۔ سرخ اونچی دیوار کی رومی ٹوپی، سیاہ جوتے، تنگ مہری کی پتلون سردیوں میں وہی ایک نیلا کوٹ اور گرمیوں میں اسی وضع قطع کا سفید یا بادامی، چنانچہ بعض زبان دراز شاگرد انھیں اسٹیشن ماسٹر کہا کرتے تھے، رسمی تقریبات میں کبھی اچکن اور شلوار بھی پہن لیا کرتے لیکن ان تقریبات میں وہ آتے ہی کب تھے، طلباء کے لئے کالج کے اوقات کے بعد ملاقات پر قدغن تھی۔ کبھی کوئی مشکل لے کر پہنچ گیا تو مولوی صاحب کالج کے پچھواڑے ریبیہ اخبار گلی میں اپنے مکان کی بالائی منزل سے کھڑکی میں کھڑے کھڑے گفتگو فرماتے درونِ دربار باریابی کا شرف شاید ہی کسی کو حاصل ہوا ہو، لبعد میں البتہ وہ ہم سب پر انتہائی شفقت فرماتے رہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ سر سفید ہو جانے کے بعد بھی ان کی طلبی پر خفیف سی گھبراہٹ ضرور ہوتی تھی۔

مجھے طالب علمی کے دنوں سے اب تک دیس پردیس بیسیوں اہلِ فضل سے شرفِ نیاز رہا ہے لیکن السنۂ شرق و غرب میں جیسی وسیع بصیرت اور جیسا یکساں عبور مولوی شفیع مرحوم کو حاصل تھا اُس کی نظیر ڈھونڈے سے ملے گی، ضعیفی کی عمر میں انہوں نے اردو میں انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کی تالیف کا بارِ گراں اپنے سر لیا تھا اس نوع کی مہم کے لئے جیسے ذرائع اور جتنی سہولتیں لازم ہیں وہ مولوی صاحب کو زندگی میں فراہم نہ ہو سکیں ہماری بدقسمتی ہے کہ وہ یہ کام ادھورا چھوڑ کر رخصت ہو گئے اس لئے کہ اس کی تکمیل کے لئے ان کا بدل مشکل سے ملے گا ہمارے ہاں گذشتہ کئی برس سے علم و ادب کے لئے سرکاری اعزاز بٹنے لگے ہیں نجانے مولوی صاحب کا نام سر دربار پہنچا کہ نہ پہنچا۔ اگر نہیں پہنچا تو غنیمت ہے ہر چند ان جیسے اہلِ کمال رسمی اعزازات کے محتاج اور متمنی نہیں ہوتے لیکن کسی جگہ رسم ٹھہر جائے تو پھر ایسے بزرگوں کے اعزاز و اکرام میں کوتاہی کسی طور روا نہیں۔

(۲)

راجہ غضنفر علی خاں مرحوم سے اولین ملاقات بھی طالب علمی ہی کے دوران ہوئی۔ راجہ صاحب ہمارے محبوب استاد پروفیسر احمد شاہ بخاری (پطرس) کے ہمجولیوں میں سے تھے اگرچہ ایک لحاظ سے ان دونوں کے مشرب میں کافی فرق رہا ہو گا راجہ صاحب گورنمنٹ کالج کے باغی قوم پرست طلباء کے سرغنہ تھے۔ بخاری صاحب ادب برائے ادب کے وکیل، سیاست سے کوسوں بھاگتے تھے لیکن اس بات سے قطع نظر خوش طبعی، یار باشی، فقرے بازی، بذلہ سنجی بلکہ آمائی حتیٰ کہ کبھی کبھی طرح بازی میں دونوں ہم شغل اور ہم مزاج تھے۔ ہماری طالب علمی کے دنوں میں بخاری صاحب کے گھر پر ہفتے پندرہ روز شوقین طلباء اور معروف ادبا کی ایک علمی ادبی محفل منعقد ہوا کرتی تھی کا طلباء میں سے حفیظ ہوشیار پوری، ن م راشد، آغا عبدالحمید (سابق کمشنر کراچی) سید رشید احمد (سابق ڈائرکٹر جنرل ریڈیو) شیر محمد حمید، محمود ہاشمی، احسان محفل کے سرگرم کارکن تھے، معتقد لکھنے والوں میں سالک مرحوم، پنڈت ہری چند اختر مرحوم، سید امتیاز علی تاج، صوفی تبسم باقاعدگی سے شرکت کرتے۔ کبھی کبھی حفیظ جالندھری بھی تشریف لاتے۔ گھنٹوں باتیں ہوتیں، گھنٹوں شعر و سخن اور بحث و تنقید کا بازار گرم رہتا ایسی ہی ایک صحبت میں راجہ صاحب بھی تشریف لائے۔ قومی سیاست میں ان کا نام جب تک کافی معروف ہو چکا تھا اور غالباً ان دنوں وہ وائسرائے کی لیجسلیٹو اسمبلی کے رکن بھی تھے۔ ایک ہی شام میں راجہ صاحب حسبِ معمول سب لوگوں سے ایسے گھل مل گئے گویا برسوں کی ملاقات ہے اور اس کے بعد ہم میں سے کسی کو ان سے دوبارہ متعارف ہونے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اس کے بعد برسوں اور بارہا راجہ صاحب کو خلوت و جلوت۔ وزارت، سفارت، گوشہ نشینی، ہر رنگ میں دیکھا اور ہمیشہ یک رنگ پایا۔

اپریل ۱۹۵۵ء میں جیل سے رہائی کے بعد گھر پر میرا پہلا دن تھا۔ صبح ہی صبح راجہ صاحب تشریف لائے جب وہ دہلی

میں ہمارے ہائی کمشنر تھے، آتے ہی انھوں نے اپنا مخصوص قہقہہ بلند کیا اور کہنے لگے "بھئی خوب وقت پر آئے۔ کیا حسنِ اتفاق ہے۔ اگلے مہینے ہم یومِ اقبال پر دہلی میں مشاعرہ کر رہے ہیں تم بھی چلو۔" میں نے کہا "راجہ صاحب ابھی تو پوری طرح گلو خلاصی بھی نہیں ہوئی ضمانت کی رسی گلے میں پڑی ہے بھلا مجھے دہلی کون جانے دے گا! بھاگ جاؤں تو؟"

"ہٹاؤ جی، وہ ہمارا ذمہ ہے"۔ راجہ صاحب نے فرمایا۔ میں نے ہاں تو کر دی لیکن مجھے یقین تھا کہ راجہ صاحب اپنی مسلمہ قدرتِ کار کے باوجود ایسی تگ و دو میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ چند دنوں کے بعد واقعی دہلی جانے کا پروانہ آ گیا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی، اگلے مہینے دہلی میں راجہ صاحب کا دربار دیکھا، ان کے دروازے پر ہاتھی تو نہ جھومتے تھے لیکن اہلِ دہلی اور خاص طور سے خالصائی کے ٹھٹ ضرور لگے رہتے، کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ یہ ایک بدیسی سفیر کا مکان ہے یہی محسوس ہوتا تھا کہ یہاں کے کسی حاکمِ اعلیٰ کا ایوان ہے۔ بہت دھوم کا مشاعرہ ہوا موجودہ صدرِ ہند، ڈاکٹر رادھا کرشنن صدر تھے، راجہ صاحب کا مکان سلیقے اور سجاوٹ میں پہلے ہی کچھ کم نہ تھا اس شام اور بھی چمک دمک گیا۔ وسیع لان اور برآمدے خلقت سے کھچا کھچ بھر گئے تو باہر کی دیوار پر لاؤڈ اسپیکر نصب کئے گئے۔ اور ہزاروں کے مجمع نے رات بھر مشاعرہ سنا۔ اگلی دوپہر راجہ صاحب میرے کمرے میں آئے اور کہنے لگے "میں نے رات پروٹوکول (PROTOCOL) کے خیال سے پنڈت نہرو کو مدعو نہیں کیا تھا۔ ابھی انھوں نے ٹیلیفون پر شکایت کی ہے اور آج شام صرف پاکستانی شعراء کو سننے یہاں آ رہے ہیں تم ذرا محمد جعفری اور زہرہ نگاہ کو اطلاع کر دو۔"

راجہ صاحب کے سفارتی کمالات تو خیر ایک الگ باب ہے۔ کہنا یہ مقصود تھا کہ راجہ صاحب نڈر اور دھن کے پکے آدمی تھے جس بات پر ڈٹ جاتے عام طور سے منوا کر رہتے ورنہ ہمارے ہاں اچھے خاصے بھلے مانسوں کو بھی ایسی آسانی سے پاسپورٹ اور دیارِ غیر کے سفر کی اجازت کہاں ملتی ہے۔ پہلے نوں ناک رگڑو، سو پشت کی چھان پھٹک کرواؤ جب کسی نے عنایت کی تو خیر ورنہ خیر صلا۔ اور اگر کسی کا نام ہماری طرح پولیس کے دس نمبر میں درج ہے تو بڑے بڑے افسروں اور لیڈروں کا محض سفارش کی درخواست پر پتا پانی ہونے لگتا ہے لیکن راجہ صاحب مرحوم کو ایسے معاملات میں قطعی کبھی باک نہ ہوا۔ اس کی ایک اور مثال یہ ہے کہ راجہ صاحب نے پاکستان چین دوستی کی تنظیم اس وقت قائم کی جب اس عظیم ہمسائے کا نام ہمارے ذی اقتدار حلقوں میں بالکل مقبول نہ تھا بہت سے صحافی اور سیاسی بزرگ جو آج کل چین کی تعریف میں اس قدر رطب اللسان اور چین و پاک کی دوستی پر اتنے مصر نظر آتے ہیں کل تک کسی امریکی فرمان سے سرمو انحراف تخریب اور گناہ گردانتے تھے اور جیسا کہ ساری دنیا جانتی ہے امریکی حکمتِ عملی میں چین دشمنی ہمیشہ سے سرِفہرست ہے ان دنوں چین سے دوستی کی بات کرنا ان سب بزرگوں کی نظر میں کمیونسٹ نوازی اور امریکہ دشمنی کا ایک بہانہ تھا اور یہ الزامات کسی شریف آدمی کو گشتنی اور گردن زدنی ٹھہرانے کے لئے کافی سمجھے جاتے تھے راجہ صاحب نے انھیں دنوں اس تنظیم کی صدارت سنبھالی اور ہر سال چین کے یومِ انقلاب پر دھڑلے سے تقریبات منعقد کرتے رہے۔

مختلف سفارتی عہدوں کے دوران راجہ صاحب کے کارناموں کے بارے میں کچھ کہنا تحصیلِ حاصل ہے یوں گمان ہوتا ہے کہ انھیں اپنے بزرگوں سے جذب و کرامات کا حصہ ورثے میں ملا ہوگا کہ جہاں بھی جاتے عوام و خواص دونوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتے اور اگر یہ غیر عقلی بات قابلِ قبول نہیں تو ان کی کامیابی اور مقبولیت کے لئے ان کے اپنے اوصاف کیا کم تھے خلوص، بے غرضی اور ملنساری، حسنِ ذوق، بے باکی اور جرأتِ رندانہ، بڑے چھوٹے، امیر فقیر ہر کسی سے ایک سا برتاؤ کرتے، نہ کسی سے دبے نہ کسی سے کھنچے ملازمت کے دوران کوئی کام مفید اور اہم سمجھا تو دفتری قاعدے قانون کو طاق پر رکھا، گھر کی وزارتوں کی مین میخ پر لعنت بھیجی اور من مانی کرتے رہے

پاکستان کی خوش قسمتی تھی کہ اسے اپنے ابتدائی ایام میں وکالت اور سفارت کے لئے ایسا بلیغ اور موثر کارکن ہاتھ آیا اور بد قسمتی ہے کہ بعد کے ایام میں نہ ان کی خدمات سے مکمل استفادہ کیا جا سکا نہ کوئی ان کا بدل بروئے کار آیا۔

"پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ"

(۳)

شوکت تھانوی مرحوم یکایک محفل سے اٹھ گئے۔ اس ہمدم دیرینہ کی جدائی پر احباب کے دل پر جو گزری سو گزری، لیکن ذاتی غم سے زیادہ اس بات کا دکھ ہے کہ محفل وطن میں جہاں رلانے کو بہت کچھ ہے، لیکن ہنسانے کو صرف شوکت تھانوی تھے۔ اور ان کی جگہ اب کون سنبھالے گا۔ برسوں سے ان کا نام تکیہ کلام کی صورت گھر گھر ورد زبان تھا۔ یہ فقرہ، وہ لطیفہ وہ نقل۔ ہزار جگہ، ہزار بات شوکت تھانوی سے روایت تھی۔ پھر ان کا لطف صحبت اس پر مستزاد، آنکھ اوجھل یاد سے دور، بیسیوں مخلص بیسیوں صورتیں اور طرح طرح کے بزرگ بھی تھے جنہیں مرحوم اپنی شعبدہ بازی سے دم بھر کو زندہ کر دیا کرتے تھے۔ لکھنؤ کا کوئی مشاعرہ یا دربار کسی رئیس کی بیٹھک۔ دہلی میں کسی حکیم کا مطب۔ یہ ثاقب لکھنوی ہیں۔ یہ نوح ناروی ہیں۔ یہ احسن مارہروی ہیں۔ یہ فلاں حکیم صاحب ہیں۔ یہ فلاں نواب صاحب۔ شوکت مرحوم اپنے ممدوح کی نقل نہیں اتارتے تھے۔ خود وہی ہو جاتے تھے اور اس پر طرفہ یہ کہ جس صحبت کا تذکرہ کرتے اس کی فضا اس کا سماں اس کا پورا نقشہ آنکھوں میں گھوم جاتا یوں تھا کہ ان کے دم سے ایک عالم زندہ تھا۔ اب جو وہ رخصت ہوئے تو یاران لاتعداد ان گنت محفلوں کا لطف بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ لیکن یہ تو ان کے گوناگوں کمالات کا بہت چھوٹا سا جزو تھا۔ ان کی ذہین اور پر تموج شخصیت نے جولانی طبع کے لئے جو بھی میدان منتخب کیا اس میں یکساں جوہر دکھلائے۔ نظم، نثر، تمثیل، افسانہ، شخصیت نگاری، نامہ نویسی، ریڈیو، صحافت، بذلہ سنجی، بدیہہ گوئی۔ ان کی طبع زبان اور قلم ہر میدان میں یکساں طراری سے رواں رہتے۔ ان کی ظرافت میں تکلف اور آورد کو دخل نہ تھا۔ بے تکلف اور بے تکان جیسے بولتے ویسے لکھتے۔ نہ گفتار میں ان کی طبع کو غیر حاضر پایا نہ تحریر میں کبھی انہیں قلم پر زور دیتے دیکھا اور اس مشاقی کا راز ریاضت نہ تھی۔ ان کی خداداد ذہانت تھی جو اکتساب کی محتاج نہیں ہوتی۔

شوکت مرحوم اپنی ہمعصر دنیا کے ان محسنوں میں سے تھے جنہیں زندگی کی آسائشوں میں بہت کم حصہ ملا۔ لیکن وہ اپنے سوا سب کے لئے فرحت اور انبساط کے اسباب بہم کرتے رہے۔ اب جو وہ نہیں ہیں تو اپنی محرومی پر رنج ہے کہ ان کی باغ و بہار صحبت اب کبھی حاصل نہ ہو سکے گی اور اس سے زیادہ رنج ان کی محرومی پر ہے جو اس لطف سے کبھی بھی آشنا نہ ہو سکیں گے۔

افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی۔

قومی کلچر کسی شہر، گلی، محلے یا کسی چھوٹے سے طبقے یا گروہ کے پسند یا ناپسند کو نہیں کہتے۔ سارے معاشرے کے اجتماعی ظاہر و باطن کو کہتے ہیں۔

—— فیض

فیض احمد فیض

پاکستان کہاں ہے؟

بیرونی ممالک میں پاکستان کے تہذیبی و ثقافتی تعارف کا مسئلہ

"آپ کہاں سے آئے ہیں"

"پاکستان سے"

"پاکستان! وہ کہاں ہے؟ وہ ہندوستان میں ہے کہ افغانستان میں؟"

"نہیں صاحب، ہندوستان افغانستان میں نہیں ہے، بالکل الگ ملک ہے۔"

"اچھا تو آپ کی آبادی کتنی ہے؟"

"نو کروڑ"

"کیا؟ نو لاکھ یا نو کروڑ"

"نو کروڑ"

"اُفوہ، پھر تو بہت بڑا ملک ہے۔ تعجب ہے ہم اس کے بارے میں کچھ جانتے ہی نہیں۔"

یہ گفتگو کئی بار کی بات ہے اور اس دور افتادہ خطے میں پاکستان کے خدوخال سے ناآشنائی محل تعجب نہیں رہا شاید یہ ہے اس لئے کہ یہاں (افغانستان، مصر، انڈونیشیا، گھانا، وغیرہ وغیرہ کے سفارتی نمائندے یہاں موجود ہیں) لیکن دو چار قریبی ممالک کے علاوہ جہاں بھی جائیے آپ کو اسی قسم کی عدم واقفیت سے سابقہ پڑے گا۔ ہمارا نام تو خیر سب لوگ جانتے ہیں اور بیشتر کو ہمارا محل وقوع بھی معلوم ہے لیکن پاکستان کیا ہے اور کیوں ہے اور ہے تو ایسا کون سا سرخاب کا پر لگا ہے جو کسی اور کے پاس نہیں، یہ معدودے چند صاحب علم یا صاحب غرض افراد کے علاوہ بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ یہ سرخاب کا پر میں طنزاً نہیں کہہ رہا ہوں، مقصد یوں ہے کہ دنیا کے قریب قریب ہر ملک نے کوئی نہ کوئی علامت، کوئی نہ کوئی نشان، کوئی امتیازی طغرا اپنے لئے مخصوص کر رکھا ہے اور اس ملک کا نام اس نشان یا علامت کا تصور اپنے سامنے لاتا ہے۔ اس تصور میں اس ملک کی تاریخ، اس کی تہذیب اور کلچر، اس کی قومی ماہیت، اور مزاج سبھی کچھ شامل ہوتے ہیں۔ چین، جاپان، انڈونیشیا، برما، لنکا، ہندوستان

ایران، عرب، عراق، ترکی، مصر، حبشہ، کینیا، گھانا، کسی چھوٹے بڑے ملک کا نام لیجیے اس نام کے ساتھ کوئی نہ کوئی تصویر ذہن میں ضرور ابھرے گی۔ حروف تہجی، باغات، محلات، مینار، پیگوڈے، سادھو، مجسمے، تصاویر، رقاص، ریت کے ٹیلے، کھجور کے درخت، مور چھل، ہاتھی دانت، تخت جمشید، حافظ و خیام، الف لیلہ، ملکہ سبا، اہرام فراعنہ، ابوالہول، گینڈے، شیر، جھالے، تیر کمان، کچھ ہی سہی، ہر ملک نے اپنے ماضی و حال کے خزانوں میں سے کچھ ایسی علامتیں یا خود منتخب کر رکھی ہیں یا یہ چیزیں پہلے سے معروف تھیں۔ اور اب انہیں ایک نیا قومی رنگ پہنا دیا گیا ہے۔ لیکن ہر کسی کے پاس کوئی نہ کوئی ضرب کا نقش ہے ضرور، اور اس علامت کی تشہیر کے لئے لوگ طرح طرح کے جتن کرتے ہیں۔ بیج، تمغے، پھریرے، اجرتیں، ماڈل، ٹھپے، نیلے، ڈھالے، نیچے اور بانٹے جاتے ہیں۔ بین الاقوامی اجتماعوں اور تبادلۂ وفود میں یہ تحفے تحائف کے کام آتی ہیں۔ یوں سمجھ لیجیے کہ ہر ملک نے اپنا ایک ٹریڈ مارک بنا رکھا ہے جو ہر موقع پر تعارف اور جان پہچان کے کام آتا ہے۔

آپ نے کبھی غور کیا کہ ہمارا یعنی پاکستان کا ٹریڈ مارک کیا ہے؟ اگر نہیں کیا تو اب غور فرما لیجیے ورنہ پردیس میں بار بار، جگہ جگہ آپ کو ایسے ہی سوالات کا سامنا ہوگا جو ابتدا میں لکھ چکا ہوں۔ اور اگر آپ کو ہند و پاکستان کی تاریخ، کانگریس اور مسلم لیگ کی سیاست، ہندو مسلم چپقلش اور مسئلہ کشمیر کی تفصیلات بیان کرنے کی فرصت اور دماغ ہے تو بھی آخر آپ انفرادی سعی و تبلیغ سے کتنے اشخاص کو تشریح پاکستان کر سکیں گے۔ اس سلسلے میں ہمارے سفارت خانوں کے عمال پر دیوان جب اخبار اور مراسلہ نویس حضرات اکثر برستے رہتے ہیں فلاں ملک میں پاکستان کی پبلسٹی نہایت ناقص ہے۔ آخر ہمارے سفارتی نمائندے کس مرض کی دوا ہیں؟ فلاں شہر سے مجھے ایک خط موصول ہوا ہے جس پر پاکستان انڈیا لکھا ہے، ہمارا سفارتی عملہ کیا کر رہا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ شاید ہمارے سفارتی نمائندوں اس بارے میں قطعی بے خطا بھی نہیں لیکن یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ایک حد تک وہ معاذ بھی ہیں ہماری قومی تہذیب، ثقافت یا شخصیت کا تعین ہمارے سفارتی اداروں کا منصب یا ذمہ داری نہیں ہے، یہ ذمہ داری تو گھر والوں کی ہے جس میں حکومت، اہل دانش اور ارباب سیاست سبھی شامل ہیں۔ سفارت خانے تو آپ کے بارے میں وہی کچھ مشتہر کریں گے جو آپ ان تک پہنچائیں گے اور اگر آپ کو خود اپنا ناک نقشہ نہیں معلوم تو بیچارے سفارتی افسر اپنے میزبانوں کے سامنے کس مخلوق کی تصویر پیش کریں۔

تو پھر کیا کرنا چاہیے! شاید آپ فرمائیں کہ ہمارے قومی جھنڈے پر ستارہ و ہلال موجود ہے، یہ اسلامی نشان ہے، ہمارے قومی کردار کی وضاحت کے لئے یہ علامت کافی ہونا چاہیے۔ اگر ستارہ و ہلال صرف پاکستان کا نشانِ امتیاز ہوتا تو شاید اس کی تفسیر و تشریح سے کچھ مشکل حل ہو جاتی، لیکن یہ نشان تو کسی نہ کسی صورت میں قریب قریب ہر اسلامی ملک کے جھنڈوں اور طغروں کا حصہ ہے۔ اور اسے پاکستان کی سرزمین سے مخصوص نہیں کیا جا سکتا۔ پھر تاریخی اعتبار سے اس نشان پر ترکوں کا حق بہرحال ہم پر فائق ہے ہمیں اپنے تعارف کے لئے لامحالہ اپنی تاریخ، تہذیب اور جغرافیہ کے ایسے مظاہر سے رجوع کرنا پڑے گا جو خالص ہمارے اور بلا شبہ پاکستانی ہوں اور ان میں کوئی بھی صنف لے لیجیے۔ تاریخی آثار و مقامات، عوامی فن و ہنر کی اقسام، مناظر فطرت کا جلوس ہمارا دیس تو ہر لحاظ سے بہت حسین اور بہت بھرپور سرزمین ہے۔ تاج محل اور لال قلعہ ادھر رہ گئے تو کیا ہوا اور ہزاروں شے ہیں جنہیں سلیقہ اور بناؤ سنگھار سے ایسا ہی مقبول بنایا جا سکتا ہے لیکن آپ کچھ طے تو کیجیے کہ آپ کو کیا عزیز ہے غیروں سے منوانے کی باری تو بعد میں آئے گی۔

اور پھر کسی ایک چیز پر اکتفا کرنا کیا ضرور ہے۔ موہنجوڈارو سے لے کر مسجد اورنگ زیب، لاہور، مزار اقبال تک کے ڈوبے لے کر کراکس بازار تک زمانوں کے پاکستانی نام گنے جا سکیں گے، سوات کے جوبلی، الورح مزار سے لے کر چٹاگانگ کے قبائلی کھیلوں تک اپنی سرزمین کی تاریخ، فنون اور مناظر سے کوئی ایسی دس بیس حسین چیزیں چن لیجیے جنہیں آپ کسی اجنبی کے سامنے رکھ سکیں اور کہہ سکیں کہ دیکھو یہ ہیں ہم، یہ ہندوستان نہیں ہے اور افغانستان بھی نہیں ہے، یہ تو ایران ہے اور نہ تورانی، نہ عرب ہے نہ عجم یہ سب کچھ جو تم دیکھتے ہو پاکستان ہے۔ یہ دیکھو سوات کا چشمہ ہے،

یہ سندھ کی رلّی ہے، یہ پشاوری حقہ ہے، یہ بہاولپور کی صراحی ہے، یہ سلہٹ کی چٹائی ہے اور یہ کومیلا کی پنکھیا۔ یہ درۂ خیبر ہے، یہ شالامار، یہ شاہ رکن عالم کا مزار ہے، یہ سات گنبدوں والی مسجد ہے، یہ چیل اور دیودار کے پیڑ ہیں، یہ جھالیہ اور بانس کے جھنڈ، یہ سرسوں کے کھیت ہیں، یہ کپاس کی بارش ہے، یہ میگھنا کے کنارے مچھیروں کی کشتیاں ہیں، یہ کبڈی ہو رہی ہے، یہ نیزہ بازی، یہ خٹک ناچ، یہ علم اٹھ رہے ہیں، یہ نماز ہو رہی ہے، یہ دودھ بلویا جا رہا ہے، یہ پٹ سن کی فصل سمیٹی جا رہی ہے، یہ الغوزہ ہے، یہ اکتارہ ہے، یہ مشاعرے کی محفل ہے، یہ چراغوں کا میلہ ہے، یہ عمارتیں، یہ کھنڈر، یہ وادی، یہ صحرا، یہ کھیل تماشے، یہ خشوع و خضوع، یہ نوادر، یہ دستکاریاں، یہ سب چیزیں ہماری ہیں، یہ سب کچھ ہم ہیں اور ہم پاکستان ہیں۔

ہمارے ہاں خیر سے وزارت تعلیم بھی ہے اور وزارت اطلاعات بھی ہے، سیاحت کا محکمہ بھی ہے، چھوٹی صنعتوں کا محکمہ بھی ہے، وزارت خارجہ بھی ہے، پی آئی اے بھی ہے، آرٹ کونسلیں بھی ہیں، ادبی اور فنی ادارے بھی ہیں، اور ممالک غیر میں پاکستان اور اہل پاکستان کی دلکش تشبیہ کی تخلیق ان سب کے فرائض میں شامل ہے اور پھر چند کتابیں اور کتابچے، تصاویر کے سیٹ، نمائشی اسٹال وغیرہ کے لئے کچھ ایسا قارون کا خزانہ بھی درکار نہیں محض شوق، معقول اور ذوق نظر کی بات ہے، یہ اس لئے بتا رہا ہوں کہ اول تو ہم گھر کی مرغی کو دال سے ادھر اہمیت نہیں دیتے اور دوسرے ایک قومی مسئلہ کی حیثیت سے ہم نے اس امر پر کبھی غور نہیں کیا۔ یہ کہنا تو غلط ہے کہ ہمارے سرکاری اور غیر سرکاری اداروں نے ہماری تہذیبی اور قومی رونمائی پر بالکل توجہ نہیں دی، وزارت اطلاعات کی زیر نگرانی بعض تہذیبی موضوعات پر کچھ رسالے چھپ چکے ہیں، محکمہ صنعت نے بھی تھوڑی بہت طبع آزمائی کی ہے، ہمارے تاریخی نوادر کی ایک آدھ نمائش بھی امریکہ اور جاپان کا دورہ کر چکی ہے۔ لندن کے ایک بہت بڑھیا بازار میں پاکستانی مصنوعات کی ایک بہت گھٹیا دکان بھی موجود ہے اور ہماری بیگمات بھی کبھی کبھی ملک کے اندر اور باہر اس سلسلے میں کچھ شوق فرماتی ہیں لیکن ڈیڑھ اینٹ کی اتنی بہت سی مسجدوں کے بعد بھی کسی مکمل عمارت کے بام و در کہیں دکھائی نہیں دیتے۔ ہم نے ان بے ربط، بے سلیقہ اور سطحی کوششوں میں پیسے بھی بہت گنوائے ہیں اور نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات،

بیچ میں ایک مشکل یہ بھی آن پڑی ہے کہ قومی تہذیب، ثقافت، یا کلچر کا نام لیجئے تو ایک طبقہ کا ذہن فوراً ہیرا منڈی، مس فلاں، ستارہ اور زندہ ناچ گانے کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، اور اچھے خاصے معقول اور ثقہ لوگ چلانے لگتے ہیں کہ "کلچر" کے نام پر "ثقافت کی آڑ میں" ان کے دامن عصمت پر دست درازی کا اہتمام کیا جا رہا ہے، اگر کلچر، ثقافت یا تہذیب سے محض وہی شے مراد لی جائے جسے ہمارے ہاں "کلچرل شو" کہتے ہیں تو شاید یہ واویلا ایسا بے جا بھی نہیں لیکن قومی تہذیب یا ثقافت کی یہ تعریف غلط، بلکہ نامعقول تاویل آخر کیوں ضروری ہے۔ مجھ پر تو خیر ذاتی طور سے اس سلسلے میں اتنی سنگ باری ہو چکی ہے کہ شاید میری رائے آپ کی نظر میں زیادہ وقیع نہ ہو لیکن آپ خود سنجیدگی سے غور فرمائیے کہ اوپر اتنی بہت سی چیزیں جو میں نے گنوائی ہیں کیا سب کی سب فاطر زہد اور دشمن تقویٰ ہیں، مثلاً آپ نے کبھی یہ سوچا ہے کہ ہر وہ نغمہ جس پر آپ اتنا قصد رنتا ہے محض لچر فلمی گانوں اور گھٹیا مغربی موسیقی سے عبارت نہیں، اس میں ہیر بھی ہے، ستارہ، ماہیا، ٹپہ، بھٹیالی، قوالی حتیٰ کہ حمد و نعت اور قومی ترانہ بھی شامل ہے، کیا آپ کی رائے میں یہ سب کچھ فحش ہے؛ لیکن اس پر بھی جھگڑے کی ضرورت نہیں، اگر آپ لحن و سماع کو کسی طرح برداشت کرنے پر تیار نہیں اور ان کی ہر ایک حکومت کو مردود اور غیر مشروع جانتے ہیں تو نقاشی، خطاطی، دستکاری، تعمیرات، ادب، کھیل، بہروپ، دشت و مرغزار اپنی زندگی کے کسی تہذیبی مشغلے سے کچھ ہی پسند فرما لیجئے جسے باہر کی دنیا آپ سے مخصوص اور مختص کر سکے۔

بات تو قومی ٹریڈمارک سے ابھارا ہوئی تھی لیکن اس بنیادی مسئلے سے متعلق بہت سی فروعی الجھنیں اور بھی ہیں مثلاً پردیس میں قومی اور مذہبی تہوار منانے کا سوال ہے۔ انگلستان کے لوگ کرسمس، نیا سال، ایسٹر، گائی فاکس ڈے وغیرہ کا ہفتوں پہلے سے اہتمام کرتے ہیں اور قومی برادریوں نے بھی اپنی مخصوص تقریبات کے لئے رسوم و مناسک طے کر رکھی ہیں۔ ہمارے ہندوستانی بھائی بھی ہولی، دیوالی، بسنت اور دسہرا پر کچھ

پاکستان کہاں ہے

ہنگامہ کر لیتے ہیں لیکن ہمارا کوئی تہوار آجائے تو بیشتر انہیں جھانکنے کے سوا کسی کو کچھ نہیں سوجھتا۔ یہاں لندن میں عید آئی اور گزر گئی، یوم پاکستان آیا گیا اور کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔ یوم پاکستان پر ہمارے ہائی کمیشن میں چائے اور مٹھائی ضرور تقسیم ہوئی اور سچ یہ ہے کہ ... لیکن ــــ Lowndes Square لاؤنڈز اسکوائر میں برتنوں کی کھنک کے علاوہ اس ساری سرزمین میں جہاں تقریباً ... ہیں کوئی حرف و صدا اپنے کانوں تک نہیں پہنچی صرف لیڈز (Leeds) یونیورسٹی کے کچھ مستعد طلبا نے جشن پاکستان کا اہتمام کیا ہو تو ... پاکستانی ... رہا میں سمجھتا ہوں کہ اگر گھر کے اندر ہمارے بہت سے رسمی میلے ٹھیلے جو بھی گئے ہیں تو کوئی ایسی بات نہیں لیکن گھر سے باہر ایسی تقریبات پر کچھ ... کی کامیاب صورت متعین ہو سکے تو یار و اغیار دونوں کے لئے مفید ہوگا۔

یہ تصویر کا ایک پہلو ہے اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر خدانخواستہ ناک کٹوانے کا کوئی عنوان ہاتھ آجائے تو کیا مجال جو ابنائے وطن کبھی چوک جائیں۔ سب سے پہلے اور سب سے زیادہ رسوائی تو برس دو برس پہلے چیچک کے قصے میں ہوئی۔ اگرچہ اسے ہوا دینے میں زیادہ ہاتھ تو یہاں کے ایک مفسد اور متعصب طبقہ کا تھا لیکن اس میں کچھ نہ کچھ دخل ہمارے ہاں کے ڈاکٹروں اور مسافر برداروں کا بھی ضرور ہے یا تو کچھ ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ پانچ دس روپے کے عوض ٹیکہ کا جعلی سرٹیفیکیٹ اکثر مل جایا کرتا تھا خیر یہ بات تو اب پرانی ہو چکی لیکن حال ہی میں حبیب بینک اور اس کے ملازمین کا جھگڑا ہے۔ لندن کے بیشتر اخبارات میں سرخیاں لگیں، تصویریں چھپیں، صدر پاکستان کو خطوط گئے۔ برطانوی پارلیمنٹ تک سوال گیا اور پھر کہیں جا کے معاملہ رفع دفع ہوا اور یہ ساری جنگ ہنسنے کی چالیس پچاس پونڈ کی خاطر۔ خود ہر کون سا کون نہیں تھا مجھے نہیں معلوم، لیکن اتنا ضرور سمجھ میں آتا ہے کہ اتنی چھوٹی سی رقم کے لئے اتنے بڑے ادارے کو اتنا فضیحتا کروانے کی ضرورت نہ تھی۔ یہ قصہ نپٹا تو ہمارے ہائی کمیشن کے مشیر تعلیم اور پاکستانی طلبا کی فیڈریشن میں تو تو میں میں شروع ہوئی اس تکرار کا سر پیر بھی کچھ ہمارے پلے نہیں پڑا۔ سنی سنائی یہ ہے کہ ہائی کمیشن والے معترض تھے کہ فیڈریشن کا آئین بدلا جائے تاکہ لندن سے باہر رہنے والے طلبا کو زیادہ نمائندگی مل سکے۔ فیڈریشن والے کہتے تھے کہ ہم آئین بدلنے کو تیار ہیں لیکن آپ ہمارے معاملات میں دخل دینے والے کون۔ اس طرح ایک طرف فیڈریشن کے دفتر پر تالے پڑ گئے اور دوسری طرف اشتہار بازی اور بیان بازی کے دروازے کھل گئے۔ سنا ہے اب یہ معاملہ بھی سلجھ گیا ہے۔

لیک بعد از خرابیِ بسیار

انگریزی میں کہاوت ہے کہ بیکار دماغ شیطان کی کارگاہ بن جاتا ہے اور ہمارے ہاں کہتے ہیں کہ ... تو بہت لڑیں۔ چنانچہ اپنی برادری میں اس قسم کے جھگڑوں جھمیلوں کی بنیادی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ ان کی تفریح و تسکین کے لئے انبساط اور افتخار کے اسباب کوئی فراہم نہیں کرتا تو سب کہتے ہیں کہ آؤ بھئی لڑیں۔ اور جیسے کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں ان اسباب کی فراہمی کے ذمہ دار سفارتی افسر نہیں قومی اور وطنی ادارے ہیں۔ اگر آپ اس فرض کو اہمیت نہیں دیتے تو پھر یہ گلہ نہ ہونا چاہئے کہ

ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ
ایک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے

ادب کوئی بے جان کل نہیں ہے جس کے عمل پر ہمیں اختیار نہ ہو۔ انسان کے ہاتھ میں اس کی حیثیت چکنی مٹی سے زیادہ نہیں اور اس کے لئے مختلف سانچے انتخاب کرنا انسان ہی کا کام ہے

— فیض

فیض احمد فیض

داغستان میں چند روز

بچپن کا کیا مذکور ہے اب بھی بے خیالی میں کوہ قاف کا نام لیجئے تو مشکل سے باور آتا ہے کہ ایسا کوئی علاقہ واقعی کہیں موجود ہے جہاں جن پریاں نہیں ہم جیسے انسان بستے ہیں اب بھی گمان ہوتا ہے کہ یہ کوئی جغرافیائی خطہ نہیں محض خواب و خیال کی سرزمین ہے جو سنی ضرور ہے دیکھی کہیں نہیں۔ میں نے ایسے ہی کچھ نام اور بھی سنے ہیں۔ دور دراز اور پر اسرار، انہیں میں داغستان کا شمار بھی ہے اور کیوں نہ ہوں آخر یہ کوہِ قاف ہی کا ایک گوشہ تو ہے اگرچہ اس کے تصور میں جن و پری کا دخل کم ہے اور سرفروش تیغ زنوں، برق رفتار توسنوں اور نڈر طالع آزماؤں کا زیادہ۔ چنانچہ مجھے داغستان کی انجمن مصنفین کی طرف سے ایک تقریب میں شرکت کی دعوت آئی تو ہوسِ سیر و تماشا کی کمی کے باوجود زحمتِ سفر باندھنے میں یک گونہ مسرت محسوس ہوئی۔

ہمارا چھوٹا سا ڈکوٹا قسم کا جہاز داغستان کے صدر مقام مہاچ قلعہ کے کچے ہوائی میدان میں اترا، مہمان ہوائی جہاز سے نکلے، داغستان کے ملک الشعراء رسول حمزہ (مقامی تلفظ میں غمزہ) پذیرائی کو آگے بڑھے، گلے ملے اور میزبانوں سے ہمارا تعارف کروایا۔

"یہ جمہوریۂ داغستان کی صدر ہیں، بیگم عبدالبصیر" ہلکے تنسواری رنگ کے کوٹ اور اسکرٹ میں ملبوس ایک خاتون آگے بڑھیں بظاہر تیس پینتیس کا سن ہوگا، کھلتا ہوا رنگ، باریک نقش، سیاہ بالوں میں ہلکی سی سرخی کی جھلک سنہری فریم کا چشمہ لگائے، بیگم بصیر کا لباس ذرا مختلف ہوتا تو ان پر اپنے ہاں لاہور یا کراچی کی کوئی پروفیسر یا ڈاکٹر ہونے کا گمان ہو سکتا تھا۔ داغستان کی محفلوں میں ان کی شخصیت ہمیشہ الگ تھلگ دکھائی دیتی رہی، یہاں کے لوگ بہت کھاتے ہیں، بہت پیتے ہیں، بہت بولتے ہیں، بہت ہنگامہ کرتے ہیں لیکن بیگم عبدالبصیر ہمیشہ متین، کم گو اور کم آمیز، بہت ہوا تو ایک ہلکی سی مسکراہٹ لبوں پر کھیل گئی اور بس۔

ان کے بعد اور لوگوں سے تعارف ہوا۔ عبدالرحمان دانیال، عبداللہ خان، حبیب اللہ، محمد یعقوب، عبدالوہاب سب نام مجھے یاد نہیں، یہ سیاسی قائد ہیں، یہ یونیورسٹی کے صدر، یہ "پلاننگ" تنظیم کے سربراہ وغیرہ وغیرہ اور پھر ہم ایک پتلی سی سڑک پر شہر کی جانب روانہ ہوئے، سڑک کی حالت کچھ بہت اچھی نہ تھی۔ کئی بار ڈرائیور کو جھٹکے سے گاڑی ادھر ادھر موڑنا پڑی، "بھئی، موٹر کے جھنگڑ ناچ کو معاف کر دینا" رسول حمزہ نے ہنستے ہوئے کہا "بات یوں ہے کہ اس سڑک پر اکثر سمندر کا پانی

آجاتا ہے اور گڑھے پڑ جاتے ہیں۔" ہم سے ذرا دور کیسپین سمندر کا پانی جھیل کی طرح ساکن تھا، مہاچ قلعہ کے گردا گرد پہاڑیوں پر شام کی نیلاہٹ چھا چکی تھی، دائیں جانب بہت دور ایک چوٹی کے کنارے کاسنی بادلوں میں گھرا ہوا قرمزی سورج دھیرے دھیرے ڈوب رہا تھا، کسی نے منظر کی تعریف کی تو رسول حمزہ کہنے لگے "اس منظر پہ مت جاؤ دوستو! یہ اصل داغستان نہیں ہے، اصل داغستان تو ان پہاڑیوں سے اُدھر ہے جہاں میرا گاؤں ہے اور میرے عزیزوں کے گاؤں ہیں، تمہیں دکھائیں گے"

رسول حمزہ داغستان کی سب سے بڑی مقامی بولی 'آوار' میں شعر کہتے ہیں، داغستان کی آبادی صرف دس لاکھ سے ذرا اوپر ہے لیکن یہاں سب ملا کر کوئی چھتیس چھوٹی بڑی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان میں سے آٹھ بڑی اور بنیادی زبانیں ہیں، آوار، لزگی، درگو، آذربائیجانی، کومیک وغیرہ اور باقی ان کی مختلف مقامی صورتیں۔ ان زبانوں کا شجرۂ نسب چار بڑے خانوادوں قفقازی تاتاری، ترکی اور فارسی سے ملتا ہے اور ان کی اصوات اور مخرجات عربی سے مشابہ ہیں، کئی صدیوں سے ماضی قریب تک یہاں کی درسی زبان عربی تھی۔ اور مقامی زبانوں میں لکھنے پڑھنے کی کوئی سہولت میسر نہ تھی، غالباً اسی وجہ سے ان میں سے کوئی بھی ترقی کر کے دوسری بولیوں پر غلبہ نہ پا سکی، یہاں لطیفہ مشہور ہے کہ جب قسامِ ازل کے حضور مختلف قوموں میں مختلف زبانیں بٹنے لگیں تو عربوں کو عربی ملی، عجمیوں کو فارسی، چینیوں کو چینی لیکن قوموں کی گنتی ختم ہو گئی اور زبانیں بہت سی بچ رہیں۔ چنانچہ حکم ہوا کہ ان سب کو ایک طرف پھنکوا دو اور یہ سب داغستان میں آ گریں۔

تاریخی اعتبار سے چوتھی صدی عیسوی سے انیسویں صدی تک داغستان کی سرزمین پر ہر جانب سے یلغار ہوتی رہی، ہن، ہرمنی، آذربائیجانی، ایرانی، گرجستانی، عرب، تاتار، منغول، ترک، روسی، یوکرانی، یہودی، کوئی فاتح بن کر آیا، کوئی پناہ گیر ہو کر۔ اس کے پہاڑوں اور وادیوں میں ان گنت لڑائیاں لڑی گئیں جن میں ہن اور ایرانی، عرب اور تتار، روسی اور ترک صدیوں نبرد آزمائی کرتے رہے، چوتھی اور پانچویں صدی عیسوی کے اوائل میں داغستان اور شمالی آذربائیجان کی مشترکہ سلطنت سارے قفقاز کی تجارتی منڈی تھی۔ اور ایشیا اور جنوب مشرقی یورپ کی تجارتی شاہراہوں کا بہت اہم مرکز، پانچویں صدی میں اس سلطنت کا شمالی علاقہ ایرانیوں نے فتح کر لیا اور داغستان کے سب سے مشہور اور قدیم شہر دربند کی بنا ڈالی لیکن ایرانی اس پورے علاقے کو مطیع فرمان نہ بنا سکے اور ساسانیوں کے زوال کے بعد یہاں کے قبائل پھر خود مختار ہو گئے۔

تاریخ کے اگلے دور میں کوئی تین سو برس تک یہاں عربوں کی حکومت رہی جس کے نقوش اہل داغستان کے مذہب اسلام، ان کے لب و لہجے، اور ان کے آداب و اخلاق سے اب تک عیاں ہیں خلافت عباسیہ کا چراغ گل ہوا تو یہ بساط بھی الٹ گئی اور چودھویں صدی میں امیر تیمور نے داغستان پر لشکر کشی کی جو یہاں کے گوہ دومن کا سب سے خونچکاں باب ہے، کہتے ہیں کہ تیمور نے یہیں بریدہ سروں کے مینار بنائے تھے اور سر بریدہ لاشوں کے انبار لگائے تھے، داغستان کے بہت سے پرانے عوامی گیت، جنگ نامے اور قومی سرفروشوں کے قصے کہانیاں اسی دور سے متعلق ہیں۔

سولہویں صدی میں روسیوں نے قفقاز کی طرف پیش قدمی شروع کی اور اس صدی کے وسط میں قازان اور استراخان پر قبضہ کر کے دولت تاتار کی کمر توڑ دی، لیکن اس سرزمین پہ روسیوں کے قدم جمنے نہ پائے تھے کہ ایشیائے کوچک کی ترک فوجوں کا ہلالی پرچم مشرق و مغرب میں دندناتا ہوا بڑھا اور ۱۵۷۸ء عیسوی میں ترک جرنیل نے گرجستان اور آذربائیجان کو زیر کر کے داغستان میں قدم رکھا، داغستان کے قبائلی سردار دو ٹولیوں میں بٹ گئے، کچھ ترکوں کے مطیع ہو گئے۔ کچھ

روس کے چلن رہے، برسوں جدال و قتال کا بازار گرم رہا آخر ۱۷۲۲ء میں امیر امام قلی خان نے دار الحکومت دربند کی چابیاں زارِ روس پیٹر اعظم کے حوالے کر دیں لیکن ترکوں اور روسیوں کے معرکے ختم نہ ہوئے تھے کہ ایران میں نادر شاہ نے بھاری فوجی جمعیت منظم کی اور شمال و جنوب میں ہلہ بول دیا اور داغستان کا بیشتر علاقہ فتح کر لیا، اگلی نصف صدی میں یہ چھوٹا سا ملک تین بڑی قوتوں یعنی روس، ترکی اور ایران میں بار بار تکہ بوٹی ہوتا رہا، انیسویں صدی کے اوائل میں بارہ سال مسلسل خونریزی کے بعد معاہدۂ گلستان کی رو سے داغستان، گرجستان اور شمالی آذربائیجان مستقل طور سے زارِ روس کی قلمرو میں آ گئے اگرچہ ان علاقوں میں داخلی خود مختاری کی کوئی نہ کوئی صورت جب سے اب تک قائم ہے۔

داغستان کی آبادی دس لاکھ باسٹھ ہزار اور رقبہ تقریباً اکتیس ہزار مربع میل ہے، شمالی مشرقی قفقاز میں اس کی سرحد ایک جانب گرجستان اور دوسری سمت آذربائیجان سے متصل ہے قدرت نے اس خطے کے کوہ و دمن بحر و بر حتیٰ کہ اس کے دشت و صحرا میں بھی اپنے خزائن دونوں ہاتھوں سے لٹائے ہیں، پہاڑوں میں کرومیٹ، لوہے، گندھک اور جپسم کے ذخیرے ہیں میدانوں میں تیل کے فوارے پھوٹتے ہیں، زیر زمین قدرتی گیس پیچ و تاب کھاتی ہے، یہاں کی زمین سونا اگلتی ہے، چاول، گندم، مکئی پھل، ترکاری ہر نوع کی فصل کی کاشت ہوتی ہے۔ یہاں گرم پانی کے صحت بخش چشمے ہیں، اخروٹ، سفیدے اور شاہ بلوط کے بن، خوبانی، سیب، شہتوت اور انگور کے باغات، زرگری، ظروف سازی، قالین بافی اور شیشہ گری کی قدیم دستکاریاں ہیں اور فولاد، مشینی آلات اور کیمیاوی مفردات و مرکبات کے جدید کارخانے، انقلاب روس سے پہلے ان میں سے بہت سے خزائن سربمہر رکھے تھے لیکن اب جمہوریۂ داغستان کا شمار سوویٹ روس کے اہم صنعتی علاقوں میں ہوتا ہے۔

رسول حمزہ کا ذکر شروع کیا تھا اور بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ رسول حمزہ کو حال ہی میں ادبی خدمات کے صلے میں لینن انعام عطا ہوا ہے۔ سوویٹ روس میں رسول حمزہ کے علاوہ یہ اعزاز صرف چار اشخاص کو حاصل ہے جن میں دو ادیب ہیں ایک عمارت گر اور ایک مجسمہ ساز، ہم لوگ اسی تقریب پر داغستان آئے ہیں۔ رسول حمزہ کی عمر صرف بیالیس برس ہے لیکن سر کے بال مجھ سے زیادہ سفید ہیں، فربہ کشیدہ قامت، بہت چھوٹی آنکھیں، بہت لمبی ناک سرخ و سفید رنگ سخت باتونی، بہت ہنسوڑ، زبان ہر وقت قینچی کی طرح چلتی ہے، بات بات پر قہقہہ لگاتے ہیں، پہلے سے معلوم نہ ہو تو ہرگز اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ انتہائی غیر سنجیدہ مزاج شخص، انتہائی سنجیدہ شاعر بھی ہو سکتا ہے اور یہ سن کر تو مجھے بھی تعجب ہوا کہ یہ حضرت داغستان کے ملک الشعرا ہی نہیں سوویٹ یونین کے نائب صدر بھی ہیں۔

مہاچ قلعہ میں ہماری آمد کے اگلے دن جمہوریۂ داغستان کے ایوانِ حکومت میں ایک بہت بڑا جلسہ منعقد ہوا جس میں رسول حمزہ کو لینن انعام کا طلائی تمغہ پیش کیا گیا۔ عبدالرحمان دانیال نے صدارت کی، لینن پرائز کمیٹی کی طرف سے اس کو تھیٹر کے ڈائرکٹر زوڈنیکی صاحب نے رسول حمزہ کو سند اور تمغہ دیا۔ روسی، آذربائیجانی، گرجستانی، ترکمانی اور کرغیز ادیبوں کے علاوہ ایک طالب علم ایک سپاہی، ایک کسان خاتون اور ایک مزدور نمائندے نے تقریریں کیں اور اپنی اپنی تنظیم کی طرف سے رسول کو تحفے پیش کئے، سپاہی نے ایک منقش پیش قبض کسان خاتون نے چاندی کی درانتی اور مزدوروں کے نمائندے نے ایک چوبی مجسمہ، ہال کی بالکنی پر داغستانی سازندوں کا ایک طائفہ بیٹھا تھا جو مختلف وقفوں کے بعد شادیانے بجاتے رہے سب کچھ ہو چکا تو دو چار بغلی کمروں میں مہمانوں کی شربت پانی سے تواضع کی گئی اس کے بعد ہال میں شعر و موسیقی کی محفل منعقد ہوئی

رسول کی نظمیں اور گیت گائے اور سنائے گئے اور ان کے مطابق مرتب کئے ہوئے عوامی رقص اور ساز پیش کئے گئے۔ یہاں سے فراغت ہوئی تو ہم لوگ اپنے ڈاک بنگلہ نما مہمان خانے میں تھوڑی دیر دم لے کر مہاچ قلعہ سے ذرا فاصلہ پر بالائے کوہ ایک وسیع اور پرفضا باغ میں پہنچے۔ جہاں سرسبز قطعے پر دعوت کا اہتمام تھا۔ یہاں پھر تقریریں ہوئیں جام صحت تجویز ہوئے۔ امن کے نام پر، ادب اور شعر کے نام پر، روسی، ازبکستانی، داغستانی، ترکمانی اور پاکستانی عوام اور ادیبوں کے نام پر۔ آخر میں بیگم حمزہ نے کہا "میں سب ماؤں کا جام صحت تجویز کرتی ہوں، وہ مائیں جو شاعروں، فنکاروں، بہادروں اور شہیدوں کو جنم دیتی ہیں وہ مائیں جن کی پیشانیاں اپنے کامران بیٹوں کے کارناموں کی خوشی سے روشن ہیں، اور جن کے کلیجے اپنے شہید بیٹوں کے دکھ میں داغ داغ ہیں۔"

مہاچ قلعہ جمہوریہ داغستان کا صدر مقام اور اس خطے کا علمی، تہذیبی اور صنعتی مرکز ہے۔ یہاں کارخانے ہیں، سرکاری دفاتر ہیں، یونیورسٹی ہے، سائنس اکاڈمی ہے، تاریخ، انسانیت اور آثار قدیمہ کے تحقیقی مراکز ہیں، لیکن ان سب کے باوجود اس نئے نویلے شہر میں داغستان کا صحیح قومی رنگ بہت نمایاں نہیں ہے۔ سوویٹ روس کے ان نئے شہروں اور نوآبادیوں کو دیکھ کر اپنے یہاں کے نئے علاقوں کے نوآباد شہر یاد آتے ہیں۔ لائل پور، سرگودھا، منٹگمری وغیرہ جو سب ایک دوسرے کی نقل معلوم ہوتے ہیں۔ سیدھی متوازن سڑکیں برابر فاصلوں پر چوک، ایک وضع کے مکانات، وسطی جلسہ گاہ اور میدان اور کسی مناسب سا ہیرو یا یادگار۔ البتہ کیسپین سمندر اور تین طرف پہاڑیوں کے سبب سے مہاچ قلعہ کا منظر نسبتاً زیادہ پرفضا ہے۔ رسول حمزہ کہتے تھے کہ یہ اصل داغستان نہیں ہے، دیکھنا چاہو تو ان پہاڑیوں سے ادھر چلو جہاں میرا گاؤں ہے اور اگلے دن ہم ان کا گاؤں دیکھنے پہنچے۔

دو ٹولیوں میں بٹ کر ہم کوئی بیس نفر لوگ دو چھوٹے چھوٹے مٹیالے رنگ کے فوجی طیاروں میں سوار ہوئے جنہیں جہاز نہیں کھٹولے کہنا چاہئے۔ ذرا سے وقفے کے بعد کیسپین سمندر اور مہاچ قلعہ کا میدان پہاڑ اوجھل ہو گئے۔ یہ اصل داغستان ہے، سبز اور گلابی کوہستانوں کا لامتناہی سلسلہ، کوئی چٹیل، کوئی شاداب، یہاں ہیبت ناک گھاٹیاں ہیں اور سبز ترو تازہ وادیاں، پرانے حصاروں کے کھنڈر ہیں اور نئی سرکاری عمارتوں کی سرخ چھتیں، بار بار گمان ہوتا ہے کہ اگلے وقتوں میں جن لوگوں نے ان چٹانوں کا سینہ شگاف کر کے یہاں بستیاں بسائیں، باغ لگائے اور فصل اگائی۔ ان میں سے ہر کوئی لامحالہ فرہاد کا ہمسر رہا ہوگا۔ کوئی گھنٹے بھر کی پرواز کے بعد ہم کوہ ایک مختصر سے مرغزار میں اترے۔ جو اس علاقے کے صدر مقام خنزہ کا ہوائی میدان ہے اور جہاں سے روزانہ یہی دو کھٹولے مہاچ قلعہ کو پرواز کرتے ہیں۔ اس میدان میں رسول حمزہ اور اس کے مہمانوں کی پذیرائی کے لئے بچوں، بوڑھوں، عورتوں، مردوں کا جم غفیر جمع تھا۔ سب سے پہلے علاقے کے سب سے معتبر اور سب سے عمر رسیدہ بوڑھے جن میں سے کسی کی عمر ایک صدی سے کم نہ ہوگی اپنے علاقے کے نامور فرزند کو خوش آمدید کہنے بڑھے، مجھے یہ دیکھ کر اکثر مسرت بھی ہوئی اور کچھ اچنبھا بھی ہوا۔ کہ اشتراکی روس کے ہر علاقے میں بالعموم اور مسلم علاقوں میں بالخصوص "بزرگی بسال" کے ادب و تعظیم کی مشرقی روایت اب تک قائم ہے۔ مغربی ممالک میں تو اس روایت کا نام و نشان بھی باقی نہیں جہاں بڑھاپا انتہائی غیر فیشن ایبل چیز سمجھی جاتی ہے اور سب بوڑھے سینگ کٹا کر بچھڑوں میں شامل ہونے کے لئے پریشان رہتے ہیں، رنج اس بات کا ہے کہ اس مغربی تہذیب کے انتہائی خود پرستانہ اور خود غرضانہ

سماجی نظریات سے ہمارے خالص مشرقی معاشرے بھی متاثر ہو رہے ہیں ممکن ہے یہ تاسف محض اس وجہ سے ہو کہ مجھ جیسے بڈھوں کو زندگی کی خزاں میں وہ مراعات نہ مل سکیں گی جو ہماری زندگی کی بہار میں ہمارے بزرگوں کو حاصل تھیں، تو خیر پہلے ان بڈھے بوڑھوں نے رسول حمزہ کا منہ سرخ ہوا، رسول حمزہ پر یلغار کر دی جس کی لپیٹ میں ہم لوگ بھی آگئے، بچوں کی رنگین ٹوپیاں عورتوں کی سیاہ یا پھولدار شالیں اور ذرباف مردوں کی بڑے بڑے گھیر گھار کی گول سیاہ یا بھوری ٹوپیاں آپس میں گڈمڈ ہو گئیں چند بالکل نئے فیشن کے بانکوں کو چھوڑ کر یہاں قریب قریب سبھی مرد ان کا منصب اور مقام کچھ ہی نہ کیوں ہو ایک ہی سا لباس پہنتے ہیں، یعنی گھٹنوں تک لمبے بوٹ، سیہ یا نیلی برجس نما پتلون، بند گلے کا کوٹ یا چرمی صدری اور بہت بڑی گول اونی ٹوپی، عورتیں عام طور سے ٹخنوں تک لمبا کشمیری پھرن نما، ڈھیلا ڈھالا کرتا، پاؤں میں سیہ جوتے اور سر پر شال یا گوشیہ رومال سن رسیدہ عورتوں کا لبادہ اور اوڑھنی عام طور سے سیہ رنگ کی ہوتی ہے، نوجوان عورتوں کا لباس رنگین اور پھولدار سب کے چہرے کھلے رہتے ہیں اور سر ڈھکا رہتا ہے، برہنہ سر پھرنا مردوں اور عورتوں دونوں میں معیوب سمجھا جاتا ہے اگرچہ داغستانی گھروں میں زنانہ اور مردانہ کی تقسیم نہیں لیکن عام طور سے عورتیں مردوں کی محفل میں بہت کم شرکت کرتی ہیں بلکہ مرد مہمان گھر میں ہوں تو کھانے کی میز پر بھی ان کے ساتھ نہیں بیٹھتیں البتہ یہ ضرور ہے کہ یہاں کے قومی اور ریاستی اداروں میں بہت سے اعلیٰ عہدے خواتین کو حاصل ہیں (رسول حمزہ کے گاؤں کی سربراہ بھی ایک خاتون ہیں)، چنانچہ قومی، رفاہی اور پبلک سرگرمیوں میں عورتوں مردوں میں تقدیم و تاخیر کا قصہ نہیں ہے ـ

تھوڑی دیر افراتفری کے بعد استقبالیہ مجمع پھر سے صف بستہ ہوا، سب معززین وسط میں یکجا ہوئے اور رسمی تقاریر شروع ہوئیں، علاقے کے پارٹی لیڈر نے تقریر کی۔ رسول کے گاؤں کی نمبردار خاتون نے تقریر کی، گاؤں کی ایک کمسن طالبہ اور ایک سن رسیدہ کسان نے تقریر کی، مہمانوں کی طرف سے ممتاز روسی شاعر تووردوسکی نے تقریر کی اور پھر موٹروں اور جیپوں کا جلوس رسول حمزہ کے گھر کی جانب روانہ ہوا، داغستان کے کوہستانی دیہات کی وضع قطع کچھ کچھ ہمارے ہاں ہزارہ ضلع کے بعض دیہات سے ملتی جلتی ہے، پتھر اور لکڑی کے یک منزلہ مکان، بل کھاتی ہوئی سنگلاخ گلیاں، بیچوں بیچ پتلی سی شفاف آبجو اور گھروں سے ملے ہوئے مختصر خوبانی، سیب اور شفتالو کے باغات، ہر گھر کی صورت ایک بند قلعے کی سی ہے چاروں طرف بلند سنگین دیوار جس میں نہ روزن، نہ دریچہ، صرف ایک صدر دروازہ جسے صدر کے بجائے عقبی دروازہ کہنا چاہیئے۔ اس لئے کہ یہ عام طور سے صدر گلی یا بازار کے بجائے مکان کے پہلو یا عقب میں کھلتا ہے مکان میں داخل ہوجیئے تو پہلے ڈیوڑھی اس کے آگے صحن یا باغ اور پھر یک رویہ رہائشی کمرے رسول کے گھر کے بالمقابل ان کے والد حمزہ سادا کی شبیہ اور یادگار نصب ہے، دروازے کی چوبی محراب پر بہت خوبصورت عربی حروف میں بیت حمزہ سادا، اور نجار کا نام کندہ ہے۔ ہم پہنچے تو صدر دروازے میں سیاہ پوش بڑی بوڑھیاں پھول لئے کھڑی تھیں، انہوں نے خالص عربی لہجے میں اہلاً و سہلاً کہا، ہم سب سے مصافحہ کیا اور اپنی زبان میں دعا دی، بر سبیل تذکرہ یہاں کے لوگ مصافحہ کرنے میں اہل مغرب کی طرح محض انگلیوں سے انگلیاں نہیں چھولتے قریب قریب پہلوانوں کی طرح پنجہ کشی کرتے ہیں اور دست و بازو کی خیریت مطلوب ہو تو اس بارے میں ذرا چوکنا رہنا چاہیئے، ہم ڈیوڑھی اور صحن سے گزر کر ایک کافی کشادہ دالان میں داخل ہوئے موٹے موٹے غیر تراشیدہ شہتیروں اور سرکیوں کی چھت فرش پر چٹائیاں اور نمدے، دیوار سے لگے ہوئے چوبی بنچ اور ان کے آگے آگے لمبی لمبی میزیں، میں نے کسی سے کہا کہ اگر یہاں یہ بنچ اور

میز کرسی نہ ہوں تو بالکل ہمارے ہاں کے کسی دیہاتی دالان کا نقشہ ہے۔ اس پر ان صاحب نے زور سے قہقہہ لگایا "یہ تو مہمان خانہ ہے یہاں ورنہ اپنے گھروں میں ہم میز کرسی پر کہاں بیٹھتے ہیں، فرش ہی پر بیٹھ کر گزر ہوتی ہے۔"

اتنے میں کھانا چنا جانے لگا، ابلے ہوئے گوشت کے بڑے قتلے، پنیر، بیسن کا حلوا، دہی، گھی اور پنیر کے پراٹھے، اچار، پیاز، پودینے کی چٹنی اور بہت سی کچی سبزیاں، یہاں کا کھانا بہت سادہ اور غیر مرصع ہے لیکن صحت بخش اور لذیذ کھانے کے ساتھ پھر سے تقریروں اور جام صحت کا سلسلہ شروع ہوا۔ رسول حمزہ کے لئے میزبانوں کے لئے مہمانوں کے لئے مہمانوں میں بدیسی صرف میں تھا، باقی سب لوگ مختلف سوویٹ جمہوریتوں کے معروف ادیب تھے جنہیں بیشتر لوگ پہلے سے جانتے تھے، چنانچہ جب پاکستان کا نام آیا تو مجمع میں سنسنی سی دوڑ گئی، بہت تالیاں پیٹیں، بہت ہنگامہ ہوا، صرف نعرۂ تکبیر کی کسر باقی رہ گئی، میرے ساتھ ایک گرجستانی شاعر بیٹھے تھے انہوں نے داغستان اور پاکستان قافیہ ٹھہرا کے ایک فی البدیہہ قطعہ بھی کہہ ڈالا، دو ڈھائی گھنٹے لوگ کھا پی کر سیر ہو چکے تو ایک کونے سے مقامی طبقیا (رضاکار فوج) کے سردار مقصود حمزہ نے بلند آواز میں کہا "صاحبو ناشتے پر کب تک بیٹھے رہو گے۔ دوپہر کے کھانے کا وقت ہو چلا، اب میرے ہاں چل کر کھانا تناول فرمائیے۔"

"لاحول ولا قوۃ" میں نے اپنے ہمسائے سے کہا "تو گویا یہ صرف ناشتہ تھا" "بھئی تو ابھی آپ نے کھایا ہی کیا ہے؟"

وہ صاحب بولے "اب ہم مقصود صاحب کے ہاں پہنچے، ان کا گھر کچھ نسبتاً زیادہ مکلف تھا کھانا بھی، اب کے کھانے میں داغستان کی مخصوص غذا کے علاوہ گرجستانی اور روسی ماکولات بھی شامل تھیں، مزید تقریریں اور جام صحت ہم لوگوں نے جوں توں کچھ حلق سے اتارا لیکن اطمینان کا سانس لینے سے پیشتر پھر کہیں سے آواز آئی "دوستو! اس چار دیواری میں کب تک بند بیٹھے رہو گے ذرا دیکھو تو باہر دھوپ کتنی حسین ہے، سرکو دیہہ سبزہ زار پہ چل کر بیٹھو جہاں ہر طرف پھول کھلے ہیں، معطر ہوائیں چل رہی ہیں جہاں وہ شفاف دریا بہہ رہا ہے جسمیں دخترخان نہایا کرتی تھی کھانے پینے کا باقی پروگرام وہاں ہو گا۔"

اب ہم نے جس جگہ پر ڈیرے ڈالے اگر دخترخان نے واقعی نہانے کے لئے یہ مقام منتخب کیا تھا تو اس کے ذوق کی داد دینا چاہئیے، یہ جگہ نیلے پیلے خودرو پھولوں سے اٹا ہوا وسیع لہریا سبزہ زار ہے، شمال اور جنوب میں سر بفلک پہاڑ کھڑے ہیں۔ مشرق میں جدھر سے ہم آئے ہیں سادا، خنزہ اور دوسری آبادیاں ہیں اور مغرب میں نصف دائرے کی صورت کئی ہزار فٹ گہرا تقریباً عمودی کھڈ ہے یہاں پر مختلف سمتوں سے آتی ہوئی پتلی پتلی دودھیا ندیوں کے آبشار گرتے ہیں اور دریاؤں کی شکل میں بہنے لگتے ہیں۔

سبزے پر جگہ جگہ قالین بچھے تھے، ایک طرف دو خیمے نصب تھے، ایک میں گوشت دوسرے میں دیگیں چڑھی تھیں، ہم صبح سے کھا کھا کر پہلے سے نڈھال ہو چکے تھے، سب قالینوں پر دراز ہو گئے، ایک داغستانی صاحب میرے پہلو میں اکڑو بیٹھ گئے۔

"مسلمان الحمد للہ؟" میں نے کہا "الحمد للہ"

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم؟"

میں نے دہرایا۔

انہوں نے سینے پہ ہاتھ مار کر اپنا تعارف کروایا "محمد علی"!

میں نے کہا "بہت خوشی ہوئی"۔

اب انہوں نے میری ترجمان خاتون سے کہا "تم ہٹ جاؤ ہم خود بات کریں گے" پھر ملی جلی عربی فارسی اور اشاروں سے پہلے دوستی اور محبت کا اظہار کیا اور پھر بتایا کہ اگلے دن ان کی بیٹی سعادت کی سالگرہ ہے اور میں اپنے ہاتھ سے بچی کے لئے کچھ لکھ دوں، اس نام سے اتفاقاً اپنی بھی کوئی بھولی بسری یاد وابستہ ہے، میں نے غالب کا شعر لکھا:

تم سلامت رہو ہزار برس

ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

ترجمہ سنایا گیا تو آس پاس کے سب سننے والے پھڑک گئے، غالب کے احوال اور رمز یہ کلام کی فرمائش ہوئی اور گرجستانی شاعر کلاڈ چکوز نے پھر ان اشعار کو فی البدیہہ گرجستانی میں منظوم کر دیا۔

پھر لڑکیوں نے پرانا مذہب کے پرلے اور نئے داغستانی گیت گائے، پُر موج اور ادائی کے عشق کی داستان جو یہاں کا مرزا صاحباں سمجھ لیجئے، بڑے بڑے اور باطر بہادر کے جنگ نامے، ندیوں اور پہاڑیوں کے گیت، لینن اور انقلاب کے گیت، حیثیا کے کرنل بانکے سردار مقصود رضا میرے پاس آکر بیٹھ گئے "دیکھو ہم لوگ ان پہاڑوں میں اڑنے والے عقابوں کی طرح جفاکش ہیں اور سبک پرواز، ہم دوستوں کے دوست ہیں، کبھی دغا نہیں دیتے کبھی جھوٹا قول نہیں ہارتے، ہم سے دوستی کر لو اور جب کوئی افتاد پڑے ہمیں پکارو، ہم دوستوں کی آواز ہزاروں میل سے پہچان لیتے ہیں"

سورج ڈھل رہا تھا اور پروگرام کے مطابق پانچ بجے ہماچ قلعے واپسی کے لئے جہاز پہ پہنچنا چاہئے تھا، میں نے رسول حمزہ سے کہا "سوا پانچ بج چکے، ہوائی جہاز چھوٹ جائیگا" وہ کہنے لگے "ہٹاؤ بھی، یہی کوئی جا سکو ہے، یہاں تو سب اپنے جہاز ہیں، جب جی چاہے گا چلیں گے۔"

خیر کوئی چھ بجے کے قریب ہم ہوائی میدان میں پہنچے تو کسی طیارے کا دور دور کوئی نشان نہ تھا، کچھ دیر کھڑے رہے، رسول حمزہ کنٹرول روم کے ایک دو چکر لگا کر باہر آئے اور کہنے لگے "یار بہت حماقت ہو گئی، ہم نے صبح پائلٹ کو دعوت میں نہیں بلایا اب وہ کہتا ہے کہ میں جہاز نہیں لاتا۔"

کسی نے مجھ سے سرگوشی میں کہا "بالکل خرافات ہے، جہاز کب کے آکر واپس جا چکے، یہ سب پاکھنڈ تم لوگوں کو ایک رات یہاں روکنے کے لئے ہے۔"

مجبوراً ہم سب پھر گاڑیوں میں سوار ہوئے اور دوبارہ گاؤں کا رخ کیا۔ کسی ایک گھر میں بیس آدمیوں کو ٹھہرانے کی گنجائش کہاں تھی، چنانچہ ایک ایک دو دو مہمان مختلف گھروں میں بٹ گئے، میرے میزبان رسول کے گاؤں حمزہ کے کولخوز، колхоз، یعنی مشترکہ فارم کے صدر محمد خطیب صاحب تھے، نہایت مہذب، شائستہ اور باخبر، چھ فٹ کے قریب قد، کسرتی جسم، بہت سرخ رنگ، سر گھٹا ہوا، داغستانیوں کی مخصوص لمبی عقابی ناک اور تیز عقابی آنکھیں، ان کا گھر نسبتاً نئی وضع کا ہے، بیرونی صحن میں انار، ناشپاتی اور سیب کا باغ اور ترکاریوں کی کیاری، اس کے بعد چار پانچ سیڑھیاں چڑھ کر اونچی کرسی کے مکان میں داخل ہوتے ہیں اس سرے سے اس سرے تک جالی دار بالکنی ہے جس میں ایک

سمت نشست کے لئے آرام کرسیاں ہیں درمیان میں ہاتھ دھونے کے لئے چھوٹا سا حمام اور سلفچی، دوسری طرف کھانے کی میز اور سیڑھیاں جو غسلخانے کو اترتی ہیں، چار کشادہ کمرے ہیں جو اس بالکنی میں کھلتے ہیں، بجلی اور نلکا تو خیر یہاں ہر گھر میں ہے خطیب صاحب کے یہاں ان کے علاوہ دو ریڈیو سیٹ اور ریفریجریٹر بھی ہے۔

خطیب صاحب نے مجھے بتایا کہ اُن کے کولخوز میں سات گاؤں شریک ہیں جن کی آبادی چار ہزار نفر کے قریب ہے اس کولخوز کے زیر اہتمام گندم اور مختلف پھلوں کی کاشت ہوتی ہے اور بھیڑوں کے غلّے پالے جاتے ہیں جن کی فروخت پر کالخوز کی بیشتر آمدنی کا دارومدار ہے، یہ بھیڑیں حکومت کو بیچی جاتی ہیں۔ لیکن گندم اور پھل کولخوز کے ممبروں کی اپنی ضروریات سے فاضل ہو تو مقامی منڈیوں میں فروخت ہوتا ہے، قریباً چالیس ہزار بھیڑیں کولخوز کی ملکیت ہیں اس کے علاوہ ہر شخص ایک گائے اور دس بھیڑیں ذاتی ملکیت میں رکھ سکتا ہے ہر گھر کو ایک ایکڑ کے قریب زمین ذاتی باغ یا کھیتی باڑی کے لئے رکھنے کی بھی اجازت ہے، ہر گاؤں کا اپنا اسکول ہے، آٹھویں جماعت تک تعلیم صرف مقامی زبان "آوار" میں دی جاتی ہے، پانچویں جماعت کے بعد روسی زبان لازمی ہے، کولخوز کا اپنا ہسپتال ہے جس میں ایک سو بیس مریضوں کے داخلے کے لئے سہولتیں میسر ہیں۔ دو زچگی خانے ہیں، ایکس رے اور دوسرا طبی اور جراحی ساز و سامان موجود ہے۔

روزانہ ہوائی سروس ہے اور بسوں اور موٹروں کے لئے پکی سڑک، شب گزارنے کے لئے خطیب صاحب نے میرے لئے اپنا کمرہ خالی کر دیا تھا، اس کمرے کو دیکھ کر ہرگز یہ گمان نہ ہوتا تھا کہ داغستان کے دور افتادہ علاقے کے ایک دور افتادہ گاؤں کے کسی غیر کسان کا کمرہ ہے، شہر کے کسی پروفیسر کی بیٹھک معلوم ہوتی تھی، دیواروں پر نقشے اور مختلف شہروں کی تصاویر، چاروں طرف کتابوں کی الماریاں، پڑھنے کی میز پر اخبارات اور رسالے، ریڈیو سیٹ، بڑا سا کلاک، پڑھنے کا لیمپ، کاغذ پنسلیں اور سگریٹ۔

صبح ہم ناشتہ کر چکے تو رسول حمزہ آئے اور آتے ہی عذر و معذرت کے پل باندھ دئے۔ "بھئی آپ سمجھتے ہوں گے کہ عجب بدتمیز آدمی ہے، مہمان کو کسی کے گھر پہنچا کر جانے کہاں غائب ہو گیا۔ لیکن بات یہ ہے کہ مصروفیت کے باعث گاؤں آنے کا اتفاق کم ہوتا ہے۔ اس دوران کسی گھر میں ماتم ہو گیا ہے۔ کہیں شادی، کسی کے ہاں بچہ ہوا ہے، کسی کے لڑکے نے یونیورسٹی میں کامیابی حاصل کی ہے، کسی سے تعزیت کرنا ہے کسی کے ہاں تہنیت پہنچانا ہے، اب مشکل سے سب کو نپٹا سکا ہوں، چلئے اب ناشتے کو چلیں"۔

"ناشتہ تو ہم کر چکے" میں نے کہا۔

"ابھی تو اس سے کیا ہوتا ہے، جانے سے پہلے آپ کو دو جگہ ناشتہ اور کرنا ہے"۔

دو جگہ ناشتہ کرنے کے بعد ہم لوگ ہوائی میدان پہنچے تو طیاروں کے سامنے کچھ لوگ دہی ابلا ہوا گوشت اور مشروبات لئے کھڑے تھے۔

"ایں یہ کیا؟"

"کھانا پڑے گا" محمد علی نے کہا "ہمارے ہاں کی رسم ہے"۔

فیض احمد فیض

ایک یادگار تقریر

فیض صاحب کی تقریر جو انہوں نے ماسکو میں بین الاقوامی
لینن امن انعام کی پرشکوہ تقریب کے موقع پر اردو زبان میں کی

محترم اراکین مجلس صدارت، خواتین اور حضرات! الفاظ کی تخلیق و ترتیب شاعر اور ادیب کا پیشہ ہے لیکن زندگی میں بعض مواقع ایسے بھی آتے ہیں جب یہ قدرت کلام جواب دے جاتی ہے۔ آج عجز بیان کا ایسا ہی مرحلہ مجھے درپیش ہے۔ ایسے کوئی الفاظ میرے ذہن میں نہیں آ رہے جن میں اپنی عزت افزائی کے لیے لینن پرائز کمیٹی، سوویٹ یونین کے مختلف اداروں، دوستوں اور آپ سب خواتین و حضرات کا شکریہ خاطر خواہ طور سے ادا کر سکوں۔ لینن امن انعام کی عظمت تو اسی ایک بات سے واضح ہے کہ اس سے لینن کا محترم نام اور مقدس لفظ وابستہ ہے۔ لینن جو دور حاضر میں انسانی حریت کا سب سے بزرگ علم بردار ہے اور امن جو انسانی زندگی اور اس زندگی کے حسن و خوبی کی شرط اول ہے۔ مجھے اپنی تحریر و عمل میں ایسا کوئی کام نظر نہیں آتا جو اس عظیم اعزاز کے شایان شان ہو۔ لیکن اس عزت بخشی کی ایک وجہ ضرور ذہن میں آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ جس تمنا اور آدرش کے ساتھ مجھے اور میرے ساتھیوں کو وابستگی رہی ہے یعنی امن اور آزادی کی تمنا وہ بجائے خود اتنی عظیم ہے کہ اس واسطے سے ان کے حقیر اور ادنیٰ کارکن بھی عزت اور اکرام کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔

یوں تو ذہنی طور سے مجنوں اور جرائم پیشہ لوگوں کے علاوہ سبھی مانتے ہیں کہ امن اور آزادی بہت حسین اور تابناک چیزیں ہیں اور سبھی تصور کر سکتے ہیں کہ امن گندم کے کھیت ہیں اور سفیدے کے درخت، اور دلہن کا آنچل ہے اور بچوں کے ہنستے ہوئے ہاتھ، شاعر کا قلم اور مصور کا موئے قلم اور آزادی ان سب صفات کی ضامن اور غلامی ان سب خوبیوں کی قاتل ہے جو انسان اور حیوان میں تمیز کرتی ہے۔ یعنی شعور اور ذہانت، انصاف اور صداقت، وقار اور شجاعت، نیکی اور رواداری، اس لئے بظاہر امن اور آزادی کے حصول اور تکمیل کے متعلق ہوش مند انسانوں میں اختلاف کی گنجائش نہ ہونی چاہیے۔ لیکن بدقسمتی سے یوں نہیں ہے۔ اس لئے نہیں ہے کہ انسانیت کی ابتدا سے اب تک ہر عہد اور ہر دور میں متضاد عوامل اور قوتیں برسر عمل اور برسر پیکار رہی ہیں یہ قوتیں ہیں تخریب و تعمیر، ترقی اور زوال، روشنی اور تیرگی، انصاف دوستی اور انصاف دشمنی کی قوتیں یہی صورت آج بھی ہے اور اسی نوعیت

کی کشمکش آج بھی جاری ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ آج کل انسانی مسائل اور گزشتہ دور کی انسانی الجھنوں میں کئی نوعیتوں سے فرق بھی ہے۔ دورِ حاضر میں جنگ سے دو قبیلوں کا باہمی خون خرابہ مراد نہیں ہے نہ آج امن سے خون خرابے کا خاتمہ مراد ہے۔ آج کل جنگ اور امن کے معنی ہیں آدم کی بقاء اور فنا ـــــ بقا اور فنا ان دو الفاظ پر انسانی تاریخ کے خاتمے یا تسلسل کا دارومدار ہے انھیں پر انسانوں کی سرزمین کی آبادی اور بربادی کا انحصار ہے۔ یہ پہلا فرق ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ اب سے پہلے انسانوں کو فطرت کے ذخائر پر اتنی دسترس اور پیداوار کے ذرائع پر اتنی قدرت نہ تھی کہ ہر گروہ اور برادری کی ضرورتیں پوری طرح سے تسکین پا سکیں، اس لئے آپس میں چھین جھپٹ اور لوٹ مار کا کچھ نہ کچھ جواز بھی موجود تھا۔ لیکن اب یہ صورت نہیں ہے۔ اب انسانی عقل، سائنس اور صنعت کی بدولت اس منزل پر پہنچ چکی ہے کہ جس میں سب تن بخوبی پل سکتے ہیں اور سبھی جھولیاں بھر سکتی ہیں۔ بشرطیکہ قدرت کے بے بہا ذخائر پیداوار کے بے اندازہ خرمن بعض اجارہ داروں اور مخصوص طبقوں کی تسکین ہوس کے لئے نہیں۔ بلکہ جملہ انسانوں کی بہبود کے لئے کام میں لائے جائیں۔ اور عقل اور سائنس اور صنعت کی کل ایجادیں اور صلاحیتیں تخریب کی بجائے تعمیری منصوبوں پر صرف ہوں۔ لیکن یہ جبھی ممکن ہے کہ انسانی معاشرے میں ان مقاصد سے مطابقت پیدا ہو اور انسانی معاشرے کے ڈھانچے کی بنائیں ہوس، استحصال اور اجارہ داری کے بجائے انصاف، برابری، آزادی اور اجتماعی خوشحالی پر اٹھائی جائیں۔ اب یہ ذہنی اور خیالی بات نہیں، عملی کام ہے اس عمل میں امن کی جدوجہد اور آزادی کی جدوجہد کی حدیں آپس میں مل جاتی ہیں اس لئے کہ امن کے دوست اور دشمن اور آزادی کے دوست اور دشمن ایک ہی قبیلے کے لوگ، ایک ہی نوع کی قوتیں ہیں ایک طرف وہ سامراجی قوتیں ہیں جن کے مفاد جن کے اجارے جبر اور تشدد کے بغیر قائم نہیں رہ سکتے اور جنھیں ان اجاروں کے تحفظ کے لئے پوری انسانیت کی بھینٹ بھی قبول ہے۔ دوسری طرف وہ طاقتیں ہیں جنھیں بھوکوں اور دکھیوں کی نسبت انسانوں کی جان زیادہ عزیز ہے جنھیں دوسروں پر حکم چلانے کی بجائے آپس میں ہاتھ بٹانے اور ساتھ مل کر کام کرنے میں زیادہ لطف آتا ہے۔ سیاست و اخلاق، ادب اور فن، روزمرہ زندگی غرض کہ تمام محاذوں پر انہی صورتوں میں تعمیر اور تخریب، انسان دوستی اور انسان دشمنی کی یہ چپقلش جاری ہے۔ آزادی پسند اور امن پسند لوگوں کے لئے ان میں سے ہر محاذ اور ہر صورت پر توجہ دینا ضروری ہے۔ مثال کے طور پر سامراجی اور غیر سامراجی قوتوں کی لازمی کشمکش کے علاوہ بدقسمتی سے بعض ایسے ممالک میں بھی شدید اختلافات موجود ہیں جنھیں حال ہی میں آزادی ملی ہے۔ ایسے اختلافات ہمارے ملک پاکستان اور ہمارے سب سے قریبی ہمسایہ ہندوستان میں موجود ہیں بعض عرب ہمسایہ ممالک میں موجود ہیں اور بعض افریقی حکومتوں میں موجود ہیں ظاہر ہے ان اختلافات سے وہی طاقتیں فائدہ اٹھا سکتی ہیں جو امن عالم اور انسانی برادری کی دوستی اور یگانگت کو پسند نہیں کرتیں اس لئے صلح پسند اور امن دوست صفوں میں ان اختلافات کے منصفانہ حل پر غور و فکر اور اس حل میں امداد دینا بھی لازمی ہے۔

اب سے کچھ دن پہلے جب سوویٹ فضاؤں کا تازہ کارنامہ ہر طرف دنیا میں گونج رہا تھا تو مجھے بار بار یہ خیال آتا تھا کہ آج کل جب ہم ستاروں کی دنیا میں بیٹھ کر اپنی ہی دنیا کا نظارہ کر سکتے ہیں۔ تو یہ چھوٹی چھوٹی کمینگیاں، خود غرضیاں، یہ زمین کے چند ٹکڑوں کو بانٹنے کی کوشش اور انسانوں کی چند ٹولیوں پر اپنا سکہ چلانے کی خواہش کیسی بعید از عقل باتیں ہیں اب جبکہ ساری کائنات کے راستے ہم پر کشادہ ہوگئے ہیں ساری دنیا کے خزینے انسانی بس میں آسکتے ہیں تو کیا انسانوں میں ذی شعور، منصف مزاج اور دیانتدار لوگوں کی اتنی تعداد موجود نہیں ہے جو سب منوا سکے کہ یہ جنگی اڈے سمیت لو یہ بم اور راکٹ، توپیں، بندوقیں، سمندر میں غرق کردو۔ ایک

(باقی صفحہ ۷۰۸ پر)

فیض احمد فیض

شعر میں اظہار اور ترجمانی

فیض صاحب کا یہ نایاب مضمون جو اُن کے مجموعۂ مضامین "میزان" میں شامل نہیں ہے، اتفاقاً ہمیں مل گیا۔ یہ مضمون آج سے ۴۵ سال قبل "ادبی دنیا" کے سالنامہ ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا تھا اور ایک متاعِ گمشدہ کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ وہ دور "ادبی دنیا" کے شباب کا تھا، اور اس کے مدیروں میں مولانا صلاح الدین احمد مرحوم کے علاوہ میراجی بھی شامل تھے۔ مولانا مرحوم نے اپنے ادارتی کالم میں فیض کے اس مضمون پر ایک تعارفی نوٹ بھی لکھا تھا جسے ہم ذیل میں درج کر رہے ہیں۔ (ادارہ)

"پروفیسر فیض احمد نے ایک مختصر لیکن نہایت پرمغز مضمون لکھا ہے۔ شعر میں اظہار اور ترجمانی" غالباً مولانا حالی کا شعر ہے ؎

اے شعر دلنشیں نہ ہو گر تو تو غم نہیں
پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دل گداز تو

اہلِ ذوق کے ہاں اشعار کی قدر و قیمت جانچنے کا جو پیمانہ مقرر ہے یہ شعر اس کی مختصر تفسیر ہے۔ مگر فیض صاحب نے اپنے قیمتی مضمون میں تفصیل سے بتایا ہے کہ شاعری میں ترجمانی کا کیا درجہ ہے؟ ــــ اظہار اور ترجمانی میں کیا فرق ہے؟ ــــ اور کسی شعر کی قدر و قیمت معلوم کرنے کا صحیح معیار کیا ہے؟ ــــ مضمون نہایت خیال انگیز ہے اور ہمارے تنقیدی لٹریچر میں ایک بیش قیمت اضافہ ــــ (صلاح الدین احمد)"

اس مضمون میں ہمیں اس معاملے پر غور کرنا ہے کہ شعر کی ادبی قیمت کامیاب اظہار پر منحصر ہے یا کامیاب ترجمانی پر۔ پہلے ہر دو الفاظ کی تشریح سن لیجئے۔ اگر شاعر پڑھنے سننے والوں کا تصور کئے بغیر محض اپنی تسکین کے لیئے کسی جذبے کو ادا کرنے کی کوشش کرے تو اس عمل کو اظہار کہیں گے۔ اگر شاعر یہی جذبہ نہ صرف ادا کرے بلکہ دوسروں تک پہنچائے تو اس دوسروں تک پہنچانے کے عمل کو ہم ترجمانی پکاریں گے۔ اس سلسلہ میں دو ضروری سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ شعر لکھنے سے شاعر کا مقصد کیا ہوتا ہے؟ اظہار یا ترجمانی! دوسرا یہ کہ ان دونوں میں سے شعر کو جانچنے کا قطعی معیار کون سا ہے؟ اس مسئلہ کو یوں لیجئے کہ شعر لکھتے وقت شاعر کو اپنی تسکین مدنظر ہوتی ہے یا دوسروں کی؟ وہ شعر اپنے لیئے لکھتا ہے یا پڑھنے والوں کے لیئے۔ اس کا جواب تو شاعر سے ہی پوچھنا چاہیئے۔ لیکن بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ شاعر ہر وقت کسی پڑھنے یا سننے والے کا تصور سامنے نہیں رکھتا۔ وہ کسی موہوم جذبے یا گمنام الجھن کے زیر اثر شعر لکھنے بیٹھتا ہے اور اس کا فوری مقصد یہی ہوتا ہے کہ یہ جذبہ ایک حسین اور واضح صورت میں اس کے سامنے آجائے اور اس مقصد کا پورا ہو جانا اس کی تسکین کے لیئے کافی ہے۔ اگر وہ۔۔۔ دوسروں سے داد کا طالب ہو تو بھی اسے اپنی ہی تسکین مطلوب ہوتی ہے۔ اگر دوسرے بھی اس کے جذبات کو سمجھیں یا ان سے متاثر ہوں تو وہ اسے اظہار ہی کی کامیابی سمجھتا ہے۔ اس کے ثبوت میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر شاعر کو کسی غیر آباد جزیرہ میں تنہا چھوڑ دیا جائے جہاں پڑھنے سننے والے کا وجود نہ ہو تو وہ شاعری کی حرکت سے پھر بھی باز نہیں آئے گا

شائد اس پر یہ اعتراض کیا جائے کہ شاعری کی بعض اصناف ایسی بھی ہیں جن میں روئے سخن ہوتا ہی کسی سننے والے کی جانب ہے اور بعض نظمیں لکھی ہی اس لئے جاتی ہیں کہ اوروں کو سنائی جائیں۔ مثلاً قصیدے۔ قصے کہانیاں۔ اخلاقی پیغامات وغیرہ یہ بھی کلی طور پر صحیح نہیں۔ یوں بھی ہو سکتا ہے کہ شاعر کسی شخصیت، کسی کہانی یا کسی اخلاقی نظریئے سے اتنا متاثر ہو کہ محض اپنے تاثر کا اظہار کرنے کے لیئے قصیدہ یا کہانی لکھ دے اور لکھتے وقت کسی سننے والے کا تصور بھی نہ کرے۔

شاید کوئی صاحب یہ اعتراض کریں کہ اگر شاعر کو ہمیشہ اظہار ہی سے مطلب ہوتا ہے اور ترجمانی محض اتفاقی امر ہے جس کا شاعری سے براہ راست کوئی تعلق ہے ہی نہیں تو اظہار اور ترجمانی کی بحث کو نہیں ختم ہو جانا چاہیئے۔ اگر ترجمانی شاعر کا مقصد کبھی ہوتا ہی نہیں تو یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا کہ ترجمانی اس کا مقصد ہونا چاہیئے یا نہیں اس کا جواب یہ ہے کہ اظہار کا عمل بذات خود ایک ترجمانی ہے۔ جب شاعر کسی پوشیدہ تجربے کو ظاہری صورت میں پیش کرتا ہے۔ تو ارادی یا غیر ارادی طور پر اس کی ترجمانی بھی کر دیا ہوتا ہے۔ خواہ یہ ترجمانی اس کی اپنی ذات تک ہی محدود رہے۔ اور دوسرے لوگ اس میں شریک نہ ہو سکیں اب ہم اس سوال پر بحث کر سکتے ہیں کہ اس کی ترجمانی کو وسیع ہونا چاہیئے یا نہیں۔ فرض کیجئے کہ کوئی شخص کاغذ پر چند الٹی سیدھی لکیریں ڈال کر کہے کہ یہ ہے روضۂ تاج محل آپ اس کاغذ کو الٹ پلٹ کر دیکھیں اور فرمائیں کہ ہمیں تو یہ اقلیدس کی پندرھویں شکل کی پیروڈی معلوم ہوتی ہے روضہ تاج محل کی تو اس میں کوئی بات نہیں۔ لیکن وہ شخص اسی بات پر مصر رہے کہ میرے ذہن میں روضہ تاج محل کا تصور یہی ہے میں نے اپنے تصور کا اظہار کر دیا اور میں اسے کامیاب سمجھتا ہوں اب یہ آپ کے ذہن میں آئے یا نہ آئے میری بلا سے!

ان حالات میں آپ دونوں میں سے کس کی بات تسلیم کی جائے۔ اور کس کا معیار صحیح مانا جائے۔ اسی طرح اگر شاعر اپنی نظم میں کسی تجربے کا بزعم خود کچھ بھی اظہار کر دے۔ لیکن ہمارے پلے خاک نہ پڑے تو ہم شاعر کو الزام دیں یا اپنے آپ کو؟ ظاہر ہے کہ شاعر شعر کو اپنے معیار سے جانچے گا۔ اور آپ اپنے ہی معیار سے۔ اب یہ فیصلہ کون کرے کہ ان دونوں معیاروں سے آخری اور قطعی کون سا ہے؟ نقاد! لیکن نقاد بھی تو آخر آپ ہی میں سے ہے اور وہ جو کچھ کہے گا پڑھنے والے ہی کے نقطۂ نظر سے کہے گا

آپ کو یا آپ کے نقاد کو کیا حق پہونچتا ہے کہ شاعر اپنے احکام کی تعمیل پر مجبور کرے شاعر کی تسکین
ہو یا نہ ہو آپ کا مطلب نکل جائے! اس کا ہم یہ جواب دیں گے کہ اگر شاعر ہمیں شعر سناتا ہے تو اسے ہم اپنے ہی معیار سے جانچیں گے
اگر اسے یہ معیار پسند نہیں تو اپنے شعر اپنے پاس رکھے اور بڑی خوشی سے پڑیاں باندھ کر ان میں ہاضمہ کا چورن بیچا کرے۔ ہمیں
کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ ہمارا مغز چاٹے گا تو ہم اس سے معاوضہ بھی طلب کریں گے اور وہ یہی ہے کہ شعر کے تصور
اور تخلیق میں جو راحت اس نے محسوس کی ہے۔ اس میں ہمیں بھی شریک کرے۔ اس نے جو کچھ دیکھا ہے ہمیں دکھائے اور جو کچھ سنا ہے
ہمیں سنائے۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ تنقید کے اصول ہمیشہ پڑھنے والے وضع کرتے ہیں اور پڑھنے والوں کے نزدیک شعر کی پہلی خوبی یہ ہے
کہ شعر کا مضمون ان تک زیادہ سے زیادہ مؤثر طریقے سے پہونچے پہلی خوبی اس لئے کہ جب تک ہم شعر کو سمجھیں گے نہیں شعر کی باقی خوبیاں
ہمیں نظر ہی نہیں آئیں گی۔ شاعر کے تجربے میں کتنی وسعت اور کتنی گہرائی کیوں نہ ہو اگر ہم واجبی کوشش کے باوجود اس تجربے کو ذہن میں
نہیں لا سکے تو شعر کو لازماً ناکامیاب ٹھہرائیں گے۔ ہم یہی کہیں گے کہ اول تو اس مضمون میں وسعت نہیں ہے۔ اور اگر ہے تو فی بطن
شاعر ہے۔ فی بطن شعر نہیں۔ غالباً دنیا کا کوئی شعر بالکل مہمل اور بے معنی نہیں ہوتا۔ کیونکہ شعر لکھتے وقت شاعر کے ذہن میں کوئی
نہ کوئی خیال تو ہوتا ہی ہے لیکن ہم ہر اس شعر کو مہمل کہنے میں حق بجانب ہیں جس میں یہ خیال ہم تک نہ پہونچے۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں
ہر وہ شعر جو فوراً ذہن میں آجائے اچھا ہے اور ہر وہ شعر جو فوراً ذہن میں نہ آئے برا ہے۔ اگر شعر فوراً ذہن میں آجائے تو یہ ایک خوبی ضرور ہے لیکن بہت ممکن ہے کہ شعر میں اور
بہت سی برائیاں ہوں جو اس خوبی کو رد کر دیں یا شعر کا مضمون اتنا پامال ہو کہ اس پر توجہ دینے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ اسی طرح اگر شعر فوراً ذہن میں نہ
آئے تو اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ شاعر نے شعر میں اتنے تصورات یک جا کر دیئے ہیں کہ ان کا ایکدم ذہن میں آجانا مشکل ہے۔ اس صورت میں ہم
شعر پہ جتنا زیادہ غور کریں گے اسی قدر اس سے لطف اندوز ہوں گے اور ہمیں اس میں ہر بار کوئی نئی خوبصورتی نظر آئے گی۔

اس بحث سے نتیجہ یہ نکلا کہ شعر کی کامیابی اظہار پہ نہیں۔ ترجمانی پہ منحصر ہے ہم کسی اظہار کو اس وقت تک کامیاب کہہ ہی نہیں
سکتے۔ جب تک وہ دوسروں کے لئے ترجمانی کا حق ادا نہ کرے۔

یہاں ایک اور دقت پیش آتی ہے۔ شاعر کا کلام باقی رہتا ہے لیکن اس کے پڑھنے والے بدلتے رہتے ہیں۔ بہت ممکن ہے
کہ شاعر کا کلام اس کے عہد کے لوگ نہ سمجھیں لیکن بعد میں آنے والی نسلیں اسی کلام کو شاعری کا معراج قرار دیں یا کوئی شاعر
اپنے عہد میں آسان لیکن آئندہ زمانے میں ناقابل فہم ہو جائے۔ غالب کو ہی لے لیجئے غالب کو ہم بہت بڑا شاعر مانتے ہیں۔ لیکن سنا
ہے کہ غالب کے اپنے زمانے میں اس کا کوئی چرچا نہیں تھا۔ اور لوگ اسے مہمل گو کہتے تھے۔ اگر شاعر کا مقصد ترجمانی یا اپنے مضمون
کو دوسروں تک پہونچانا ہے تو وہ لوگ بھی سچے تھے اور ہم بھی سچے ہیں اور اس طرح ترجمانی کوئی قطعی معیار نہ رہا۔ اس کا جواب کئی
طریقوں سے دیا جا سکتا ہے۔ اول تو یہ بات ہے ہی غلط کہ غالب کے زمانے میں اس کے قدر دان نہیں تھے۔ غالب کو سراہنے والوں
کی اس زمانے میں بھی کمی نہ تھی اور غالب کو کوسنے والے آج بھی موجود ہیں۔ غالب سے لوگوں کو اختلاف اس کے مضامین کی وجہ سے نہیں
اس کے نظریۂ شاعری کی وجہ سے تھا۔ آخر ناسخ کی بھی تو قدر ہوئی اور استاد ذوق کا کلام بھی تو زیادہ سلیس نہیں۔ معاملہ اصل میں یہ تھا کہ
لوگ لفظی صنعتوں کو کمال شاعری سمجھتے تھے لیکن غالب اس راستہ سے ہٹ کر خالص جذبات کی مصوری کرنا چاہتے تھے۔ بعض اشخاص کو
یہ چیز عجوبہ سی معلوم ہوئی اور وہ اس کی فنی اہمیت کا اندازہ نہ کر سکے دوسری بات یہ کہ آج کل بھی غالب کی عظمت اس کے سلیس اشعار
کی وجہ سے قائم ہے نہ کہ مشکل اشعار کی وجہ سے۔ اب بھی غالب کے بعض اشعار ہمیں اتنے ہی مہمل معلوم ہوتے ہیں جتنی کہ ڈاکٹر ٹیگور کی

(باقی صفحہ ۷۰۸ پر)

فیض احمد فیض

آہنگ

"آہنگ" کا پہلا ایڈیشن اس شعر سے شروع ہوتا ہے ؎

دیکھ شمشیر ہے یہ' ساز ہے یہ' جام ہے یہ
تو جو شمشیر اُٹھالے تو بڑا کام ہے یہ

شمشیر، ساز اور جام، مجازؔ کی شاعری انہی تینوں اجزا سے مرکب ہے۔ غالباً اسی وجہ سے ان کا کلام زیادہ مقبول بھی ہے۔ ہمارے بیشتر شعرا نے ان عناصر میں ایک فرضی تضاد کی دیواریں کھڑی کردی ہیں۔ کوئی محض ساز و جام کا دلدادہ ہے تو کوئی فقط شمشیر کا دھنی۔ لیکن کامیاب شعر کے لئے (آجکل کے زمانے میں) شمشیر کی صلابت اور ساز و جام کا گداز دونوں ضروری ہیں ؎

دلبری با قاہری جادوگری است

مجازؔ کے شعر میں یہ امتزاج موجود ہے۔

اس امتزاج میں ابھی تک شمشیر کم ہے اور ساز و جام زیادہ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شمشیر زنی کے لئے ایک خاص قسم کے دماغی زُہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن مجازؔ کی طبیعت میں زُہد کم ہے لذتیت زیادہ ہے۔ شمشیر زنی کو میں انقلابی شاعری کے معنوں میں استعمال کر رہا ہوں۔ دماغی زہد سے میری مراد ہے ایک مخصوص انقلابی مقصد کے نشر و اظہار میں ذہنی اور جذباتی یکسوئی۔ تمام غیر متعلق جذباتی ترغیبات سے پرہیز۔ یہ کٹھن اور محنت طلب عمل ہے۔ مجازؔ ہم میں سے اکثر کی طرح لاابالی اور سہل انگار انسان ہیں۔ چنانچہ جب بھی انھیں ذوقِ پنہاں کی آسودگی کا موقع ملے باز نہیں رہ سکتے۔

مجازؔ کے شعر کا ارتقا بھی ہمارے بیشتر شعرا سے مختلف ہے۔ عام طور سے ہمارے یہاں شعر یا شاعری کا ارتقائی عمل یہ صورت اختیار کرتا ہے۔ ساز و جام۔ ساز و جام + شمشیر۔ شمشیر۔ مجازؔ کے شعر میں اس عمل کی صورت یہ ہے کہ ساز و جام + شمشیر۔ ساز و جام + شمشیر؛ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ رجعت نہیں ترقی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ شاعر کے مضمون اور تجربہ میں مطابقت اور موانست زیادہ گہری ہوتی جا رہی ہے۔ شاعر کی طبیعت خارجی اور انقلابی مضامین کے اینٹ پتھر کو تراشنے اور جوڑنے جانے میں زیادہ لذت محسوس کرنے لگی ہے۔

مجازؔ بنیادی طور پر اور طبعاً غنائی شاعر ہے۔ اس کے کلام میں خطیب کے نُطق کی کڑک نہیں۔ باغی کے دل کی آگ نہیں'

نغمہ سنج کے گلے کا وفور ہے۔ یہی وفورِ مجاز کے شعر کی سب سے بڑی خوبی ہے اور اس کے شعر کی کامیابی کا سب سے بڑا امین۔ بیچ کے ایک مختصر سے دور کے علاوہ مجاز ہمیشہ سے گاتا رہا ہے۔ اس کے نغموں کی نوعیت بدلتی رہی لیکن اس کے آہنگ میں فرق نہیں آیا کبھی اس نے آغازِ بلوغت کی رنگین بے فکر، خواب نما محبت کے گیت گائے ؎

چھلکے تری آنکھوں سے شراب اور زیادہ
مہکیں ترے عارض کے گلاب اور زیادہ
اللہ کرے زورِ شباب اور زیادہ

نور ہی نور ہے کس سمت اُٹھاؤں آنکھیں
حسن ہی حسن ہے تا حدِّ نظر آج کی رات
اللہ اللہ وہ پیشانیٔ سیمیں کا جمال
رہ گئی جم کے ستاروں کی نظر آج کی رات
وہ تبسم یہ تبسم کا جمال پیہم
وہ محبت ہی محبت کی نظر آج کی رات

کبھی اس خواب کی شکست پر آنسو بہائے ؎

کچھ تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا اے شورشِ دوراں بھول گئے
وہ زلفِ پریشاں بھول گئے، وہ دیدۂ گریاں بھول گئے
اے شوقِ نظارہ کیا کہیے، نظروں میں کوئی صورت ہی نہیں
اے ذوقِ تصور کیا کیجے ہم صورتِ جاناں بھول گئے

کبھی اس خالص تخریبی اور مجبور پیچ و تاب کا اظہار کیا جو موجودہ ماحول کے متعلق ہر نوجوان کا اضطراری اور پہلا جذباتی ردِّ عمل ہوتا ہے ؎

جی میں آتا ہے یہ مردہ چاند تارے نوچ لوں
اس کنارے نوچ لوں اور اس کنارے نوچ لوں
ایک دو کا ذکر کیا سارے کے سارے نوچ لوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں؟
بڑھ کے اس اندر سبھا کا ساز و ساماں پھونک دوں
اس کا گلشن پھونک دوں اس کا گلستاں پھونک دوں
تختِ سلطاں کیا میں سارا قصرِ سلطاں پھونک دوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں؟

کبھی اس تعمیری انقلاب کے اسباب و آثار کا تجزیہ کیا جس کے نقوش صرف شعور فکر کے بعد دکھائی دینے لگتے ہیں ؎

اک نہ اک در پر جبینِ شوق گھستی ہی رہی
آدمیت ظلم کی چکی میں پستی ہی رہی

رہبری جاری رہی پیغمبری جاری رہی
دین کے پردے میں جنگِ زندگی جاری رہی

ذہنِ انسانی نے اب اوہام کے ظلمات میں
زندگی کی سخت طوفانی اندھیری رات میں

کچھ نہیں تو کم سے کم خوابِ سحر دیکھا تو ہے
جس طرف دیکھا نہ تھا اب تک ادھر دیکھا تو ہے

یہ کافی متنوع مرکب ہے لیکن اس میں کہیں بھی مجاز کا ترنم بے آہنگ، اُس کی دُھن پھیکی یا اُس کے سُر بے سُرے نہیں ہوئے — مجاز کے کلام میں روایتی شعراء کی سہولت اظہار ہے۔ لیکن ان کی جذباتی سطحیت اور محدود خیالی نہیں ۔ نئے شعراء کی نزاکت کا احساس ہے، ان کی لفظی کھینچا تانی اور توڑ مروڑ نہیں۔ اس کے ترنم میں چاندنی کا سا فیاضانہ حسن ہے، جس کے پرتو سے تاریک اور روشن چہرے یکساں دلکش نظر آتے ہیں۔ غنائیت ایک کیمیاوی عمل ہے جس سے معمولی روزمرہ الفاظ عجب پُراسرار اور پُرمعنی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ بعینہٖ جیسے عنفوانِ شباب میں سادہ پانی مے رنگین دکھائی دیتا ہے، یا مے رنگین کے اثر سے بے رنگ چہرے عنابی ہو جاتے ہیں۔ مجاز کو اس کیمیاوی عمل پر قدرت ہے ؎

ہمدم یہی ہے رہگذرِ یارِ خوش خرام
گذرے ہیں لاکھ بار اسی کہکشاں سے ہم

ضو فگن روئے حسین پر شبِ مہتاب شباب
چشم مخمور نشاطِ شبِ مہتاب لئے
نشۂ نازِ جوانی میں سراپورادا
جسم ذوقِ گہر و اطلس و کمخواب لئے

سکونِ دیر، تقدیسِ کلیسا
گدازِ امتِ خیر البشر بھی
یہ تربت ہے امیر کارواں کی
یہ منزل بھی ہے شمعِ رہگذر بھی

یہی غنائیت مجاز کو دوسرے انقلابی اور غنائی شاعروں سے ممیز کرتی ہے۔

مجاز کی غنائیت عام غنائی شعرائے مختلف ہے۔ عام غنائی شعرا محض عنفوانِ شباب کے دو چار محدود ذاتی تجربات کی ترجمانی کرتے ہیں، لیکن تھوڑے ہی دنوں میں ان تجربات کی تحریک، ان کی شدت اور قوت معدوم ہو جاتی ہے۔ تمام غنائی شعراء کی شاعرانہ عمر بہت کم ہے۔ ان کا اوسط سرمایہ پانچ دس کامیاب عشقیہ نظمیں ہیں۔ بعد میں وہ عمر بھر انہی پانچ دس نظموں کو دہراتے رہتے ہیں یا خاموش ہو جاتے ہیں۔ مجاز کی غنائیت زیادہ وسیع، زیادہ گہرے، زیادہ مستقل مسائل سے متصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں ابھی تک ارتقا کی گنجائش اور پنپنے کا امکان ہے۔ اس کے شباب میں بڑھاپے کا رنگ نہیں جھلکتا۔ عام نوجوان شعرا کی غنائیت زندگی سے بیزار اور موت سے وابستہ ہے۔ انہیں زندگی کی لذتوں کی آرزو نہیں۔ موت کے سکون کی ہوس ہے۔ مجاز گرم زندگی کے نشے سے چور اور موت کے سرد جمود سے سراسر بیزار ہے ؎

مجھے پینے دے پینے دے کہ تیرے جامِ لعلیں میں
ابھی کچھ اور ہے، کچھ اور ہے، کچھ اور ہے ساقی

یہی وجہ ہے کہ مجاز کے شعر میں تھکن نہیں مستی ہے۔ اُداسی نہیں، سرخوشی ہے۔ مجاز کی انقلابیت عام انقلابی شاعروں سے مختلف ہے۔ عام انقلابی شاعر انقلاب کے متعلق گرجتے ہیں۔ للکارتے ہیں۔ سینہ کوٹتے ہیں۔ انقلاب کے متعلق گا نہیں سکتے۔ ان کے ذہن میں آمدِ انقلاب کا تصور طوفان برق و رعد سے مرکب ہے۔ نغمۂ ہزار اور رنگینیٔ بہار سے عبارت نہیں۔ وہ صرف انقلاب کی ہولناکی کو دیکھتے ہیں، اُس کے حسن کو نہیں پہچانتے۔ یہ انقلاب کا ترقی پسند نہیں رجعت پسند تصور ہے۔ یہ برق و رعد کا دور مجاز پر بھی گذر چکا ہے۔ لیکن اب مجاز کی غنائیت اُسے اپنا چکی ہے ؎

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

تقدیر کچھ ہو کاوشِ تدبیر بھی تو ہے
تخریب کے لباس میں تعمیر بھی تو ہے
ظلمات کے حجاب میں تنویر بھی تو ہے
آ منتظر ہے عشرتِ فردا، ادھر بھی آ

برق و رعد والوں میں خلوص اور تیقن تو ہے، یہ لوچ اور نغمہ نہیں —— ان میں انقلاب کی قاہری ہے، دلبری نہیں — میں سمجھتا ہوں کہ مجاز کی "خوابِ سحر" اور "نوجوان خاتون سے خطاب" اس دور کی مکمل اور کامیاب ترقی پسند نظموں میں سے ہیں۔ مجاز انقلاب کا ڈھنڈورچی نہیں انقلاب کا مطرب ہے۔ یہ ساری باتیں میں صرف مجاز کی اچھی نظموں کے متعلق کہہ رہا ہوں، اور ابھی تک گنتی میں یہ نظمیں بہت زیادہ نہیں۔ مجاز کے مجموعے میں بہت سی کمزور اور سست نظمیں بھی ہیں۔ لیکن میں نے انہیں عمداً نظر انداز کر دیا ہے کہ میری رائے میں کسی لکھنے والے کے محاسن کا جائزہ لیتے وقت صرف اس کی بہترین تحریریں سامنے رکھنا چاہئیں۔

(دیباچہ "آہنگ": — از اسرار الحق مجاز (سنہ ۱۹۳۸ء)

فیض احمد فیض

کچھ ڈراموں کے بارے میں

ہمارے برصغیر کا عوامی تھیٹر اجلا جیسا بھی تھا اب سے برسوں اُدھر نسلی موت مرچکا۔ لیکن اسے ہمارے لکھنے والوں کی ہمت کہیے، ہٹ دھرمی کہیے یا امید پرستی کہ ڈرامے جب بھی لکھے جاتے رہے۔ اور اب بھی لکھے جاتے ہیں۔ اس صنفِ ادب میں ضرور کوئی غیر معمولی کشش ایسی ہوگی کہ بہت سے مشّاق لکھنے والے اپنی اور دوسروں کی پسندیدہ اصناف سے ہٹ کر بھی اکثر اس کی جانب رجوع کرتے ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ بیشتر ڈرامے ریڈیو کے لئے لکھے جاتے ہیں۔ یا مغربی تصانیف سے اخذ و ترجمہ کئے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ بھی ظاہر ہے۔ ریڈیو موجود ہے اس لئے ریڈیو ڈرامے کی مانگ بھی موجود ہے۔ مغربی تراجم کا یہ ہے کہ اصل کی شہرت کے باعث نقل کی قبولیت کے امکانات خود ہی بڑھ جاتے ہیں۔

ریڈیو ڈرامہ اپنی جگہ ایک الگ اور مستقل صنفِ تحریر ہے۔ جسے اسٹیج ڈرامہ کا بدل نہیں ٹھہرا سکتے۔ ریڈیو ہوائی چیز ہے۔ اس لئے ریڈیو ڈرامے پر بھی مقام اور زماں کی قید نہیں۔ نہ تھیٹر، نہ اسٹیج، نہ اداکار نہ تماشائی۔ جی چاہے تو اس میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیجئے۔ لیکن ایسے ڈرامے اسٹیج پر منتقل کرنا محال ہے۔ ریڈیو کی اپنی مخصوص حدود و قیود ضرور ہیں۔ لیکن ان کی نوعیت اسٹیج کے تقاضوں سے مختلف ہے۔

رہے مغربی ڈراموں کے تراجم یا چربے تو ان کی افادیت اپنی جگہ مسلم، لیکن مشکل یہ آن پڑتی ہے۔ کہ بیشتر ڈراموں پر کسی مخصوص معاشرے اور زمان و مقام کی چھاپ ہوتی ہے۔ جسے آپ آسانی سے بدل نہیں سکتے۔ یوں تو سبھی ادب اپنے عہد اور گرد و پیش کی عکاسی کرتا ہے لیکن ڈرامے کے آئینے میں اس تصویر کے خدوخال اور بھی نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ چنانچہ کسی اجنبی معاشرے کے بارے میں لکھا ہوا ڈرامہ کیسے ہی سلیقے اور مہارت سے کیوں نہ اپنایا جائے۔ تکلف یا تصنع یا اجنبیت کا کچھ نہ کچھ شائبہ باقی رہ ہی جاتا ہے۔

باجستہ مسرور افسانہ نگار کی حیثیت سے ہمارے ہاں ایک زمانے سے معروف ہیں۔ تمثیل نگاری کے میدان میں یہ مجموعہ ان کی پہلی کاوش ہے لیکن اس نقشِ اول میں بھی بعض منفرد اوصاف نمایاں ہیں۔ مثلاً ایک بات تو یہی ہے کہ یہ ڈرامے نہ ریڈیو ڈرامے ہیں نہ مغربی تصنیف کے چربے یا تراجم۔ ان کے مضامین، واقعات اور کردار سب دیسی ہیں۔ اور کسی کردار میں بدیسی پن کی جھلک ہے بھی تو ہو بہو ایسی ہے جیسی ہم اپنے فیشن ایبل طبقے میں روزانہ دیکھتے ہیں۔ ان کرداروں کی الجھنیں اور ان کے حل، چپقلشیں اور سلجھاوے، افعال اور محسوسات سب ہماری جانی پہچانی باتیں ہیں جس ساز و سامان کے ساتھ اور جن پردوں کے سامنے یہ ناٹک کھیلے جاتے ہیں۔ ہمارے روزمرہ ماحول کا جزو ہیں۔ جو

تماشا یہ لوگ برپا کرتے ہیں۔ ہر روز ہمارے آگے ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ ان ڈراموں میں سچائی اور خلوص موجود ہے۔ جو کسی تحریر میں دیدۂ بینا اور دلِ درد مند کے بغیر پیدا نہیں ہوتا۔

ہاجرہ مسرور کی تربیت جدید افسانہ نگاری کے مکتب میں ہوئی ہے۔ اس لئے انھیں خارجی واقعات کی نسبت اپنے کرداروں کے داخلی اور جذباتی ارتقا سے زیادہ دلچسپی ہے۔ اس کا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان ڈراموں میں جو مرکزی مسائل یا مضامین بیان ہوئے ہیں ان کی رعایت سے مناسب ہی یہی تھا۔ ہمارے سفید پوش طبقے میں مرد اور عورت کے جذباتی کاروبار کے خسارے اور نا آسودگیاں اس کاروبار کی رنگینی اور بے رونقی، اس کے جھوٹ اور ریاکاریاں، اس کی معصومیت اور نادانیاں —— ان ڈراموں کا بیشتر موضوع یہی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر انسانی تجربے کی طرح ان تجربات کی تشکیل میں بھی خارجی عوامل اور داخلی کیفیات دونوں باہم پیوست ہوتی ہیں۔ چھوٹے عمل اور ردِ عمل سے کسی کردار کی ذہنی اور جذباتی شخصیت پیہم بدلتی رہتی ہے۔ ہاجرہ مسرور نے انسانی شخصیت کی شکست و ریخت میں ان داخلی محسوسات کی گرفت اور دخل اندازی پر زیادہ توجہ دی ہے۔ اور خارجی واقعات بیشتر اشارتاً بیان کئے ہیں مثلاً "نوری خالہ" میں رضا ماموں کی برسوں پہلے کی جذباتی شکست ایک نئے بیاہے جوڑے کے لئے عذابِ جان بن جاتی ہے۔ "دستک" میں ایک نوعمر گھریلو لڑکی دلہن بنتے ہی اپنے پرانے محبوب سے یکسر نا آشنا اور اپنے نئے دولہا کے لئے سراپا انتظار ہو جاتی ہے۔ "کھلی کھڑکیاں" میں ڈاکٹر نور اور اس کی بیوی نسرین ایک دوسرے سے نفرت بھی کرتے ہیں چھٹکارا بھی پانا چاہتے ہیں لیکن ساتھ رہنے کی عادت اور اجنبی دنیا کے خوف نے دونوں دلوں میں ایسی زنجیریں ڈال رکھی ہیں جن سے نجات ممکن نہیں۔

"وہ لوگ" اس مجموعے کے باقی ڈراموں سے مختلف رنگ میں ہے اور تکنیک اور موضوع کے اعتبار سے شاید سب میں مؤثر، اس کے کردار زیادہ حقیقی ہیں۔ جن کی ہولناک جدوجہد حیات میں خیالیت اور جذباتیت کو دخل نہیں۔ ان کی جدوجہد و کشمکش کی ڈرامائی وضاحت کے لئے وقت اور (SITUATION) کا مرکزی نقطہ بہت صحت سے چنا گیا ہے۔ اس کشمکش کے تمام پہلو اس مرکز کے ارد گرد بہت خوبی سے مرتب ہو گئے ہیں۔

کردار اور موثر مکالمہ نگاری پر ہاجرہ مسرور کی قدرت ان سب ڈراموں میں یکساں نمایاں ہے۔ ان کی مخلوق میں بچے بوڑھے، امیر، غریب، ملازم، آقا، نئے فیشن کی دوشیزائیں اور پرانی وضع کی بیگمیں سبھی شامل ہیں۔ اور یہ سبھی مخلوق دلچسپ اور جیتی جاگتی مخلوق ہے۔ حتیٰ کہ "نوری خالہ" جیسے کردار بھی جو بالکل سامنے ہی نہیں آتے مانوس اور جاندار معلوم ہوتے ہیں۔

ڈرامے کے اصل جوہر تو اسٹیج پر ہی جا کر کھلتے ہیں۔ ان تحریروں کے بارے میں اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ادبی محاسن کے علاوہ ان میں اسٹیج کا امتحان پاس کرنے کی سبھی صلاحیتیں اور لوازم موجود ہیں۔

یہ مجموعہ ہمارے ادب میں بہت ہی قابلِ قدر اضافہ ہے۔

(دیباچہ "ہم لوگ" از ہاجرہ مسرور ۱۹۶۱ء)

ادب ریاضی نہیں ہے، اس میں کوئی کلیہ قاعدہ صحیح
نہیں ہوا کرتا۔ ہر قاعدے کی مستثنیات مل جاتی ہیں۔
—— فیض

فیض احمد فیض

چند روز اور

"چند روز اور" خدیجہ مستور کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ ہے۔ آج سے کوئی چار برس پہلے ان کا دوسرا مجموعہ "بوچھار" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اور جب سے موجودہ ادب کے طلبا کو اس نوک دست افسانہ نگار کے متعلق کافی تجسس چلا آتا ہے۔ "چند روز اور" کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ مصنفہ کے دوسرے مجموعے سے کئی بنیادی باتوں میں مختلف ہے۔ میں مختلف کہہ رہا ہوں، بہتر نہیں کہہ رہا ہوں۔ اس لئے کہ مجھے خدیجہ مستور کے پہلے افسانوں کی تحقیر مقصود نہیں۔ ہمارے ہاں آج کل عام طور سے یہ ہوتا ہے کہ نوجوان لکھنے والے اپنی ابتدائی تحریری زندگی میں ایک آدھ کتاب لکھ چکنے کے بعد عمر بھر اپنی ہی نقل اتارتے ہیں، مصروف رہتے ہیں چنانچہ ایک خاص عرصہ کے بعد ان کی تخلیقات میں نمو اور ارتقا کا عمل دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن "چند روز اور" اس بات کی شاہد ہے کہ خدیجہ مستور نے ابھی تک اپنے پہ ذہنی اور فنی ارتقا کے دروازے بند نہیں کئے۔ نہ اپنی تحریروں کو تجربات اور مشاہدات کی کسی محدود نوع سے اتنا مخصوص کر لیا ہے کہ ان میں وسعت اور نیرنگی کی صلاحیتیں مفقود ہو جائیں۔

خدیجہ مستور کے ابتدائی افسانوں میں دو تین خوبیاں بہت زیادہ واضح ہیں۔ پہلی خوبی تو یہ ہے کہ انہیں سچ کہنے میں بہت کم دریغ ہوتا ہے۔ نقاد اس خصوصیت کو حقیقت نگاری یا واقعیت نگاری کہتے ہیں۔ لیکن واقعیت نگاری کے بھی کئی مدارج ہوتے ہیں۔ جن مصنفوں کو ہم حقیقت نگار کہتے ہیں۔ ان میں بہت کم ایسے ہوں گے جن کا ہاتھ حقیقت کی نقاب کشائی کرنے میں کسی نہ کسی پردے تک پہنچ کر رک نہ جاتا ہو۔ جو کبھی نہ کبھی اپنی جھجک یا پڑھنے والے کی رعایت سے واقعیت کے بہت سے مقامات سے آنکھیں میچ کر گزر نہ جاتے ہوں۔ بیشتر مصنف حقیقت کی درشتی میں اتنا لوچ ضرور پیدا کر لیتے ہیں کہ پڑھنے والے کی سطح ذہن پہ ان کی تحریر کا سفینہ غیر ضروری ہچکولوں کے بغیر گزر جائے۔ خدیجہ مستور اس بارے میں پڑھنے والے سے بہت کم مفاہمت کرتی ہیں۔ ابتدائی افسانوں میں ان کی یہ ہٹ دھرمی اور بھی واضح اس لئے ہے کہ انہوں نے سچ بولنے کے لئے موضوع بھی ایسا تلاش کیا جس کے متعلق ہم ہمیشہ سے جھوٹ سننے کے عادی ہیں۔ یعنی عورت مرد کے جنسی تعلقات اور محسوسات، اس معاملے میں وہ دانستہ یا نادانستہ دغابازیاں اور ریاکاریاں جو مرد عورت ہمیشہ ایک دوسرے سے کرتے چلے آئے ہیں۔ ہماری ذہنی، جذباتی اور سماجی زندگی میں اس قدر پیوست ہو چکی ہیں کہ ان کی پردہ دری مشکل بھی ہے مقبول بھی۔ خدیجہ مستور نے اس بارے میں بہت سفاکی سے کام لیا ہے جس کے لئے

غالباً مرد عورت میں سے کوئی بھی ان کا شکر گزار نہ ہوگا۔ لیکن اس سفاکی کے باوجود ان کے افسانوں میں درشتی، مردم بیزاری اور انسان دشمنی کا تاثر قریب قریب ناپید ہے اس لئے نا پید ہے کہ خدیجہ مستور کو انسانی دکھ اور مصیبت سے بہت لگاؤ ہے۔ اس لگاؤ کی وجہ سے "بوچھار" اور "چند روز اور" کے جملہ افسانے ایک خاص نوع کے سوز اور رقت کا احساس دلاتے ہیں۔ یہی خدیجہ مستور کے افسانوں کی دوسری خوبی ہے۔ جنسی معاملات کی منظر کشی میں بھی ان کی نظر لذت کے کسی پہلو کی بجائے ہمیشہ دکھ کے کسی پہلو پر پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے جنسی افسانے واقعیت کے باوجود عریاں نہیں ہیں۔ اور ان کا صحیح مقصود جسم و دل سے مجبور مخلوق سے ہمدردی ہے۔ ان کا استہزا نہیں ہے۔

اس سوز اور ہمدردی کا اظہار مصنفہ عام طور سے دو طرح کرتی ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ خدیجہ کے افسانوں کا منظر عام طور سے نچلے درجے یا ہمارے مفلس طبقوں کے گھٹے ہوئے نلاکت زدہ گھر ہوتے ہیں۔ اور انہیں طبقوں سے ان کے بیشتر افراد تعلق رکھتے ہیں۔ بھوک، بے بسی، ناداری اور بے سروسامانی کا یہ مستقل پس منظر، افسانوی افراد کی چال ڈھال اور افعال و اعمال میں اس طرح جھلکتا رہتا ہے کہ ان کی کوتاہیوں اور کمزوریوں سے ہمدردی کئے بغیر نہیں بنتی۔ دوسری بات یہ ہے کہ مصنفہ ان کوتاہیوں کو بے نقاب کرنے میں کسی پر حکم بن کر نہیں بیٹھتیں، نہ ان سے کبھی نفرت اور بیزاری کا اظہار کرتی ہیں۔ عام طور سے وہ عورت مرد کے جنسی اخلاق کو سماجی ماحول سے اتنا مربوط ضرور کر دیتی ہیں کہ اپنے افعال کے لئے افراد کی ذمہ داری بہت حد تک کم ہو جاتی ہے۔

خدیجہ مستور کے افسانوں کی تیسری خصوصیت جزئیات سے ان کا شغف ہے۔ وہ مصوری کم کرتی ہیں اور کشیدہ کاری زیادہ، شاید اسی مناسبت سے ان کی ابتدائی کہانیوں کا ظرف بھی محدود ہے، محسوس یہ ہوتا ہے کہ افسانہ نگار نے دوربین سے کسی وسیع منظر کو سمیٹنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ خوردبین سے ایک نقطے کو پھیلانے کی کوشش کی ہے۔ یہ خوبی بھی ہے اور خرابی بھی۔ خوبی اس لئے کہ یہ طریقہ افسانہ نگار کے موضوع کے لئے نسبتاً زیادہ موزوں ہے خرابی اس لئے کہ اس سے پڑھنے والے کو کشادہ دل و دماغ کا احساس نہیں ہوتا جو ادب عالیہ کی سب سے اہم ودیعت ہوا کرتی ہے، جزئیات نگاری بیشتر زبان و بیان کی چابکدستی پر انحصار رکھتی ہے اور اس میدان میں خدیجہ مستور یقیناً کمال رکھتی ہیں۔ ان میں ہماری چند اور معروف لکھنے والیوں کی سی چمک اور تیکھا پن تو ہے ان کی سی یک رنگی اور اتراہٹ نہیں ہے۔

ان میں سے بیشتر باتیں، خدیجہ کے نئے اور پرانے افسانوں میں مشترک ہیں۔ واقعیت یا یوں کہئے کہ پردہ دری کا شوق جیسا انہیں پہلے تھا اب بھی ہے ——— ان کے افراد اب بھی مجبور اور بے کس مخلوق میں سے ہیں جو پہلے تھے۔ تفصیلات اور جزئیات کو اجاگر کرنے میں اب بھی ان کی نگاہ وسیع ہے، زود رس ہے لیکن اب ان کے سماجی اور فنی تصور میں پہلے سے نمایاں فرق دکھائی دیتا ہے۔ اب انھیں محض جنسی جبر و ستم، محض جذباتی فریب اور ریاکاری، محض نجی الجھنوں اور گھریلو سازشوں کے علاوہ ان بنیادی حقائق سے بھی آشنائی ہو چلی ہے، جن کی وجہ سے جملہ ذہنی، جذباتی اور سماجی امراض پیدا ہوتے ہیں وہ اسباب جو مرد کو ظالم اور ہوسناک، عورت کو محکوم اور مقہور، گھروں کو تاریک اور بے رونق، اور گھرانوں کو جھگڑالو اور خود غرض بناتے ہیں۔ محض افراد کے تجزیہ اور مطالعے سے سمجھے اور سمجھائے نہیں جا سکتے۔ اس لئے کہ ان کی جڑیں کسی مخصوص سماجی نظام اور طبقاتی تربیت میں پیوست ہوتی ہیں۔

چند روز اور

"چند روز اور" میں مصنفہ نے انہی زیادہ اور وسیع تر مسائل کی طرف رجوع کیا ہے جو یقیناً ارتقا کی اگلی منزل ہے طبقاتی تعلقات اور ان کے سیاسی نتائج یعنی امن، جنگ، فسادات، تعیش اور ناداری، شقاوت اور خلوص افراد اور واقعات کو کس طرح مختلف صورتوں میں مرتب کرتے ہیں۔ "چند روز اور" کا بیشتر موضوع یہی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ خدیجہ مستور کو اس نئے مواد کی تراش خراش میں ابھی اتنا ملکہ پیدا نہیں ہوا۔ جتنا انھیں اپنے ابتدائی موضوعات پر ہے اس لئے انہیں کبھی کبھی واقعات سے ہٹ کر تفسیر و تشریح سے کام لینا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر فرقہ وارانہ فساد کا المیہ "مینوں لے چلے بابلا" میں افسانوی واقعات بغیر کسی تشریح کے نہایت موثر طور سے واضح ہوتے ہیں، لیکن "اٹامک لوٹیے" میں یہی کچھ بتلانے کے لئے طویل مکالموں سے کام لینا پڑتا ہے۔ جس کی وجہ سے فلمی گیتوں کی طرح کہانی کی حرکت اور رفتار رک جاتی ہے۔ اس طرح ان افسانوں میں فلاکت زدہ طبقے کی جہد حیات کا سوز اور دکھ بہت شدت سے محسوس ہوتا ہے، لیکن اس جدوجہد کا شکوہ اور جلال ٹھیک نہیں دکھائی دیتا۔

ان بنیادی مسائل سے مکمل فنی اور ذہنی تطابق پیدا کرنے کے لئے خلوص، وقت اور محنت تینوں درکار ہوتے ہیں خلوص موجود ہے (جو "چند روز اور" میں یقیناً موجود ہے) تو فن کی باقی منازل تک پہنچنے کے لئے گامزن رہنا ہی کافی ہے۔ اس لئے اردو ادب کے شائقین نہ صرف افسانوں کے اس مجموعے سے اپنے دیرینہ تجسس کی تسکین پائیں گے۔ بلکہ خدیجہ مستور کے اگلے مجموعے کا اور بھی تجسس سے انتظار کریں گے۔

(دیباچہ "چند روز اور" از خدیجہ مستور)

ایک یادگار تقریر

(صفحہ ۶۹۶ سے آگے)

دوسروں پر قبضہ جمانے کے بجائے سب مل کر تسخیر کائنات کو چلو۔ جہاں جگہ کی کوئی تنگی نہیں ہے۔ جہاں کسی کو کسی سے الجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جہاں لامحدود فضائیں ہیں اور ان گنت دنیائیں ہیں مجھے یقین ہے کہ سب رکاوٹوں اور مشکلوں کے باوجود ہم لوگ اپنی انسانی برادری سے یہ بات منوا کر رہیں گے مجھے یقین ہے کہ انسانیت جس نے اپنے دشمنوں سے آج تک کبھی ہار نہیں کھائی اب بھی فتح یاب ہو کر رہے گی۔ اور آخر کار جنگ و نفرت اور ظلم و کدورت کے بجائے ہماری باہمی زندگی کی بنا وہی ٹھہرے گی جس کی تلقین اب سے بہت پہلے فارسی شاعر حافظ نے کی تھی:

> خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی
> بجز بنائے محبت کہ خالی از خلل ست

("دست تہ سنگ" فروری ۱۹۶۵ء)

شعر میں اظہار اور ترجمانی

(صفحہ ۶۹۹ سے آگے)

تصویریں پڑھنے والے بدلتے رہتے ہیں لیکن زندگی کے بنیادی تجربات اور جذبات نہیں بدلتے۔ اگر شاعر نے ان کی کامیاب ترجمانی کی ہے تو ان اشعار کی قیمت وقت اور مقام کی پابند نہیں۔ مگر یہ سب دلیلیں رد کر دی جائیں تو بھی ہم یہی کہیں گے کہ اگر غالب کو اس عہد میں داد نہیں ملی تو اس وجہ سے کہ لوگ اس کے اشعار سمجھ نہیں سکے اور ہم اسے داد دیتے ہیں تو اس وجہ سے کہ ہم اس کے اشعار سمجھ سکتے ہیں۔ معیار پھر بھی ایک رہا اگرچہ اس کے دائرہ اور وسعت میں تبدیلی واقع ہو گئی اس لیے ایک اچھے شعر یا اچھی نظم کی کامیابی یہی ہے کہ اس کا مضمون پڑھنے والوں تک سہولت اور برجستگی سے پہونچے تاکہ وہ اسے سمجھ سکیں۔ اس سے متاثر ہو سکیں اور اپنے تاثر کو داد کی صورت میں شاعر تک پہونچائیں۔

فیض احمد فیض

کچھ راگ رنگ کے بارے میں

فنون لطیفہ میں سے صرف موسیقی ہی کو یہ فخر حاصل ہے کہ خواص و عوام اس کے رسیا ہیں اور سب اپنے اپنے ذوق اور معیار کے مطابق اس سے حظ حاصل کرتے ہیں۔ مگر اردو زبان میں علم موسیقی کی کتابوں کی افسوسناک کمی ہے اور جس موضوع پر عنایت الٰہی ملک نے قلم اٹھایا ہے اس پر تو اردو میں کوئی کتاب شاید ہے ہی نہیں۔ یہ مختصر سی کتاب بھی اس بہت بڑی کمی کو کماحقہ پورا نہیں کر سکتی۔ البتہ قارئین کے دلوں میں علم موسیقی سے متعلق کچھ جاننے اور کچھ سمجھنے کا احساس ضرور پیدا کر سکتی ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ حالت میں یہ بھی موسیقی کی (اور بالواسطہ طور سے اردو زبان کی بھی) کوئی معمولی خدمت نہیں ہے۔

مصنف نے راگ رنگ میں نہ علم موسیقی کا کوئی محاکمہ پیش کیا ہے۔ نہ تحقیق کے سمندر کھنگالے ہیں اور نہ ہی ان کے مدنظر گائیکوں کا محاسبہ تھا۔ انھوں نے صرف اتنا کیا ہے کہ آسان زبان میں روانی اور وضاحت کے ساتھ موسیقی میں گزشتہ ایک صدی کی روایات و تجربات کا جائزہ لیا ہے۔ اور اس امر کا التزام رکھا ہے کہ یہ جائزہ ہر لحاظ سے غیر جانبدارانہ ہو۔ اس کے علاوہ چند ایک مضامین میں موسیقی کے ثقافتی پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں مصنف نے یہ بہت اچھا کیا کہ اپنے لئے ایک حد مقرر کر لی۔ بصورت دیگر ایک مختصر سی کتاب میں موسیقی کے وسیع علم کے تمام مباحث کو سمیٹنے کا نتیجہ یہ نکلتا کہ قارئین پہلے سے بھی زیادہ الجھ جاتے۔

یوں سمجھ لیجئے کہ مستقبل کے لئے یہ کتاب خام مواد کا کام دے گی۔ اور اس مضبوط بنیاد پر تنقید و تحقیق کے بڑے بڑے قصر تعمیر کئے جا سکیں گے۔ اس کتاب کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ مستقبل کے قاری کو ہمارے دور کی موسیقی کے بارے میں مستند معلومات حاصل ہوں گی اور اسے معلوم ہو سکے گا کہ اس دور میں اس فن نے کہاں تک ترقی کی تھی۔ اس میں کیا کیا تغیرات رونما ہونے والے تھے۔ اس دور کے بڑے بڑے گائیک کون تھے۔ اور انھوں نے اس فن کو اپنی انفرادیت اور اپنے اسلوب سے کس کس زاویے سے متاثر کیا۔

(دیباچہ "راگ رنگ" از عنایت الٰہی ملک ۱۹۶۲ء)

آپ کوئی بھی ہوں
کہیں بھی ہوں
کچھ بھی پس انداز کریں
آپ کے لئے
پوسٹ آفس سیونگ بینک
میں ساری سہولتیں موجود ہیں
آپ کم سے کم ۲ روپے سے اکاؤنٹ کھول سکتے ہیں اور اس کے بعد کم سے کم ایک روپیہ نکلوا یا جمع کرا سکتے ہیں عام ڈپازٹ پر ۲½ فیصدی اور ایک، دو یا تین سال کے میعادی ڈپازٹ پر ۳ فیصدی ۳½ فیصدی اور ۴ فیصدی منافع ملتا ہے۔ منافع پر ٹیکس معاف ہے۔
آپ اپنے ہیڈ پوسٹ آفس کے حلقے میں
کسی بھی ڈاکخانے سے روپیہ نکلوا سکتے ہیں
پوسٹ آفس
سیونگ بینک
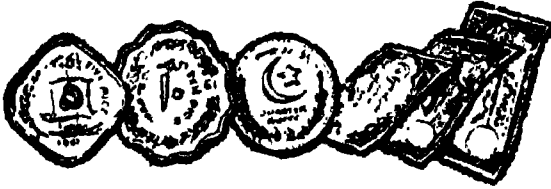
ترقی میں دوش بدوش
تیل کیا ہے؟ روشنی اور توانائی ۔ روشنی اور توانائی ترقی و خوشحالی کا منبع ہیں
توانائی کو عظیم قوت میں منتقل کرنے اور دور دور تک روشنی پہنچانے کے لئے
بند تعمیر کئے جاتے ہیں۔ وارسک بند پاکستان کی زبردست ترقی کا مظہر ہے۔ اسے
وجود میں لانے کے لئے برماشیل کے تیل سے چلنے والی بیسیوں مشینیں رات
دن مصروف رہیں۔ اور اب وارسک کے بعد منگلا بند کی تعمیر شروع ہو گئی ہے
اس عظیم بند کی تعمیر کے لئے بھی برماشیل ہی تیل فراہم کر رہی ہے
برماشیل کو بجا طور پر فخر ہے کہ وہ ترقی و خوشحالی کے ان عظیم
منصوبوں میں پاکستانی عوام کے دوش بدوش ہے۔
بھروسے کے قابل ۔ برماشیل

2 flowers
BROWN PERFUMED
CIGARETTES
مجھے تو ٹو فلاورز
کی خوشبو
بے حد پسند ہے

لپٹن
کے معنی
عمدہ چائے
LP 14-62

A TINY MAGIC WAND

That dispels the gloom and engulfs the darkness. Brings flaming warmth and happy brightness amid frustration and chaos.

HABIB MATCHES

ARE NON-FAILING
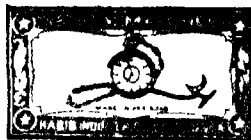
CHOOSE A BRAND NOW FROM A LONG RANGE

HABIB INDUSTRIES LIMITED

تحفہ ہو تو ایسا ہو۔۔
کہ ہر تقریب اور موقع کو زیب دے اور جسے دیکھتے ہی طبیعت کھل اٹھے
ایسے تحفہ کیلئے ویسٹ اینڈ واچ
کا انتخاب عین موزوں ہے
ویسٹ اینڈ واچ سوئٹزرلینڈ کے ماہر گھڑی سازوں کی
کاریگری کا اعلیٰ شاہکار ہے۔ دلکشی اور نفاست
کے علاوہ صحیح وقت دینے میں بھی لاجواب ہے
جی ہاں! آپ بھی دل موہ لینے والی
ویسٹ اینڈ واچ ہی کا تحفہ پیش کیجئے۔
ویسٹ اینڈ واچ کمپنی

روشنیوں کا شہر

بستا ہے اس کہر کے پیچھے روشنیوں کا شہر

- ○ بک سیلر فیض
- ★ فیض صاحب اور میں
- ○ مرے دریچے میں
- ★ نثار میں تری گلیوں پہ !
- ○ سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں
- ★ تاریک راہوں میں مارے گئے
- ○ درد آئے گا دبے پاؤں
- ★ خدا وہ وقت نہ لائے

ابراہیم جلیس

بک سیلر فیض

دوستو آؤ چل کے دیکھیں گے
فیض صاحب کتاب بیچیں گے

وہ فیض احمد فیض، شیرینیِ لب، خوشبوئے دہن، شادابیِ دل اور تفریحِ نظر کا نقیب شاعر فیض احمد فیض۔

وہ فیض
جس سے سنتِ منصور و قیس زندہ ہے۔

وہ فیض
جس سے ہے باقی جہاں میں کج کلہی

وہ فیض جس کے دم سے ہے کوئے جنوں میں اب بھی خجل
عبائے شیخ و قبائے امیر و تاجِ شہی

وہ فیض جو کبھی تنہا پسِ زنداں تھا، آج بیٹھا سرِ بازار ہے، تاکہ
اے مکتبہ گلڈ ــــــــ ترا کاروبار چلے

پاکستانی ادیبوں کے رشتہ اتحاد رائٹرز گلڈ نے پہلے تو ملک کے سب سے زیادہ ذہین اور سب سے زیادہ مظلوم انسانوں، ادیبوں اور شاعروں کو کسمپرسی، انتشار، خواری و نزاری سے نکال معاشرے کے باعزت اور اہم انسانوں کے شانہ بشانہ کھڑا کیا۔ ان کے اتحاد کی خانہ آبادی کی۔ اور ان کے کھانے کمانے کے لئے (بحوالہ اصلاح دکانداری)

"ایک دکان کر کے دے دی ہے۔"

کراچی کی خوبصورت شاہراہ وکٹوریہ روڈ پر کتابوں کی جو ایک نئی دکان ہے پاکستان کے علم نواز اور ادب دوست وزیر خزانہ جناب محمد شعیب نے نہ صرف اس کا افتتاح کیا تھا بلکہ اس دکان بارونق کے پہلے خریدار بھی وہی تھے اور شاید یہ محمد شعیب کے ہاتھوں کی برکت ہی ہے کہ دکان کا بجٹ نمبر پلس،

ہی جا رہا ہے۔ دکان خوب چمک اٹھی ہے اور پہلے ہی دن سے ع

بڑی رونقوں پر ہے گلڈ کی دکان

اس دکان سے پہلے ادیب عرف رائٹرز رے رائٹر تھے۔ اب رائٹرز گلڈ نے ہر رائٹر کو رائٹر کے علاوہ

" رائٹر۔ پرنٹر۔ پبلشر اینڈ بک سیلر "

بھی بنا دیا ہے۔

اب فیض ہوں یا حفیظ، نسیم حجازی ہوں یا احمد ندیم قاسمی، ماہر القادری ہوں یا جمیل الدین عالی، ہاجرہ مسرور ہوں یا قدرت اللہ شہاب ——
یہ دل بیچنے والے، یہ سر بیچنے والے، یہ جان بیچنے والے قلمکار کے قلمکار رہیں دُکندار کے دُکندار

ے
یہ مکتبۂ گلڈ سلامت سے تو اد با
تصنیف و تجارت کو ہم کرتے رہیں گے

واہ حضرت حفیظ جالندھری ع

خوب کرتے ہو دُکنداری

اخباروں میں خبر چھپی ہے کہ آج سہ پہر تین بجے سے شام کے سات بجے تک حضرت فیض احمد فیض رائٹرز گلڈ کی اس کتابوں کی دکان پر بہ حیثیت "بک سیلر" کے بیٹھیں گے۔ اب فیض صاحب کے وہ مداح اور عشاق جنہوں نے فیض صاحب کو کبھی نہیں دیکھا اور جو فیض صاحب کا شربتِ دیدار بھی پینا چاہتے ہیں اور ان کے قیمتی دستخط سے ان کی تصانیف حاصل کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے یہ بڑا نادر موقع ہے۔

"دست صبا" بھی لو "دست خط" بھی لو
آنکھوں سے لگا دُ کبھی تم دستِ صبا کو
ہونٹوں سے لگا دُ کبھی تم دست خطوں کو

کیونکہ بقول فیض ے

میرا سرمایہ، مری آس یہی ہاتھ تو ہیں
اور کچھ بھی تو نہیں پاس یہی ہاتھ تو ہیں

لب پہ حرفِ غزل دل میں قندیلِ غم۔ دیکھو وہ شاعر فیض بھی بیٹھا ہے۔ وہ دیکھو "بک سیلر" فیض بھی بیٹھا ہے۔ فیض کو دیکھنے، فیض سے ہم کلام ہونے اور فیض سے خود "کلام فیض" خریدنے جہاں بہت سے لوگ جائیں گے وہاں (بوجوہ) بعض لوگ ایسے بھی ہوں گے جو اس تذبذب میں مبتلا ہو جائیں گے کہ

واں جائیں یا نہ جائیں نہ جائیں کہ جائیں ہم　　(فیض)

آج فیض اپنی تصنیف کے آپ بیوپاری بن بیٹھے ہیں تو کل حفیظ جالندھری گلڈ پر بیٹھیں گے۔ باری باری سب کی باری آئے گی۔ نسیم حجازی، احمد ندیم قاسمی، جمیل الدین عالی، قتیل شفائی، شوکت صدیقی، انور، ضیا جالندھری، ابن انشا، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، شاہد احمد دہلوی، شوکت عثمان،

جسیم الدین، فارغ بخاری، ممتاز حسین وغیرہ وغیرہ سب کے سب دُکان پر بیٹھیں گے. گاہک آئیں گے. فرمائش کریں گے.

"فیض صاحب! ایک پیکٹ 'نقش فریادی' دیدیجئے."

"نسیم حجازی صاحب! ایک کنستر ناول چاہیئے."

"ہاجرہ مسرور صاحبہ! "چھری چھپے" ایک افسانہ بیگ میں دیدیجئے."

"ندیم قاسمی صاحب! پانچ سیر غزلیں تول دیجئے."

"انشا جی! آپ کے پاس "چاند نگر" کی گائیڈ بک ہوگی."

"مسٹر جی الانا: ذرا ولایتی شاعری کا سیمپل تو دکھائیے."

"ضیا جالندہری صاحب! ڈنڈی نہ ماریئے. پوری غزل تولئے."

"عالی جی! آپ کے "دوہوں" کی ایک بوری ناری اور ایک بوری گوری دیدیجئے."

"شاہد احمد دہلوی صاحب! ذرا ایک سیر دلّی کے چٹخارے دار محاورے تو باندھ دیجئے."

امید تو یہی ہے کہ دکان خوب چلے گی، خوب چمکے گی اور انشاء اللہ اس دُکان کا مال دساور بھی جایا کرے گا.

ارادہ ہے کہ آج سہ پہر ہم بھی اس دکان کی رونق دیکھیں. شاعر فیض کو تو بارہا دیکھا ہے "بک سیلر فیض" کو آج تک نہیں دیکھا. ذرا دیکھیں تو سہی کہ ان کی دُکانداری بھی ان کی شاعری کی طرح ہے کہ نہیں. دُکان پر ہنس مکھ دُکاندار کی طرح بیٹھے ہیں کہ "ادھار کھائے بیٹھے ہیں؟"

ان کی دلفروشی اور سر فروشی کو تو آزما چکے اب ذرا ان کی کتب فروشی بھی دیکھیں.

ہمیں ان کی "دست صبا" بھی چاہیئے اور "دست خط" بھی.

ہم تو فیض کے پرانے "بندۂ بے دام" ہیں. اس لئے اگر انہوں نے "دام" مانگے تو ہم یہ شکوہ ضرور کریں گے کہ ؎

اے فیض اپنی وضع تجارت تو دیکھئے
دیوان بیچتے ہیں تو بے دام کیوں نہیں

ابن انشا

فیض اور میں

بڑے لوگوں کے دوستوں اور ہم جلیسوں میں دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو اس دوستی اور ہم جنسی کا اشتہار دے کر خود بھی ناموری حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسرے وہ عجز و فروتنی کے پتلے جو شہرت سے بھاگتے ہیں کم از کم اپنے ممدوح کی زندگی میں۔ ہاں اس کے بعد رسالوں کے ایڈیٹروں کے پرزور اصرار پر انھیں اپنے تعلقات کو عالم آشکار کرنا پڑے تو دوسری بات ہے ڈاکٹر فقیر الدین کو لیجئے۔ جیسے اور پروفیسر ہوتے ہیں ویسے ہی یہ تھے۔ لوگ فقط اتنا جانتے تھے کہ علامہ اقبال کے ہاں اٹھتے بیٹھتے تھے۔ سو یہ بھی کوئی خصوصیت کی بات نہیں۔ یہ انکشاف علامہ کے انتقال کے بعد ہوا کہ جب کوئی فلسفے کا دقیق مسئلہ ان کی سمجھ میں نہ آتا تو انہی سے رجوع کرتے تھے۔ ڈاکٹر فقیر الدین نے ایک واقعہ لکھا ہے۔ کہ ایک روز آدھی رات کو میں چونک کر اٹھا اور کھڑکی سے جھانکا تو کیا دیکھتا ہوں کہ علامہ مرحوم کا خادم خاص علی بخش ہے۔ میں نے پوچھا "خیریت تو ہے"۔ بولا "علامہ صاحب نے یاد فرمایا ہے"۔ میں نے کہا "اس وقت؟" بولا "جی ہاں اس وقت اور تاکید کی ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو لے کر آنا"۔ میں حاضر ہوا تو اپنے لحاف ہی میں جگہ دی اور فرمایا "آج ایک صاحب نے گفتگو میں رازی کا ذکر کیا۔ تم جانتے ہو میں تو شاعر آدمی ہوں۔ آخر کیا کیا پڑھوں؟ اس وقت یہ پوچھنے کو تکلیف دی ہے کہ یہ رازی کون صاحب تھے۔ اور ان کا فلسفہ کیا تھا؟" میں دل ہی دل میں ہنسا کہ دیکھو اللہ والے لوگ ایسے ہوتے ہیں۔ بہرحال تعمیل ارشاد میں میں نے امام فخر الدین رازی اور ان کے مکتب فکر کا سیر حاصل احاطہ کیا اور اجازت چاہی۔ علامہ صاحب دروازے تک آئے اور آبدیدہ ہو کر رخصت کیا۔ اور کہا "تم نے میری مشکل آسان کر دی۔ اب اس شہر میں اور کون رہ گیا ہے۔ جس سے کچھ پوچھ سکوں"۔

اگلے اتوار کو زمیندار کا پرچہ کھولا تو صفحہ اول پر علامہ موصوف کی نظم تھی جس میں وہ مصرع ہے :۔

عزیب اگرچہ ہیں رازی کے نکتہ ہائے دقیق

اگرچہ میں نے واضح کر دیا تھا کہ رازی کا فلسفہ خاصا پیش پا افتادہ ہے۔ دقیق ہرگز نہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے علامہ مرحوم کو ایسا ہی معلوم ہوا۔

مدرسہ علمیہ شرطیہ موچی دروازہ کے پرنسپل مرزا اللہ دتہ خیالؔ نے جو چھ ماہ میں میٹرک اور دو سال میں بی۔ اے پاس

کرانے کی کمائی ٹھگ لیتے ہیں۔ ماہنامہ "تصویرِ بتاں" میں پہلی بار اس بات کا اعتراف کیا کہ علامہ مرحوم کو مثنوی مولانا روم کے بعض مقامات میں الجھن ہوتی تو مجھے یاد فرماتے تھے۔ ایک بار میں نے عرض کیا کہ آپ منشی فاضل کیوں نہیں کر لیتے۔ تمام علوم آپ کے لئے پانی ہو جائیں گے۔ بولے "اس عمر میں اتنی محنتِ شاقہ نہیں کر سکتا۔" بعد میں میں نے سوچا کہ واقعی شعرا تلامیذ الرحمٰن ہوتے ہیں۔ ان کو علم اور ریسرچ کے جھمیلوں میں نہیں پڑنا چاہیئے۔ یہ تو ہم جیسے سر پھروں کا کام ہے۔

علامہ کے ایک جگری دوست رنجور فیروزپوری کو بھی لوگ گوشۂ گمنامی سے نکال لائے۔ ایک بصیرت افروز مضمون میں آپ نے لکھا۔ "خاکسار نے اپنے لئے شاعری کو کبھی ذریعہ عزت نہیں جانا۔ بزرگ ہمیشہ سے یہی بندی کرتے آئے تھے۔ (اس میں خدا نے مجھے برکت دی) چھوٹا ہوں۔ کلام بیشتر ارتجال کہتا تھا۔ علامہ صاحب کی نذر کر دیتا تھا۔ اب میں دیکھتا ہوں کہ ارمغانِ حجاز وغیرہ کتابوں میں سینکڑوں ہی مصرعے جو اس ہیچمدان کج مج زبان نے علامہ کے گوش گذار کئے تھے۔ نگینوں کی طرح چمک رہے ہیں۔

حکیم عزرائیل مصنف طب بقراطی نے نمائندہ صبح و شام کو انٹرویو دیا تو بتایا کہ ایک زمانہ میں حکیم الامت کو بھی طب کا شوق ہوا۔ بندہ نسخہ لکھتا اور علامہ مرحوم پڑیاں بناتے۔ اور جو شاندے کوٹتے چھانتے۔ اس دوران اگر فکرِ سخن میں مستغرق ہو جاتے تو کبھی کبھی ہاون دستے میں اپنا انگوٹھا پھوڑ بیٹھتے۔ دوسرے روز عقیدتمند پوچھتے کہ یہ کیا ہوا تو فقط مسکرا کر انگشتِ شہادت آسمان کی طرف بلند کر دیتے۔

عام لوگوں کا یہ خیال تھا کہ علامہ مرحوم عمر کے آخری سالوں میں کبوتر بازی اور پہلوانی نہیں کرتے تھے۔ اور بٹیر سے لڑانے کا شغل بھی ترک کر دیا تھا۔ صحیح صورتِ حال سے میاں معراج الدین گوجرانوالوی نے رسالہ عرض الغزلات کے اقبال نمبر میں پردہ اٹھایا۔ پھر علامہ مرحوم کے احوال میں اکثر آیا ہے کہ فلاں بات سنی اور آبدیدہ ہو گئے۔ فلاں ذکر ہوا اور آنسوؤں کا تار بندھ گیا۔ اس کا بھید بھی علامہ مرحوم کے ایک اور قریبی دوست ڈاکٹر عین الدین ماہر امراضِ چشم نے کھولا۔

اسی زمرے میں ڈاکٹر محمد موسیٰ پرنسپل بانگ درا ہومیو پیتھک کالج گڑھی شاہو کو رکھئے۔ جنہوں نے علامہ اقبال مرحوم کی زندگی کے ایک اور غیر معروف گوشے کو بے نقاب کیا۔ اپنی کتاب "تسہیل الہومیوپیتھی" کے دیباچے میں رقمطراز ہیں "لوگوں کا یہ گمان غلط ہے کہ ڈاکٹر اقبال فقط نام کے ڈاکٹر تھے۔ اس عاجز کا مطالعہ اتنا نہیں کہ ان کے شاعرانہ مقام پر گفتگو کر سکے۔ ہاں اتنا وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ مرض کی تشخیص میں اپنے بعد میں نے انہی کو دیکھا۔ بعض اوقات دواؤں کے ضمن میں بھی ایسے قابلِ قدر مشورے دیتے کہ یہ عاجز اپنے تبحرِ علمی کے باوجود حیران رہ جاتا۔ بہرحال شاعر تو ہمارے ہاں اب بھی اچھے اچھے پائے جاتے ہیں۔ میرے نزدیک علامہ مرحوم کی رحلت ہومیو پیتھی طب کے لئے ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ میں مریضوں پر توجہ دیتا اور وہ ایک کونے میں بیٹھے حقہ پیتے رہتے۔ تاہم اس عاجز کے مطب کی کامیابی میں جو مایوس مریضوں کی آخری امیدگاہ ہے۔ اور جہاں خالص جرمن ادویات کفایت فراہم کی جاتی ہیں ان کے نام نامی کا بڑا دخل تھا۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ آپ نے اپنی ایک مشہور تصنیف کا نام بھی عاجز کے مطب کے نام پر رکھا۔

فیض صاحب کے متعلق کچھ لکھتے ہوئے مجھے تامل ہوتا ہے۔ دنیا حاسدان بدبین سے خالی نہیں۔ اگر کسی نے کہہ دیا کہ ہم نے تو اس شخص کو کبھی فیض صاحب کے پاس اٹھتے بیٹھتے نہیں دیکھا تو کون ان کا قلم پکڑ سکتا ہے۔ مدیر افکار اصرار نہ کرتے تو یہ بندہ بھی اپنے گوشۂ گمنامی میں مست رہتا۔ پھر بعض باتیں ایسی بھی ہیں کہ لکھتے ہوئے خیال ہوتا ہے کہ آیا یہ لکھنے کی ہیں بھی

یا نہیں۔ مثلاً یہی کہ فیض صاحب جس زمانہ میں پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر تھے۔ کوئی اداریہ اس وقت تک پریس میں نہ دیتے تھے۔ جب تک مجھے دکھا نہ لیتے۔ کئی بار عرض کیا کہ ماشاءاللہ آپ خود اچھی انگریزی لکھ لیتے ہیں۔ لیکن وہ نہ مانتے اور اگر میں کوئی لفظ یا فقرہ بدل دیتا تو ایسے ممنون ہوتے کہ خود مجھے شرمندگی ہونے لگتی۔ پھر فیض صاحب کے تعلق سے وہ راتیں یاد آتی ہیں جب فیض ہی نہیں بخاری، سالک، خلیفہ عبدالحکیم وغیرہ ہم سبھی ہم پیالہ و ہم نوالہ دوست راوی کے کنارے ٹہلتے رہتے۔ اور ساتھ ہی ساتھ علم و ادب کی باتیں بھی ہوتی رہتیں۔ یہ حضرات مختلف زاویوں سے سوال کرتے اور یہ بندہ اپنی فہم کے مطابق جواب دے کر ان کو مطمئن کر دیتا۔ اور یہ بات تو نسبتاً حال کی ہے کہ ایک روز فیض صاحب نے صبح صبح مجھے آن پکڑا۔ اور کہا ایک کام سے آیا ہوں ایک تو یہ جاننا چاہتا ہوں کہ یورپ میں آجکل آرٹ کے کیا رجحانات ہیں۔ اور آرٹ پیپر کیا چیز ہوتی ہے"۔ دوسرے میں واٹر کلر اور آئل پینٹنگ کا فرق معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ ٹھمری اور دادرا کا فرق بھی چند لفظوں میں بیان کر دیں تو اور اچھا ہے"۔ میں نے چائے پیتے پیتے سب کچھ عرض کر دیا۔ اٹھتے اٹھتے پوچھنے لگے"۔ ایک اور سوال ہے۔ غالب کس زمانے کا شاعر تھا۔ اور کس زبان میں لکھتا تھا۔" وہ بھی میں نے بتایا۔ اس کے کئی ماہ بعد تک ملاقات نہ ہوئی۔ ہاں اخبار میں پڑھا کہ لاہور میں آرٹ کونسل کے ڈائرکٹر ہو گئے ہیں۔

اکثر لوگوں کو تعجب ہوتا ہے کہ نقش فریادی کا رنگ کلام اور ہے اور فیض صاحب کے بعد کے مجموعوں دست صبا اور زنداں نامہ کا اور۔ اب چونکہ اس کا پس منظر راز نہیں رہا۔ اور بعض حلقوں میں بات پھیل گئی ہے۔ لہٰذا اسے چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ فیض صاحب جب جیل گئے ہیں تو ویسے تو ان کو زیادہ تکلیف نہیں ہوئی لیکن کاغذ قلم ان کو نہیں دیتے تھے۔ اور نہ شعر لکھنے کی اجازت تھی۔ مقصد اس کا یہ تھا کہ ان کی آتش نوائی پر قدغن رہے اور لوگ انہیں بھول بھال جائیں۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں تدبیر کند بندہ تقدیر کند خندہ۔ فیض صاحب جیل سے باہر آئے تو تانگہ لے کر سیدھے میرے پاس تشریف لائے، اور ادھر ادھر کی باتوں کے بعد کہنے لگے۔" اور تو سب ٹھیک ہے۔ لیکن سوچتا ہوں میرے ادبی مستقبل کا اب کیا ہوگا؟" میں نے مسکراتے ہوئے میز کی دراز میں سے کچھ مسودے نکالے اور کہا یہ میری طرف سے نذر ہیں۔ پڑھتے جاتے تھے اور حیران ہوتے جاتے تھے۔ فرمایا۔" بالکل یہی جذبات میرے دل میں آتے تھے۔ لیکن ان کو قلم بند نہ کر سکتا تھا۔ آپ نے اس خوبصورتی سے نالے کو پابند نَے کیا ہے کہ مجھے اپنا ہی کلام معلوم ہوتا ہے۔" میں نے کہا "عزیزمن۔ بنی آدم اعضائے یک دیگرند۔ تم پر جیل میں جو گزرتی تھی اسے میں یہاں بیٹھے بیٹھے محسوس کر لیتا تھا۔ ورتہ من آنم کہ من دانم۔ بہرحال اب اس کلام کو اپنا ہی سمجھو۔ بلکہ اس میں میں نے تخلص بھی تمہارا ہی باندھا ہے۔ اور ہاں نام بھی میں تجویز کئے دیتا ہوں۔ آدھے کلام کو دستِ صبا کے نام سے شائع کرو۔ اور آدھے کو زنداں نامہ کا نام دو۔" اس پر بھی ان کو تامل رہا۔ بولے۔"یہ برا لگتا ہے کہ ایسا کلام جس پہ ایک محبِ صادق نے اپنا خونِ جگر ٹپکایا ہو اپنے نام سے منسوب کروں۔" میں نے کہا "فیض میاں! دنیا میں چراغ سے چراغ جلتا آیا ہے۔ شیکسپیر بھی تو کسی سے لکھوایا ہی کرتا تھا۔ اس سے اس کی عظمت میں کیا فرق آیا۔" اس پہ لاجواب ہو گئے اور رقت طاری ہو گئی۔

فیض صاحب میں ایک اور بات میں نے دیکھی وہ بڑے ظرف کے آدمی ہیں۔ ایک طرف تو انہوں نے کسی پر بھی یہ راز افشا نہ کیا کہ یہ مجموعے ان کا نتیجۂ فکر نہیں دوسری طرف جب لینن انعام لیکر آئے تو تمغہ اور آدھے روبل میرے سامنے ڈھیر کر دیئے کہ اس کے اصل حقدار آپ ہیں۔ اس طرح کے اور بہت سے واقعات ہیں جنہیں بیان کرنے بیٹھوں تو کتاب ہو جائے لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا حاسدانِ بد بیں سے مفر نہیں اسلئے کنج خمول میں پڑا رہتا ہوں۔ یہ بھی صہبا صاحب کا کمال سمجھئے کہ اصرار کر کے یہ چند سطور مجھ سے لکھوالیں۔

کوثر چاندپوری

میرے دریچے میں

اندر گہری تاریکی اور خاموشی تھی اور باہر ایک بھیانک سناٹا۔ ماحول پر مکمل سکوت طاری تھا جس کے نیچے طوفان کروٹیں لیتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے ابھی ابھی اخبار فرش پر ڈال دیا تھا۔ وہ ان لمبے چوڑے اداریوں سے اکتا گیا تھا جو دو رنگی باتوں سے بھرے ہوتے تھے ایک طرف مظلوم کے حلق سے چیخیں بلند کرتے تھے۔ دوسری طرف مصلحت اندیشی کا لبادہ اوڑھ کر ظلم کا جواز اور ظالم کی نیک نیتی ثابت کرنے کے لیے دلائل پیش کرتے تھے، وہ چاہتا تھا بات دو ٹوک ہو یا تو دار و رسن کا وجود ہی نہ رہے اور زندگی سارے بندھنوں سے آزاد ہو کر مسرت کا ایک دل افروز نغمہ بن جائے، یا پھر جیل کی یہ کوٹھری جس میں وہ مقید ہے اور اس جیسے ہزاروں آدمی بند ہیں۔ اتنی پھیل جائے کہ پوری کائنات اس میں سما جائے یوں جسے وہ اپنی دنیا کہتا اور سمجھتا تھا اسے اب بھی ایک وسیع و عریض جیل خانہ ہی کہا جا سکتا تھا جس میں بات کرنے کی آزادی نہ تھی اور محبت پابند سلاسل تھی اسی وجہ سے وہ دورخی اور مصلحت آمیز تحریروں سے بہت زیادہ چڑنے لگا تھا۔ حالانکہ چڑنا اور جھنجھلانا اس کی عادت میں نہ تھا۔ اخبار پھینک کر وہ اس گھٹا ٹوپ اندھیرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس میں کوئی ایسی کرن ڈھونڈ رہا تھا جس میں صبح کا نور ہو ——— صبح جو اس کے نزدیک یقینی تھی اور اس شب گزیدہ سحر کے بعد ضرور طلوع ہونے والی تھی جس نے دنیا بھر کو سورج پھیل جانے کا مغالطہ دے رکھا تھا اور ابھی آنے والی اصلی صبح کا تصور کرتے کرتے وہ اپنے نوجوان ساتھیوں کی دائمی جدائی پر آنسو بہانے لگا تھا۔ یہ آنسو رنج کے نہیں تھے۔ غصہ اور بیزاری بھی ان میں نہیں تھی، بس محبت ہی محبت تھی۔ اس میں شک نہیں کہ وہ اپنے ماحول سے بیزار تھا اور خفا بھی اور یکسر اسے بدل ڈالنا چاہتا تھا۔ تلوار کو وہ قلم پر ترجیح نہ دیتا تھا۔ اس نے امن اور تہذیب کی باتیں لکھتے لکھتے اپنی انگلیاں فگار کر ڈالی تھیں۔ اس کے ساتھی اس وقت باہر پھیلی ہوئی تاریکی میں جگہ جگہ سولیوں پر لٹکے نظر آ رہے تھے۔ ان کے کپڑے خون آلود تھے زبانیں باہر نکل آئی تھیں جیسے زندگی کا راگ الاپتے ہی وہ مر گئے ہوں اور مرنے کے بعد بھی چپ رہنا پسند نہ کرتے ہوں، یہی باہر نکلی ہوئی بے جان زبانیں ان کی فریادیں تھیں۔ وہ اپنے ہی خون کی حرارت سے پھر جی اٹھنا چاہتے تھے۔ یہ عزیز اور پرجوش رفیق دس روز قبل ہی گولیوں اور لاٹھیوں کا نشانہ بنے تھے۔ اور ان

کے ساتھ نہ جانے کتنی خوبصورتی اور رعنائی نے دم توڑ دیا تھا۔ انھوں نے ایک درکر کے لیے قتل پر اپنی ناراضی کا اظہار کرنے کی غرض سے جلوس نکالا تھا۔ وہ ہسپتال کے فری وارڈ میں دقت پر آکسیجن نہ ملنے کی وجہ سے مرگیا تھا۔ آکسیجن کا سامان پلنگ کے پاس رکھا تھا صرف ڈاکٹر موجود نہیں تھا۔ اور ڈاکٹر کے قدموں کی آہٹ کانوں میں آنے سے پہلے ہی اس کی روح پرواز کرگئی تھی۔ مزدوروں نے برہم ہو کر بہت بڑا مظاہرہ کیا تھا جہاں ایک نسل اور ایک تہذیب کو قتل کر ڈالا گیا راستہ میں اسے روک کر منتشر ہو جانے کا حکم دیا گیا جس کی تعمیل نہ ہونے پر لاٹھی چارج کیا گیا، پھر آنسو گیس چھوڑی گئی مزدور اس کے بعد بھی میدان میں جمے رہے اور ایک ایک آدمی کے ملنے سے جو بڑا سا قافلہ بن گیا تھا وہ تتر بتر نہ ہوسکا تو قانون کے محافظوں نے اپنی مخصوص اصطلاح میں محض اپنی حفاظت کے لیے گولی چلا دی۔ سب سے پہلے گولی عزیز کی کنپٹی میں لگی وہ ایک دراز قامت نوجوان تھا۔ جس کے فولادی اعصاب میں عزم و استقلال کی بجلیاں کوندتی رہتی تھیں وہ جھنڈا اٹھائے سب سے آگے نعرے لگاتا جا رہا تھا۔ عزیز بے جان ہو کر زمین پر گر پڑا۔ اور جلوس مشتعل ہوگیا۔ اس کی پیش قدمی جاری رہی گولیاں تڑ تڑ چلتی رہیں۔ جمال عزیز کا رازدار دوست آگے بڑھا اس نے دیکھا عزیز کی بے نور آنکھوں میں اپنی محبوبہ کو دیکھنے کا اشتیاق مچل رہا تھا اور کنپٹی سے خون کا فوارہ جاری تھا۔ جمال نے اس کی پیشانی چوم کر جھنڈا پھر اونچا کر دیا اور لمحہ بھر ٹھہر کر کہا۔

"جانتا ہوں دوست تم اپنے ماں باپ کے بڑے لاڈلے تھے تم نے اپنی محبوبہ کو پرسوں ہی خط لکھا تھا۔ تم نے اس سے ایک مہینہ اور انتظار کرنے کی درخواست کی تھی، تم بونس ملنے پر اس سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ وہ بڑی وفادار ہے ضرور اتنے دنوں انتظار کرے گی مگر تم کبھی اپنا وعدہ پورا نہ کرسکو گے، ایک مہینہ کی مدت اس کی ان کالی زلفوں سے بھی طویل ہو جائے گی جو ہجر کی رات سے زیادہ سیاہ اور ریشم سے زیادہ نرم ہیں، میں اسے بتا دوں گا کہ تم نے خود کو اور ہم سب کو زندہ رکھنے کی کوشش میں جان دی ہے تم شہید ہو، غازی بننا تمہاری توہین تھی اس لئے تم گولی کھا کر مر گئے۔"

جمال اپنے نام سے زیادہ خوبصورت تھا۔ وہ نازک اندام اور ذکی الحس بھی تھا اس کی تقریر میں جادو تھا وہ اپنے دوست کا منہ چوم کر سیدھا کھڑا بھی نہ ہوا تھا کہ ایک سنسناتی ہوئی گولی نے سینہ کو برما ڈالا۔ اس نے فوراً ہی جان دیدی ——— پھر ایک پتلا دبلا، دھان پان لڑکا بجلی کی سی تیزی کے ساتھ جمال کی جگہ آگیا۔ وہ موت کو للکار کر کہہ دینا چاہتا تھا۔ ہم مریں گے نہیں، زندہ رہیں گے، اس کا چھریرا اور نازک سا بدن ایک ایسی شاخ گل کے مشابہ تھا۔ جو کلیوں کے بوجھ ہی سے۔ دہرا ہو جاتی ہے۔ گولی نمانا اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ اس کے تعاقب میں چل چکی تھی۔ وہ پھانسی کے اس مجرم کی طرح جو سولی تک پہنچتے پہنچتے ہی ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ تیورا کر گرا اور سب نے نہایت حیرت کے ساتھ دیکھا کہ جہاں ارمان کی لاش پڑی تھی وہاں ایک بیڈی ورکر نسرین کھڑی مرت سے آنکھیں چار کر رہی تھی۔ وہ اپنے سفید دودھیا لباس میں بادل کا شفاف ٹکڑا معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے گلے میں بندھا رنگین رومال بادل کے درمیان دھنک کی مانند لہرا رہا تھا۔ نسرین کے متعلق ارمان کہا کرتا تھا کہ وہ نسیم کے نرم و نازک جھونکے کی طرح اٹھلاتی اور بہکتی میرے قریب سے گذر جاتی ہے تو نہ جانے دل و دماغ میں آرزوؤں کے کتنے آبشار پھوٹ پڑتے ہیں۔ لیکن اس وقت نسرین اس

ی لاش کے پاس ہی کھڑی تھی اور دل یا دماغ کے سارے آبشار سوکھے پڑے تھے۔ اس کا منہ بند تھا اور زخم کے لبوں پر خون کی بوندوں نے مہر لگا دی تھی۔ اس میں بہنے کی سکت نہ پا کر نسرین رو پڑی۔ اسے اپنی زندگی پانی کا ایک بلبلہ معلوم ہوئی وہ سوچنے لگی۔

کیا میں اکیلی اسے اٹھا سکوں گی ؟

وہ سوچ کر رہ گئی۔ ادھر بادل کا شفاف ٹکڑا آشیانہ کی سمت پرواز کرتے ہوئے پیاسے لکھے کی مانند اڑتے اڑتے نہ جانے کہاں غائب ہوگیا۔ اور اسی وقت وہ چند پرجوش نوجوانوں کے جھرمٹ میں بندوقوں کے سامنے آگیا۔ اور جیب سے کاغذ نکال کر زندہ ہوئے، مگر مردانہ لہجہ میں فیض کی نظم دریچے پڑھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں رلانے والی گیس کی دھند تھی۔ اور اس کے پیچھے شعلوں کی زبانیں لپک رہی تھیں۔ ابھی وہ نظم پوری نہ کر پایا تھا کہ اسے زبردستی اٹھا کر موٹر میں ڈال دیا گیا۔ اس نے بہت کہا میں اپنے ساتھیوں کو چھوڑنا نہیں چاہتا سب کے ساتھ مرنا چاہتا ہوں۔ ہمارے خون سے گل و لالہ میں رنگینی آئے گی۔ لیکن اس کی بات کسی نے نہ سنی —— اور اب وہ جیل میں بند ہے۔ جس کی دیواریں بہت اونچی ہیں۔ ان کے اوپر کنگورے ہیں جیسے کسی کے مضبوط جبڑوں میں دانتوں کی نوکیلی قطاریں ہوں وہ ان دانتوں میں ایک کڑوے لقمہ کی طرح دبا ہوا تھا۔ ذائقہ اچھا نہ تھا پھر بھی مضبوط جبڑے اسے چبا ڈالنا چاہتے تھے۔ بار بار وہ ان گھٹتی ہوئی دیواروں کی طرف بڑھنے کا ارادہ کرتا تھا تاکہ انہیں بھی بوسیدہ روایات کی طرح اپنے قلم سے توڑ ڈالے۔

عزیز۔ جمال، ارمان اور نسرین کے لاشے اس کے ذہن پر یوں تیر رہے تھے۔ جیسے آسمان کی بیکراں وسعتوں میں برابر برابر چار سفید کبوتر اڑ رہے ہوں۔ جن کے پر دل میں امن اور دوستی کے پیغام بندھے ہوں۔ وہ ان چاروں کی تعلق سوچتا رہا۔ ان دلکش اور حسین اور جوان چہروں پر مرنے کے بعد بھی زندگی کے گیت مچل رہے تھے۔ اسی لمحہ آہنی سلاخوں کے اس پار بھیانک تاریکی اور خاموشی چھائی تھی۔ اسے کچھ صلیبیں سی کھڑی دکھائی دیں۔ اس نے سوچا شاید ان سلاخوں کا سایہ ہو مگر جیل اندھیرے میں سائے کا وجود ناممکن ہے۔ وہ صلیبیں ہی تھیں۔ ان کا سلاخوں سے الگ اپنا وجود تھا۔ ان پر اس کے ساتھی تھے۔ عیسیٰ کی داستان غم دہرا رہے تھے، جیسے یہ چاروں اپنے وقت کے مسیح ہوں۔ اس نے چیخ کر کہا۔

"تم مرے نہیں ہو ساتھیو، اس قربانی کے بعد بھی تمہاری روح زندہ اور پائندہ ہے جس مقصد کے لیے تم نے گولیاں کھائیں اور منصور کی طرح اٹھلاتے ہوئے دار و رسن کی جانب چلے۔ وہ کبھی مر نہیں سکتا۔ وہ پھولوں کی مہک اور رنگینی میں مسکراتا رہے گا —— زندگی ابدی ہے وہ مہر و ماہ کی تابانی میں ہمیشہ رقص کرتی رہے گی اور پہاڑی جھرنے کی مانند آگے بڑھتی جائے گی" وہ بھیگی ہوئی آنکھیں جو ابھی ابھی اندھیری فضا میں بھٹک رہی تھیں ایک دم لال ہوگئیں۔ جیسے ان سے مرنے والوں کا خون ٹپکنے والا ہو۔ ان میں شعلے سے چلنے لگے وہ ان موٹی اور سولی نما سلاخوں سے خوب بھڑ کر کھڑا ہوگیا جن کے آگے گھپ اندھیرا اور خلا تھا اور پیچھے گھٹتی ہوئی وہ تنگ و تاریک کوٹھری تھی جس میں اسے بند کر دیا گیا تھا۔ اسے سینہ میں دل بہت زور سے دھڑکتا محسوس ہوا اور سانس میں تیزی آگئی۔ خلا میں جگہ جگہ ابھری صلیبیں لمحہ بہ لمحہ قریب آتی جا رہی تھیں۔ ان میں سے ایک میں ہر کا ٹکڑا عاشق کے گریبان کی طرح الجھا پھڑ پھڑاتا محسوس ہو رہا تھا گویا

کوئی اس کا گلا گھونٹ رہا ہے۔ دوسری ایک خوبصورت چہرہ یوں بنا ہوا تھا۔ جیسے چاند بہت اونچی کھجور کے پتوں میں اٹک کر رہ گیا ہو ایک صلیب پر ایک نوجوان لچکتی ہوئی شاخ گل کی مانند جھول رہا تھا۔ ایک دو ایسی تھیں جنہیں رات کی رانی کی مہک میں بسی مست ہوائیں بڑے اشتیاق کے ساتھ چوم رہی تھیں۔ جیسے وہ خود ان پہ لٹک جانا چاہتی ہوں۔ اچانک ایسا لگا جیسے عزیز، جمال، ارمان اور نسرین خون آلود کپڑے پہنے سلاخوں کے دریچوں سے اندر آنے کی کوشش کر رہے ہیں وہ بے اختیار بول اٹھا۔

"آؤ رک کیوں گئے ...؟

تم تو روز آنے والے مہمان ہو۔

تم کس روز یہ خونی لباس پہنے میرے پاس نہیں آتے ؟"

جلدی ہی کسی نے ان شہیدوں کو بہت اونچا اٹھا لیا وہ حیران ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ تاریکی میں اسے کچھ سجھائی نہ دے رہا تھا۔ جیسے آنسو گیس نے اس کی نگاہیں بیکار کر دی ہوں۔ جیل کی اونچی دیواریں چٹانوں کی مانند سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا اس کے ساتھی اوپر جا کر ان چٹانوں کو ریزہ ریزہ کر ڈالیں گے۔ ان کے جسموں میں فرہاد کی روح سما گئی ہے، اور پھر کانوں میں تیشہ چلنے کی آوازیں بھی آنے لگیں۔ اس نے بھی ہاتھ آگے کی طرف بڑھا دیئے تاکہ اندھیرے میں چمکتی ہوئی ان لال لال صلیبوں کو اکھاڑ کر پھینک دے۔ جو حسین اور ٹھنڈی لاشوں کو منہ میں دبائے کھڑی ہیں جب تک یہ کھڑی رہیں گی چاند کی تابانی اور سورج کی درخشانی میں اضافہ نہ ہوگا اور نسیم کے جھونکے پوری شوخی اور روانی کے ساتھ نہ چل سکیں گے۔ اس کی انگلیاں ٹھنڈی اور موٹی آہنی سلاخوں میں الجھ کر رہ گئیں اور وہ انہیں پوری طاقت سے کھینچنے لگا۔ ہوا تیز ہوگئی۔ اور سائیں سائیں کرنے لگی۔ دور کوئی آبشار بہہ رہا تھا اور اس کی سہانی آواز میں موسیقی میں ڈھل کر اس کے دھڑکتے ہوئے دل سے جیسے کہہ رہی ہوں۔ ان مقتولوں کے خون کی سرخی اس تاریکی میں اجالا بن کے نمودار ہونے والی ہے وہ کائنات کے ہر رنگ کو بدل ڈالے گی!

آج کل ہمارے ہاں یہ نیا رواج چلا ہے کہ ہمارے گھریلو ادب میں جو کچھ اچھائی برائی ہے سب انگریزی کے سر منڈھ دی جاتی ہے گویا ہمارے ادیب تو محض کاٹھ کے اُلو ہیں۔ ادھر انگریزی میں ایک خبر چھپی ادھر ہمارے ادیبوں نے اندھا دھند نقل کر دی۔ اپنے ادیبوں کے متعلق میری رائے اتنی گھٹیا نہیں ہے، میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ وہ جو کچھ لکھتے ہیں، بیشتر اپنے حالات سے متاثر ہو کر لکھتے ہیں۔ انگریزی زبان اور انگریزی ادب ہمارے ماحول کا ایک حصہ ضرور ہیں پورا ماحول نہیں ہے۔

فیض

یونس رمزی

نثار میں تیری گلیوں پہ

یہ پتھر کا مجسمہ اپنی خون آشام آنکھوں سے مجھے کیوں گھور رہا ہے؟ کون ہو تم؟ تمہارے ہاتھ میں یہ تلوار کیسی ہے؟ گھوڑے کی برق رفتاری پتھر میں منجمد ہو کر بھی زندگی سے کس قدر بھرپور ہے۔ میں اکثر اسکول جاتے جاتے رک کیوں جاتا ہوں۔ سارے بچے ہنستے کھیلتے پانی کی ریشمی لہر کی طرح گزر جاتے ہیں لیکن میرے قدم جم سے جاتے ہیں میرے اردگرد کی تمام چیزیں جم جاتی ہیں۔ اور میں حیرت سے پتھر کے پس منظر کا خود بھی ایک حصہ بن جاتا ہوں۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ یہ گھوڑے سوار کون ہے؟

وقت کی بیکراں لہروں میں میری روح جھول رہی ہے ——— میرے اردگرد کھلی آنکھوں والی خوبصورت سیپیاں ہیں۔ مگر تجسس نے میری آنکھوں کو وہ روشنی بخشدی ہے جسکے آگے سیپیوں کی خوبصورت آنکھیں ماند ہیں ——— میری آنکھوں کی سیپیوں کو یہ لہریں اپنے اندر جذب نہیں کر سکتیں، ———

اب میں جان گیا ہوں کہ وہ مجسمہ انگریز جرنیل کا ہے ——— میرے ہاتھ میں ملٹن کی "لاسٹ پیراڈائز" ہے۔

میں مجسمہ کے سامنے کھڑا ہوں۔ میرے ہونٹوں پر ایک استہزائیہ مسکراہٹ ہے۔ میں اپنی اس مسکراہٹ کو پہچانتا ہوں۔ میرے قریب سے ابھی ابھی ایک انگریز عورت گذری ہے۔ اس کی مسکراہٹ میں آلپس اور یورال کے برف کی سی ٹھنڈک تھی ——— وہ اب کلب کے احاطہ میں بھی داخل ہو چکی ہوگی۔ مگر میں اب تک سوچ رہا ہوں کہ مادام کی پیشانی پر طلوع ہونے والے آفتاب کے متعلق اس کے رخساروں پر پھولی ہوئی شفق کے متعلق جو دل کے آبگینے میں شراب بن کے اتر جاتی ہے صحت مند ہونٹوں کی مسکراہٹ کے متعلق جو معاشی خوشحالی کی چاندنی میں دھل کر کتنی صاف اور شفاف نظر آتی ہے۔ اس ہنسی اور مسکراہٹ کے پس منظر میں دھنواں اگلتے ہوئے آہن و فولاد کے کارخانے ہیں جو مشین بناتے ہیں مشین کے پرزے بناتے ہیں۔ اور پھر یہی مشین دنیا کے انسانوں کے لئے روٹیاں ڈھالتی ہے۔ روٹیاں خون پیدا کرتی ہیں۔ پھر یہ خون کارخانوں میں جلتا ہے، اور جل کر سونا بن جاتا ہے۔ قومی دولت میں اضافہ کرتا ہے۔ ملک کو ترقی یافتہ بناتا ہے۔ پس ماندہ ملکوں پر حکومت کرتا ہے تجارتی منڈیاں پیدا کرتا ہے۔ کالے پیلے انسان کے لئے راہ نجات پیدا کرتا ہے۔ ان کے کلچر ان کی تہذیب، ان کی ثقافت، ان کی تاریخ کے ورثہ کو ناکارہ اور بیہودہ قرار دیتا ہے مشین ایج (Machine age)! بہت دیر سے میں یہی سوچ رہا ہوں۔

میرے سامنے سے پابجولاں انسانوں کا کارواں گزر رہا ہے۔ ان کے زخم ستاروں کی طرح چمک رہے ہیں۔ میں مجسمہ کے سامنے ہنوز کھڑا ہوں۔

سوچتا ہوں آزادی کتنی بڑی نعمت ہے۔ شام کا اندھیرا دھیرے دھیرے پھیل رہا ہے۔ ــــــــــ اور مجھے سمیر کی سرگوشی سنائی دے رہی ہے۔ آزادی پست حوصلہ اقوام کی قسمت نہیں ہے۔ آزادی صرف ہمارا حصہ ہے۔ اور ان کا حصہ ہے جنکے ہاتھ میں تلوار ہے۔ اور جن کی صبح کا ایک سرا دوسرے سرے سے جا ملتا ہے ہم نوآبادیات کے آقا ہیں۔ نوآبادیات کے لوگ، ان کے مسائل، ان کے مزدور، ان کی عورتوں کی عصمت، ان کی زندگی، ان کی شہ رگ، ان کا خون، ان کی موت، ان کی خوشی پر برطانیہ کی مہر ثبت ہے۔ تمہارا ملک بھی ہماری ایک کالونی ہے۔ برطانیہ کی جھولی میں رنگ برنگے پھول ہیں ــــ رنگ رنگ کے انسان ہیں۔ رنگ رنگ کے تماشے ہیں۔ اور یہ رنگ اور پھول انھوں نے سمندروں کی نیلی چھاتی کو چیر کر حاصل کیا ہے۔ جاہل اور بربریت پسند انسانوں سے ٹکر لے کر حاصل کیا ہے۔ ان پر فتح پائی ہے، اور تب کنکر بیچ کر ہیرا خریدا ہے۔ اپنے بدکیڈ بیچ کر غلام خریدے ہیں۔ غلاموں کی تجارت کی ہے۔ ان کے لہو سے چراغ جلا کر اپنے دلوں کے اندھیرے دور کیے ہیں۔ کھیتوں کو لہلہایا ہے۔ اور پھر تجارت کے ذریعے برطانیہ کو برطانیہ عظمیٰ بنایا ہے۔ برطانیہ اپنے Mercantilist age کا مشکور ہے جس نے برطانیہ کے خزانے ہیرے اور جواہرات سے بھر دیے تھے۔ اور پھر ان خزانوں پر ہمیشہ کے لیے مہر لگا دی تھی۔ قومی دولت کے معنی کو بدل دیا تھا، جو تاریخ میں بند ہو کر اب طالب علموں کے کام آتی ہے۔ اور آج برطانیہ کی حکومت ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک پھیلی ہوئی ہے۔

برطانیہ اپنے تجارتی دور کا ممنونِ احسان ہے۔ اپنے مدبروں، معاشیات کے ماہروں اور سیاست دانوں کا ممنونِ کرم ہے۔ یہ رنگا رنگ پھول انھیں کی یادگار ہیں۔ اور یادگار چیزیں کبھی ضائع نہیں کی جاتیں۔ بلکہ ان کو محفوظ رکھا جاتا ہے۔ نوآبادیات کے لوگ جاہل ہیں، وہ برطانیہ کی عظمت کے قائل نہیں۔

اور اس تقریر کے جواب میں میں مسکرا رہا ہوں ــــــــ تم مجھے محکوم سمجھا کرو ــــ میری روح آزاد ہے۔ ــــــ تم اسے مقید نہ کر سکو گے ــــ" یہ محض چند روز کی باتیں ہیں۔ روح کو محبوس سمجھا کرو۔ میرے احساس پر ہزار تعزیریں سہی۔ لیکن انسان کی زندگی کسی مفلس کی قبا نہیں ہے جس میں درد کے پیوند لگتے ہی رہیں۔ اگر زندگی باقی ہے۔ تو تم دیکھنا ہم ایسے ہرگز زندہ نہیں رہیں گے ــــ یہی بات میں اپنی محبوبہ کو سمجھاتا ہوں۔ مگر وہ سمجھتی ہی نہیں ہے۔"

میرے اردگرد پھیلی ہوئی دنیا کتنی حسین ہے۔ چمکتے دریاؤں کے آبگینے۔ لہلہاتے ہوئے کھیت جیسے کوئی حسین خیال خوابیدہ ہو گاتے ہوئے سرخ لب، یہ گیت کتنے آزاد ہیں۔ انھیں کون محکوم کر سکتا ہے۔ سماعت سے نزدیک، سماعت سے بے پروا۔ موتر اور گہری یہ آواز بڑی لازوال ہے۔ کتنے ہی حریت پسندوں کے سینہ میں بندوق کی سلگتی ہوئی گولیاں ٹھنڈی ہو گئیں۔ کتنی ہی مخملیں پلکیں ہمیشہ کے لیے بند ہو گئیں۔ خوبصورت ہونٹوں پر موت کی مہر لگ گئی۔ لیکن آواز تو جھرنوں کی ترل ترل ہے جو ابد کا راگ ہے۔ جو یادوں کے ساحل سے ٹکراتی رہتی ہے۔ آواز کا سفر لازوال ہے۔ وہ خلا میں بھٹکتی رہتی ہے۔ ہمارے گیت تو حسین ہونٹوں کا بوسہ ہیں۔ آنکھوں کی وہ چمک ہے جو پیار کے پہلے احساس پر بہت چپکے سے جاگ اٹھتی ہے۔ شمع کی کانپتی ہوئی لو ہے۔ ایک خوشبو ہے۔ آوارہ سی ہلکی ہلکی اچھل پاتھل۔ ایک چھپا ہوا لذت آگیں احساس ہے۔

میں انھیں ہونٹوں کے لیے گیت لکھتا ہوں اور لکھتا رہوں گا۔ مگر یہ ہراسانی کیسی ہے؟ آنکھوں سے جھانکتی سراسیمگی کیسی ہے، سارے لوگ کھوئے کھوئے سے لگتے ہیں۔

یہ کس کی تلاش ہے؟

شاید آزادی کی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں آزادی بڑی نعمت ہے۔ جنگ کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ طیاروں کی گڑگڑاہٹ دلوں

میں اتر گئی ہے۔ میں نے بھی یونیفارم پہن لیا ہے۔ جس پر امتیازی نشان لگے ہوئے ہیں۔ میں بھی فسطائی طاقتوں کے آگے سینہ سپر ہوں۔ میں انھیں آگے نہیں بڑھنے دوں گا ـــــــ اور اس جنگ کے بدلے ہم نے آزادی کی شرط ٹھہرائی ہے ۔۔۔۔۔۔۔ ہم رسم وفا نبھانے نکلے ہیں۔
ہم ایشیا کے کالے پیلے لوگ ہمیشہ سے رسم وفا نبھاتے آئے ہیں۔ ہم نے اپنے مہمانوں کو سینے سے لگایا ہے۔ ان کی نیند سوئے ہیں ان کی بیداری پر جاگے ہیں۔ ان کے لئے جنگیں بھی لڑی ہیں۔ حتیٰ کہ خود اپنے پیاروں کے گلے کاٹے ہیں اور جشن منایا ہے۔ مگر اب کی بار تو آزادی کی شرط ٹھہری ہے۔ اور ہم سینہ تانے اپنے گھروں سے نکل پڑے ہیں۔

محاذ پر گولیاں چل رہی ہیں۔ خط آرہے ہیں آج یہ مرا۔ کل وہ ـــــــ مرنے والے لوگ تو میرے ہاتھوں کی اپنی انگلیاں ہیں جو روز جدا ہو جاتی ہیں۔ بہت سی سہاگنیں بیوہ ہو گئی ہیں۔ بہت سی جھونپڑیاں، بچکیوں کے زلزلے سے لرزہ خیز ہیں۔ بہت سے ہونٹوں کے گیت خلا کے پیوند بن گئے ہیں۔ بہت سی بوڑھی آنکھوں کے ستارے ڈوب گئے ہیں۔ بہت سی ماؤں کی دعائیں نوید زندگی بنتے بنتے مغفرت کا نوحہ بن گئی ہیں۔ میری آنکھیں جل رہی ہیں۔ ان میں بڑی سوزش ہے۔ سوچ کی تپش اور فکر کی گرمی ـــــــ اور ایسا معلوم ہوتا ہے ساری دنیا اسی تپش اور سوزش میں جھلس رہی ہے۔ مگر میں جانتا ہوں ہماری یہ سوچ سونا ہے جو وقت کی بھٹی میں تپ رہی ہے۔ اور وہاں سے کندن بن کے نکلے گی ـــــــ اس کی چمک دمک بڑی لازوال ہوگی۔

۱۴/ اگست ۱۹۴۷ء ـــــــ یہ آزادی کی صبح ہے۔ کتنی حسین اور یادگار صبح ہے یہ رات کو غلامی کو ابدی نیند آگئی۔ اور ہم جاگ اٹھے ہیں نئے جسم کے لبادہ میں۔ چاروں طرف شور و غل ہے۔

ہاں ہم آزاد ہیں۔ ہمارے لب آزاد ہیں۔ ہمارے جسم آزاد ہیں۔ ہمارے دماغ آزاد ہیں۔
اور میں آزادی کو ڈھونڈنے کھلی سڑکوں پر نکل آیا ہوں۔ مگر ہماری اس آزادی کا سویرا دھواں دھواں سا کیوں ہے؟ یہ پرہول سناٹا کیسا ہے؟ یہ خون میں لتھڑی ہوئی لاشیں کیسی ہیں؟ ہمارے شہر کے در و دیوار پہ یہ خون کی گلکاریاں کیوں ہیں؟ یہ سب کہیں خواب تو نہیں ـــــــ؟

لوگ سہمے سہمے سے کیوں ہیں؟ ان کی زبانیں گنگ ہیں میں سارے شہر میں بھٹکتا پھرا ـــــــ کہیں جواب نہ ملا۔؟ ہاں میرے اپنے وجود نے صرف اتنا ضرور کہا کہ میرے خواب آزادی کی یہ تعبیر تو نہ تھی۔

پھر میں نے سوچا کہ گنگ زبانوں کو اپنی زبان دیدوں ـــــــ میں شاعر ہوں۔ میں اپنے وطن کو اپنی زبان بخش دوں گا۔ میں انھیں آزادی کا مطلب سمجھاؤں گا۔ لیکن میری زبان پر پہرے بٹھا دئے گئے۔

میرے جسم کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا گیا۔ لیکن ہر صبح میں نے یہ محسوس کیا کہ اپنے پیارے وطن کی گلیوں میں نکل آیا ہوں۔ جہاں کنوارے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی چاندنی ہے۔ ماہیا کی تان ہے جس نے دنیا کو خلا میں سنبھال رکھا ہے۔ میں اپنے پیاروں کے درمیان مسکرا رہا ہوں۔ میں ہر صبح کی پہلی کرن ہوں ہر شام کی مانگ میں افشاں ہوں۔

میں نگر نگر گھوم رہا ہوں۔ میرے پاؤں میں کوئی زنجیر نہیں ہے۔ میں اپنے گیت بانٹ رہا ہوں۔ میری تحریر شرمندۂ خامہ نہیں ہے۔ میں خود وقت کی ایک حسین تحریر ہوں۔ جسے سب پڑھ رہے ہیں۔ لوگ جانتے ہیں میں کون ہوں ـــــــ جیل کی یہ دیواریں میرے وجود کو مقید نہیں کر سکتیں۔ میرے ہاتھ جیل سے باہر ہیں۔ میری آواز جیل سے باہر ہے۔ میرے پیروں کے نیچے دھرتی ہے۔ میرے سر پہ

(باقی صفحہ ۷۶۵ پر)

رضیہ فصیح احمد

سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں

یہاں اس نے یہ نئی بات دیکھی۔ ج کی بیگم جب آتیں تو تمام بیگمات کھڑی ہو جاتیں۔ وہ کلب کے دروازے میں داخل ہوتیں۔ آہستہ آہستہ چلتیں اور اپنا موٹا سراپا لئے بمشکل بیٹھتیں تب تک تمام خواتین قریب قریب اٹینشن رہتیں۔ بالکل پریڈ کا سا منظر لگتا نئی ممبر کو ان نئے قاعدے قانونوں کی کچھ خبر نہ تھی۔ پہلی مرتبہ جب ایسا ہوا تو وہ برابر بیٹھی ہوئی خواتین سے شد و مد سے باتیں کر رہی تھی۔ یکایک ایسا لگا جیسے بھونچال آ گیا ہو۔ ریشمی کپڑوں کی سرسراہٹ، کوٹوں کو جھٹکنے کی آواز کرسیاں کھڑکھڑانے کا شور اور اس کی بات پوری سنے بغیر برابر کی کرسی کی صاحبہ اٹھ کھڑی ہوئیں نئی ممبر کی سمجھ میں کچھ نہ آیا بس اس نے دیکھا کہ ایک موٹی سی خاتون سرخ شال جس پر نیلے پھول کڑھے ہوئے ہیں لپیٹے چلی آ رہی ہیں۔ کالے سینڈلوں میں سے ان کے سفید موزے جھانک رہے تھے۔ وہ نزدیک آئیں اور ایک لمحے تک اسے دیکھتی رہیں اس نے نظریں چرالیں اور دوسری طرف دیکھنے لگی۔ وہ اپنی کرسی پر جو عورتوں کے دائرے سے الگ ایک میز کے پاس رکھی تھی۔ براجمان ہو گئیں۔ ان کے بیٹھنے کے بعد عورتیں باری باری یوں بیٹھیں جیسے پریڈ کر کے تھکے ہارے سپاہی اپنی بیرکوں کو واپس لوٹتے ہیں۔ ج کی بیگم شہر کے سب سے بڑے افسر کی بیوی تھیں۔ اس لئے وہ لیڈیز کلب کی پریزیڈنٹ تھیں۔ ان سے چھوٹے افسر کی بیگم کلب کی سکریٹری تھیں۔ جب وہ بیگم کے لئے کھڑی ہوتیں تو ان کا انداز کچھ یوں کہہ رہا تھا "بچو! تھوڑے ہی دن کی بات ہے۔ تم چلی جاؤ گی۔ اور میرے میاں تمہارے میاں کی جگہ لے لیں گے۔ تو یہ سارا قبیلہ میرے اعزاز میں کھڑا ہوا کرے گا؟" مگر باقیوں کے انداز مختلف تھے۔ چند ایک پھرتی سے یوں کھڑی ہوتیں۔ جیسے ان میں اسپرنگ لگ گئے ہوں۔ بعض آہستہ آہستہ دیر سے تاکہ کم سے کم وقت کھڑا رہنا پڑے پہلا گروپ وہ تھا جس پر بیگم ج مہربان تھیں۔ دوسرا گروپ وہ تھا جس پر بیگم ج نامہربان نہیں تھیں مگر مہربان بھی نہیں تھیں۔ اب وہ تیسری قسم بن گئی تھی۔ جو سرے سے کرسی سے اٹھتی ہی نہیں۔

اسے یہ زعم تھا کہ لیڈیز کلب کے مینی فیسٹو میں یہ بات درج تھی کہ کلب کی تمام ممبران برابر ہوں گی۔ اور ان کے میاں کے عہدوں سے ان کا اتنی دیر کوئی تعلق نہ ہوگا۔ اسے پہلی دفعہ یہ سوچ کر نظرانداز کر دیا گیا کہ وہ نئی تھی۔ اور یہاں کی رسم سے واقف نہیں تھی۔ مگر جب دوسری مرتبہ اور تیسری مرتبہ بھی یہی ہوا تو لوگوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا بیگم ک شائد ابھی اور نظرانداز کر جاتیں مگر بیگم د جو آئندہ ان کی جگہ لینے والی تھیں۔ بیگم ی جو ہمیشہ بڑی کرسیوں کو منٹوں میں اپنے قبضہ میں کر لیتی تھیں اور ان اور ہ کی بیگمات جو بیگم ی کے کہنے میں تھیں۔ اتفاق سے ایک ہی دن بیگم ج کے ہاں پہنچیں۔ یہ بات دوسری ہے کہ انہوں نے فون پر

پہلے ہی سے یہ بات طے کر لی تھی۔ بیگم ج کے گھر انھوں نے ان کے نئے کتے سے لے کر طوطوں کے پرانے جوڑے تک کی تعریف کی پھر ان کے چوتھائی صدی پرانی قمیض کے پرنٹ کی تعریف کی۔ اس کے بعد کافی کے ساتھ آنے والی چیزوں کی لذت کو سراہا کافی پینے کے بعد اطمینان سے یہ ذکر چھیڑا کہ نئی ممبر بے انتہا بدتمیز اور بے لحاظ ہے۔ بیگم ج کے کچھ کہنے سے پہلے بیگم د نے بزرگوں کی عزت نہ کرنے کے سلسلے میں لمبا چوڑا خطبہ دیا اور بیگم ج کی ہونے والی جانشین بیگم نے کہا (بیگم ج کی ہونے والی جانشین چونکہ لمبا ٹکڑا ہے اس لئے آئندہ انھیں بیگم جانشین لکھا جائے گا۔) کسی کی عزت کرنے سے کوئی چھوٹا نہیں ہو جاتا بلکہ خود اس کی عزت بڑھ جاتی ہے۔ اب یہی دیکھ لو کہ اس کے کھڑے نہ ہونے سے ہم سب کے دل میں اس کی عزت دو کوڑی کی نہیں رہی ہے —

بیگم ج نے اتنے مہذب سے پر جوش بیانوں میں کچھ زیادہ بنا مناسب نہ سمجھا اور ان سب کی باتوں پر ہنس ہنس کر صاد کرتی رہیں۔

بیگم جانشین نئی ممبر کے ہاں گئیں۔ انھوں نے کہا کہ پہلے وہ خود اس رسم کے خلاف تھیں۔ مگر اب غور کرنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچی ہیں کہ اس میں کوئی عیب نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک طرح سے اچھے اخلاق کا مظاہرہ ہے۔ کہ بزرگوں کے آنے پر کھڑے ہوں۔ نئی ممبر بڑا اکھڑ مزاج ہونے میں اپنی مثال آپ تھی۔ بزرگی کی تعریف پوچھنے لگی۔ اور بولی کہ کلب میں مختلف عمر کی عورتوں کے ہونے کی وجہ سے بزرگیوں کا ایک پورا... سلسلہ ہے۔ میں بھی وہاں بہت سوں کی بزرگ ہوں اور آپ بھی مگر جو عمر میں سب سے بڑی ہوں ان کی تعظیم تو ضروری ہے۔"

"ہاں یہ بات تو ٹھیک ہے۔ یہیں سے چلئے —" نئی ممبر نے بات خوش اسلوبی سے ٹال دی اور جانشین بیگم یہ اثر لے کر لوٹیں۔ کہ انہوں نے جن کو شیشے میں اتار لیا ہے۔ اگلی مرتبہ جان بوجھ کر وہ بیگم ج کے ساتھ آئیں۔ تاکہ انھیں ایک تو خصوصاً اٹھنا پڑے۔ دوسرے عورتیں ان کے اعزاز میں اٹھنے کی بھی عادی ہو جائیں۔ تیسرے وہ نئی ممبر کے کھڑے ہونے کا زیادہ لطف اٹھا سکیں۔ جیسے ہی بیگم ج نے دروازے میں قدم رکھا ساری محفل جو رنگ برنگی ساریوں، تنگ شلوار قمیضوں، خوشبوؤں اور بالوں میں لگے ہوئے پھولوں سے جگمگا رہی تھی اٹھ کھڑی ہوئی مگر نئی ممبر اسی طرح بیٹھی رہی۔ بیگم ج اور بیگم جانشین نے دیکھا کہ اس کے ساتھ کئی اور عورتیں بھی اطمینان سے بیٹھی ہوئی ہیں، ناگواری کی لہر جیسے کڑوی دوا ان کی زبان پر چپٹ گئی ہو۔ ان کے چہرے پر جم گئی ہو۔ بیگم جانشین تو ٹھٹک ہی گئیں۔ ساری کا بیتنی پلو اور پنسل سے بنی ہوئی بھنوؤں کو سمیٹا اور کچھ انگریزی کچھ اردو اور باقی پنجابی میں بڑوں کی عزت و تکریم کو اپنی ملک سیکھنے والیوں کو خوب ہی ترتاڑا۔ کہ آپ کی ایلڈر سسٹر آئیں تو آپ کھڑی نہیں ہوتیں آپ کی مدر آتیں تو آپ ریسپیکٹ نہیں دیتیں۔ آپ کی ماسی اور چاچی تشریف لائیں تو آپ آگے بڑھ کر نہیں ملتیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اسی عمر کی جب آپ کی کوئی بڑی محفل میں آئیں تو آپ کھڑی نہ ہوں۔ صرف اس وجہ سے کہ وہ بیگم ج ہیں۔ ایک بڑے افسر کی بیگم ہیں۔ بڑے افسر کی بیگم ہونا ان کی اتنی بڑی غلطی نہیں کہ آپ ان کو وہ تعظیم بھی نہ دیں جو آپ کی سوسائٹی آپ کا معاشرہ آپ کو سکھاتا ہے۔ سب کو یقین ہو گیا کہ کالج کے زمانے میں مباحثوں میں انعام پانے والی بات جس کا وہ اکثر ذکر کیا کرتی تھیں۔ سرے سے غلط نہیں ہے۔ جب وہ تقریر کر کے بیٹھیں تو تقریباً ساری بیگمات سر ہلا رہی تھیں جو خواتین آج بیٹھی رہ گئی تھیں۔ وہ دل ہی دل میں شرمندہ ہو رہی تھیں۔ فضا مکدر ہو گئی تھی کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کریں اس لئے چائے کا اعلان کر دیا گیا۔ چائے پر ان خواتین نے جو آج پہلی مرتبہ گستاخی کی مرتکب ہوئی تھیں۔ موقع پا کر باری باری بیگم ج سے معذرت کر لی ایک نے کہا کہ وہ پاس والی سے باتوں میں اتنی مشغول تھیں کہ انھوں نے بیگم ج کو آتے ہوئے نہیں دیکھا۔ دوسری نے کہا کہ آج ان کی ٹانگوں میں سخت درد ہے۔ بمشکل کسی کی کار میں یہاں تک پہنچی ہیں۔ اور وہ درد ہے کچھ عجیب قسم کا کہ اگر کھڑی ہوں تو بیٹھا نہیں جاتا اور بیٹھی ہوں تو کھڑا نہیں ہوا جاتا۔ تیسری نے کہا کہ آج ان کے بچے کے ساتھ ایک حادثہ پیش آ گیا ہے۔ وہ اسپتال میں پڑا ہے۔ اس لئے ان کے اعصاب بالکل بے قابو ہیں۔ اور انھیں پتہ ہی نہیں چل رہا کہ ان کے آس پاس کیا ہو رہا ہے۔ وہ اس قدر پریشان ہیں کہ ابھی چائے پیتے ہی واپس چلی جائیں گی۔

بیگم ج اور بیگم جانشین نئی ممبر کے آنے کا انتظار ہی کرتی رہیں۔ مگر وہ دو رکھڑی ایک گروپ میں باتیں کر رہی تھیں۔ اس سے اردگرد کھڑی عورتوں کا مجمع خود بیگم ج اور ان کے جانشین کے آس پاس کھڑی عورتوں سے زیادہ تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اپنا زہریلا اثر برابر ڈال رہی ہے۔ اور جاہل عورتیں اس کی طرف بے تحاشہ کھنچی رہی ہیں۔ بیگم جانشین نے کہا کہ بڑے جو کہہ گئے ہیں کہ لوگ اچھی باتیں مدتوں میں نہیں سیکھتے اور بری باتیں جھٹ اپنا لیتے ہیں۔ اس کی کیسی اچھی صاف ستھری مثال اس وقت ان کے سامنے ہے۔ اس دفعہ کلب پارٹی بھی نہیں بلکہ اچھی خاصی الھڑی الھڑی رہی۔ بیگم ج اور بیگم جانشین کے کپڑے کی تعریف کرنے والیوں کی بھی کمی رہی۔ حد تو یہ ہوئی کہ بیگم جانشین کے تازہ نئے فیشن کے بنے ہوئے کپڑے کا کسی نے نوٹس نہیں لیا۔ حالانکہ وہ پورے وقت بائیں ہاتھ سے سموسہ اٹھا کر کھاتی رہیں۔ اور اسی ہاتھ سے چائے پیتی رہیں۔ تقریر کے دوران بھی وہ بار بار اپنا بایاں ہاتھ ہوا میں اچھال رہی تھیں۔ اس نئی ممبر نے آکر کچھ ہوا ہی بگاڑ دی تھی کلب کی جب وہ واپس بیٹھنے والے کمرے میں جا رہی تھیں تو انھوں نے سنا کہ سیلاب زدگان کے لئے پیسے اور کپڑے جمع کرنے کی کچھ بات ہو رہی ہے۔ جس میں ساری عورتیں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی ہیں۔ بغیر ان سے رائے لئے اس قسم کی باتیں کلب میں پہلی بار ہو رہی تھیں۔ اور ظاہر ہے کہ صرف اس نئے کی جا رہی تھیں کہ کوئی صاحبہ خواہ مخواہ مقبول ہونا چاہتی تھیں۔ اور یہ اسی نئی ممبر کے سوا اور کون ہو سکتا تھا۔ اسی وقت بیگم ج نے بیگم جانشین کو حکم دیا کہ اس قسم کا کوئی ہنگامہ بغیر ان کی اجازت کے نہ کیا جائے۔ اگلے ہفتے وہ غور کر کے خود کچھ اعلان کریں گی۔

اگلے ہفتے کا سب کو بے چینی سے انتظار تھا۔ اسی دوران میں بیگم جانشین ایک مرتبہ پھر نئی ممبر کے گھر گئی تھیں۔ اس سے کہا تھا کہ اگلے ہفتے سیلاب زدگان کے لئے کچھ کام کرنے کا ارادہ ہے۔ اس لئے وہ ضرور آئے۔ چلتے چلتے پھر ایک مرتبہ بزرگوں کی تعظیم و تکریم کے موضوع پر انھوں نے چند جملے کہے تھے۔ جس کا نئی ممبر پر خاطر خواہ اثر ہوا تھا۔ بلکہ خود اس نے کہا تھا کہ ممبران میں جو بہت بڑی اور عمر رسیدہ ہوں۔ بلالحاظ اس کے کہ ان کے میاں کا عہدہ کیا ہے۔ سب کو ان کی عزت کرنی چاہئیے۔ ان کی بات ماننی چاہئیے۔ اور ان ہی کو کلب کی صدارت کا عہدہ سونپنا چاہئیے جن نہ صرف شیشے میں اتر گیا تھا بلکہ انھوں نے اس پر کس کر ڈاٹ بھی لگا دی تھی۔ بس اب اگلے ہفتے اس جن کو بیگم ج کی خدمت میں پیش کرنے کی دیر تھی

نئی ممبر وقت کی بڑی پابند تھی۔ ریڈیز کلب میں دس بجے کا وقت اس کے لئے رکھا جاتا کہ دس ساڑھے دس تک سب اکٹھی ہو جائیں مگر سنا گیا تھا کہ نئی ممبر ٹھیک نو بجے اپنی بائی اور چند رسالے لے کر پہونچ جاتی تھیں۔ اور انھوں نے یہ بھی سنا تھا کہ پچھلے ہفتے چند اور خواتین بھی ٹھیک نو بجے پہونچ گئی تھیں۔ پونے دس بجے بیگم جانشین نے بیگم ج کو فون کیا کہ اگر وہ تیار ہوں تو وہ ان کے گھر پہونچ جائیں۔ تاکہ اکٹھی کلب چلیں۔ بیگم ج نے کہا کہ وہ بالکل تیار ہیں۔ صرف کپڑے بدلنے اور بال بنانے ہیں۔ چنانچہ سوا دس بجے بیگم جانشین نے میاں کو فون کر کے سرکاری گاڑی منگائی۔ اور بیگم ج کے ہاں جا پہونچیں۔ بیگم ج بالکل تیار تھیں۔ صرف بال بنانے اور زیور پہننے باقی تھے۔ ساڑھے دس بجے کے بعد وہ گھر سے نکلیں اور ہنستی ہوئی لمبی کار پانچ منٹ میں کلب پہونچ گئی بیگم ج آگے اور بیگم جانشین ایک قدم پیچھے بڑے رعب سے کلب میں داخل ہوئیں۔ اس دفعہ انھوں نے سوچ رکھا تھا کہ اگر نئی ممبر نے اپنی ضد جاری رکھی تو اگلی مرتبہ وہ ایک ریزولیشن پیش کروا کے اسکو ممبر شپ سے نکلوا دیں گی۔ لیڈیز کلب کے رولز ریگولیشن بنے ہوئے نہیں تھے۔ اس سے ایک فائدہ یہ تھا کہ مناسب قوانین موقع پر ڈھالے جا سکتے تھے۔ ہر قدم پر دونوں کے دل دھڑک رہے تھے۔ زندگی اور موت کی کشمکش نہیں تھی۔ مگر امید و بیم کا ایک عجیب عالم ضرور تھا۔

جس وقت انھوں نے دروازے کے اندر قدم رکھا۔ سب کھڑی ہو گئیں۔ انھوں نے ایسی کرسی دیکھنے کی کوشش کی جہاں کوئی

عورت بیٹھی ہو مگر نہیں سب کھڑی تھیں۔ اطمینان اور خوشی کی لہر دونوں کے چہروں پر دوڑ گئی۔ ایک دم دونوں کے سینے مزید تن گئے اور وہ مسکرا اٹھے۔ بیٹھتے ہوئے دونوں نے آس پاس والیوں سے خیر و عافیت پوچھی۔ پھر باری باری سب پر نظر ڈالی۔ نئی ممبران میں نہیں تھی۔

——— تو آج وہ ہار کر میدان چھوڑ گئی تھی۔ اس میں خوشی کی بات تو تھی مگر ایک دکھ بھی تھا۔ کچھ اس قسم کا جو بادشاہوں کو اس دشمن کو ہرا کر ہوتا ہوگا جو میدان چھوڑ کر بھاگ تو گیا۔ مگر پابہ زنجیر ان کے سامنے حاضر نہ کیا جا سکا۔ اگر آج وہ ان عورتوں میں کھڑی ہوتی تو ان کی کامیابی مکمل اور خوشی بھرپور ہوتی۔ بیگم ج نے بھی یہ سب دیکھا اور محسوس کیا مگر اس وقت کچھ نہ کہا۔ باتیں شروع ہو گئیں۔ بیگم جانشین نے کہا کہ سیلاب زدگان کے لئے ہمیں ضرور کچھ کرنا چاہئے۔ اس کے لئے بیگم ج کی تجویز یہ ہے کہ ہم سب اپنے گھروں سے بے کار گرم اور ٹھنڈے کپڑے اور جوتے لا کر اکٹھے کریں۔ ان کے پارسل بنائیں اور پھر ان کو بیگم ج اور ان کے ساتھ دو ایک اور بیگم مل کر یہ پارسل منسٹر کے حوالے کر آئیں۔ سب عورتوں نے اس رائے سے اتفاق کیا۔ اور بیگم ج نے خوشی اور اطمینان سے پہلو بدلا۔ عین اسی وقت کیا دیکھتی ہیں کہ کلب کے دروازے سے نئی ممبر ایک اور صاحبہ کے ساتھ اندر داخل ہو رہی ہیں۔ دوسری صاحبہ سفید دودھ ایسی ساڑی میں ملبوس تھیں۔ ایسا ہی ان کا بلاؤز اور جھاگ جیسے سفید ہی ان کے بال تھے۔ وہ بڑی بردباری سے چل رہی تھیں ایک قدم پیچھے نئی ممبر تھی۔ سب کی نظریں ان پر جمی ہوئی تھیں۔ بڑی عمر کی خاتون کو چند ایک عورتیں جانتی تھیں۔ چند نہیں جانتی تھیں۔ وہ بیگم ج کے میاں کے دفتر میں کام کرنے والے ایک معمولی کلرک کی بیوی تھیں۔ جب وہ دونوں اندر آئیں تو آپس کی بات چیت بالکل بند ہو چکی تھی۔ اور سب ان کو اس طرح دیکھ رہی تھیں۔ جیسے اب کوئی تعجب خیز واقعہ ظہور میں آنے والا ہے۔ مگر کوئی بات ایسی نہیں ہوئی۔ نئی ممبر کے ساتھ آنے والی خاتون نے اندر آ کر السلام علیکم کہا۔ نئی ممبر نے بھی سلام کیا اور بیگم سے کہا "یہ ہمارے کلب کی نئی ممبر بننے آئی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہاں کی تمام ممبران سے بڑی ہیں۔ اس لئے ہمیں ان کے اعزاز میں کھڑا ہونا چاہئے۔ اور بیگم صاحبہ نے بتایا تھا کہ سب سے بڑی خاتون ہی اس کلب کی پریسیڈنٹ ہوتی ہیں۔ آج یہ ممبر بن جائیں تو اگلے ہفتے سے پریسیڈنٹ بھی . . . . ."

"شٹ اپ" بیگم جانشین دھاڑیں "تم بیگم ج کی توہین کر رہی ہو" بیگم ج جواب تک منہ پھاڑے دیکھ رہی تھیں۔ ہوش میں آ گئیں اور ہاتھ چلا کر بولیں: "اس کلرک کی بیوی کے آنے پر کھڑی ہوں، چہ خوب! اور آج کے بعد یہ کلب کی پریسیڈنٹ بنے۔ ہم ہوش ٹھکانے میں تمہارے۔ تمہیں معلوم ہے میرا میاں کون ہے۔ اس شہر کا سب سے بڑا افسر ہے۔ سب سے بڑا"

"ہم نیا آپ نے" نئی ممبر نے دوسری خواتین کی طرف منہ کر کے کہا "سارے فسانے میں جس بات کا ذکر نہیں تھا۔ وہ میں نے آپ کو سنوا دی ہے۔ باقی آپ جانیں آپ کا کام ——— خدا حافظ" ——— کلرک کی بیگم کا ہاتھ پکڑ کر وہ جس راستے سے آئی تھی۔ اسی سے لوٹ گئی ———

دوسرے ہفتے اس سے پہلے کہ بیگم جانشین نئی ممبر کو ممبر شپ سے نکالنے کا نکتہ اٹھاتیں۔ کلب کے چپڑاسی نے ایک لفافہ لا کر دیا۔ بیگم جانشین نے کھول کر پڑھا اور گھبرا کر بیگم ج کی طرف بڑھا دیا۔ یہ نئی ممبر کا لیڈیز کلب کی ممبر شپ سے استعفیٰ تھا۔

مکمل طور پر اچھا شعر وہ ہے جو فن کے معیار
پر بھی، نہیں، زندگی کے معیار پر بھی پورا
اترے۔ ——— فیض

سجاد نظر

تاریک راہوں میں مارے گئے

جتیندر دو گھنٹے سے کھڑکی کے قریب کھڑا تھا۔ اور یہ دو گھنٹے پگھل کر کھڑکی سے نیچے گر گئے تھے اور گرگر دوپہر بن گئے تھے لمبی اکیلی دوپہر جو بیچ سڑک پر بے حیائی سے پڑی ہانپ رہی تھی۔ اس نے دیکھا کہ بہت دور ٹوٹی پھوٹی بدصورت کوٹھیوں کے پیچھے گھنے درختوں سے پتے ٹوٹ کر ہوا میں اُڑ رہے تھے اور یوں لگ رہے تھے جیسے بہت سی مردہ تتلیاں ہوں۔ تتلیاں جو دوپہر کی زردی پی کر مر گئی تھیں۔ سڑک پر ہوا اور دھول کا ایک بہت بڑا بھنور گھوم رہا تھا جس کے بیچ بس کا ایک ٹکٹ اور ماچس کی چند تیلیاں بے بسی سے پھڑپھڑا رہی تھیں۔ جتیندر نے جھک کر دیکھا

اس بے بسی کا کیا اپائے ہے؟

کہاں ہے وہ سفر جو اس ٹکٹ کو بے منزل کر گیا؟

اور کہاں ہے وہ شعلہ جو ان تیلیوں کو جلا گیا؟

اس بھنور کا کیا اپائے ہے؟

اس کا جی چاہا کہ وہ اس ننگی دوپہر کی کمر میں ہاتھ ڈال دے اور اسے ساتھ لیکر کہیں دور کسی لمبے سفر پر چلا جائے۔ اور اس سرحد پر کھڑے ہوکر بارش کا انتظار کرے۔ جہاں بادل کبھی نہیں آتے ـــــــ اس نے بے دھیانی میں کھڑکی کی سلاخوں پر ہاتھ پھیرا اور وہ ساری کی ساری سلاخیں یکایک جیسے موت کی ہچکیوں سے بھر اٹھیں۔ جتیندر نے چونک کر دیکھا۔ ان سلاخوں سے خون کی بو آرہی تھی۔ اس نے پھر بڑے پیار سے پہلی سلاخ پر اپنا ہاتھ رکھا اور اس کی آنکھوں تلے اکھڑی ہوئی سانسوں کا دھواں چھا گیا۔ نیچے جہاں تک دوپہر پھیلی ہوئی تھی وہاں تک سڑک ریگستان بن گئی اور اس کے ہاتھوں سے سلاخ پھسل کر ایک صلیب بن کر ریگستان کے بیچوں بیچ جا کر گر گئی۔ اس نے دیکھا صلیب پر مائیکل اسمتھ لٹکا تھا۔

جتیندر نے گھبرا کر آنکھیں بند کرلیں۔ یہ کس کا چہرہ تھا؟ وہ ایک ایک کو یاد کرنے لگا اور اس کے سامنے چہروں کی ایک بھیڑ لگ گئی آوازوں کا ایک جلوس کھڑا ہوگیا۔ کتنی ہی آنکھیں اور کتنے ہی ہونٹ۔ وہ ایک ایک کو ٹٹولنے لگا۔

یہ کس کا چہرہ تھا؟

زندگی یکایک جیسے کسن ہوکر جو لمبی ہوتی راہوں پر اس چہرے کو ڈھونڈھنے لگی، کھوئے ہوئے موسموں میں اس کا سایہ تلاش کرنے لگی۔ کتنی ہی برساتیں اور کتنے ہی پت جھڑ ـــ وہ ایک ایک میں اسے پکارنے لگا۔

یہ کس کا چہرہ تھا؟

اس نے اور کس کر آنکھیں بھینچ لیں، اور اس کی آنکھوں کے اندھیرے میں بہت سارے دروازے کھل گئے، کتنی کھڑکیوں کے مانوس چہرے دکھائی دیئے۔ بہت سے تہوار یاد آئے۔ اور بچپن کے کتنے سارے کھیل اور وہ شہر جو چھوٹ گیا؟ اور وہ سپیرا جو ہر اتوار کو آیا کرتا تھا۔ مگر یہ چہرہ کس کا تھا؟

جتیندر نے ذرا سی آنکھیں کھول کر چوری سے اس صلیب کی طرف دیکھا جو اپنے سینے سے مائیکل اسمتھ کو لگائے کھڑی تھی۔ فادر مائیکل اسمتھ جس کے جسم پر پادریوں کا سفید لانبا گاؤن تھا اور جس کے گلے میں یسوع مسیح کا ایک چھوٹا سا کراس لٹک رہا تھا۔ مائیکل اسمتھ۔

جتیندر نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ میں تمہیں پہچانتا ہوں۔ تم مائیکل اسمتھ ہو۔ تم فادر مائیکل اسمتھ ہو۔ تم جو تاریک راہوں میں مارے گئے — میں تمہیں جانتا ہوں —"

جتیندر نے بے اختیار اپنی عمر کو دنیا کے گول نقشے کی طرح گھما کر دیکھا — اور پھر اس نے دیکھا۔ پھول کی طرح کھلا ہوا ایک گاؤں ہے۔ اور گاؤں کے آخری سرے پر ایک چھوٹا سا خوب صورت گرجا ہے۔ اور گرجے کے پھاٹک پر جھکے ہوتے چہروں کی ایک لمبی لائن ہے۔ وہ لائن میں ایک ایک کو تکنے لگا — یہ مارگریٹ ہے، یہ صبح سویرے سب سے پہلے گرجا کے پھاٹک پر لائن لگا دیتی ہے اور دس بجے دن تک چپ چاپ کھڑی دروازہ کھلنے کا انتظار کرتی ہے — یہ شنٹو ہے جو آٹھ بجے صبح اپنے اسکول کا تھیلہ لئے لائن پکڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور بار بار گرجے کی گھڑی دیکھتا ہے۔ اس کا اسکول آدھ میل دور ہے۔ اور اسے ٹھیک ساڑھے دس بجے اسکول پہنچنا ہے۔ یہ جیم ہے جو گھر کا سارا کام کرنے کے بعد سب سے آخر میں لائن لگاتا ہے اور کھڑے کھڑے اونگھتا ہے۔ اور اپنی بیٹی کو یاد کرتا ہے جو گھر میں اردو کا قاعدہ کھولے پڑھ رہی ہوگی۔ یہ مریم ہے جو . . . .

یکایک ایک غبار سا اٹھا اور جتیندر کی آنکھوں کو گدلا کر گیا۔ اس کی کھڑکی کی دوسری سلاخ جس پر اس کی انگلیاں بے حسی سے پڑی تھیں، مریم کے خون سے تپ اٹھیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے ہاتھ سے پھسل کر ایک صلیب بن کر مائیکل اسمتھ کے بغل میں جا کر گڑ گئیں۔ اس نے دیکھا صلیب پر مریم ٹنگی ہے۔

جتیندر کو اپنے سینے پر کسی آہنی کا منوں بوجھ محسوس ہوا۔ "میں تمہیں پہچانتا ہوں۔" جتیندر کو یکایک یاد آیا — "میں تمہیں پہچانتا ہوں تم مریم ہو — تم جو تاریک راہوں میں ماری گئیں — میں تمہیں جانتا ہوں۔"

یکایک اس نے کس کر دانت بھینچ لئے۔

اب گرجے کا پھاٹک کھل گیا ہے اور لائن کسی سانپ کی طرح آہستہ آہستہ رینگ رہی ہے۔ گرجے کی پیشانی پر گھڑی کی سوئیاں دس اور بارہ پر اٹکی اونگھ رہی ہیں۔ اور بڑھتی ہوئی دھوپ سے سارا گاؤں یرقان کے مریض کی طرح زرد ہوتا جا رہا ہے — اب گیہوں بٹے گا — لائن میں بہت سے چہروں کی راکھ تلے پھول کھل اٹھے — اب گیہوں بٹے گا۔

جتیندر نے دیکھا وہ چھوٹا سا گرجا کسی پیغمبر کی طرح وقار سے مسکرا رہا ہے۔ اس نے پڑھا سامنے کی دیوار پر بڑے بڑے حرفوں میں لکھا تھا۔ "MISSIONARY OF CHARITY" اس مشنری میں ہر روز گیہوں مفت بٹتا تھا اور کبھی کبھی شکر اور کبھی کبھی ولایتی گھی۔ اور یہ سب چیزیں اس دیش سے دور سات سمندر پار سے آتی تھیں۔ وہاں سے جہاں خدا مہربان ہے اور انسان چالاک ہے' اور جہاں اس سے بھی بڑی مشنری آف چیریٹی ہے۔

فادر مائیکل اسمتھ نے، جو ہر روز اپنے ہاتھوں سے گیہوں بانٹتا تھا، گاؤں کے لوگوں کو اپنے ملک کی بہت سی باتیں بتائی تھیں اور یہ باتیں وہ اسی وقت بتاتا تھا جب خود اس کے سینے میں اس کے وطن کی گلیوں کے نام پھڑپھڑانے لگتے اور اس کا دل بیتاب پرندے کی طرح اڑتا ہوا بہت دور سمندر پار

چلا جاتا اور اسے پکارتا۔۔۔ مائیکل چلے آؤ۔

مگر مائیکل نہیں جا سکتا تھا۔ اسے ابھی ہندوستان میں دو سال رہنا تھا اور جگہ جگہ گھوم گھوم کر عیسائی مذہب کی تبلیغ کرنی تھی۔ اُسے اُس کے ملک نے اسی مقصد کے لئے یہاں بھیجا تھا۔ اس کے وہ چار سو ساتھی جو اس کے ساتھ آئے تھے مختلف جگہوں میں پھیلے ہوئے اپنا اپنا کام کر رہے تھے۔ اور ان کا سربراہ بی شاپ ایلگز ینڈر گرین انھیں ہر ہفتے احکامات دیا کرتا تھا۔

مائیکل اسمتھ کو دوسری کسی بات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ مذہب کے سوا اسے کسی چیز سے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا۔ تبلیغ کرنے اور دوسرے مذہبوں کو جلتے میں اسے بہت مزہ آتا تھا۔ وہ اب تک برما، تبت اور سیلون میں گھوم گھوم کر ڈیڑھ سو کے قریب عیسائی بنا چکا تھا اور اب ہندوستان کی باری تھی۔

اور ہندوستان ایک غریب، مجبت، ایک بدنصیب بھوک اور ایک ظالم صلیب لئے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ پھر بھی زندگی میں ان سمندروں کو نہ پاٹ سکا جو اس کے اور اس کے خوابوں کے بیچ آ گئے تھے۔ وہ یوں مذہب کے پل پر چلتا ہوا یہاں تک آیا تھا مذہب ہی کے جہنم میں جل کر راکھ ہو گیا۔

فادر مائیکل اسمتھ، تمہاری کہانی بھی عجیب ہے!

جنیفر نے سوچا اور دیکھنے لگی جب اس چھوٹے سے پھاٹک کو جہاں مائیکل اسمتھ سفید لمبا گاؤن پہنے کھڑے کھڑے جھک کر گیہوں بانٹ رہا تھا۔ وہ مانگنے والوں کے صرف ہاتھ دیکھ سکتا تھا لیکن صرف ہاتھ دیکھ کر ہی ان کے نام بتا سکتا تھا۔

یہ مارگریٹ کے ہاتھ ہیں۔ ان ہاتھوں نے شاید زندگی بھر کپڑوں میں پیوند لگائے ہیں اور آنسو پونچھے ہیں۔ اور بجھتے دیئے جلائے ہیں! آدھ سیر گیہوں۔۔۔! مائیکل اسمتھ نے اس کے تھیلے میں گیہوں ڈال دیئے۔

یہ شنکر کے ہاتھ ہیں۔ وہ ہاتھ جو شاید ہمیشہ دالائے ہیں۔ جنہوں نے ہمیشہ اسکول کی پھٹی ہوئی کتابوں کو جوڑا ہے اور ڈاکٹر کو خوشامد سے سلام کیا ہے۔

آدھ سیر گیہوں۔۔۔!

یہ رحیم کے ہاتھ ہیں۔ ان ہاتھوں نے شاید ہمیشہ دوسروں کے لئے گھروندے بنائے ہیں۔ اور شاید ہر پل میں ایک چتا جلائی ہے اور راکھ میں آنسوؤں کے موتی ڈھونڈے ہیں۔

آدھ سیر گیہوں۔۔۔!

اور یہ شیلا کے ہاتھ ہیں۔

آدھ سیر گیہوں۔۔۔!

اور یہ چھوٹے ببلو کے ہاتھ ہیں۔

آدھ سیر گیہوں۔۔۔!

اور یہ۔۔۔۔۔ اور یہ۔۔۔۔۔ اور یہ کس کے ہاتھ ہیں؟؟

مائیکل اسمتھ نے لمحہ بھر کے لئے اپنا پسینے سے شرابور چہرہ اٹھایا۔ یکایک اسے یاد آیا کہ جہاں وہ کھڑا ہے وہیں پر ایک اونچا درخت ہے اور اس کے سر پر سرخ سرخ بے شمار پھول کھلے ہیں اور انگنت مرغابیوں کا ایک جھنڈ اڑتا ہوا کسی سرد ملک کی طرف جا رہا ہے اور اونچے اونچے پام کے درختوں پر پتے گھنے سبز ہو گئے ہیں۔

یہ کون سا مہینہ ہے۔۔۔؟ یہ کون سا مہینہ ہے۔۔۔؟؟

اس رات مائیکل اسمتھ جب اپنے بستر پر لیٹا تو اسے مریم بہت یاد آئی۔ اسے بہت سے دوسرے ہاتھ بھی یاد آئے جن کے جال سے وہ بچتا بچاتا اپنے مذہب کی لاج رکھتا ہوا یہاں تک آیا تھا۔ کیسے کیسے خوبصورت نیند میں ڈبو دینے والے ہاتھ ـــ اور ان کے وہ اشارے ـــ مگر یہ ہاتھ ـــ یہ کس کے ہاتھ تھے؟؟

مائیکل اسمتھ کو بہت دنوں بعد خیال آیا کہ وہ اب تک بوڑھا نہیں ہو سکا ہے۔ اس کی عمر ابھی صرف پچپن سال ہے۔ اور ہندوستان بہت خوبصورت ملک ہے ـــ اسے برما کی وہ لڑکی یاد آئی جو ہر روز باقاعدہ اس کے گرجے میں گیہوں لینے آتی تھی اور گیہوں لیکر پھر لائن لگا دیتی تھی اور اسے ایک ٹک دم سادھے دیکھے چلی جاتی تھی۔ مائیکل کو بہت سی باتیں یاد تھیں۔

"تم لوگ شادی نہیں کرتے فادر ـــ؟"

"نہیں ـــ"

"کیوں ـــ؟"

"کیتھولک کلرجی شادی نہیں کرتے۔"

"کیوں نہیں کرتے ـــ؟"

"اس لئے کہ یہی ہمارا مذہب سکھاتا ہے۔"

"تمہارے مذہب کی بس یہی بات مجھے پسند نہیں۔"

"مذہب بہت سی خواہشات کو مارنے ہی کا نام ہے۔"

"تم لوگوں کا دل بھی نہیں چاہتا فادر؟"

"نہیں ـ؟"

"تو پھر تمہارے ہاتھ کے دیئے ہوئے گیہوں مجھے اتنے میٹھے کیوں معلوم ہوتے ہیں؟"

پھر سیلون کی وہ سانولی لڑکی جو چپکے چپکے اس پر مرمٹی تھی۔ جو دن میں کئی کئی بار اس کے چرچ کے سامنے سے گذرا کرتی تھی اور جب وہ ہندوستان آرہا تھا تو اس کے ہاتھوں کر بیچین ہو گئی تھی۔

"تم پھر کبھی سیلون نہیں آؤ گے فادر؟"

"نہیں ـ؟"

"تم نے اب تک کتنے عیسائی بنائے ہیں ـ؟"

"ڈیڑھ سو۔"

"ان میں میرا نام بھی ہے نا؟"

"ہاں ـ"

"کیا نام لکھا ہے ـ؟"

"نورا اسمتھ ـ"

"کیا ـــ؟؟"

"نورا اسمتھ ـ"

"پھر کہو —"

"نورا اسمتھ —"

مائیکل اسمتھ آنکھیں بند کئے کئے ان بیوقوف لڑکیوں کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ سب اب کہاں ہوں گی اور کیا کر رہی ہوں گی۔ برما اور سیلون میں وہ پھر کبھی پلٹ کر نہیں جائے گا لیکن ہندوستان — شاید وہ ہندوستان بار بار پلٹ کر آئے۔ شاید یہاں سے کبھی نہ جائے۔

اس نے پھر مریم کو یاد کیا۔ اور بہت دیر تک یاد کرتا رہا۔ لیکن یکایک جب آدھی رات کا گھنٹہ بجا تو اس نے نادم ہو کر اپنے گلے کے کراس پر ہاتھ رکھ دیا۔ یہ سب پاپ تھا — شاید وہ اب تک اپنے دل کو نہیں مار سکا ہے (Oh. Heavenly Father) ———— یہ سب پاپ ہے۔

اس رات وہ بہت کم سو سکا۔ صبح سویرے جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے کھڑکی سے چرچ کے گیٹ کی طرف دیکھا جہاں اب بھی وہ درخت کھڑا تھا اور اس پر سرخ سرخ بے شمار پھول کھلے تھے اور انگاروں کی طرح سبز پتوں سے لگے لگے سلگ رہے تھے۔

جتیندر نے یکایک آنکھیں کھول دیں۔

اب دوپہر بجھ رہی تھی۔ اور سڑک پر ہوا اور دھول کا ایک دھیما طوفان اٹھا ہوا تھا۔ لوگ آ رہے تھے، لوگ جا رہے تھے اور اس طرح جیسے سبھوں کا کچھ نہ کچھ نقصان ہوا ہو۔

"تمہارا ہندوستان بہت خوبصورت ہے۔"

جتیندر نے چونک کر سنا۔ یہ مائیکل اسمتھ کی آواز تھی۔ اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں اور دیکھا، مریم کی بڑی بڑی آنکھیں جھک گئیں ہیں اور جھک کر چراغوں کی طرح جل اٹھی ہیں۔ اور وہ اپنے کانپتے ہاتھوں کے گیہوں کو اس طرح دیکھ رہی ہے جیسے اس کا ایک ایک دانہ مائیکل اسمتھ کا ایک ایک نقطہ ہے۔

"یہ کیسے ممکن ہے" —— "یہ ناممکن ہے ——" مریم تقریباً دوڑتی ہوئی وہاں سے بھاگ آئی۔ فادر مائیکل اسمتھ نے اپنے گلے کے کراس پر ہاتھ رکھ دیا۔ "یہ پاپ نہیں ہے۔"

وہ بات بہت اہتمام سے سج دھج کر آئی تھی۔ مگر مائیکل اسمتھ کو کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اسے زندگی میں پہلی بار خیال آیا کہ وہ کیتھولک ہے وہ محبت نہیں کر سکتا۔ وہ شادی نہیں کر سکتا۔ وہ چیخ کر مریم کو پکار نہیں سکتا ———— اگر یہ سب پاپ ہے تو وہ اس پاپ سے لڑ کیوں نہیں سکتا کیوں وہ اس پاپ کے لئے تڑپ رہا ہے —؟ اسے برما کی وہ لڑکی یاد آئی۔

"تمہارے مذہب کی بس یہی بات مجھے پسند نہیں۔"

بس یہی بات کہ وہ کیتھولک ہے۔ بس یہی بات کہ مریم کو دیکھ کر آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ بس یہی بات کہ زندگی بار بار نہیں ملتی ——

مائیکل کی سوچ پوری رات کو ایک بلیڈ کی طرح کاٹتی ہوئی گذر گئی —— صبح سویرے جتیندر نے دیکھا۔ وہ چرچ کے گیٹ کے پاس دھند میں اکیلا کھڑا ہے اور سرخ پھولوں والے درخت کے تنے پر چاقو سے مریم کا نام کھود رہا ہے۔ اوپر شاخوں پر سبز طوطے جاگ گئے ہیں اور جھک کر مائیکل کو دیکھ رہے ہیں۔ اور کہہ رہے ہیں،

"مائیکل اسمتھ! مبارکباد —"

جتیندر ہلکے سے مسکرا اٹھا۔ جانے کیوں اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ اتنی دیر سوچنے سے واقعات اس کے دماغ میں گڈمڈ ہونے لگے۔ اس نے اپنے باپ کو دیکھا جو کھدر کا کرتا اور پائجامہ پہنے ایک چبوترے پر کھڑا تھا اور اس کے ارد گرد گاؤں کے لوگوں کی بھیڑ تھی۔ وہ غصے میں کچھ کہہ رہا تھا اور پوری بھیڑ پر ایک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ جتیندر کو اچھی طرح یاد تھا۔ گاؤں میں اس کے باپ کی حیثیت سب سے اونچی تھی کیونکہ وہ وہاں کا اکیلا گریجویٹ تھا اور سب سے زیادہ زمین اسی کے پاس تھی۔ اس نے سنا وہ مجمع سے کہہ رہا تھا۔

"یہ انگریز قوم بڑی دغاباز ہے۔ اس نے ہندوستان میں پہلے تو صرف کمپنی کھولی تھی۔ پھر سالہا سال تک ہم پر حکومت کی۔ یہ وہی ہیں جو مغل دربار وں میں سر جھکا کر آتے تھے اور آنکھیں اٹھا کر بات نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی غلامی سے آزاد ہونے میں کتنا خون بہا ہے یہ ہر ہندوستانی جانتا ہے۔ گو ان کا راج چلا گیا ہے لیکن یہ اب بھی بھیس بدل بدل کر آتے ہیں اور ہمیں دھوکا دے جاتے ہیں۔ اس بات کی ہزاروں مثالیں موجود ہیں اور ان مثالوں میں سے ایک مثال مائیکل اسمتھ کی ہے۔ فادر مائیکل اسمتھ جو اس کیتھولک چرچ کا پریسٹ ہے۔"

جتیندر نے دیکھا کہ وہ بہت چھوٹا ہے اور اپنے باپ کے بغل میں کھڑا حیرت سے اس بھیڑ کو دیکھ رہا ہے جہاں نفرت کی آگ بھڑکنی شروع ہو گئی ہے۔

"مائیکل اسمتھ سے اس کے باپ کا کیا تعلق؟" جتیندر نے سوچا اور پھر اس نے دیکھا۔

ندی کنارے شام ٹھہری ہوئی ہے۔ دن بھر کا پیاسا سورج بجھ چکا ہے اور کہیں کہیں تارے نکل آئے ہیں۔ جتیندر تھکے تھکے قدموں سے ایک بہت اونچے پربت پر چڑھ گیا اور وہاں سے اس نے جھک کر نیچے کی طرف دیکھا۔ فادر مائیکل اسمتھ چپ چاپ ایک پتھر کی طرح کھڑا ہے — اس کا لمبا سفید گاؤن تیز ہواؤں سے ایسے پھڑپھڑا رہا ہے جیسے کسی بہت بڑے پرندے کا ٹوٹا ہوا پنکھ ہو — مائیکل ڈبڈبائی آنکھوں سے مریم کو دیکھ رہا ہے جو زمین پر بیٹھی دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپائے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی ہے۔

"یہ ناممکن ہے۔ یہ پاپ ہے۔"

"یہ پاپ نہیں ہے۔" مائیکل اسمتھ نے جھک کر مریم کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا — "یہ پاپ نہیں ہے۔"

مریم نے بھیگی آنکھیں اٹھا کر اس اجنبی انگریز کو دیکھا۔ "ہاں یہ پاپ ہے — پاپ بہت خوبصورت ہوتا ہے اس لئے مائیکل بھی خوبصورت ہے۔ پاپ میں نشہ ہوتا ہے۔ اس لئے مائیکل کی آنکھوں میں بھی نشہ ہے۔"

"مریم —" مائیکل نے اس کے شانوں کو پکڑ کر اٹھایا اور ایک جھٹکے سے اپنے سینے سے لگا کر بھرا کر بولا — "مجھ سے مت ڈرو۔ اس بھرے ہندوستان میں میرا کوئی نہیں ہے۔ میں بہت دور دیس کا رہنے والا ہوں۔ مجھ سے مت ڈرو۔"

"مائیکل" — مریم اس کے سینے پر سر رکھے رونے لگی — "یہ پاپ ہے" — "یہ پاپ ہے!"

"یہ انگریز قوم بڑی دغاباز ہے۔" جتیندر کا باپ کہہ رہا تھا۔ "ان کا سب سے بڑا ہتھیار ان کا چرچ ہے۔ یہ جانتے ہیں کہ ہندوستان بھوکا ملک ہے اور بھوکے کو دھوکا دینا بہت آسان ہے۔ یہ ہم لوگوں میں وہ گیہوں بانٹ رہے ہیں جو سمندر میں پھینک دیا جاتا تھا۔ ہم ایک ہاتھ سے آنسو پونچھتے ہیں اور ایک ہاتھ سے گیہوں مانگتے ہیں۔ اور یہ کالے کالے بائیبلوں میں چہرہ چھپائے اوپر سے اپنا کام کر جاتے ہیں — یہ ہم سے ہمارا مذہب چھینتے ہیں۔ ہماری قوت چھینتے ہیں، ہماری آزادی چھینتے ہیں اور ہم اپنے اخباروں کے پہلے صفحوں پر ان کے احسانوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں — کیا یہ ہماری بے وقوفی نہیں ہے

"ہاں۔۔ ہاں ——" پورا مجمع چلا اٹھا

"کیا یہ انیائے نہیں ؟؟"

"ہاں —— ہاں —" لاکھوں ہاتھ فضا میں بلند ہو گئے۔

جتیندر نے ڈر کر اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ یا سارا شور ایک دم غائب ہو گیا۔ اور اس کی آنکھوں کے سامنے ایک چاندنی رات پازیب بجاتی چلی آئی۔

"میں تو کالی ہوں پھر تمہیں کیسے پسند آ گئی ——" مریم نے مسکرا کر اپنے ایک ہاتھ پر دوسرا ہاتھ پھیرا اور مائیکل کو دیکھنے لگی۔

"دل پر کس کا بس ہے۔ ؟" مائیکل نے اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

"اچھا یہ بتاؤ تمہارے ملک کی عورتیں تو بہت خوبصورت ہوتی ہیں، بہت گوری گوری ——"

"ہاں۔"

"ان میں سے تمہیں کوئی پسند نہیں آئی ؟"

"نہیں !"

"جھوٹ بولتے ہو۔"

"نہیں۔"

"جھوٹ۔۔"

"نہیں —— میری آنکھیں دیکھ لو کیا جھوٹے کی آنکھیں ایسی ہی ہوتی ہیں ——؟" مائیکل اس پر جھک آیا۔

"میں کیا جانوں ؟" مریم کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

"آج اس دغاباز قوم کا ایک پٹھو اس گاؤں میں بھی آیا ہے" جتیندر کا باپ پھر بولنے لگا: "یہ مائیکل اسمتھ ہے جو فادر کہلاتا ہے۔ جو ہر روز گاؤں میں گیہوں بانٹتا ہے۔ یہ ہماری عورتوں سے اپنی خیرات کے دام مانگنے لگا ہے۔ لیکن کیا ہم اتنے بے حیا ہیں ——؟"

"نہیں نہیں —— ایک دہلا دینے والا شور اٹھا۔

"کیا بھوک نے ہمیں بزدل بھی بنا دیا ہے ——؟"

"نہیں نہیں۔"

"اف بھگوان۔" جتیندر نے پھر گھبرا کر کانوں میں انگلیاں ڈال لیں۔ اور پھر سارا شور دب گیا اور اس نے دیکھا۔

صبح ہو رہی ہے۔ دھند میں لپٹے ہوئے پیڑ بھکشوؤں کی ٹولی کی طرح نظر آ رہے ہیں۔ اور پگڈنڈیاں شبنم سے بھیگ کر کانپتی ہوئی دور تک چلی گئی ہیں۔ اور گرجے کی چوٹی پر صبح کا اکیلا ستارہ دھیرے دھیرے بجھتا چلا جا رہا ہے۔

ندی کے پاس ایک گھنے درخت کے نیچے مریم گہری نیند سو رہی ہے۔ ایک لمبا سفید گاؤن زمین پر بچھا ہے اور مائیکل اسمتھ مریم کو اٹھا رہا ہے۔ مریم کے بالوں میں بہت سے جنگلی پھول لٹکے ہوئے ہیں۔ اور اس کے ہونٹوں پر ان ساری باتوں کا رنگ ہے جو وہ زندگی بھر مائیکل سے کہنے والی تھی۔

یکایک ایک تیز کھنکار کی آواز سنائی دی۔ مائیکل نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کے سامنے گاؤں کا زمیندار جتیندر کا باپ کھڑا ہے۔ ایک ٹھنڈی لہر مائیکل

اسمتھ کو جھنجھناتی ہوئی گذر گئی۔ ایک لمحے کو اس کی آنکھیں زمیندار کی آنکھوں سے چار ہوئیں۔ اور پھر جھک گئیں۔ زمیندار کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ دوڑنے لگی۔ اور وہ بغیر کچھ کہے واپس مڑ گیا۔ مائیکل نے دیکھا اس کے پیچھے دو آدمی اور تھے اور ان کے ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں۔

"مریم اس سارے گاؤں کی عزت ہے۔" جتیندر کا باپ چیخ کر کہنے لگا "وہ ہماری بیٹی ہے ـــــ وہ تمہاری بیٹی ہے اور آج ہماری اس بیٹی کی قیمت مائیکل اسمتھ صرف آدھ سیر گیہوں لگا رہا ہے۔ کیا ہم اب بھی چپ رہیں گے ــ؟"

"نہیں نہیں۔" ساری بھیڑ بپھر گئی جیسے آگ لگ گئی ہو۔

"کیا ہماری پرکھوں کی تاریخ یہ نہیں بتاتی کہ عزت لٹنے سے موت بہتر ہے؟"

"ہاں ــ ہاں۔"

"کیا ہم ان بہادروں کی اولاد نہیں جنہوں نے ایسے ایسے کروڑوں مائیکل اسمتھ کے سر کاٹ کر خاک میں ملا دیئے ہیں؟"

"ہاں ــ ہاں ــ"

"تو پھر کیا دیکھتے ہو ــ؟ وہ رہا گرجا۔ مائیکل وہیں ہوگا۔ جاؤ اور اس کے خون سے اپنے کوڑھے دھبوں کو صاف کر لو۔ آج میں نے اپنی آنکھوں سے اسے تم سب کی بیٹی کو ننگا کرتے دیکھا ہے۔"

یکایک مجمع میں کھلبلی مچ گئی۔ ایک دل ہلا دینے والا شور اٹھا۔ فضا میں لاکھوں لاٹھیاں، گنڈاسے اور برچھیاں لہرانے لگیں اور ہزاروں لوگ پاگلوں کی طرح دوڑتے ہوئے گرجے میں گھس گئے۔

"ٹھہرو ــــ ٹھہرو ــــ" جتیندر نے چیخ کر کہا

"ٹھہرو ــ" مریم گھبرا کر چلائی۔ مگر کوئی نہیں رکا کوئی نہیں پلٹا۔ جتیندر کو اپنے باپ کی خوفناک ہنسی سنائی دی۔ اس نے دیکھا مریم اس کے باپ کے پیروں پر سر رکھے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی ہے ـــــ "روک لو انہیں ــــ اس کا کوئی قصور نہیں ــــ اس کا کوئی قصور نہیں ــــ روک لو انہیں ــ"

"روک لوں ــ؟" زمیندار ذرا سا جھک کر بولا۔ "یاد ہے تجھے وہ رات۔ جب تو میرا ہاتھ جھٹک کر چلی گئی تھی۔ آج اس رات کی صبح بھی دیکھ لے ــــ اس دن تو نے مجھ پر رحم نہیں کیا تھا، آج میں تجھ پر رحم نہیں کروں گا ــ" جتیندر کے باپ نے اس کے سر پر زور سے ٹھوکر ماری اور مریم اچھل کر دور جا گری۔

گرجے کے اندر بھیانک شور مچا ہوا تھا۔ مریم سنتی رہی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے گرجے کی طرف دیکھتی رہی۔ یہ سلسلہ کب تک جاری رہا اسے خبر نہیں۔

بہت دیر بعد اس نے سنا کہ گرجے کی گھنٹی زور زور سے بج رہی ہے۔ اور چاروں طرف ایک خوفناک سناٹا پھیلا ہوا ہے۔ وہ آہستہ سے اٹھ کر تھکے تھکے قدموں سے گرجے کی طرف بڑھی۔ وہاں ایک بھی آدمی نہیں تھا ــ اس نے آہستہ سے پھاٹک کھولا۔ اندر تین چار پادریوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ اس نے غور سے دیکھا۔ سب سے آخر کی لاش مائیکل اسمتھ کی تھی۔ بے سر ـ لہو میں غرق ـ وہ آہستہ آہستہ بغیر آنسو بہائے اس کی طرف بڑھنے لگی۔

تیرے ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت میں ہم

"مائیکل"۔ مریم آہستہ سے بولی۔

دار کی خشک ٹہنی پہ وارے گئے۔

"مائیکل" مریم نے پھر پکارا۔
تیرے ہاتھوں کی شمعوں کی حسرت میں ہم۔
"مائیکل!" مریم زور سے چیخ پڑی۔
نیم تاریک راہوں میں مارے گئے۔
مائیکل — "مائیکل۔ جتیندر نے دیکھا وہ مائیکل اسمتھ کی لاش سے لپٹی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی ہے
نارسائی اگر اپنی تقدیر تھی۔
"مائیکل — مائیکل" اس نے اس کے مردہ ہونٹوں پر ہونٹ رکھ دیئے۔
تیری الفت تو اپنی ہی تدبیر تھی۔
وہ اسے پاگلوں کی طرح چومنے لگی۔
کس کو شکوہ ہے گر شوق کے سلسلے۔
"مائیکل — مائیکل"
ہجر کی قتل گاہوں سے سب جا ملے۔
"یہ پاپ ہے — یہ پاپ ہے — میں پہلے ہی جانتی تھی"
جتیندر نے یکایک آنکھیں کھول دیں۔
شام ہو چکی تھی۔ دور گھنے درختوں کے پیچھے پورا چاند اس سادھو کی طرح ابھر رہا تھا۔ جیسے اپنی تپسیا سے کچھ بھی حاصل نہ ہوا ہو۔ جتیندر نے دیکھا کھڑکی سے باہر مائیکل اسمتھ اسی طرح صلیب پر لٹکا ہوا تھا۔
"مائیکل!" جتیندر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے — "کیا واقعی تم نے پاپ کیا تھا؟"
"نہیں۔" مائیکل نے آہستہ سے جواب دیا — جتیندر نے چونک کر دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔
"تم زندہ ہو فادر —؟" جتیندر حیرت سے بولا۔
"ہاں۔" مائیکل نے پھر مسکرا کر اپنے سر کو اوپر اٹھایا — یکایک اس کے پیروں اور ہتھیلیوں کی کیلیں کھل کر خود بخود گر گئیں اور وہ خون میں تربتر ہوا ڈولتا آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کی کھڑکی سے کمرے میں آ گیا — "ہاں میں زندہ ہوں۔"
"مگر تم تو......"
"ہاں میں مر گیا تھا لیکن میں پھر بھی زندہ ہوں۔ مجھے انتظار ہے اس دن کا جب پاپ بر چھی لیکر گرجے میں نہیں گھسے گا — تم بتاؤ۔ مریم پر کیا گذری —؟"
"مریم —؟" جتیندر نے سوچا۔
"ہاں۔" مائیکل اسمتھ اپنی پیشانی کے خون کو پونچھتا ہوا بولا۔
"ہاں، میرے بعد اس پر کیا گذری —؟"
"تمہارے بعد اسے گاؤں سے نکال دیا گیا تھا۔"

"پھر ـــ؟"

"پھر وہ دوسرے گاؤں چلی گئی۔"

"پھر ـــ؟"

"پھر وہ زمینداروں کے بستروں پر سونے لگی۔"

"پھر ـــ؟"

"پھر شہر چلی گئی۔"

"پھر ـــ؟"

"پھر چکلوں میں چلی گئی۔"

"پھر ـــ؟"

"پھر واپس اپنے گاؤں چلی آئی"

"گاؤں؟"

"ہاں"

"کیوں؟"

"مجھے نہیں معلوم ـــ مگر مجھے وہ دن یاد ہے۔" جتیندر نے آنکھیں بند کرلیں۔ "مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے۔"

اسے ماضی کی ایک دوپہر یاد آئی۔ اس نے دیکھا ـــ ایک گاؤں ہے اور گاؤں میں ایک گرجا ہے اور گرجے کے پھاٹک پر دبلے تھکے ہوئے چہروں کی ایک لمبی لائن ہے۔ پھر وہ ایک ایک کو دیکھنے لگا ـــ یہ مارگریٹ ہے، یہ اب بھی سب سے پہلے لائن لگاتی ہے۔ یہ شنتو ہے۔ یہ اب بھی اسکول جاتا ہے یہ رحیم ہے، یہ اب بھی سب سے آخر میں آتا ہے۔ اور یہ . . . اور یہ . . . . ؟

جتیندر نے بڑے دکھ سے دیکھا ـــ یہ مریم ہے۔ اس کے سر کے گندے بال بکھر کر اس کے چہرے پر آگئے ہیں۔ اس کی پھٹی ہوئی چولی سے اس کا دودھ بھرا سینہ صاف نظر آرہا ہے اور وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا پھولا ہوا پیٹ دبائے زور زور سے کراہ رہی ہے۔ جتیندر نے اس کے ہاتھوں کو دیکھا۔ کیا یہ وہی ہاتھ ہیں جنہیں مائیکل اسمتھ نے دیکھا تھا، اور یہ اس کے پیٹ میں کس کا بچہ ہے جسے وہ پیدا ہونے سے روکنا چاہتی ہے۔

یکایک جتیندر کو ایک بہت پرانی قاتل گلی یاد آئی جہاں اس نے دو دن کے ایک بچے کو مردہ پڑا ہوا دیکھا تھا، پھر اسے وہ پل یاد آیا جب آدھی رات تک لالٹین جلائے چھ سال کا ایک اندھا لڑکا بھیک مانگتا تھا۔ پھر اسے یتیم خانوں کے وہ لڑکے یاد آئے جو کبھی کبھی اپنی ماں کو دیکھنے کے لئے ضد کرتے ہیں، پھر اسے ریڈ کراس کے بچوں کا مقابلہ یاد آیا، اور پھر اسے بچوں کا وہ اسکول یاد آیا جس کی ماہانہ فیس ستر روپے ہے۔

"مریم ـــ"

مریم اب بھی کراہ رہی تھی مگر پھر بھی لائن میں کھڑی تھی۔

"یہ کس کا بچہ ہے؟"

"نہیں،" جتیندر نے سوچا۔ "یہ شاید بچہ نہیں ـــ شاید آدھ سیر گیہوں کا بوجھ ہے۔ شاید وہ بھوک ہے جس کا کوئی گلا نہیں گھونٹ سکتا۔"

"مریم ـــ"

یکایک مریم کی ایک تیز چیخ سنائی دی اور پوری لائن ریڑھ کی ہڈی کی طرح جگہ جگہ سے ٹوٹتی چلی گئی۔ اس نے دیکھا مریم زمین پر پڑی اپنے پیٹ کو دونوں

ہاتھوں سے دبائے تڑپ رہی ہے۔

پھر ایک چیخ، اور پوری لائن ایک دائرہ بن گئی۔

پھر ایک چیخ، اور جتیندر نے سنا کہ مریم کہہ رہی تھی ——"گیہوں —— میرا گیہوں - گیہوں۔"

اس نے دیکھا اس کی رانوں کے بیچ ایک کمزور سا بچہ لعاب اور خون میں لت پت پڑا ہے اور اپنی ماں کے ساتھ چیخے جا رہا ہے ——"گے —— ہوں گے —— ہوں ——"

یکایک شنٹو بھیڑ کو چیرتا ہوا آگے بڑھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اس نے اپنی اسکول کی کتابیں پھینک دیں اور پھر تھیلے میں ہاتھ ڈال کر ایک مٹھی گیہوں نکالا اور مریم کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ مریم نے ایک بار کس کر مٹھی بھینچی اور پھر ڈھیلی چھوڑ دی۔

جتیندر نے دیکھا وہ مر چکی تھی —— گرجے کی گھنٹی زور زور سے بجنے لگی۔ اور اس نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھول دیں اور کھڑکی کے باہر دیکھا ——

مریم اسی طرح صلیب پر لٹکی تھی۔

"مریم" جتیندر کی آنکھیں پھر ڈبڈبا گئیں۔ "تمہارا پاپ کیا تھا؟"

"کچھ بھی نہیں!" اسے مریم کی آواز سنائی دی۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔

"تم زندہ ہو —؟"

"ہاں!" مریم نے مسکرا کر پھر اپنا سر اٹھایا یکایک اس کے پیروں اور ہتھیلیوں کی کیلیں کھل کر خود بخود گر گئیں اور وہ خون میں تر بتر ہواؤں پر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کھڑکی سے اس کے کمرے میں آ گئی۔

"ہاں میں زندہ ہوں!"

"مگر تم تو ......"

"ہاں میں مر گئی تھی۔ مگر میں پھر بھی زندہ ہوں۔ مجھے انتظار ہے اس مورخ کا جو ایک دن آئیگا اور میری زندگی کی تاریخ پھر سے لکھے گا۔"

"اور تمہارا بچہ؟"

"میرا بچہ —— ؟" مریم کی آواز بھرا گئی —— "میرا بچہ ابھی گھوم رہا ہے۔ وہ بہت دنوں تک اسی طرح اپنا معصوم سوال لئے گھومتا رہیگا۔ کبھی وہ چل پر بیٹھ کر بھیک مانگے گا۔ اور کبھی یتیم خانے میں مجھے دیکھنے کے لئے ضد کرے گا۔ لیکن ہر جگہ یہی پوچھے گا

"میں کون ہوں!" میں دیکھوں گی زمانہ کب تک جواب نہیں دیتا۔"

جتیندر نے دور گھنے درختوں کی طرف دیکھا —— وہ اتنے آنسو کہاں سے لائے جو آنکھوں کو اندھا کر دیں۔ کہاں سے لائے ؟؟

اسے یاد آیا کہ وہ دوپہر سے اب تک منجو کے انتظار میں کھڑا ہے —— مگر منجو تو اب کبھی نہیں آئے گی —— اس کی محبت تو کوئی خرید کر لے گیا ہے۔ اب اس سے اس کا کیا سمبندھ؟

"منجو —" آنسو ڈھلک کر جتیندر کے گالوں پر آ گئے۔

"منجو"

"منجو — تجھ سے میرا کیا سمبندھ ؟"

جتیندر نے دھیرے سے اپنے سینے پہ ہاتھ رکھا۔ "کاش — کاش تجھ سے کچھ سمبندھ ہوتا؟"

(باقی صفحہ ۷۶۵ پر)

ذکاء الرحمٰن

درد آئے گا دبے پاؤں

یہ اگر میں یہ بتاؤں کہ چھ سات برس پہلے شہاب کیا تھا۔ تو لوگ یقین نہیں کریں گے۔ لیکن مجھ سے بہتر اسے کون جان سکتا ہے۔؟ اس کا گھر میرے مکان کے عین سامنے تھا۔ اور ہمارے دروازوں کا درمیانی فاصلہ بمشکل آٹھ گز تھا۔ اس کی بہن شاہدہ میری بہن کی سہیلی تھی۔ وہ دونوں ایک ہی کالج میں پڑھتی تھیں۔ کوئی دن ایسا نہ جاتا تھا جب شاہدہ ہمارے ہاں نہ آتی ہو یا میری بہن اس کے گھر نہ جاتی ہو۔ ایک زمانہ تو ایسا بھی آیا تھا جب میں شاہدہ کے بارے میں بڑی سنجیدگی سے سوچنے لگا تھا...... وہ تھی بھی بہت پیاری لڑکی۔ اتنی پیاری کہ مجھ ایسے لڑکے کے اعصاب پر بھی سوار ہو گئی۔ میں جو بچپن سے ہی نامساعد حالات کے باعث ان روشن روشن لمحوں سے محروم رہا ہوں جب نظر کسی کے حسن سے ہمکنار ہوتی ہے اور دل کسی کی یاد سے ہمکلام ہوتا ہے...... شاہدہ کا بوٹا سا قد اور گداز جسم مجھے آج بھی یاد ہے...... اس کی آواز میں آسمانی گیتوں کی ترنگ تھی۔ اس کے رخساروں کے شفق زاروں کو اجڑتا دیکھ کر سورج سلام کرتا تھا۔ اور اس کی شمعی انگلیاں جب پیانو پر سروں کا جادو جگاتی تھیں تو کم از کم مجھے یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے یہ پوری کائنات اعجاز طلسم کے سوا کچھ بھی نہیں۔

شہاب ان دنوں بی۔ اے میں پڑھتا تھا۔ اور میں ایم۔ اے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس نے تعلیم کا پیشہ اختیار کرنے کا فیصلہ کر کے اپنی آئندہ زندگی کی راہ متعین کر لی تھی اور میں...... میں حسب معمول، سامنے آنے والے کسی بھی راستے پر چلنے کے لئے تیار تھا۔ اس سے بے نیاز کہ وہ راستہ کونسی وادی میں جا نکلے گا۔ کونسی منزل پر ختم ہو گا۔ میں نے نتائج کی کبھی پرواہ نہیں کی۔ میں لکھ پتی نہیں ہوں۔ لیکن طبیعت کا سانچہ کچھ اس طرح تشکیل پا چکا ہے کہ عواقب و عواطف میرے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ میں ان اہل جنوں میں سے ہوں جن کے لبوں پر حرف غزل مچلتا ہے۔ جن کے دلوں میں قندیل غم فروزاں رہتا ہے جو وہاں تک جاتے ہیں جہاں تک قدم لے جائیں۔ جو تاریک راہوں پہ مارے جاتے ہیں اور اس وقت بھی شکوہ نہیں کرتے۔ جب شوق کے تمام سلسلے ہجر کی قتل گاہوں سے جا ملتے ہیں۔

شہاب ایک خوب صورت لڑکا تھا گھنی پلکوں اور سیاہ گھنگریالے بالوں والا لڑکا اس کے چہرے کو دیکھ کر اس زرد گلاب کا خیال آتا تھا جو بارانی رات کے بھیگے بھیگے لمحوں میں کھلا ہو۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں ہمیشہ کچھ تلاش کرتی ہوئی۔ انجانی گہرائیوں میں اتری ہوئی محسوس ہوتی تھیں، وہ بڑی عمدگی، بڑے وقار سے بات کرتا تھا۔ زندگی کے ساتھ اس کا ہر معاملہ یہاں تک کہ اس کا لباس بھی اسی عمدگی اور وقار کا حامل تھا...... وہ ذاتی طور پر ایک غیر معمولی لڑکا تھا اور اسے اپنے بدن اور اپنی روح دونوں کا مکمل محاسبہ کرنے اور انھیں حدود کے اندر رکھنے کی بے پناہ قوت حاصل تھی۔ شاید اسی قوت

کو ضبطِ نفس کی صلاحیت بخشتے ہیں...... بعض اوقات اسے اپنا کوئی سبق رات کو یاد نہ ہوتا تو وہ علی الصبح اٹھ بیٹھتا اور جب تک وہ مشکل سبق از بر نہ ہوتا اپنے کمرے سے باہر نہ نکلتا۔ وہ بلاشبہ ان جری انسانوں میں سے تھا جو انسان کی عظمت پر یقین رکھتے ہیں جن کے لئے کون و مکان کا کوئی مسئلہ انسانی دسترس سے باہر نہیں ہوتا۔ زندگی کی جولانگاہ میں جب تک ہم دونوں ساتھ ساتھ رہے، ندیم کا یہ مصرعہ میرے ذہن میں گونجتا رہا۔

انسان عظیم ہے خدایا

جس دور کا میں ذکر کر رہا ہوں، وہ ہم دونوں کے لئے معاشی اعتبار سے بڑا صبر آزما دور تھا۔ لیکن ان دنوں بھی اس کا اعتقاد تھا کہ وہ دن آنے والا ہے۔ جب معاش کا مسئلہ کوئی مسئلہ نہیں رہے گا۔

"میرا ایمان ہے کہ میں مفلس نہیں رہوں گا۔ میرے پاس ایک نہ ایک دن اتنی دولت آجائے گی کہ میں ساری دنیا کا سفر کر سکوں" وہ کہا کرتا تھا۔

اور آپ مانیں نہ مانیں اس نے اس طویل سفر کی تیاری کے سلسلے میں بیک وقت فرانسیسی، جرمن، روسی، عربی اور سکینڈے نیوین زبانیں سیکھنی شروع کر دی تھیں۔ جب کہ اس زمانے میں مجھے انگریزی زبان پر بھی پورا عبور نہیں تھا اور ایم۔ اے میں پڑھنے کے باوجود میں انگریزی گرامر کی فاش غلطیاں کیا کرتا تھا۔

"زندگی کا پہلا سبق یہ ہے کہ کام کرو" وہ مجھ سے کہا کرتا تھا۔۔۔ "انتھک کام...... سستی اور کاہلی انسان کو دیمک کی طرح چاٹ جاتی ہے"

اس نے کسی کتاب میں پڑھا تھا۔ کہ جب انگریزی کا مشہور شاعر کیٹس اپنی طبیعت کو لکھنے پڑھنے کی محنت پر آمادہ نہ پاتا تو تازہ پانی سے غسل کرتا اور نئے کپڑے پہن کر یوں تیار ہوتا جیسے کسی تقریب میں شرکت کرنے جا رہا ہو۔ اس طرح اس کی کسلمندی دور ہو جاتی اور وہ ہر نئے دن کے ساتھ اپنے کام میں مصروف ہو جاتا...... شہاب نے اکثر مجھے مشورہ دیا تھا کہ اپنی کسلمندی دور کرنے کے لئے میں بھی کیٹس کا یہ نسخہ استعمال کروں کیٹس واقعتاً اس کا آئیڈیل ہی نہیں دیوتا تھا۔ اور انگریزی شاعری میرے سے اپنی سمجھ میں ہی نہیں آتی تھی البتہ کبھی کبھی جب میں زندگی کی مسلسل جدوجہد سے اکتا جاتا تو دل کو بہلانے کے لئے اختر شیرانی کی رومانی نظمیں زیر لب گنگنایا کرتا تھا۔ شہاب کو اختر شیرانی کی شاعری قطعاً پسند نہیں تھی اور جب ہم گرما کی شاموں میں ٹہلنے کیلئے دریا پر جاتے تو اختر شیرانی اور کیٹس کے فن پر اکثر بحث چھڑ جاتی۔ شہاب اسی اعتماد اور وقار کے ساتھ کہتا۔!

"بات دراصل یہ ہے پیارے کہ اختر شیرانی عظیم شاعر نہیں ہے"

"وہ عظیم شاعر ہو یا نہ ہو" میں جواب دیتا۔ "لیکن اس کے شعروں میں ایک دردمند دل ضرور دھڑکتا ہے"

"بالکل ٹھیک" اس کے لبوں پر ایک خوشگوار مسکراہٹ پھیل جاتی "میں مانتا ہوں لیکن جس طرح بدن کی ہر حرکت فن رقص نہیں ہے، ہر آواز کو موسیقی نہیں کہا جاتا، محض رنگ و خطوط کا اجتماع مصوری نہیں کہلاتا، اسی طرح محض دردمند دل کی پکار شاعری نہیں ہو سکتی۔ شاعری بھی فنون کی بنیادی قدروں کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے اور فن کی بنیادی قدروں میں سے ایک اہم قدر تنظیم و ترتیب ہے۔ اختر شیرانی کی طرح کیٹس بھی ایک دردمند دل رکھتا ہے۔ لیکن اس نے اپنے دردمند دل کی پکاروں کو تنظیم و ترتیب کا حسن بخشا ہے۔ اسی حسن نے اس کی شاعری کو عظیم بنایا ہے۔ اس کے برعکس اختر شیرانی کے ہاں دردمند دل تو ہے لیکن وہ اس دل کے نالوں کو حسن تنظیم و ترتیب نہیں دے سکا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پراگندہ خیالی اور سستی رومانویت کا شاعر بن کر رہ گیا جبکہ کیٹس نے

"چھوڑو میاں۔ یہ کیا کیٹس کیٹس کی رٹ لگا رکھی ہے" میں جھنجھلا جاتا "اردو میں بھی تو اختر شیرانی کے علاوہ کئی عظیم شاعر ہیں۔ مثلاً میر، غالب، اقبال"

"ہاں ہاں میں نے کب انکار کیا ہے" وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے کہتا "میر، غالب اور اقبال واقعی اردو کے عظیم شاعر ہیں"

"یہ نام تو میں نے تمہیں انگریزی سے اردو کی طرف لانے کے لئے دہرائے ہیں۔ ورنہ اردو نے ان کے علاوہ بھی کئی شاعروں کو جنم دیا ہے۔ فراق، جوش اور فیض کے بارے میں کیا خیال ہے۔؟"

"فراق واقعی عظیم شاعر ہے" وہ کہتا۔ "جوش کی عظمت میں مجھے کچھ کچھ شک ہے۔ اور فیض کو تو میں قطعاً عظیم شاعر نہیں مانتا۔ اس کی شاعری کو بہت جلد بھلا دیا جائے گا۔ اور وہ ہے بھی اس قابل کہ اس کو بھلا دیا جائے۔"

"تم نے بہت جلد اپنا فیصلہ صادر کر دیا۔ آخر فیض نے بیچارے نے ایسا کون سا جرم کیا ہے کہ تم اسے عظیم شاعر ماننا ترک کیا، اردو کی شعری روایت سے ہی محو کئے دے رہے ہو۔"

"اس فیض کے بارے میں میری رائے بہت پکی ہے وہ ایک ہنگامی شاعر ہے جسے وقت کی ایک تیز رو نے سطح پر ابھار دیا ہے۔ ایک دور آئے گا کہ لوگ اس کو بھول جائیں گے۔ "نقش فریادی" تک اس کی شاعری میں تازگی تھی۔ آگے بڑھنے کی دھن تھی۔ لیکن "دست صبا" کے دور میں ایک تھکی تھکی سی کیفیت ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے فیض کو شاعری سے برائے نام سی دلچسپی باقی رہ گئی ہے۔ فیض نے ایک مخصوص نظام زندگی کی راہ میں قید و بند کے مرحلے بھی طے کئے اور دار و رسن تک پہونچنے کا حوصلہ بھی دکھایا لیکن اس کی شاعری، ایک تحریک کی شدت میں اضافے کے باوجود، قوالی سے آگے نہ بڑھ سکی۔

چلے ہیں جان و ایمان آزمانے آج دل والے

وہ لائیں لشکر اغیار و اعدا ہم بھی دیکھیں گے

وہ آئیں تو سر مقتل تماشا ہم بھی دیکھیں گے

اس قسم کی قوالیاں لکھنے والا اور زندہ کچھ ہو سکتا ہے، عظیم شاعر نہیں ہو سکتا۔"

"لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" مجھے شہاب کو چڑانے میں لطف آتا تھا۔ "کسی بھی شاعر کے ہاں جب کوئی مخصوص نظریۂ زندگی مقصد کا تمام حاصل کر لیتا ہے تو معاملہ فن پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے کیا یہ حادثہ اقبال اور حالی کے ساتھ نہیں گزرا۔؟ مگر اس سے ان کی عظمت میں تو کوئی فرق نہیں آیا۔"

"یہ درست ہے۔" شہاب نے چیخ چیخ کر کہنا شروع کیا "لیکن تم نے یہ بات کیوں نظر انداز کر دی کہ حالی اور اقبال نے جس نظریہ زندگی کو اپنا مقصد بنایا، اس کی جڑیں ہمارے معاشرے کی گہرائیوں میں تھیں۔ فیض جس نظریے کی تبلیغ کرتا ہے وہ ہمارے معاشرے کے مزاج کے خلاف ہے۔ ہم بنیادی طور پر مذہبی لوگ ہیں اور اشتمالیت کی راہ ہمیں مذہب سے دور لے جاتی ہے۔"

"اشتمالیت ہمیں مذہب سے دور لیجاتی یا نزدیک لاتی۔ بہرحال اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فیض زبان شعر میں جو کہتا ہے سچ کہتا ہے۔"

"میں ہی کب کہتا ہوں کہ وہ جھوٹ بولتا ہے۔ میرے کہنے کا مطلب ہے کہ وہ سچ جو ہماری زندگیوں سے مطابقت نہ رکھتا ہو ہمارے کس کام کا۔"

اس کے بعد ہماری بحث کا دائرہ معروضیت اور موضوعیت تک پھیل جاتا...... ہم دونوں خوب لڑتے آپس میں جھگڑتے رہتے، اور ہمارے چاروں طرف اداس سیاسی جھاڑیاں اپنی مخصوص مہک اڑاتی رہتیں اور دریا کے پل پر سے لوگوں کا ہجوم گزرتا رہتا۔ اس ہجوم میں آبرو باختہ شہر کے غول بھی ہوتے اور ان سوگوار انسانوں کے گروہ بھی جو اپنی آنکھوں میں ناکامیوں اور نامرادیوں کی پیاس لئے سر جھکائے چپ چاپ گزر جاتے لیکن ہم ان سے بے خبر بحث میں مصروف رہتے۔ حتیٰ کہ میں اکتا کر کوکا کولا یا چائے کی فرمائش کرتا لیکن شہاب کو ڈرنکس (DRINKS) پر اپنے پیسے ضائع کرنے سے بڑی چڑ تھی۔

"اس شہر کے لوگ ڈرنکس کے لئے دولت بھی ضائع کرتے ہیں اور وقت بھی" وہ کہا کرتا تھا "یہ لوگ چائے کی پیالیوں میں طوفان اٹھاتے رہتے ہیں حالانکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے معمولات کو منظم کریں اور بے پناہ محنت کریں...... تنظیم اور کام...... یہ وقت کی آواز ہے۔"

اور پھر یوں ہوا کہ شہاب بی۔ اے کرنے کے بعد ایک ہائی اسکول میں ٹیچر ہو گیا اور مجھے ایک امریکن انشورنس کمپنی میں معقول ملازمت مل گئی۔ اور ہم ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ اس دوستی کی وجہ کوئی لڑائی، جھگڑا نہیں تھا۔ بس یوں تھا کہ مجھے تتلیاں پسند تھیں اور شہاب کو تنہائیاں راس آتی تھیں۔

سیری انجمن آرائیوں نے مجھے لاابالی، بے پروا، اور آزاد منش لڑکوں کے گروہ میں لا پھینکا۔ ۔ ۔ ۔ طالب رحمانی، یوسف، منور اور میں رات گئے تک کافی ہاؤس میں بیٹھے رہتے اور اپنے سامنے میں سیاہ کافی کی پیالیاں انڈیل انڈیل کر کائنات کا مستقبل سنوارنے کے نقشے مرتب کیا کرتے۔ کبھی کبھی شہاب بھی ان محفلوں میں شریک ہو جاتا۔ لیکن جب طالب رحمانی بیٹا کوئی طویل رومانی افسانہ سنانا شروع کرتا تو شہاب کے ماتھے پر ناگواری کی شکنیں ابھر آتیں اور جب میں اسے الوداع کہنے کو، دس سے باہر آتا، تو وہ مجھ سے کہتا۔

"تمہارے یہ دوست باتیں بنانے کے علاوہ بھی کوئی کام کرتے ہیں یا نہیں۔ آخر یہ لوگ کیوں نہیں سوچتے کہ وقت کم ہے اور کام زیادہ۔ زندگی یوں مفت لٹانے کیلئے تو نہیں ہے۔"

"کوئی مسکرا کر شہاب۔" میں کھسیانا سا ہو کر جواب دیتا۔ "انقلاب آرہا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بدل ہی دیں گے نظام دوراں ہم ایسے آوارہ لوگ ساتھی۔ ۔ ۔"

"اگر تاریخ کوئی چیز ہے۔" وہ بگڑ کر کہتا۔ "تو میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ تم اور تمہارے ان دوستوں ایسے آوارہ ساتھی آج تک نظام دوراں نہیں بدل سکے۔"

یہ کہہ کر وہ سڑک کے دوسری طرف، دن ہجوم میں گم ہو جاتا اور جب میں واپس کافی ہاؤس میں آتا تو، یوسف برا سا منہ بنا کر کہتا۔

"یار یہ حقیقت تھی یا میں خواب دیکھ رہا تھا کہ تمہارے ساتھ ابھی ابھی ایک ایسی مخلوق تھی، جو اس کے بیسٹ میں بھی تیر رہا جو معانی رکھتا ہے۔" اور پھر کافی ہاؤس ہمارے قہقہوں سے گونج اٹھتا۔ اور لوگ مڑ مڑ کر ہمیں دیکھنے لگتے۔

شاہدہ سے بھی اب شاذ و نادر ہی ملاقات ہوتی تھی۔ کبھی کبھی یونیورسٹی بس سٹاپ پر وہ کتابیں تھامے مل جاتی، تو کہتی۔ ۔

"ہائے اللہ ندیم، ہمارے لئے تو تم اب بالکل اجنبی ہوتے جا رہے ہو۔ پتہ نہیں کہاں کہاں گھومتے رہتے ہو، کبھی ملتے ہی نہیں۔"

میں بڑی ندامت سی محسوس کرتا اور جونہی شام کے سائے گہرے ہونے لگتے، میرے قدم خود بخود شہاب کے گھر کی طرف اٹھ جاتے۔ یہ وہ دن تھے جب شہاب مذہب کا بالاستیعاب مطالعہ کر رہا تھا۔ اور اس نے دل و دماغ کو شدید مذہبی رجحانات اپنی لپیٹ میں لے رہے تھے حتیٰ کہ ایک دفعہ ایسا بھی ہوا کہ اس نے شاہدہ کی تعلیم کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ اور اسے پردے میں بٹھا دیا۔ وہ اب شہاب کی مرتبہ دکائیں، میرے سامنے بھی نہ آتی تھی۔ ایک پاگل کی وجہ سے بیچاری کی یونیورسٹی کی تعلیم ادھوری رہ گئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں بیٹھا سوچتا۔

لیکن بہت دنوں کے بعد ایک صبح جب شہاب سے اچانک ملاقات ہوئی تو میں نے محسوس کیا کہ وہ اب مذہب سے کچھ اکتایا، اکتایا سا ہے۔ اس نے مذہب کے بارے میں غلاف معمول کوئی بات نہیں کی۔ میں نے بھی اسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا اور یونہی گفتگو کے بعد ہماری یہ مختصر سی ملاقات ختم ہو گئی۔

اسی صبح کی شام کو جب میں حسب معمول کافی ہاؤس گیا تو یوسف نے مجھے دیکھتے ہی سوال کیا۔

"یار اس دن جو تمہارے ساتھ وہ عجیب و غریب مخلوق تھی وہ آج کل کہاں ہے۔؟"

"کیوں۔ ۔ ۔؟"

"میں نے آج دوپہر، کو دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں بے تحاشا سرخ ہو رہی تھیں اس نے کہیں بھنگ تو شروع نہیں کر دی۔؟"

"کیا بکتے ہو یار، وہ تو بڑا سخت مذہبی آدمی ہے۔"

"اچھا" یوسف نے یوں کہا، جیسے میری بات کا اسے یقین نہ آیا ہو۔

کافی ہاؤس میں ہم رات کے گیارہ بجے تک چوکڑی جمائے بیٹھے رہے۔ یہاں سے فارغ ہو کر جب میں گھر کی طرف جا رہا تھا، تو گیارھویں رات کے چاند کا

چہرہ زرد ہو گیا تھا۔ اور شہر کے کوچہ و بازار میں اضمحلال اور پژمردہ سی چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ جب میں اپنی گلی میں مڑا تو میں نے دیکھا کہ مجھ سے دس قدم آگے ایک انسانی ہیولیٰ دیواروں کے سائے میں شہابیوں کی طرح لڑکھڑاتا ہوا جا رہا ہے۔ میں نے غور سے دیکھا۔ لڑکھڑاہٹ کے باوجود مجھے اس کی چال سے شہاب کی شباہت آئی معاً میرے ذہن میں یوسف کا وہ فقرہ گونج گیا ...... "اس نے کہیں ڈرنک تو نہیں شروع کر دی۔؟"
...... مجھے بڑا افسوس ہوا کہ اتنا ذہین اور نفیس لڑکا جسے ابھی زندگی میں بہت کچھ کرنا ہے۔ ان راہوں پر کیسے چل نکلا ہے۔ جو تباہی کے دہانے پر جا کر ختم ہوتی ہیں۔ کہاں منزہی کتب میں اور کہاں شراب ...... وہ متضاد چیزیں ...... دو کنارے۔ جو آپس میں کبھی نہیں مل سکتے ...... لیکن شہاب، یکایک ایک کنارے سے دوسرے کنارے پر کیوں آ گیا ہے۔؟ ...... یہ سوال مجھے ساری رات پریشان کرتا رہا۔
اگلے دن ناشتے سے فارغ ہوتے ہی، میں شہاب کے ہاں جا پہنچا۔ لیکن وہ کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ شاہدہ گھر میں موجود تھی۔ میری آواز سن کر وہ بیٹھک میں آ گئی۔۔
"کیوں پردہ چھوڑ دیا گیا۔؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
"ہاں" اس نے انتہائی خوش مزاجی سے جواب دیا۔ "بھائی جان کے سر پر جو عورت سوار تھا، وہ اُتر گیا ہے ...... یہ بھی انھیں سخت مایوس کیا ہے"
"عجیب آدمی ہے تمہارا بھائی بھی۔ میری اس کی دوستی کا عرصہ کم از کم دس سال ہے۔ لیکن میں اسے آج تک نہیں سمجھ سکا۔ اچھا یہ بتاؤ۔ آج کل اس کے حال چال کیا ہیں۔ مجھ سے تو اس نے اب ملنا جلنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ میرا ایک دوست ملا تھا۔ کہتا تھا کہ ان دونوں شہاب بہت کمزور ہو گیا ہے۔"
"ہاں کمزور تو ہو گئے ہیں۔ ساری ساری رات نجانے کونسی کتابوں میں سر کھپاتے ہیں۔ دن کو بھی بہت کم سوتے ہیں۔ اسکول سے واپس آتے ہیں تو دس بیس شاگردوں کی کھیپ ساتھ ہوتی ہے۔ کھانا کھا کر ان کے ساتھ کہیں باہر نکل جاتے ہیں۔ اس طرح کمزور نہیں ہوں گے تو کیا رستم بنیں گے؟"
شاہدہ کے اس جواب نے مجھے مطمئن کر دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ مجھ سے جھوٹ نہیں بول سکتی۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوتی تو وہ مجھ سے ضرور بتا دیتی ـــ
ملک کے سیاسی حالات روز بروز خراب ہوتے جا رہے تھے۔ ہر طرف طوائف الملوکی ابتری اور انتشار کا دور دورہ تھا۔ ایسے ایسے لوگ برسر اقتدار آ گئے تھے کہ عام حالات میں ان کے منہ پر تھوکنے کو بھی جی نہ چاہتا تھا۔ کوئی دن ایسا نہ جاتا جب ایک نئی وزارت حلف نہ اٹھاتی ہو۔ اور کوئی رات ایسی نہ جاتی جب کسی وزارت کا تیا پانچہ نہ ہوتا ہو ...... ایک مضبوط خفیہ ہاتھ، اپنے اقتدار کے لئے پورے ملک کی سالمیت کو داؤ پر لگائے بیٹھا تھا۔ خوف اور دہشت کا یہ عالم تھا کہ ہر شخص نظر چرا کر اور جسم و جان بچا کے چلتا تھا ...... وطن کی ہر صبح داغ داغ طلوع ہوتی اور ہر شام خون میں نہا کر نکلتی اور ہر رات تقدیروں کا ماتمی لباس اوڑھ کر آتی۔
ایسی ہی ایک رات کا ذکر ہے ...... میں، یوسف منوّر اور طالب رحمانی کافی ہاؤس کے، ہر طرف سے تھکی تھکی اُداس اُداس چاندنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ اس چاندنی میں ہر شخص پتھر کا مجسمہ دکھائی پڑتا تھا ...... سرد، بے جان اور بے حس ...... شاید ایسی ہی رات تھی جب لوہے کی زمین میں دھنس گیا تھا۔ بغداد کے آخری خلیفہ کو بیش قیمت قالین میں لپیٹ کر بدست ہاتھیوں کے پاؤں تلے روند ڈالا گیا تھا۔ اور ردم کو شعلوں کے سپرد کر کے نیرو نے ایک پہاڑی منبر پر چڑھ کر بانسری بجائی تھی ...... ہم چاروں خاموش تھے۔ جیسے کسی ان دیکھی قوت نے ہم سے زبانیں چھین لی ہوں اور ہماری سوچوں کو حرکت کرنے سے منع کر دیا ہو ...... میں نے سگریٹ سلگایا اور سنسنی کے اس بے پناہ تنفّر کے بارے میں اندر ہی اندر سوچا۔
"وہ دیکھو" معاً منوّر نے اپنی لمبی مخروطی انگلی سڑک کی طرف اٹھا دی ...... اس کی آنکھوں میں دہشت کا خوف لرز رہا تھا۔

ہم سب نے چونک کر سڑک کی طرف دیکھا۔۔۔ بری جانب کی فٹ پاتھ پر سے شہاب، دس بیس، نو عمر لڑکوں کے جلوس میں، مشیر ابیوں کی طرح لڑکھڑاتا ہوا گزر رہا تھا۔ اس نے ایک لمبا اوور کوٹ پہن رکھا تھا، اور سر پر سیاہ جناح کیپ تھی۔۔۔۔۔۔ وہ لڑکے غالباً اس کے شاگرد تھے۔۔ ۔۔۔وہ اپنے شاگردوں کے ساتھ ہماری آنکھوں کے سامنے سے گزر گیا اور ہماری نظریں ایک تاریک گلی کے نکڑ تک اس کا تعاقب کرتی رہیں۔۔۔ گلی میں مڑنے کے بعد وہ اور اس کے شاگرد غائب ہو گئے۔۔۔۔ کسی نے کوئی تبصرہ نہ کیا۔۔ لیکن مجھے یوں لگا جیسے میرا دل اچھل کر حلق میں آیا چاہتا ہو۔

وہ رات مجھ پر بہت گراں گزری۔۔۔۔۔ عجیب آسیب زدہ سی رات تھی۔ ہر آدھ گھنٹے کے بعد میری نیند ٹوٹ جاتی اور میں ہڑبڑا کر اپنے بستر پر اٹھ بیٹھتا۔۔۔۔۔ ایسے ہی ایک وقفے میں جب آنکھ کھلی تھی تو میں نے اپنے مکان کے دروازے پر ایک بھاری ہاتھ کی دستک سنی۔ میں جلدی سے باہر نکلا۔۔۔ سفید کپڑوں میں ملبوس ایک طویل قامت شخص میرا انتظار کر رہا تھا۔ دم توڑتی ہوئی چاندنی میں اس کے چہرے کے نقوش کچھ مسخ سے دکھائی پڑ رہے تھے۔۔۔۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی مردہ، کالے چادر کے زیر اثر، اپنی قبر سے نکل کر مجھے بلانے آگیا ہو۔

"تمہارا نام ندیم ہے۔؟" اس نے کسی تمہید کے بغیر کھٹ سے سوال کر دیا۔ اس کے لہجے میں تحکم تھا۔

"جی ہاں" خوف کے باوجود، میں نے مستحکم لہجے میں جواب دیا۔

"تم شہاب کے بہت گہرے دوست ہو۔؟"

"جی ہاں"

"اسے سمجھاؤ۔ وہ آگ سے کھیل رہا ہے۔ اس نے طالب علموں میں حکومت کے خلاف زہریلا پروپیگنڈہ شروع کر رکھا ہے۔ اسے کہہ دو کہ اگر اس نے اپنا طرزِ عمل یہی رکھا تو اس کا بہت بُرا حشر ہوگا۔ اس سے زیادہ میں کچھ کہنا نہیں چاہتا۔۔"

یہ کہہ کر وہ کفن پوش مردہ گلی کے پیچ و خم میں غائب ہو گیا اور میں کئی لمحوں تک حیران و ششدر ساکت و جامد اپنی دہلیز پر کھڑا رہا۔

اس کے بعد میں نے کئی بار شہاب سے ملنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ مجھے نہ مل سکا۔ شاہدہ بھی اس کے باعث بہت پریشان تھی۔ اس کو بھی اسی قسم کی وارننگ مل چکی تھی۔

اور تب ایک دن شاہدہ نے مجھے بتایا کہ شہاب گرفتار ہو گیا ہے اور کچھ پتہ نہیں کہ اسے کون سے شہر کی جیل میں رکھا گیا ہے۔۔۔۔۔ زندگی روز بروز مشکل ہوتی چلی جا رہی تھی۔

شاہدہ شہاب کے بعد اپنے گھر میں اکیلی رہ گئی تھی۔ میں نے اپنی بہن سے کہا۔ وہ اسے اپنے پاس لے آئی۔ شہاب کی گرفتاری نے اس کے دل و دماغ پر بڑا اثر ڈالا تھا۔ اور وہ یوں مضمحل سی ہو کر رہ گئی تھی جیسے لو کے تھپیڑوں سے گلاب کی پتی کمھلا کر رہ جائے۔ اس کی باتوں میں تلخی آگئی تھی۔ شہاب کا کوئی اتا پتہ نہیں ملتا تھا۔ میں نے سر توڑ کوشش کی کہ کم از کم اس جیل کا پتہ چل جائے جہاں اس کو رکھا گیا ہے۔ لیکن میری ہر کوشش ناکام ہو گئی۔

کئی دنوں کی ذہنی کشمکش کے بعد، ایک صبح، ڈاک میں ہمیں ایک خستہ سا کٹا پھٹا، لفافہ ملا۔ جس پر کئی اجنبی مہریں ثبت تھیں۔ ہم ناشتہ کر رہے تھے۔ میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے چائے کی پیالی کو بریچ میں رکھا یا اور جلدی سے لفافہ چاک کیا۔ شہاب کا خط تھا۔ اسے لاہور کے قلعے میں محبوس رکھا گیا تھا۔ اور اب وہ ملتان سنٹرل جیل میں تھا۔ اسے پہلی دفعہ خط لکھنے کی اجازت ملی تھی۔ اس نے شاہدہ کی خیریت دریافت کی تھی۔ ان رسمی باتوں کے بعد اس نے صرف فیض کی ایک نظم "اے دل بیتاب ٹھہر" لکھ بھیجنے پر اکتفا کیا تھا۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

....

رات کا گرم لہو اور بھی بہہ جانے دو
یہی تاریکی تو ہے غازہ رخسار سحر
صبح ہونے ہی کو ہے اے دل بیتاب ٹھہر

اور پھر۔۔۔

....

....

اپنے دیوانوں کو دیوانہ تو بن لینے دو
اپنے میخانوں کو میخانہ تو بن لینے دو
جلد یہ سطوت اسباب بھی اٹھ جائے گی
وہ گرانباری آداب بھی اٹھ جائے گی
خواہ زنجیر چھنکتی ہی، چھنکتی ہی رہے

اس خط میں واضح طور پر کچھ لکھنے کی بجائے شہاب نے جو فیض کی یہ نظم لکھ بھیجی تو مجھے بھی بے اختیار فیض کا وہ شعر یاد آ گیا۔

ادھر تقاضے ہیں مصلحت کے ادھر تقاضائے درد دل ہے
زباں سنبھالیں کہ دل سنبھالیں اسیر ذکر وطن سے پہلے

اور اس کے ساتھ ہی مجھے وہ دن یاد آ گیا، جب شہاب نے کہا تھا۔

"فیض کے بارے میں یہ میری ذاتی رائے ہے کہ وہ ایک ہنگامی شاعر ہے، جسے وقت کی ایک تیز رو سطح نے ابھار دیا ہے۔ ایک دور آئے گا کہ لوگ اسے بھول جائیں گے۔"

میں نے مسکراتے ہوئے لفافہ شاہدہ کے حوالے کر دیا۔ جیسے ایک عرصے کے بعد اپنے گمشدہ بھائی کی خبر ملی تھی۔ اس کے بعد بھی مسلسل شہاب کے خط ملتے رہے۔ اور ہر خط میں وہ واضح طور پر کچھ لکھنے کے بجائے فیض کی کوئی نظم یا غزل لکھ بھیجتا تھا۔ وہ جو اپنی زبان میں کچھ نہ کہہ سکتا تھا، فیض کی زبان میں سب کچھ کہہ جاتا تھا۔ اور سنسر والے، اپنی جہالت کے طفیل، یہ سب کچھ ہم تک اور ماں سب تک جن کو شہاب مخاطب کرتا تھا، پہنچا دیتے تھے .... وہ بیچارے رخسار کے خم اور کاکل کی شکن کی زبان کیا سمجھیں۔؟

دن گزرتے رہے۔ اور آخر وہ دن بھی آ گیا، جب بادصبا نے اپنے وعدہ و پیمان پورے کئے اور اہل قفس کی آنکھ صبح چمن میں کھلی۔ تاریکی غازہ رخسار سحر بن گئی۔ شب سست موج کو ساحل مل گیا اور سفینۂ غم دل انقلاب کے کنارے آن لگا۔ زندانوں میں زنجیریں چھلیں اور محل گر ٹوٹ گئیں۔

میں شہاب کو لینے ملتان گیا جب وہ جیل سے باہر نکلا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کے پھول کھل رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں روشنی تھی۔ میں نے لپک کر اس کو گلے سے لگا لیا۔

"یار آخر تم رہا ہو ہی گئے۔ ہم تو دل چھوڑ بیٹھے تھے۔" وفور جذبات سے میری آواز کانپ رہی تھی۔ وہ خاموش تھا۔

"یار بہت ظالم تھے وہ جنہوں نے تمہیں جیل میں ڈالا" میں بدستور جذباتی ہو رہا تھا۔ اس نے ایک قہقہہ لگایا اور کہنے لگا۔

نہیں شکایت ہجراں کہ اس وسیلے سے ✽ ہم ان سے رشتۂ دل استوار کرتے رہے

میں ہنس پڑا۔

"اور کچھ ہو یا نہ ہو البتہ جیل نے تمہیں فیض کا شیدائی بنا دیا ہے۔"

اور پھر رات کی ٹرین سے ہم دونوں اپنے شہر لوٹ آئے۔

زندگی ایک بار پھر معمول پر آ گئی۔ دواں دواں ہو گئی۔ . . . . . میں، منور، یوسف، اور طارق رحمانی پھر کافی ہاؤس میں محفلیں جمانے لگے جیسے ہم سب کو نئی زندگی مل گئی۔ لیکن میں کچھ اداس اداس تھا۔ شاہدہ شہاب کی رہائی کے بعد اپنے گھر چلی گئی تھی اور مجھے یوں لگتا تھا، جیسے مجھ سے میری عزیز ترین متاع یک بیک چھین لی گئی ہو۔ اگرچہ وہ مجھ سے دور نہیں تھی۔ میں چند قدم چل کر اس کے قریب جا سکتا تھا۔ اس سے باتیں کر سکتا تھا۔ لیکن پھر بھی نجانے کیوں، جب میں اپنے گھر میں داخل ہوتا تھا تو محسوس ہوتا تھا جیسے یہ گھر نہیں ایک وحشت تنہائی ہے اور اس وحشت تنہائی میں اس کی آواز کے سائے لرزاں ہیں، اس کے پیکر کے سمن اور گلاب کھل رہے ہیں۔

شہاب سے حسب معمول کئی کئی دن ملاقات نہیں ہوتی تھی۔ وہ عموماً سارا سارا دن گھر سے غائب رہتا تھا۔ اس کی عدم موجودگی میں مجھے بار بار اس کے گھر جانا اچھا نہیں لگتا تھا۔

ایک اتوار کی صبح کو میری طبیعت بہت کسلمند تھی۔ کہیں جانے کو جی نہ چاہتا تھا۔ ناشتے کے بعد میں نے سوچا کہ یوں خالی بیٹھے رہنے سے بہتر ہے کہ چل کر شہاب سے گپیں ہانکی جائیں۔ یہ دو قدم ہی تو ہے اس کا گھر۔ چنانچہ میں نے سلیپر پہنے اور اس کے پاس چلا گیا۔ وہ ابھی تک بستر پر دراز تھا۔ اور اخبار پڑھ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ اٹھ بیٹھا اور مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔

"اب تو تم ہمارے لئے عنقا ہو گئے ہو۔"

"جناب، عنقا میں نہیں بلکہ تم ہو گئے ہو۔ اتنی دفعہ تمہارے گھر آیا۔ لیکن تم تو جیل سے کیا ہو آئے کہ اب گھر میں ٹکتے ہی نہیں۔ دوبارہ جیل جانے کا ارادہ ہے کیا۔؟"

وہ ہنس پڑا . . . . . اتنے میں شاہدہ اپنے دوپٹے کے پلو سے ہاتھ پونچھتی ہوئی آ گئی۔ وہ شاید آٹا گوندھ کر آ رہی تھی۔

"آ ہا آج آپ کہاں بھول پڑے۔ بھئی کئی کئی دن ہو جاتے ہیں، نہ آپ آتے ہیں اور نہ آپ کی بہن بہتر منہ نکل دکھاتی ہیں . . . . . اچھا خیر چائے پئیں گے۔؟"

"اور یہ تو سراسر تہمت ہے کہ میں کئی دفعہ تمہارے گھر آیا، لیکن تم نہیں ملے۔"

"جھوٹ . . . . . بالکل جھوٹ" شاہدہ نے دزدیدہ نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے شرارت سے آنکھ میچ کر کہا: "کمال کرتے ہیں آپ بھی شہاب بھائی۔ یہ اور ہمارے گھر آئیں . . . . . اچھا بھئی چھوڑو، یہ بتاؤ چائے لاؤں۔؟"

وہ چائے لینے چلی گئی اور میں حسب عادت دائیں طرف رکھے ہوئے بک شیلف میں کتابیں دیکھنے لگا۔

"شہاب یار میں کئی دن سے تم سے ایک بات پوچھنا چاہ رہا تھا۔ اب یہ بک شیلف میں فیض کے شعری مجموعے دیکھ کر مجھے پھر وہ بات یاد آ گئی ہے"

"میں جانتا ہوں" اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "تم فیض کے بارے میں پوچھو گے۔ ہاں، اس کے متعلق میں نے اپنی رائے بدل دی ہے"

"لیکن آخر کیوں۔ تم تو کہتے تھے کہ فیض جس نظریے کی تبلیغ کرتا ہے وہ ہمارے معاشرے کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا۔؟"

"ہاں، میں کہتا تھا۔ لیکن غلط کہتا تھا۔ دراصل اس وقت تک میں زندگی کی اجتماعی جدوجہد میں نہ صرف شریک نہیں تھا۔ بلکہ اس جدوجہد کو ذرا سی بھی نہیں رکھتا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ یہ ادراک مجھے نجمہ زیدی نے عطا کیا۔"

"وہ کون تھی۔؟" شہاب نے یہ نام اسکے سامنے پہلی بار لیا تھا۔ اور میں حیران تھا کہ ایک لڑکی بھی شہاب کو متاثر کر سکتی ہے۔

"وہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" شہاب کی آواز جیسے خوابوں کی وادی میں سے آرہی تھی "۔ ۔ ۔ وہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک ایسی لڑکی ہے جو ہر شخص کو کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں ضرور ملتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کوئی اسے پہچان نہ سکے اور کوئی پہچان لے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے اسے پہچان لیا تھا۔"

میں نے غور سے شہاب کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں کہیں دور خلاؤں میں کھوئی ہوئی تھیں۔

"وہ ان دنوں کی جب میں طلباء میں ایک تحریک کے لئے کام کر رہا تھا جس کا مقصد جبر و استبداد کے خلاف بغاوت تھا۔ جو وطن کے شب و روز کو شرمسار اور حسین بنانا چاہتی تھی اور جس کی پاداش میں مجھے جیل جانا پڑا۔ وہ ایک مقامی گرلز ہائی اسکول میں ٹیچر رہی ہے اور ان دنوں وہ اس تحریک میں ہماری رفیق تھی۔"

وہ ایک لمحے کے لئے رکا اور پھر کہنے لگا۔

"میں پہلے اس نظریے پر اب کم سا قائم ہوں کہ انتہا پسندی ہمارے مزاج سے لگا نہیں کھاتی۔ میں یہ بھی کہتا ہوں کہ زندگی مارکسیت کا نام نہیں۔ لیکن زندگی محض بدھ ازم، عیسائیت یا اسلام کا نام بھی نہیں۔ زندگی کرشن بھی ہے اور اسلام بھی۔ زندگی نیرنگ بداماں ہے، الھڑ البیلی ہے متحرک ہے۔ سنجیدہ بھی ہے اور کھلنڈری بھی، گریاں بھی ہے اور خنداں بھی۔ زندگی عظیم ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فیض کو محض انتہا پسند شاعر قرار دینا ظلم ہے۔ وہ تو زندگی کا شاعر ہے۔ اسی نیرنگ بداماں اور عظیم زندگی کا شاعر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ سب کچھ مجھے نجمہ زیدی نے بتایا تھا۔"

"یہ بیچ میں فلسفے کو کہاں سے گھسیٹ لائے، تم نجمہ زیدی کے بارے میں بتا رہے تھے۔" میں نے کہا۔

"ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ اس تحریک میں وہ ہماری رفیق تھی۔ اس تحریک نے مجھے ہر اس شاعر کے نزدیک کر دیا تھا جس کی تخلیقات نامساعد حالات میں حوصلہ دیتی ہیں، مصائب اور تصادم کے طوفانوں سے گذرنا سکھاتی ہیں اور آزادی کی پکار سے قوت و حرارت حاصل کر کے، حق و صداقت کا نور پھیلانے کی تلقین کرتی ہیں۔ چنانچہ لازمی طور پر میں فیض کے بھی قریب آگیا۔ اور جس رات میں گرفتار ہوا ہوں، اس رات میں نجمہ زیدی کے گھر بیٹھا تھا۔ سارے دن کے بے پناہ کام نے ہمیں تھکا دیا تھا۔ وہ چائے بنا کر لے آئی تھی۔ اور میں نے تھکے تھکے لہجے میں فیض کی وہ نظم "نثار میں تری گلیوں پہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" گنگنانی شروع کر دی تھی۔

"کیا گنگنا رہے ہو۔؟" نجمہ نے پوچھا تھا۔

میں نے یہ نظم اسے سنانے کیلئے اپنی گنگناہٹ کا آہنگ ذرا اونچا کر دیا۔

"اوہ، فیض ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" اس نے گہرا سانس لیکر کہا تھا "وہ واقعی ایک عظیم شاعر ہے۔"

"اسے میں ایک تحریکی شاعر تو ماننے لگا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن فنی اعتبار سے بھی وہ عظیم ہے۔ اس میں مجھے شک ہے۔" میں نے کہا تھا۔

میرا خیال تھا کہ میرے جواب میں ۔ ۔ وہ سنی سنائی باتیں دہرا دیگی۔ لیکن اس نے کہا تھا۔

"اس کی وجہ یہ ہے کہ تم نے فیض کا بالاستیعاب مطالعہ نہیں کیا۔ اور تم بھی، عام لوگوں کی طرح اسے ایک اشتعالی شاعر سمجھتے ہو۔ حالانکہ وہ اشتعالی شاعر نہیں ہے۔ وہ تو رنگ برنگ زندگی کا شاعر ہے۔ تم نے اس کی وہ نظم پڑھی ہے، جس کا عنوان "دو آوازیں" ہے۔؟ اگر نہیں پڑھی ہے تو پڑھو۔ اس نظم میں امید اور ناامیدی، عزم اور یاس، عمل اور بے عملی کی کشمکش کا شاعرانہ اظہار بہت ہی دلکش ہے ۔ ۔ ۔ ۔ سنو میں تمہیں سناتی ہوں

پہلی آواز کہتی ہے -

جب کنجِ قفس مسکن ٹھہرا اور جیب و گریباں طوق و رسن
آئے کہ نہ آئے موسمِ گل، اس دردِ جگر کا کیا ہوگا

دوسری آواز یوں حوصلہ دیتی ہے -

ان طوق و سلاسل کو ہم تم سکھلائیں گے شورشِ بربط و نے
وہ شورش جس کے آگے زبوں ہنگامۂ طبلِ قیصر و کے

اس کے علاوہ فیض کی نظمیں ..... "تنہائی" .. "کتے" "شاہراہ" "ہم لوگ" "اور اے دل بے تاب ٹھہر" ..... وہ نظمیں ہیں جو علامتی ہیں اور علامت و رمز کے موزوں استعمال کی وجہ سے نہایت ہی وسیع الاثر ہو گئی ہیں -"

ابھی وہ یہ باتیں کر ہی رہی تھیں کہ دروازے پر پولیس نے دستک دی اور مجھے گرفتار کر لیا گیا - نجمہ زیدی کو انہوں نے، نجانے کیوں، معاف کر دیا - لیکن بعد میں پتہ چلا کہ کچھ دنوں کے بعد وہ بھی گرفتار ہو گئی تھی ..... مجھے جب پولیس اپنے ساتھ لیجانے لگی تو نجمہ نے مجھے فیض کی شعری مجموعے دیئے اور کہا -

"یہ عظیم کتابیں تمہیں جیل میں میری یاد دلاتی رہیں گی -"

اور یوں فیض کا درد دبے پاؤں میرے رگ و ریشہ میں سرایت کر گیا۔ اور آج مجھے جب ان الفاظ کا خیال آتا ہے جو میں نے بہت مدت ہوئی تم سے کہے تھے ..... "فیض ایک ہنگامی شاعر ہے" ..... تو مجھے ہنسی آتی ہے - زندگی کا درد کبھی ہنگامی نہیں ہوتا"

یہ کہہ کر شہاب خاموش ہو گیا -

"نجمہ زیدی آج کل کہاں ہیں - ؟" میں نے پوچھا -

"اسی اسکول میں ہے، جہاں پہلے تھی"

"تم اس سے شادی کیوں نہیں کر لیتے - اکیلے میں تمہارا اور شاہدہ کا بھی گھبراتا ہوگا" میں نے فراخی لہجے میں کہا -

"شہاب نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا - اس کی سیاہ آنکھوں میں چمک سی پیدا ہو گئی -

"شاہدہ تمہارے ساتھ تنہا نہیں رہے گی - اور میں ..... میں واقعی نجمہ سے شادی کروں گا - تاکہ فیض ہمیشہ میرے قریب رہے، مجھے حوصلہ اور اُمنگ بخشتا رہے - اس کے درد کو میں تمام زندگی اپنے سینے کے ساتھ لگائے رکھنا چاہتا ہوں"

میری پلکیں خود بخود جھک گئیں ..... شاہدہ چائے لے آئی اور پیالی میں چمچ گھماتے ہوئے میں نے دیکھا کہ شیلف میں رکھے ہوئے فیض کے شعری مجموعوں کو نصف النہار کے سورج کی سنہری شعاعیں، روشندان میں سے آ کر چوم رہی تھیں -

باہر فضا فضا میں، بہار کی خوشبو دبے پاؤں پھیل رہی تھی -

ایک آٹوگراف

"بلسنکو اگر اتنا بڑا انسان بھی ہوتا جتنا بڑا فن کار تھا تو شاید ہمیں اس کا ماتم اتنا جلد نہ کرنا پڑتا"

— فیض

رفعت

خدا وہ وقت نہ لائے

اُس نے آہستہ سے ناہید کی آٹوگراف بُک اٹھائی۔ صفحے پلٹے۔

..... یہ کیا..... یہ کیا.....

جیسے ماضی اُس کے سامنے ناچ اُٹھا ـــــ

اُسے کس قدر عقیدت تھی، عقیدت بھی نہیں بس فیض کے ایک ایک شعر پر جسم میں نشیلی سی لہر دوڑ جاتی..... چھُپ چھُپ کر اُس کا کلام پڑھا کرتی، بلکہ فیض کا ابتدائی کلام تو اسے زبانی یاد تھا۔

فیض تمہارا کیا لگتا ہے؟ ..... اُس نے شعر پڑھتے ہوئے بارہا اپنے آپ سے پوچھا تھا ـــــ اور جسم میں اُٹھتی ہوئی ہر لہر نے بڑا نشیلا سا جواب دیا تھا.....

کیا فیض بھی کسی سے محبت کرتا ہے؟ کس کو چاہتا ہے؟..... وہ کون ہے؟ ..... وہ کیسی ہے؟ کہتے ہیں ہر شاعر کی ایک محبوبہ ہوتی ہے جسے وہ چاہتا ہے جس کی جُدائی میں وہ شعر کہتا ہے ـــــ ہجر و فراق کی ہی تڑپ تو اُسے سوز میں ڈوبے ہوئے شعر عطا کرتی ہے۔ وہ محبوبہ..... وہ کون کم بخت ہے جو اس کے قریب نہیں آتی۔ اُسے تڑپاتی ہے ..... یہ کس کے رسیلے ہونٹ اور حسین آنکھیں مانگتا ہے ..... اوہو..... فیض تجھے کیا پتہ۔ تیرے لئے تو خود کسی کا حسن بے قرار سا ہے ـــــ وہ خود ہی شرما کر اس رسالے میں چہرہ چھُپا لیتی جس میں اور جس صفحے پر فیض کا کلام چھپا ہوتا۔

پھر ایک بار ایسا بھی ہوا ـــــ اُسے فیض کو بڑے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا..... تمہارا دل جسے چاہتا ہو، تصور ہی تصور میں جسے تم نے پوجا ہو..... جب وہ عین تمہارے سامنے آجائے تو پھر..... ہائے یہ دل پھر اس بے ڈھنگم طریق سے کیوں ڈھول پیٹ ڈالتا ہے..... اور جسم کی ساری لطافت، ساری مہک، قطرہ قطرہ بن کر ٹھنڈے پسینے کا روپ کیوں دھار لیتی ہے..... وہ سمجھ ہی نہ پائی ـــــ اب تک سمجھ نہیں سکی ـــــ مشاعرے پر وہ کالج تشریف لائے تھے ـــــ لڑکیاں مری مٹی تھیں..... اُس نے اپنی آٹوگراف بُک سنبھالی اور فیض تک جانے کا راستہ تلاش کرتی رہی۔ مشاعرہ ختم ہوگیا۔ فیض کے گرد ڈھیر ساری آٹوگراف بُک نظر آنے لگیں۔

میں کس طرح بڑھوں ـــــ اس سے کس طرح کہوں..... وہ تو جانے کو تیار ہے..... کیا میری یہ خواہش بھی پوری نہیں ہوگی ـــــ پھر وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھی ـــــ یہ تاثیر ہیں اور یہ پیپرس ..... شاید میری مدد کردیں..... تم دُور کیوں کھڑی

ہو۔۔۔ آگے آجاؤ ناں ۔، ۔۔۔۔ فیض! ایس وچاری نوں وی کجھ لکھ دے ۔۔۔۔۔ ایہہ تے بڑی اداس اداس کھلوتی اے'
اس نے اس شفقت بھری آواز کی طرف دیکھا ۔۔۔ چہرے پر مسکراہٹ اور مسکراہٹ میں خلوص نہیں ملنر ۔۔۔۔۔ "آؤ
۔۔۔ ادھر آؤ ۔۔۔۔ " اس نے بڑھ کر آٹوگراف بک فیض کو تھما دی ۔۔۔۔۔ "اتنی اتنی سی باتوں پر یوں مایوس اور اداس
نہیں ہوتے " کہتے ہوئے انہوں نے کچھ لکھا اور آٹوگراف بک واپس کر دی ۔ شکریہ" کہتے ہوئے جیسے اس کا سارا
جسم کانپ گیا آنکھوں میں جذبات کی ایک دنیا امڈ آئی ۔۔۔ وہ دوسری بار پلٹی اور فیض کے دوست کا شکریہ ادا کر کے واپس
آگئی ۔۔۔۔ دھیرے دھیرے چلتے ہوئے اس نے فیض کی تحریر کا سامنا کیا۔

" خداوہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو ۔۔۔۔ "

اس کے قدم ڈگمگا گئے ۔ جذبات قطرہ قطرہ بن کر روئیں روئیں سے پھوٹنے لگے ۔

"یہ تم نے دعا دی ہے ۔ یا ۔۔۔۔ کیا تم نے میرے کانپتے ہوئے جسم اور سہمی اور خاموش نظروں سے کچھ سمجھ لیا ۔ ؟ کیا تم نے جان لیا کہ میں وہ ہوں جو تمہارے شعروں میں رچ بس جانے کا سوچا کرتی ہوں ۔۔۔ کیا تم اب بھی اپنی نگاہوں میں حسن اور رس مانگا کرو گے ؟ ارے تم فرمائش کیوں نہیں کرتے ؟ تم نئی قدروں کے حامی ہو ۔ تم نے نئے تقاضوں کو محسوس کیا ہے ۔۔۔۔ تم اختر شیرانی کی طرح اپنی محبوبہ کو سات پردوں میں چھپا کر صرف اپنے لئے ہی محدود رکھو گے نا ! "

اوہوں ۔ ہوں ۔۔۔۔ مجھے سرعام نہ پکارنا ۔۔۔۔ ہاں ۔۔۔۔ ، اس نے دھیرے سے آٹوگراف بک کے گلابی موٹے چکنے کاغذ کو ہونٹوں سے لگا لیا ۔

فیض نے انگریز عورت سے شادی کر ڈالی ۔۔۔ یہاں کی لڑکیوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی ۔۔۔۔ یہ اپنے پڑھے لکھے لوگ قابل ہوتے ہیں تو باہر والیوں کو قبولیت کا شرف بخشتے ہیں ۔۔۔ کم بخت !

اس دن اس نے اپنی آٹوگراف نکال کر دیکھی ۔

"اتنی اتنی سی باتوں پر یوں مایوس اور اداس نہیں ہوتے ۔ یہ فیض نے کہا تھا ۔۔۔ یہ تو فیض آج بھی کہہ رہا ہے ۔ اتنی سی' بات ۔۔۔ شاعر کی بیوی بننا تو آسان بات ہے ۔ بڑا مرتبہ تو محبوبہ کا ہوتا ہے ۔۔۔ ہاں ۔۔ اس نے جی ہی جی میں اپنے مایوس ہوتے ہوئے ذہن کو تسلی دے ڈالی ۔ اچھا ہوا ۔ ملکی لڑکی کو بیوی نہ بنایا ۔۔۔ ورنہ ۔۔۔۔ ورنہ اگر وہ بھی میری ہی کلاس کی ۔ یا اردگرد کی ہوتی تو میں مارے رقابت کے خودکشی کر ڈالتی ۔

اگر وہ ملکی بیوی سے شادی کرتا ۔۔۔ تو پھر یہ نظم کون لکھتا ۔ میرے ندیم ۔ کہ اپنے فسانے کون سناتا ۔ فیض محبت ہے یہاں کی محبتیں فنا ہو گئیں ۔۔۔ مشرقی محبت تو مشرقی لڑکی کی طرح ذرا سے دباؤ میں آن کر اور بھی سنور جاتی ہے ۔۔۔۔ ہاں ۔ اس نے فیض کی ایک اور تصویر اپنے البم میں لگا ڈالی ۔

فیض کی شاعری کی طرح اس کی زندگی بھی قدم قدم بڑھتی چلی گئی ۔

فیض کی اپنے ملک سے وابستگی بڑھتی گئی ۔۔۔ اور اسے اپنے خاوند اور بچوں میں دلبستگی کا سامان مل گیا ۔ فیض جدید نظرئے کا علمبردار ہے ۔ وہ نئے تقاضوں کو جس طرح محسوس کرتا ہے اسی طرح پیش کرتا ہے ۔ فیض کے رومان کا انجام ہو گیا ۔۔۔ وہ رومان کا نہیں صرف احساسات کا شاعر ہے

یہ فیض اچھا بھلا لکھتے لکھتے کیا لکھنے لگا ۔ نری بکواس ـــ یہ سب شاعر کا کام نہیں کسی سیاسی لیڈر کا ہے ۔ فیض کو سیاست نہیں جچتی ـــ

فیض محبت کرنا نہیں جانتا ۔ فیض کے پاس کوئی الجھن نہیں تھی ۔ کوئی رقیب نہیں تھا اس لئے اس نے ملک کے ایک مخصوص طبقہ پر لکھ لکھ کر پارٹیوں میں الجھ کر رقیب و محبوب کا ماحول پیدا کر لیا۔

یہی تو جدید تطریہ ہے ۔ اب کیا فیض پرانے شاعروں کی طرح جالی دار چولی اور سوہاف بندھی چوٹی کے قصے سنتا ـــ بھئی دیکھو ـــ فیض کی شاعری میں بھی دہکتے ہوئے رخساروں، سرخ ہونٹوں اور نیم خوابیدہ شبستانوں کا ذکر آتا ہے مگر وہ ان میں کھو کر اپنے گرد و پیش کو بھولتا نہیں ـ وہ محبوبہ سے معذرت چاہ لیتا ہے

مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

صاف ظاہر ہے وہ محبت کرتا بھی ہے کرنا جانتا بھی بلکہ چاہتا بھی ہے کہ محبت کرے ـ مگر اس کے ذہن کے خوبصورت خیالوں پر وہ تصویریں چھا جاتی ہیں جو اس کی نگاہیں دیکھتی ہیں ـــ اگر آج وہ ان سب سے نظر بچا کر محبوبہ کے جسم سے لطف اندوز ہوتا ہے تو کل آنے والی نسلیں اسے تیرو کہیں گی جو جلتے ہوئے روم کی طرف سے آنکھیں موندے اپنی بانسری بجا رہا تھا ـــ ہمیں خوشی ہے کہ فیض نے اپنے جسم سے بغاوت کرکے اپنے ذہن پر قبضہ کر لیا ـــ اپنی محبوبہ کو موضوع سخن دے کر اسے بولنا بھی سکھا دیا اور اسے "چند روز اور" کی امید دلا کر "شیشوں کے مسیحا" کے نہ ہونے کا بھی یقین دلا دیا ـــ فیض نے اپنی محبوبہ کو کبھی دھوکے میں نہیں رکھا۔

یہ لوگ کلبوں، کافی ہاؤسوں اور گھر کی بیٹھکوں میں فیض کا تذکرہ کرتے تو وہ جی ہی جی میں خوش ہوتی ۔ یہ فیض کو لوگ کس کس روپ میں کس کس رنگ میں ڈھال رہے ہیں ۔ اس نے انہی دنوں فیض کی ایک تصویر اپنے ڈرائنگ روم میں لٹکائی تھی اور اپنے ملنے والوں سے فیض کا تذکرہ بڑی شان سے کرتی ـــ میں نے ان کے فلاں شعر پر یوں داد دی ۔ فلاں جگہ یوں کہا ۔ اپنے تصوریں کی ہوئی باتیں وہ محفل میں سنا سنا کر لوگوں پر رعب ڈالتی ـــ اور پھر انہیں پکا یقین دلانے کے لئے اپنی آٹوگراف بک دکھا دیتی ۔ فیض نے کتنے پیار سے لکھا تھا ـــ وہ کہتے تھے ہمارے نوجوان طبقہ کو ہماری نئی نسل کو بہت کچھ کرنا ہے ۔ ملک میں انقلاب لانا ہے ۔ میں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ ہم لوگ آپکی پارٹی میں شامل ہوں گے ۔ وہ ایسی باتیں سنا سنا کر رات گئے دیر تک خود ہی سوچتی ـــ اب اگر فیض ملیں ـ اوہوں وہ کہاں مل پائیں گے ـــ کاش فیض! تم نے اختر شیرانی کی طرح اپنی محبوبہ کا نام لے دیا ہوتا ـــ پھر میں اپنا وہی قلمی نام رکھ لیتی ـــ اور اپنی بیاہتا زندگی کے اس کچھا کچھ بھرے خول کی گھٹن سے نجات پانے کو کبھی کبھی تمہارے شعروں کو پڑھ کر واقعی تسلی کر لیا کرتی ـ مگر تم تو بس عوام کے شاعر ہوتے چلے جا رہے ہو ـ تم اپنی محبوبہ سے کیوں نہیں کچھ مانگتے ـ تم اس کے قریب آن کر بھی اسے یہ کیسی "آوازیں" سناتے ہو کہ وہ حیران حیران سی ہر چیز کو سمجھتے جانتے ہوئے بھی اپنے ہاتھ میں کچھ نہ پا کر خاموش ہو جاتی ہے ـــ فیض!

مگر یہ چند روز کی تسلی دے کر فیض تو زنداں کی شام منانے نکل گیا۔

"یہ کیا ـــ ہ" وہ کانپ اٹھی ـــ اتنے ذمہ دار افسر کی بیوی ہوتے ہوئے اس نے پہلا کام یہ کیا کہ ڈرائنگ روم سے فیض کی تصویر اتار کر وہاں "چغتائی" کا فن آویزاں کر دیا۔

فیض - میں نے تو سوچا تھا - اختر شیرانی کی سلمیٰ کی طرح گلی سے نکل کر تمہارے جنازے پر پھول ڈالوں گی اور برقعے میں لپٹی لپٹی دور چلی جاؤں گی ـــ لوگ کہیں گے یا فیض! جس سے رشتے ہوتے ہیں اور مریں یا جیتے انتظار رہا ـ جس کے حسن کو سلام اور جیسے چند روز اور ۔ کی تسلی دیتا ہوا اپنے دل کی بیتابی کو ہر ساون بھولنے کا مشورہ دیتا رہا ـــ یہ وہ تھی ـــ وہ آئی تھی ـــ وہ فلاں لڑکی تھی ـــ نہیں ـــ وہ فلاں عورت تھی ـ اس کی ماں ہے ـ نہیں فلاں بڑے آفیسر کی بیوی تھی جو اس سے عشق کرتی رہی .... فیض کو اس کا پتہ تھا ..... زندگی میں دونوں حالات کے ہاتھوں مجبور رہے اور مرنے کے بعد ـــ موت کے سامنے تو ہر فرد مجبور ہوتا ہے ـ

مگر فیض تم تو جیتے جی ـــ چھین لئے گئے ـــ تمہیں انگریز بیوی کے ساتھ دیکھ کر دل میں رشک کا جذبہ ابھرتا تھا ـ مگر تمہیں اب اتنے بڑے رقیب کے قریب میں دیکھ کر تو ہول اٹھتا ہے ـ مگر اچھا ہو تم ـــ زنداں کی تیرہ و تار شام سے بہل گئے ـــ زنجیروں میں تمہیں آہٹ ـ نغمے اور دل کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں ـ

کئی بار وہ فیض کے اس دوست کو دیکھتی ـ اس کا کلام سنتی اور مسکرا دیتی ـــ اب تو وہ واقعی بزرگ ہوتا جا رہا ہے .... اور میں .... اس نے اپنی نادان عمر اور نادان آنسوؤں کی گواہ اس آٹوگراف بک کو نہیں دیکھے کسی فائلوں میں ڈال دیا ـــ زندگی خراماں خراماں چلتی چلی گئی .... اب تو اپنی بچیاں جوان ہوتی ہیں ـــ کانونٹ اور سینٹ جوزف میں پڑھنے والی لڑکیاں ـ اردو ادب کو کیا جانیں ـــ مگر ناہید کو تو فیض پسند تھا ـ اس کے تکیے اس دن فلم فیئر پڑا ہوا تھا ـ مینا کماری نے اپنے حالات لکھے تھے اور اس نے فیض کے چار شعروں سے آغاز کیا تھا ـ ناہید نے یہ صفحہ سنبھال کر رکھا ہوا تھا ـ

ـ ممی ـ دیکھنا ـ مینا کماری نے کتنے اچھے شعر چنے ہیں فیض کے ـــ کتنے سوئیٹ ـ بالکل اسی ریڈرز کی طرح جو مینا کماری نے پکڑ رکھا ہے ـ ممی آئی لائیک فیض اینڈ ہز پوئٹری ویری مچ .... "

اس نے ناہید کے گال تھپتھپا دیئے ـــ پگلی ـ فل بی بی ـــ یہ فیض کو کیا سمجھ پائے گی ـ میں بھی اسے نہیں سمجھ پائی جو اس کے ساتھ عمر اور زندگی کی منزلیں طے کرتی چلی آ رہی ہوں ـــ فیض رومان کا شاعر قرار دیدیا گیا ـ جدید تقاضوں کا علمبردار کہلایا ترقی پسند کہا گیا ـ اور پھر یہی نئے احساسات یہی جدید تقاضوں کی پسندیدگی اور پرانے نظریوں سے بغاوت اسے کمیونسٹ بنا کر قید خانے تک لے گئی ـــ اور میری بچی ناہید اس کے رومانٹک شعروں کو پسند کرتی ہے ' ـــ اس نے جھک کر مینا کماری والا فلم فیئر اٹھا لیا

لے گئے ساتھ میری عمرِ گزشتہ کی کتاب
اس میں تو میری بہت قیمتی تصویریں تھیں

ہوں ـــ واقعی ـــ ' وہ ہنس دی ـ

فیض تو بوڑھا ہو گیا اب ـــ اب تو اس کی شاعری پر بھی خزاں آ گئی ـــ لینن پرائز تو لے ہی گیا ـ مگر حکومت اسے کیوں کر اجازت دے گی ـــ یہ بھی حکومت کی پالیسی ہے ـ حکومت کی پالیسی ـــ وہ مسکرا دی ـــ تمہیں لوگ کن کن رنگوں میں رنگتے اور کیسے کیسے روپ دیتے ہیں فیض ـ !

آرٹ کونسل سے واپس آ کر ناہید نے آٹوگراف بک میز پر ڈال دی تھی اور چپ چاپ اپنی کتاب لے کر بیٹھی

پڑھ رہی تھی۔ وہ بہت تعدکرکے آرٹ اونسل گئی تھی۔ فیض کی شام کے پروگرام میں شرکت کرنے ۔ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اور وہ اس کی طرف بڑھی۔ نا ہید کی سہیلی کا فون تھا۔ وہ اسے بتا رہی تھی۔

"ہاں۔ ہاں۔ میں پاپا کے ساتھ گئی تھی۔۔ ارے سنو تو۔۔ ایک شخص ململ کا کرتا پاجامہ پہنے تھا۔ سگریٹ پر سگریٹ پیے جا رہا تھا۔ تھم تھم کر بات کرتا تھا۔ یہ فیض تھا۔۔ مایوسی نہیں آگے سنو۔ پروگرام ختم ہونے پر میں نے پاپا سے کہا کہ مجھے ان کا آٹوگراف چاہیئے۔ وہاں ایک صاحب اور تھے۔ سر جھکاتا ہوا۔ سر کے گرد سفید بالوں کی جھالر۔۔ بالکل لارڈ مسٹانگز کی طرح۔ مگر کرتا پاجامہ پہنے ہوئے۔ پاپا سے بڑی اپنی طرح ملے۔ اور مجھے فیض کے پاس لے گئے۔۔۔۔ ایہہ وحید دی کڑی اے۔۔۔ فیض۔۔۔ اینوں ذرا۔۔۔۔ ابھی وہ اتنا ہی کہنے پائے تھے کہ فیض نے میرے ہاتھ سے گریبان بانہہ ڈال کر لیا۔۔۔ اوہو۔۔ تو پھر تو یہ اپنی ہی بیٹی ہے۔ لاؤ بیٹی۔ میں ہی لکھ دوں۔" بیٹی! اتنا غیر شاعرانہ لفظ سن کر میں کانپ گئی۔ وہ پاپا سے دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ارے بھئی پاپا کے پرانے کلاس فیلو ہیں نا۔

وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھی۔ وہی دوست۔ وہی آٹوگراف بک۔ اب بتاؤ۔ کیا لکھوایا فیض سے؟ اس نے آٹوگراف بک دیکھی۔ خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو۔

"ہیں!۔۔۔۔ ارے فیض! تم فلمی ہیرو کی طرح کبھی بوڑھے نہیں ہوئے کیا! یہ تمہاری جوان شاعری کا رنگ ہے یا بڑھاپے کا رنگ۔۔ وہ چپ چاپ آٹوگراف بک پکڑے جیسے کسی شعلے کی لپک اپنے اردگرد محسوس کر رہی تھی اور سارے نئے پرانے جذبات قطرہ قطرہ بن کر اس کی ریشمی قمیض میں جذب ہوتے جا رہے تھے۔

نثار میں تری گلیوں پہ (صفحہ ۳۵ سے آگے)

بھی وہی نیلا آسمان ہے پھر میں قید کیسے ہوں۔

ایک عمر بیت چلی ہے۔۔۔ ان آنکھوں نے کتنے انقلابات دیکھے ہیں۔ کبھی کبھی احساس ہوتا ہے کہ میں تھک گیا ہوں۔۔۔ یہ تھکن اگرچہ مجھے زندگی سے بے حسی کی طرف نہیں لے جاتی۔ اس لیے کہ میرے اندر رہنے والا شاعر جوان ہے اور ہمیشہ جوان رہے گا، کیونکہ اس کے گیت امر ہیں۔ میں اس دنیا میں نہ بھی رہوں تب بھی وہ روح ضرور زندہ رہے گی۔ اور گلی گلی اور نگر نگر گھومے گی جس کے صداقت اور وطن سے محبت کی خاطر کبھی سقراط کی طرح زہر پیا اور کبھی فیض احمد فیض کی طرح زنداں میں بسر کی۔

تاریک راہوں میں مارے گئے (صفحہ ۵۰ سے آگے)

"مگر اس سے بھی کیا ہوتا ہے۔۔" اس نے کھڑکی سے بہت دور اندھیرے میں دیکھا۔

تو گر میری بھی ہو جائے۔

اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔

دنیا کے غم یونہی رہیں گے

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور بہت دیر تک سوچتا رہا کہ وہ کھڑکی کھلی رکھے یا بند کر دے۔

کنھیا لال کپور

تنہائی

(پیروڈی)

پھر کوئی آیا دِلِ زار نہیں کوئی نہیں (فیض)

○

فون پھر آیا دلِ زار نہیں فون نہیں
سائیکل ہوگا، کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات اُترنے لگا کھمبوں کا بخار
کمپنی باغ میں لنگڑانے لگے سرد چراغ
تھک گیا رات کو چلا کے ہر اک چوکیدار
گُل کرو دامنِ افسردہ کے بوسیدہ داغ
یاد آتا ہے مجھے سُرمۂ دنبالہ دار
اپنے بے خواب گھروندے ہی کو واپس لوٹو
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا

سید ابوالبرکات نظمی

پاس رہو

(پیروڈی)

تم مرے پاس رہو — میرے قاتل مرے دلدار مرے پاس رہو (فیض)

تم ذرا فقد رہو
میرے قاتل، مرے ہمدم، میرے پیارے سگریٹ
جس گھڑی دوست خریدیں سگریٹ
چند سکوں کا ہو دے کے خریدیں سگریٹ
"کیپسٹن" کوئی لے اور کوئی "سیزرس" لے
"ڈائمنڈ" ہی کوئی ہونٹوں میں دبے
بڑھ کے اخلاق سے پیکٹ کو مری سمت بڑھائے

تم ذرا فقد رہو
میرے قاتل، مرے ہمدم، میرے پیارے سگریٹ
"جب کوئی بات بنائے نہ بنے"
جیب سے اوروں کی بھی جب کوئی سگریٹ نہ ملے
"مفت سگریٹ" کی امید نہ بر آئے
مجھ کو رہ رہ کے جماہی آئے
اپنا پیکٹ ہی مرے ہاتھ کی رہ تکنے لگے
تم مری جیب میں انگڑائی لو
نشہ کام و دہن کی مجھے دعوت دے دو
ہاں یہی وقت ہے پیارے سگریٹ
میرے قاتل، مرے ہمدم، میرے پیارے سگریٹ

گلڈ اشاعت گھر کی مطبوعات

افسانے

تیسری منزل — ہاجرہ مسرور — ۵/۵۰

تھکے ہارے — خدیجہ مستور — ۵/۵۰

سورج بھی تماشائی — انور — ۵/۵۰

ناول

آبلہ پا (آدم جی ادبی انعام یافتہ)
رضیہ فصیح احمد — ۸/-

چائے والا — اے حمید — ۴/-

لال چادر — سید ولی اللہ
ترجمہ: یونس احمر — ۲/۵۰

تنقید

اردو میں سوانح نگاری (داؤد ادبی انعام یافتہ)
ڈاکٹر سید شاہ علی — ۶/-

شاعری

ہفت کشور (آدم جی ادبی انعام یافتہ)
جعفر طاہر — ۷/-

جلتے جزیرے — احسن احمد اشک — ۲/۵۰

صدا بہ صحرا — یوسف ظفر — ۴/۵۰

ہاڑے (پنجابی) — فیروز سائیں — ۳/۵۰

کہانی

پنجابی لوک کہانی — شفیع عقیل — ۴/۵۰

ڈرامہ

فصیل شب — میرزا ادیب — ۴/-

بچوں کی کتابیں

شہزادی کنول کلی — بیگم عصمت جعفری — ۶۰ پیسے

سائنس کے دلچسپ تجربات — نگہت سلطانہ — "

ایک تھا چور — انور عنایت اللہ — "

لکڑ ہارا چور — رحمان مذنب — "

درخت کے بچے — مسلم ضیائی — ۷۰ پیسے

سیر پاکستان — رضیہ فصیح احمد — ۲ روپے

زیر طبع کتابیں

قصص الاسلام — پرنسپل ابراہیم حسان

پاکستان منزل بہ منزل — شریف الدین پیرزادہ

ظلمت نیم روز (فسادات پر افسانوں کا انتخاب)
مرتبہ: ممتاز شیریں

(بچوں کے لئے)

چاند تارے — غلام عباس

سائنس نامہ — مسرور بدایونی

ڈیلائیٹ
انڈس
DELIGHT
INDUS
Safety Razor
Blade 0.13mm
بلیڈ
عمدہ اور پُرمسرت
شیو کے لئے
DELIGHT
INDUS
پاکستان بلیڈ انڈسٹریز
اے-١٧، ایس. آئی. ٹی. ای، حیدرآباد

سٹیزن
گھڑی
پاکستان میں ہر جگہ
دستیاب ہیں